ان من الشعر لحکمۃ وان من البیان لسحرا

ہزار ہزار شکر اُس ناظم کون ومکاں کا کہ زبان اردو کے شعرائے
ماضی وحال کا یہ مکمّل تذکرہ موسوم بہ

تذکرہ ہزار داستان

معروف بہ

خمخانۂ جاوید

۱۳۲۵ھ

جلد سوم

لالہ سری رام ایم۔ اے منصف دہلوی خلف الصدق عالیجناب آنریبل رائے بہادر
مدن گوپال صاحب بیرسٹر ایٹ لا رئیس دہلی و لاہور کی لگاتار محنت تلاش اور کوشش کا نتیجہ ہے

سنہ ۱۹۱۷ء

لالہ ٹھاکر داس صاحب اینڈ سنز کے اہتمام سے

دلی پرنٹنگ ورکس دہلی میں چھپا

تذکرہ ہزار داستان

المعروف بہ

خمخانۂ جاوید

۲۵ سے ۱۳

جلد سوم

مؤلفہ

جناب لالہ سری رام صاحب ایم اے سابق منصف دہلوی خلف الصدق

عالیجناب آنریبل رائے بہادر لالہ مدن گوپال صاحب کیاشی

مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس ۱۹۱۷ء

تعداد طبع اول ۱۳۰۰ قیمت فی جلد مجلد پانچ روپیہ مالحاز ها للہ

فہرست اسماء شعراء مندرجۂ خمخانہ جاوید جلد سوم

ردیف حرف ذال

صفحہ	تخلص	نام	صفحہ	تخلص	نام

صفحہ	تخلص	نام	صفحہ	تخلص	نام

تذکرۂ ہزار داستان

معروف بہ

خمخانۂ جاوید

جلد سوم

خادم شیخ خادم علی خان مرحوم خادم از رؤسا قصبہ کتیھل من مضافات سرہند (حال تحصیل ضلع کرنال) اِنکے چچا قادر علی خان بسبب مُلازمت عماد الملک غازی الدین خان فرخ آباد میں سکونت پذیر ہوئے اور یہ بھی اُنکے ساتھ وہیں جا رہے۔ نواب احمد خان مخاطب بہ ناصر جنگ بنگش نے آپ کو منظفر جنگ کا اتالیق مقرر فرمایا تھا آپ غلام محمد آزاد کے شاگرد تھے اُردو فارسی دونوں زبانوں میں مشہور انشا پرداز تھے۔ یہ کلام کا انتخاب ہے ؎

ہر چند ٹالتا ہے تو لیکن تری طرف ‍ ‍ ‍ آتا ہوں پھر پھرا کے میں قبلہ نما کی طرح

سچ مچ ہیں آن بان میں ترکیب طور میں ‍ ‍ ‍ بھاتی ہے ہمکو اپنے ہی اُس خوش ادا کی طرح

خادم سخن تو اور بھی کہتے ہیں خوب خوب ‍ ‍ ‍ پر ہم سے سیکھ لے کوئی طرز و ادا کی طرح

عاشق ہوا ہوں اک بتِ بالا بلند پر
مجکو کہتے ہو کہ چل بے باہر ہو

صد آفرین ہے میری بھی عالی پسند پر
آپکے کہنے سے کب باہر ہوں

ہے کہیں یہ بھی رہ و رسم وفاداری کی
پاس سے میرے جو وہ غیرتِ نشیں اُٹھ جائے

دِل مرا چھین کے یوں راہ بتائی تُونے
طاقت و صبر و قرار و دل و دین اُٹھ جاوے

تیرے قامت کا اگر شور نہ ہو کیا شک ہے
سارے عالم سے قیامت کا یقین اُٹھ جاوے

کفِ افسوس ہی پھر بیٹھے ملیں گے تا حشر
ہائے گر یار دمِ بازپسین اُٹھ جاوے

اُس سے در پردہ کچھ اظہار محبت کا کروں
یہ بغل کا مرے دشمن جو کہیں اُٹھ جاوے

ہم نشیں پاؤں کو ہاتھ اُسکے لگا تا تو ہے تو
ہے غضب اُس کا اگر ہاتھ کہیں اُٹھ جاوے

خادم - جناب عتیق الرحمٰن خان صاحب تلمیذ جناب قدرت رامپوری - باوجود تلاش اِنکے حالات بہم نہ پہنچ سکے یہ اشعار انکے ہیں *

کعبہ سے دَیر کی لی راہ مسلماں ہوکر
یہ شرارت ہے نئی جان جلانیکے لئے

بُت کا بندہ ہیں ہُوا صاحبِ ایماں ہوکر
دِل طلب ہم سے کرو غیر کے مہماں ہوکر

خاص - محمد حیدر خاں خاص پسر الٰہی بخش خاں منشی پلٹن شاہی شاگرد شاہزادہ جمعیت شاہ ماہر - اکبر شاہ ثانی کے عہد میں دہلی میں موجود تھے۔ تذکرہ نویسوں نے یہ اشعار انکے لکھے ہیں -

تھی جُدائی گرچہ پہلو میں مرے وہ یار تھا
کاوشیں جھیلیں کیا کیا یار دم مژگاں میں تری

ناز تھا - آزردگی تھی - رنج تھا انکار تھا
گاہ نشتر تھا جگر میں گاہ دل میں خار تھا

دیکھ لے نقشہ اگر اُس عالم تصویر کا
تُو تو کیا زاہد دل آوے اُس پہ تیرے پیر کا

مار کر مجکو ہوا تو قتلِ عالم پر دلیر
حلق تھا میرا فساں قاتل تری شمشیر کا

کیوں تقاضائے خلش ہر دم نفس کے ساتھ ہے
دل میں شاید رہ گیا ہے کوئی پیکان تیر کا

خاطر منشی سید محمد صالح صاحب لکھنوی شاگرد جناب فاخر لکھنوی - زمانۂ حال کے شعرا میں سے ہیں - اِن کا کلام لکھنو کے گلدستوں میں نظر سے گذرا اور یہ چند شعر درج تذکرہ کئے گئے *

ٹیس نے اُٹھکے کلیجے کی کیا کام تمام
درد آخر کو میرے درد کا درمان نکلا

مالکِ حور و جناں کہتے تھے سب ضواں کو
جا کے دیکھا تو دربار کا درباں نکلا

کچھ خلش کا تو مزہ دل کو ملے ای صیّاد
نو رگِ جاں میں مری توڑ دے نشتر اپنا

کر عہد پہ اُس عہد شکن کے نہ بھروسا
جز یاس نہیں نخلِ تمنّا میں ثمر اور

کس منھ سے کہا تھا کہ تجھے شاد کرینگے
کس دل سے یہ کہتے تھے کہ برباد کرینگے

خاطر - جناب رائے سورج نراین صاحب تلمیذ حضرت ظہیر دہلوی۔ انکے اُستاد نے اِن کی دو غزلیں بھیجی تھیں اُن میں سے چند شعر درج ہوئے حالات اور کلام بارہا طلب کئے۔ مگر دستیاب نہیں ہوئے ۔

تقصیر نظر کی ہے نہ آئیں جو نظر میں
آنکھوں میں سمائے ہیں وہ بیٹھے ہیں جگر میں

مرغوب ہے اس درجہ اُنھیں اپنی نمایش
آئینے لگا رکھے ہیں دیوار میں در میں

پڑتے ہیں زباں پر مری چھالے دمِ گفتار
کیا قہر کی گرمی ہے مرے سوزِ جگر میں

دِل چھین لیا دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے
کیا سحر ہے اُس شوخ کی دزدیدہ نظر میں

خاطر - منشی سید ظفر حسن صاحب لکھنوی تلمیذ حضرت جلیل۔ روزگار کی وجہ سے بمبئی میں رہتے ہیں آپکی اکثر غزلیں نظر سے گذریں۔ باوجود کوشش حالات معلوم نہ ہوئے۔ کچھ اشعار منتخب ہو کر ضبط تحریر میں آئے۔ اگرچہ مدتِ مشق کچھ زیادہ نہیں ہے مگر موزونی طبع کے ساتھ شوخی اور خوش مذاقی انکے کلام سے آشکار ہے مضمون کی طرف بھی خیال کی پرواز ہے۔

چل بسے ہوش وخرد میں ہاتھ ملکر رہگیا
اک چھلاوہ میرے دِل میں مجھکو چھلکر رہگیا

ہائے رے جوشِ شباب اُف رے مستانہ روش
جب قدم رکھا کسی کا دِل کچل کر رہگیا

جب اُٹھانے کے لیئے میرے چلا دربانِ یار
میں بشکلِ نقشِ پا در پر مچل کر رہ گیا

خوب کی جلوہ نمائی مرحبا اسے برقِ طور
ہو گیا بے ہوش کوئی کوئی جل کر رہگیا

یادِ گیسو سے اگر رات کو اُلجھن میں رہا
دِن کو بیتاب خیالِ رُخِ روشن میں رہا

نہ مٹا خونِ شہیدانِ ستم کا دھبہ
حشر تک بن کے شفق چرخ کے دامن میں رہا

وقتِ آخر بھی نہ دیدار کی حسرت نکلی
کب وہ آئے ہیں کہ جب دم نہ مرے تن میں رہا

گر یہی دل کی تڑپ ہے تو پسِ مردن بھی
دفن یاروں نے کیا مجکو میں مدفن میں رہا؟

اپنے صیاد کے احسان بھلا دوں کیونکر
میں قفس میں بھی رہا یوں کہ نشیمن میں رہا

کبتک رہیگا بادۂ الفت سے سرگراں
لِلّٰہ اب تو ہوش میں آ کچھ سنبھل کے چل

فقیرِ عشق ہیں پروائے ملک و مال نہیں
ہمارے پاس وہ شے ہے جسے زوال نہیں

تری نگاہ کا ہر بار اُٹھ کے جھک جانا
یہ کیا ہے مجھ سے مرے دلکا گر سوال نہیں

کسیکی فتنہ خرامی سے حشر برپا ہے
وہ بدنصیب ہے اب بھی جو پائمال نہیں

ہو مجھ سے وصل کا وعدہ عدو سے ایفا ہو
تمھیں کہو کہ یہ فقرہ نہیں یہ چال نہیں؟

یہ کچھ شوقِ شہادت ہے کہ ہم سر بیچکر اپنا
برائے نذرِ قاتل آج خنجر مول لیتے ہیں

یہاں کے واسطے کیا کیا تزک کیا کیا تکلف ہے
وہاں کیواسطے بھی کچھ تو نگر مول لیتے ہیں

خریداری دلوں کی اور نیچی نیچی نظروں سے
پرکھتے کس طرح ہیں اور کیونکر مول لیتے ہیں

وہ ہونگے اور بکجاتے ہیں جو تقدیر کے ہاتھوں
کوئی بیچے تو ہم اے دل مقدر مول لیتے ہیں

جذبِ الفت پردہ دارِ روئے زیبا کیوں نہو
میرے دل کے آئینہ میں تیرا نقشہ کیوں نہو

بیحجابی روکشِ چشمِ تمنّا کیوں نہو
جسکو آنکھیں دے خدا محوِ تجلّی کیوں نہو

کیا حیا ہے نیچی نظروں کے تصدق جایئے
تم نہ آنکھ اپنی اُٹھانا کوئی مرتا کیوں نہ ہو

بات جب بننے بھی دے برگشتگی تقدیر کی
ہیں بجا بھی کچھ کہوں اُنسے تو بیجا کیوں نہ ہو

آنسو ٹپک پڑے جو مری التجا کے ساتھ
کچھ رحم کھا کے ہولئے وہ مسکرا کے ساتھ

جویائے معرفت ہو تو باطن پہ کر نظر
کبتک چلے گا شیخ یہ تقویٰ ریا کے ساتھ

قاتل نہ توڑ آس ہماری دمِ اخیر
تیرِ نگاہ بھی کوئی تیغِ ادا کے ساتھ

تقدیر کی ہے بات جو اب بھی نہ ہو قبول
آمین کہہ رہے ہیں وہ میری دعا کے ساتھ

خاک میں مرکے یہ حسرت کے سوا لے نہ گئے
قبر میں ساتھ امیروں کے دوشالے نہ گئے

حشر تک سنگِ لحد بن کے رہے چھاتی پر
صدمے فرقت کے پسِ مرگ بھی ٹالے نہ گئے

ہوش بھی کرگئے ہمراہ نظر کے پرواز
شیخ جی پیکے جو بہکے تو سنبھالے نہ گئے

تشنہ کام و تشنہ لب کو آبِ جو درکار ہے
دِل کو تیری آرزو اور مجھکو تو درکار ہے

کچھ نشاں اِس کا ملے گر ہو حقیقت پر نظر
جستجو میں اُسکی اپنی جستجو درکار ہے

خاک تیرے نقشِ پا کی مُنہ پہ مل لیتے ہیں وہ
کوچۂ اُلفت میں جنکو آبرو درکار ہے

تیری وحدت کثرتِ عالم پہ ہی چھائی ہوئی
ایک ہے لیکن زمانے بھر کو تو درکار ہے

خاطر۔ مرزا معظم سُلطان خاطر خلف اکبر مرزا محمود شاہ ثنا اکبر گورگانی دفتر ٹریفک سپرنٹنڈنٹ۔ ایس پی۔ آر۔ دہلی میں کلارک ہیں اور چالیس سال کے قریب عمر ہے۔ تلمذ اپنے والد بزرگوار سے رکھتے ہیں۔ انداز کلام مندرجۂ ذیل اشعار سے نمایاں ہے۔

دیکھنا کچھ ہے ٹھکانا ہیبتِ جلاد کا
خنجر فولاد سے باہر ہے دم فولاد کا

جستجو میں عمر کھوئی تب ملا اتنا سُراغ
خود فراموشی بھی اک کلمہ ہے تیکی یاد کا

تجھکو دعویٰ ہے خدائی کا تو آ بسم اللہ
میرا دِل تیرے لیئے عرش معلّی ہوگا

مٹ بجائے تربتِ عاشق نسبمل دِل کہیں
دیکھکر رکھیئے قدم آگے مریجان دیکھکر

مُفت کا دِل مُنکے ہی خوبانِ عالم کا ہجوم
کیا گری پڑتی ہے دُنیا جنسِ ارزاں دیکھکر

ابھی کچھ تھے ابھی کچھ ہیں۔ ابھی بدلے ابھی بگڑے
عدو کے سامنے وہ میری حالت نیکے آتے ہیں

عجب انداز ہیں محفل میں اُنکے آنے جانیکے
شرارت بن کے جاتے ہیں قیامت نیکے آتے ہیں

سمجھ لو تم ہمارے ضعف کے آثار جتنے ہیں
حسینوں میں سب انداز نزاکت بن کے آتے ہیں

کسنے نکالا اِنکو گھروں سے جو ہو گئیں
آباد حسرتیں دِل خانہ خراب میں

دِن بھر جو تمکو دیکھ کے اُٹھتے ہیں ولولے
ارمان وہ نیکے شبکو جگاتے ہیں خواب میں

ہیں دولتے آبلے مرے دریا سے پوچھتے
کسکی بندھی ہوئی یہ ہوا ہے حباب میں

خاک

خاک میر طالب حسین ابن سید میر عظیم علی ساکن قصبۂ چلکانہ ضلع سہارنپور۔ اثنا عشری مذہب کے پیرو تھے اور قدیم وضع اور قطع کے پابند مذہب بزرگ تھے۔ چالیس سال تک ریاست سرمور ناہن میں معقول عہدوں پر مثل وکالت شملہ لاہور اور آخر میں مشیر ریاست بھی رہے اور اپنے آقا کو اپنی حسن خدمات سے رضامند رکھا۔ ۱۳۲۱ھ میں سفر حجاز اختیار کیا مگر قسطنطنیہ میں جہاز زیادہ عرصہ رُکے رہنے کے باعث سعادت حج سے محروم رہے۔ شعر گوئی کے دلدادہ تھے مگر غزل کم کہتے تھے۔ زیادہ تر طبیعت کا میلان اخلاقی اور نعتیہ مضامین کی جانب تھا۔ ایک طولانی مثنوی "گل باغ ارم" تیس چالیس جزو کی حسن آداب و اخلاق میں جو مستورات کے درس کے لائق ہے تصنیف کر کے ۱۳۲۹ھ میں شائع کی تھی۔ قصائد و متفرق کلام بھی بہت سا یادگار رہا۔ آخر ۱۳۳۰ھ میں ۶۶ سال کی عمر پا کر ریاست ناہن میں انتقال کیا اور وہیں سپرد خاک کئے گئے۔ کچھ کلام اُن کا بعد انتخاب پیشکش ہے۔

از قصائد

نہیں مطلع یہ نو مدحت ابروئے احمد کا	بنا ہے تذ بسم اللہ اونچا ہو کے سرحد کا
بیانِ خوبیِ تصویر بھی وصفِ مصوّر ہے	جو ہے وصفِ محمد وصف ہے ربِ محمد کا
گنہگاروں کا حصہ ہے ترے دربارِ جنت میں	یہیں تو بڑھ گیا ہے حوصلہ کچھ نیک سے بد کا
خدا کا گھر ہے مولد والدِ شبیر و شبّر کا	جو پیدا ہو خدا کے گھر میں وہ مختار ہے گھر کا
علی کے ہاتھ پر کی جس نے بیعت خلد میں پہنچا	خدا کا ہاتھ پکڑا اُس نے اور بازو پیمبر کا

از غزلیات

چھوٹ کس طرح رہوں تُو کس طرح سے جاؤں	بار ہو وے نہ کسی پر مرا مرنا جینا
شعلۂ عشقِ بتاں دل میں چھپا کر رکھا	سینے اس آگ کو چھاتی سے لگا کر رکھا
سوزِ فرقت سے کبھی آہ نہ آئی لب تک	آگ کے ساتھ دھوئیں کو بھی دبا کر رکھا
دیکھ آئینے میں ابرو کو ہے مائل قاتل	آپ تلوار سے اپنی ہوا بسمل قاتل
سر جو کٹتا ہے تو در پر بھی پڑا رہنے دے	نالہ کر سکتا ہے کیا جب نہ ہو سائل قاتل
کہیں کمر میں بل آ نجائے یہ بوجھ اس نے کہاں اٹھائے	کہ سر پہ زلفوں کا بار بھی ہے گلے میں سہرا بندھا ہوا بھی

خاکسار

خاکسار میر محمد یار متخلص بہ خاکسار معروف بہ میر کلّو شاہ جہان آبادی فیلن صاحب لکھتے ہیں کہ خاکسار عرف کلّو سودا اور میر حسن سے پیشتر تھا اور میر تقی کے اشعار کو ایام طفلی میں اصلاح دیتا تھا۔ لیکن میر صاحب اس امر کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ اپنے تذکرہ میں کہتے ہیں کہ جب میں اُسے مشاعرہ میں بلاتا تھا تو وہ آنے سے جان چُراتا تھا۔ نسّاخ انھیں جانِ جاناں مظہر کا شاگرد بتاتے ہیں۔ بہرحال ایک خوشگو اور عاشق مزاج شاعر تھے۔ قدیم تذکروں میں یہ بھی نظر سے گذرا کہ ان کا لقب "شاہ الشعراء" تھا۔ آپ قدم شریف دہلی کے خادموں میں تھے۔ قلندرانہ وضع رکھتے تھے۔ سودا اور میر کے عہد شباب میں کہنہ مشق گنے جاتے تھے۔ زبانِ ریختہ کے بڑے مشّاق تھے۔ صاحبِ دیوان اور شاعر خوش بیان تھے۔ علی ابراہیم علی خان مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ اشعار اس عزیز کے میرے ہاتھ نہیں لگے اور یہی باعث ہے کہ تذکروں میں آپکے اشعاروں کی کمی ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے :-

تھا زلیخا کو جو جاں سے مہِ کنعان عزیز
کیوں نہ وہ مصحفِ رو جان سے مجھے ہووے زیادہ
خاکسار عرش سے بھی دیکھا پرے تیرا مزاج
تیغِ قاتل رہے محروم سبب بے تقصیر ہم
کیا ہے حاصل تجھے ناصح مرے سمجھانے سے

ہمنے بھی تجھ سے تو بے مہر نہ کی جان عزیز
کس مسلمان کو نہیں دین اور ایمان عزیز
آپ میں آ ذرا اپنے تئیں پہچان عزیز
روز محشر کو اُٹھیں گے اس لئے دلگیر ہم
آہ جوں شمع ہے راحت مجھے جل جانے سے

ترے باغباں کا یہ دیکھا سلیقہ
دل شیفتہ کر کے کیا لیا تُو
تری زلف سیہ سے اے پیارے
رونے سے خاکسار کے سوتا نہیں کوئی
کیا ہے اِس خاکسار کی تقصیر
قیامت بھی ہوگی تو میری بلا سے

کہ نرگس کو بویا نہ بوئیں یہ آنکھیں
اے خانہ خراب کیا کیا تُو
مجھ کو اک سر ہزار سودا ہے
اِس خانماں خراب کو چپکا خدا کرے
یہ مگر تم کو پیار کرتا ہے
مجھے داد خواہی کی طاقت کہاں ہے

خاکسار

خاکسار۔ محمد بلاقی خاکسار تخلص ساکن مراد آباد سپاہی وضع عاشق مزاج۔ وارستہ رنگ شخص تھے اور قدرت اللہ شوق کے دلی دوست اُنہیں کے فیض صحبت سے گاہ گاہ ریختہ بھی کہتے تھے۔ شاہ عالم ثانی کا زمانہ پایا تھا۔ عالم جوانی میں فوت ہوئے یہ چند شعر تذکرۂ شوق سے درج ہوئے ؀

مرے دیدۂ تر بہا کر چلے	دو آبے میں یہ گھر ڈبا کر چلے
کیا تیغ ابرو سے مجھ کو شہید	یہ کیا خوب جوہر دکھا کر چلے
دکھا ساق سیمیں تو اب شمع کو	رولا کر۔ گلا کر۔ جلا کر چلے

خاموش

خاموش۔ حضرت میاں عبد اللہ شاہ بنوری چشتی صابری۔ یہ بزرگ نہایت عالی خاندان اور صاحبِ سجادہ حیدر آباد دکن میں تھے۔ عارفِ باکمال و سالکِ حال و قال مشہور تھے تنہائی پسند۔ اکثر جہاں رہتے تھے خاص اوقات کے سوا کسی کو آنے کی اجازت ہوتی تھی اور شبانہ روز خاموش رہا کرتے۔ کبھی اشد ضرورت ہوتی تو کسی سے بات کر لیتے گویا اسم بامسمّی خاموش تھے۔ باوجود ان مشاغلِ صوفیانہ و مجاہدانہ کے فن سخن سے طبیعت مانوس تھی۔ آپ کا کلام بھی عارفانہ اور بالکل تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا اور سیدھا سادا ہے ایک بہت مختصر دیوان قریبًا پندرہ سال ہوئے چھپا تھا اُس سے کچھ اشعار انتخاب کر کے درج کیے جاتے ہیں۔ سال وفات معلوم نہ ہوا ؀

بھلا ہوا سو ہوا۔ یا بُرا ہوا سو ہوا	طرف سے یار کی جو کچھ ہوا ہوا سو ہوا
قریب مجھ سے ہو پھر کیوں نظر سے غائب ہے	جمال اپنا تو مجھ کو دکھا ہوا سو ہوا
ایک مدت حرم و دیر میں ڈھونڈا عاشق	سیم بر میں چھپا تھا مجھے معلوم نہ تھا
بظاہر ملاقات ہوتی ہے مشکل	مگر خواب میں تو ملا کیجئے گا
ہم عشق کے بندے ہیں سو شیخ و برہمن	کیا تم سے کہیں کفر ہے اسلام ہمارا
صحرا میں رہیں باغ میں ہم کا ہیکو جائیں	گلشن میں نہ ہو جبکہ وہ گلفام ہمارا

شام کثرت ہے نمایاں زلفِ روئے یار پر | صبح وحدت کے ہیں جلوے یار کے رخسار پر

چلے بُت خانے کو خدا حافظ | زاہدو! اپنا لو خُدا حافظ

ستم کو ترے کب ستم جانتا ہُوں | عنایات ولطف وکرم جانتا ہُوں

دو عالم کی ہستی ہے موہوم ساری | جسے دیکھتا ہُوں عدم جانتا ہوں

نہ مہر و وفا نے جفا چاہتا ہُوں | بہر حال تیری رضا چاہتا ہوں

پروانے کیسے جلتے ہیں محفل میں آ کے دیکھ | پوشیدہ عاشقوں سے نوائی شمع رو نہو

دیکھ صورت کو تری ہوش نہیں رہتا ہے | اپنا احوال بھلا کیا میں سُناؤں تجکو

خاموش دیکھ ارض وسما میں ہے کسکا نُور | سُورج ہیں کون ماہ درخشاں ہیں کون ہے

شمع پروانے کو جلاتی ہے | شمع کا دِل جلا دیا کس نے

روشن ہوئی جب شمع تو پروانے سے بولی | اب تیرے پر و بال جلانے کے دن آئے

تجھے جبکہ ڈھونڈا نظر آپ آیا | عیاں ہوں میں تجھ میں نہاں مجھ میں تو ہے

کرے قتل گر ہمکو انکار ہے کب | وہ تلوار کس کی یہ کس کا گلو ہے۔

خان۔ اشرف خان نام تھا۔ دہلوی الاصل تھے۔ پھر لکھنو چلے گئے۔ جب دہلی میں رہتے تھے تو انجمن مشاعرہ ترتیب دیتے تھے غلام ہمدانی مصحفی سے فن شعر میں مستفید ہوئے۔ ر ۔ ۹

رہی کچھ بھی تو ویسی وحشت کی ہوا میرے بعد | پہلے ہیں وحشی ہوا قیس ہوا میرے بعد

تو ابھی سے تو نہ اس بُت کی طرفداری کر | مجھ سے ہو جائیو اے دِل تو جدا میرے بعد

اِس بُرائی کے سزاوار ہمیں ہیں پیارے | گالیاں کسکو سُناؤ گے بھلا میرے بعد

اے خان غم فراق میں تم زہر کھا مرو | اِس کے سِوا نہیں کوئی تدبیر دوسری

خان۔ محمد خان نام سعادت یار خان رنگین سے تلمذ تھا۔ نیک طینت خوش اخلاق شخص تھے۔ اوائل اٹھارہ صدی میں دہلی میں موجود تھے۔ یہ دو شعر انکے ملے۔

یاد جس وقت تری آتی ہے | مجکو ہچکی وہیں لگ جاتی ہے

ناحق ہم اپنے نام کو بدنام کر چلے	دنیا میں ہم جو آئے تو کیا کام کر چلے

خاور

خاور - میرزا محمد اکبر خان خاور مرحوم ابن مرزا محمد مہدی سیستانی شاگرد میر وزیر صبا۔ مہاراجہ صاحب والیٔ پٹیالہ کی سرکار سے سو روپیہ کا مشاہرہ مقرر تھا۔ ۱۲۹۵ھ میں پینتالیس سال کا سن تھا۔ لاہور میں عربی اخبار موسومہ "نفع العظیم" کے اڈیٹر تھے بڑے جید فاضل اور اکثر فنون سے ماہر تھے۔ فارسی اشعار نہایت عمدہ کہتے تھے۔ سیاحی کا بہت شوق تھا اکثر اطرافِ ہندوستان کی سیر کی تھی۔ فارسی شعر اکثر کہتے تھے چنانچہ کوہ نور وغیرہ لاہور کے پرانے اخباروں میں بسا اوقات ان کا کلام شائع ہوتا رہا اپنے زمانے کے اکثر مشاہیر سے روشناس تھے۔ ۷۰ برس سے زیادہ عمر پائی۔ آپ کا دل و دماغ علمی معلومات کا ذخیرہ تھا اور انھیں اپنے عہد کی زندہ تاریخ سمجھنا چاہیئے۔ مدتوں دہلی لاہور لکھنؤ میں رہے۔ کثیر الاحباب اور بڑے زندہ دل بزرگ تھے۔ انتخابِ کلام حسبِ ذیل ہے:۔

مثلِ شجرِ طور ہے نقشہ مرے دل کا	معمور ہے داغوں سے سراپا مرے دل کا
چلتا ہے پریزادوں میں سکہ مرے دل کا	دیوانگی سے نے باد شہِ وقت بنایا
رہ رہ کے ٹپکتا ہے پھپولا مرے دل کا	مر مر کے بسر کرتا ہوں میں زیست کو اپنی
کیا پوچھتا ہے حال ہے کیسا مرے دل کا	جیتا ہوں نہ مرتا ہوں عجب دکھ میں پڑا ہوں
پانی کی طرح بہہ گیا شیشہ مرے دل کا	ساقی نے دیا جام مئے ناب نہ خاور

پریزاد دیکھیں تماشا ہمارا	جنوں رنگ لائے کچھ ایسا ہمارا
وہ آج آ کے دیکھے تماشا ہمارا	نہ دیکھا ہو جس نے کبھی رقصِ بسمل
موئے پر بھی وہ ہی ہے سودا ہمارا	بگولا بنی پھرتی ہے خاک اپنی
ہما بن کے پھرتا ہے سایا ہمارا	بھری ہے ہوا شاہِ خوبان کی جی میں
گھٹا یہ سکھائے گی دریا ہمارا	لہو پی کے چھوڑیگی وہ زلف مشکیں
یہ جنت ہماری یہ طوبیٰ ہمارا	نہ چھوڑینگے ہم کوئے دلبر کو واعظ

ہوئے ہو تم اُس بے مروت کے خاور	نہ ہے وہ کسی کا نہ ہوگا ہمارا

خاور

خاور ۔ میرزا نواب بہادر خاور باشندہ خیرآباد ملازم سرکار معتمد نواب بہرام الدولہ بہادر خویش نواب سرسالار جنگ بہادر مرحوم وزیر حیدرآباد دکن۔ زیادہ حال معلوم نہیں یہ انکا کلام ہے ؎

کس نے جھانکا ہے آج محمل سے	صبر جاتا رہا مرے دل سے
جا کے اب در پہ اُسکے بیٹھ رہیں	یہی ٹھیرا ہے مشورۂ دل سے
پوچھتے کیا ہے ماجرا وہاں کا	کوئی پھرتا جو کوئے قاتل سے
سیکڑوں روز قتل ہوتے ہیں	شوق ہے اُنکو رقص بسمل سے

خاور

خاور ۔ میرزا احمد سلطان خاور گورگانی ابن میرزا مظفر بخت خلف میرزا شاہرخ بہادر فرزند دوم حضرت بہادر شاہ ثانی۔ عمر اب پچاس سال سے متجاوز ہے۔ یہ خود مرزا فیروز شاہ خلف مرزا سلیم کے داماد ہیں۔ اور ۱۳۰۸ھ سے ضلع بھونگر ریاست حیدرآباد دکن میں صیغہ دار انعام ہیں تصانیف سے ایک رسالہ موسوم بہ خورشید خاور نظر سے گذرا۔ اُس میں سے چند اشعار انتخاب ہو کر درج تذکرہ کیے جاتے ہیں کلام میں کوئی بات بجز سادگی قابل ذکر نہیں معلوم ہوتی ؎

خالق ہے وہی غمزہ و انداز و ادا کا	جسنے کہ بتایا کہ یہیں ڈھنگ آہ و بکا کا
ضرورت دشت پیمائی کی اب جاتی رہی خاور	کہ گھر میں ہی مزا آنے لگا ہمکو بیاباں کا
ہوئی ہے نعش غم دل اور جگر پر مرتسم ایسی	کہ سینے کے قفس میں بند وہ طاؤس ہیں گویا
بڑھتا ہے شوق طاعت اصنام اور بھی	لطف ثواب سنتے ہیں جب پارسا سے ہم

اشعار از قصیدہ در مدح اعلیحضرت نظام خلد آشیان

ازل ہی میں ہوں جسکو عطا اوصاف سلطانی	وہ ہرگز کر نہیں سکتا جہانداری جہاں بانی
روش وہ سیدھی سادھی ہی ہمارے قدر قدرت کی	سمجھ سکتی ہی جس سے خلق حضرت کی خداوانی

دروغ و مکر دونوں دشمنوں کو زہر لگتے ہیں	تکلف اور بناوٹ کے ہیں بے حد دشمن جانی
بڑھی مشقِ سخاوت رفتہ رفتہ ایسی حضرت کی	کہ کم عمری میں ہیں مشہور عالم حاتم ثانی
انھیں کے عہد دولت مہد میں ہم جیسے شنا ہیں	کہ خستہ خاطروں کی دل سے فرماتے ہیں مہمانی

خبر

خبر۔ سید محمد مہدی بلگرامی ولد سید محمد عسکری یہ بزرگ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کے پھوپھا اور استاد تھے فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں فکر سخن کیا کرتے تھے۔ بمقام بھاگل پور ۱۲۷۴ھ ہجری میں انتقال کیا یہ اُن کے اشعار ہیں۔

ہنسنے رونے کا بھلا کب سر و ساماں باندھا	تم نے ہی دیدہ و دانستہ یہ طوفاں باندھا
سدِّ وصال رنجشِ دلدار ہو گئی	اتنا بڑھا غبار کہ دیوار ہو گئی

خبر

خبر۔ میرزا حسین صاحب شاگرد مشتاق لکھنوی۔ آپ دورِ موجودہ کے شاعر ہیں حالات باوجود تلاش بہم نہ پہنچے۔ کلام حاضر ہے ؁

اک نہ اک دن جان دیدونگا میں تیرے ہجر میں	گر یونہیں اے بے وفا تو مجھ سے بیگانہ رہا
جستجو قیس کی منظور تھی ورنہ کیا تھا	دشت میں پھرتی تھی کیوں صاحب محمل خاموش
ممنون ہوا دردِ جگر کا میں شبِ وصل	سینے پہ رکھا ہاتھ ترس کھا کے کسی نے
دیکھا نہ گیا اِس سے مرے سینے کی جانب	خورشید کو اندھا کیا داغ جگری نے

خبیر

خبیر۔ مولوی غلام محمد خان خٹک خبیر فرخ آبادی۔ حضرت رشک کے تلامذہ سے ہیں انکے بزرگ رؤسا بنگش کی سرکار میں ملازم تھے اور غلام قادر خان انکے والد مہاراجہ سیندھیا کی فوج میں رسالہ دار تھے۔ یہ خود ایک عرصہ تک نواب کلب علیخاں والی رامپور کے مصاحب رہے۔ صاحب دیوان و مثنوی "دریائے عشق" "وسخن فیض" ہیں ؁

تشنۂ آب اجل جان کے مجکو شاید	آبِ شمشیر پلانے میرا قاتل آیا
ہے ماہ پر آگے ترے مہتاب کا عالم	خورشید میں نقشہ ہے چراغ سحری کا
کہتے ہیں بقتل عشاق ہیں آکر سفاک	آئیں تو روبرو وہ کون ہیں مرنیوالے

خرد

خرد۔ نواب فخر الدین خاں خرد دہلوی۔ خلف نواب شرف الدین محمد خاں۔ قلعۂ دہلی میں بہادرشاہ کے زمانے میں بخشی گری کے منصب پر ممتاز تھے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے گہرے دوست تھے۔ آنکے کلام کی بھی انھوں نے ہی تدوین کی تھی۔ یہ اُنکے اشعار ہیں۔

ہماری اُن کی محبت آہ ابر و برق کی سی ہے	ہم اُنکو دیکھکر روتے ہیں اور وہ ہمپہ ہنستے ہیں
لبوں پہ جان ہے جلدی پہونچ کہیں ظالم	یہ آرزو ہے کہ دم تیرے رُوبرو نکلے

خرد

خرد۔ حکیم مرزا محمد علی حسین خاں خرد عرف حکیم انور آغا لکھنوی مقیم حیدرآباد دکن پنشن خوار سرکار تھے ایران بھی گئے تھے۔ انگریزی میں بھی معقول دستگاہ تھی ۱۲۳۸ھ سال پیدائش تھا۔ دکن میں عرصۂ دراز تک رہے اور شاعروں کے انعقاد سے شعر و سخن کا چرچا جاری رکھا غزلوں کے علاوہ قصیدہ گوئی میں بھی ملکہ تھا۔ دس یا بارہ برس ہوئے حیدرآباد میں انتقال کیا۔ دکن کی علمی صحبتوں میں اکثر شریک رہتے تھے استعداد علمی بہت اچھی اور پایہ کی تھی اور ہزارہا اشعار اساتذہ کے نوک زبان تھے لکھنؤ کے اُساتذہ کی صحبت پائی تھی۔

قیس لیلیٰ کے سبب عشق میں کامل نکلا	لوگ مجنوں جسے سمجھے تھے وہ عاقل نکلا
سخت جانوں پہ نہ آساں ہوئی مشکل دم نزع	دم بھی مشکل میں جو نکلا تو بمشکل نکلا
خرد اُس طفل نے دل لے لیا نادان بنکر	ناسمجھ جسکو سمجھتے تھے وہ عاقل نکلا

خوش سلیقہ دلبرانِ وقت ہیں مطلب کے دوست	یہ عدوئے جاں ہیں دشمن سب کے اور پھر سب کے دوست
کچھ تو سمجھا ہوں جو خود جان کے کھویا ہے دل	تجھ میں وہ بات ہے جس بات کا جویا ہے دل
شعر بے عشق کبھی لایقِ تاثیر نہیں	ساز ہے سوز نہیں۔ شمع ہے تنویر نہیں
جب سے تو جلوہ نما اسے بت بے پیر نہیں	بزم میں شمع نہیں۔ شمع میں تنویر نہیں
دستِ قدرت نے بنایا ہی مرقع تیرا	جو کہ مانی سے کھنچے وہ تری تصویر نہیں
مثل غالب ہوں خرد قائلِ قولِ ناسخ	آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں
میں کیا ہوں کون ہوں تھوا عمر بھر یہ علم	خود اپنی معرفت سے رہا اشتباہ میں

حور و قصور جنت و عفو و ثواب و اجر	سب کچھ ہے ایک تیرے کرم کی نگاہ ہیں
کیونکر چھپے گا نالہ و افغان ہیں دردِ دل	غماز اب کئی مرے رازِ نہاں کے ہیں
مر کر بھی قیدِ غم سے نہ آزاد ہو سکے ہم	اک مرغ جان ہے سات قفس آسمان کے ہیں
افکارِ دنیوی سے ہیں اہلِ عدم پرے	یہ سب تعلقات خرد اس جہاں کے ہیں
نگاہِ زنداں ہر رخنہ افگن ہے رخنہ افگن نگاہِ زنداں	ٹپک رہی ہے شراب خم سے شراب خم سے ٹپک رہی ہے
پسِ فنا بھی ہے یادِ گیسو ہے یادِ گیسو پسِ فنا بھی	مہک رہی ہے لحد ہماری لحد ہماری مہک رہی ہے
پسند گوشہ نشینی جو ہمکو زیست میں تھی	رہے مزار میں یوں جیسے اپنے گھر میں رہے
بخیل ایسے گرفتارِ حرصِ دنیا ہیں	کہ دم بھی جسم سے نکلے تو مال و زر میں رہے
غیر ہیں سب نہیں اپنوں میں بھی اپنا کوئی	سمجھے اپنا نہیں اپنوں میں بھی اتنا کوئی
اب وہ نوبت ہے کہ دشمن بھی مجھے کہتے ہیں	ہائے کیا تو نے یہ احوال بنا رکھا ہے
اُس پری نے دمِ نزع آکے مری بالیں پر	ملک الموت کو دیوانہ بنا رکھا ہے

خرد۔ صاحبزادہ مرتضیٰ خان خرد رامپوری پہلے آغا غنی سے مشورہ کرتے تھے پھر حضرت جلال سے اصلاح لینے لگے۔ صاحبزادہ محمد علی حسن خاں کے بیٹے ہیں ۱۲۶۶ھ سالِ پیدائش ہے۔ انکا کلام بہت اچھا ہوتا ہے طبیعت میں جدت شوخی مضمون آفرینی سب کچھ ہے اب سنا ہے کہ بسمل تخلص کر لیا ہے۔ بعض بعض شعر بے مثل کہہ جاتے ہیں۔

کلیسا کیا حرم کیا بتکدہ کیا ؟	تمھیں ڈھونڈا ہے گھر گھر ہمنے کیا کیا
نہیں گر خون پہلو میں ہوا دل	شبِ فرقت پھر آنکھوں سے بہا کیا
خلشیں ہوتیں مگر کوئی نہ ارماں ہوتا	کاش اس دل کی جگہ سینہ میں پیکاں ہوتا
منہ کو آنچل سے چھپانے جو تم آکر شبِ وصل	جلوۂ حسن چراغ تہِ داماں ہوتا
اپنا یہ حال۔ انکی توجہ ادھر نہیں	سچ ہے کسی کے دل کی کسیکو خبر نہیں
ایماں کی خیر حضرتِ زاہد منائیے	یہ بت وہ ہیں کہ جنکو خدا کا بھی ڈر نہیں

خرد

میں بھی اللہ سے روز ایک نیا دل مانگوں — آیئے دن آپ جو تازہ ستم ایجاد کریں
خلش درد بھی یارب ہے یہاں روز افزوں — ظلم پر ظلم وہ بیداد پہ بیداد کریں
فرقت میں سوا اس کے تمنا مجھے کیا ہو؟ — وہ درد اُٹھے دل میں کہ جبکی نہ دوا ہو
خلش کی لذتیں قاتل مرے دل سے کوئی پوچھے — مرا دل توڑ کر ناوک ترا جب دم نکلتا ہے
دل و دین کی خرد ہو خیر وہ آتا ہے بن ٹھن کر — کہ جبکی سادگی میں حُسن کا عالم نکلتا ہے
کچھ زیادہ تپش دل ہو یہاں بھی ہر شب — روز افزوں جو یونہی حسن خدا داد رہے
بیدار رہوں یا خواب کا عالم ہے الٰہی — غیرت ہے شب وصل کہ وہ میرے گھر آئے
جب میں کہتا ہوں حشر آنے دو! — کہتے ہیں وہاں بھی گر خدا نہ سنے

خرد۔ خواجہ محمد شفیع الدین انصاری خرد تلمیذ آزاد سہارنپوری دکن میں سکونت ہے اور ڈاکخانہ میں ملازم ہیں۔ داغ صاحب کے ہاں اکثر نشست رہتی تھی ایک مختصر دیوان بھی چھپا ہے۔

اس طرح ہوتے نہ ہم خوار و ذلیل و رسوا — تیرا سودا نہ اگر زلف پریشان ہوتا
رام اُس بت کے ہوئے سینکڑوں مشتاق جمال — کھینچکر قشقہ جو وہ شوخ جبین پر نکلا
حسرت و یاس و الم کا ہے جو بالین پہ ہجوم — آج پُرسا ترے بیمار قضا لیتے ہیں
انتظار شب ہجراں کا کہوں کیا عالم — آنکھ دروازے سے ہر وقت لگی رہتی ہے

خرد۔ منشی ہردیال پرشاد سررشتہ دار محکمہ سکرٹریٹ دربار گوالیار دور موجودہ کے کہنے والے ہیں۔ باوجود بار بار دریافت کوئی حالات بہم نہ پہنچے رسالۂ ارمغان شاہجہانپور میں عرصہ تک انکی غزلیں شائع ہوتی رہیں اُس میں سے کچھ اشعار منتخب ہو کر درج تذکرہ کئے گئے۔

آنچل سے چھپاتے ہو عبث روئے منور — اس ابر میں یہ چاند نہاں ہو نہیں سکتا
کبتک ترے سودے لے محبت کو چھپاؤں — وہ جوش ہے دل میں کہ بیان ہو نہیں سکتا
ہم تو نگاہ لطف کے اُمید وار تھے — آنکھیں پھرائیں یار نے یہ کیا ستم کیا

اتنا کوئی کہدے کہ انسے جاکر — بیمار کو دیکھ لو تم آکر
گریباں چاک کر دامن پارہ پارہ — بڑی مشکل ہے کس کس میں رفو ہو

تدتوں ہمنے ترے در پہ جبیں سائی کی
رات دن آنکھوں میں تصویر پھرا کرتی ہے

وائے قسمت نہ دمِ نزع بھی صورت دیکھی
عشق گیسو میں بلا کے غم رہے

دل پہ نگاہ ڈالکے اُسنے لگا دی آگ
دن رات خرد کوچۂ جاناں کی کرو سیر

جب سے ہوائے عشق عدو لگ گئی تمہیں

یُوں مٹا یا خطِ تقدیر کا لکھا کس نے
تم کو ہمنے نہیں دیکھا ہے تو دیکھا کس نے

اُسنے منہ پھیر لیا غیر جو حالت دیکھی
اپنے جینے سے بھی برہم ہم رہے

شعلہ چراغ طور کا برقِ نظر میں ہے
مطلب تمہیں کیا حور سے کیا باغِ ارم سے

مُرجھا گئے ہیں پھول سے رخسار اور بھی

خرم

خرم ۔ پنڈت گلاب رسائے مجو متخلص بہ خرم دہلی وطن تھا انکے صاحبزادے پنڈت کنھیالال شگلو عرف مجو مبارک تخلص ڈپٹی کلکٹر تھے اب پنشن پاتے ہیں اور پوتے انکے پنڈت سورج نراین منصف ہیں

دِل جلا کیا کوئی آتا ہے یہاں
خرم آتی ہے مجھے بوئے کباب

غبارِ خط نہیں خرم ہے گرد اس رُخِ تاباں کے
مدّور ہے بنی کیا خوب میری آہ کی صورت

یاد آتی ہے مجھے خرم جو وہ زلفِ سیاہ
سانپ پھرتا ہے مری چھاتی پہ لہراتے ہوئے

خرم

خرم ۔ منشی سیتل پرشاد خرم حیدرآبادی ۔ شاید منصبدار ہیں ظریف اور خوش طبع آدمی ہیں ۶۰ ۔ ۷۰ برس کے درمیان عمر ہے ۔ حیدرآباد کے اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے رہتے ہیں ؀

ملیں گے خاک میں ہم خاکسار ہیں اے چرخ
ہُوئی ہے جیسے کہ کُن سے نمودِ ہستی کی

خدا کو روزِ قیامت میں مُنہ دکھانا ہے

کریگا کیا بھلا دشمن ہمارا تُو ہو کر
فنا بھی ہو گی یونہیں ایک روز ہُو ہو کر

رواں جہاں سے ہو خرم تو سرخرو ہو کر

خستہ

خستہ ۔ قطب بخش نام ۔ سید محمد کرمانی کی اولاد اور حضرت نظام الدین اولیاء کے مجاور تھے خوش خلق و مہذب نیک اور باوضع بزرگ تھے ۔ کبھی کبھی شعر گوئی کی طرف بھی توجہ کرتے تھے اور اس فن میں بھورے خان آشفتہ سے مشورہ کرتے تھے ۔ یہ اُنکے اشعار ہیں ۱۲۷۸ھ سے پہلے انتقال کیا ؀ ۵

چہرہ اُس بُت نے جو ناگاہ لبِ بام کیا	روز خورشید درخشاں کا وہیں شام کیا
جسکو پرواہی نہیں کوئی مرے یا جیوے	دِل دیا ہائے میں اُس شوخ کو کیا کام کیا
جور و جفا مت کرو دل کو نہ آزار دو	چاہ کے پیاسوں کو تک شربتِ دیدار دو
ہائے رے نا منصفی خلوت و جلوت کے بیچ	سب کو بلاؤ صنم اِک ہمیں دھتکار دو

خستہ

خستہ عبداللہ خاں عرف میاں جیون۔ اصل وطن کشمیر تھا مگر یہ خود دہلی میں پیدا ہوئے اُنکے والد نواب مجدالدولہ عبداللہ خان بہرام جنگ کے رفقا میں تھے جو شاہ عالم ثانی کے وزیر تھے اور اپنے والد کے بعد یہ بھی اُس منصب پر ممتاز رہے متواضع اور خوش مزاج شخص تھے۔ فنِ سخن میں حکیم ثناءاللہ خاں فراق کے شاگرد تھے۔ یہ اُن کے اشعار ہیں +

جو کوئی لا وے پیام اُس کے آج آنے کا	میاں میں صدقے ہوں اُسکے زباں ہلانے کا
دستِ قاتل پہ مرے خوں کی جو تھی رنگینی	ایسی رنگت کا کبھی رنگ حنا نے نہ دیا
سایہ ساں پہنچے تو تھے پاؤں تلک گر پڑ کر	اُسنے دامن کو بھی پر ہاتھ لگانے نہ دیا
جب خاکِ غریباں پہ تم اس حال سے آؤ	انصاف کرو کیونکہ نہ برباد ہو کوئی
یہانتک تو ہوئے محو تمہارے کہ جہاں میں	لو ہم سے قسم ہمکو اگر یاد ہو کوئی

خستہ

خستہ حکیم محمد سلیم خاں مرحوم خلفِ حکیم محمد عظیم خاں دہلوی از خاندان حکیم محمد شریف خاں (حکیم محمود خاں صاحب) منصب دار ریاست جیپور۔ ان کا وطن اصلی دہلی تھا، مگر بعد غدر جیپور میں مستقلاً سکونت اختیار کر لی تھی مہاراجہ رام سنگھ والی جیپور کے دربار میں ذی رسوخ اور صاحب اثر تھے آخر عمر میں کونسل عالیہ کے سر رشتہ دار بھی ہو گئے تھے۔ علم طب میں ایسا دخل تھا کہ دُور دُور جواب نہ رکھتے تھے اُنکے مطب اور حذاقت کی آجتک شہرت چلی آتی ہے علاوہ ازیں شاعری میں بھی دستگاہ معقول تھی پندرہ برس ہوئے ۵۰ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ بڑے خلیق زندہ دل وسیع مشرب بزرگ تھے۔ شعر بہت خوب کہتے تھے۔ گو مشق کم تھی۔ مذاق سخن صاف شستہ اور رنگ میں پختگی پائی جاتی ہی طبیعت معانی خیز پائی تھی علم طب میں ایک

طویل کتاب اپنے آقائے نامدار کی فرمایش سے لکھی تھی جو چھپ بھی گئی ہے حضرت ظہیر۔ انور۔ نواب رونق تسلیم وغیرہ کے جلسوں میں شریک رہتے تھے۔ بہزار دقت وتلاش یہ چند اشعار ملے۔

محشر میں دیکھئے لب معجز نما کے کام — مٹتا ہے بات بات پہ دفتر گناہ کا
بے جرمیوں پہ قتل مرا پر ضرور تھا — کیا کم ہے یہ قصور کہ میں بے قصور تھا
واں تھی حیا سے مانع گفتار خامشی — سمجھے سب اہل بزم کہ اُسکو غرور تھا
غیر سے اُلفت نہیں ضد ہی سہی — تمکو وعدے بھی نہیں ہیں یاد کیا
یہ ناامیدئ مطلب کہ یاس مرنے سے — یہ بے کسی کہ دم مرگ انتظار رہا
وفا نہیں تو نہیں مورد جفا ہی سہی — ہزار شکر کہ میں داخل شمار رہا

خستہ

خستہ۔ جناب حیدر علیخان صاحب بہادر فضل اسسٹنٹ کمشنر ملک برہما۔ حالات باوجود تلاش دستیاب نہو سکے صرف ایک غزل ہاتھ آئی اُسکے چند شعر درج ذیل ہیں۔

تجھ کو غیروں سے جو اُلفت ہو گئی — سے ہمیں بھی تجھ سے نفرت ہو گئی
چین سے گذری شب وصل صنم — صبح ہوتے ہی قیامت ہو گئی
گھر سے نکلا ہے بت محشر خرام — شہر میں برپا قیامت ہو گئی
زلف سلجھانا بھی اُن کو بار ہے — اس قدر نازک طبیعت ہو گئی
کیا سبب ہے اے بت ظالم تجھے — نام سے خستہ کے نفرت ہو گئی

خستہ

خستہ۔ جناب منشی معشوق اللہ خاں صاحب تلمیذ حضرت داغ۔ باوجود کوشش حالات دستیاب نہوئے۔ چند رسالوں سے کلام منتخب ہو کر نقل ہوا۔

دل لیا ناز و ادا نے تیغ نے جان و جگر — خون جو کچھ تھا بدن میں اُسکو پیکاں لیچلا
ہے کدھر جذب محبت کیا ہوا تیرا اثر — دیکھ پہلو سے مرے دل کو وہ پیکاں لیچلا
ساقی نگاہ لطف ہو پھر میگسار پر — لینا خبر کہ نشۂ مے ہے اُتار پر

خستہ

خستہ۔ حکیم غلام حضرت خاں صاحب رامپوری شاگرد امیر مینائی۔ آجکل کے

شاعروں میں ہیں کلکتہ میں عرصہ تک مطب کرکے اب رامپور اپنے وطن چلے آئے ہیں اور ٹھیکہ داری کرتے ہیں۔ فقیر منش اور بہت خلیق اور مہذب شخص ہیں چند غزلیں نظر سے گذریں اُنکا انتخاب درج ذیل ہے۔

اُنکے انکار سے کیا کام تھا تجکو خستہ
اپنا مطلب کسی پہلو سے نکالا ہوتا

جنازہ اُٹھنے دو عاشق کا پھر سنور لینا
ابھی تو رات ہے پچھلے پہر سنور لینا

وفورِ ضعف سے بیمارِ غم کو مشکل ہے
جگر سے ہاتھ اُٹھا کر جگر پہ دھر لینا

دل آپ گرفتار ہو گیسوئے دوتا میں
کمبخت مجھے کیوں لئے جاتا ہے بلا میں

جو مر گیا الفت میں ہوا نام اُسیکا
اُبھرا وہی جو ڈوب گیا بحرِ فنا میں

آرزو میری کوئی کیا نخلِ ماتم کی تھی شاخ
جو کلی کمبخت میں آئی وہ مرجھائی ہوئی

حسرتیں جو دلمیں ہیں سر رکھیں ٹھیں بوقتِ ذبح
منہ چھپائے حشر میں پھرتی ہیں شرمائی ہوئی

کس بلاکش کی ہے اے خستہ یہ جلت کی گھڑی
شامِ غم پھرتی ہے گھر گھر آج گھبرائی ہوئی

خستہ منشی جیالال خستہ دہلوی۔ دفتر میونسپل کمیٹی میں ملازم ہیں۔ ۴۰ برس سے زیادہ عمر ہے شعر گوئی کا شوق اور یہ کلام کا نمونہ ہے۔ مذاق ستھرا اور پاکیزہ ہے۔

جوشِ مستی سے جھکی جاتی ہیں آنکھیں اُن کی
خود اُنھیں محو کئے دیتا ہے جوبن اُن کا

دل کوئی مانگا ہوا ہے عاشقِ ناشاد کا
آپ کیوں باقی رکھیں ارماں کوئی بیداد کا

نہ وہاں تجھسے پری پیکر نہ میں حوروں کا شیدائی
نہ جنت میرے قابل ہے نہ میں جنت کے قابل ہوں

الٰہی کس طرح گذرے گی مجھسے ہیچکارے کی
نہ ماہر ہوں کسی فن میں نہ عالم ہوں نہ فاضل ہوں

جاتے پائے کوئی ہشیار نہ میخانہ سے
ہو گیا عہد صراحی کا یہ پیمانے سے

خسرو خسروِ اقلیمِ معانی بادشاہ جہانِ شیریں زبانی خواجہ ابوالحسن عرف امیر خسرو۔ کون ہے جو اس خسروِ معانی سے آگاہ نہیں۔ کیا علمائے کرام کیا صوفیانِ عظام کیا خاص و عوام کس کو حضرت امیر خسرو سے واقفیت نہیں۔ اگرچہ عام طور سے شعرائے فارس کے اعلیٰ طبقہ میں انکا شمار ہوتا ہے مگر اردو زبان کے تاریخ دان جانتے ہیں کہ حضرت امیر خسرو کو خدا نے وہ

قوۃ ایجاد عطا کی تھی کہ تمام اصنافِ نظم و نثر میں صدہا مضامین تازہ کے گُل کھلا گئے۔ نظم فارسی میں اس درجہ کمال تھا کہ شیریں کلامی اور قبولیت عام کیوجہ سے آپ کا لقب "طوطیٔ ہند" مشہور ہے۔ فن موسیقی میں مہارتِ تام رکھتے تھے اسی طرح جب ہندی کی طرف التفات کی باگ کو پھیرا سینکڑوں راہیں اسمیں نکال لے گئے خدا کی قدرت پر نظر کرنے والے کہاں ہیں دیکھیں اوہ لڑکا جو اُردوئے شاہی کی بدولت ہندوستان کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا اور اس بھیڑ بھاڑ سلطنتوں کے بناؤ بگاڑ میں اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا تھا۔ خدا کے سہارے سے قوت پکڑ کر ایسا ہوا کہ امیر خسروؒ کو مل گیا اور اُنھوں نے اپنی پیرانہ سالی کا سہارا سمجھکر اپنی گود میں لیا اور گویا چھاتی سے لگا کر رکھا۔ ہندی اور عرب و عجم و ترک کے میل جول سے جو زبان اُردوئے شاہی میں پیدا ہو گئی تھی اسوقت سب لوگ اپنے اپنے کام اُس سے لیتے تھے مگر کوئی پہچانتا نہ تھا۔ امیر خسروؒ نے اُسکو روشناس کرنے کا ذمہ لیا اور یہی پہلے شخص ہیں جو اسکو زبان جان کر کام میں لائے۔ اور فارسی۔ ہندی بھاشا وغیرہ کے ساتھ اس نئی زبان کو پیوند کیا۔ خالق باری اور اُسکے سوا سینکڑوں پہیلیاں۔ کہہ مکرنیاں۔ دو سخنے۔ غزلیں غرض کہ بہت کچھ اس رنگ میں کہا جو آجتک لوگوں کی زبانوں پر ہے۔ اسکو یہاں بالتفصیل بیان کرنا ضرور نہیں یہ مختصر عبارت اسلئے لکھدی گئی کہ اجنبی واقف ہو جائیں یعنی اس اُردو زبان میں جس شخص کو سب سے پہلے کسی مستقل تصنیف اور فکر کا موقع مِلا اور شہرت بھی حاصل ہوئی وہ حضرت امیر خسروؒ ہیں ✦

امیر خسروؒ کی ولادت تیرہویں صدی عیسوی کے درمیان مومن آباد ضلع ایٹہ میں ہوئی ان کے اسلاف چنگیز خاں کے وقت میں ماوراالنہر سے ہندوستان میں آ کر رہے۔ انکے والد سیف شمسی ایک بڑے جری دلدار سپاہی تھے امیر خسروؒ کی سات برس کی عمر ہوئی تھی کہ وہ کسی معرکے میں کام آئے۔ عماد الملک ان کے نانا نے جو شاہی مشیر تھے اِنکی پرورش اور تربیت کی ✦

حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کے سب سے برگزیدہ مرید و خلیفہ تھے بلکہ مشہور تو یہ ہے کہ ان کی مریدی ہی سے ان کے پیر کی شہرت اسقدر پھیلی۔ ان کو اپنے پیر و مرشد کے ساتھ جتنی محبت و خلوص تھا اُسکے متعدد افسانہ مشہور ہیں گویا فنافی الشیخ تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے انتقال کا اِن کو سخت صدمہ ہوا اور اس رنج و غم کی حالت میں ۱۳۲۵ء مطابق ۷۲۵ھ کو انتقال فرمایا۔ اور اپنے پیر و مرشد کی قبر کے قریب دفن ہوئے۔

یاوری بخت سے سلطان نظام الدین اولیاؒ کا قیام انکے نانا کے مکان پر تھا۔ اِس طرح بچپن میں شرف ملازمت و استفادہ حاصل کیا۔ اُنہوں نے ہدایت کی تھی کہ "بہ طرز صفاہانیاں بگو"۔ خود فارسی کتب پڑھائیں۔ اس فیضان سے کلام خسرو میں سوز گداز کی شان پیدا کردی اور اس کا اثر یہ ہے کہ چھ سو صدیاں گذر جانے پر بھی کلام زندہ اور اب تک دلوں میں اپنا اثر جمائے ہوئے ہی۔ خود اپنے دیوان تحفۃ الاصغر کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ ۱۲ برس کی عمر میں شعر و رباعی کہنا شروع کیا۔ علما اور عمائد مجھے دیکھکر استعجاب کرتے تھے۔ میں رات دن مطالعہ اور فکر شعر میں غرق رہتا تھا۔ انوری و سنائی اور خاقانی کے کلام سے مجھے بہت دلچسپی رہی اور ہر اُستاد کے رنگ میں کہنے کی مشق کرتا رہا۔ اسی لیئے میرے مجموعہ میں تمام اساتذہ کی تقلید اور پیروی کے نمونے جابجا موجود ہیں۔ خواجہ عزیزالدین کلانی جو عالم متبحر اور بڑے پایہ کے سخنور تھے اُن ایام میں دہلی میں نظر بند تھے کسب کمال کا ذوق اُنکی خدمت میں لے گیا اُنھوں نے کلام سنکر کلمات تحسین و آفرین سے دل بڑھایا اور اکثر نکات و اشارات سخنوری دل نشین کیئے اور مشکل اشعار کو جنکے مطالب کی باریکی کو ذہن نہ پہنچتا تھا حل کر کے بتایا۔ فطری مناسبت۔ کثرت مطالعہ۔ ولولۂ شوق شفقت بزرگان نے رفتہ رفتہ درجۂ کمال کو پہنچادیا۔ خوش قسمتی سے شاہزادہ محمد سُلطان ولیعہد سُلطان غیاث الدین بلبن جیسا مربی مل گیا اور اس وسیلہ سے دربار شاہی میں بار حاصل ہوا۔

اُنکے نانا کی سرکار میں دو سو ترکی اور دو سو ہندی غلاموں کے علاوہ دس ہزار سوار ملازم تھے یادگار عمر پائی امیر خسروؒ کی بہن ۱۲ برس کی عمر تھی کہ اُنہوں نے ۱۱۳ برس کی سن میں انتقال کیا۔

کامل ستر برس عہدہ عرض بیگی سلطنت پر مامور رہے۔ انکی وفات کے بعد خان اعظم قتلو خاں کی سرکار میں جو سلطان بلبن کا بھتیجا تھا ملازمت اختیار کی کئی قصیدے اسکی مدح میں موجود ہیں خود فرماتے ہیں کہ کچھ عرصہ بعد سامانہ جاکر شاہزادہ بغرا خان صوبہ سامانہ پسر سلطان بلبن کا مصاحب ہوا اور وہ مجھ پر از حد مہربان ہوگیا۔ شبانہ روز اپنے ہمراہ رکھتا تھا۔ ۶۷۸ھ میں طغرل بیگ صوبہ بنگالہ نے بغاوت کی اور سلطان بلبن خود اسکے زیر کرنے کو شاہزادہ بغرا خاں کو ساتھ لیکر روانہ ہوا۔ اورانجام کار وہاں کی حکومت بغرا خاں کو دیکر دہلی واپس آگیا اسوقت سلطان کی عمر ۷۵ برس کی تھی۔ میں کامل ایک سال کے سفر اور اعزا کی مفارقت سے بیدل اور شکستہ خاطر ہوگیا تھا۔ ملازمت ترک کرکے شاہی لشکر کے ساتھ دہلی واپس آگیا۔ واپسی پر سلطان محمد ولیعہد نے جو میری سخنوری کی شہرت سنکر کچھ مشتاق ہوگیا تھا۔ مجھے ملتان طلب کرلیا۔ مگر چند ہی ماہ میں مغلوں سے مقابلہ میں سلطان محمد مارا گیا۔ اور سلطان شہید کے نام سے ملقب ہوا۔ میں بھی بدشواری قید سے رہائی پاکر دہلی آیا اور مومن پور عرف پٹیالے میں گنگا کنارے چند ماہ والدہ کی خدمت میں حاضر رہا۔ اس عرصہ میں ۶۸۵ھ میں سلطان غیاث الدین بلبن نے انتقال کیا اور بغرا خاں کا لڑکا کیقباد تخت سلطنت پر بیٹھا کیونکہ بغرا خاں نے بنگال سے معاودت منظور نہ کی۔ دربار میں ملک نظام الدین کا دور دورہ تھا۔ میری بھی طلبی ہوئی۔ مگر میں نے حاتم خاں کی ملازمت ترک کرنی مناسب نہ سمجھی۔

حاتم خاں کے ہاں چند ہی دن گذرے تھے کہ ملک نظام الدین نے قضا کی اور میں دربار شاہی میں بادشاہ کی مصاحبت کے جلیل القدر عہدے پر فائز ہوا۔ کیقباد کی اقبالمندی کا پیمانہ جلد ہی لبریز ہوگیا اور مفلوج ہوکر مر گیا۔ شائستہ خاں جو اسکے لڑکے کخش الدین کا وزیر تھا بالآخر خود مستقل بادشاہ ہوگیا اور فیروز شاہ کے لقب سے ۶۸۸ھ میں تخت نشین ہوا۔ یہ بادشاہ بڑا ذی علم اور امیر خسرو کا بڑا قدردان تھا بڑی بات یہ تھی کہ شاعرانہ باریکیوں اور نزاکتوں کو خود بھی خوب سمجھتا تھا۔ اسکے زمانہ میں امیر خسرو مالا مال ہوگئے۔ انکے بے تکلف دوستوں میں چار

شخص قابل ذکر ہیں - برادر حقیقی تاج الدین زاہد - برادر علاؤالدین علیشاہ - مولانا شہاب الدین قاضی سراج الدین
یہ شرف قبول کم مصنفین کو نصیب ہوا ہی کہ اُنکی تصانیف خواص و عوام میں مقبول ہوں - مگر یہ وصف حضرت
امیر خسرؒو کا حصہ ہی اگر انکی بعض تصانیف مقتدر علما کی حرز جان ہیں تو بعض ایسی بھی ہیں جو بچہ بچہ کی
وردِ زبان ہیں - اسکی نظیر تحفۃ العراقین اور خالق باری - جو تبحرّ اور جامعیت خدا نے آپ کو عطا کئے تھے وہ
ہر ایک کو نصیب نہیں ہوا کرتے - خمخانہ جاوید میں حضرت امیر خسرؒو کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں کسی معافی نامہ
یا تمہیدی مقدمہ کی ضرورت نہیں - پہلا دیوان اردو بار ریختہ میں چاہیے کسی کا ترتیب دیا گیا ہو لیکن اسمیں
کسیکو شک نہیں ہوسکتا کہ پہلا شعر اردو کا پہلی تصنیف اردو کی امیر خسرؒو کی عالی دماغی کا مولود ہی - اُنہوں نے
آیندہ اُردو کے عنصر انتخاب کیئے - مسالہ جمع کیا - ارکان مہیا کیئے اور ایک ڈھانچا بنا کے دکھا دیا -
غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اکثر پہیلیوں اور بیتوں (دوہوں) کی زبان ایسی صاف اُردو ہی کہ متقدمین
ریختہ کی زبان سے صاف ملتی ہی - المختصر امیر خسرؒو اگرچہ سب سے اوّل صاحب دیوان اردو کے نہیں مگر
اوّل اُردو شعر کے موزوں کرنے والے ہیں - اور اُردو شعر کے موجد ہونے کی حیثیت سے ہم
انھیں خمخانۂ جاوید کا پیر مغاں تسلیم کرتے ہیں -

کوئی شخص تحقیق اور صحت سے اُن کی تصانیف کی فہرست یا تعداد نہیں بتا سکتا مشہور ہی کہ
شاہانِ مغلیہ کے کتب خانہ میں ایک لاکھ اشعار سے زائد اُنکے موجود تھے مگر اُسپر بھی گاہ گاہ نیا کلام
شائقین تلاش کرکے لے آتے تھے - حضرت کا قول تھا کہ ہندوستانی اسقدر طباع ہیں کہ
معمولی کوشش سے ہر ملک کی زبان - محاورہ اور نظم و نثر کہنے میں استعداد کامل پیدا کرسکتے
ہیں اور برخلاف اسکے ایران عرب توران کے ہزارہا آدمی ہندوستان آئے کسیکو ہندوستانی
زبان بولنی یا لکھنی نصیب نہ ہوئی -

امیر خسرؒو کو باوجود انتہائے کمال اور کثرت مشق اپنے کلام کو جمع اور مرتب کرنے کا بالکل خیال
نہ تھا چنانچہ دیوان عالم صغر سنی یعنے ۱۹ سال کی عمر تک کا کلام جسکا نام تحفۃ الصغر ہی اُن کے بھائی
تاج الدین نے مرتب کیا اور بڑے اصرار سے اُسپر دیباچہ لکھوا کر مکمل کیا اسی طرح علاؤالدین علیشاہ

کاتب کے بعد اصرار سے دو ہفتہ کی محنت میں وسط الحیوٰۃ اور غرۃ الکمال دیوان دوم و سوم مدون ہوئے اور دیباچوں سے آراستہ کئے گئے۔ اس بیان میں امیر خسرو فرماتے ہیں کہ مثنوی قران السعدین بھی شامل کردی گئی تھی۔ گویا مثنوی مذکور ۳۴ برس کی عمر میں امیر خسرو نے تالیف فرمائی تھی معمے کی تصنیف میں جو جو ایجادیں اور اختراعیں کی ہیں ان کا بھی بالتفصیل ذکر دیباچہ میں کر دیا خود فخریہ لکھتے ہیں کہ میرے زمانہ سے پیشتر فارسی میں تین دیوان کسی نے ہندوستان میں نہیں لکھے کچھ عربی اشعار بھی اُس میں شامل کئے ہیں۔

امیر خسرو صاحب تصانیف کثیر تھے وہ سب فارسی زبان میں ہیں اور مستند سمجھی جاتی ہیں مثل خمسہ امیر خسرو بجواب خمسۂ نظامی و قران السعدین۔ ہاں اردو ہندی سے متعلق جو اشعار انکے مشہور ہیں اور جا بجا دیکھے گئے وہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ زبان کے ابتدائی زمانہ میں الفاظ کی کمی کے سبب ادائے مطلب میں جو دقت واقع ہوتی ہے اسکو سب جانتے ہیں۔ مجبوراً دوسری زبانوں کے الفاظ بکثرت لانے پڑتے ہیں چنانچہ یہی کیفیت حضرت امیر خسرو کے اس کلام میں موجود ہے جو اردو کہا جاتا ہے۔

ایک غزل میں جو زیادہ مشہور ہے اسمیں تو یہ التزام کیا ہے کہ ایک مصرع فارسی زبان میں ہے اور دوسرا اردو میں۔ اس صنعت کو غالباً اہل فارس صنعتِ ملمع کہتے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

زحالِ مسکیں مکن تغافل دُرائے نیناں بنائے بتیاں ‎ ‎ کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چو عمر کوتاہ ‎ ‎ سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں ‎ ‎ کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ز مہر آں مہ بگشتم آخر ‎ ‎ نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں
بحقِ روزِ وصالِ دلبر کہ داد مارا فریب خسرو ‎ ‎ سپیت من کے درائے رکھوں جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں

لال کی پہیلی

اندھا گونگا بہرا بولے گونگا آپ کہائے ‎ ‎ دیکھ سفیدی ہوت انگارا گونگے سے بھڑ جائے
بانس کا مندر واہ کا باشا باسنے کا وہ کھاجا ‎ ‎ سنگ ملے تو سر پر رکھیں واہ کو راؤ راجا

سی سی کرکے نام بتایا تا میں بیٹھا ایک	اُلٹا سیدھا ہر پھر دیکھو وہی ایک کا ایک
بھید پہیلی میں کہی تو سُن لے میرے لال	عربی ہندی فارسی تینوں کر و خیال

ناخن کی پہیلی

بیبیوں کا سر کاٹ لیا	نہ مارا نہ خون کیا

خضر

خضر۔ صاحب عالم مرزا خضر سلطان خضر فرزند ارجمند حضرت بہادر شاہ بادشاہ دہلی کا تخلص ہے فن شعر میں نواب اسد اللہ خان غالب المعروف بہ میرزا نوشہ کے شاگرد تھے۔ انکا کلام آشوب غدر میں تلف ہو گیا۔ غدر میں انکی عمر چھبیس سال کی تھی لفٹنٹ ہاڈسن نے جو انہیں مقبرۂ ہمایوں سے شہر لا رہا تھا رستہ میں انکا رتھ ٹھیرا کر متقبل موجودہ جیلخانے کے بضرب گولی انکا کام تمام کر دیا۔ مرزا ابوبکر انکے بھتیجے اور مرزا مغل بھائی نے بھی موت میں انکا ساتھ دیا۔ مرزا خضر سلطان صاحب اولاد تھے لڑکا مرزا عثمان اختر کئی برس ہوئے انتقال کر گیا۔ لڑکی میرزا مجاہد الدین شاہی خلعت مرزا مغل سے منسوب تھیں۔ شعر اچھا کہتے تھے اور تلاش مضامین والفاظ بھی بُری نہیں تھی نشستِ الفاظ بھی درست ہے البتہ کہیں کہیں پُرانی زبان برت جاتے ہیں

مانا کہ ستم تم نہیں کرتے ہو کسی پر	غیروں پہ کرم ہو یہ ستم بھی نہیں تھوڑا
لہو میں میرے رنگیں ہوں اگر دیکھوں تو دیکھوں	اُنہوں کے ہاتھ پر رنگِ حنا دیکھا تو کیا دیکھا
نہ کہہ سکتے ہیں کچھ اپنی نہ سن سکتے ہیں کچھ میری	ہمیں اس وقت میں اے بیوفا دیکھا تو کیا دیکھا
جام جمشید کو آئینہ سکندر کو ملا چھٹوں کس طرح پھندے سے بتوں کے کہتے ہو کہ اک روز تجھے قتل کرینگے کہتے ہو وہ بھی ہوس پیشہ ہی جیسا تو ہے گالی سے کون خوش ہو مگر حُسنِ اتفاق	خضر میں وہ ہوں کہ حصہ میں مرے دل آیا مجھے کچھ بن نہیں آتی خدایا پر یہ بھی تو اے شوخ ستمگر نہیں ہوتا مجھ سے اِک چھیڑ ہوئی شکوۂ عدو کا تھا جو تیری خوشی تھی وہ ہی میرا مدعا ہوا
تری خاکِ کفِ پا سے نہ بدلوں	کوئی دے گر مجھے اکسیر آکر

ہُوں جو بھیگے ہوئے شراب کے پھول	میکشوں کے مزار پر رکھنا
اے بتو بندۂ خدا ہیں ہم	ظلم ہم پر ذرا سمجھ کے کرو

خضر شیخ محمد یوسف شاگرد جان صاحب نواب کلب حسین خاں نادر کے تذکرہ سے کلام نقل ہوا اغلب کہ یہ خضر اور انکے بعد جن کا ذکر ہے ایک ہی صاحب ہوں۔

ایسے کلمے تو حضور آپنے فرمائے بہت	وعدۂ وصل کے دن ہجر میں ٹھیرائے بہت
ایسے تو کاسۂ سر ہمنے ہیں ٹھکرائے بہت	بولے جھنجلا کے ہیں پاؤں پہ گرا جب اُنکے
ساتھ کوسوں مرے یارانِ وطن آئے بہت	شہر سے موسم گل میں جو میں وحشی نکلا
یاد آئیگا یہ جاں باز ہمیں ہائے بہت	فاتحہ پڑھکے مری قبر پہ غیروں سے کہا

خضر - بابو شیخ محمد یوسف مرحوم خلف شیخ کریم بخش مولوی - مقیم سہارنپور کے شاگرد اور فارسی میں اچھی استعداد رکھتے تھے اور کسی قدر انگریزی کی بھی مہارت تھی۔ سہارنپور میں ایک انگریزی کارخانہ گنّے پیلنے کا تھا اُس میں عرصۂ دراز تک کلرک رہے۔ مرنج مرنجان - شریفانہ مزاج پایا تھا۔ پہلے یوسف تخلص کرتے تھے آخر میں خضر اختیار کیا سنہ ۱۹۰۸ء میں کتب دینیہ کی کما حقہٗ مُطالعہ اور مناظرہ کے بعد آبائی مذہب سنت جماعت کو ترک کر کے شیعہ ہو گئے اور آخر عمر تک اس کا اعلان کرتے رہے سنہ ۱۹۱۵ء میں بعمر ۶۳ سال انتقال کیا۔ کچھ اشعار سہارنپور سے ایک عنایت فرمانے بھیجے وہ درج کیئے جاتے ہیں +

وہ زاہدوں کے گنبدِ دستار نے کیا	جو مکر و فن فلک سے ہُوا تھا فرو گذاشت
وہ پیری میں ہمیں اب دور سے رستہ بتاتے ہیں	جوانی میں جو رہبر تھے ہمارے ولولے ہر دم
دُہائی ہے خدا و ندا یہ بت ناحق ستاتے ہیں	غلافِ کعبہ پکڑے خضر کوئی رات کہتا تھا
غیر ممکن ہے کہ تلوار سے جو ہر چھوٹے	کس طرح خوئے وفا تجھسے ستمگر چھوٹے
شیشہ پہلو سے مرے ہاتھ سے ساغر چھوٹے	جب تلک دم ہے مرے دم میں یہ ممکن نہیں ہے

خطا دہلوی - اِن کا حال صرف اتنا معلوم ہے کہ سنہ ۱۸۵۷ء کے قریب جب یہ غزل مرزا قربان علی بیگ

سالک نے دہلی کے مشاعرہ میں پڑھی تو انھوں نے اُسپر مصرعے لگائے تھے جو بہت چست اور انکی خوش مذاقی کا کامل ثبوت ہیں۔

یا وہ گو غیر ہیں اپنا تو یہ دستور نہیں پر ابھی مرگ کا خواہاں دلِ رنجور نہیں	جان دینے میں ہمیں عذر کچھ اسکے سوا نہیں ترکِ کیفیتِ دنیا ہمیں منظور نہیں

ورنہ اک دم میں پہنچتے ہیں عدم دور نہیں

خط لکھا تھا پئے تسکین دلِ خانہ خراب اب نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے نہ آنکھوں میں ہے خواب	اور بھی کردیا کمبخت کو میں نے بیتاب کیا کہوں حالتِ بیتابیٔ اُمیدِ جواب

کوئے جاناں میں چلا جاؤں یہ مقدور نہیں

خطا۔ جناب شفقت حسین صاحب ۱۸۹۹ء میں چھاؤنی سیمبری میں موجود تھے زیادہ حال معلوم نہ ہوسکا

وصل میں بھی نہیں ہوتے ہیں مزے یہ حاصل ایسا پتھر کا جگر لاؤں کہاں سے یارب	لذتیں دردِ جدائی کی جو پاتا ہوں میں عیش میں شاد نہ ہو درد میں ناشاد نہ ہو
کسی کافر ادا کا جب سے اسنے تیر کھایا ہے میں تم کو مفت دیڈالوں جو آمادہ ہوئے لینے پر	دلِ بسمل نے پہلو میں مرے محشر اُٹھایا ہے یہاں تک اس دلِ آفت طلب نے اب ستایا ہے

خطیر۔ مولوی سید امراؤ علی ولد میر امیر علی فرخ آبادی ۱۳۰۲ء میں ۲۵ برس کی عمر تھی اوائل سن تمیز سے شعر کہتے ہیں طب میں بھی دخل ہے فن شعر میں امداد حسین خاں صفیر سے فیض پایا ہے۔ یہ انکا کلام ہے۔

لحد کو غیر کوئے یار میں کب دیکھ سکتے ہیں تلاش کوچۂ دلبر میں پائے شوق تھکتے ہیں یہ ظاہر موم ہیں پوچھو نہ ان کی سختیٔ باطن آج غصہ میں وہ زنداں کی طرف آتا ہے اپنے دامن سے مرے منہ کو چھپالے قاتل میرے اخلاط میں ہے زلفِ سیہ کا سودا	مری تربت کے پتھر اُنکی آنکھوں میں کھٹکتے ہیں پتہ ملتا نہیں دیر و حرم میں ہم بھٹکتے ہیں یہ آہن دل ہیں جنکے رنگ کندن سے دمکتے ہیں بیڑیاں پاؤں میں بولیں تو قیامت ہوگی دیکھ کر دیدۂ مذبوح کو حسرت ہوگی جب پری زاد نظر آئیں گے وحشت ہوگی

دَور موقوف نہ ہوگا ستم ایجادوں کا	حشر تک روز ملنے ہیں قیامت ہوگی
یار اُٹھ جائے گا پہلو سے جو گھبرا کے خطیر	حشر میرے لیے صبح شبِ فرقت ہوگی

خلش

خلش منشی جگیشر پرشاد خلف منشی کاشی ناتھ متوطن سیرامپور ندرہ ضلع گیا آپ کو مولنا عبدالرؤف عشرت لکھنوی سے تلمذ ہے۔ بابو ٹھاکر پرشاد وکیل کے ہاں بالفعل محرر ہیں کچھ کلام بھیجا تھا اُس میں سے یہ چند شعر منتخب ہوئے۔ ابتدائی شوق ہے۔

کاٹ لے سر خلش کا ای قاتل	آج ہو جائے فیصلہ دل کا
شبِ وصل وہ لب پر خفا ہو گیا	الٰہی یہ کیا ماجرا ہو گیا
ہائے اسپر بھی تجھے رحم نہ آیا افسوس	مل گئے خاک میں ہم نقش کفِ پا ہو کر
رقص بسمل کی تڑپ اُنکو خلش دکھلاؤ	آج بیٹھے ہیں وہ مشتاق تماشا ہو کر
آہ میں ہو اثر تو پھر کیا ہے	آئیں وہ میرے گھر تو پھر کیا ہے

خلش

خلش ۔ مولنا خواجہ سید کرامت علی صاحب خلش۔ آپ سید خواجہ نظام الدین علی صاحب گورنمنٹ پلیڈر کے حقیقی بھتیجے اور اولاد حضرت خواجہ اجمیر سے ہیں تیرہ برس کی عمر سے شوق شاعری ہوا۔ ابتدا میں حضرت ابوالحسن صاحب ساکت رامپوری سے غزل میں مشورہ کیا کرتے تھے دو سال بعد صلاح لینی ترک کر دی۔ پھر چند غزلیں نواب عبداللہ خاں مطلب کی تحریک سے نواب فصیح الملک مرزا داغ کو دکھائیں کشتی بدن تھا اور ورزش کا بھی شوق تھا۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں حکیم مومن خاں مؤمن دہلوی کا مقلد ہوں اور انہیں کو اپنا اُستاد مانتا ہوں۔ نواب محمد ابراہیم علی خاں صاحب بہادر والئ ٹونک نے آپکے ذہن رسا کی تعریف سُنکر آپ کو زمرۂ اُستادان سخن میں داخل کر لیا ٹونک اور اجمیر میں زیادہ تر قیام رہتا تھا۔ معاملہ بندی۔ روزمرہ۔ شستگی زبان نشست الفاظ آپ کا حصّہ تھا۔ شوخ مزاجی طبیعت میں خلقی تھی۔ الغرض مشق سخن قابل تعریف تھی۔ ۴۰-۴۲ سال کی عمر میں ۱۳۱۹ھ میں انتقال کیا۔ بیس پچیس شاگرد بھی تھے دیوان تیار تھا۔ مگر شائع نہیں ہوا کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

مجھکو کسی نے بھیجے تھے کل یاسمن کے پھول
پھولوں میں آ پڑے ہیں میرے بدن کے پھول
دلمیں کھٹک رہی ہے خلش دوستوں کی یاد
کیا گھٹاؤں سے دھواں دھار ہیں ساون بھادوں
قتل کرتے مجھے بے یار ہیں ساون بھادوں
مینہ برستا ہے ترستے ہیں وہ گھر جانے کو
ابر دوڑا ہوا جاتا ہے سوئے میخانہ
ابرِ نیساں ہے خلش دستِ گہر بار خلیل
ہم بزم میں صرف انکی نظر دیکھ رہے ہیں
اب بزم میں انکو بھی نہیں دیکھتا کوئی
بیٹھے ہیں مرے پاس مگر دل میں خلش ہے
قصور اس میں تمہارا کچھ نہیں ہے بے خطا تم ہو
مجھے اب کچھ نہیں معلوم ہے کیا اور کیا تم ہو
برا ہوتا ہے ہر اک بات کا حد سے گذر جانا
کھڑے تھے میکدے میں منہ چھپائے حضرتِ زاہد
وہ رشکِ غیر پر بولے طبیعت اپنی اپنی ہے
برابر کی محبت میں یہی تو حال ہوتا ہے
شبِ وعدہ پڑیگی بات پھر آخر کشاکش میں
تعلق اٹھ گیا جس روز سے دونوں کے مر میں ہیں
وعدہ کر جاؤ مرے دل کے بہلنے کے لیے
تعلق ہی نہیں باقی تو پھر میری شکایت کیوں

تلووں سے اسنے مل دیئے مارے جلن کے پھول
مرجھائے بھی نہیں ہیں ابھی تو کفن کے پھول
کانٹے سے بنے ہوئے ہیں سفر میں وطن کے پھول
روزِ روشن میں شبِ تار ہیں ساون بھادوں
کوئی چلتی ہوئی تلوار ہیں ساون بھادوں
ابتو کچھ میرے طرفدار ہیں ساون بھادوں
کھل گیا صاف کہ میخوار ہیں ساون بھادوں
بخشش و فیض میں سرکار ہیں ساون بھادوں
کچھ اس سے نہیں بحث کدھر دیکھ رہے ہیں
آپس میں سب اک اک کی نظر دیکھ رہے ہیں
گھبرائے ہوئے جانبِ در دیکھ رہے ہیں
نہ یوں محوِ وفا میں ہوں نہ سرگرمِ جفا تم ہو
تمہارا مدعا میں ہوں کہ میرا مدعا تم ہو
نہ اتنا باوفا میں ہوں نہ اتنے بے وفا تم ہو
بڑی مشکل سے پہچانا تمھیں مردِ خدا تم ہو
کسی پر مبتلا ہم ہیں کسی پر مبتلا تم ہو
کبھی تم سے خفا ہم ہیں کبھی ہم سے خفا تم ہو
ہم اپنی وضع کے پابند پابندِ حیا تم ہو
نہ تم سے ہمنوا ہم ہیں نہ ہم سے ہمنوا تم ہو
سیکڑوں حیلے ہیں پھر وقت پہ ٹلنے کے لیے
تمہیں مطلب نہیں مجھ سے تو پھر میرا گلہ کیوں ہے

وہ میرے قتل پہ نیار خوش کرنیکو دشمن کے	اُسے یہ غم کہ اُسکے ہاتھ سے اسکی قضا کیوں ہے

خلش ۔ فردوس علی خلش عزیز و شاگرد عبدالحکیم بسمل مندرجہ ذیل اشعار ایام نابالغی ہیں ایام غدر میں زندہ تھے

اُس سے مل مل کے دلا دیکھ تو کیا کیا ہوا	ہم کو کیا تیرے ہی کچھ حق میں یہ اچھا نہ ہوا

کچھ اثر نقانہ آہ سے مقصود	یہ بھی اک طبع آزمائی تھی
ضعف سے لب پہ تھم گئے نالے	ورنہ آفت فلک پہ آئی تھی
کیا مزے سے خلش گذرتی تھی	جبکہ اُس بُت سے آشنائی تھی

خلش ۔ منشی نصیر الدین کاتب خلش باشندہ میرٹھ ۔ شاگرد منشی احمد حسن شوکت چند شعر انکی طبع زاد درج کئے جاتے ہیں

نصیحت کا اثر واعظ تری مجھ رند پر کیا ہو	جو دختِ رز پہ مرتا ہو وہ کیا حوروں پہ شیدا ہو
لبِ زخمِ جگر بوسہ اگر لیں تیغِ بُرّاں کا	ہمارے خوں بہانے کا اُنہیں خاصا بہانا ہو
گلوئے تشنہ کامانِ شہادت کام آجائے	اگر خونِ تمنّا کا لبِ خنجر کو چسکا ہو

خلش ۔ منشی محمد حسام الدین سب انسپکٹر پولیس حسن گنج وانا وُ ارمغان ۹۳ سے یہ کلام منتخب ہوا۔ احسان شاہجہاں پوری کے تلامذہ میں ہیں۔

جسنے دیکھا گر پڑا مثلِ کلیم	جلوۂ رُخ اُن کا برقِ طور تھا
منہ کی کھائی حشر کے دن شیخ نے	زہد و طاعت پر بہت مغرور تھا
دل وہ اچھا جس میں تیرا غم رہے	دم وہ اچھا جس کا تو ہمدم رہے
وصل کی شب میں حیا آنے نپائے	شوخ چشمی کا وہی عالم رہے
اے خلش دل میں کھٹکنے کے لئے	یادِ مژگاں بن کے خارِ غم رہے

خلق ۔ میر حسن علی خلق خلف الرشید میر حسن صاحب بدر منیر مقیم فیض آباد لکھنو اپنے والد مرحوم کے شاگرد صاحب دیوان تھے۔ ترتیب تذکرۂ شوق کے زمانے میں وجیہ و خوبرو جوان تھے خاندانی رسم کے بموجب مرثیہ کہتے تھے۔ میر خلیق انکے حقیقی بھائی تھے ۱۲۰۳ھ کے بعد سو برس کی عمر میں وفات پائی ؎

خلش

خلش

خلق

عجب عالم میں بے ہوشی کے وہ مجھکو نظر آیا
کہ اتنا بھی نہ آیا ہوش جو پوچھوں کدھر آیا
بیقراری میں کٹی رات تو یاں اپنے تئیں
چین سے زلف میں دل کیونکر رہا ہو ویگا
دل لگاتے تو لگا یا یہ نہ تھا کچھ معلوم
جی پہ کیا گذریگی اور جان پہ کیا ہو ویگا

خلق

خلق منشی محمد مستجاب خاں نام اصل وطن انکا قاسم گنج ضلع فرخ آباد ہے عرصہ سے بصیغۂ ملازمت سرکار نظام حیدر آباد دکن باقاعدہ فوج میں ملازم ہیں پہلے اضلاع دکن میں متعین تھے اب چند سال سے خاص بلدے میں مامور ہیں قریب ۴۵ سال کے عمر ہے خلیق اور نیک آدمی ہیں۔ فن سخن میں حضرت داغ دہلوی مرحوم کے شاگرد ہیں اکثر اپنے استاد مرحوم کی خدمت میں حاضر رہے شعر خاصا کہتے ہیں۔ اپنے استاد کے رنگ کی اچھی طرح تقلید کرتے ہیں مشاقی اعلیٰ درجے کی ہے زبان کی صفائی سلاست اور ستھراپن انکے کلام میں پایا جاتا ہے۔ یہ انکے کلام کا انتخاب ہے۔

اسکی نظروں سے وہ بچنا بلبل ناشاد کا
آڑ میں سے تاکنا چھپ چھپ کے وہ صیاد کا
صبر بھی اور صبر مجھسے عاشق ناشاد کا
ظلم بھی اور ظلم پھر تجھ سے ستم ایجاد کا
عیش زیبا ہے تمھیں غم زیب دیتا ہے اُسے
وہ تمھارا ہے تو یہ حصہ دل ناشاد کا
عاشقی کا لطف جب ہو دل بھی ہوں عاشق کے دو
ایک طالب وصل کا ہو ایک ہو بیداد کا
لو رہا وہ امتحاں میں سخت جاں ثابت قدم
لو وہ آخر ہو گیا دم خنجر فولاد کا
خلق کا اب پاؤں قابو میں دل کہنے میں ہے
ہاتھ لینا میرے مولا وقت ہے امداد کا

کاکل میں ہے گیسو میں ہے مٹھی میں تری ہے
دنیا میں مرے دل کا ٹھکانا ہی نہیں اور
مژگاں تری سفاک نگاہیں تری خونریز
پھر اسپہ نمک پاش یہ حسن نمکیں اور
اقرار میں اک گھات تو انکار میں اک بات
دیتی ہے مزا آپ کی ہاں اور نہیں اور
جاتے ہیں مسافر جو شب و روز عدم کو
بستی کوئی بستی تو نہ ہو زیر زمیں اور
خزاں رہی تو تڑپتے تھے بیقرار سے ہم
بہار آئی تو شوریدہ ہیں بہار سے ہم
وہ دل گیا وہ اُڑے ہوش وہ گئے اوسان
سنبھالنا کہ چلے اپنے اختیار سے ہم

یہ چشمِ مست کی اُلفت نے کر دیا بیخود — کہ خود بیخود نظر آتے ہیں بادہ خوار سے ہم
عاشق کی زندگی ہے سہارے کی زندگی — اُمید چاہیئے دلِ اُمیدوار میں
کیا بات ہے تری نگہ ناز واہ واہ — عاشق کا کام کر ہی دیا ایک وار میں

ڈھونڈے کوئی بے مثل اگر حسنِ بشر میں — وہ کھُبتے ہیں آنکھوں میں وہ چھُبتے ہیں نظر میں
اُس مہرِ منور کی قیامت ہے تجلی — بجلی کی طرح کوندتی پھرتی ہے نظر میں
تمھیں پروا کسیکی کیا کہ تم ایسے ہو خوش قسمت — وہی ملتا ہے جو مانگو وہی ہوتا ہے جو چاہو

بے خبر ہے حُسن کے انداز سے — آنکھ ہے اُس کی نشیلی ناز سے

قیامت ہی ترے کوچہ میں تیری دلربائی سے — بپا ہے شورِ محشر کُٹنے والوں کی دہائی سے
رُخِ روشن ہے آئینہ قدِ موزوں ہی بالا — زمانہ محوِ حیرت ہے کسی کی خودنمائی سے

سُرخ ڈوروں میں نگاہِ یار ہے — خون میں لتھڑی ہوئی تلوار ہے
اور کس کا میرے دل پر وار ہے — آپ ہیں یا آپ کی تلوار ہے
نگہ ناز ہے تلوار ادا قاتل ہے — اب بھی مشکل نہ ہو آساں تو بڑی مشکل ہے

خلیق مرزا ظہور علی ولد مرزا ہوشدار جو مشہور مرثیہ خوان اور ماہرِ فنِ موسیقیؒ تھے اُردو شعر بھی کہتے تھے محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں حسب طلب نواب نوازش محمد خان شہاب جنگ مرشد آباد کو گئے تھے اور وہ زمانہ اُنکے آغاز جوانی کا تھا۔ سنہ ۱۱۹۹ ہجری میں صوبہ بنگال میں کسی عہدہ پر مامور تھے مرثیہ اچھا کہتے تھے فیلن صاحب نے اُنکا پورا ایک مرثیہ اپنے تذکرے میں درج کیا ہے اور اصنافِ سخن میں سے کچھ نہیں لکھا۔ لہذا اُس مرثیہ کے چند بندوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

خلیق

ہوا صغرا پہ جب ظاہر کہ بابا کا سفر ٹھہرا — مجھی کو چھوڑنا گھر میں اُنھیں مدِ نظر ٹھہرا
یہ سب ہے درمیاں اب کوچ کُنبے کا سحر ٹھہرا — دم اُس بیمار کا غم سے لبوں پر آنکے ٹھہرا

لگیں کہنے الٰہی آج میرا دم نکل جائے
جو بابا کے جدا ہونیکا دل سے غم نکل جاوے

جُدائی مجھ سے بابا جان کی دیکھی نجائیگی
نظر بابا کی صورت جسگھڑی مجکو آئیگی
مری جانِ حزیں ہرگز نہ یہ صدمہ اُٹھائیگی
اکیلی گھر میں یہ دُکھیا پڑی آنسو بہائیگی

تیقن ہے نہ صورت اچھّے ہونے کی کوئی ہوگی
نہ بابا گھر میں آوینگے نہ میری زندگی ہوگی۔

یہ خط کس کا ہے آج آیا مطالعہ جسکو فرماکے
پھوپی زینب کو چپکے سے کہی کیا بات بلواکے
ہوئی تشویش اور آنسو بہے چہرے پہ بابا کے
گئیں حجرے میں کیوں بابا کے امّاجان گھبرا کے

یہ ہے کیا مشورہ ہونا بتادے ہوش جاتے ہیں
سکینہ گود میں بیٹھی ہے اور مجھ سے چھپاتے ہیں

خلیق

خلیق۔ شاعر شیرین زبان میر مستحسن خلیق دہلوی خلف ارشد میر غلام حسن حسن مرحوم برادر خورد میر احسن خلق نے لکھنؤ اور فیض آباد میں تعلیم و تربیت پائی۔ سولہ برس کی عمر سے مشق سخن کا شوق دامنگیر ہوا حسن خلق کی رعایت سے خلیق تخلص اختیار کیا اور مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ انھیں ایام میں میرزا تقی ترقی نے چاہا کہ فیض آباد میں شعر و سخن کا چرچا ہو۔ مشاعرہ قائم ہوا اور خواجہ حیدر علی آتش کو لکھنؤ سے بلوایا پہلے ہی جلسہ میں جو میر خلیق نے غزل پڑھی اُس کا مطلع یہ تھا۔

مثل آئینہ ہے اُس رشک قمر کا پہلو
صاف اِدھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو

آتش نے اپنی غزل پھاڑ ڈالی اور کہا کہ جب ایسا شخص یہاں موجود ہے تو میری کیا ضرورت ہے چند روز کے بعد میر حسن اُنکے والد نے قضا کی۔ عیال کا بوجھ انکے سر آپڑا اور شعر شاعری کے خیالات پست ہوگئے بڑے پُرگو تھے۔ غزلیں بیچا کرتے تھے اِس پر بھی دیوان مکمّل کر لیا تھا۔ مگر اُسے رواج نہیں دیا۔ تمام عمر مرثیہ گوئی میں بسر کی میر ضمیر اور میرزا فصیح مرثیہ گو انکے ہمعصر تھے۔ میر خلیق کے ادائے کلام اور پڑھنے کی خوبی دیکھنے اور سننے کے قابل تھی۔ خوبی محاورہ اور لُطف زبان جو انکے مرثیوں میں پایا جاتا ہے وہ انکے ہمعصروں کے کلام میں مفقود ہے۔ لکھنؤ میں انکی اور انکے تمام گھرانے کی زبان محاورے کے لحاظ سے مستند سمجھی جاتی تھی۔

ہر چند چاہا کہ کلام دستیاب ہو مگر انکے عزیزوں کی لاپرواہی سے مجبور ہو کر پرانے تذکروں سے کچھ اشعار انتخاب کرکے درج کیے گئے ؛

غفلت میں فرق اپنی تجھ بن کبھو نہ آیا — ہم آپ میں نہ آئے جب تک کہ تو نہ آیا

اشک جو چشم خوں فشاں سے گرا — تھا ستارہ کہ آسماں سے گرا

مجرائی طبع کند سے لطف بیاں گیا — دنداں گئے کہ جوہر تیغ زباں گیا

گذری بہار عمر خلیق اب کہیں گے سب — باغ جہاں سے بلبل ہندوستاں گیا

کہا میں نے جو اے گل کچھ وفا کر — تو وہیں ہنس پڑا وہ کھل کھلا کر

ہے حسن ترا مہر درخشاں کے برابر — دنداں در و لب لعل درخشاں کے برابر

کیا چاہیئے عاشق کے تجھے قتل کو خنجر — ابرو ہیں ترے خنجر براں کے برابر

جس گھڑی تم کو نہیں پاتے ہیں ہم — جی ہی جی میں اپنے گھبراتے ہیں ہم

کسکے خرام ناز کا پامال ہوں خلیق — لگتی ہے چوٹ دلکو مرے ہر قدم کیساتھ

مرغان قفس کرتے ہیں سب نغمہ سرائی — کیا فصل بہاری کی چمن سے خبر آئی

گلشن میں یہ کس شخص کا ہے ڈھیر کہ بلبل — منقار میں لیجا کے کئی پھول دھر آئی

مدت سے بہم رہتے تھے جس گھر میں ہم اور یار — اب دیکھ کے وہ خالی مکاں آنکھ بھر آئی

کیا پوچھتے ہو حال اسیران قفس کا — گلشن سے جو بیخود ہو نسیم سحر آئی

ایسا تو جہاں میں کوئی ہووے گا نہ رسوا — آفت جو خلیق جگر افگار پر آئی

دل میں تھا آتے ہی اسکے جا ملیں لگ آغوش سے — جب وہ آیا سامنے تب رہ گئے خاموش سے

خلیق

خلیق - جناب منشی ارشاد حسین صاحب خلف حاجی محمد امداد حسین صاحب صفیر مرحوم رئیس فرخ آباد ۱۸۸۵ء کے قریب زندہ و سلامت موجود تھے بعد کا حال معلوم نہیں یہ کلام کا نمونہ ہے

سمجھے تھے جسکو دوست وہ دشمن نظر میں ہے — امید خیر کیا ہو کہ شر ہر بشر میں ہے

تاثیر جس کا نام ہے وہ اے شب فراق — آہ سحر میں ہے نہ دعائے سحر میں ہے

دیکھیں ہم اور پھولوں کو کیا محوِ چشم ہیں
نرگس کا پھول تہِ نظر باغ بھر میں ہے
انصاف کر کہ ہم کسے چاہیں ترے سوا
تو ہی بتا کہ ناز پری کس بشر میں ہے

خلیق

خلیق - جناب محمد نصر اللہ خاں صاحب باشندہ حسن پور تلمیذ جناب امیر لکھنوی ان کا کچھ حال باوجود تلاش میسر نہ ہوا ناچار اندراج کلام پر اکتفا کیا گیا ؛

آئی نظر کسی کی جو ترچھی نظر مجھے
دل کی خبر رہی نہ جگر کی خبر مجھے
ممکن نہیں کہ چھوڑ دے دردِ جگر مجھے
رہنے دے اب خدا پہ ہی ای چارہ گر مجھے
اے رفتگانِ راہِ عدم پھر بھی آئیو
کچھ پوچھنی ہے تم سے عدم کی خبر مجھے
نہ ہوتے ہم جو رسوائے زمانہ
یہ شہرت آپ کی ہوتی کہاں سے

خلیق

خلیق - عالیجناب راجہ دیبی داس صاحب سوم تعلقدار پائگاہ حیدرآباد کے امرائے عظام میں سے ہیں منشی حفیظ سے تلمذ ہے۔ دو شعر نتائج افکار سے درج کیے جاتے ہیں ؛

یوں تو اک روز تجھے آنا ہی ای موت ضرور
گر شب ہجر میں آجاتی تو احسان ہوتا
بڑھ گئی مرہم کافور سے سوزش دونی
کاش زخموں پہ مرے وہ نمک افشاں ہوتا

خلیق

خلیق - جناب منشی محمد خلیق صاحب ساکن بٹاوہ ضلع خاندیس۔ آجکل کے شاعروں میں ان کا شمار ہے رسالوں میں غزلیں شایع کراتے رہتے ہیں اُن میں سے چند شعر انتخاب ہوئے۔ کوئی خاص بات قابلِ ذکر انکے کلام میں نہیں ہے ؛

آج کوئی آنے والا ہے ضرور
یہ پتا بے تابئ دل سے ملا

قاصد نے اُسکی نوک پلک کا کیا جو ذکر
نشتر سا ہائے میرے جگر میں چبھو گیا
لایا نہ کچھ جواب ہمارے سوال کا
قاصد ہمارا جا کے اُدھر ہی کا ہو گیا
اے بیکسی بہائے ہیں کتنے یہ چار اشک
آکر مرے مزار پہ یہ کون رو گیا
رسوا ہوا ذلیل ہوا تیرے عشق میں
جو کچھ مرے نصیب میں ہونا تھا ہو گیا
سکھے گا کون مسیحا تجھے زمانے میں
مریضِ عشق کا جب کچھ تجھے خیال نہیں

جو مرشتوں کا ذرا بھی تمھیں خیال نہیں	ہمیں بھی جائیے اب حسرت وصال نہیں
گلی میں ماہ رخوں کی نجاؤ حضرتِ دل	بتائے دیتے ہیں اچھی یہ دیکھ بھال نہیں

خلیق

خلیق منشی عبدالخالق دہلوی کسی پنجابی سوداگر کی دوکان پر ملازم ہیں۔ استعداد علمی بہت معمولی ہے مگر شاعری کا شوق حد اعتدال سے متجاوز ہے۔ جو کچھ آمدنی ہوتی ہے اُس کا کثیر حصہ اِس فن کے شوق کی نذر کر دیتے ہیں۔ سائل صاحب اور منشی چندربھان کیفی انکے اُستاد ہیں۔ اور شعرا سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ قابلِ قدر رسالوں میں کئی نظمیں انکے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ ان نظموں میں تاریخی مضامین ایسی جامعیت اور قابلیت سے سلسلہ وار لکھے گئے ہیں، جن سے اِنکے مصنف کی علمی استعداد، اور واقفیت عامہ کے متعلق اچھی رائے قائم کی جا سکتی ہے اور مشقِ سخن بھی پختگی اور سنجیدگی کا پہلو لیئے ہوئے ہے۔ واقعات کا تسلسل بہت خوبی سے دکھایا ہے اور روانی قابلِ تعریف ہو۔

ڈر تو یہ ہے جو بدل لے وہ ستمگر آنکھیں	اُلٹی چھریاں کہیں ہو جائیں نہ پھر کر آنکھیں
یہ تماشا ہے نیا صُلح بھی ہے جنگ بھی ہے	دل ملے پر بھی لڑا کرتی ہیں اکثر آنکھیں
کہتے ہیں مجھپہ مرتی ہے دنیا تو کیا عجب	ایسا کوئی جہاں میں طرحدار بھی تو ہو
کہتا ہے مجھ سے داورِ محشر کے رُوبرو	دل سے نکال دعویٔ باطل کی آرزو
ریاکاری میں ساری عمر کردی رائگاں اپنی	جہاں میں جسنے جنت کی تمنا میں عبادت کی
یں جسکو دیکھا دل ہو گیا اُس کا بس آزاہد	نکر تعریف میرے سامنے حورانِ جنت کی
اے فنیس تجکو دشت نوردی سے کیا حصول	لیلیٰ کے دل میں شکل نکال اپنی راہ کی
پامال یوں نہ کیجئے وقتِ خرام ناز	فریاد کچھ تو سُنئے دلِ دادخواہ کی
اُمید و یاس میں دل کا عجب دستور رہتا ہے	کبھی مسرور رہتا ہے کہیں رنجور رہتا ہے
ریاکاری خدا کے گھر میں بھی ای حضرت زاہد	زباں پر نام حق دل میں خیال حور رہتا ہی

نوحۂ وفات نظام

کیا غضب ہے ای اجل دنیا میں کوئی ذی حیات
تیرے دستِ ظلم سے زندہ نہ رہنے پائے ہائے

چشم بد دور اپنے حق میں جو ترے آگے کہے
دیغ و دستہ اُسکو ہی نظر کھا جائے ہائے

کیسے کیسے خاندانوں کو کیا تُو نے تباہ
کیسے کیسے گھر بنے تو نے اُجاڑے ہائے ہائے

نامیوں کے کھوج تک باقی نہ رکھے نام کو
صفحۂ ہستی سے وہ نام و نشاں مٹوائے ہائے

بے گنہ ناداں جواں سب پر پھری تیغِ جفا
یہ ستم یہ ظلم تیرا کِس سے دیکھا جائے ہائے

تھا جو گلدستہ میں ای بادِ فنا چوٹی کا پھول
کیا غضب ہے کیا ستم ہے وہ ہی گل مرجھائے ہائے

جسکے لکھتے تھے قصیدے شاعرانِ ذی شعور
اُن سے نوحے مرثیے اب سکے تو لکھوائے ہائے

سب جسے آنکھوں میں رکھیں آہ وہ ہر دلعزیز
کارواں سے مثلِ یوسف یوں بچھڑ کر جائے ہائے

شادیانے جسکے بجتے اُسکی یہ نوبت ہے آج
پیچھے میت آگے ماتم اُسکا ہوتا جائے ہائے

بین کے نغموں کے بدلے بین کا ہی شور و غل
دھوم سے اُس کا جنازہ یوں اجل اُٹھوائے ہائے

جھاڑتے تھے روز و شب جو اُسکے پاپوش کی گرد
اُسکی میت پر اُنھیں سے مٹی اب ڈلوائے ہائے

فرشِ دیبا کی بھی جسکو سلوٹیں تھیں ناگوار
اُس تنِ نازک کو تو یوں خاک میں ملوائے ہائے

ہاتھ جو بہرِ سلام اُٹھتے تھے جس کے رو برو
آج اُسی کی فاتحہ کو ہاتھ وہ اُٹھوائے ہائے

چھا گئی ہے کیا غم و اندوہ کی دل پر گھٹا
ہے سیہ پوش اُسکے ماتم میں یہ کعبہ ہائے ہائے

قیصری دربار میں جو شوق سے آنے کو تھا
ای اجل اُسکو ہی تو ملکِ عدم پہنچائے ہائے

حشر تک ماتم رہے گا اِس غمِ جانکاہ کا
شاہ آصف جاہ جیسا شخص یوں مرجائے ہائے

سرگذشت دہلی

اُجڑا ہوا نہیں ہے ہرگز دیارِ دہلی
پوچھے ہمارے دِل سے کوئی بہارِ دہلی

ہیں زندہ یادگاریں نقش و نگارِ دہلی
کچھ نام کر گیا ہے ہر تاجدارِ دہلی

تاریخ ذوفنون اِس میں ہندوستان کی ہے
یونان و مصر و فارس سارے جہان کی ہے

بھارت میں جبکہ ڈنکا پانڈو و کل بج رہا تھا
وہ بھیم وہ یدھشتر وہ کرشن سج رہا تھا

کوروں کے دل میں جاکر ارجن گرج رہا تھا
بانکوں کا بانکپن بھی جن سے نہ بچ رہا تھا

اُنکے محل تھے کیا کیا جمنا ترے کنارے
اندر پرست دہلی کہتے تھے تجھکو سارے

بھیشم کے دور دورے کوروں کی حکمرانی
ایسے ہوئے پریچھت کلجگ نے ہار مانی
پھر جنمے جے نے اپنی کی تنیں مار خانی
اب نام اُنکا سُن لو کھنڈرات کی زبانی

حسرت سے کہہ رہے ہیں دالان ٹوٹے پھوٹے
ہمپر بھی نقش کاری ہمپر بنے تھے بیل بوٹے

تجھکو پرانے قلعہ آباد رکھنے والا
دُنیا کے حادثوں سے آزاد رکھنے والا
تعمیر میں نرالی ایجاد رکھنے والا
وہ کون نامور تھا بنیاد رکھنے والا

کیا تجھ میں خوبیاں تھیں کیا شانداریاں تھیں
کس شاہِ ذی حشم کی مہمانداریاں تھیں

دہلی میں راجپوتی لہرا رہا نشاں تھا
اقبال اوج پر تھا ہمدرد آسماں تھا
کروٹ جو ایک بدلی غوری کا آستاں تھا
ڈھنتا تھا سر پتھورا مندر مرا یہاں تھا

چونسٹھ تھے اُس میں کھنبے کھمبوں میں مورتیں تھیں
اِن مورتوں میں کیا کیا عالم کی صورتیں تھیں

مینار قطب صاحب کب سے کھڑا ہوا ہے
کچھ بول چال مُنہ سے کیا تو لڑا ہوا ہے
کیوں سربلندیوں سے اتنا بڑا ہوا ہے
تیری بنا میں کس کا پتھر گڑا ہوا ہے

اے التمش کی مسجد تُو ہی نشاں بتادے
کرتی تھی حکمرانی رضیہ کہاں بتادے

چتوڑ کی لڑائی دولت پہ جان دینا
وہ قوم کی حمیت عزت پہ جان دینا
خلجی کا شوخ چنچل صورت پہ جان دینا
جانباز پدمنی کا عصمت پہ جان دینا

ہیں زندہ داستانیں ہستی رہیگی جب تک
جمنا کنارے دہلی بستی رہیگی جب تک

تغلق نے تخت چھینا قلعہ نیا بنایا
فیروز شہ نے اپنا پھر کوٹلہ بسایا
سنگین لاٹ گاڑی سُکھ سے رہی رعایا
یک لخت قہر کیسا نازل ہوا خدایا

تاتاریوں کو لیکر تیمور لنگ آئے
دلی کے رہنے والے جانوں سے تنگ آئے

لاکھوں کے خوں بہانے کی لوٹ مار کیسی
تیغ دودم ہوئی تھی سینے کے پار کیسی

آہیں نکل رہی تھیں بے اختیار کیسی
بچوں کے واسطے تھی ماں بیقرار کیسی

ایسا نہ دن دکھائے دشمن کو بھی الٰہی!
دہلی کو مدتوں تک جیسی رہی تباہی

وہ خاندانِ لودھی بابر کا چڑھ کے آنا
میدانِ پانی پت میں توپوں کا دندنانا
دیتا تھا جان کیسا آزادیوں پہ رانا
آتا ہے یاد مجھکو اُس وقت کا زمانا

تھی باپ کی محبت بیٹے پہ جان دیدی
مفتوحہ سلطنت کی اُسکو عنان دیدی

کی ہے شہ ہمایوں نے سلطنت ادھوری
زوروں پہ چڑھ رہا تھا جب شیر شاہ سوری
گردش میں تھا نصیبا ہندوستاں سے دُوری
ایرانیوں نے کردی آخر مراد پُوری

بیرم کی جاں نثاری اب تک زبان زد ہے
وہ نیک نام زندہ دنیا میں تا ابد ہے

کیا تربتِ ہمایوں پہ مقبرہ بنا ہے
صفدر کا مدرسا ہے درگاہِ اولیا ہے
طوطیِ ہند نامی خسرو یہیں ہوا ہے
تیرا جہاں آرا سبزہ ہرا بھرا ہے

غالب کی ہے یہیں پر اُجڑی ہوئی نشانی
اُردو لحد کے اُوپر کرتی ہے نوحہ خوانی

درگاہِ قطب صاحب سنگِ مزار دیکھے
شہروں میں پھول دیکھے پھولوں میں خار دیکھے
شاہوں کے جشن کیا کیا پروردگار دیکھے
آخر کو زیرِ تربت سب تاجدار دیکھے

شکھ نیند سو رہے ہیں قبروں میں شاہزادے
بادِ سحر جگا دے بادِ سحر جگا دے

انسان کو جان پیاری جاں کو بدن پیارا
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن پیارا
عاشق کو کوئے جاناں شیریں کو بن پیارا
شاہِ جہاں کو دہلی ہمکو وطن پیارا

رکھیں گے یاد اسکو جیتے رہینگے جب تک
جامِ شرابِ عشرت پیتے رہینگے جب تک

دہلی کے لال قلعہ فردوس کے نمونے
اقبال دوڑتا تھا قدموں کو تیرے چھونے
دربارِ شہ جہانی دیکھا ہے خوب تو نے
پائی تھی کامیابی کس کس کی آرزو نے

کس تخت پر مرصع طاؤس جلوہ گر تھے
فرمانروائے دولت بیٹھے ہوئے کدھر تھے

دیوانِ خاص تیرا دیوانِ عام تیرا
آئین کے موافق ہر انتظام تیرا

شوکت کنیز تیری، رتبہ غلام تیرا
مشہور ہو رہا تھا دنیا میں نام تیرا

انصاف پروری سے دِلّی پَڑی ہوئی تھی
اِس شہر میں اٹاٹٹ دولت بھری ہوئی تھی

ہاں تجھکو جامع مسجد رضواں پہ برتری ہے
عالم فریب منظر انداز دلبری ہے
جب تک ہے حوض جاری اس نام میں تری ہے
نیکی کی جڑ ہری ہے نیکی کی جڑ ہری ہے

جنت میں کیوں نمازی جائیں نماز پڑھنے
دِلّی میں جب فرشتے آئیں نماز پڑھنے

حامئ دینِ احمد اورنگ زیب نامی
ارکانِ سلطنت کی لیتا رہا سلامی
لیکن رہا ہے کس کا جاہ و حشم دوامی
مغلوں کے دبدبہ میں آنے لگی تھی خامی

ایسے سحر سے بیٹھے جلسوں میں شام کردی
اِن عیش جیوڑوں نے ترکی تمام کردی

ایسے ہوئے محمد شاہِ زمان رنگیلے
نقال-بھانڈ کتھک مجرا کریں سجیلے
دربار میں طوائف آنے لگے تھے بے وسیلے
شیشہ کی یہ صدا تھی جام شراب پی لے

رندوں کا لال قلعہ میخانہ بن رہا تھا
خود بادشاہِ دہلی مستانہ بن رہا تھا

نادر کی فوج آئی نشہ حرام کرنے
پابند عیش جاتے کیوں روک تھام کرنے
مسجد میں آکے بیٹھا جب قتل عام کرنے
پہنچا وزیر اعظم جھک کر سلام کرنے

نادر ہوا روانہ پھیلکے اُٹھا کے لاشے
مستِ شراب عشرت کرنے لگے تماشے

چوپٹ تھے شاہ عالم اندھیر چھا رہا تھا
ظالم غلام قادر آنکھیں دکھا رہا تھا
ہر شخص اپنا اپنا نقشہ جما رہا تھا
ہلکر اُچھل اُچھل کر فتنے اُٹھا رہا تھا

دہلی نے ہائے کیا کیا آشوبِ دہر جھیلے
آئے کبھی مرہٹے چھائے کبھی رہیلے

ساعت سعید آئی پھر وقت نیک آیا
دِلّی کو فتح کرنے انگریز ایک آیا
سب سے نجات پائی جب لارڈ لیک آیا
بارے ہوا اڑا دن کھانے میں کیک آیا

سکہ جمایا اپنا ایسٹ انڈیا نے
ہر سُو تھے شور و غل تھے بجتے تھے شادیانے

بس ایک لاکھ پنشن پاتا تھا شاہِ دہلی
پر نام تھا ابھی تک عالم پناہِ دہلی

پھر انقلاب آیا بگڑی سپاہِ دہلی
پھر خاک میں ملایا کالوں نے جاہِ دہلی

مغلوں کی سلطنت کا نام و نشاں نہ رکھا
بابر کا نام لیوا باقی یہاں نہ رکھا

تھے سب مشیرِ شاہی دربار میں چھچھورے
گاتے رہے ملاریں سنتے رہے کٹورے

مارے گئے ہزاروں دمباز مفت خورے
سُنتھراؤ کر رہے تھے ہتیار بند گورے

شاہِ سخن کے اکثر مضمون قید کر کے
بھیجا ظفر کو آخر رنگون قید کر کے

شہزادیوں پہ ٹوٹا کیسا غضب خدا نے
پھرتی تھیں نتھکے چھنتی جنگل میں بے ٹھکانے

تھے خاک کے بچھونے ڈیرے نہ شامیانے
تنکے کے بدلے پتھر رکھنے لگیں سرہانے

پھولوں میں تُل رہی تھیں نازوں میں پل رہی تھیں
سب وہ بے نقاب ہو کر گھر سے نکل رہی تھیں

ملکہ ہوئی یہاں کی وکٹوریہ پیاری
فرمان کر دیا تھا امن و امان کا جاری

بازار میں لنڈن کی نکلی بڑی سواری
دربارِ قیصری کی بڑھ کر تھی شانداری

ہندوستاں کے راجا خیل و خدم سے آئے
اقبال و جاہ و حشمت جتنے قدم سے آئے

پھر اڈیورڈ ہفتم نے کی صلح پسندی
رشیا سے رشتہ جوڑا جرمن سے بھائی بندی

خوش انتظامیوں کے صدقے تھی عقلمندی
دہلی کا کارونیشن شاہانہ سربلندی

پیلِ دماں پہ نکلے کرزن سوار ہو کر
چلنے لگی سواری بادِ بہار ہو کر

اب آپ جارج پنجم دربار کر رہے ہیں
فیضِ قدم سے بن کو گلزار کر رہے ہیں

امن و اماں کا سب سے اقرار کر رہے ہیں
تعریف روزمرہ اخبار کر رہے ہیں

یہ جشن ہو مبارک یہ جشن ہو مبارک
ہندوستان، دہلی، انگلینڈ کو مبارک

چہرہ ہے نور افشاں کیا شانِ قیصری ہے
اقبال و دبدبہ سے عالم کو تھرتھری ہے

قبضہ میں بحر و بر ہیں مشہور سروری ہے
نوشیرواں سے بڑھ کر انصاف گستری ہے

زیر و زبر ہیں یکساں ایسی ہے حکمرانی
پیتے ہیں شیر بکری اب ایک گھاٹ پانی

ریلوں کی ہے ترقی جاری ہے ڈاکخانہ
زوروں پہ ہے تجارت صنعت کا ہے زمانہ

نہروں سے آبپاشی کھیتوں پہ آبیانہ / فوجِ پولس معیّن بھرپور ہے خزانہ
سکھوں کا ڈھنگ دیکھا مغلوں کا طور دیکھا / ایسا نہ عہد دیکھا ایسا نہ طور دیکھا
اقبال کی رہے گی دولت شفیق جب تک / ہے عدل کی جہاں میں رحمت رفیق جب تک
آزادیوں کا حامی لبرل فریق جب تک / ہم بھی دعائیں دیں گے ہر دم خلیق جب تک
ملکہ و جارج پنجم انصاف و عدل پیشہ / زندہ رہیں ہمیشہ زندہ رہیں ہمیشہ
دہلی کی شان دگنی ہو جائیگی یقین ہے / اُجڑا ہوا نہیں ہے اُجڑا ہوا نہیں ہے
خلدِ بریں سے بہتر اس شہر کی زمیں ہے / ہر نقش دلفزا ہے ہر بات دلنشیں ہے
لندن بنا ہوا ہے ہندوستاں میں دہلی / ہے انتخاب بیشک سارے جہاں میں دہلی

بنسی کی صدا

سکھی میں مست ہوں بنسی کی دھن سے / کہوں گی جو مجھے کہنا ہے اُن سے
تجھے میں کیا بتاؤں رے جی کہاں ہے / تو ہی مجھکو بتا دے پی کہاں ہے ؟
برہ کی آگ سے میں جل رہی ہوں / تڑپتی ہوں کلیجہ مل رہی ہوں
نگاہِ ناز سے بسمل ہوئی ہوں / فقط بسمل نہیں بے دل ہوئی ہوں
میرے چت چور کو کوئی بلا دے / سنا دے، پھر کوئی بنسی سنا دے
مری آنکھوں میں وہ رنگیں ادا ہے / مرے کانوں میں بنسی کی صدا ہے
کسی کا مدھ بھری گوری میں دم ہے / مرا اُس بانس کی پوری میں دم ہے
اِسی غمّاز نے مارا ہے مجھ کو / اِسی آواز نے مارا ہے مجھ کو

مرونگی جان دونگی سر دھنونگی / سنونگی پھر وہی بنسی سنونگی

وہی بنسی رسیلی ہے سریلی / وہی بنسی رنگیلی ہے چھبیلی
وہی بنسی بھرا ہے سوز جس میں / نئی آواز ہے ہر روز جس میں
وہی بنسی جو بے جاں بولتی ہے / مگر رازِ حقیقت کھولتی ہے

وُہی ہنسی مُجھے دُکھ دے رہی ہے
لبِ جاناں کے بوسے لے رہی ہے
وُہی ہنسی کٹی جو بانس ہو کر
کھٹکتی ہے جگر میں پھانس ہو کر
اُسی ہنسی میں جادو بھر رہا ہے
اُسی ہنسی نے میرا من ہرا ہے
مرونگی جان دونگی سر دھنونگی
سُنونگی پھر وہی ہنسی سُنونگی

خلیل

خلیل شرف الدولہ منتظم الملک نواب محمد ابراہیم خان بہادر مستقیم جنگ خلفِ خواجہ عبدالحکیم لکھنوی از اہل خطہ آپ محمد علی شاہ بادشاہ کے وزیر اور موزونی طبع کے اقتضا سے نواب عاشور علی خان کے شاگرد تھے۔ غدر میں مارے گئے بڑے متقدر اور والا منزلت امیر تھے۔ لکھنؤ میں اِنکے نام کی کوٹھی ابتک مشہور ہے گاہ گاہ شعر کہتے تھے ملاحظہ ہوں ✤

سُن کے حالِ شب فرقت بولے
کہیئے کچھ اور بھی فرمایئے گا
نزع میں دیکھ کے فرماتے ہیں
ہم جلا لیں گے جو مرجایئے گا
وصل میں کتنے ہیں بھولے بنکر
کس طرح ہجر میں مرجایئے گا
ایسے وعدے بھی وفا ہوتے ہیں
ہاں بجا سچ ہے ضرور آیئے گا

مثلِ مہِ نو عشق میں اُس رشکِ قمر کے
اُٹھتی ہے سدا مجھ سے وفا کوش پہ انگشت
دیوانہ تیرا بادیہ پیما ہوا اگر ✤
دوڑیگا اُسکے لینے کو خود قیس بن کے پاؤں
دیکھی قریبِ چشم جو گیسوئے مشکبار
تشبیہ دی کہ ہیں یہ غزالِ ختن کے پاؤں
ہاتھوں پہ سر جو معرکہ منتہاں میں تھا
پیچھے ہٹے نہ ایک قدم کو سخن کے پاؤں
درگاہ میں خدا کی دعا ہے یہی خلیل
ہوں روز حشر سر پہ مرے پنجتن کے پاؤں

خلیل

خلیل سخنور خوش فکر میر دوست علی خلیل مرحوم خلف سید جمال علی باشندۂ قصبۂ ڈولی اودھ خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی کے شاگردوں میں نامور تھے اِنکی خوش کلامی کا بڑا شہرہ تھا۔ نواب نادر میرزا نیشاپوری کی مصاحبت میں بسر اوقات کرتے رہے سنہ ۱۲۷۹ھ میں کلکتے بھی گئے تھے اِنکا اُردو دیوان مطبع نامی لکھنؤ میں چھپا تھا۔ مگر معتبروں سے سُنا کہ اچھا کلام بیشتر ضائع ہو گیا اُردو دیوان

مطبوعہ میں شامل نہ ہو سکا اخلاق اور معرفت کا رنگ بھی کہیں کہیں اپنی جھلک دکھاتا ہے خلیل کے کلام میں اجنبی اور غیر مانوس الفاظ کی بھرمار زیادہ ہے اور تشبیہ و استعارہ کا شوق حد اعتدال سے متجاوز ہے۔ مراعاۃ النظیر اور صنعت تجنیس کے دلدادہ معلوم ہوتے ہیں۔ بعض اشعار بالکل فحش کا رنگ لیئے ہوئے ہیں۔ زلف۔ کنگھی۔ مانگ۔ چوٹی۔ خط و خال کے مضامین کثرت سے نظم کیئے ہیں۔ صاف عاشقانہ شعر غزلوں میں کم نکلتے ہیں۔ نازک خیالی اور شگفتگی مضامین کی طرف توجہ کم معلوم ہوتی ہے اسی لئے کلام میں دلکشی دلچسپی کہ ایسے سخنور کے ہاں امید کیجا سکتی ہے، نہیں ہے عموماً جو ایک مصرعہ میں زور ہوتا ہے وہ دوسرے میں قائم نہیں رہتا۔ ہمنے اپنی پسند کے مطابق عاشقانہ اور اخلاقی مضامین کے اشعار کا انتخاب کیا ہے مگر دیوان میں ایسے اشعار کی تعداد بہت کم ہے سلطان عالم واجد علی شاہ کے عہد میں نظامت اور چکلہ داری کے عہدہ پر ممتاز رہے تاحیات کمال عیش و عشرت سے بسر کرتے رہے۔ دیوان مطبوعہ کا خلاصہ درج ذیل ہے

ناقصوں پر نظرِ مہر نہ رکھتا جو فلک
لعل پتھر کو نہ پھر سیپ کو گوہر ملتا

جب عرضِ حال کرتا ہوں کہتا ہے وہ صنم
کچھ اور کہیئے یہ تو ہے قصہ سُنا ہوا

دل ہی میں نہیں کچھ ترا جلوہ تو ہر اک کو
شمع حرم و دیر و کلیسا نظر آیا

وہ رنگ ہے تیرا کہ ترے رنگ کے آگے
جس رنگ کو دیکھا ہے وہ پھیکا نظر آیا

آدمی وہ ہے کہ جو حضرت آدم کی طرح
شیرِ مادر کا بھی شرمندۂ احساں نہوا

چُپ کس لیئے رہتے ہو خلیلِ جگر افگار
تبلاؤ تو کیا حال ہے اے یار تمھارا

کبھی دیکھا جو اُبلتے ہوئے مے کو خم سے
جوش اپنی بھی جوانی کا ہمیں یاد آیا

اہلِ دنیا ہیں تمام اپنی غرض کے بندے
پڑ گئی جب کوئی مشکل تو خدا یاد آیا

کیا بہار ہے جسنے بتا یا جو لٹکا
گیا نہ زلف کا سودا ہزار سر پٹکا

شب فراق میں بیتاب یوں نے گیند کیطرح
فلک پہ مجکو اُٹھایا زمیں پہ دے پٹکا

کٹتی نہیں ہیں مجرمِ الفت کی بیڑیاں
جو مر گیا وہ قید سے آزاد ہو گیا

یار نے آکے دمِ نزع کہا
کیا ارادہ ہے کدھر جائیے گا

جو بن رہتا نہیں کسی کا
یہ دھوپ ہیں سایہ ہے پری کا

ہاتھ پورا نہ پڑا زخم لگائے اوچھے
قتل کرنا بھی نہ تجھکو مرے جلّاد آیا

جس نے پوچھا یہی جواب ملا
آدمی باوفا نہیں ملتا

طالبِ مقصود گر ہے اپنی ہستی کو مٹا
ہوگیا جس وقت خود گم مدعا مل جائیگا

عاشق ہوں بتو تم مجھے جو چاہو سزا دو
اللہ کا بندہ ہوں گنہگار تمھارا

قاتل نے بعد قتل مری مسکرا دیا
کیا خوب خوں بہا کے مجھے خوں بہا دیا

کھنچتے ہو دور ہمسے ہمارا قصور ہے
کیوں چاند کہہ کے تمکو فلک پر چڑھا دیا

شبِ غم میں دِل پر قلق جب ہوا
خیال اُس کا آکر خبر لے گیا

بزم سے یار نے یہ کہکے نِکالا مجھکو
اُٹھئے، گھر جائیے، دم لیجئے، ستائیے بہت

حرص نعمت کی بہت کرتی ہے انساں کو خراب
پھوٹ جائے بدن کھیر جو کھا جائے بہت

اے پری ہیں ترے دیوانے کے مرتبے خراب
ہتکڑی، طوق، رسن، خانہ زندان زنجیر

جبیں پہ غصے سے پڑ گئی چین پھیر لیں آنکھیں بھویں چڑھا کر
دہن کا بوسہ جو اُس سے مانگا بگڑ گئے صاف منہ بنا کر

نکر تصور بتوں کا دل میں محل تو یہ ہے کہ کچھ حیا کر
خلیل کعبہ میں بُت پرستی خدا خدا کر خدا خدا کر

بلا ہے سایہ بھی ان بتوں کا خدا بچائے ہر اک بشر کو
پری کو دیوانہ چٹکیوں میں بناتے ہیں یہ اُڑا اُڑا کر

ہوئی ہے مدت میں وصل کی شب حشر تک ہو سحر نمایاں
کروں میں آہیں جھکا کے سر کو خدا سے تو اے صنم دعا کر

بتوں کو بھی بد نہ کہیو واعظ خدا کو گر ایک جانتا ہے
نکال حرفِ دوئی نہ منہ سے خدا خدا کر خدا خدا کر

حسینوں میں حسن ضو قمر میں گلوں میں بو سنگ میں ہے آتش
کیا ہے عالم کو تو نے حیران ہر اک میں جلوہ دکھا دکھا کر

بتانِ ہندوستاں میں تو نے بہت سی کی سیرت پرستی
خلیل کعبے میں چل کے یہاں سے کبھی کوئی دن خدا خدا کر

کوئی بلبل نہ کسی پھول کا شیدا ہو خلیل
گُل کے پردے میں رہے وہ نہ اگر بو ہو کر

رونے پہ باندھے جو مری چشم تر کمر
کیسی زمیں فلک پہ ہو پانی کمر کمر

سوز و گداز عشق سے ہو جائینگے فنا — اپنا مآل کار ہے مثلِ مآلِ شمع

حشر برپا ہو کہیں لوگ قیامت آئی — ربع مسکوں میں ہو ہلچل جو چلو چار قدم

جانِ جاں عاشقوں میں نام جدائی کا تو لو — موت کا ذکر نہیں کرتے ہیں بیماروں میں

دِل سے ہم شیدائے چشمِ یار ہیں — نرگسِ بیمار کے بیمار ہیں

چھیڑتے ہیں عاشقانِ زار کو — خوب رو کتنے غریب آزار ہیں

کیا اُسکی جستجو نے چھڑوا دیئے ہیں مسکن — پروانے ہیں چمن میں بلبل ہیں انجمن میں

مری قدر کیا ہو جہان میں کہیں مجھسا کوئی بشر نہیں — وہ دوا ہوں جس میں شفا نہیں وہ دعا ہوں جس میں اثر نہیں

مرے دلکو جس کا خیال ہے شب و روز شوقِ وصال ہے — وہ کہاں ہے، کون ہے؟ کیا ہے شئے ابھی تک کچھ اسکی خبر نہیں

نہیں دم زدن کی یہ ہے جگہ جو خیال بھی ہو عروج کا — تو صدا یہ آتی ہے کان میں کہ بس آ حباب ابھر نہیں

مرے اُسکے ہیں جو معاملے وہی اُسکو خوب ہے جانتا — یہ مقامِ راز و نیاز ہے دل و جاں کو اسکی خبر نہیں

کرے دید اُسکی مجال کیا وہ جمال دشمنِ ہوش ہے — جھلک اُسکی جسکو نظر پڑی اُسے پھر کسی کی خبر نہیں

وہ جو کرتے ہیں مرا امتحاں پڑیں بیچ والے نہ درمیاں — اگر آگ میں بھی وہ پھینک دے تو خلیل کچھ مجھے ڈر نہیں

اللہ رے حسنِ عارضِ رنگین کے عکس سے — یاقوت بن گیا ہے گہر گوشِ یار میں

ہو نہ غصہ آگئے ہیں لختِ دل نالوں کے ساتھ — باغباں گلبرگ منقارِ عنادل میں نہیں

سر ترے زانو پہ ہو دم نکلے جب اے مہ لقا — اور کچھ حسرت ترے بیمار کے دل میں نہیں

زندگانی کا سبب عاشق کی ہجرِ یار ہے — زیست پروانہ کی وصلِ شمع محفل میں نہیں

ہمتِ مردانہ ہے میری مجھے مشکل کشا — غیر سے خواہاں مدد کا وقتِ مشکل میں نہیں

عمر غفلت میں بسر ہوتی ہے اپنی روز و شب — کچھ نہیں معلوم ہم سوتے ہیں یا بیدار ہیں

کسکو یاں تابِ رقم واں کسکو پڑھنے کا دماغ — ورنہ قاصد شرحِ شوقِ وصل کے طومار ہیں

دل ہی دل میں گفتگو رہتی ہے باہم روز و شب — میرے اُسکے درمیاں تقریر کی حاجت نہیں

وصفِ روئے نگار کرتا ہوں — لکھتا ہوں شرحِ داستانِ چمن

مُسلمان جانتے ہیں شمع قندیلِ حرم تجھکو
چراغ دیر ہے تو لے صنم چشم برہمن میں

خالی ہیں سبُو شیشے ہیں نے لبریز شراب سے جام نہیں
چلتے ہیں یہاں سے بادہ کشو اس بزم میں اپنا کام نہیں
جو مر گئے اُنکو زیر زمیں کچھ راحت و رنج سے کام نہیں
شادی ہے بیاض صبح نہیں اندوہ سواد شام نہیں
ہُوں بندۂ عشق حُسن بتاں کچھ دیر و حرم سے کام نہیں
مذہب ہی جُدا ہے محبت کا یاں کفر نہیں اسلام نہیں
بلبل ہیں شگفتہ سُنتے ہیں گُل ہے باغ میں دھوم بہار آئی
دے موت خدا تجھکو شبنم یہ رونے کا ہنگام نہیں
شاعر ہوں خلیل تخلص ہے کعبہ تک منہ سے جاتے ہیں
کیوں ننگ ہے تجھکو ملنے میں اے بُت میں بھی گمنام نہیں

خدا کو بھُول گئے لوگ فکر روزی میں
خیالِ رزق ہے رزّاق کا خیال نہیں
ترکِ دُنیا خوب ہے حرص و ہوا اچھی نہیں
ہرکس و ناکس کے آگے التجا اچھی نہیں
عشاق کو محفل سے اُٹھاؤ نہ حسینو!
آئے ہیں ہوا کھانے کو بیمار چمن میں
تم سیر کو جاتے ہو دھڑکتا ہے میرا دل
بلبل کہیں مرجائیں نہ دوچار چمن میں
ناز سے منہ کو جو زلفوں میں چھپا لیتے ہو
جی سے بھایا ہے یہ انداز تمھارا مجھکو
تم سُنو یا نہ سُنو نالے کیئے جاؤں گا
دردِ دل کہنے سے مطلب ہے اثر ہو کہ نہو
اجل ہے گھات میں دم توڑتا ہوں تم مسیحا ہو
اکیلا چھوڑ کر جاؤ نہ بیمارِ محبت کو
جس سنگ پہ چاہو جبہہ سا ہو
پر شرط یہ ہے کہ بے ریا ہو
کیونکر نہ کہوں تمہیں مسیحا ٭
دردِ دلِ زار کی دوا ہو ٭
اچھے نہیں ہیں جوششِ وحشت کے رنگ ڈھنگ
تیور کچھ اب کے سال بُرے ہیں بہار کے
دم سے طلسم آدمِ خاکی کا ہے خلیل
پھرتی ہیں پُتلیاں یہ سہارے سے تار کے

پاؤں پر خم رہی جبینِ نیاز
زندگی یُوں بسر ہوئی میری
طالبِ وصل ہُوں نہ چھیڑ مجھے
دل لگی کیا غریب سائل سے

نہو جو داغِ جگر تو غلط ہے دعویٔ عشق
بغیر مہر سند معتبر نہیں ہوتی
کیونکر ڈروں نہ اُنکے خطِ مشک فام سے
پہنچے ہیں سیّدوں کو بہت رنج شام سے

چمن چمن پہ نسیمِ سحر پکار آئی ۔ خزاں نے کوچ کیا بلبلو بہار آئی

جاوۂ یار نہ تھا داروئے بیہوشی تھی ۔ دیر تک ایک نظر دیکھ کے بیہوش رہے

داغ دیجاتی ہی برسات میں بے یار گھٹا ۔ ابر تر آگ کلیجہ کو لگا جاتا ہے

دھوم سنتے رہے آج آتی ہی کل آتی ہی ۔ قامتِ یار کے آگے نہ قیامت آئی

جمال حور کا مٹی کی مورتوں کو دیا ۔ کمالِ صنعتِ پروردگار دیکھ چکے

محبت مرض ہے محبت دوا ہے ۔ محبت اجل ہے محبت شفا ہے

شرافت ہی حُسنِ عمل سے خلیل ۔ جبیں پر کہاں شیخ و سید لکھا ہے

ہوتی ہی شکست اسکو جو مجھ رند سے اکثر ۔ جب دیکھیے توبہ درِ قاضی پہ کھڑی ہے

فرقت کی نہیں شب شب آفات یہی ہی ۔ رونا تھا جسے روز ہمیں وہ رات یہی ہی

لاکھ نازک ہو رشتۂ اُلفت ۔ ٹوٹتا ہے یہ تار مشکل سے

عشق اپنا اثر آخر کو یہ دکھلاتا ہے ۔ پہلے غم کھاتے تھے ہم اب ہمیں غم کھاتا ہے

نظارۂ معشوق سے سیری نہیں ہوتی ۔ ہو وصل بھی تو وصل کی حسرت نہیں جاتی

لاکھ پردوں میں ہوں پھر چھپتے نہیں ۔ چھپتو نہیں چاہت کی تیور پیار کے

دِل پہ بے یار کچھ عجب گذری ۔ کیا کہوں کس طرح سے شب گذری

یہ بھی معلوم وصل میں نہ ہُوا ۔ کب ہوئی صبح رات کب گذری

خلیل

خلیل ۔ جناب حافظ خلیل حسن صاحب مانکپوری خلف حافظ عبدالکریم سنہ ۱۲۷۶ھ سال ولادت ہے۔ حافظ جلیل حسن صاحب جلیل کے جواب حیدرآباد میں ہیں بڑے بھائی ہیں حضرت امیر مینائی کے یہ بھی شاگرد ہیں اور مدت تک ریاستِ رامپور میں انکی خدمت میں رہے ہیں پھر کئی برس گوالیار رہے۔ اب پندرہ سولہ برس سے ریاستِ بلرام پور میں ملازم ہیں مہاراجہ صاحب بہادر آپ کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ انکی تصنیف سے علاوہ دیوان کے تین چار عاشقانہ مثنویاں بھی ہیں قصائد کا ایک بہت بڑا ذخیرہ آپ کے پاس ہے۔ تاریخ گوئی میں آپ کو کمال حاصل ہے

علمی استعداد خاصی ہے۔ ہنگام ترتیب تذکرہ جو کلام بھیجا اُس کا انتخاب درج تذکرہ کیا گیا۔ کلام میں صفائی روزمرّہ کے علاوہ، معاملہ بندی، شوخی، اور بندش کی خوبی سب باتیں موجود ہیں ملاحظہ ہو

نالے ہیں اُٹھتے بیٹھتے کیوں لب پہ اے خلیل
بیٹھے بٹھائے تم کو یہ آزار کیا ہُوا

دی دغا دل سے دوست نے مجھکو
اب بھلا اعتبار ہو کس کا

تم ہو، میں ہوں، گلا ہے، خنجر ہے،
اور اب انتظار ہے کس کا

پڑی تھی تم پہ نظر دل کو کیوں کچل ڈالا
قصور آنکھ کا تھا دل گناہگار نہ تھا

چاہتا ہے دل جسے، جب وہ ہی پہلو میں نہیں
چاندنی چھٹکی تو کیا، ٹھنڈی ہوا آئی تو کیا

مدّتوں یاد وہ شب و روز کی باہم صحبت
یا تمھیں راہ میں بھی دیکھ کے کترا جانا

اتنی مدت سے تو تم دل میں مرے رہتے ہو
اور کچھ حال نہ سننے مرے دل کا جاتا

تم تو افسردہ ہر اک بات پہ ہو جاتے ہو
ہمکو بھاتا نہیں یہ پھُول سا مرجھا جانا

آئے ایسے ہی ہاں نظر کا تیر
دیکھنا اب نہ تم خطا کرنا

ہائے دل کا علاج کون کرے
وہ نہیں جانتے دوا کرنا

دو گے کب تک بتوں پہ جان خلیل
چاہیئے اب خدا خدا کرنا

اطاعت عشق میں کرتے ہیں جو نازک مزاجوں کی
اِدھر انکو مناتے ہیں اُدھر دلکو سنبھالے ہیں

رحم کر اب بھی مرے دل پہ ذرا اے کافر
کھا چکا اب تو تری زلف کے جھٹکے لاکھوں

پھانسی بنتے ہیں، کبھی جال کبھی، دام کبھی
گیسوؤں کو بھی ترے یاد ہیں ٹکے لاکھوں

ہائے کیا شوخی ہے، کیا انداز ہے، کیا حُسن ہے،
جس طرف گذرے، وہ بسمل کر گئے دو چار کو

گال اُنکے، اور گلہائے چمن، اے عندلیب
صدقے ان پھُولوں پہ کر ڈالوں ترے گلزار کو

سخت جاں ایسا ہوں قاتل سے گلا کٹتا نہیں
دیکھتی ہے تیغ مجھکو، اور میں تلوار کو

دل نہ وابستہ ہو کیوں، زلفِ گرہ گیر کے ساتھ
اُنس ہو جاتا ہے، دیوانے کو، زنجیر کے ساتھ

ضبط سے کام ہمیشہ ترے بسمل لیں گے
جان دیدینگے ترا نام نہ قاتل لیں گے

ہائے ملتے نہیں کہتے ہیں کہ جلدی کیا ہے
اٹھکے ہیں سن کے اور اس ضد کے ہیں صدقے قربان

عید آئیگی تو ہم ملنے گلے مل لیں گے
صبح سے آج وہ مچلے ہیں کہ ہم دل لیں گے

فراقِ جاناں میں ہے یہ حالت کہ سبکو مجھ سے ہے اک عداوت
نہ آپ آنکھیں ہمیں دکھائیں نہ ہمکو محفل سے اب اٹھائیں

ذرا جو آنکھ لگ گئی ہے تو دل اچھلکر جگا رہا ہے
ہمیں تو خود درد ہی جگر کا اب انجمن سے اٹھا رہا ہے

آرزو تھی تری دل میں اتر آتی تصویر
یہی کرتے مری جاں دل پہ جو قابو ہوتا
عشوہ نہ کرینگے، کہ وہ غمزہ نہ کرینگے

ہم اسے سر کو جھکائے ہوئے دیکھا کرتے
سامنے ہمکو بٹھا کر تمھیں دیکھا کرتے
آئیں گے جوانی پہ تو کیا کیا نہ کرینگے

رہی محفل تری یونہی بھری غیروں سے آئے دن

جگہ ہمکو بھی ملجائے پسِ دیوار تھوڑی سی

خوشبو جو پسینہ کو ترے دی ہے خدا نے
نظر اِس طرف انکی کیا ہوگئی
صبا کی ذرا شوخیاں دیکھنا

یہ بات کسی پھول کی خوشبو میں نہیں ہے
مرے دردِ دل کی دوا ہوگئی
کہ بو اس کی لا کر ہوا ہوگئی

دِل آج بہت دیر سے پہلو میں نہیں ہے
سمجھتا ہوں اُنہیں تیری نشانی

اُلجھا تو تمہارے کہیں گیسو میں نہیں ہے
لگاؤں کیوں نہ داغوں کو جگر سے

نہ لالی ہے وہ رنگت ہے، نہ پھولوں میں وہ شوخی ہے
مرا سینہ بنا ہے غیرتِ گلزار داغوں سے
بہت روئے ہیں آیا ہے نظر جب پھول لالے کا

بجھادی شعلۂ عارض سے کِسنے آگ گلشن کی
ہم اپنے گھر میں بیٹھے کر رہے ہیں سیرِ گلشن کی
اِسی صورت اِسی رنگت کا اک دل ہم بھی رکھتے تھے

سخت جانی مری گردن نہیں کٹنے دیتی

تیغِ جلّاد کی بیکار ہوئی جاتی ہے

کوئے جاناں کو سمجھتا نہیں کم کعبہ سے
نہ جلاؤ، نہ جلاؤ، میری تربت پہ چراغ
نامہ بر ہوش میں آ مجھ سے یہ کیا کہتا ہے!

پاؤں سے میں نہ چلوں گا کبھی سر کے ہوتے
حاجتِ شمع نہیں داغ جگر کے ہوتے
خط سیاہی سے لکھوں خونِ جگر کے ہوتے

خلیل

خلیل - عالیجناب معلیٰ القاب امین الدولہ وزیر الممالک نواب حافظ محمد ابراہیم علیخان صاحب بہادر

صولت جنگ۔ جی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ فرمانروائے ٹونک۔ نواب محمد علی خان سابق نواب ٹونک کے خلف اکبر ہیں ۱۸۴۸ء مطابق ۱۲۶۵ھ سال پیدایش ہے ۱۸۶۶ء میں بعد معزولی اپنے والد کے مسند نشین ہوئے۔ ایام نابالغی میں ریاست کا انتظام صاحبزادہ عبیداللہ خان فیروز جنگ کی تفویض رہا۔ یکم جنوری ۱۸۷۰ء کو کامل اختیارات حکمرانی عطا ہوئے۔ نواب صاحب خود تجربہ کار زمانہ دیدہ باخبر ہیں ریاست کی سلامی جو انکے مسند نشین ہونے کے وقت گیارہ توپ کی تھی اب پھر سترہ توپ کی ہو گئی ہے۔ بائیس تئیس برس صاحبزادہ عبیداللہ خان وزیر مدار المہام ریاست رہے انکی وفات کے بعد انتظام ریاست میں کچھ خلل واقع ہوا، اور کونسل ہو گئی اب پھر دوبارہ اختیارات ریاست مل گئے ہیں۔ نواب صاحب کے گیارہ فرزند ہیں شعر و شاعری کا بھی شوق ہے پہلے جناب بسمل خیرآبادی برادر کلاں جناب مضطر سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے انکی وفات کے بعد جناب مضطر استاد بنائے گئے اور انکی استادی کے زمانے میں نواب صاحب کی غزلیں بعض گلدستوں کے ذریعے ملک میں پھیلیں۔ اپنے دوسرے استاد جناب مضطر کو انھوں نے "اعتبار الملک" "افتخار الشعراء" "اقتدار جنگ" اور "خان بہادر" کے خطاب سے معزز فرمایا۔ علاوہ جناب مضطر کے آسد، ظہیر، کوثر، خلش، وغیرہ اکثر شعراء ان کے دامن دولت سے وابستہ رہے اور بعض اب بھی ہیں۔ کلام بہت پاکیزہ اور صاف ہے، شوخی اور جودت متانت اور سلاست موقعہ بموقعہ مناسب مقدار میں پائی جاتی ہے۔ اشعار میں رنگینی بھی ہے۔

جذبِ اُلفت کا حب اثر جانوں۔	رُوٹھوں میں اور مجھے منائیں آپ
تُم دستِ نازنیں سے جو چھو لو چمن کے پھول	کلیاں تمام باغ کی رہ جائیں بن کے پھول
شاخ جفا نے پائے ہیں مہر و وفا کے پھل	نخلِ وفا میں آئے ہیں رنج و محن کے پھول
تجھ پہ فدا ہزار کلی ہر کلی کا رنگ	تجھ پہ نثار لاکھ چمن ہر چمن کے پھول
کوئی ہے زہد پہ نازاں کوئی عبادت پر	یہاں تو اے میرے آمرزگار کچھ بھی نہیں
دل ایک چھوٹی سی شے ہے پر تعجب کا محل یہ ہے	خیالاتِ جہاں کس طرح سے اس میں سماتے ہیں

زمانہ جانتا ہے ناز بردار جفا ہم ہیں | خدائی دیکھتی ہے دشمن رسم وفا تم ہو

مروت ہیں، وفا ہیں، ناز بردار ہیں، چاہت ہیں
ذرا ہم بھی تو سنوں کس بات میں مجھ سے سوا تم ہو

جو واپس ہم نے دل مانگا خلیل اُسنے تو وہ بولے
کہ اچھا بے وفا اب کون نکلا ہم ہیں یا تم ہو

وفا کر یا نہ کر تو جان تجھ کو کیا تری مرضی
تجھی کو سب کہیں گے بے مروت دیکھنے والے

ستایا ایسے دل ظالم نے کی بیدل لگی اچھی
اسی کا نام الفت ہے تو اس سے دشمنی اچھی

نہ پوچھو حال شب جدائی جو دل کو رنج و محن ہوا ہے
تمہارے سر کی قسم ہے صاحب کہ صبح کرنا کٹھن ہوا ہے

جو قصۂ زلف چھڑ گیا ہے تو پہروں طول سخن رہا ہے
سکوت سب نے کیا ہے اوبت جو تیرا وصف دہن ہوا ہے

جو روئے گلگوں کا دھیان آیا تو دل نے لطف چمن دکھایا
خیال آنکھوں کا جبکہ باندھا تو صید مضمون ہرن ہوا ہے

بُرا ہے جبدن سے عشق گیسو نہ دل پہ قابو رہا سر مو
ہمارے قبضے میں اے پریرو سواد ملک ختن ہوا ہے

یہاں تو نور کا تڑکا ہے یاد روئے روشن ہیں
وہ کوئی اور ہونگے شام فرقت دیکھنے والے

خمار — حکیم برجموہن لال صاحب خمار بریلوی شاگرد حضرت ہوش۔ صرف اتنا معلوم ہوا کہ ۱۸۷۰ء میں زندہ و سلامت موجود تھے اور اُس زمانے کے مشاعروں میں شریک رہتے تھے کلام سے پایا جاتا ہے کہ چند غزلیں حضرت اسیر لکھنوی کو بھی دکھائی تھیں۔

تاسف کیا کریں ہم سر کے جانیکا بھلا قاتل
چلو اچھا ہوا گردن سے اپنا بار سر کا

یوں لکھا احوال اپنے دیدۂ بیدار کا
پھول اک خط میں بنا یا نرگس بیمار کا

اے شیخ جاکے بزم میں اُس مے پرست کی
دیکھوں گا میں کہ کس طرح ہشیار آئیگا

جب دیا کاندھا جنازے کو مرے اُس مہر نے
بن گیا پھولوں کی چادر کا ہر اک گل آفتاب

قابل تشبیہ اُس دم ہو کہ جب پیدا کرے
یہ دہن یہ چشم یہ ابرو یہ کاکل آفتاب

وہ پھر آ گیا کہ پھری ساری خدائی ہمسے
دوست بھی ہمکو ستانے لگے دشمن ہو کر

لکھنؤ کیوں نہ بریلی کو کہیں ان روزوں
اب تو سرسبز یہاں باغ سخن دیکھتے ہیں

آب کوثر کی ہمیں چاہ نہ ہو بعد فنا
آب خنجر سے گلا اسلیئے تر کرتے ہیں

قطعہ

ہوا اسیر وہ ہوش، کی جس پہ عنایت نے احمال
کہا یہ اُن سے کہ اک بوسہ ہم اگر لے لیں
بگڑ کے کہنے لگے وہ کہ مُنہ کو بنواؤ

کبھی خمار نہ محتاج جامِ صہبا ہو
اُسی کو کہتے ہیں پاں جو بقرار رہے
خطا رقیب کریں دیں سزا مجھی کو آپ
جھکائیں سر کو حسین آکے سارے عالم کے
اُٹھے جنبکہ دُھواں سینے وداں ہو گیا اشک
وہ بیکس ہُوں سو بار آکر قضا

کیوں نہ پھر اُسکی زمین شعر میں جاگیر ہو
تو کہیئے آپکا نقصان اِس میں کیا ہو جائے
تمہارے واسطے دستور کیا نیا ہو جائے
جو چشمِ مست کا بوسہ کوئی عطا ہو جائے
اُسی کا نام ہے دل جس میں اضطرار رہے
کسی کا جرم ہو کوئی قصوروار رہے
سرِ مزار اگر نقشِ پائے یار رہے
کہیں پانی بھی برستا ہے گھٹا سے پہلے
سرہانے مرے نوحہ گر ہو گئی

خمیرؔ۔ اِنکا نام اور حال باوجودِ تلاش معلُوم نہ ہوا۔ ایک پُرانی بیاض میں کچھ اشعار نظر پڑے اُس میں سے یہ چند شعر منتخب ہوئے۔ غالباً نواح اودھ کے باشندے تھے اور مذاقیہ شعر کہنے میں معقول دسترس تھی ٭

نہ پیس اتنا اے گردشِ آسماں
رُخِ پُرملاحت کا بوسہ ملا
جو غمِ شب کے خاصے میں سیج رہا
لبِ شیریں کی یاد میں اے خمیرؔ

کہ ہر استخواں کا روا ہو گیا
نمک خوار میں آپکا ہو گیا
وہی صبح کا ناشتہ ہو گیا
جو چھلکے تلے گلگلا ہو گیا

نقرے تمہارے چھڑکے ہوئے نون مرچ کے
خمیرؔ اشعار سے میرے نمکیوں بھوکوں کی سیری ہو

کیا چٹ پٹے بڑے ہیں وہی کے مسالہ دار
کہ مجھ کو فیض پہنچا ہے یہ نعمت خوانِ عالی سے

قطعہ

روکھی سوکھی بھی آبرو سے ملے
جب کہا اُن سے ایک بوسہ دو
ہنسکے بولے کہ جان جائے گی

یہ بھی اِس وقت میں غنیمت ہے
یہ جو رخسار ہیں گلابی سے
ہاتھ تم اٹھاؤ اباس رکابی سے

خنجر

خنجر۔ شیخ محمد عبداللہ خان ولد پیر بخش فاروقی ساکن اجمیر۔ سرسہ ضلع حصار ہیں کئی برس تک ریل کے محکمہ میں ٹھیکہ داری کرتے رہے آوائل مشق میں بطور خود کہتے رہے جب کچھ نیک و بد کی تمیز ہوئی تو سید زماں خان صاحب دہلوی کے شاگرد ہو گئے۔ کچھ کلام غلام عبدالقادر خان آلفنی ناگپوری کو بھی دکھایا تھا اپنا دیوان موسوم بہ "چمنستانِ گفتار" عرصہ ہوا چھپوا کر شائع کر چکے ہیں۔ کلام معمولی درجے کا ہے کوئی خاص بات قابلِ ذکر انکے کلام میں نہیں ہے لکھنو کی طرز کے مقلد ہیں اور اُسی رنگ میں کہتے ہیں۔ سرسری نظر میں کچھ اشعار منتخب ہو کر درج تذکرہ کئے گئے

نہ شاکی ظلم کا ہوں میں نہ خواہاں ہوں عنایت کا	کیا ہی ہم نے جامہ زیب تن صبر و قناعت کا
کیا ہے اُن سے تُونے آج کیا دیدار کا وعدہ	ترے سودائیوں میں شور کیسا ہے قیامت کا
جب تک نہ سہے رنج و غم و زحمت و تکلیف	کچھ مرحلہ عشق میں حاصل نہیں ہوتا
نیند آتی ہے تصورِ ابرو میں کیا مجھے	چلتا گلے پہ ہے مرے خنجر تمام رات
ہجر ساقی میں خونِ دل اپنا	پیتے ہیں ہم شراب کی مانند
کس طرح یار تجھ کو پائیں ہم	رہبر اپنا کسے بنائیں ہم
واعظ و شیخ بکے جائیں تو ہوتا کیا ہے	رند کب پند و نصیحت کو سنا کرتے ہیں
رُولایا خوں جہاں کو تیری چشمِ ارغوانی نے	دکھلایا زہر لاکھوں کو تری پوشاک دھانی نے
بہائے خون کے دریا تری تلوار نے قاتل	بجھائی پیاس لاکھوں کی ترے خنجر کے پانی نے
لکھا تقدیر کا ارے ناداں	کہیں مٹتا بھی ہے مٹانے سے
جھکا جاتا ہے دل اُس بت کی جانب	وہ قبلہ ہے تو دل قبلہ نما ہے

خنجر

خنجر۔ نواب محمد حسین خان باشندۂ فرخ آباد۔ دورِ موجودہ کے شاعر اور غالباً مولانا طاہر فرخ آبادی کے تلامذہ میں ہیں۔ رسالہ نیرنگ سے کلام منتخب ہوا

نکلنا حسرتوں کا اپنے دل سے کچھ نہیں آساں	اگر نکلی کوئی حسرت بڑی مشکل سے نکلے گی
بوقتِ نزع گر بالیں پہ میری تم نہ آؤ گے	تو یہ جانِ حزیں نکلے گی پر مشکل سے نکلے گی

خنجر منشی محمد عبدالغفور خان گھڑی ساز میرٹھ شاگرد مولانا شوکت شعر خاصہ کہہ لیتے ہیں موزوں طبع شاعر ہیں یہ چند شعر کلام بہم رسیدہ میں سے انتخاب ہو کر درج تذکرہ کئے گئے ؂

جان و دل صبر و تحمل لیلئے اک وار ہیں	بار بار آئے تو کیا چھوڑ و گے جسم زار ہیں
درد و غم رنج و تعب ارمان حسرت ساتھ ہوں	ساتھ دل کے دفن یہ گنج شہیداں کیوں نہ ہو
نہ شاخ گل پہ تو بیٹھ اتنا پھول کر بلبل	خزاں ہے گل کے لیئے اور گل خزاں کیلئے
فرشتے بولے لحد میں جو داغ دل دیکھا	اسی کی روشنی کافی تھی دو جہاں کیلئے

خنجر - خنجر تخلص منشی محمد سعید ولد سید عبدالمجید سادات حسینی سے ہیں - قدیم وطن دہلی تھا - مگر ایام غدر میں دہلی چھوڑ کر قصبہ "نونی" میں جو دہلی سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر ہے سکونت اختیار کرنی پڑی - لیکن جب تعلیم و تربیت کے قابل ہوئے تو آپکے والد ماجد نے "نونی" میں مدرسہ نہ ہونے کی وجہ سے سکندر آباد میں جہاں آپ کی ننہال ہے سکونت منتقل کر لی - یہاں آپنے پہلے عربی فارسی میں تعلیم پائی پھر سرکاری مدرسہ میں داخل ہوئے اور مڈل تک پاس کیا - اسی دوران میں فن طب بھی تحصیل کرتے رہے - انگریزی کا مطالعہ بھی اسی وجہ سے چھوڑ دیا طب میں مہارت حاصل کرکے اب سکندر آباد میں مطب کرتے ہیں اپنے ماموں حضرت قاضی غیاث الدین صاحب خورشید سے مشورہ کرتے ہیں - نثر کا شوق بھی نظم کے ساتھ رہا چند ناول بھی لکھے جو "جہاں نما" اور دیگر اخبارات میں ہفتہ وار شائع ہوا کیئے - رسالہ "ید بیضا" کے کئی سال تک اڈیٹر رہے -

نظم میں غاور کاکت اور لغقید سے کلام کو بچاتے ہیں - متروکات کا بھی زیادہ خیال ہے یہی وجہ ہے کہ قاضی صاحب کے رنگ سے آپ کا رنگ جدا گانہ ہے - کچھ شاگرد بھی کر لیئے ہیں جن میں قمر سکندر آبادی و حشمت، شاہجہاں پوری صاحب دیوان ہیں - کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو -

نظر آئے ہر اک ذرہ میں جلوہ شان وحدت کا	جو آنکھیں کھول کر دیکھے تماشہ تیری قدرت کا
دل چھپایا ہو تو نے مٹھی میں	ہاتھ لا اسے نگار کیا کہنا !
وصل کے ذکر پر تجاہل سے	انکا وہ بار بار "کیا" کہنا

دیکھ کر اشتیاق بسمل کا
عرش پر ہے دماغ قاتل کا

غیر نکلا نہ تیری محفل سے
کیا یہ ارمان تھا مرے دل کا

کچھ بھی واماندگی میں قیس کے کام آگئی
تھک گیا مجنوں تو پہنچی آہ محمل کی طرف

بہاریں جسکی قسمت میں تھیں لوٹیں اُسنے اے خنجر
مرا شیون مری فریاد بھی پہنچی نہ گلشن تک

خدا شاہد ہے یکتا ہوں تمھارے جاں نثاروں میں
نہ مجھسا پاؤ گے عاشق جو ڈھونڈھو گے ہزاروں میں

یہ مانا مجمع اغیار میں بولا نہیں جاتا
مگر کچھ تو کہو آنکھوں میں ہونٹوں میں اشاروں میں

سحر آتے ہیں، شام آتے ہیں وہ آتے ہیں اب آئے
دلِ بیتاب کو اب تک رکھا ہے ان بہانوں میں

آؤ، ملجاؤ گلے، رُخ سے اُلٹ دو پردہ
کہیں خلوت میں بھی عاشق سے حیا کرتے ہیں

ذرا چھیڑا جنوں نے کشمکش ہونے لگی باہم
خدا جانے کہاں کی لاگ ہے دستِ گریباں میں

مزے کیا کیا گناہوں میں گناہگاروں کو آتے ہیں
تری رحمت نے وہ پیدا کیئے ہیں لطفِ عصیاں میں

چارہ گر، درد کی کیا خوب دوا کرتے ہیں
اُس کے پیکاں کو مرے دل سے جُدا کرتے ہیں

میرے ہوتے ہوئے کیوں غیر پہ ہو مشقِ ستم
شرم آتی ہے مجھے آپ یہ کیا کرتے ہیں

آج کیا ڈر ہے کرو شوق سے عشاق پہ ظلم
دیکھنا تم کہ یہ کل حشر میں کیا کرتے ہیں

تم ماتمِ رقیب میں یوں نوحہ گر نہ ہو
دیکھو کسی غریب کا ٹکڑے جگر نہ ہو

میں خوگرِ وفا ہوں مزا ہے فراق میں
گو اُس صنم کا وصل مجھے عمر بھر نہ ہو

شوخی نے پائی نشو و نما تیری آنکھ میں
تو وہ ہے جسکی لاکھ میں نیچی نظر نہ ہو

دریائے عشق میں دُرِ مقصود کب وہ پائے
جس کو یہ ہو خیال کہ اپنا ضرر نہ ہو

حسرتِ دید میں مر جائیں نہ عشاق کہیں
جلد اے کاش نقابِ رُخِ زیبا اُلٹے

جان و دل دے لیئے خنجر یہ کرم ہے اُنکا
میرے احسان تو کیا اُنکے ہیں احساں اُلٹے

ساقیا ٹال نہ پیاسا مجھے میخانے سے
میرے حصے کی چھلک جائیگی پیمانے سے

دل ملا شیشے سے آنکھیں لڑیں پیمانے سے
ہم کہاں جاتے ہیں ساقی ترے میخانے سے

تھا تنگ ظرف جو باہر ہوا پیمانے سے
محتسب میرا یہ پیمان ہے پیمانے سے
پیری میں جوانی کا مذکور ہی کیا کرنا

شیخ نکلا ہے بہکتا ہوا میخانے سے
توبہ توڑوں گا میں خشتِ خمِ میخانے سے
اک خواب ہی بھولا سا اک بات ہے مدت کی

بلا دوں عرش کو تاب و تواں مجھ میں یہاں تک ہے
پھنکا جاتا ہوں ہمدم سوزِ فرقت سے کہوں کیونکر
کیسی تشنہ کامی کا تقاضا ہے یہ قاتل سے

تمہارا یہ تغافل بس مرے ضبطِ فغاں تک ہے
لگی اک آگ سی گویا مرے دل سے زباں تک ہے
مجھے بھی دیکھنا ہے تیغ میں پانی کہاں تک ہے

خنجر

خنجر۔ ابوالبیان محمد سید عالم خنجرؔ مودودی مارہروی۔ دور موجودہ کے شعرا میں سے ہیں اور فنِ سخن میں حضرت احسن مارہروی سے صلاح لیتے ہیں۔ مولنا نذیر احمد کی مفصل سوانح عمری مرتب کی ہے اور بھی چند کتب انکی تصنیف سے ہیں۔ ۴۰ سال کے قریب عمر ہے۔
آپ کو انشا پردازی میں اچھا ملکہ حاصل ہے۔ اور فکرِ معاش سے بھی بدرجہ اوسط آسودہ ہیں۔ یہ کلام کا انتخاب ہے۔

گُل اپنے رنگ و روپ پہ پھولا ہوا ہے کیا
ناراض کیوں ہوئے جو کہا تم کو بے مثال
ہم ٹھان کر گئے تھے کہ سب کچھ کہینگے حال
کیسے ہیں جسکو ڈھونڈتے ہو وہ تو دل میں ہے
کیا عجب عقدۂ دشوار جو آساں ہوگا

دو دن کی ہے بہار ہمیشہ دھرا ہے کیا
تعریفِ حُسن کی ہے کوئی بد دعا ہے کیا
پوچھا نہ اُسنے یہ بھی ترا مدعا ہے کیا
خنجر تمہاری عقل پہ پردہ پڑا ہے کیا
درد جب حد سے گذر جائیگا درماں ہوگا

غیر سے ربط تجھے مجھ سے قضا کو نفرت
وعدۂ وصل سے کیا خوش ہوں کوٹھکا ہی
وہ بھی دن ہوگا خدایا کہ بر آئے گی اُمید
کہنا جو اُسنے تھا وہ میرے دلمیں رہگیا
دل نظروں نظروں ہی میں اُڑا لیگئے وہ صاف

کون حالِ دلِ بیمار کا پرساں ہوگا
حسرتیں نکلیں جو دل سے تو یہ ویراں ہوگا
وہ بھی دن ہوگا کہ کوئی مرا مہماں ہوگا
اصلی خیال شکوۂ باطل میں رہ گیا
میں دیکھتا کا دیکھتا محفل میں رہ گیا

جس کو دیکھا اسی پہ لوٹ گیا
یار رہا ہیں پہ جب تک آ نہ لیا
فصلِ گل آئی گو ہزاروں بار
کہتا ہے ہر گھڑی دلِ زحمت طلب یہی
اللہ رے اثر تری برقِ نگاہ کا

دل سا بھی کوئی من چلا نہ ہوا
تن سے دم، دم سے تن جدا نہ ہوا
نخل دل ہی مرا ھرا نہ ہوا
کچھ چاشنئی دردِ محبت ضرور ہو
جلجائے اک نظر میں اگر کوہِ طور ہو

ہوتی ہے عیاں لاکھ حجابوں میں تجلی
پردے میں نہاں وہ رخِ روشن نہیں رہتا

منہ سونے ہے طعنہ یہ دیا آج سرِ بزم
عاشق کی زباں پر کبھی شیون نہیں رہتا

جب اسکی شوخیاں بچپن میں دل کو چھینے لیتی ہیں
تو پھر کیا کچھ نہ ڈھائیگا ستم وہ نوجواں ہوکر

خوفِ عدو وہاں تھا یہاں خوفِ حشر ہے
اپنے گناہ پر جو ہوا مجکو انفعال
خونِ شہید ناز کے دھبے جو پڑ گئے
حاسد کا گر گزر نہیں جنت میں ایخدا

دنیا میں چین تھا نہ ہمیں ہے مزار میں
رحمت نے اسکی لیلیا مجکو کنار میں
نقش و نگار بن گئے شمشیر یار میں
دشمن کا کیوں قیام ہے پھر کوئے یار میں

ہمارے جذبۂ دل میں اگر تاثیر ہو جائے
دعا میں اسقدر یارب مری تاثیر ہو جائے
نشانِ قبر تک ظالم نے اس ڈر سے مٹایا ہے
کھنچے نقشہ بھلا کس طرح اسکے روئے تاباں کا
پریشاں کیوں نہو قاتل ہماری سخت جانی سے
وہ نازنیں شبِ وصل اسطرح حجاب میں ہے
مٹائی محفلِ ہستی جگایا فتنۂ حشر
وفورِ طیش سے رخسار اور سرخ ہوئے
ادھر خیالِ جدائی ادھر خیالِ سحر

سنبھل جائے مقدر کار گر تدبیر ہو جائے
کہ اس سے جو کہے یہ عاشقِ دلگیر ہو جائے
مبادا گردِ عاشق اٹھکے دامن گیر ہو جائے
مصور دیکھکر جب صورتِ تصویر ہو جائے
گلے پر پھیرتے ہی کُند جب شمشیر ہو جائے
زباں پہ قفلِ خموشی ہے منہ نقاب میں ہے
اثر بلا کا تری چشمِ نیمخواب میں ہے
دو چند حسنِ رخِ دلربا عتاب میں ہے
وصال میں بھی مری جان اک عذاب میں ہے

خنجر

خنجر منشی مرزا فدا علی لکھنوی شاگرد سیف شاہجہانپوری۔ آپکے والد مرحوم کا نام منشی آغا صاحب تھا۔ کٹرہ سرائے میوا میں آپکا مکان ہے استعداد علمی بقدر ضرورت ہے۔ سنہ ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ اِس حساب سے اب چوبیس برس کا سن ہے سولہ برس کی عمر سے شعر گوئی کا مذاق شروع ہوا، پہلے چند غزلیں خواجہ عشرت لکھنوی کو دکھائیں اب جناب سیف شاہجہانپوری سے تلمذ اختیار کیا ہے، چھ سات ناول بھی لکھ چکے ہیں۔ اب حال میں حضرت واجد علی شاہ کی تالیف پریخانہ کا ترجمہ کر کے شائع کیا ہے مثنوی انجام عشق زیر طبع ہے۔ کلام اور حالات جو اُنھوں نے ہنگام تحریر تذکرہ ارسال کیے اُنکا خلاصہ حاضر ہے

تھا جس سے دِل کو چین وہ کاشانہ چھٹ گیا
اب جی کے کیا کریں در جانانہ چھٹ گیا

وہ وحشت ناک سناٹا وہ پر ہیبت شب ہجراں
وہ گھبرا کے در و دیوار پر میری نظر جانا

ہماری سرد آہوں سے وہ بجھنا شمع محفل کا
اندھیرے میں وہ گھبرا کر کسی کم سن کا ڈر جانا

بُرائی دختر رز کی نہ ہوتی پھر سرِ ممبر
اگر زاہد کبھی اک گھونٹ بھی تو نے پیا ہوتا

ظلم سے کوئی فائدہ نہ ہوا - مر گیا میں ترا بھلا نہ ہوا
مجکو یہ کہکے یاد کرتے ہیں - ہائے وہ درد آشنا نہ ہوا

غش میں ہیں جو ہے مریض غم ہوش میں آئے یا نہ آئے
گیسوئے مشکبوئے یار تیری بلا کو کیا غرض

بدلی رہی جو یوں ہی کچھ روز آسماں پہ
پیرِ مغاں کے بر میں ہوگی قبائے واعظ

ہوگی سحر کو گرمی بازار حسن سرد
شب بھر دکھائے شعلۂ رخ کی بہار شمع

قلب لیلیٰ میں ہو قیس کی آہوں کا خیال
آئی جب بادِ صبا پردۂ محمل کی طرف

اِک عمر پیا ہجر میں خونِ جگر و دل
ہے پر ابھی ناداں ہوس جام ابھی تک

راہ میں کعبہ پڑا تھا کر لیا جھک کر سلام
سامنے آتے ہوئے اُس بت کے شرماتے ہیں ہم

بیکسی میں اپنی دل رویا جو فرطِ ضعف سے
درد نے اُٹھکر کہا کروٹ بدلواتے ہیں ہم

آئے تھے بے آبرو ہو کر جہاں سے رانکو
مضطرب دل سے پھر اُس بزم میں جاتے ہیں ہم

جفاؤں سے کلیجہ پک گیا ہے پیش خدا اب تو
تری فریاد لیکر او بتِ مغرور جاتا ہوں

لپٹ جائے غبارِ عاشقِ ناشاد دامن سے	کہ وہ گورِ شہیدِ ناز سے بچ کر نکلتے ہیں

سنبھل کے گذرے اِدھر سے ناقہ کہ خاک اُڑتی ہے ناتواں کی

افسوس دل میں رہ گئی سب دل کی آرزو	پوری ہوئی نہ ایک بھی بسمل کی آرزو
ممکن نہ تھی جو لیلیٰ پردہ نشیں کی دید	مجنوں کو تھی نظارۂ محمل کی آرزو
دل نے جس جلوہ کو پہلو میں نہاں دیکھا ہے	تم نے موسیٰ وہ سرِ طور کہاں دیکھا ہے
توبہ پہ گری بجلی اور گھر کے گھٹا چھائی	اب پیرِ مغاں بوتل کونے میں دھری کیوں ہے
یہ خشکیٔ لب کیا ہے یہ زردیٔ رخ کیسی	گر درد نہیں دل میں آنکھوں میں تری کیوں ہے
کس غیرتِ گلشن کا سودا ہے تجھے اے گل	اِس فصلِ بہاری میں یہ جامہ دری کیوں ہے

سنو تو مخبر کہ نجد سے کیا صدائے مجنوں یہ آرہی ہے

عشق سے کب غرض تھی وصلِ بتاں	جان اپنی ہمیں گنوانی تھی
ناامیدی نہ مٹا داغِ تمنا دل سے	اِس گلستاں میں یہ اک پھول کھلا رہنے دے
کبھی تو ہو آرزوئے کعبہ ہوس کبھی کوچۂ بتاں کی	بتاؤں کیا حال اپنے دل کا لگی ہے ظالم کو لو کہاں کی
صبا یہ پیغام میرا کہنا جو کوچۂ یار میں گذرنا	کہ جاں بلب ہے مریضِ فرقت خبر بھی ہے کچھ تمھیں وہاں کی
اِدھر ہے صیاد اُدھر ہے گلچیں چمک رہی ہے فلک پہ بجلی	خفا ہے کچھ باغباں بھی ہم سے الٰہی اب خیر آشیاں کی

خنداں

خنداں میرزا امجد علی رامپوری - دورِ موجودہ کے شاعر ہیں۔ رسالۂ نیرنگ رامپور سے کلام نقل ہوا۔

ہوا معلوم کہ بس ہوگیا سب خوں پانی	جائے خوں جبکہ مری چشم سے آنسو نکلا
ہم تو سمجھے تھے سبھی قافلۂ صبر لٹا	چشمِ خونبار سے جس روز کہ آنسو نکلا
بزم میں آپ کی کب چین کسی نے پایا	پیٹتا سر، کوئی سینہ، کوئی زانو نکلا

خندہ

خندہ میر شجاعت علی صاحب خندہ بریلوی مذاقیہ کلام کہنے کا شوق تھا۔ طبیعت میں ظرافت بیحد تھی [illegible] کے قریب بریلی میں زندہ و سلامت موجود تھے۔ دس بارہ غزلیں ہنگامِ ترتیب تذکرہ ہاتھ آئیں اُن کا انتخاب درج ذیل کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو +

ایک سے ایک شبِ ہجر میں بڑھ کر آیا	کبھی پسّو، کبھی کھٹمل، کبھی مچھر آیا

پھوس سے یار کو جاڑو نہیں تپایا شب وصل — کام آخر مرا ٹوٹا ہوا چھپر آیا
اپنی گھوڑی کو جدا کر تو سٹرک سے ای شیخ — ہنہناتا ہوا خندہ کا وہ خچر آیا

ہوں کوئی دس سیر چاول اور من بھر شیر ہو — ڈالدو کھاری نمک تو خوب میٹھی کھیر ہو
مے پرستو شیخ صاحب کی یہ اب توقیر ہو — پاؤں میں گھنگرو بندھیں اور ناک میں اک تیر ہو
کیا کوئی چھیڑے انھیں اور کیا لگائے کوئی ہاتھ — ناک کے پکڑے سے جنکی پھوٹتی نکسیر ہو
ہے دہن کا اُنکے بوسہ میرے سودا کا علاج — جس طرح اے خندہ تلّی کی دوا انجیر ہو

مرا رقیب الٰہی ذلیل و خوار رہے — گلے میں ٹوٹی ہوئی جوتیوں کا ہار رہے
لحاف اوڑھ کے چھپر پہ مائیوں بیٹھے — کہ جب نکاح کے دن اُنکے تین چار رہے
لگا کے آگ بجھانے کو جاؤں دیکھوں اُسے — مرے محلّہ میں آکر اگر وہ یار رہے

ہضم ہوتے نہیں اب پانچ روپے رشوت کے — لوگ کھاتے تھے پچاسے کے پچاسے پہلے
سینہ پر مار کے ہاتھوں کو وہ سر کوٹتے ہیں — ڈھول پیچھے سے بجا کرتے ہیں تاشے پہلے

جو شعر غیر کو اپنا بنا کے پڑھتا ہے — چھپے ہزار وہ لیکن مری نگاہ میں ہے

خواجہ نواب فیاض الرحمن احمد المعروف بہ پیارے صاحب خواجہ مقیم کلکتہ خاندان شاہی میسور سے ہیں شعر گوئی کا بھی شوق ہے۔ مولوی سیّد حیدر طبا طبائی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ یہ اِن کا کلام ہے۔

آئینہ لیکے کیجیئے انصاف — کیوں نہ عاشق ہوں ایسی صورت پر
رحم بلبل پہ چاہیئے صیّاد — چادرِ گل ہوا اُس کی تربت پر

اے صبا مجنوں سے کہدے چھوڑ دے وحشت کو — وحشتِ دل لے چلی مجھکو بیاباں کی طرف
لے دیئے جاں عشق میں اصلا نہیں عاشق کو چین — جائے پروانہ نہ کیوں شمع شبستاں کیطرف
دیکھ لو جذبِ دلِ مجنوں کی تاثیر اے بتو! — محملِ لیلیٰ رواں ہے خود بیاباں کی طرف

خواہاں۔ مولوی سیّد قاسم علی نقوی خلف سیّد ولدیت علی سیّد بریلوی سنہ ۱۲۶۴ سال ولادت

یہ بزرگ ایکے امروہہ کے رہنے والے تھے اپنے بزرگوں کی تقلید سے شعرگوئی کا اوائل عمر میں شوق ہوا۔ راجہ کالیچرن صاحب رئیس بریلی کی اُستادی کا شرف آپ کو حاصل ہے اور بریلی ہائی سکول میں فارسی کے مدرس ہیں۔ اکثر شاعری کا مشغلہ رہتا ہے کم وبیش چالیس سال سے آپ شعر کہتے ہیں اور بریلی کے اکثر نومشق شاعر آپ سے اِس فن میں مستفید ہوتے ہیں بندش مضمون کی طرف جسقدر توجہ ہے اُسی قدر شستگی زبان کی جانب سے بے پروائی معلوم ہوتی ہے ہنگام ترتیب تذکرہ میں پچیس غزلیں نظر سے گذریں جن کا انتخاب ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔

وہ مہر وش اگر سرِ بازار آویگا
خود ماہِ مصر ان کے خریدار آئیگا

ہوگا جو شوقِ آمدِ جاناں میں اضطراب
تسکین دینے وصل کا اقرار آئیگا

روئینگے پھوٹ پھوٹ کے پاؤں کے آبلے
مدت کے بعد ملنے جو ہر خار آئیگا

ایسا ہوں بدنصیب کہ بن جائیگا وہ دھوپ
سر پر مرے جو سایۂ دیوار آئیگا

دیدارِ چشمِ ساقی میکش کریگا مست
جو میکدے میں جائیگا سرشار آئیگا

عیش وصلِ یار سے فرقت کا غم کم ہوگیا
عید کا چاند اِن دنوں ماہِ محرم ہوگیا

آیا خیال ہمہ ہی زلفِ یار کا
بگڑا دماغ نافۂ مشک تتار کا

فرقتِ ساقی میں بگڑی ہیں کے میخانے کی بات
کون پوچھے خم، صراحی، جام، پیمانے کی بات

یارِ زینت دوست کو ہے شوقِ آرائش کمال
ذکرِ آئینہ ہے دن بھر رات بھر شانے کی بات

قید خانے میں مجھے فصلِ بہار آئی ہے
کھول اے دستِ جنوں پاؤں کی زنجیر کے پیچ

خطِ نسخ پھیرا کتابی رخون پر
ترے مصحفِ رخ نے قرآن ہوکر

جانبِ کعبہ جو گذرے بتِ پرفن ہوکر
بتکدہ شیخ حرم آئے برہمن ہوکر

پژمردہ فکرِ صبحِ شب وصل سے ہر دل
پہلے تجھے پڑے ہیں چراغِ سحر سے ہم

فرطِ عصیاں نے کیا ہے مجھے محرومِ نجات
رحمتِ حق جو کرے پاس تو کچھ دور نہیں

عشقِ ابرو میں ہرے زخمِ جگر کرتے ہیں
آب شمشیر سے اِس کھیت کو تر کرتے ہیں

مہمان جان کے لائے ترک ترے تیروں کو — خاطریں دل سے مرے زخمِ جگر کرتے ہیں
محضرِ ظلمِ جفا جو کے سند ہونے کو — مُہر پر مُہر مرے زخمِ جگر کرتے ہیں
ہے یہ سوزِ دلِ محزوں کہ ہر اک قطرۂ آب — آبلہ بنتا ہے ہونٹوں کو جو تر کرتے ہیں
شُہدا لیتے ہیں اُٹھ اُٹھ کے قدم قبروں سے — وہ اگر گنجِ شہیداں میں گذر کرتے ہیں
آجکل زور پہ ہے گردشِ قسمت اپنی — عیب ہو جاتا ہے خواہاں جو ہنر کرتے ہیں
قتل ہو جاؤں تو نیند آئے مجھے آرام سے — صبح کا جھوکا ہوائے دامنِ شمشیر ہو
جان پڑ جائے مرقعہ میں اگر آجائیں آپ — مائل پرواز ابھی ہر طائرِ تصویر ہو
کریں وہ غیر کی خاطر ہمارے جیتے جی — نہ کیسے لطفِ حیات اپنا بدمزا ہو جائے
چھُٹے گا عشق بتوں کا کبھی نہ خواہاں سے — ہزار متقی بن جائے پارسا ہو جائے
اے ادب آکے ذرا دیکھ مقامِ تسلیم — راہِ معشوق میں سر رکھتے ہیں پا سے پہلے
پڑی جس طرف کارگر ہو گئی — قیامت وہ تیغِ نظر ہو گئی

خواہش — **خواہش** حافظ مولا بخش صاحب خواہش شاہجہانپوری شاگرد حافظ نثار احمد صاحب ثابت۔ یہ دو شعر انکے ملے ؛

دلِ دوپارہ کو گر عشق کا بخار رہے — تو مرکے صورتِ سیماب بیقرار رہے
ڈاک بجلی سے خبر کسو واسطے جاتی ہے جلد — کیا نمونہ تار برقی ہے نظر کے تار کا

خواہش — **خواہش** منشی امیر حسن نام خلف اکبر مولوی حکیم سیّد امداد علی کاہش جونپوری حنفی مذہب قادری مشرب اور فنِ شعر میں اپنے والد کے شاگرد تھے۔ موضع بڑا گاؤں ضلع جونپور میں شادی ہو جانے کے باعث قیام اختیار کر لیا تھا۔ کچھ عرصہ مہاراجہ بنارس مرحوم کی سرکار میں ملازم بھی رہے تھے بعارضۂ سل حضرت کاہش کے انتقال کے تین چار سال بعد رحلت کی ؛

جمع زلفوں کے جو اجزائے پریشاں کرتے — بیتِ ابرو کو ترے مطلعِ دیوان کرتے
کھول کر زلف کو رُخ پر ترے لٹکا دیتے — ہم اسی پیچ سے ہندو کو مُسلمان کرتے

حال کیا ہم نفس سرد کا تجھ سے کہتے	گرم کیا تجھکو ہم اے نالۂ سوزان کرتے
عید کے روز مرے گھر جو وہ آتا خواہش	دل تو پہلے ہی دیا جان بھی قربان کرتے

خواہش

خواہش میر اللہ داد متوطن الہ آباد قاضی محمد خلیل کی بیاض سے ایک شعر نقل کیا جاتا ہے۔

ہر قدم پر ہیں آفتیں برپا	چال ہے یا کوئی قیامت ہے

خوب

خوب ڈاکٹر خوبداد خان صاحب ہیڈ اسسٹنٹ محکمہ کمسریٹ انکے والد مدح خان ریاست رامپور کے باشندے تھے انھوں نے ۱۸۹۶ء میں اپنا دیوان بھی چھپوا دیا ہے شعر خاصہ کہہ لیتے ہیں مضمون بھی نکل آتا ہے اور خیال بھی صاف ہوتا ہے۔ سرسری نگاہ میں جو شعر اچھے معلوم ہوئے انتخاب کر کے یہاں لکھے جاتے ہیں۔

مظہر ہے دل تجلّیِ حق کے ظہور کا	ہر دم مشاہدہ ہے یہاں اسکے نور کا
سینہ ہمارا وادیِ سینا سے کم نہیں	عالم ہمارے قلب پہ ہے کوہِ طور کا
کیوں ہے شیدا بتانِ کم سن کا	ناز کب تک تم اٹھائے گا ان کا
گھائل جگر و دل ہوئے صرف ایک نظر سے	ہے وصف نگہ میں تری کیا تیغ دو دم کا
ہے کس غضب کی الٰہی بہار گلچیں پہ	کہ ہوتے ہیں گل و غنچے نثار گلچیں پر
آیا گلزار سے اے شوخ جو کل تو ہو کر	رنگ ایک ایک گل تر کا اڑا تو ہو کر
کوئی مسجد کو چلا اور کوئی بتخانے کو	میں چلا جھومتا ساقی ترے میخانے کو
ہو سکتا ہے تو بحر کرم ہم سے کب جدا	ہوتا نہیں الگ کبھی دریا حباب سے
کی یہ کل ترکیب اُن کی ضد گھٹانے کیلئے	زلف کے شانے نے بوسے ہمنے شانے کیلئے

خوب

خوب - خوب چند نام عرف پاپالال تئیس برس کی عمر ہے شیخ محمد صاحب ہزبر سے تلمذ ہے ابھی مشق سخن کی ابتدا ہے۔ حیدر آباد دکن وطن ہے۔ کلام مرسلہ میں سے یہ چند شعر منتخب ہو کر درج کئے گئے۔

زمین ہے سرخ مانند شفق خون شہیداں سے	نہ کیوں ترکِ فلک کو رشک آئے کوئے قاتل پر

زمیں پر وہ تڑپ کر اس ادا سے جان دیتا ہے محبت ہے ترے تیر نظر سے	قضا بھی لوٹ جاتی ہے تمہارے رقص بسمل پر نکالوں کس طرح اسکو جگر سے

خورشید

خورشید۔ سید محمد خورشید علی بلگرامی ۱۹ اشعبان ۱۱۵۹ہجری میں بمقام بلگرام پیدا ہوئے ذوق علم جبلی تھا۔ سید محمد خلف علامہ عبد الجلیل بلگرامی کی خدمت میں تحصیل علم کیا آخر شعر کا شوق دامن گیر ہوا فارسی کہنے لگے پہلے شیخ صالع بلگرامی بعدہ شیخ محمد صدیق سخنور سے اصلاح لی اُسکے بعد حضرت آزاد بلگرامی کو بذریعۂ خط وکتابت حیدرآباد دکن اپنا کلام اصلاح کے لیئے بھیجا۔ اُس وقت تک فصاحت تخلص کرتے تھے حضرت آزاد نے خورشید تخلص بدل دیا۔ اُس کے بعد شیخ علی حزیں علیہ الرحمۃ سے فیض پایا۔

آغاز شباب میں بمقام کوڑا جہاں آباد سرکار شاہ عالم بادشاہ میں سرفراز اور الف خان رسالہ دار کے ہمراہ ہوئے۔ ملازمت ترک کرکے پھر نواب سید نور الحسن خان بلگرامی کے پاس چلے آئے انکے قرابت قریبہ میں تھے وہ ضلع شاہ آباد میں صاحبان انگریز کی طرف سے متعہد تھے خان صاحب نے اپنا کاروبار انکے سپرد کیا۔ آخر سرکار انگلشیہ میں بلیا کی تحصیل انکے سپرد ہوئی تھی کہ مرض لقوہ میں مبتلا ہوئے اور ۱۲ صفر ۱۲۰۱ہجری کو انتقال کیا۔ طرز زمانہ کے موافق کبھی کبھی اُردو میں فکر سخن کرتے تھے یہ چند اشعار اُنکے لکھے جاتے ہیں۔ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی انکے پڑپوتے تھے۔

مرا دل ہے مائل اب اُس تندخو کا لگا تیر اُلفت یہ دل میں کسو کا	جو پیاسا ہے ہر آن میرے لہو کا کہ جاری ہے آنکھوں سے دریا لہو کا
اسقدر بیتاب ہیں اس دل بیتاب کو صبا کہیو پیام اشتیاق اُس یار جانی کو	بیقراری جس طرح آتش پہ ہو سیماب کو کوئی کھوتا ہے تیرے ہجر میں اپنی جوانی کو
بیمار عشق کے ترے جینے پہ حرف ہے وہ آئے چڑھ کے گھر سے لڑائی کیواسطے	پانی کہاں وہ اُسکے بھی پینے پہ حرف ہے یاں پاؤں ٹیکتے ہیں ہم صفائی کیواسطے

کرتا دعا ہوں ساری خدائی کیواسطے	یارب خدا نہو وے کسی سے کسی کا دوست

خورشید

خورشید۔ میر سید علی مرحوم خلف سید مظفر علی قوم سید مذہب شیعہ۔ آپ قصبہ چلکانہ ضلع سہارنپور کے باشندے اور اچھے خاصے تعلیم یافتہ، خوش باش، خوش گذران زمیندار تھے، مزاج میں تہذیب، متانت اور تواضع کا سلیقہ قابل تعریف تھا۔ باہر کے باکمال جو سہارنپور آتے اِنکی کشش اخلاق سے اکثر انکے مہمان ہوتے تھے۔ فن سخن میں خورشید اور ذکا، دو تخلص کرتے تھے، مذاق سخن کی تحریک سے خود بھی دہلی اور لکھنؤ گئے اور وہاں کافی عرصہ تک باکمالوں کی صحبت سے فیضیاب ہوئے۔ آخر عمر میں زیادہ تر نعت کہنے کا شغل رہتا تھا۔ دیوان غزلیات سُنا ہے کہ مرتب تھا مگر اولاد کی غفلت سے اسکی اشاعت کی نوبت نہ آئی کربلا و نجف کی زیارت سے بھی بہرہ اندوز ہوئے تھے آخراہ برس کی عمر پاکر اپنے وطن ہی میں ۱۸۸۸ء میں وفات پائی۔ دونوں طرح کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

جھونکے اُداس آج جو بادِ صبا کے ہیں	گلچیں سے نے کوئی تازہ جفا کی چمن میں کیا
ہم کب سے منتظر تیری قُم کی صدا کے ہیں	مارا ہے گر، جلا بھی تو اے غیرت مسیح

ابر کو ہر لحظہ شرماتی رہی	برق کو غیرت یہ دلواتی رہی
چشم تر یہ اشک برساتی رہی	مثل دریا جوش میں آتی رہی

آبرو برسات کی جاتی رہی

گو وہ باغ سبز دکھلاتی رہی	دل سے دنیا کی ہوس جاتی رہی
حُر کو فوجِ شام بہکاتی رہی	عقل دور اندیش سمجھاتی رہی

حبِّ حیدر راہ بتلاتی رہی

خورشید

خورشید۔ پنڈت سورج پرشاد خورشید وکیل فرخ آباد خلف پنڈت آسارام۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے دیوان مطبوعہ نظر سے گذرا اُس کا انتخاب درج ذیل ہے کلام میں کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں ہے ۱۲۹۵ھ تک حیات تھے +

پرنیاں شہ کو مبارک ہو گدا کو کمل
میں تو دیتا ہوں دعا تم مجھے دشنام ہی دو
اقبالِ خدا داد کی ہے اور ہی صورت
کھلنی ہی نہیں دل کی کلی باغ جہاں میں
آج مختار ہیں جو ظلم وہ چاہیں کرلیں
یدِ بیضا کو ہتھیلی کا پھپولا سمجھیں

جامہ بخشا ہے جنوں نے مجھے عریانی کا
کچھ تو ملجائے صلہ مجکو ثنا خوانی کا
آئینہ بنانے سے سکندر نہیں ہونا
مٹھی میں جو غنچہ کی طرح زر نہیں تہا تو
حشر کو ہوگا مرے ہاتھ میں دامن انکا
دیکھیں جو حضرتِ موسیٰ رخِ روشن انکا

خوابِ راحت ہے کہاں نادان و پرخرخ میں
گردشِ ایام سے پھرتا نہیں اپنا نصیب
کون سا افسوں نہیں تیری نگاہِ ناز میں
تھی کسے جوشِ جوانی میں خبر انجام کی
نہیں جاتی اصالت آدمی کی صحبتِ بد سے
عشق لکڑی کو بھی ہے بے سر و ساماں کرتا
نہ ذبح کر مجھے ظالم کہ صید لاغر ہوں
دہانِ زخم سے چوسا زبانِ خنجر کو
غبار ہو کے پڑے دیدۂ رقیب میں ہم
اربابِ صفا زنگ کدورت سے بری ہیں

گردشِ ایام ہے اے دل یہ گہوارہ نہیں
اخترِ قسمت مرا ثابت ہو سیارہ نہیں
کان ہے جادو کی چشم شعبدہ پرداز میں
عشق بازی کھیل اک سمجھے تھے ہم آغاز میں
ہو آہن رہے جو پاس آہن کے طلا برسوں
بیدِ مجنوں میں گل و برگ و ثمر کچھ بھی نہیں
عبث لہو میں نہ بھر ہاتھ منتِ پر کے لیئے
مزے وصال کے کیا کیا نہ ہمنے مر کے لیئے
لیئے عدو سے جو بدلے تو ہمنے مر کے لیئے
خورشید کے چشمے میں تو کائی نہیں ہوتی

ملکِ عدم کو اب کوئی پیاسا نجائیگا
پھٹ جائیگا شکم غمِ دنیا بہت نہ کھا
پھولو نہ بلبلو اچمن بے ثبات پر

قاتل نے آبِ تیغ کی رکھی سبیل ہے
اے بوالہوس غذا یہ نہایت ثقیل ہے
غنچوں کی جو چٹک ہے وہ کوسِ رحیل ہے

خورشید

خورشید۔ خورشید احمد خورشید از اولاد حضرت شیخ احمد صاحب سرہندی اوائل میں شاہ رؤف احمد سے بیعت کی بعد میں شاہ سعد اللہ حیدرآبادی سے فیض یاب ہوئے اطراف ہندوستان

اور خراسان - فرغانہ - سمرقند - فارس - بخارا - بلخ - ممالک دور دراز میں مدت سفر کیا اور ہر صاحب کمال سے فیض حاصل کیا - فن شعر میں پہلے شاہ رؤف احمد صاحب رافت اپنے پیر سے اور آخر میں مومن خان اور نواب اسد اللہ خان سے مستفید ہوئے دہلی میں ولادت ہوئی تھی - فارسی اردو دونوں زبانوں میں شعر خوب کہتے تھے - یہ آپکے کلام کا انتخاب ہے ؏

کہاں پہلو میں دل خورشید جسکو ہم تسلی دیں	جو کچھ تھا آنسوں کے ساتھ خوں ہو کر نکل آیا
جاتا نہیں آنکھوں سے تصور کبھی خورشید	موجود ہے ہر وقت وہ گویا میرے آگے
نوید وصل یہ مانا کہ جھوٹ ہے خورشید	کسی طرح کوئی تسکین اضطراب تو دے
بتوں کے عشق سے باز آتے ہی نہیں خورشید	رلاتا ہے انکو محبت میں کیا مزہ دیکھے

خورشید

خورشید - سید محمد مصطفی خورشید عرف مولوی لڈن نبیرہ مولنا سید دلدار علی صاحب مجتہد العصر اوائل عمر سے شعر گوئی کا شوق رہا - عربی فارسی اور فنون شاعری مثل عروض و قافیہ سے اچھی طرح واقف و ماہر تھے فن سخن میں پہلے اپنے ماموں سید محمد جعفر امید اور پھر آغا حجو لکھنوی سے مشورۂ سخن کرتے تھے علاوہ غزل کے مرثیہ و نوحہ و سلام بھی کہتے تھے - اکثر ایام محرم میں مثل اور مرثیہ خوانوں کے یہ بھی باہر جایا کرتے تھے دو مرتبہ کربلائے معلی کی زیارت بھی کی - نواب مہدی علی خان ماہر داماد نواب تاج محل صاحبہ کی لڑکی ان سے منسوب تھیں - انکے خاندان میں اکثر بزرگ صاحب علم و فضل گذرے ہیں - کئی سال تک ایک ماہوار رسالہ "شعر و سخن و انتخاب" نامی اپنے اہتمام سے نکالتے رہے ۵۴ برس کی عمر میں ۱۹۱۰ء کو انتقال کیا - ایک دیوان اردو ایک رسالہ موسوم بہ "افادات" ان سے یادگار ہے - "افادات" میں اپنا حال اور عروض و قافیہ اور اپنے متروکات وغیرہ تحریر کیئے ہیں - یہ مختصر رسالہ نہایت قابلیت سے لکھا ہے شاعری اور عروض میں مشاق شاعر تھے اور مذاق سخن بھی اچھا تھا - اکثر ارباب فن انکے شاگرد ہیں - انکے کلام کا انتخاب درج ذیل کیا جاتا ہے ؏

موسی کی طرح طالب دیدار کون ہو	اس دل میں کیا نہیں جو سر کوہ طور تھا

ہیں بخشتا گناہ کیے گو کہ ہے کریم
رحمت کو ڈھونڈتے تو ہمارا قصور تھا

زہاد سے کہتا ہے وہ بت سامنے آ کر
اب دیکھ لو گر شانِ خدا کو نہیں دیکھا

تنکا تنکا جمع کیوں کرتے بنانے کس لیے
ہم نہ سمجھے تھے کہ برباد آشیاں ہو جائیگا

مرمٹوں کی تربتیں کردو برابر شوق سے
یہ بھی اپنی بے نشانی کا نشاں ہو جائیگا

مانا نظر پڑی تھی دل آیا پھر اس پہ کیوں
آنکھوں کی کیا خطا سب اسی کا قصور تھا

عشقِ جاناں میں ہوئی باعثِ رونق ہر شئے
درد بھی دل میں رہا زینتِ پہلو ہو کر

ستم کیے تو کئے اب تو صاف ہو مجھ سے
جو کچھ ہوا وہ ہوا یہ کہو خفا تو نہیں

طلب پہ بوسہ کی کیوں اسقدر بگڑتے ہو
زبان ہی سے کہا تھا چلو لیا تو نہیں

حفظ جان ہجر میں اشتیاق بہت ہے اے دوست
کسکو کہدے اُسے دیدوں میں امانت تیری

یہ منہ کو پھیر کے کیسے اشارے ہیں دمِ ذبح
حلال کرتا ہے ظالم کسے دکھا کے مجھے

عاشق ہی کا یہ دل ہے کہ ساکت ہے میرے جان
پتھر بھی جو ٹوٹیں گے تو فریاد کریں گے

بتوں کے قبضۂ قدرت کو کوئی کیا جانے
یہی ہیں وہ کہ جو برسوں خدا کے گھر میں رہے

ہم ایسے زار بھی کہیں دیکھے ہیں اے حباب
تن کے عوض ہوا ہی ہوا پیرہن میں ہے

دل سے اُٹھے نہ دھواں عشق میں جلتا ہوں ہی
یوں تو اک شمع بھی ہے بزم میں جلنے کے لیے

دم رہے تیرا جہاں میں شبِ فرقت باقی
نہ رہے گی کوئی دُنیا کی مصیبت باقی

ہر آن بانیِ ستم و جور ہو گئے
تم تو جوان ہوتے ہی کچھ اور ہو گئے

خورشید

خورشید۔ حاجی میرزا خورشید احمد خاں خورشید۔ خلف شاہ انوار الحق ساکن گوپامئو نواب عظیم جاہ۔ جی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ شاہزادہ ارکاٹ کے داماد ہیں اور مدراس میں رہایش ہے زیادہ حال معلوم نہ ہو سکا۔

خالی ہی ہاتھ جائیں گے آئے تھے جیسے ہم
لایا نہ ہو جو کچھ بھی تو پھر لیکے جائے کیا ؟

اب وہ تیر مژہ چلاتے ہیں
دل کو تو وہ مرے بناتے ہیں

رُخ کے بوسے جو لیتی ہے کاکُل	ہم یہاں پیچ و تاب کھاتے ہیں

خورشید

خورشید منشی خوش وقت علی خان خلف منشی داؤد خان نخانہ دار اکبرآباد کے رہنے والے اور میرزا فتح الدولہ برق کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ نواب کلب حسین خان نادر کے دوستوں میں تھے، نہایت خوش فکر اور طبّاع سخن سنج تھے، آٹھ نو شعر سے زیادہ کی غزل نہیں کہتے تھے مگر غزل مرصع ہوتی تھی اور اہل مشاعرہ پھڑک جاتے تھے۔ منیر شکوہ آبادی کے ہمعصر اور نواب فرخ آباد کے ہاں ۱۸۵۴ء میں ملازم تھے۔ طاہر اکبرآبادی نے اپنے بچپن میں انھیں دیکھا تھا۔

بوسے دہانِ تنگ سے تم جی پھڑک گیا	یہ کس طرف گلاب کا غنچہ چٹک گیا
ایذا اُٹھا چکا ہوں محبّت کے درد کی	کھینچی کسی نے آہ میرا دل دھڑک گیا
گردن میں ہے کمندِ محبت پڑی ہوئی	جلنے کھینچے حضور میں آگے سرک گیا
خورشید مرحبا یہ محبت کا جوش ہے	آئی بہار ہاتھ میں ساغر چھلک گیا
جدائی کے صدموں کو ٹالے ہوئے ہیں	چلے جاؤ ہم دل سنبھالے ہوئے ہیں
عجب مست اللہ والے ہوئے ہیں	چُھنے موتیوں کے نوالے ہوئے ہیں
لحد میں کس بل نکل جائیں گے	مرینگے تو سانچے میں ڈھل جائینگے

جبتک ہو روح جسم میں چلتے ہیں ہاتھ پاؤں	دولھا کے دم کے ساتھ یہ ساری برات ہے
پیری میں ولولے وہ کہاں ہیں شباب کے	اِک دُھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

خورشید

خورشید میرزا عباس عرف میرزا خورشید مدرسِ فارسی مدرسہ کراچی۔ چندے حیدرآباد سندھ میں بھی ملازمت کی تھی ۱۸۷۶ء میں زندہ تھے۔ شعر اچھا کہتے تھے اور ترکیبیں بھی صاف سُتھری برتتے تھے طبیعت کا میلان زیادہ تر مضمون کی طرف ہی۔ یہ انکا کلام ہے۔

جگہ دی جب سے دل میں ہمنے عشق شوخِ پُرفن کو	بنایا دوست کو دشمن بنایا دوست دشمن کو
مجھے زنجیر پا کیوں مانعِ صحرا نوردی ہو	گلا دیتی ہے میری گرمئ رفتار آہن کو
فلک کی فتنہ پردازی سے شاید جانبری ہووے	اگر تحت الثریٰ یا لامکاں لیجاوے مسکن کو

ہُوا برباد تیری راہ میں مشتِ غبار اپنا
چمن میں آنکھ کھولی تھی کہ صیّاد آگیا سر پر
رقیب روسیہ پر بھی کبھی تیغ آزمائی ہو
کریں پھر محفلِ کثرت میں کیوں ہنگامہ آرائی
ہُوا خورشید عاشق اُن پہ جو اچھا سمجھتا ہے

جھٹکنا پر نہ چھوڑا تو نے ظالم اپنے دامن کو
رہی حسرت یہ بلبل کو نہ دیکھا میں نے گلشن کو
ہمارا کیا ہے ہم تو لو جھکا دیتے ہیں گردن کو
ملے گر مجلسِ وحدت میں جا شیخ و برہمن کو
سمجھنا دوست کو دشمن سمجھنا دوست دشمن کو

خورشید۔ مہرِ سپہرِ فصاحت و سخندانی نیّرِ اوجِ بلاغت و زباندانی قاضی غیاث الدین احمد صاحب خورشید ابن قاضی حسام الدین احمد مرحوم بزرگوں کا وطن شاہجہاں آباد دہلی ہے مگر اب عرصہ سے قصبہ سکندرآباد ضلع بلند شہر میں سکونت ہے وہاں کا عہدۂ قضا روز آبادی سے انکے خاندان میں چلا آتا ہے۔ جناب خورشید بہ سلسلۂ ملازمت چند سال ریاستِ گوالیار میں رہے اب عرصہ سے خانہ نشین ہیں دہلی مقام پیدایش ہے اور وہیں انہوں نے اپنی ننہال خاندان شیخ عبدالحق محدث دہلوی میں تعلیم و تربیت پائی مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے برادرزادہ مولانا محمد حسن تائب مرحوم تلمیذ فخر الشعرا میر نظام الدین ممنون سے فن شعر کی تحصیل کی اور مولانا مرحوم نے نہایت دلسوزی اور محنت سے رموز سخنوری و نکات شاعری کو ان کے دلنشین کیا۔ سن شریف اب ۱۹۱۴ء میں ۵۸ برس کا ہے صاحب دیوان ریختہ ہیں۔ اکثر غزلیں حضرت داغ دہلوی اور دیگر مشاہیر زمانہ حال کی زمینوں میں کہی ہیں اور حق یہ ہے کہ اپنی خداداد ذہانت اور مشاقی فن کا سکہ بٹھا دیا ہے۔ راقم تذکرہ کے ملاقاتی ہیں۔ دہلی میں دو مرتبہ خاص مجھ سے ملاقات کے لیے تشریف لائے کلام بھی منتخب کر کے بھیجا قاضی نجم الدین برق شاگرد رشید حضرت مومن انکے حقیقی چچا تھے۔ سخن طرازی میں اعلیٰ درجے کی قابلیت حاصل ہے پڑھتے بھی اچھا ہیں ترکیب بیان نہایت دلچسپ ہے اور متانت سے خالی نہیں انکے کلام میں اکثر اشعار ناخن بدل پائے جاتے ہیں۔ بلاغت اور فصاحت دونوں اپنے اپنے محل پر انکے کلام میں اپنا اپنا جلوہ دکھاتی ہیں۔ مضمون آفرینی کا بھی خاصہ ملکہ ہے۔ بڑے

مہذب متین اور منکسر المزاج شخص ہیں فکر سخن سے کسی وقت خالی نہیں رہتے۔ دیوان اگرچہ چھپا نہیں مگر مرتب موجود ہے ❊

شایانِ حمدِ حق جو نہ مضموں رقم ہوا
اس جرم میں قلم کا سدا سر قلم ہوا

چھوٹا یہ رنج و غم سے اُنہیں یہ الم ہوا
میں خوش ہوا اُنہیں مرے مرنیکا غم ہوا

طاعت نہ کام آئی تہ بندوں کی بندگی
آخر شریکِ حال اُسیکا کرم ہوا

دونوں گھروں میں ایک تجلی کا ہے ظہور
جلوہ وہی ہے دیر ہوا یا حرم ہوا

کس باوفا کو یاد کیا گا لیوں سے آج
کس کے کھُلے نصیب یہ کس پر کرم ہوا

کچھ فخر جام جم کو نہیں اُنکے دور میں
جو جام اُنکے مُنہ سے لگا جام جم ہوا

مجکو تو دوستوں سے بھی ملنے کا رشک تھا
دشمن سے تم ملے یہ ستم پر ستم ہوا

خون ہونے کے لئے خاک میں ملنے کے لئے
روز اس دل میں نئے ہوتے ہیں ارماں پیدا

کرتے ہو ستم مہر و محبت کے عوض میں
یہ جرم تو تعذیر کے قابل نہیں ہوتا

کہدیا شوق میں پہلے تو یہ رونا اب ہے
ہائے قاصد کی زباں اور فسانہ دل کا

رفتہ رفتہ ترے بیمار نے صحت پائی
ضعف سے درد گھٹا سوت سے آزار گھٹا

لیکے کب نکلے ہیں ہم گوہرِ مضموں خورشید
آہ جس وقت میں نرخ دُرِ شہوار گھٹا

صحرا چمن کیا مرے پائے فگار نے
گلگوں ہر ایک خار بیاباں کا ہو چکا

اک ناتواں کا خوں لو رستے سنان و تیر
دل سے مقابلہ صفِ مژگاں کا ہو چکا

ملیں جگر میں، سینہ میں، پہلو میں جا بجا
قبضہ کہاں کہاں تیرے پیکاں کا ہو چکا

اُس بُت نے ایک کو نرکھا اپنے دین پر
مذہب خراب گبر و مسلماں کا ہو چکا

تھاموں دل و جگر کو میں کیا ایک ہاتھ سے
اک ہاتھ تذتوں سے گریباں کا ہو چکا

ہوگا خرام ناز سے کیا اہل حشر پر
محشر تو ایک جنبشِ داماں کا ہو چکا

میسر تک نہیں خارِ وطن بارِ وطن کس کا
تڑپا ہے دشتِ غربت میں یہ لاشہ بے کفن کسکا

مجھے مرنے پہ کیا کیا رشک ہے اُس مرنیوالے کے
یہ تم بیٹھے ہو ایسا سوگ لیکر جانِ من کسکا

عقیدہ کھل گیا اُس کا پڑی کافر نظر جس پر
ڈھکا رکھتی ہے پردہ اُسکی چشم سحر فن کسکا

زبانِ شکر رعبِ حسن سے واں بند ہوتی ہے
کھلے شکووں پہ اُسکے روبرو جاکر دہن کسکا

خوشی میں جسکا گذرے وقت غم سے کیا غرض اُسکو
وہ محوِ عیش و عشرت ہیں سُنیں رنج و محن کسکا

پڑے ذرا تو کلیجے کی آگ پر پانی
جگر کے داغ پہ پھوٹے جو آبلہ دل کا

دل تڑپتا ہے مزے لیلیکے اس نخچیر کا
او قدر انداز کیا کہنا ہے تیرے تیر کا

درازی میں کوئی اُسکے برابر ہو نہیں سکتا
شبِ غم کے مقابل روزِ محشر ہو نہیں سکتا

پابند حیا رہنا یا ترکِ حیا کرنا
اوّل شبِ وصلت ہے آخر ہمیں کیا کرنا

طبیعت اِس قدر بگڑی کہ اندازِ سخن بگڑا
کوئی مضموں جو تیرے وصل کا ای جانِ من بگڑا

یہ قد بوٹا سا، لب گلبرگ تر، عارض گلِ رنگین
چمن کا رنگ تیرے سامنے رشکِ چمن بگڑا

کس جا نہ جلوہ گر تری وحدت کا نور تھا
جلوہ ترا تھا عام نظر کا قصور تھا

کیا اُسکو ہو خبر کسی خاطر شکستہ کی
وہ مستِ ناز اپنی جوانی میں چور تھا

واہ کس شوق سے تھم تھم کے چھری پھیری ہے
میری گردن پہ ہوئے آپکے احسان بہت

شرارت چشم پر صدقے، فدا شوخی ہے چتون پر
ادائے دلفریبی آپ غش ہے اُن کے جوبن پر

خوشی وہ غیر کی کرتے ہیں میرے رنج دینے کو
مرے صدقے ہیں گویا یہ کرم ہوتے ہیں دشمن پر

غنیمت ہے ہوا مر کر تو لطفِ زندگی حاصل
وہ ظالم فاتحہ پڑھنے کو آیا میرے مدفن پر

نکالا قتل کا میرے نیا انداز قاتل نے
رکھی ایک تیغ بر گردن، رکھی اک تیغ گردن پر

مجروح دل پہلو میں ہے زخمی جگر سینہ میں ہے
یہ بھی کوئی دستور ہے گھائل ہے گھائل کے پاس

خورشید راہِ عشق میں اس گرم رفتاری کیساتھ
کیوں سرد ہو جاتے ہو تم آتے ہو جب منزل کے پاس

جوشِ وحشت میں بہم ربط ہوا ہے ایسا
ہاتھ ہوتا نہیں دم بھر کو گریبان سے الگ

یہ مری خاک ہے ظالم تو جھٹکتا کیوں ہے؟
اب نہ ہوگی یہ ترے گوشۂ داماں سے الگ

کانوں میں ہیں بیوفا نہ یاسمن کے پھول
شیریں نے ایک دن نہ بنایا گلے کا ہار
یارب دلوں کی خیر وہ کہتا ہے دلفریب
خورشید کس غضب کی کہانی کہی کہ آج

ہیں آج تیرے کشتۂ رنج و محن کے پھول
تیشہ سے روز جھڑتے رہے کوہکن کے پھول
دیکھیں تو کوئی دیکھے ہمیں اور نہ آئے دل
اپنی طرح ہمیں بھی کیا مبتلائے دل

مایوس ہوگئے ہیں قبولِ دعا سے ہم
کہتے ہیں سکو شوق کہ نکلا جدھر سے تو
ہاں سچ تو ہے جو تم سے ستمگر کو دیدیا
کام آئیگی مصیبت ہجراں میں ایکدن
قامت میں قیامت کے برابر تو نہیں تم
پھرتے ہو خفا مجھسے پھر الٹی ہے شکایت

ملتا تو مانگتے نہ بتیں کو خدا سے ہم
آنکھیں ملا کیئے ترے ہر نقش پا سے ہم
ایسے ہی دق ہوئے تھے دلِ مبتلا سے ہم
پیدا کرینگے رسم محبت قضا سے ہم
فتنہ ہو مگر فتنۂ محشر تو نہیں تم
پھر جاؤ تو کچھ میرا مقدر تو نہیں تم

کہنے کو کہدیں یونتو ابھی دل کا راز ہم
سجدہ خدا کو کرتے ہیں دل میں بتوں کی یاد

دیکھیں ابھی دردِ دل کا کوئی چارہ ساز ہم
نادم ہیں خود کہ پڑھتے ہیں کیسی نماز ہم

جب ظلم کریں آپ تو کیونکر نہ کہیں ہم
تم کو تو نہ توفیق ہوئی پرسش غم کی
آتے ہی ترے بزم میں اک پڑ گئی ہلچل
شوخی ہے طبیعت میں فصاحت ہے زبان میں

کیا خوب ستمگر کو ستمگر نہ کہیں ہم
پھر آپ بھی حالِ دلِ مضطر نہ کہیں ہم
اسپر بھی تجھے فتنۂ محشر نہ کہیں ہم
خورشید کو کس طرح سخنور نہ کہیں ہم

آبلے پاؤں کے برسوں سے لیئے پھرتے ہیں ہم
دستِ وحشت کو مرے اب تو ملے گی فرصت
گھر آیا ہے ابر باراں میکدہ پر جوشش رحمت ہے
کہیں کس منہ سے ہجر یار میں مونس نہیں کوئی
عیش کے یار تو اغیار بھی بن جاتے ہیں

اپنے قسمت کے تو کانٹے بھی بیاباں میں نہیں
ایجنوں اب تو کوئی تار گریباں میں نہیں
رہیگی حرمت توبہ کہا تک بادہ خواروں میں
ابھی اک بیکسی باقی ہے اپنے غمگساروں میں
دوست وہ ہیں جو برے وقت میں کام آتے ہیں

دیکھیئے ہجر کی شب میں ہو سحر تک کیا حال / غش پہ غش مجکو ابھی سے سرِ شام آتے ہیں
ایک پر ایک گرا پڑتا ہے مشتاقِ جمال / شور برپا ہے کہ اب وہ لبِ بام آتے ہیں
کچھ عجب لطف اُٹھاتی ہے طبیعت خورشید / جب کبھی سُننے میں اشعار نظام آتے ہیں

دونوں ہیں دردِ عشق کے بیمار کیا کروں / دل کی دوا کروں کہ میں اپنی دوا کروں
جی چاہتا ہے عشقِ گزشتہ کا ماجرا / بیٹھا کوئی سُنا کرے اور میں کہا کروں

کہتے ہیں لوگ مر کے یہ چھوٹے گا رنج سے / مجکو یہی ہے غم کہ غمِ جاوداں نہیں

پانی ہو تری تیغ کا اور اپنا گلا ہو / چھُوٹنے کا نہیں ہاتھ سے گر آبِ بقا ہو
ہنگامۂ محشر تری چالوں سے بپا ہو / ٹھکرا کے کہے تو مرے مرقد سے کھڑا ہو

مرنے کے بعد تم ہی تو آؤ گے قبر پر / تم ہی تو فاتحہ بھی پڑھو گے اُٹھا کے ہاتھ

لگیگی ایک گھر کی آگ سو گھر اسلیئے چپ ہوں / پھُکیگا اک جہاں دل سے جو آہِ آتشیں نکلی
کروں اصرار کیونکر وصل کے وعدہ پہ ڈرتا ہوں / نہ ہوگی عمر بھر پھر ہاں اگر منہ سے نہیں نکلی
شب عذر امید و یاس کے جھگڑے رہے کیا کیا / کبھی ٹھہرا دلِ مضطر کبھی جانِ حزیں نکلی

یا تو ہمارے دل کو الٰہی قرار دے / ورنہ تو اِن بتوں پہ ہمیں اختیار دے

جدھر اُس کی کافر نظر ہوگئی / خدا کی خدائی اُدھر ہوگئی
وہ اپنی طبیعت سے مجبور ہیں / جدھر ہوگئی بس اُدھر ہوگئی
جگر ہو کہ دل ہو وہ تیغِ نظر / جہاں پڑگئی کارگر ہوگئی

جواب دادخواہاں داورِ محشر کو کیا دوگے / بتو اِک روز تم کو بھی خدا کو مُنہ دکھانا ہے
جسقدر تم کو تغافل ہو محبت ہو ہمیں / بیوفائی میں تمھاری یہ کمال اچھا ہے

قوت نہ آہ کی ہے نہ طاقت فغاں کی ہے / حالت بہت خراب دلِ ناتواں کی ہے
قاصد سے اب پیام زبانی پہ ہے یہ رشک / کیوں اس زباں پہ بات بھی اُنکی زباں کی ہے
آنکھوں کو لطف دید کا کانوں کو بات کا / قسمت جو دیکھیئے تو ترے پاسباں کی ہے

بدظن ہے رازداں سے نگہباں سے مشتبہ
آفت میں جان اپنے دلِ بدگماں کی ہے

اے بختِ خفتہ ایسی بھی غفلت کی نیند کیا
آخر کچھ انتہا بھی تو خوابِ گراں کی ہے

کیا پوچھتے ہو دل پہ جو گذری فراق میں
تم سن بھی لو پہ تاب ہمیں کب بیاں کی ہے

ہے شرم تیرے ہاتھ مدد سے گدازِ عشق
کچھ جسم میں نمود ابھی استخواں کی ہے

تا مشتِ استخواں کو نہ میرے ملے جگہ
حجت ہے اُن کو یہ کہ زمیں آسماں کی ہے

قبضہ بتوں کا گھر میں خدا کے بھی ہو گیا
بندی نماز کی ہے منادی اذاں کی ہے

خورشید شاعری میں فصاحت کا ہے مزہ
سچ پوچھئے تو شعر میں لذت زباں کی ہے

حور و بہشت کو دیکھوں کہ میں اسکو دیکھوں
وہ کسی وقت مرے حال سے غافل نہ رہے

کشش دل ہو مددگار تو کیا غیر کا گھر
تو تو جنت میں بھی اے حور شمائل نہ رہے

میں تو دیکھوں نہ کبھی بھول کے اُسکو خورشید
کیا کروں جب کہ مرے کہنے میں مرا دل نہ رہے

تم تو تم ناز عدو کے بھی اُٹھائے ہونگے
ایک دن یہ بھی محبت میں ہوا رکھا ہے

تصور میں ہمارے کاش یہ تاثیر ہو جاتی
کہ قید آہوں میں آکر یار کی تصویر ہو جاتی

نہ اُٹھنا حشر کے دن بھی مرا سر اس ندامت سے
مرے خوں سے جو آلودہ تری شمشیر ہو جاتی

شرر افشاں جو مجنوں آہ تیرے دل سے نکلیگی
بجھاتی آگ لیلیٰ پردۂ محمل سے نکلیگی

ذرا چھیڑ تر ستم سخت جانی آج برسوں میں
گلے ملنے کی حسرت خنجر قاتل سے نکلیگی

آنکھیں وہ فتنہ گر میری آنکھوں میں ڈالکے
سینے سے لے گیا ہے ابھی دل نکال کے

حسن اور عشق کے جھگڑو نہیں مزا جب آگئے
حیلہ گر تم سا ہوا اور سے آئے طبیعت میری

اہلِ ایماں کا خدائی میں ٹھکانا نہ رہا
دعویٰ کرتا ہے وہ کافر کہ ہے جنت میری

سوزشِ دل کے ہوئے اور یہ درماں اُلٹے
لب پہ آآ کے پھرے نالۂ سوزاں اُلٹے

جو سنتے ہو تو سنو غمزدوں کا دردِ دل پیچھے
ذرا ہاتھوں سے اپنے تھام لینا تم جگر پہلے

نہیں کچھ بازیٔ طفلاں لگانا دل کہیں خورشید
وہ کھیلے کھیل اُلفت کا جو کھیلے جان پر پہلے

کہتے تو ہیں کہ دل میں ترے گھر بنائیں گے | پر سوچتے ہیں دل میں کہ کیونکر بنائیں گے

ہیں وہ محروم قسمت ہوں نہ جانا آجتک میں نے | امید وصل کیا ہے حسرت دیدار کیسی ہے

مہروش تجھ سے خجل شب کو قمر ہو کے رہے | رخ سے سر کے جو دوپٹہ تو سحر ہو کے رہے

جس کو دیکھا نگہ ناز سے مارا اسکو | دیکھ لینا تری آنکھوں کو نظر ہو کے رہے

میں تو ترے سبب ہوں مصیبت میں مبتلا | تو میرے ساتھ اے شب ہجراں بلا میں ہے

قسمت کا اپنی پیچ کھلا ہے نہ کھل سکے | وہ اور ہے جو آپ کی زلف دوتا میں ہے

خورشید ایسی چوٹ لگی ہے کہ کیا کہوں | ہر وقت اک کھٹک سی دل مبتلا میں ہے

دیکھئے غم میں ترے جان رہے یا نہ رہے | ہے کوئی دن کی یہ مہمان رہے یا نہ رہے

تو سلامت رہے آباد ہے تجھ سے دنیا | ہم سے ناشاد مری جان رہے یا نہ رہے

فائدہ حجت ناحق سے بس اتنا کہدو | تم کہیں رات کو مہمان رہے یا نہ رہے

یار ہے، شیشہ و ساغر ہے، کروں کیوں تاخیر | پھر خدا جانے یہ سامان رہے یا نہ رہے

سانس کے ساتھ نکلتے ہیں شرارے منہ سے | سوزش دل نے کلیجے کو جلا رکھا ہے

دلربا گھات میں پھرتے ہیں کوئی چھین نہ لے | دل کو ابتک تو میری جان بچا رکھا ہے

آفت جان تو حسینوں کی ادا ہوتی ہے | ورنہ دیکھو تو ترے حسن میں کیا رکھا ہے

خورشید

خورشید۔ منشی شیخ محمد سعید خورشید۔ موضع شفیع ضلع منٹگمری پنجاب میں مقیم اور حضرت جلال لکھنوی کے شاگرد تھے۔ شعر گوئی کا خاصہ مادہ ہے۔ یہ انکا کلام ہے :-

ٹھوکریں کھاؤ سر طور تمہیں لے موسیٰ | جلوہ گر دل ہی میں ہمنے رخ جاناں دیکھا

اسکو جلنا تھا تو شمع سر محفل ہوتا | رونق بزم بتاں کاش میرا دل ہوتا

کسی کے قتل کو اس کی بلا نکلتی ہے | کہ جسکے کوچے سے بسمل قضا نکلتی ہے

خورشید

خورشید۔ پنڈت بلدیو کشن صاحب تکو المتخلص بہ خورشید۔ آپکے والد بزرگوار ریاست جموں و کشمیر میں بعہدہ سپرنٹنڈنٹی پولیس ممتاز تھے۔ آپ خود لاہور میں انسپکٹر تحصیل

چونگی ہیں اور ٹمپرینس ایسوسی ایشن لاہور و کشمیری پنڈت نیشنل ایسوسی ایشن کے سکرٹری ہیں اوائل سے فن شاعری کا شوق ہے اور اٹھارہ اُنیس برس سے طبیعت ادھر مائل ہے عشقیہ غزلیں کہنے سے اجتناب ہی زیادہ تر ٹمپرینس سوسائٹی کے متعلق مضامین پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اور اکثر ٹمپرینس سوسائٹی کے سالانہ جلسوں اور منرو الوخ کے اجلاسوں میں دادِ سخن دیا کرتے ہیں۔ آپ اپنا دیوان مرتب کر رہے ہیں جسے عنقریب چھپوانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ زمانۂ حال کے شعرا میں انکا شمار ہے۔ کلام میں سادگی ہے زبان شستہ ہے اور نفس مضامین اخلاقی ہوتا ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

نہ وہ اوصاف ہیں ہم میں نہ وہ اُلفت رہی ہم میں
ہماری غفلتوں سے دیکھئے سارا وطن بگڑا

ذرا دیکھو تو بگڑی کسقدر حالت ہماری ہے
روش بگڑی، چلن بگڑا، ہمارا پیرہن بگڑا

اگر دل میں خیالاتِ من و مائی نہ لاؤ تم
تو اس اُجڑے چمن کو آج ہی رونق پہ پاؤ تم

میں کیا منہ سے کہوں میں کون ہوں دنیا میں کیا میں ہوں
بشر کی ہستیٔ ناپاک کا اک آئینہ ہوں میں

میری ہستی بنائی خاک کے ذروں نے مل مل کر
اسی باعث سے تو اک خاک کا پُتلا بنا ہوں میں

خدا کی جب نظر میں کل بشر دنیا کے یکساں ہیں
تو دل میں کیوں خلش رکھتے ہو پھر ہندو مسلماں ہیں

نہیں بگڑا ہے اب بھی کچھ اگر کفتوڑا سنبھل جاؤ
کدورت چھوڑ دو اور جانبِ اصلاح تم آؤ

طبیعت میں مری کچھ ان دنوں ایسی صفائی ہے
ضیائے آئینہ منہ دیکھنے کو دل میں آئی ہے

فروغِ ماہِ تاباں جذبۂ دل نے مرے لوٹا
یہاں سرخی ہوئی پیدا وہاں زردی سی چھائی ہے

کہاں لکھا ہے مذہب میں کرو تم بیر آپس میں
غضب ہے گر زمانے میں جُدا بھائی سے بھائی ہے

انتخاب از قصیدہ تہنیت تاجپوشی

خیاباں کھل گئے فصلِ چمن میں اب بہار آئی
شمیم اٹھکیلیاں کرتی نویدِ جانفزا لائی

یہ دہلی ہے کہ جنت آگئی ہے بلغِ دنیا میں
کہ حوریں بھی فلک پر آج ہیں دیکھو تماشائی

یہ ہیں وہ کون جنکے عہد میں یوں ہمنوالی ہے
کہ پیتے شیر اور بکری بھی ہیں اک گھاٹ پر پانی

ندا آئی ہمارے جارج پنجم شاہ انگلستان
ہمایوں فال ہو، نیکو سیر، نیکو طبیعت ہے
رعایا ہند کی تیار ہے اب جاں نثاری پر
دعائے خیر ہے تجھ پر سدا ظل الٰہی ہو

پہنکر آئے اورنگ شہی پر تاج سلطانی
تو اے قیصر جہاں میں منبع بحر سخاوت ہے
کہ اس میں اک زمانے سے وفاداری کی عادت ہے
ہما بن کر ترے سر پر یہ چتر تاج شاہی ہو

آج دہلی بنی ہو رشک چمن
لاڈلی ہو شہان ذی جم کی
آج شہ کی سواری آتی ہو
پیش کرتا ہوں طشت کاغذ پر
کیوں نہ خورشید بھی ضیا پائے

آج دہلی بنی نئی دلہن
یہ دلاری ہو جارج پنجم کی
یہ بھی پھولوں نہیں سماتی ہو
ہوں جو منظور یہ مرے گوہر
بزم شعر میں نام پا جائے

خورشید

خورشید ۔ صاحب عالم مرزا خورشید عالم گورگانی خلف الرشید مرزا فخرو ولیعہد بہادر شاہ ثانی ۔ ان کا نام تاریخی ہے سنہ ۱۲۶۱ ہجری میں پیدا ہوئے ۔ غدر کے وقت انکی عمر ۱۲ سال کی تھی ۔ جوانی میں نہایت خوبرو زیبا منظر جوان تھے ۔ ورزش جسمانی کا ہمیشہ شوق رہا ۔ فن سپہ گری سے خوب واقف ہیں ۔ لکڑی اور بانک دونوں خوب جانتے ہیں ۔ بنوٹ سے بھی کسی قدر واقف ہیں ۔ غلیل لاجواب لگاتے ہیں ۔ شعر بھی بہت اچھا کہتے ہیں ۔ زبان ٹکسالی اور اسی چاردیواری کے اندر کی ہے جس کا نام کبھی قلعہ معلّیٰ تھا ۔ اصلاح دینے کا ملکہ اچھا ہو اور زبان کی صحت کے متعلق آپ کی معلومات وسیع اور قابل داد ہیں ۔ نہایت بامذاق ہنس مکھ یار باش شہزادے ہیں ۔ بڑے خوش گلو اور موسیقی کے فن سے ماہر ہیں ۔ تباہی قلعہ کے بعد ۲۵ سال رامپور اور دہلی رہے ۔ نواب یوسف علیخان صاحب نے سو روپیہ ماہوار مقرر کر دیا تھا ۔ جو اتبک ملتا ہو ۔ بلکہ اب نواب صاحب حال نے کچھ اس پر اضافہ کر دیا ہی ۱۸۹۱ء سے اپنے علاتی بھائی حضرت داغ دہلوی مرحوم کے پاس حیدر آباد دکن رہے وہاں سے بھی دو سو روپیہ ماہوار وظیفہ پاتے ہیں ۱۹۰۳ء کے جشن جوبلی میں جو چند شاہزادوں کی جدید پنشنیں مقرر ہوئی تھیں انمیں

یہ بھی شامل تھے۔ چنانچہ پچاس روپیہ ماہوار سرکار برطانیہ سے مقرر ہے۔ حضرت داغ کی وفات کے بعد گاہے دکن گاہے دہلی رہے اب تین برس سے رامپور میں مقیم ہیں۔ اگرچہ فطرۃً طبیعت موزوں پائی ہے مگر شعر گوئی کی طرف زیادہ توجہ نہیں ہے۔ نواب حامد علیخان صاحب والئے رامپور انکی بہت قدر و منزلت کرتے ہیں۔ مرزا خورشید عالم کے صرف ایک لڑکی ہے نواسے کو انھوں نے اب متبنی کرلیا ہے اور دکن کی پنشن اُسکے نام منتقل کرادی ہے۔ راقم تذکرہ سے مخلصانہ تعلقات ہیں بڑے خوش مزاج خوش تقریر ہیں۔ کلام کے لیے بنگاہِ نظرِ ثانی بار بار تقاضا کیا مگر فطری تساہل نے اقرار کی تکمیل کی نوبت نہ آنے دی اشعار ملاحظہ ہوں

گھر سے نکلے ہیں وہ اس ٹھاٹ سے تنکر باہر	ہاتھ میں تیغ علم میان سے خنجر باہر
غش جو آیا مجھے محفل میں تو ظالم نے کہا	تجکو منظور ہے مرنا تو کہیں مر باہر
جب سے برباد ہوئے کوئی ٹھکانا نہ ملا	ٹھوکریں کھاتی پڑیں پھرتے ہیں گھر در باہر

جو میری طرف سے تمہیں بھڑکاتے ہیں دشمن	ایک ایک مرے دل میں ہے ایک ایک نظر میں
ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہم جبکو یہاں تک پہنچے	ساری دنیا ہے وہی حشر کے میدان میں نہیں
رازِ سربستہ یہ پیدائشِ عالم سے کھلا	لطف ظاہر میں جو ہے وہ کبھی پنہاں میں نہیں
وہ کہتے ہیں ہمارا چاہنے والا بھی ایسا ہو	زمانے سے انوکھا ہو تو دنیا سے نرالا ہو
وہ دل لیکر کسی کا پھیر دیں یہ ہو نہیں سکتا	پرایا مال وہ اپنا سمجھتے ہیں کسیکا ہو
شبِ وصل اُسنے شرما کر یہ شوخی سے کہا آخر	یہیں چھیڑے تو غارت ہو یہیں دیکھے تو اندھا ہو
ستم سہنے کا ساری عمر کے یہ پھل ملا ہمکو	وہ اب سب سے یہ کہتے ہیں جو عاشق ہو تو ایسا ہو
نہ میں سچا نہ تم سچے تو آخر کون سچا ہے	خدا کے سامنے یہ پیش ہو جھگڑا تو اچھا ہو
ہُوا حاصل یہ ہمکو دوستوں کی بیوفائی سے	کہ ہم نے عمر بھر کو توبہ کرلی آشنائی سے
ملے بھی بات بھی کرلی ڈھٹائی سے رُکھائی سے	بنے پھر جان کر انجان میری آشنائی سے
نہ میں سچا نہ تم سچے نہ میں جھوٹا نہ تم جھوٹے	چلو قصہ ہوا طے فائدہ کیا اب لڑائی سے

مطلب اُن سے غرض ہی اُنکا تم اچھا برا دیکھو
ہمیں کیا کام غیروں کی بھلائی سے برائی سے

دل لیا ہے تم نے جس انداز سے
کوئی لے سکتا بھی ہے اس ناز سے

ہر روز یہ پرسش ہی کہ تم کیوں دھر آئے
اُمید پر آتے ہیں جو اُمید بر آئے

جاتے تھے کہیں اور اِدھر بھولکر آئے
کیا دیدہ و دانستہ وہ خود میرے گھر آئے

فرقت کی دعاؤں میں الٰہی اثر آئے
آئے نہ ستمگر تو کچھ اچھی خبر آئے

جاتے تھے میرے کوچہ سے پوچھا تو وہ بولے
ہم تیری بلا سے جدھر آئے اُدھر آئے

بے چین ہو تم اور مجھے رشک ہی اس کا
اللہ کرے آج عدو کی خبر آئے

رحم آہی گیا دیکھ کے قاتل کو مرا حال
کام اپنے برے وقت میں زخم جگر آئے

محشر ہوا جلد ہو کہ وہ کافر ہو کوئی ہو
ہم منتظر اُسکے ہیں کہ جو پیشتر آئے

اِک حشر بپا اور ہوا روزِ قیامت
محشر میں برے حال سے جب وہ نظر آئے

کیا غیر سے لڑ آئے ہیں کہتے نہیں بنتی
گھبرائے ہوئے وہ ادھر آئے اُدھر آئے

اُس شوخ نے بالوں میں پروئے ہیں جو موتی
خورشید ہمیں ابر میں تارے نظر آئے

وہ نشیلی آنکھ اک عیار ہے
دیکھنے کو مست ہے ہشیار ہے

آرزو میں کر نہ کوئی بھی رہا
آپ کا ہر تیر دل کے پار ہے

میں ہوں عاشق میری بدنامی ہی کیا
اُن کا چرچا بھی سر بازار ہے

آپ سے بنتی نظر آتی نہیں
روز جھگڑے روز کی تکرار ہے

کون مرتا ہے کسی کے واسطے
جان کا کھونا بہت دشوار ہے

یہ تری محفل ہے یا ہے میکدہ
جسکو دیکھو مست ہی سرشار ہے

جان سے بڑھکر ہمیں ہو تم عزیز
تم ملو تو اور کیا درکار ہے

اگلے لوگوں کا چلن کچھ اور تھا
اب زمانے کی نئی رفتار ہے

دل ستانے کے لیئے موجود ہے
جان جانے کے لیئے تیار ہے

خورشید

خورشید - سید خورشید عالم۔ خلف شمس الشعرا مولوی سید مقصود عالم تھانوی۔ ان کا نشو و نما غدر کے عین بعد میں تھا۔ نواب کلب حسین خاں نادر نے اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر کیا ہے، چند شعر انتخاب ہوکر درج ہوئے۔ ان کے والد بڑے پایہ کے سخنور تھے انھیں سے انھیں تلمذ تھا ✿

اے اجل یہ قتل پر کس کا اشارا ہو گیا	صف بہ صف جولشکرِ مژگاں صف آرا ہو گیا
ہاں یہ حرف شوق میں ہو معجزِ شق القمر	نالۂ از خود دل کی بیتابی سے پارا ہو گیا
قتل گہ میں یہ شہیدوں کا بہایا ہے لہو	نیچے کا گھاٹ دریا کا کنارا ہو گیا
گھر میں ای خورشید جب شاکِ قمر مہماں ہوا	نیر اعظم نصیبوں کا ستارا ہو گیا

خورشید

خورشید - پنڈت جوالا پرشاد ایم اے وکیل چیف کورٹ لاہور آپ رائے بہادر پنڈت جانکی پرشاد اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر اور منشی مرحوم کے صاحبزادے اور قوم کے کشمیری برہمن ہیں، اوائل شباب میں موزونی طبع کے باعث طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل تھی۔ یہ انھیں ایام کا کلام ہے نہ معلوم اب یہ مشغلہ جاری ہے یا بند ہو گیا۔ ۴۰ برس کا سن ہے۔

آزمانا تجھے ہم چاہتے تھے مدت سے	تیغ جلاّد دکھا آج تو جوہر اپنا
خون ہی تن میں نہیں جسکا کہ ڈر ہی قاتل	کس لئے چلتا ہے دامن تو بچا کر اپنا
جسکو کہتا ہی تو خورشید قیامت وعظ	دیکھ ہے داغ نہاں جس ہی تو بڑھ کر اپنا
ایک حسرت ہی گئی ساتھ مرے زیر لحد	اور کوئی بھی نہ ساتھی ہوا مر کر اپنا
مانگا بوسہ تو کہا تو بھی ہوا اس قابل	منہ تو جا دیکھ ذرا آئینہ لیکر اپنا
نہوا دستِ قضا سے بھی یہ کشتہ سیماب	ہائے مرکر بھی نہ ٹھیرا دلِ مضطر اپنا
کیوں نہ خورشید فلک پر ہو دماغ آج ترا	باغ ہی، جام ہی، اور پاس ہے دلبر اپنا

خوشتر

خوشتر - منشی عبدالرحمن محمد محسن باشندہ منگرول کاٹھیاواڑ۔ رسالہ العصر لکھنؤ سے کلام نقل ہوا

شمع رو جائیں کہاں اٹھکے تری بزم سے ہم	دل کو پروانہ کی مانند جلا بیٹھے ہیں

شربت وصل ہی بیمارِ محبت کا علاج
دکھا دو چاہنے والوں کو تم اندازِ محبوبی
اِس اندازِ حیا سے اور چوری کھا گئی اُنکی
جو محفل ہی وہ مقتل ہو جو بیدل ہیں وہ بسمل ہوں

چارہ گر کیوں لیئے بالیں پہ دوا بیٹھے ہیں
سما جاؤ نظر میں سب کی دلمیں سب کے گھر کر لو
کہا تھا تمسے کسنے جیب کر تر چھی نظر کر لو
جو خنجر ہاتھ میں اپنے کبھی تم بن سنور کر لو

آپ کہتے ہیں بجا حضرتِ ناصح لیکن
ہو مدد تیری جو اے ہمتِ مردانہ عشق
میری خواہش گذر درد نہو دلمیں مرے

کیا کروں کیجیئے جو قابو میں مرے دل نہ رہے
جس کو مشکل میں سمجھتا ہوں وہ مشکل نہ رہے
درد کہتا ہی میں پہلو میں ہوں دل نہ رہے

خوشتر — شاعرِ شیوا بیان سخنورِ شیریں زبان منشی جگناتھ ولد منشی مُنا لال سری باستب کایستھ ساکن لکھنؤ، عہدِ واجد علیشاہ میں سرکارِ شاہی میں متصدی گری پر فائز تھے۔ اِنکی رامائن منظوم "شری بھاگوت" و "چتر گپت" بہت مشہور ہیں۔ مذہبی مسائل اور حکایات کو بہت خوبی اور فصاحت سے نظم کیا ہے ۱۲۷۹ھ میں اِنکا انتقال ہوا، بخوفِ طوالت رامائن میں سے چند اقتباس کرکے اُنکے حال کو ختم کیا جاتا ہے۔

راجہ رام چندر جی کا بن باس ہونا

مشعبد ہے عجب یہ پیرِ گردوں
جفا پیشہ، ستمگر، فتنہ خو ہے
اگرچہ پیر ہے، لیکن ہے بے پیر
کسی کا خوش نہیں آتا اِسے عیش
ہر اِک کے عشق میں ہے رخنہ انداز
سدا اس سنگدل کا ہے یہ شیوہ
یہ وہ زنبور ہے چرخِ ستم کیش
شہنشاہِ اودھ تھا یعنے اِک روز

کہ ہر دم اِسکی صورت ہے دگرگوں
برائے رنج ہر کس حیلہ جو ہے
ہمیشہ منقلب ہے اسکی تدبیر
برائے جنگ پھرتا ہے لیئے جیش
میان ہر بشر ہے فتنہ پرداز
کہ پتھر مارتا ہے دیکھے میوہ
کہ پہلے نوش دے پیچھے چڑے نیش
سریرِ زر فشاں پر رونق افروز

[illegible]

مرصّع سر پہ زیبا تاجِ زرّیں　　عیاں چہرے سے نورِ ماہ و پرویں
پئے آرائشِ تاجِ زر افشاں　　کیا آئینہ پیشِ روئے تاباں
نگاہِ شہ پڑی کاکل پہ اک بار　　سفید آئے نظر بال اُس میں دو چار
خزاں دیکھی بہارِ زندگی میں　　اماں دیکھی خدا کی بندگی میں
سُنا جب سار و اسنے یہ فسانہ　　ہوئی سوئے اودھ پیدل روانہ
ہوئی جا کر وہاں پر حیلہ انگیز　　نہ پایا کوئی دشمن اُس جگہ تیز
کنیز اک کیکئی کی منتھرا نام　　زبس تھی عقل و دانش سے وہ ناکام
کیا نطقِ زباں کو اُس کے اغوا　　وہ نکلی شہر میں بہرِ تماشا
جو دیکھا یہ اودھ میں جلوۂ عیش　　حضور کیکئی آئی بصد طیش
سراپا تن میں روشن آتشِ خشم　　رواں مانندِ دریا چشمۂ چشم
کہا یوں کیکئی سے با غم و آہ　　کہ کیا غافل ہے تو اے بانوِ شاہ
بھرت کو شاہ نے گھر سے کیا دُور　　خلافت ہے بنامِ رام مسطور
محبت پر ہے نازاں شہ کی ناحق　　یہ تیرا ہے خیالِ خام مطلق
بظاہر تجھ پہ عاشق ہے شہنشاہ　　ولے باطن میں کوشلیا کی ہے چاہ
یہ کوشلیا کا ہے سب مکر اور فن　　کہ بیشک سوت کی ہو سوت دشمن
خلافت کا اگر ہو رام کو تاج　　ترا فرزند ہو روٹی کو محتاج
یہ سنکر کیکئی بولی غضبناک　　کہ کیا کہتی ہے تو اے شوخ بیباک
اگر ہو رام کو تاجِ خلافت　　بھرت کو ہے زہے فخر و سعادت
مرے دل کے بر آئیں سب مطالب　　بھرت اور رام ہیں یک جان و دو قالب
نہو اُن میں کبھی ہرگز جدائی　　اگر ہو اک طرف ساری خدائی
تو ہے بد باطن و بد کار و بد ذات　　غضب تو نے نکالی منہ سے یہ بات

کہا پھر منتھرا نے باصفائی | بھلائی میں ہوئی حاصل بُرائی
کوئی ہو بادشہ کیا مجکو مطلب | نہیں لونڈی سے بیوی ہونگی میں اب
وہ ہے میں ہوں کنیز بانوئے شاہ | کیا راہِ نمک خواری سے آگاہ
کہا میں نے براہِ خیر خواہی | مبارک رام کو ہو بادشاہی
نہیں خواہش مجھے کچھ سیم و زر کی | خطا کی میں نے گر تم کو خبر کی
مجھے مطلب نہیں ہے کچھ کسی سے | خوشی اپنی ہے مالک کی خوشی سے
ولے کیا کیجئے اس دل کا چارا | بُرائی ہے تمھاری ناگوارا
زمانے میں ہے یہ روشن سبھوں پر | کہ دشمن ہے برادر کا برادر
خصوصاً جبکہ ہووے بادشاہی | مقرر ہو برادر پر تباہی
زبانِ چرب سے جب کی یہ تقریر | ہوئی تب کیکئی بیزار و دلگیر
ہوئی دلگیر تب بولی وہ نادان | کہ ہے تدبیر اس مشکل کی آسان
کیئے ہیں شہ نے جو دو عہد محکم | کہو تم شہ سے امشب شاد و خرم
سحر گہ رام ہوں صحرا کو راہی | بھرت کو دیجئے دیہیم شاہی
کیا یوں کیکئی کو جبکہ اغوا | ہوا برگشتہ دِل پھر کیکئی کا
عروسی پیرہن تن سے کیا چاک | ہوئی آشفتہ غلطاں بر سرِ خاک
کیئے غم سے پریشاں مشکبو بال | بچھایا مکر و فن کا خاک پر جال
بوقتِ شب ہوا شاہِ نکو روز | محل میں کیکئی کے رونق افروز
پریشاں حال دیکھا کیکئی کا | ہوا دلگیر شاہ عالم آرا
بہم اُسکے عشق میں دیوانہ تھا شاہ | کہ تھی وہ شمع رو پروانہ تھا شاہ
نہ تھی بیتابیٔ معشوقہ منظور | نہ کرتا تھا کبھی نزدیک سے دور
جو فرشِ گل پہ کرتی تھی سدا خواب | اُسے دیکھا زمیں پر در تپ و تاب

ہوا آشفتہ خاطر دیکھکر شاہ　　سر بالین پر دیں پر گیا ماہ
کہا اے جانِ شاہِ عالم آرا　　ہوا کیا رنج دل پر آشکارا
ز روئے شکر بولی کیکئی تب　　کیا تم نے مرا کہنا سدا سب
کیے تھے پیشتر دو مجھ سے اقرار　　کیے تم نے وفا ابتک نہ زنہار
کہا دسرت نے اے جانِ شہنشاہ　　کرو مطلب سے اپنے مجھکو آگاہ
بجا لاؤں اُسے بالراس والعین　　دلِ بیتاب کو بخشو ذرا چین
قسم ہے رام کی گر جان مانگو　　تو حاضر ہے نہیں افسوس مجھکو
یہ سنکر کیکئی با دیدۂ تر　　ہوئی حاضر حضور شاہ اُٹھکر
کہا ہیں شاہ سے مجکو دو مطلب　　وفائے عہد ہے شاہوں کو انسب
بھرت کو سلطنت کا دیجئے کام　　بیاباں میں رہیں چودہ برس رام
یہ سنکر ہوگیا بے ہوش دسرت　　گرا سر سے زمیں پر تاج دولت
ہوا چہرہ غم و اندوہ سے زرد　　کہا یوں کیکئی سے با دمِ سرد
بھرت کو تاج دوں اے راحتِ دل　　جدائی رام کی لیکن ہے مشکل
جو آیا دیکھنے سے رام کے ہوش　　ہوا با گریہ و زاری ہم آغوش
زبس غم سے نہ تھا یارائے گفتار　　رہا مانند نرگس محو دیدار
کہا تب رام سے ماں نے یہ مضموں　　بھرت سے مجکو تم پیارے ہو افزوں
کیے تھے شاہ نے دو مجھ سے اقرار　　وفا میں اُنکی اب ہے صاف انکار
اگر دنیا میں چاہو بول بالا　　بجا لاؤ قرارِ شاہِ والا
کہا شاہِ دو عالم نے زہے بخت　　مبارک ہو بھرت کو افسر و تخت
یہ کہکر شاہ سے رخصت ہوئے رام　　پڑا دولت سرائے شہ میں کہرام
ہوئے مادر سے رخصت رام جاکر　　بہت روئی گلے مِل مِل کے مادر

ہوئی بیتاب سیتا سُن کے یہ حال ۔ پریشاں صورتِ سُنبل کیے بال

ہُوا جینا اُسے بے رام مشکل ۔ نہ لائی تاب ہجر گل عنادِل

فراقِ رام کب ہو اُس کو منظور ۔ غضب ہے شمع سے پروانہ ہو دور

سیا پھر آئی پیشِ مادرِ رام ۔ پریشاں موئے زلفِ عنبریں فام

ہوئی پا بوسِ خوشدامن ادب سے ۔ ہوئی رخصت کی خواہاں رو کے سب سے

ہوئی دلگیر خوشدامن یہ سُنکر ۔ کہا اے راحتِ دلہائے مضطر

بیاباں میں نہیں عورت کا ہے کام ۔ نہ کر برباد ناحق ننگ اور نام

کہا سیتا نے اے خوشدامنِ پاک ۔ نہوں جانے سے میرے آپ غمناک

نہیں بہتر ہے اِس سے کوئی دولت ۔ کرے عورت جو شوہر کی اطاعت

رہا کب دامنِ شوہر ہو زن سے ۔ کہیں سایہ جُدا ہوتا ہے تن سے

رواقِ طاق و منظر کا اُڑا رنگ ۔ ہُوا غم سے مُشبّک سینۂ سنگ

زبس تھے غم سے گریاں سقف و دیوار ۔ نظر آتے تھے روزن چشم خونبار

مکانِ شاہ کے ہر طاق و منظر ۔ پئے گریہ تھے شکلِ دیدۂ تر

ہزاروں چشم سے روتا تھا دریا ۔ حباب اُسکے ہوئے دیدے سراپا

کیا غم سے سحر نے پیرہن چاک ۔ اُڑائی سر پہ اپنے شام نے خاک

جہاں گریاں تھا سب آہ و فغاں سے ۔ فرشتے گل فشاں تھے آسماں سے

نہ کھولی آنکھ ایسی شہ نے کی بند ۔ یکایک جبکہ چھوٹے دونوں فرزند

زمیں پر شاہ تھا اِس طرح بیتاب ۔ کہ ہو جس طرح سے آتش پہ سیماب

لہو تھا ہر بنِ مژگاں سے جاری ۔ پسند آنکھوں کو آئی اشکباری

اودھ میں زاغ نالاں بن میں بلبل ۔ اُگے کانٹے یہاں پھولے وہاں گل

چلے جبدم اودھ سے رام و لچھمن ۔ گرا لنکا میں سر سے تاجِ راون

خوشدل

خوشدل ۔ محمد حمید الظفر خان رامپوری خلف عباس خان۔ زندہ دِل شخص ہیں اور اسی وجہ سے اپنے حسب حال تخلص تجویز کیا ہے۔ مرزا عابد حسین اوج رامپوری کے تلامذہ میں ہیں رامپور کے مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں۔

یاد آکے وہ تبسم ہمکو رُلا رہا ہے
ہر لحظہ سامنا ہے تازہ مصیبتوں کا
حالِ زبوں ہمارا کیا پوچھتا ہے ہمسے
کس شوق سے ہم اُسکی صورت کو دیکھتے ہیں
اُلفت نے تیری ظالم آخر ہمیں مٹایا
ایک دن تھا وہ کہ تیرا کوچہ تھا اور ہم تھے
ہیں وہ ہوں یاد تیری رہتی ہو میرے دل ہیں
اُس شوخ کا بگڑنا تقدیر کا تھا بننا
اِس سے عشاق کو ملتی ہو حیاتِ جاوید

سوزِ غمِ محبت دل کو جلا رہا ہے
یہ عشق تیرا مجکو کیا کچھ دکھا رہا ہے
کچھ تو ستا رہا ہی کچھ غم ستا رہا ہے
کس ناز سے وہ اپنے مُنہ کو چھُپا رہا ہے
اب کیوں ستا رہا ہو اب ہم میں کیا رہا ہے
جنگل میں جوش سودا اب تو پھرا رہا ہے
تو وہ ہو اپنے دِل سے مجھکو بھُلا رہا ہے
باہیں گلے میں ڈالے خوشدل منا رہا ہے
آبِ حیواں ہو کہ خنجر کا ترے پانی ہے

خوشوقت

خوشوقت منشی خوشوقت رائےصاحب عرف راجہ بینی جی تخلص خوشوقت شاگرد آتش و میر وزیر علی صبا بخشی الملک راجہ لالجی بہادر بخشی زمانہ شاہی لکھنو کے بیٹے تھے گاہ گاہ ست تخلص بھی کر لیتے تھے۔ غدر کے دس بارہ برس بعد انتقال کیا۔ لکھنو کے عمائد میں گنے جاتے تھے اور کبھی کبھی فکرِ سخن سے دل بہلاتے تھے۔ کلامِ بہم رسیدہ کا یہ انتخاب ہے :

گیسوؤں کا جو لئے دام وہ گلفام آیا
تخت و تاج و علم و طبل شہنشاہوں کا
نہ پوچھو درد کہاں سینے میں ہو عاشق کے

بلبلِ دل مرا خود اُڑکے تہِ دام آیا
سب دھرا رہگیا جب موت کا پیغام آیا
غش آ گیا ہے ابھی تو جگر جگر کرتے

شکلِ مہ و خورشید تو کب دل میں گڑیگی
اِس دل کے لگانے کا ہم انجام نہ سمجھے

جب آنکھ پڑے گی کسی آدمچے پہ پڑیگی
سینے میں یہ برچھی نہ کسی طرح گڑے گی

نوکِ مژۂ یار کا کرنا نہ تصور
ہی صلح کی تدبیر عبث یار سے خوشوقت

نکلے گی نہ پھر دل میں جو یہ پھانس گڑ گئی
سلجھائیگا خود آپ سے قسمت جو لڑ گئی

عجب کمال پہ جوبن ترا شباب میں ہو
ادا جان لیتی ہے جانی تمہاری

یہ ضو نہ نور نہ مہ میں نہ آفتاب میں ہو
قیامت ہوئی ہے جوانی تمہاری

فدا تم پہ ہیں ہوں تم اوروں کو چاہو
یہ قسمت مری قدر دانی تمہاری

تمھارا ہے ورد زباں ذکر ہر دم
وظیفہ مرا ہے کہانی تمہاری

یہ خوشوقت آتش کے فیض و کرم سے
زبان زد ہوئی خوش بیانی تمہاری

خیال

خیال۔ غلام حسین خان خیال برادر زادہ و شاگرد برکت اللہ خان برکت شاعر فارسی بہت پرگو شاعر تھے۔ ایک لاکھ شعر کے قریب کہے تھے۔ بیگم سمرو کے ملازم تھے۔ ۱۸۴۳ء میں انتقال کیا۔ سنا ہے کہ پانی پت میں انکے دو دیوان موجود ہیں۔ یہ انکے کلام کا نمونہ ہے۔

تجھے تو غیر کو منظور منہ دکھانا تھا
نقاب کھولنا گرمی سے اک بہانہ تھا

پھر نئے سر سے ہوا خانۂ مجنوں آباد
پاؤں جب ہمنے دھرا آنکے ویرانے میں

حاضر ہیں ہم تو آؤ شمشیر کیں نکالو
جو دل کی آرزو ہو اس کو کہیں نکالو

جرعہ افشاں ہو ہماری خاک پر غافل کبھی
ہم بھی لے ساقی تری محفل کے میخواروں میں تھے

مژگاں کی یہ کاوش نہیں ناوک فگنی ہے
ابرو کی اشارت نہیں شمشیر زنی ہے

تیر شگفتگی پر دل آیا ہے اے خیال
اے غنچہ رفشردہ تجھے بھی ہوا لگی

خیال

خیال منشی جیسکھ رائے خیال کایستھ دہلوی۔ فارسی شعر بھی کہتے تھے۔ شاہ نصیر کے ہمعصر تھے۔ کلام درد انگیز ہے۔ زبان، بندش، مضمون، سب خوبیاں لایق داد ہیں۔ افسوس ہو کہ باوجود تلاش اسی قدر اشعار ایک بیاض میں سے دستیاب ہوئے۔

تو جور و ستم کر نہ سکھائے سے کسی کے
کچھ پھل نہیں پائیگا ستائے سے کسی کے

حسرت ہی رہی جی میں مرے آہ پس از مرگ
بالیں پہ دم نزع نہ آئے سے کسی کے

میلا ہو بدن ہاتھ لگائے سے کسی کے		اے یاسمن اُس سے نہ مقابل ہو کہ جس کا
تربت پہ مری پھُول چڑھائے سے کسی کے		پھر داغ جگر ہو گئے غیروں کے بھی تازہ

خیال

خیال۔ مولوی محمد ریاض حسن خان خلفِ اوسط مولوی حکیم محمد ہادی حسن خان نایاب رئیس اعظم موضع رسول پور ضلع مظفر پور۔ ترتیب تذکرۂ ہذا کے وقت جو حالات آپ نے قلبند کر کے بھیجے اُن کا خلاصہ یہاں درج ہے آپ لکھتے ہیں کہ "میری ددھیال۔ ننھیال دونوں شیخ ہیں آباء و اجداد ہمیشہ صاحبِ اعزاز و امتیاز رہے۔ عہدِ مغلیہ میں جو عزت و ناموری اُنہوں نے پیدا کی اُن پُرانی باتوں کا تذکرہ فضول ہے۔ عہدِ انگلشیہ میں میرے پردادا مولوی مولا بخش خان بہادر سی۔ آئی۔ ای نے غدر کے زمانے میں گورنمنٹ اور ملک کی جو خدمتیں کیں اُن کا ذکر کتابوں میں موجود ہے چنانچہ گورنمنٹ نے اُنہیں اسٹار آف انڈیا (نجم الہند) کا خطاب دیا۔ اُنکے بڑے صاحبزادے حاجی محمد امیر حسن خان مرحوم و مغفور میرے دادا تھے۔ میں ۱۲ رجب ۱۲۹۴ھ ہجری کو پیدا ہوا۔ چنانچہ ایک ترکیب میں خود کہتا ہوں۔

روز اثنا عشر از ماہِ رجب پیش زوال		در ہزار و دو صد و چار و نود ہجری سال
ہیچو نجمے کہ ز بیت الشرف آید بوبال		پیکرِ خاکیٔ من از عدم آمد بوجود

میں چھ برس کا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ دادا نے تعلیم و تربیت کی۔ فارسی عربی مختلف اُستادوں سے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ جن میں سب سے زیادہ حکیم حافظ سید فرزند علی صاحب دہلوی سے استفادہ ہوا شعر و سخن کا مجھے بچپن ہی سے شوق تھا۔ چھ سات برس کی عمر میں ڈیڑھ دو ہزار اُردو و فارسی اشعار یاد تھے۔ اور مجھے خوب یاد ہے کہ اس عمر میں بھی مَیں بعض اچھے شعروں سے متاثر ہوتا تھا۔ گیارہ برس کی عمر سے مَیں نے شعر کہنا شروع کیا۔ چنانچہ میری پہلی غزل کا پہلا شعر یہ ہے۔

چشم بد دُور غضب ہیں آنکھیں		تیری اے حور غضب ہیں آنکھیں

جب تک مولنا فرزند علی بیتاب دہلوی مرحوم یہاں رہے اُن کو کلام دکھاتا رہا۔ پھر

رمضان ۱۳۱۱ھ ہجری میں حضرت داغ مرحوم سے تلمذ اختیار کیا - اُردو میں میرا تخلص خیال ہے اور فارسی میں دانش - فارسی میں جناب خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز لکھنوی کے فیض صلاح سے مشرف ہوتا ہوں - اب شعر و سخن کا اتفاق کمتر ہوتا ہے "۔

جناب خیال واقعی ایک عمدہ اور باذاق طبیعت و قابلیت کے شخص ہیں - فارسی میں بہت اعلیٰ قابلیت رکھتے ہیں - علاوہ نظم کے موجودہ زمانے کی روشنی کے موافق نثر بھی اچھی کہتے ہیں اس زمانے میں آپنے ایک فارسی مشہور کتاب نامہ دانشوران ناصری کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے جو انجمن ترقی اُردو نے پسند کیا اور جسکی صحت زبان کی مولانا شبلی جیسے ماہر نے داد دی علاوہ شعر و سخن کے شکار کا بھی شوق ہے نشانہ اچھا لگاتے ہیں - راقم تذکرہ سے خط و کتابت رہتی ہے - کلام بہم رسیدہ میں سے کچھ اشعار منتخب ہو کر درج کیئے جاتے ہیں - زبان درست بندش چست مضامین صاف عاشقانہ رنگ میں کہتے ہیں - اپنے والد کا دیوان بھی آپنے اپنے کلام کے ساتھ ارسال کیا تھا - اب انکا کلام ملاحظہ ہو جو اُن غزلوں سے انتخاب کیا گیا ہے جو خود جناب خیال نے مؤلف تذکرہ کو ارسال کی تھیں -

یہ نہ کہیئے کہ مجھ پہ کس کا حق	بندہ پرور میری محبت کا

بعضوں کی خامشی میں بھی اظہار ہے خیال	رستہ بتاتے ہیں لبِ خاموش نقشِ پا
جمال ان میں جلال ان میں پھر اُنمیں شانِ استغنا	بتوں میں کیا کہوں جلوہ مجھے کس کا نظر آیا
گوشۂ خلوت، دلکو فراغت رات سہانی جوبن جوانی	یار بغل میں ہاتھ میں بوتل آج مزا ہے بادہ کشی کا
دیکھو خیال آئینہ لگا کر کیسی اُداسی چھائی ہے منہ پر	کہتے نہ تھے ہم عشق و محبت جان کا گھن ہے روگ ہے جی کا

صاف طینت صاف باطن ہے خیال	جب ملا جس سے ملا دل سے ملا
اللہ اللہ رے اُس بت کا جمال	دیکھ کر جسکو خدا یاد آیا
پائے بوسی ہے عبث بے فیض کی	دیکھ کیا دریا کو ساحل سے ملا
دیکھ لی ہمنے سخاوت آپ کی	ایک بوسہ وہ بھی مشکل سے ملا

کیا بات ہے عدم ہی کو دُنیا سے جو گیا
دِلدار کی ہوس میں دل اپنا ہی کھو گیا
خوش ہوں کہ باوفا تو ہوں اُنکی نگاہ میں
میرا سوال وصل۔ پھر اُنکی وہ گالیاں

جس سے دیکھا چار دن دیکھا ملاپ
دُشمنی کی ابتدا ہے دوستی
مِل گئیں آنکھیں تو اِس کی کیا خوشی

رہ رہ کے تو لٹتے ہو کیا خنجر دو دم کو
پھیلا ہے نور اُسکا سارے جہاں میں یکساں
کیسے یہ نقش پا ہیں کوئے عدو میں یا رب
اُس بت نے میرے دل میں گھر کرلیا تو کیا ہے
دیکھا ہے جب سے اُسکو اتنے نڈھال کیوں ہو

آیا نہ پھر پلٹ کے وہیں کا وہ ہو گیا
لالچ میں فائدے کی یہ نقصان ہو گیا
ہر چند سر گیا وہ مجھے مان تو گیا
پھر پوچھنا وہ طنز سے کہیے سُنا جواب

یہ بھلا کس کام کا تیرا ملاپ
وہ ہی بگڑا ہے جس کا تھا ملاپ
لُطف جب ہے دل سے ہو دلکا ملاپ

گردن یہ پھیر بھی دے اب آہنی ہے دم پر
اے کعبہ والے تمکو کیا ناز ہے حرم پر
سر جھک رہا ہے اپنا سجدے کو ہر قدم پر
آخر بتوں کا قبضہ اک روز تھا حرم پر
خود روتے ہو خیال اب ہنستے تھے پہلے ہم پر

رُکا کیوں ہاتھ کیسی بیخودی چھائی یہ قاتل پر
تمھیں دیکھا ہے جسنے اُسکو اکثر ہو ہی جاتا ہے
بُرے طالع نہ ہے قسمت خطا اُس کا میرے پاس آیا
جسے تو پردہ سمجھا ہے یہ دودِ آہ ہے مجنوں

وہ بیٹھا ہے چھُری رکھے گلو ئے نیم بسمل پر
تمھارے چاند سے چہرہ کا دھوکا ماہِ کامل پر
کبھی رکھتا ہوں آنکھوں پر کبھی سر پر کبھی دل پر
ذرا آنکھیں جما کر دیکھنا لیلی کے محمل پر

گئے جو فاتحہ کو پڑی آنکھ یار پر
محشر میں کچھ نہ دادو محشر سے کہہ سکا
چتون تو کہہ رہی ہے وفا نام کو نہیں
قیس اپنی دھن میں ہے اُسے اسکی خبر نہیں
کیا کس کی نگہ نے اسکو بیتاب

شیشہ بجائے سنگ ہو میرے مزار پر
رحم آ گیا مجھے نگہ شرمسار پر
دِل دے جو کوئی تمکو تو کس اعتبار پر
محمل میں کیا گذرتی ہے محمل سوار پر
"تڑپتی کیوں ہے بجلی آسمان پر

ہماری زندگی ہے آپ کے ہاتھ
نہیں، پر مرتے ہیں جیتے ہیں ہاں، پر

ہمیں نے تو ستم بے شمار جھیلے ہیں
ہمیں تو ہیں کرم بے حساب کے قابل

دعائے وصل صنم کے لئے حرم کو گئے
چلے گناہ کو بھڑے ثواب کے قابل

کباب دل ہو تو جچتا ہی نشۂ مے عشق
گزک ہے خاص یہی اک شراب کے قابل

نہ آئی دخترِ رز بس میں جناب شیخ کے اب تک
نہ ہو کسطرح شک رندوں کو حضرت کی کرامت میں

خبر کیا پوچھتے ہو اپنے بیمار محبت کی
جو دم ارمان میں ٹوٹا تو نکلی جان حسرت میں

شہرت ہوئی تمھاری ہمارے ہی عشق سے
معشوق جس نے تم کو بنایا ہمیں تو ہیں

بے بندگی کے جسکو ہوا انعام کی امید
عاصی ترے وہ بارِ خدایا ہمیں تو ہیں

آئینہ دیکھتے ہیں تو کہتا ہے ان سے عکس
تمثال حسیں بھی جسپہ ہو شیدا ہمیں تو ہیں

کل دیکھ کر خیال کو تسکین ہو گئی
سمجھے تھے ہم کہ شہر میں رسوا ہمیں تو ہیں

نہ طاقت فغاں کی نہ ضبط فغاں کی
یہ زوروں پہ ہے ناتوانی ہماری

اس تغافل کو ہمیں جانتے ہیں
یہ بھی اک طرح کی ہشیاری ہے

گالیاں دینے لگے جب خوش ہوئے
یہ نئی بخشش نیا انعام ہے۔

یہ بلا شرح مصیبت پر جواب
دل لگانے کا یہی انجام ہے

ہوش اک جلوہ میں لیلے وہ جمال انکا ہے
دلکو بیتاب جو رکھے وہ خیال انکا ہے

آج رہ رہ کے جو یوں عذرِ جفا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

لذتیں عالم امید کی برحق لیکن
عالم یاس میں کچھ اور مزا ہوتا ہے

چپ رہوں تو وہ سمجھتا ہی کچھ آزار نہیں
اور دکھ درد سناؤں تو خفا ہوتا ہے

دے چکے دل تو پھر اب روتے ہو بیکار خیال
چوک جب ہو گئی پچتانے سے ہوتا کیا ہے

جب کہا ایفائے عہد وصل کو کہنے لگے
کیسا وعدہ؟ کب کا وعدہ؟ ہو مجھے کچھ یاد بھی

یہ وفا، یہ جاں نثاری، یہ جگر، یہ دل کہاں
بندہ پرور غیر پر کی ہے کبھی بیداد بھی

جو گرا قعرِ محبت میں نہ اُبھرا وہ خیالؔ

کیا بری اُفتاد ہے یہ عشق کی اُفتاد بھی

قدرِ وفا نہ ہو جب بے سُود پھر وفا ہے
آنے کی کس کے اے دل اُمید کر رہا ہے
آنکھوں میں کُھبنے والی دل میں اُترنے والی
تم جانو یا نہ جانو جو حال ہے ہمارا
سیماب، شمع، بجلی، ہیں بیقرار تینوں
آنکھ اُس سے کیوں ملائی؟ کیوں تو نے چوٹ کھائی
جب تک بغل میں دل تھا یہ تجربہ نہیں تھا
ناصح تجھے خبر کیا وہ خوب رُو ہے کیسا
سینے سے ہم لگائے رہتے ہیں داغِ دل کو
کیا مفت چاہتا ہوں کچھ بھیک مانگتا ہوں
رسوائیوں کا تیری پھیلا خیالؔ چرچا

کچھ اور اب ارادہ ہم نے بھی کر لیا ہے
چھوٹا زمانہ بھر کا وہ ایک چالیا ہے
تیری ہر ایک شوخی تیری ہر اک ادا ہے
اللہ دیکھتا ہے اللہ جانتا ہے
عاشق کی بیقراری سب سے مگر جدا ہے
میں دل سے پوچھتا ہوں دل مجھ سے پوچھتا ہے
مشہور ہے کہ انساں کچھ کھو کے سیکھتا ہے
ہم کیا مٹے ہیں سب عالم مٹا ہوا ہے
کیونکر نہ ہو پیارا کس کا دیا ہوا ہے
دینا ہی ہوگا بوسہ جب نقدِ دل لیا ہے
جس سے جہاں ملے ہیں یہ تذکرہ سنا ہے

نیند آئی شام کو کچھ بات ہے
چال اسکے ساتھ کچھ چلتی نہیں
گالیاں ملتی ہیں جب کیجے سوال

یہ ہمارے ٹالنے کی گھات ہے
عشق کی بازی ہمیشہ مات ہے
حُسن والوں کی یہی خیرات ہے

تعجب ہے کہ پیری میں بھی داغِ عشق باقی ہے
مری حالت وہ پوچھیں سُن کے رُو دیں میں سُنا نوں گا
مری مشکل کی آسانی ہوئی ہے کیسی مشکل سے
تم اپنے طالبِ دیدار سے ناحق اُلجھتے ہو
جنابِ داغؔ کا فیضان ہے یہ شاعری اپنی

سحر ہوتے ہی ورنہ شمع اُٹھ جاتی ہے محفل سے
مرے خوش کرنے کو قاصد تے یہ باتیں گھڑیں دل سے
نزاکت سے چھُٹا پڑتا تھا خنجر دستِ قاتل سے
جوار باب ہم ہیں جھک کے ملتے ہیں وہ سائل سے
خیالؔ اس فن کو سیکھا ہے بڑے اُستادِ کامل سے

خیال - ابو المعانی جناب مولوی سید محمد علی صاحب شاہجہان پوری تلمیذ امیر مینائی لکھنوی

خیال

آپکے والد محمد اکبر علیخان شاہجہانپور کے باشندے تھے۔ جناب خیال غالباً شاہجہان پور کی عدالت میں مختاری کرتے ہیں۔ شعر خاصہ کہتے ہیں اور کسی رنگ میں بند نہیں۔ زبان، بیان مضمون سب باتوں کا خیال رکھتے ہیں۔ آپنے شعروسخن کا ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ مگر اب عرصہ سے بند ہے۔ الغرض شاہجہاں پور میں جہاں اچھے شاعروں کی کمی نہیں انکے کلام کی بھی اچھی خاصی شہرت ہے ۵۴ برس کے قریب سن ہے کچھ کلام نظر سے گزرا اُسکا انتخاب حاضر کیا جاتا ہے۔

کوئی پُرسانِ حالِ بینوا ابتک نہیں آیا
ترے بسمل کا پیغامِ قضا ابتک نہیں آیا

یہ کیا ہی کیوں چھپایا منہ مجھے حیرت زدہ پاکر
تمہیں افسوس اندازِ حیا ابتک نہیں آیا

دیکھے کوئی عُروج تری جلوہ گاہ کا
ایک ایک کوہِ طور ہے ہر سنگ راہ کا

لاکھوں فریب ایک وہ اندازِ گفتگو
لاکھوں فتُور ایک کرشمہ نگاہ کا

تم اپنے گریبان کی خیر مانگو
بلا سے ہوا چاک دامن کسیکا

قیامت ہی آئے میں میری طبیعت
بلا ہے اُبھرنے میں جوبن کسیکا

بنا بنا ہے ابھی شوقِ خود نمائی کا
خدا نہیں ابھی سامان ہی خدائی کا

اُسی کی چشم کی گردش کا آسمان بسمل
شفق شہید اُسی پنجۂ حنائی کا

دکھایا مجکو جو وحشت نے وادیٔ پُرخار
کہا جنوں نے یہ حق ہے برہنہ پائی کا

بتوں کو پیار کرے جان کھوئے دل کھوئے
اور اُنکے سامنے جھوٹا بنے خدائی کا

نہ پوچھ لے مرے وعدے بھولنے والے
اجل کو یاد ترے اعتبار پر نہ کیا

بٹھایا ہے مجھے خاموش رعبِ حسن نے لیکن
بتایا ہے نگہ کو لوٹ جانا تیرے جوبن پر

نگاہِ شرمگیں سے اُسنے جب دیکھا یہ دل بولا
کوئی تیر اور بھی ظالم ابھی میں نیم بسمل ہوں

واہ رے خوبیٔ قسمت یہ سنا ہے کہ وہ آج
میری تقدیر کا دشمن سے گلا کرتے ہیں

افشاں جبیں پہ دوش پہ گیسو چھٹے ہوئے
طرفہ چراغ جلتے ہیں کالوں کے سامنے

ساقی کی مست آنکھوں پہ دل لوٹے جاتے ہیں
شیشے جھکے ہوئے ہیں پیالوں کے سامنے

کیا جلوہ بیحجاب ہو جب گر پڑیں کلیم
اُٹھتا ہے لطف دیکھنے والوں کے سامنے

ستم ہے حشر میں وہ مسکرا کر مجھ سے کہتے ہیں
اِدھر تو دیکھنا کس کی شکایت ہونیوالی ہے

نامہ بر مجھ سے پوچھتا کیا ہے؟
کہیں پُرزے اُڑے ہوئے خط کے

ق

ہیں نشاں صاف کوئے قاتل کے
کہیں ٹکڑے پڑے ہوئے دل کے

کھینچ ناوک کو نہ ظالم یہ جفا رہنے دے
ایسے مہماں کو کلیجے سے لگا رہنے دے

زندگی کے مزے اُٹھائیں گے
ہو کے مہمان تیغ قاتل کے

الٰہی کیا کروں حسرت بھری آنکھ
اُنھیں ضد ہی محبت کی نظر سے

خیال اس دردکارہ رہ کے اُٹھنا
کوئی پوچھے مرے دل سے جگر سے

درد تھمتا ہے تو کس پیار سے دل کہتا ہے
اُٹھ مرے رانوں کو اُٹھ اُٹھ کے جگانیوالے

کوئی دم اور ٹھہر جایئے جلدی کیا ہے؟
آپ کیا ہم بھی تو ہیں آپ سے جانیوالے

مقدر میں عشق بتاں لیکے آئے
ازل سے غم جاوداں لیکے آئے

وہ کہتے ہیں سنکر مری حسرتوں کو
تم آئے کہ اک کارواں لیکے آئے

چلے گا نہ یاں تیرے خنجر کا فقرہ
وہ گویا ہتھ بھر کی زباں لیکے آئے

سلام اب تو جاتے ہیں اے کعبہ والو!
یہاں ہمکو وہم و گماں لیکے آئے

کہاں ہیں خیال اور کہاں کوئے قاتل
بڑے اک مرے مہرباں لیکے آئے

خیال

خیال سید شمس الحق نام گلاؤٹھی ضلع بلند شہر کے رہنے والے منشی امتیاز احمد خان صاحب راز رامپوری کے تلمیذ رشید ہیں عرصہ چھ سات سال سے ریاست رامپور میں وکیل ہیں کلام بامزہ ہوتا ہے۔ زبان کی جانب توجہ ہے مضمون بھی خوب نکالتے ہیں۔ رامپور کے مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں۔ پڑھتے بھی اچھا ہیں۔ بدرجۂ اوسط تمام خوبیاں انکے کلام میں موجود ہیں۔ اگر موجودہ مشق جاری رہی تو عنقریب اچھا کہنے والوں میں انکا شمار ہو جائیگا

مضمون میں شوخی اور طبیعت میں جدت بلا کی ہے، روزمرہ صاف اور بندش بہت چست ہے

ترا غم بھی دل سے جدا کر دیا
ارے ابنو آ تخلیہ کر دیا

یہ کیوں تم نے محشر بپا کر دیا
یہ کیا تم کو سوجھی یہ کیا کر دیا

خزاں دیدہ تھا زندگی کا چمن
محبت نے کچھ کچھ ہرا کر دیا

ملے عمر رفتہ تو پوچھونگا میں
تجھے کس نے مجھ سے خفا کر دیا

جان نثاری کے یہ انعام دیئے جاتے ہیں
اُلٹے سیدھے مجھے الزام دیئے جاتے ہیں

کچھ زباں ہم بھی ہلائیں تو پھر اچھا کیا ہو
آپ دشنام پہ دشنام دیئے جاتے ہیں

بادۂ ناب نہیں، بادۂ کوثر، واعظ!
اِسکی قیمت میں کھرے دام دیئے جاتے ہیں

مفت دو گھونٹ پلا دے ترے صدقے ساقی
ہم غریبوں سے کہیں دام دیئے جاتے ہیں

اور کچھ گانٹھ گرہ میں نہیں اُنکی ساقی
شیخ جی جامۂ احرام دیئے جاتے ہیں

رند دستارِ فضیلت نہ اُتاریں واعظ
آپ میخانے سے بے دام دیئے جاتے ہیں

جب رُخ سے ترے نقاب سرکی
آنکھیں روشن ہوئیں نظر کی

لایا ہے جواب میرے خط کا
ہو عمر دراز نامہ بر کی

بل کھا کے خیال میں بھی آئی
اللہ رے نازکی کمر کی

کیوں وصل دعا پہ منحصر ہو
محتاج ہے خود دعا اثر کی

ہر کام ہے دوسرے کے بس میں
اللہ رے بے بسی بشر کی

دم بھرتے ہو میری دوستی کا
یہ آج ہوا چلی کدھر کی

آفت ہے شباب کی تجلّی
کیا دھوپ کڑی ہے دوپہر کی

اُس بت کو خیال دید یا دل
کچھ قدر نہ کی خدا کے گھر کی

ترے کوچے میں تیری دید کی خواہش تو کیا لائی
ہماری موت آئی گھیر کر ہمکو قضا لائی

اجل روٹھی ہوئی تھی آپکے بیمار فرقت سے
خدا رکھے سلامت جانکنی کو یہ منا لائی

بھری محفل میں ہم آغوش غیروں سے تجھے دیکھا
یہی اک دیکھنا باقی تھا، یہ قسمت دکھا لائی

خطا کیا دل کی مجرم آنکھ ہے لاکھوں ہیں ہم کہدیں
یہی اُنسے لڑی تھی، ہاں یہی ہم پہ بلا لائی

مصیبت کے دنوں سے عیش کے دن جب مجھے بدلے
خیالؔ، اغیار کا تو ذکر کیا ہے دوست سب بدلے

عدو بدلے تو بدلے ہوں مگر ہم تجھ سے کب بدلے
وہی جیسے کے تیسے ہیں نہ جب بدلے نہ اب بدلے

مجھے دم توڑتے دیکھا تو ڈر کر پھیر لی آنکھیں
میں صدقے مجھ سے بدلے بھی جو تم آنکھیں تو کب بدلے

یہ کیوں تیوری چڑھاتے ہو یہ کیوں آنکھیں دکھاتے ہو
یہ کسدن کی عنایت کے لئے جاتے ہیں اب بدلے

خیالؔ اب تو ہوا بزم سخن کا اور ہی عالم
جو پہلے رنگ تھے انداز تھے وہ سب کے سب بدلے

خیال اتنا نہیں کوئی جو پوچھے بات بھی دل کی
رُلاتی ہے مجھے آٹھ آٹھ آنسو بے کسی دل کی

دل بیتاب چٹکی سے مسل کر وہ یہ کہتے ہیں
یہی دل ہے اجی تعریف کرتے تھے اسی دل کی

پرائی آگ میں ای سوز الفت کون پڑتا ہے
مرے آنسو ہی آ آکر بجھاتے ہیں لگی دل کی

کہا جب میں نے تم کسواسطے دشمن سے ملتے ہو
تو وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر بولے خوشی دل کی

کوئی جینے سے خوش ہوتا ہے یہ مرنے پہ مرتا ہے
زمانے سے نرالی زندگی ہے زندگی دل کی

کہے دیتے ہیں یہ کھولیگی اک دن راز الفت کو
خیال اچھی نہیں ہر لحظہ ہر دم بیخودی دل کی

جفا کا ڈھنگ طرز جور اُڑا کوئی آسان ہے
ابھی کچھ روز گردوں اُس ستمگر کے چلن دیکھے

یہ راہ عشق بھی دنیا کی راہوں سے نرالی ہے
کہ جس میں ہر قدم پر راہزن ہی راہزن دیکھے

نہ آیا کام میرے کوئی بھی صحرائے غربت میں
خیالؔ اپنی غرض کے یار یاران وطن دیکھے

اُٹھا رکھی ہو جو میں نے، کوئی تدبیر ایسی ہے
مگر مشکل ہے تیرا وصل، کب تقدیر ایسی ہے

گلہ جور و ستم کا ہے نہ شکوہ ہے جفاؤں کا
کہ عادت ہی تری اے آسمان پیر ایسی ہے

دکھا دینگے کسی دن بے بلائے کون آتا ہے
بتا دینگے کہ جذب عشق کی تاثیر ایسی ہے

خدایا کیوں مرے ہی کام بن بن کر بگڑتے ہیں
الٰہی کیا مجھی کم بخت کی تقدیر ایسی ہے

خیالؔ اُس بت سے نکلے کام یہ کہنے کی باتیں ہیں
کہ میں ایسا نہ میری خوبی تقدیر ایسی ہے

خیال محمد صفدر علیخان خیالؔ شاگرد امیر ۱۸۹۲ء میں دفتر امیر اللغات میں کام کرتے تھے

خیال

بعد کا کچھ حال معلوم نہ ہو سکا۔ کچھ منتخب اشعار درج کیے جاتے ہیں۔ شعر خاصہ کہہ لیتے ہیں۔

دلِ بیمار نہ تجکو کبھی اچھا دیکھا	عمر بھر دامِ غم و رنج میں اُلجھا دیکھا
وصل و ہجر میں اُس بت کی تماشا دیکھا	عاشقوں کو کبھی مرنا کبھی جینا دیکھا
خیر ہے آپ گرے طور پہ کیوں غش کھا کر	کچھ تو فرمائیے کیا حضرتِ موسیٰ دیکھا
بوسہ لینے نہ دیا پیار انہیں کرنے نہ دیا	کبھی آئے بھی تو شوخی نے ٹھہرنے نہ دیا
یاس میں ہوتے تو کاہیکو یہ جھگڑا ہوتا	آسرا دیکے مجھے آپنے مرنے نہ دیا

خیالی جناب محمد نسیم اللہ صاحب مبارکپوری شاگرد مہر غازیپوری ۱۹۰۲ھ کے نسیم دکن سے کلام منتخب ہوا معمولی کہنے والوں میں ہیں، چند اشعار انکے نتائج افکار سے درج کیے جاتے ہیں +

چاہتا عزت نظر رکھتا اگر تو فیر پر	اے خیالی مبتلا ہونا نہ رانجھا ہیر پر
کانپ اُٹھے عرش والے بھی شبِ فرقت مگر	اُف نکی اُس سنگدل نے آہ پُرتاثیر پر
کر گیا سُرمہ اثر پہلے نگاہِ ناز سے	لیگیا بازی بُت کافر کا جادو تیر پر
چھوٹنا مشکل ہے صیادِ اجل کے دام سے	لاکھ سر ٹپکا کرے مارا کرے نخچیر پر

شیشہ و ساغر نہ محفل میں سبو درکار ہے	ساقی مہوش سے کہدو ایک تو درکار ہے
غزالانِ ختن کے ہوش ہوتے ہیں خطا یکسر	کہاں کھولے ہیں گیسو یار نے خوشبو کہاں تک ہے
خیالی یادِ زلفِ یار میں کاٹے نہیں کٹتی	درازی شبِ فرقت خدا جانے کہاں تک ہے

خیالی منشی محمد فخر الدین خیالی خلف مولوی عبدالعلی متوطن رائے بریلی ۱۲۵۶ھ میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی دان تھے فن طب میں بھی دخل تھا اور علم عروض و قوافی میں کمال حاصل تھا۔ فن سخن میں منشی امیر اللہ صاحب تسلیم سے لکھنو جا کر استفادہ کیا، وہ نہایت توجہ سے انکی غزل بناتے تھے تکمیلِ علوم و فنون کے بعد ریاستِ حیدرآباد دکن میں کچھ عرصہ تک چالیس روپیہ ماہوار پر ملازم رہے۔ پھر بھوپال میں ملازمت اختیار کی۔ اِنکی تصانیف سے "نثر خیالی" در مدح شاہ جہان بیگم والی بھوپال اور ایک ضخیم مثنوی چار سو صفحہ کی زیور طبع سے

آراستہ ہو چکی ہے۔ دو مثنویاں اور ایک دیوان ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔ فارسی میں سید محمد محمود صفہانی سے اصلاح لی ہے۔ شاعری میں آپکا انداز کلام میر سے ملتا ہے۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں فکر سخن کیا کرتے تھے۔ شاگردوں میں حکیم محمد وزیر، فکر نظام آباد دکن میں سر رشتہ دار ہیں۔ کلام سے علمی قابلیت مترشح ہوتی ہے۔ انتخاب یہ ہے

تن دل میں مرے یاد آئی جب تیری جاں ہو کر | فراموش آپ کو میں نے کیا ہے بے نشاں ہو کر
نہ پہنچیگا خیالی تو کبھی اُس شوخ کے در تک | جو پہنچا گوش گل میں بھی تو بلبل کی فغاں ہو کر
کیا بیخود کسی کی نرگس مخمور شہلا نے | رخ گلگوں دکھایا آج مجکو جام صہبا نے
بہت کھینچا پھرا میں گوشہ گوشہ سخت جانی سے | کباب کی طرح کھینچا مجھے میری تمنا نے
خیال روئے رنگیں نے خیالی کر دیا مجکو | مرا مرنے پہ بھی دامن نہ چھوڑا طبع شیدا نے
حسرت برس رہی ہے مری تربت خاک پر | چادر نہ پھول کی ہے نہ شمع مزار ہے
دکھلا رہا ہے چرخ پس از مرگ رفعتیں | باد صبا کی دوش پہ میرا غبار ہے

خبیر۔ ابو الخیر منظہر عالم قاضی بہیروی باشندۂ دربھنگا۔ دور موجودہ کے کہنے والوں میں ہیں بہار میں انکے کلام کی خاصی شہرت ہے۔ چالیس برس کے قریب عمر ہے۔ یہ کلام کا خلاصہ ہے

یہ وہ نکتہ ہے کہ سمجھیں اسے ہر ار پسند | ہے فرشتوں کو بھی خال رخ دلدار پسند
سر شوریدہ کو چوکھٹ پہ مجھے رکھدینا | اب کرے یا نہ کرے اسکو در یار پسند
دل ہے تو اسکے ہونگے خریدار اور بھی | ہم ڈھونڈ لیں گے تم سے طرحدار اور بھی
ہمکو یہ دیکھنا ہے کہاں تک کرے گا جور | ہاں اے جفا شعار ستمگار اور بھی
فتنے اُٹھا رہی ہے تمہاری نگاہ ناز | ڈھاتی ہے حشر شوخی رفتار اور بھی

خبیر۔ لالہ نہبری پرشاد منتظم دفتر معتمد پیشکاری حیدرآباد دکن آپنے فن سخن میں میر احمد علی مہر سے استفادہ کیا تھا سنہ ۹ء کے خدنگ نظر سے کلام انتخاب ہوا زیادہ حالات باوجود تلاش دستیاب نہو سکے۔

وحشت دل ان دنوں ایسی گریباں گیر ہے | طوق گردن میں ہے میری پاؤں میں زنجیر ہے
لاکھ کوشش سے نہیں اے دل سنایا حال ہجر | کہہ چکا اپنی سی اب آگے تری تقدیر ہے

ردیف دال

داد منشی غلام حسین خاں آزاد سیکش تھانوی کے شاگرد ہیں۔ کئی برس ہوئے پیام محبوب نامی ایک رسالہ دکن سے شائع کیا تھا، جو تھوڑے عرصہ میں بند ہوگیا، کلام میں کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں۔ انتخاب ملاحظہ ہو۔

اک دن تو قصد کیجیے تماشائے آب کا
مضطر ہے موج آنکھوں میں دم ہے حباب کا

چھپتا ہے اہلِ درد کا کب رنگ اتحاد
ہے اشکِ عندلیب میں عالم گلاب کا

سُن کے شکوہ وہ بے وفائی کا
بولے جھوٹا ہے تو خدائی کا

اے بتو بندہ پروری سیکھو
تمکو دعوی ہے گر خدائی کا

دارا صاحبِ عالم و عالمیان میرزا محمد دارا بخت دارا مرحوم عرف میرزا شبّو۔ ولیعہد اوّل حضرت ظلِ سبحانی محمد بہادر شاہ اخیر بادشاہ دہلی۔ شاگرد رشید ملک الشعرا شیخ ابراہیم ذوق ۱۱ جنوری ۱۸۴۹ء میں بعمر پچاس سال انتقال فرمایا اور شاہ چراغ دہلی کے مزار کے قریب ہیں دفن ہوئے آپ حضرت ابوظفر کے خلفِ اکبر تھے اور مشہور ہے کہ عمر میں صرف بارہ برس چھوٹے تھے۔ انکی والدہ زکیۃ النسا بیگم مرزا سلیمان شکوہ کی دختر تھیں جو اکبر شاہ کے حقیقی برادر خورد تھے، آپکے آٹھ اور بقول بعضے بارہ فرزند دلبند تھے، جن میں سے دو میرزا احمد اختر اور مرزا نصیر الملک اب بقید حیات ہیں، اور ایک صاحبزادی بھی زندہ و سلامت موجود ہیں۔ میرزا دارا بخت صاحب مولانا فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے اور میر محمدی صاحب سے بھی استفادہ کیا تھا۔ اور مولانا عماد الدین کے خط نسخ اور نستعلیق میں شاگرد تھے۔ بہت نیک خصلت بھولے بھالے شاہزادے تھے۔ آپکے کلام میں حضرت ذوق کا رنگ صاف جھلک رہا ہے۔ انتخاب کلام ہدیۂ ناظرین ہے۔

سحاب پارۂ دامن ہے آبدیدوں کا
نمود برق طپیدہ ہے دل طپیدوں کا
جہاں ہوئے ہیں گل سرخ خاک سے پیدا
اسی زمین میں ہے مدفن ترے شہیدوں کا
اثر یہ رکھتی ہے فریاد دردمندوں کی
بُرا ہے صبر ستمگر ستم رسیدوں کا
کوئی بھی ساتھ کسی کے گیا نہ اے دارا
عدم کو جاتا ہے کیا قافلہ جریدوں کا

خط میں گر وصل کا مضموں لکھیں ہم دارا
آرزو کا کوئی ہرگز نہ ملے حرف سے حرف
جا پھنسا حلقۂ زلف بت عیار میں دل
لیگئی کھینچ کے شامت دہن مار میں دل
ہنا کے جھانکے نہ طرف غیر کے وہ پردہ نشیں
اپنا رکھ آئے ہیں ہم روزن دیوار میں دل
شعلہ رو یہ ترے عارض پہ نہیں خال سیاہ
جل گیا گر کے کوئی آتش رخسار میں دل
دل لگی کیونکہ ہماری ہو کہیں اے دارا
لگ گیا اپنا تو اک کوچۂ دلدار میں دل
کسی کی چشم میگوں کا تصور ہمکو ہے دارا
قدم اُٹھتا نہیں ہے لغزش مستانہ رکھتے ہیں
وہ جو دریا میں نہانے کو گیا شب دارا
چومتا تھا قدم اُس مہ کے قمر پانی میں
ہم خاک ہو کے آئے ہیں کوچہ میں یار کے
لیکن یہ خوف ہے کہ صبا کو خبر نہ ہو
ہم سُن چکے ہیں شورش رفتار کسی کی
اب شور قیامت کا بھی دھڑکا نہیں ہمکو
ہے کشتئ عمر اپنی جو گرداب فنا میں
مانند حباب اپنا بھروسا نہیں ہمکو

یوں لاکھ اہل دانش تدبیر تو بنا لو
بگڑی ہوئی ولیکن تقدیر تو بنا لو
بدلہ ستم کا لینا ٹھیرا فلک سے دارا
آہ جگر کو اپنے تم تیر تو بنا لو

دل سے لطف و مہربانی اور ہے
مہربانی کی نشانی اور ہے
قصۂ فرہاد و مجنوں اور ہے
عشق کی میرے کہانی اور ہے
چشم گر فتنہ ہے تو اُس کی نگاہ
اک بلا ہے ناگہانی اور ہے
اُس مسیحا دم کو لائے گا خدا
کوئی دم کی زندگانی اور ہے
روکنے سے میری کب رکتے ہیں اشک
بلکہ ہوتی خوں فشانی اور ہے

کیوں علاج ضعف کرتا ہے طبیب ہم سے ای دارا وہ کب ہوتا ہی صاف	دم بدم یاں ناتوانی اور ہے اُس کے دل میں بدگمانی اور ہے
مت لگا مہندی محبت بے پیر اپنے ہاتھ سے غیر کے ہاتھوں سے میرا قتل کیوں منظور ہے	دل سے لے تو خونِ دلِ دلگیر اپنے ہاتھ سے ہائے لے قاتل لگا شمشیر اپنے ہاتھ سے

دارا

دارا - عالیجناب نواب خواجہ بہاؤالدین خان بہادر دلاور جنگ دارا، امیر حیدرآباد دکن شعرائے دکن میں نامور اور صاحب دیوان ہیں۔ سنہ ۱۲۷۳ھ سالِ پیدایش ہے۔ خواجہ یسین علی خان شکوہ کے فرزند رشید اور نواب وقارالدولہ نورالحسین مرحوم کے داماد اور شاگرد ہیں خوش رو خوش وضع خندہ پیشانی رئیس تھے، کلام مزے کا اور پاکیزہ ہے۔

بھری ہیں سینہ عاشق میں حسرتیں کیا کیا پھنسایا زلف میں کمبخت میری آنکھوں نے	صنم برائے خدا اُس سے مدعا دل کا خطا نظر کی ہے اس میں قصور کیا دل کا
اُنکو میرا مجھکو اُنکا اعتبار آنے تو دو عرش پر پھر میں قدم رکھوں معاذاللہ کی جا	دوستی کے درمیاں قول و قرار آنے تو دو پاؤں کے نیچے زمین کوئے یار آنے تو دو

داغ

داغ دہلوی - میر محمدی داغ - خلف الرشید میر سوز مرحوم - خوش رُو زیبا شمائل اور بڑے وجیہ جوان تھے - قسّامِ ازل نے اُنکی طبیعت میں ایک خاص درد ودیعت کیا تھا جسکی جھلک اُنکے کلام میں ملتی ہے شفیق باپ کی صلاح نے اُس میں اور چار چاند لگا دیئے تھے بیس[۲۰] برس کی عمر میں ایک شعلہ رُو کے عشق میں مُبتلا ہوئے، چند روز اُسکی صحبت میں نہایت عیش و عشرت سے اوقات بسر کی - آخر کار فلکِ تفرقہ پرداز کی کارسازی سے دام مفارقت میں پھنسکر جان دی - یہ واقعہ شاہ عالم ثانی کے زمانہ کا ہے - حالتِ نزع میں بہت انتظار کے بعد ایک اشتیاق نامہ اپنے مطلوب کو بھیجا جسکے سرِ نامہ پر یہ شعر لکھا ۔ ؎

از جاں رمقے بود کہ مکتوب تو آمد	دیگر چہ نویسم خبرم خوب گرفتی

اِس جواب کے لکھتے ہی طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔

اِسی کے پاس تھا دل کیا ہوا ہے ہمنشیں دیکھو
اِسی کے پاس ہو رہ رہ کے یہ جو مسکراتا ہے
پکڑنا چور کا مشکل نہیں گر کچھ سمجھ ہوئے
یہ چاہ نہیں بھلی بُری ہوتی ہے
لگتا نہیں جی کہیں بھی اُسکے بن آہ

اِدھر دیکھو اُدھر دیکھو نہیں دیکھو کہیں دیکھو
اِسی کی جیب دیکھو ہاتھ دیکھو آستیں دیکھو!
ہوائی رنگ دیکھو انفعالی سے جبیں دیکھو
جی لیتی ہے دوستی بُری ہوتی ہے
سچ کہتے ہیں یہ لگی بُری ہوتی ہے

داغ

داغ۔ تاجِ سخنوری کا گوہر شب چراغ نواب میرزا خان داغ دہلوی؛ المخاطب بہ سلطان الشعراء، بلبلِ ہندوستان، جہاں اُستاد، ناظم یار جنگ، دبیر الدولہ فصیح الملک بہادر، مرحوم و مغفور، بتاریخ ۱۲ ذی الحجہ سنہ ۱۲۴۶ھ مطابق سنہ ۱۸۳۱ء ۱۴ بیساکھ سمت ۱۸۸۸ بکرمی روز چہار شنبہ بمقام شاہجہان آباد دہلی محلہ بلیماران میں پیدا ہوئے۔ لائق جوتشیوں نے متعدد زائچے آپکی پیدائش کے وقتاً فوقتاً تیار کیے، کیونکہ مرزا صاحب کو فنِ نجوم سے صرف دلچسپی ہی نہ تھی، بلکہ خود بھی اِس فن میں خاصی دستگاہ رکھتے تھے، سات برس کی عمر میں آپ کی تعلیم شروع ہوئی، لیکن جملہ علوم و فنون میں تکمیل کا عدیم المثال موقعہ قلعۂ معلیٰ دہلی میں سنہ ۱۸۴۴ء میں باریاب ہوکر حاصل ہوا، اگرچہ اس سے پہلے بھی رامپور میں مولوی غیاث الدین، صاحب غیاث اللغات سے فارسی کی چند درسی کتابیں پڑھی تھیں، مگر جب قلعہ میں مستقل طور سے آئے تو مولوی سید احمد حسین ولد میر غلام حسین شکیبا جو میر تقی میر کے شاگرد تھے آپکے معلم مقرر ہوئے خوشنویسی میں پہلے اُستادِ زمانہ سید امیر پنجہ کش دہلوی کے شاگرد ہوئے، اور پھر معمولی اوقات میں مرزا عباد اللہ بیگ سے جو اُنکے شاگرد رشید تھے اصلاح لیتے رہے، مرزا صاحب کو قلعۂ شاہی کے متوسل ہونے سے جو خصوصیت اور آسانیاں تعلیم میں نصیب ہوئیں وہ عام طور سے اور لوگوں کو میسر نہیں آسکتیں۔ اجمالاً فنِ شہسواری و سپاہگری کے کل اصول اور کرتب قلعے میں رہ کر آپنے سیکھے۔

لکھنے کی مشق جن سے کی تھی انھیں سے بانک بھی سیکھی، اور مرزا سنگی بیگ سے جو خاندانِ میر حامد علی خاں کے مشہور پھکیت تھے پھکیتی اور علی مد سیکھی، گھوڑے کی سواری کی مشق سجن خاں اور بندو خاں چابک سوارانِ شاہی سے کی، اور بندوق اور تیر اور چو رنگ لگانے اور سینا کاٹنے میں خاص ولیعہد بہادر سے شرف یاب ہوئے۔ غرضکہ اسی طرح اور مختلف فنون متفرق لوگوں سے حاصل کیے، قلعے میں پہنچکر جہاں اور باتوں کا چرچا دیکھا وہاں سب سے زیادہ شاعری کی گرم بازاری پائی، آپکی خداداد ذہانت اور ہونہار طبیعت کا رجحان اسی طرف زیادہ رہا، اور اس آتش شوق کے بھڑکانے والے سامان بہت کچھ جمع ہو گئے، خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق علیہ الرحمۃ کا زمانہ تھا، وہ بادشاہ اور ولیعہد کے استاد ہونے کی وجہ سے اکثر اوقات قلعہ معلی ہی میں تشریف رکھتے تھے، مرزا صاحب کی ذہانتِ خداداد اور تیزیِ طبع دیکھکر آپکے مربی وسرپرست صاحب عالم میرزا ولیعہد بہادر نے آپ کو حضرت ذوق کا شاگرد کرا دیا، اس وقت آپکا سن گیارہ یا بارہ برس کا تھا، قلعے کے علاوہ شہر میں مختلف مقامات پر مشاعرے ہوا کرتے تھے، مرزا صاحب نے پہلے پہل نواب مصطفی خان مرحوم المتخلص بہ شیفتہ کے مشاعرے میں غزل پڑھی، جسکی طرح میں پہلا مطلع یہ فرمایا تھا۔

شرر و برق نہیں شعلہ و سیماب نہیں	کس لئے پھر یہ ٹھہرتا دلِ بیتاب نہیں

اگرچہ اب یہ مطلع موجودہ دیوانوں میں نہیں رکھا گیا ہے، مگر اہلِ نظر اس مطلع کو دیکھکر بارہ تیرہ برس کے لڑکے کی جودتِ طبع کا اندازہ کر سکتے ہیں، اسی زمانے کے ایک مطلع کو سُن کر

لگ گئی چُپ تجھے ای داغ حزیں کیوں ایسی	تجکو کچھ حال تو کمبخت بتا تو اپنا

مولانا صہبائی نے تحسین و آفرین کے کلمے کہے تھے،

ہنگامۂ غدر سے دس ماہ پیشتر ۱۸۵۶ء میں بقضائے الٰہی یکایک وبائے ہیضہ میں ولیعہد بہادر نے انتقال کیا، مرزا صاحب کو اس حادثے اور صدمے سے سخت رنج پہنچا، ہنوز اس صدمہ کی یادِ دلِ غمگین سے نجانے پائی تھی کہ دس مہینے بعد ۱۸۵۷ء کا غدر ہو گیا، اور کامل ۲۷ برس

تک جس عیش و عشرت سے زندگی بسر ہوئی تھی اُس دَور کا گویا خاتمہ ہو گیا، اِس انقلاب زمانے کے بعد مرزا صاحب مع اپنے قبائل کے رامپور چلے گئے اور نواب یوسف علی خاں بہادر فردوس مکاں کے سایۂ عاطفت میں پناہ گزین ہوئے۔ نواب موصوف اپنی حیات تک بطور مہمان نوازی سلوک کرتے رہے، اِنکے بعد نواب خلد آشیاں کلب علیخاں بہادر نے بھی وہی قدردانی کی اور مرزا صاحب کو اپنی مصاحبت میں رکھا، اور بطور معتمد خاص کارخانجات اصطبل و گاڑی خانہ و فراشخانہ و کنٹول خانہ و شتر خانہ سپرد کیا، ۲۴ برس تک مصاحبت کے ساتھ آپنے ان خدمات کو نہایت خوبی، عمدگی اور دیانت سے سرانجام دیا۔ نواب خلد آشیاں کو ان پر بہت بھروسہ اور اطمینان تھا اور عزت و قدر کی نظروں سے دیکھتے تھے، رامپور میں نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم کے زمانہ سے شعر و سخن کی گرم بازاری شروع ہو گئی تھی، اور نواب کلب علیخاں بہادر کے عہد میں جو فروغ ہوا اُسکی کیفیت اظہر من الشمس ہے، غالب، شاہزادہ حیا، بحر، قلق، عروج، اسیر، منیر، تسلیم، جلال، امیر مینائی وغیرہ سب نامی شعرا ریاست کے دعاگو تھے اور بجز غالب مرحوم کے سب وہیں قیام رکھتے تھے، اِن سب لکھنؤ کے سربرآوردہ شعرا کے مجمع میں گو دلّی کے شعرا میں صرف ایک مرزا صاحب ہی کا دم تھا، لیکن انکی خداداد معجز بیانی نے کسی کو ان پر غالب نہ آنے دیا اور یہ ہمیشہ آسمان شاعری پر آفتاب کی طرح چمکتے رہے، یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ دہلی میں قیام کے ہنگام میں جب نواب یوسفعلیخاں مرزا ولیعہد کے مصاحب تھے تو بچپن میں مرزا داغ اور نواب کلب علیخاں کا عرصہ تک ساتھ رہا تھا اور وہ بچپن کا خلوص نواب مرحوم نے تادم آخر بڑی وضعداری سے نبھایا۔

رامپور کے مشاہیر امرا کے ہاں اور خاص نواب صاحب کی طرف سے بھی مشاعرہ ہوا کرتا تھا اور اس سرکاری مشاعرہ کا اہتمام و انتظام مرزا صاحب ہی کے سپرد ہوتا تھا، مشاعرہ میں انکی غزل پر لوگوں کی نگاہیں رہا کرتی تھیں اور انکا یہ حال ہوتا تھا کہ اکثر بوجہ انتظام و اہتمام مشاعرہ اپنی غزل کہنے کی فرصت نہ ملتی جسوقت مشاعرہ شروع ہوجاتا اُس وقت

برابر کے کمرے میں ایک شاگرد کو لیکر ٹہلتے اور شعر کہتے جاتے تھے اور وہ لکھتا جاتا تھا، یہانتک کہ ان کا نمبر آیا اور غزل پڑھی، شعر پڑھنے کا انداز بھی ود انوکھا اور نرالا تھا کہ جس نے سنا ہے وہی اس لطف کو جانتا ہے، اول تو ڈیل ڈول تنومند اور شستہ پھر اس پر بڑی آواز یہ قدرتی مناسبتیں پڑھنے میں وہ شان پیدا کردیتی تھیں کہ سننے والے بیتاب ہوجاتے تھے اور معمولی شعر بھی مشاعرے میں سب سے اعلیٰ نظر آتا تھا، مولانا حالی فرماتے تھے کہ حضرت اسیر کی زبان سے خود انھوں نے رامپور میں سنا کہ "بھئی مشاعرے میں کیا جائیں ہماری طولانی غزلوں کو کوئی نہیں پوچھتا اور مشاعرہ ختم ہونے پر داغ کی غزل سب کی زبان پر ہوتی ہے"، مرزا صاحب غزل خوانی کے وقت اور لوگوں کی طرح ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتے تھے، نہ خواہ مخواہ بناوٹ کی آواز سے گلے کی رگیں پھلاتے تھے، نہایت سادہ طور سے باآواز شعر پڑھتے اور کسی کسی لفظ پر زیادہ جوش کے وقت صرف ایک ہاتھ اٹھا دیتے تھے، مرزا صاحب کا دیوان انکے شاگردوں کے پاس رہتا تھا جو وقت پر پیش کیا جاتا تھا اور اسی میں دیکھ کر غزل پڑھا کرتے تھے۔ ریاست رامپور میں مرزا صاحب کا قیام کم وبیش چالیس سال تک رہا اور مختلف اوقات سفر کا اتفاق ہوا، نواب خلد آشیاں کے ہمراہ حج کعبہ سے بھی مشرف ہوئے تھے، ایک مرتبہ دلی اور لکھنؤ پٹنہ وغیرہ کئی مقامات میں ٹھیرتے ہوئے کلکتے تشریف لے گئے اور وہاں کم وبیش تین ماہ تک قیام کیا۔

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں		عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

جس روز آپ پٹنہ پہنچے ہیں کسی رئیس شہر کے ہاں مشاعرہ تھا آپکے آنے کی خبر سنکر عمائد شہر آپ کو باصرار تمام مشاعرے میں لے گئے، آپنے فی البدیہہ بیس بائیس شعر جو جاتے وقت کہہ لئے تھے مشاعرے میں پڑھے اور خاطر خواہ داد پائی، کلکتے میں نا خدا کی مسجد کے سامنے آپ ٹھیرے تھے، جبتک وہاں رہے برابر ٹیا برج کے شعرا اور اہل بنگالہ سے ہم صحبت رہے اور شعر وسخن کے خوب چرچے رہے، نواب کلب علیخاں بہادر کے انتقال کے بعد ۱۲۹۸ھ میں نسل کا

تنفر ہوا، جنرل اعظم الدین خاں سے انکی ان بنی، اس وجہ سے ریاستِ رامپور سے دست کش ہو کے
اور دہلی چلے آئے، حیدرآباد دکن جانے تک کے وقفہ میں مختلف مقامات لاہور، امرت سر،
ریاست کشن کوٹ، بنگلور، آگرہ، علی گڑھ، متھرا، جیپور، ریاست منگرول، اجمیر شریف
ان سب شہروں میں اپنے ملاقاتیوں اور مشتاقوں کو اپنی ملاقات سے شرف بخشا، آخر ۱۳۰۵ھ
میں آپ حیدرآباد تشریف لے گئے، اور پہلے پہل چند روز محلہ بازار رشید میں عنبر میں مولوی
سیف الحق ادیب دہلوی مترجم اخبارات کے پاس اور پھر اسی کے متصل ایک دوسرے
مکان میں مقیم ہوئے، آپ کی شہرت اور ناموری نے دلوں میں پہلے ہی گھر کر لیا تھا، تمام شہر
میں دھوم مچ گئی، شدہ شدہ بندگانِ عالی حضور میر محبوب علی خان بہادر نظام دکن
خلد اللہ ملکہ کو بھی معلوم ہوا، اور اس درمیان میں آپ کی پہلی عرضی راجہ گردھاری پرشاد بہادر
عرف بنسی راجہ المتخلص بہ باقی کی معرفت پیشگاہِ سلطانی میں پہنچ چکی تھی، پہلی بار جو قصیدہ آپنے
حضور بندگانِ عالی دام اقبالہٗ کی مدح میں لکھا تھا اس کا مطلع یہ ہے۔

سرمۂ چشم غزالاں ہوئی گردِ دامن	ہیں ہوا باد یہ پیما طرفِ ملکِ دکن

اسکے بعد کچھ عرصہ کے لیئے دلی چلے آئے، ابھی یہیں تھے کہ نواب آسمانجاہ نے بذریعۂ رقعہ
طلب کیا، چنانچہ پھر حیدرآباد پہنچے اور باریابی کے منتظر رہے، حیدرآباد کی امیدواری اور
اسکے مصارف وہی لوگ خوب جانتے ہیں جنہوں نے وہاں کے امیدواروں کا حال دیکھا یا سنا
ہے، بالآخر آپکے صبر و استقلال نے یہ نتیجہ خیر دکھایا کہ ۲۶ جمادی الثانی ۱۳۰۸ھ روز شنبہ
۹ بجے شب کے مولوی ظہور علی صاحب کے مکان پر فرمانِ رحمت نشان یعنی حضور بندگانِ عالی
آصف جاہ سادس کی غزل ایک سر بمہر لفافے میں چند چوبدار لیکر حاضر ہوئے اور زبانی یہ
یہ کہا کہ صبح آٹھ بجے حاضر دربار ہونے کا حکم ہوا ہے، آپ نے اسی وقت اس غزل
کو دیکھ کر واپس کیا اور صبح حاضر دربار خاص ہو کر نذر پیش کی، بس اسی تاریخ سے سلسلۂ
اصلاح شروع ہو گیا، شرف حضوری کی جو تاریخ کہی یہ ہے، ؎

حضوری کی تاریخ پوچھیں اگر	تو کہدو ملے داغ سلطان سے

پھر تو روزانہ مراحم خسروانہ بڑھتے گئے، نو مہینے بعد ایک مراسلہ معتمد محکمہ صرف خاص صادر ہوا کہ سرکار نے آپکے نام چار سو پچاس روپیہ حالی کا وظیفہ روز ورود سے جاری کیا، پھر چھ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ کو بحکم سلطانی آپ کا وظیفہ ایک ہزار ماہوار مقرر ہوا، اور ورود حیدرآباد کیوقت سے اس تاریخ تک ایکہزار ماہوار کے حساب سے مرحمت فرمایا گیا، اس شاہانہ عطیہ کی تاریخ کہی

اس ترقی کی کہو اے داغ یہ تاریخ تم	ابتدا سے اپنی ساڑھے پانسو نقدی بڑھی

گویا پچھلے نقصانات کی تلافی بھی شاہانہ الطاف کی بدولت کماحقہ ہوگئی اور ہر طرح آسودگی اور فارغ البالی نصیب ہوئی، علاوہ اس مقررہ وظیفے کے وقتاً فوقتاً جو عطیات شاہی ہوئے انکی تفصیل بیکار ہے، علاوہ بیش قیمت مرصع گھڑی و جیغہ و قبضہائے شمشیر و چوبہائے دستی، و پارچہ جات کشمیری و بنارسی ایک موضع جسکو حیدرآبادی زبان میں مقطعہ کہتے ہیں اور جو بلدہ حیدرآباد سے دس بارہ کوس پر واقع ہے عطا کیا، اس موضع کی آمدنی کم وبیش دو ہزار روپیہ سالانہ تھی، قیمتی اشیاء کے سوا وقتاً فوقتاً نقد انعامات بھی پاتے رہے، جس کے متعلق بتحقیق سنا گیا کہ قریب چھبیس ہزار روپیہ کے جو انعامات میں دیئے گئے تھے خزانۂ خاص میں انکے نام جمع ہیں اور یہ حکم سلطانی تھا کہ مرزا صاحب جس وقت چاہیں یہ رقم وصول کرلیں، مگر یہاں الطاف شاہی نے اسقدر مستغنی اور مالا مال کر دیا تھا کہ تادم آخر اس رقم کے منگانے کی ضرورت نہ پڑی، مرزا صاحب نے حیدرآباد میں اٹھارہ برس مستقل قیام کیا، اور نہایت عزت و آبرو سے بسر کی، ریاست میں اعلیٰ طبقے کے امرا کی باہمی مخالفتوں کا بازار اس زمانے میں خوب گرم تھا، اور ہر نئے اُمیدوار یا ملازم کے لیئے اپنی ترقی کے واسطے منجملہ اور ذریعوں کے ایک بہت بڑا ذریعہ یہ ہوتا تھا کہ وہ کسی ذی اقتدار رئیس کا درباری اور خوشامدی بنے، اور دوسرے رئیسوں کے خلاف سازشوں میں شریک ہو، اس ترکیب سے مربی رئیس کے دل میں جگہ پیدا کی جاتی تھی اور یہی ذریعہ ترقی ہوتا تھا، مگر ظاہر ہے کہ آخر میں ایسی باتوں کا نتیجہ اچھی

سے لیے مضر ہوتا تھا، چنانچہ اس مرض کا اثر تھوڑا بہت اب تک باقی ہے جسکے ہاتھوں اکثر عہدہ داروں نے کفِ افسوس ملتے ہوئے حیدرآباد چھوڑا ہے۔ بہر حال مرزا داغ مرحوم نہ کوئی ملکی خیال کے آدمی تھے، نہ جنگی، نہ انھیں شاعری کے سوا کسی مشغلہ سے کام تھا۔ اگرچہ خوشامد درآمد کے لیے شاعری ایک اچھا ذریعہ ہے مگر حضرتِ داغ نے اِس قسم کی تمام باتوں سے ہمیشہ احتراز کیا، یعنی وہاں رہ کر بجز بندگانِ عالی متعالی اعلیٰ حضرت قدر قدرت خلد اللہ ملکہ کے بڑے سے بڑے رئیس کے نہ خوشامدی بنے نہ درباری، ہمیں جہاں تک علم ہے کہہ سکتے ہیں کہ کسی خاص تقریب کے سوا، اور وہ بھی ایک دو دفعہ، مرزا صاحب کسی رئیس ذی اقتدار کے ہاں محض اُسکی خوشنودی مزاج کے لیئے نہیں گئے، ہمیشہ بندگانِ عالی کی تحریک یا اجازت سے کہیں آتے جاتے تھے، مرزا داغ کا حیدرآباد میں جو اعزاز و اکرام ہوا وہ کسی پر پوشیدہ نہیں ہے، اور بیشک تمام اُردو کے شعرا کے طبقے میں یہ بات قابلِ فخر ہے کہ اس سلسلے میں ظاہری اعزاز کے لحاظ سے ایک شخص ایسا بھی ہو گیا، دکن کی قلمرو میں نعمت خان عالی کے بعد اس رتبہ پر فصیح الملک داغ فائز ہوئے ہیں۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ آپنے اس حصول ترقی و اعزاز کے مدارج طے کرنے میں زیادہ تر اپنی مدد آپ کی ہے، یہی وہ قابلِ قدر بات ہے جس نے آپ کو خود دار بنایا اور جس نے آپ کو عمر بھر کی چھوٹی خوشامدوں سے باز رکھا، جس نے ہمیشہ نیک نام رکھا، اور مرنے کے بعد متفق اللفظ ایک دنیا نے یہی رائے قائم کی، اُنکی عام بے غرضی اور بے تعلقی کی یہ حالت تھی کہ دوسرے امیروں کا کیا ذکر ہے، مہینوں اور بغیر طلب محض اپنی مرضی سے اپنے آقائے ولی نعمت کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے تھے اگرچہ اپنے ذاتی کتنے ہی کاموں کا ہرج ہوتا ہو الغرض از حد محتاط ہے اور دور اندیشی کو کام میں لاتے رہے، اس خیال کو اُنھوں نے ایک شعر میں ظاہر کیا ہے اور خوب کہا ہے۔

میں وضع کا پابند ہوں گو جان بھی جائے	جب کوئی بلائے نہیں آتا نہیں جاتا

اُمرا اور اراکین سلطنت کے علاوہ اپنے معمولی احباب اور نیاز مندوں سے وہ اس طرح ملتے تھے کہ باہم کوئی مغائرت معلوم نہ ہوتی تھی، بوجہ پیرانہ سالی اور کثرتِ امراض کے سبب زیادہ کہیں آنے جانے نہ تھے البتہ انکے پاس جو شخص آتا تھا اُس سے نہایت اخلاق اور محبت کے ساتھ پیش آتے تھے، حیدرآباد میں شاعروں کی کثرت مشہور ہے مگر آپ بجز چند مشاعروں کے دو وہ بھی کبھی کبھی، کسی عام مشاعرے میں نجاتے تھے، حاجی ابراہیم خانساماں جو حضور بندگانِ عالی نظام مرحوم کے مقرب اور بڑے بارسوخ اور ذی اقتدار شخص تھے ابتدا سے اُن میں اور مرزا صاحب میں باہم بہت محبت و اخلاص کا برتاؤ تھا وہ مہینے دوسرے مہینے اپنے گھر مشاعرہ کیا کرتے تھے اور اس مشاعرے میں اکثر بندگانِ عالی حضور نظام دکن کی تازہ غزل آیا کرتی تھی، اس مشاعرے میں مرزا صاحب البتہ اکثر جایا کرتے تھے اور حضور نظام کی غزل بھی خود ہی پڑھتے تھے، یا دو ایک مرتبہ مدار المہام بہادر اور راجہ رائے رایاں بہادر آنند ونت کے مشاعروں میں شریک ہوئے ورنہ کسی مشاعرے سے غرض نہ تھی۔

مرزا داغ دلی کے رہنے والے تھے اور جس طرح کہ اس شہر کے رہنے والوں میں عموماً خوش دلی و مذاق و لطیفہ گوئی و بذلہ سنجی کا مادہ ہوتا ہے اسی طرح مرزا صاحب کی کوئی بات لطیفے سے خالی نہ ہوتی تھی، اُنکی مسلسل تقریر اُنکی دلکش گفتگو میں خدا جانے کس قیامت کے مزے تھے کہ جی یہ چاہتا تھا ہر وقت سنے ہی جائیے، وہ بالکل اپنے اس شعر کے مصداق تھے۔

باتیں سُنئے تو پھڑک جائیے گا	گرم ہیں داغ کے اشعار یہ کیا

ہمکو ایک معتبر ذریعے سے اُنکے چند لطیفے ملے ہیں۔ تفریحِ ناظرین کے لیے ذیل میں درج کرتے ہیں مولوی حسن رضا خاں صاحب حسن بریلوی شاگرد رشید حضرت داغ مرحوم کا بیان ہے کہ زمانۂ قیام رامپور میں ایک روز میں حاضرِ خدمت ہوا دیکھا کہ ایک نہایت ہی ضعیف العمر صاحب عربی لباس پہنے ہوئے بیٹھے گا رہے ہیں، جب وہ اُٹھ گئے تو میں نے پوچھا "حضرت یہ ذاتِ شریف کون تھے؟" فرمایا تم واقف نہیں، عرض کیا نہیں، فرمایا سچ کہتے ہو

گزارش کیا۔ واقعی عرض کرتا ہوں، فرمایا "میاں یہ جنت کے قوال تھے" اسی طرح ایک دن کا ذکر ہے کہ ایک صاحب تشریف لائے، آپ عصر کی نماز پڑھ رہے تھے، وہ واپس گئے سلام پھیر کر اپنے ملازم سے فرمایا "انھیں بلا لانا" وہ جا کر لایا۔ پوچھا کیوں آئے تھے۔ پھر چلے کیوں گئے؟ کہا آپ نماز پڑھتے تھے اور مجھے ایک دوسرا کام تھا۔ فرمایا "میں نماز پڑھتا تھا لاحول تو نہیں پڑھتا تھا" ایک مرتبہ نواب خلد آشیاں کے سامنے (سانس) کی تذکیر و تانیث پر بحث ہو رہی تھی۔ جو فریق مذکر کہتا تھا وہ دلی والوں کے کلام سے سند پیش کرتا، فریق مخالف لکھنو والوں کے اشعار سے ثبوت دیتا تھا، مرزا داغ خاموش بیٹھے تماشا دیکھ رہے تھے، کہ نواب صاحب نے انکی طرف مخاطب ہو کر فرمایا، مرزا داغ تم کچھ نہیں کہتے۔ فرمایا فریقین تھک لیں تو میں ایک قولِ فیصل عرض کرونگا، دونوں فریقوں نے بالاتفاق کہا کہ آپ ہی کے سر فیصلہ ہے۔ فرمایا "میرے نزدیک مؤنث کی سانس مؤنث ہے۔ اور مذکر کا مذکر" اس پر سب ہنس دیئے اور گفتگو ختم ہو گئی۔ ایک مرتبہ رامپور کے مشاعرہ میں طرح دیگئی "ہمکو رونا ہے خندہ گل کا" آپ کچھ علیل تھے، مسہل ہو چکے تھے طرح پر غزل نہ کہی تھی، تلامذہ نے اصرار کیا ناتوانی کا عذر فرمایا۔ مگر بعض ضدی شاگردوں نے نہ مانا فرمایا خیر قلمدان لاؤ۔ سب خوش ہو گئے کہ استاد غزل تصنیف فرمائیں گے، اب کان مشتاق ہیں اور نگاہیں استاد کا منہ تک رہی ہیں کہ یہ مطلع ارشاد ہوا ؎

ہمکو کیا لطف ساغرِ مل کا		کبھی کچھ بڑی ملی کبھی چھلکا	

احسن مارہروی کی زبانی سنا کہ ایک دن احباب و تلامذہ خدمتِ استاد میں حاضر تھے اور آپ غزل کہہ رہے تھے، مرزا مظفر حسین بیگ بارق تخلص بھی حاضر تھے انھوں نے استاد کے فکر بے ساختہ اور تصنیف برجستہ کو دیکھ کر معمولی طور پر کہا کہ خدا جانے آپ کس طرح شعر کہتے ہیں ذرا دیر نہیں ہوتی کہ پورا شعر کہہ دیتے ہیں، استاد نے یہ سنکر فرمایا "بھائی تم کس طرح شعر کہتے ہو" انھوں نے جواب دیا کہ حضرت ہم تو کسی خاص وقت تو

پلنگ پر لیٹ کر اور حقہ سامنے رکھکر فکر سخن کرتے ہیں۔ کبھی اِس طرف کروٹ لی کبھی اُسطرف کبھی اُٹھے، کبھی بیٹھے، اِس مشکل سے کوئی شعر نکلتا ہے، فرمایا "آپ شعر نہیں کہتے بلکہ شعر جنتے ہیں"، اُنکی سحر بیانی اور قبولیت کا اس سے بڑھکر کیا ثبوت ہوگا کہ ہندوستان میں شاید کوئی قصبہ و قریہ ایسا ہو کہ جہاں اُنکا کلام خواص سے لیکر عوام تک کی محفلوں اور سماع کی صحبتوں میں گایا نہ جاتا ہو، مرزا داغ کا حق بہ حیثیت مصلح زبان اُردو قیامت تک مٹنے والا نہیں، اُنھوں نے بہت سے ثقیل اور غیر فصیح الفاظ ترک کردیئے، موافق اور مخالف دونوں اس امر کے شاہد ہیں کہ غزل کے جسقدر موضوع ہیں اُن تمام صفتوں پر حضرت داغ حاوی تھے اور بلاشبہ تغزل کے عدیم النظیر اُستاد اور فرد یگانہ تھے۔ اسیر۔ منیر۔ حالی۔ ظہیر۔ مجروح۔ تسلیم۔ سالک۔ جلال۔ امیر۔ سب اُنکی قادر الکلامی کے معترف اور مداح تھے، بہرحال اس شعر کے پتلے کی خوش آیند باتیں قدرتی طور پر ناموزوں طبائع میں موزونی پیدا کرنے بلکہ شاعر بنادینے کے لئے کافی سامان تھیں، مرزا صاحب کے روزمرہ واقعات اور حالات کی تفصیل و تشریح کے لئے ایک مبسوط کتاب چاہیئے۔ آپ نے اٹھارہ برس حیدرآباد میں بعزت و آبرو بسر کرکے ۹۔ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۷۔ فروری ۱۹۰۵ء کو آٹھ روز مرض فالج میں مبتلا رہ کر دار فانی سے انتقال فرمایا۔ گذشتہ سالوں میں تین چار مرتبہ حاسدوں نے اُنکی وفات کی خبر اُڑائی۔ حتیٰ کہ اخباروں میں قطعات تاریخ وفات تک درج کردیئے۔ اِس لئے چند روز لوگوں کو اس کے ماننے میں تامل رہا لیکن آخر کار اس مرتبہ خبر صحیح نکلی۔ انتقال کے بعد بحکم سلطانی عید بقر کے دن آپ کا جنازہ مکہ مسجد (حیدرآباد) میں لایا گیا جہاں بعد دوگانہ عید جنازے کی نماز پڑھی گئی۔ پھر یوسف صاحب شریف صاحب کی درگاہ میں دفن کئے گئے۔ جناب امیر مینائی مرحوم بھی اِسی جگہ آسودہ ہیں۔ تجہیز و تکفین کے مصارف کے لئے خزانۂ شاہی سے پانچ ہزار روپیہ عطا ہوا تھا۔ انتقال کی یوں تو ہزارہا تاریخیں شعرا نے لکھیں مگر یہاں ایک تاریخ ابو المعظم مرزا سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی اُنکے داماد کی لکھی جاتی ہے۔ کیونکہ یہی

تاریخ لوحِ مزار پر کندہ ہوئی ہے۔ اس تاریخ کے سوا آپ کے نام اور تخلص میں تاریخ وفات نکلتی ہے یعنی (نواب میرزا داغ) اس تاریخ میں بکثرت توارد ہوا ہے قریب قریب ہر ایک تاریخ کہنے والے سننے اور مادوں کے ساتھ یہ مادہ بھی نکالا ہے۔

قطعۂ تاریخ از جناب سائل دہلوی

رفت از دہر چوں فصیح الملک	لرزہ افتادہ در نمامی ہند
اوستادِ نظام آصف جاہ	موردِ لطفِ شاہ حامی ہند
راست بر قامتش قبائے سخن	زیب بر روے خطاب جامی ہند
سلکِ نظمش لسان سلکِ گہر	جوہری سخن نظامی ہند
شد وفاتش بشام یوم الحج	دفن شد روز عید سامی ہند
آہ دل بر کشید و سائل گفت	مدفن پاک داغ نامی ہند

اسی طرح اُنکے پیارے شاگرد سید رضی الدین کیفی نے تاریخ کہی۔ کیفی نوشت بلبل ہندوستان برفت

داغ نواب میرزا گفتم

یہ قیامت تک کسی کے دل سے مٹنے کا نہیں　　مادہ تاریخ کا داغ فصیح الملک ہے

مرزا صاحب کے تین دیوان اور ایک مثنوی مطبوعہ موجود ہے اور چوتھا دیوان یادگار داغ بھی نیا تھا۔ چاروں دیوانوں میں گلزار داغ و آفتاب داغ زمانہ قیام رامپور کے چھپے ہوئے ہیں۔ ان دیوانوں میں اکثر وہی غزلیں ہیں جو رامپور کے مشاعروں میں کہی گئی تھیں اُن غزلوں میں ایک عجیب دلکشی اور سحر آفرینی ہے یہ وہ فکر سخن ہے جو بڑے بڑے ماہران و اُستادان فن کے مقابلے میں کیا گیا تھا اور اسی نے جہاں اُستادی کا سکہ سب کے دلوں پر بٹھا دیا تھا۔

"مہتاب داغ" حیدرآباد کے قیام کا نتیجہ ہے اور وہیں پہلی مرتبہ چھپا اب دوسری بار راقم تذکرہ نے اُن کے ورثا سے حقوق تصنیف لیکر بڑے اہتمام سے چھپوایا ہے اور شائقین کے فائدہ اور اشتیاق کی نظر سے نصف قیمت کر دی ہے اس دیوان میں مضامین کے ساتھ

سلاست زبان کا بہت لحاظ کیا ہے اس دیوان کا ایک ایک شعر سہل ممتنع ہونیکے علاوہ ایسا دلچسپ اور دلکش ہے کہ ایک مرتبہ سننے کے بعد اُس کا لطف دل سے نہیں جاتا مثنوی جس کا نام فریادِ داغ ہے زمانہ قیام رامپور میں کہی گئی تھی۔ اور اس مثنوی کی اصلیت یہ ہے کہ ایک طوائف منی بائی المعروف بالتخلص بہ حجاب کلکتے کی رہنے والی بے نظیر کے میلے میں رامپور آئی۔ مرزا صاحب کی منظور نظر ہوئی بس اسکی محبت و فراق کا وہ افسانہ ہے۔ حق یہ ہے کہ سچا واقعہ ہونے کی وجہ سے اُسکا ہر شعر تیر و نشتر کا کام کرتا ہے۔ زبان کے ساتھ تمام شاعرانہ خوبیوں کا لحاظ رکھا ہے۔ یہ تینوں دیوان اور مثنوی کئی کئی بار چھپ چکی ہیں اور ہر جگہ موجود ہیں۔ یادگار داغ نامی چوتھا دیوان سید علی احسن نے مرزا داغ مرحوم کی وفات کے بعد لاہور سے شائع کیا۔ لیکن چونکہ بلا اجازت ورثائے مرزا مرحوم یہ دیوان شایع ہوا۔ اس لئے اصلی مسودات اور غزلیات مکمل طبع نہ ہو سکیں آخر کار راقم تذکرہ نے بعد حصول حق تصنیف بقیہ غیر مطبوعہ کلام بطور ضمیمہ یادگار داغ مرتب کر کے شائع کیا۔

اُن کے عادات اور حسن اخلاق کے متعلق اتنا لکھنا کافی ہے کہ طبیعت ایسی مرنجان مرنج تھی کہ کیا دنیاوی معاملات اور کیا شاعری کے میدان میں کبھی کسی سے بدمزگی نہ ہوئی۔ ہجو لکھنے لکھانے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ اعراض و تعریض اُن کے مسلک سے باہر تھے۔ بعض ہم عصر اُستادان فن کو اُن سے حسد ہو تو ہو۔ وہ خود اس الزام سے بالاتر تھے۔ ایک اس کی زندہ نظیر وہ اشتیاق اور خلوص تھا۔ جو انھوں نے امیر مینائی مرحوم کی حیدرآباد میں مہمانداری اور تیمارداری میں ظاہر کیا۔ اسی طرح حضرت جلال۔ مجروح۔ ظہیر۔ تسلیم۔ راسخ۔ نساخ شعرائے ہم عصر سے اون کے تعلقات ہمیشہ شگفتہ رہے۔ شاعری کی دنیا میں یہ ایک عجیب بات ہے کہ شاذ ہی کسی کو موجد یا مقلد ہونے کا خطاب دیا جا سکتا ہے۔ ہاں صاحب طرز ہونا جدا بات ہے۔ جرأت نے شوخ کلامی اور معاملہ بندی کا جو رنگ نکالا۔ اُسے منشی مادھو رام جوہر فرخ آبادی نے (جنکا ذکر خیر اور کلام حصہ دوم میں درج ہو چکا ہے) اِس خوش اسلوبی

سے سانچے میں ڈھالا کہ وہی تغزل کا زیور قرار پایا۔ حضرت داغ نے اپنی طبع وقاد کی صنعت کاری سے اسے ایسا اجالا اور مرصع کیا کہ معشوقہ مجاز کے سر کا جھومر بن گیا۔ غزل کی شاعری کا سرتاج قرار پایا۔ استاد کامل فن نے اُسے ایسا کر دکھایا کہ ہر کس و ناکس کے دل کو بھایا۔ اور ہر کوئی اسی رنگ میں لکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ فرق اتنا ہوا کہ کسی کو کسی حد تک کسی کو کسی درجہ تک اس تقلید میں کامیابی ہوئی۔ مگر بعض نامی شعراء اس تقلید میں اپنا اصلی رنگ بھی کھو بیٹھے۔

حضرت داغ یہی نہیں کہ غزل گوئی کے مُسلم الثبوت استاد اور اپنے طرز میں لاثانی تھے۔ بلکہ وہ جملہ اصناف سخن پر قادر تھے۔ ان کی قادر الکلامی کا ثبوت ان کے دیوان سے مل سکتا ہے۔ مثنوی شاعری کے نہایت مشکل اصناف میں سے ہے۔ اور ہم فریاد داغ کا ذکر اوپر کر آئے ہیں۔ قصیدہ۔ بلاغت سخن۔ مہارت فن۔ علوئے تخیل۔ پختہ کلامی۔ اور علمیت و تبحر کی معیار سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ اردو میں مرزا رفیع کے بعد شیخ ابراہیم ذوق اور میر ممنون کے قصاید ہی مقبول ہوئے اور مستند مانے گئے۔ لیکن حضرت داغ کے جو قصاید مہتاب داغ میں موجود ہیں۔ وہ اپنی آن بان میں کسی ہم عصر کے قصیدوں سے کم نہیں۔ اور انکی قادر الکلامی اور مشاقی فن کا سکہ بٹھاتے ہیں۔ میرزا داغ کی اوستادی میں سوائے کم سواد حاسدوں کے اور کسی کو کیا کلام ہوسکتا ہے۔ ان کے کلام کا خاص رنگ سہل ممتنع۔ فصاحت۔ روزمرہ کی صفائی شوخی مضمون اور بیاں کی ندرت ہے۔ چنانچہ ہزارہا اشعار اور صدہا غزلیں قبول عام و خاص کا تمغہ پاکر لوگوں کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ زبان کے چٹخارے اور لوچ کے ساتھ بندشیں بہت چست ہوتی ہیں اور اکثر محض الفاظ کے الٹ پھیر سے شعر میں جان ڈال دیتے ہیں۔ ان کی پرگوئی اور قادر الکلامی حیرت انگیز ہے۔ چھوٹی بحر ہو یا طویل۔ زمین شگفتہ ہو یا سنگلاخ۔ اپنے زور طبیعت سے آمد کا مزا دکھا دیا ہے۔ غرض کہ کہیں بھی اپنے رنگ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ آورد کا تمام کلام میں کہیں شائبہ تک نہیں ہے۔ گلزار داغ کی غزلوں

کے مطالعے سے پایا جاتا ہے کہ غور وفکر سے شعر کہتے تھے شعر کی بندش اور الفاظ کے
ہر ایک پہلو پر نظر غایر ڈالتے تھے۔ مہتاب داغ میں اس کے برخلاف ایک حیرت انگیز روانی
پائی جاتی ہے۔ طبیعت ہے کہ دریا کی طرح اُمڈی چلی آتی ہے۔ زبان صاف شستہ۔ بندش
میں تصنع کو ذرا دخل نہیں۔ باایں ہمہ مضمون میں شوخی اور تیکھاپن اس درجہ ہے کہ شعر بے مثل
ہو جاتا ہے۔ اور دل میں چٹکی لئے بغیر نہیں رہتا۔ حسن وادا کے دلفریب نظارے اختلاط کی
نوک جھونک کے مضمون۔ جس صفائی اور نفاست سے ان کے دیوانوں میں پائے جاتے ہیں
وہ انھیں کا حصہ ہے۔

المختصر اس سے کسی کو انکار نہیں کہ شہرت خاص وعام اور قبول دوام کے لحاظ سے بلامبالغہ
اس زمانہ میں کسی شاعر کو اُس نعمت کا عشر عشیر بھی نصیب نہیں ہوا جو حضرت داغ کا حصہ ہے۔ داغ
کا ہر شعر عجیب مقناطیسی جذب اور بجلی کی حرارت رکھتا ہے جس کی تاثیر سننے والے کے دل کو
بے چین کئے دیتی ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جس کا پیدا کرنا شاعری کا جزوِ اعظم ہے۔ مگر ہر کوئی
اسے پیدا بھی نہیں کرسکتا۔ اگر جذبات۔ احساسات اور خیالات کی ہو بہو اور بولتی چالتی تصویر
کھینچنا۔ قدرت کی نقاشی کے مرقعہ میں جگہ پاسکتا ہے۔ تو ہم حضرت داغ کو نیچرل شاعری کے
دربار میں سب سے اونچی جگہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

شعرا کی کثیر تعداد آپ کے تلمذ سے مستفید ہوئی۔ اور جسقدر اچھے شاعر آپ نے ملک میں پیدا
کیئے۔ اسکی نظیر آجتک دیکھنے میں نہیں آئی۔ یہ اردو شاعری پر آپ کا دوہرا احسان ہے۔

کل شاگردوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار کے قریب ہے۔ جن میں سے بعض ارشد تلامذہ کے نام یہاں
درج کئے جاتے ہیں۔ حضور نظام جنت مقام۔ بیخود بدایونی۔ نسیم بھرتپوری۔ بیخود دھلوی
مرزا سائل دھلوی۔ آغا شاعر دہلوی۔ ڈاکٹر محمد اقبال۔ حسن بریلوی۔ بیباک۔ حیرت۔ آزاد
رسا۔ فیروز۔ اشک۔ احسن۔ مارہروی وغیرہم۔

ایسے شخص کے کلام کا انتخاب ایک دشوار کام ہے تاہم چند اشعار انکے نتائج افکار سے ناظرین کی تفریح کیلئے نقل کیے جاتے ہیں

انتخاب گلزار داغ

سلامت منزلِ مقصود تک اللہ پہنچا دے
مجھے آنکھیں دکھاتا ہے ہر اک نقشِ قدم میرا
مجھے آباد کرتا ہے مجھے برباد کرتا ہے
خدایا دین و دنیا میں کرم تیرا ستم میرا

یہاں بھی تُو وہاں بھی تُو زمیں تیری فلک تیرا
کہیں ہم نے پتا پایا نہ ہرگز آج تک تیرا

صبر سے زاہد نا فہم نہ میخواروں کا
بخشنے والا بھی دیکھا ہے گنہ گاروں کا
ڈر گئے نام شفا سُن کے نہ ہے خواہشِ مرگ
مُنہ ذرا سا نکل آیا ترے بیماروں کا
دوش پر اپنے جو صیاد نے زلفیں چھوڑیں
اور جی چھوٹ گیا آج گرفتاروں کا

گر میرے بُت ہوش رُبا کو نہیں دیکھا
اُس دیکھنے والے نے خدا کو نہیں دیکھا
جنّت ہے مگر خانۂ دشمن بھی الٰہی
آتے ہوئے اس گھر میں قضا کو نہیں دیکھا

آج راہی جہاں سے داغ ہوا
خانۂ عشق بے چراغ ہوا

نہ دل ہی ٹھہرا نہ آنکھ جھپکی نہ چین پایا نہ خواب دیکھا
خدا دکھائے نہ دشمنوں کو جو دوستی میں عذاب دیکھا

آخر کو عشق کفر سے ایمان ہو گیا
ہیں بُت پرستیوں سے مسلمان ہو گیا
رندانِ بے ریا کی ہے صحبت کسے نصیب
زاہد بھی ہم میں بیٹھ کے انسان ہو گیا

دل کیا ملاؤ گے کہ ہمیں ہو گیا یقیں
تم سے تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا

لے ہی تو آئیں گے اُسے ہم دم
میرے ہی نام سے تو آئے گا

تیرا اک وعدۂ دیدار اور وہ بھی قیامت پر
پھر اُس پر صبر اتنا ہائے دل امیدواروں کا
آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں
آپ کے ملنے کا ہو گا جسے ارماں ہو گا
بن گئی فرقت میں جو کچھ اپنے جی پر بن گئی
ہو گیا جو کچھ ہمارے دل کا عالم ہو گیا
حُسن میں انداز کے آتے ہی نخوت آ گئی
زلف میں پڑتے ہی بل ابرو بھی پُرخم ہو گیا

جس کی بغل میں شب کو وہ ہو اُس کو دیکھئے
جس وقت آنکھ کھل گئی دیدار ہو گیا

اے داغ کیا بتائیں محبت میں کیا ہوا
بیٹھے بٹھائے جان کو آزار ہو گیا

اللہ رے جامہ زیب تری جامہ زیبیاں
پہنا جو تو نے رنگ وہی رنگ کھل گیا

ستم ہی کرنا جفا ہی کرنا نگاہ الفت کبھی نہ کرنا
تمھیں قسم ہے ہمارے سر کی ہمارے حق میں کمی نہ کرنا

ہماری میت پہ تم جو آنا تو چار آنسو گرا کے جانا
ذرا رہے پاس آبرو بھی کہیں ہماری ہنسی نہ کرنا

وہ ہے ہمارا طریق الفت کہ دشمنوں سے بھی مل کے چلنا
یہ ایک شیوہ ترا ستمگر کہ دوست سے دوستی نہ کرنا

تمھیں کہو کہ کہاں تھی یہ وضع یہ ترکیب
ہمارے عشق نے سانچے میں تم کو ڈھال دیا

بتائیں لفظ تمنا کے تم کو معنے کیا
تمھارے کان میں اک حرف ہم نے ڈال دیا

جو ہو سکتا ہے اس سے وہ کسی سے ہو نہیں سکتا
مگر دیکھو تو پھر کچھ آدمی سے ہو نہیں سکتا

نہ رونا ہے طریقے کا نہ ہنسنا ہے سلیقے کا
پریشانی میں کوئی کام جی سے ہو نہیں سکتا

رہے ہو جس طرح دل میں رہو نظروں میں بھی یونہی
کہاں کی ایسی گھبراہٹ ہے ٹھہرو دم تو لو جانا

ہوا ہے جب سے شہرہ اُس عدوئے دیں و ایماں کا
کوئی دل چیر کے دیکھے عقیدہ ہر مسلماں کا

خوشامد اس قدر کی ہو گیا بدنام عالم میں
زمانہ جانتا ہے مجھ کو یہ عاشق ہے درباں کا

حورانِ خلد بولتی ہیں بڑھ کے بولیاں
نیلام ہو رہا ہے تمھارے شہید کا

وائے غفلت کہ اب کیا ہم نے
جو ہمیں پہلے کام کرنا تھا

گذاری میں نے ساری رات یہ کہکر وہ اب آئے
ذرا اے چشمِ تر تھمنا ذرا اے دل جگر رہنا

ہماری سخت جانی بس نہ ٹھہری کھیل ہی ٹھہرا
قسم ہے تم کو گردن پر چھری تم پھیر کر رہنا

سنبھل سنبھل کے بگڑتا ہے کچھ دل بیتاب
الٰہی آج یہ صدمہ ہے جان پر کیسا

مر گئے ہم تو وضعداری میں
دوستی کی نباہ نے مارا

جو عاشقی میں خاک ہوا کیمیا ہوا
کہتا تھا آج خاک میں کوئی ملا ہوا

کم ہوگا داغ سا بھی مکار اب جہاں میں
اُس بُت پہ شیفتہ ہوا اور نام لے خدا کا

یہ دل کو تاب کہاں ہے کہ ہو مآل اندیش
کچھ آگے داورِ محشر سے ہے امید مجھے
ڈوب کر سینے میں اس رنگ سے پیکاں نکلا
تری الفت کی چنگاری نے ظالم اک جہاں پھونکا
مجھے کیوں کر یقیں ہو آگ ظالم کو جلائیگی
رہا تھا کونسا ارمان جیتے جی جلانے کا

انھوں نے وعدہ کیا اس نے اعتبار کیا
کچھ آپ نے مرے کہنے کا اعتبار کیا
دل سے بے ساختہ نکلا کہ وہ ارماں نکلا
ادھر چمکی ادھر سلگی یہاں پھونکا وہاں پھونکا
کسی دن آتشِ رنگِ شفق نے آسماں پھونکا
کہ تو نے لاش کو میری جواب اے بدگماں پھونکا

عشق در پردہ پھونکتا ہے آگ
ڈھونڈتی ہیں جسے مری آنکھیں
جان جاتی دکھائی دیتی ہے

یہ جلانا نظر نہیں آتا
وہ تماشا نظر نہیں آتا
اُن کا آنا نظر نہیں آتا

سینے میں اب کہاں وہ جوش وہ بھی تھا اک اُبال سا
عرض وفا پہ دیکھنا اوسکی ادائے دلفریب
اوسکی لچک پہ دم فدا اوسکی ادا پہ دل نثار
تارے ہی گن کے کاٹتے رات فراق کی مگر

بیٹھ گیا کچھ اُٹھتے ہی چھوڑ گیا خیال سا
دلمیں کچھ اعتبار سا آنکھ میں کچھ ملال سا
ہائے وہ شاخ سی کمر ہائے وہ قد نہال سا
نکلا ستارہ بھی کہیں کوئی تو خال خال سا

کوسوں تک اُسکے لٹے پاؤں چلا آہ میں غریب
ہاتھوں سے جو بچے تری باتوں سے مر گئے
تہمت نہ رکھ خدا کے لئے مجھ پہ زاہدا

جبتک میری نظر سے نہ پنہان وطن ہوا
چٹکی میں تھا جو تیر وہ لب پر سخن ہوا
کب میں نے توبہ کی تھی جو میں توبہ شکن ہوا

بات کیا چاہیئے جب مفت کی حجت ٹھہری
نفس کے آنے جانے پر بشر کی زندگی ٹھہری
رہی ہے رات بھر تھم تھم کے رہ رہ کر چپک دلمیں
کل چھڑالیں گے یہ زاہد اجتو ساقی کے ہاتھ
زندگی میں پاس سے دم بھر نہوتے تھے جُدا

اس گنہ پر مجھے مارا کہ گنہگار نہ تھا
یہ پوچھو تو مسافر تو نے کیا لطفِ سفر پایا
جگا بالے کے چٹکی درد نے جب بیخبر پایا
رہن اک چلو پہ ہمنے حوضِ کوثر رکھدیا
قبر میں تنہا مجھے یاروں نے کیونکر رکھدیا

پند گو لطفِ ملاقات اسے کہتے ہیں
خوش کبھی میں نہوا شاد کبھی تو نہ ہوا

لطف فرما جو وہ رہتا تو ٹھکانا ہی نہ تھا
عین حکمت تھی وہ کافر جو دل آزار رہا

خاک میں دل کی صفائی نے ملایا مجھکو
کہ مرا ایک جہاں واقفِ اسرار رہا

عجب اپنا حال ہوتا جو وصالِ یار ہوتا
کبھی جان صدقے ہوتی کبھی دل نثار ہوتا

جو تمھاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدہ کرتا
تمھیں کہدو منصفی سے تمھیں اعتبار ہوتا

ترے وعدہ پر ستمگر ابھی اور صبر کرتے
اگر اپنی زندگی کا ہمیں اعتبار ہوتا

یہ مزا تھا دل لگی کا کہ برابر آگ لگتی
نہ تجھے قرار ہوتا نہ مجھے قرار ہوتا

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

دیکھا ہے بتکدے میں جو اے شیخ کچھ نہ پوچھ
ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

کبھی مسجد میں جو وہ شوخ پریزاد آیا
پھر نہ اللہ کے بندوں کو خدا یاد آیا

میرے قابو میں نہ پہروں دلِ ناشاد آیا
وہ مرا بھولنے والا جو مجھے یاد آیا

دی مؤذن نے شبِ وصل اذاں پچھلی رات
ہائے کمبخت کو کسوقت خدا یاد آیا

جان لیجائے گا آنا شبِ تنہائی کا
کون اب روکنے والا ہے مری آئی کا

ہو گیا پرتوِ رخسار سے کچھ اور ہی رنگ
میں نے منہ چوم لیا اُس کے تماشائی کا

رازِ دل کوئی کہے لاکھ میں کیونکر اپنا
داورِ حشر جدا چاہیئے محشر اپنا

وہ زمانہ بھی تمھیں یاد ہے تم کہتے تھے
دوست دنیا میں نہیں داغ سے بہتر اپنا

میرے مرنے سے کیا ظالم نے گو سامانِ عیش
پر لبِ مطرب پہ آکر نغمہ شیون بن گیا

اُٹھنا ہی تیری بزم سے دشوار تھا ہمیں
اوسپر سنبھالنا دلِ بے اختیار کا

غش کھا کے داغ یار کے قدموں پہ گر پڑا
بیہوشی نے بھی کام کیا ہوشیار کا

لطف آرام کا نہیں ملتا
آدمی کام کا نہیں ملتا

دل نے تری گلی سے نہ اُٹھنے دیا مجھے
سو بار قصدِ دیر و حرم ہو کے رہ گیا

غم نے ترے نچوڑ لیا قطرہ قطرہ خوں
تھوڑا ہی درد دل میں کھٹکنے کو رہ گیا

نام اسکا تو میرے دل میں تھا پنہاں ناصح
ہائے کمبخت ترے منہ سے یہ کیونکر نکلا

بیداد تری دیکھ کے یہ حال ہوا ہے
عاشق کوئی دنیا میں کسی پر نہیں ہوتا

شب کو جلتا چھوڑ آئے تھے دل اس کوچہ میں ہم
وہ بھی قسمت سے چراغِ راہِ دشمن ہو گیا

اے داغ صدمہ غم ہجراں بجا درست
یہ سب سہی مگر نہیں جینا ضرور تھا

جو عرض تمنا پر ظالم نے کہا مجھ سے
ابتک نہ ملا ہوگا سائل کو جواب ایسا

نومید کرم ہو کر ہم توبہ کریں مے سے
دوزخ میں پڑے زاہد بے لطف ثواب ایسا

پوچھا تھا محبت میں ہوتا ہے قلق کیسا
قسمت نے کہا دیکھ لے خانہ خراب ایسا

لوگ کہتے ہیں بنا دلی بگڑ کر لکھنؤ
یہ کہاں اے داغ اُس اجڑے ہوئے گل کا جواب

مہرباں ہو کے جب ملیں گے آپ
جو نہ ملتے تھے سب ملیں گے آپ

کم نہیں سامان میں ہنگامۂ محشر سے آپ
دیجئے دل کو دعائیں بنگئے اس گھر سے آپ

حضرتِ زاہد ہر ایک نشہ کو عادت شرط ہے
مرنہ جائینگے شراب چشمۂ کوثر سے آپ؟

حضرتِ زاہد نکل آیا فلک پہ آفتاب
پیر و مرشد اب تو اُٹھئے میکدے کے در سے آپ

ہے طرفہ تماشہ سرِ بازار محبت
سر بیچتے پھرتے ہیں خریدار محبت

اللہ کرے تو بھی ہو بیمار محبت
صدقے میں چھٹیں تیرے گرفتار محبت

ابرو سے چلے تیغ تو مژگاں سے چلیں تیر
تعذیر کے بھوکے ہیں خطاوار محبت

اسواسطے دیتے ہیں وہ ہر روز نیا داغ
اک درد کے خوگر نہ ہوں بیمار محبت

واعظ کی زباں پر تو وہ کلمے ہیں کہ گویا
بخشے ہی نہ جائیں گے گرفتار محبت

کل تابِ فغاں تھی تو یہ تاثیر کہاں تھی
کیا کیا لبِ خاموش پہ قرباں ہے اثر آج

اندیشۂ فردا نہ رہے حضرتِ زاہد
میخانے میں پی لیجئے تھوڑی سی اگر آج

وعدے پہ مری اُنکی قیامت کی ہے تکرار
اور بات ہے اتنی کہ ادھر کل ہے ادھر آج

اے شیخ جسکو حور نہ ملیگا بڑہیگا شوق
جنت کو ہیں پسند جہنم کو تو پسند

محشر میں خلق اپنی مصیبت میں مبتلا
یاں یہ تلاش آئے کوئی خوبرو پسند

وہی تو ہے شعلۂ تجلی کہ دشت ایمن سے تنگ ہوکر
جب انکے اپنی منو چاہی کھلا حسینوں پہ رنگ ہوکر

جھکی ذرا چشم جنگجو بھی نکل گئی دل کی آرزو بھی
بڑا فراس ملاپ کا ہے جو صلح ہوجائے جنگ ہوکر

یاں وہیں خیال اور ہے واں مدِ نظر اور
ہے حال طبیعت کا ادہر اور ادہر اور

نمعیں تو ہو جو کہ خواب میں ہو تمھیں تو ہو جو خیال میں ہو
کہاں چلے آنکھیں سما کر کدہر کو جاتے ہو وہیں آکر

رقیب اچھے ہیں نے مانا برا مجھے تو نے دل سے جانا
بھلوں سے کرتے ہیں سب بھلائی کسی برے کا تو کچھ بھلا کر

مجھسے کہتے ہیں نکالیں گے ہمیں کچھ تدبیر
صاف کہدو کہ دل آیا ہے تمھارا کس پر

وہی قاتل وہی مخبر وہی منصف ہے مرا
اقربا میرے کریں خون کا دعوے کس پر

کہاں کرشمہ برق جمال وطور کہاں
نظر پڑی تھی کسی دل جلے کی پتھر پر

چشم جاناں سے الگ ہو لے حیا
یوں جھکے پڑتے نہیں بیمار پر

وہ نازک کہ جامہ سے باہر نکل کر
تھکے اس طرح جس طرح کوئی چلکر

رہبر نے راہِ عشق میں برسوں دئے چکر مجھے
ظالم سے جب پوچھا کہا اب آگئے منزل کے پاس

بیٹھے بٹھائے آئے جو شامت تو کیا علاج
دل نے کہا کہ آؤ چلیں یار کی طرف

کہتے نہ تھے وہ سن کے برا مان جائینگے
اے داغ انسے اور کہو ماجرائے دل

ستم دیکھو بیانِ رنج پر کہتا ہے وہ ظالم
یہ صدمے تو نہیں آخر کسی پر ہم بھی مرتے ہیں

دلوں پر سینکڑوں سکے ترے جوبن کے بیٹھے ہیں
کلیجوں پر ہزاروں تیر اس چتون کے بیٹھے ہیں

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتہ چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

بھری ہیں عجب ادائیں اس شوخ سیمتن میں
ایک ٹیڑہ سادگی میں ایک سیدہ بانکپن میں

یہ شوقِ خود نمائی کیا کچھ جنوں سے کم ہے
بیتاب تجھکو لایا خلوت سے انجمن میں

میت پہ آئینگے وہ یاں مجھ میں دم ہے باقی
زندہ لپیٹ دینا یارو مجھے کفن میں

نمھم تھم سے وار کر کہ مراد ردمٹ نہ جائے
کیا کہا پھر تو کہو دل کی خبر کچھ بھی نہیں
اُلجھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے
کیسا جواب حضرت دِل دیکھئے ذرا
ہرچند داغ ایک ہی عیار ہے مگر
لطف مے تجھسے کیا کہوں زاہد
اڑ گئی یوں وفا زمانہ سے
دل لگی دل لگی نہیں ناصح
کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں
چلا ہے کعبہ کو تو خاک چھاننے زاہد
ملے مجھ سے تو فرمایا تمھیں کو داغ کہتے ہیں
سبنے ہوئے ہیں وہ محفل میں صورتِ تصویر
اے آرزوئے تازہ نہ کر مجھسے چھیڑ چھاڑ
اجل کا نام لیں تقدیر کو روئیں مجھ کوسیں
مراہی دل نہ ہو جب ہی نہوں لے مرگ مایوسی
وہ ہے افسردہ دل عالم بجا ہے یہ اگر کہیئے
دل کا کیا حال کہوں صبح کو جب اُس بُت نے
فلک دیتا ہے جنکو عیش انکو غم بھی ہوتے ہیں
گلے شکوے کہاں تک ہونگے آدھی رات تو گذری
زمانہ دوستی پہان حسینوں کی نہ اترائیے
بظاہر رہنا ہیں اور دل ہیں بدگمانی ہے

جب ہیں نہیں تو لذتِ زخم جگر کہاں
کیوں یہ کیا ہے خم گیسو میں اگر کچھ بھی نہیں
سب کی ہے تم کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں
پیغامبر کے ہاتھ میں ٹکڑے زباں کے ہیں
دشمن بھی تو چھٹے ہوئے سارے جہاں کے ہیں
ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں
کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں
تیرے دل کو ابھی لگی ہی نہیں
اگر نہ آگ لگا دوں تو داغ نام نہیں
فقط خدا ہی خدا ہے حرم میں خاک نہیں
تمھیں ہو ماہ کامل ہیں تمھیں سنتے ہو لالے ہیں
ہر ایک کو یہ گماں ہے ادھر کو دیکھتے ہیں
ہیں پائے شوق و دستِ تمنا بریدہ ہوں
مرے قاتل کا چرچا کیوں ہو میرے سوگواروں میں
خدا جانے یہ کسکی فاتحہ ہے آج یاروں میں
کہ مرتے ہیں تیں ہیں پر اور زندے ہیں مزاروں میں
لیلئے انگڑائی کہا نازسے ہم جاتے ہیں
جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں
پریشاں تم بھی ہوتے ہو پریشاں ہم بھی ہوتے ہیں
یہ عالم دوست اکثر دشمن عالم بھی ہوتے ہیں
ترے کوچہ میں چرچا ہے کہ آگئے ہم بھی ہوتے ہیں

جو کہتا ہوں کہ مرتا ہوں تو فرماتے ہیں مرجاؤ
کوئی اب تجھ سے آرزو ہی نہیں
رات دن نامہ و پیغام کہاں تک ہونگے
خدا شاہد خدا شاہد ہے کیوں کہتے ہو وعدوں پہ
تم کو چاہا تو خطا کیا ہے بتا دو مجھکو
دیکھئے سیر سرِ حشر میرے پاس آکر
میں بھی حیران ہوں اے داغ کہ یہ بات ہے کیا
گرے ہوتے اُلجھ کر آستاں سے
جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں
مریض عشق کی کیا پوچھتے ہو پوچھو
رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
دمِ تقریر نالے حلق میں چھریاں چبھوتے ہیں
وہی جھگڑا ہے فرقت کا وہی قصہ ہے اُلفت کا
ہر دلیں نئی طرح سے ہے یاد کسی کی
یار کا پاس نزاکت دلِ ناشاد رہے
رنج وہ رنج ہے جسمیں نہ بتوں کو بھولیں
یوں تو برسوں نہ پلاؤں نہ پیوں اے زاہد
تدبیر سے قسمت کی برائی نہیں جاتی
مے پی تو سہی توبہ بھی ہو جائے گی زاہد
کیجئے اے قسمتِ برگشتہ تلاشِ دشمن
حق ہے کہ سیات ہیں ناصح کا طرفدار ہوں میں

جو غش آتا ہے مجھ پر تو ہزاروں دم بھی ہوتے ہیں
اب جو دیکھا تجھے وہ تو ہی نہیں
صاف کہدیجئے ملنا ہمیں منظور نہیں
خدا کو کیا غرض میرے تمہارے درمیاں کیوں ہو
دوسرا کوئی تو اپنا سا دکھا دو مجھکو
کہتے ہیں کون ہوں میں جانتے ہو تم مجھکو
وعدہ وہ کرتے ہیں آتا ہے تبسم مجھکو
چلے آتے ہو گھبرائے کہاں سے
ایسی جنت کو کیا کرے کوئی
کہ زندہ کوئی بھی تیماردار باقی ہے
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے
زباں تک ٹکڑے ہو ہو کر مرا افسانہ آتا ہے
تجھے اے داغ کوئی اور بھی افسانہ آتا ہے
ملتی نہیں فریاد سے فریاد کسی کی
نالہ کھنچتا ہوا رکتی ہوئی فریاد رہے
عیش وہ عیش ہے جس میں نہ خدا یاد رہے
توبہ کرتے ہی بدل جاتی ہے نیت میری
بگڑی ہوئی تقدیر بنائی نہیں جاتی
کمبخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی
دوست کو ڈھونڈتے ہیں ہم تو عدو ملتا ہے
دل کی کہتا ہے جو اس دل کو برا کہتا ہے

یاد سب کچھ ہیں مجھے ہجر کے صدمے ظالم / بھول جاتا ہوں مگر دیکھ کے صورت تیری

غش آیا ہاتھ کانپے تیغ کے ٹکڑے ہوئے آخر / کہو تو سخت جانوں کا کروگے امتحاں پھر بھی

سچ ہے کہ یونہی ڈوب گئیں اپنی وفائیں / ہم تم پہ کسی طرح کا دعویٰ نہیں رکھتے

دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے / جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گزار دے

اپنی تصویر پہ نازاں ہو تمھارا کیا ہے / آنکھ نرگس کی دہن غنچہ کا حیرت میری

دوست خوش ہونے لگے دوست کے مرجانے سے / غم کا یہ کال پڑا ہے مرے غم کھانے سے

روح کسی مست کی پیاسی گئی میخانے سے / مے اُڑی جاتی ہے ساقی تیرے پیمانے سے

قابلِ رحم ہے اُس شخص کی رسوائی بھی / پردے پردے ہی میں کمبخت جو رسوا ہو جائے

سنتے ہیں خوشی بھی ہے زمانہ میں کوئی چیز / ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں کدھر ہے وہ کہاں ہے

دل میں نے دیا تھا جسے دلدار سمجھ کر / کیوں تم وہی معشوق ہو یا مجکو گماں ہے

یہ میرے واسطے تاکید ہے دربانوں کو / کہ اسے میں بھی بلاؤں تو نہ آنے پائے

حور کے واسطے زاہد نے عبادت کی ہے / سیر تو جب ہے کہ جنت میں نہ جانے پائے

رہ رہ کے وہ پچھتائیں کہ کیوں اسکو ستایا / تھم تھم کے میری آہ میں یارب اثر آئے

نہیں ہوتی کسیکو بھی گوارا اپنی ناکامی / جسے تو بخش دیتا ہے جہنم اس سے جلتا ہے

شگفتگی کسی کی اثر کچھ تو کر گئی / بن بن کے زلف رخ پہ تمھارے بکھر گئی

کیا کہیئے کس طرح سے جوانی گذر گئی / بدنام کرنے آئی تھی بدنام کر گئی

زاہد شراب ناب کی تاثیر کچھ نہ پوچھ / اکسیر ہے جو حلق کے نیچے اُتر گئی

کچھ زہر نہ تھی شرابِ انگور / کیا چیز حرام ہوگئی ہے

داغ کو کون دینے والا تھا / جو دیا اے خدا دیا تو نے

بوسہ مانگا تو کہا اُس نے بدل کر چتون / آپکو یہ بھی خبر ہے میری عادت کیا ہے

تڑپنے سے دلِ بیتاب کوئی غم نکلتا ہے / ٹھہر جا صبر کر مضطر نہ ہو کیوں دم نکلتا ہے

ترجیع بند

پیغامبر کی بات پہ آپس میں رنج کیا
میری زباں کی ہے نہ تمھاری زبان کی ہے

سُنکر میرا فسانۂ غم اُس نے یہ کہا
ہو جائے جھوٹ سچ یہی خوبی بیاں کی ہے

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

غم اُٹھانے کے واسطے دم ہے
زندگی ہے اگر تو کیا غم ہے

اچھی صورت پہ غضب ٹوٹکے آنا دل کا
یاد آتا ہے ہمیں ہائے زمانہ دل کا

اِن حسینوں کا لڑکپن ہی رہے یا اللہ
ہوش آتا ہی تو آتا ہے ستانا دل کا

حسینوں کی وفا کیسی جفا کیا
جو دل آیا تو پھر اچھا بُرا کیا؟

تو ہی اپنے ہاتھ سے جب دلربا جاتا رہا
دل کی بھی پروا نہیں جاتا رہا جاتا رہا

داغ ہر ایک زباں پہ ہو فسانہ تیرا
وہ دن آتے ہیں وہ آتا ہے زمانہ تیرا

دُعا مانگ لو تم بھی اپنی زباں سے
کہ پورا ہو جو مدعا ہے کسیکا

قبضہ کرتا ہے ہر ایک حور شمائل اپنا
آج ہم وقف کئے دیتے ہیں لو دل اپنا

او پری دل سے بپا گریہ و زاری رکھنا
آخری وقت ذرا شرم ہماری رکھنا

آئیں تھم تھم کے مرے دل کو جراحت کے مزے
تیغ بے آب ذرا کُند کٹاری رکھنا

عاشقی سے ملے گا اے زاہد
بندگی سے خدا نہیں ملتا

نہ بدلے آدمی جنّت سے بھی بیت الحزن اپنا
کہ اپنا گھر ہے اپنا اور ہے اپنا وطن اپنا

اسپر بھی تو نہیں ہے غم عشق میں کمی
کھاتا ہے ایک جہاں تمھارا دیا ہوا

بیخود رہے وصال میں بیہوش ہجر میں
کیا جانے ہم سے کب وہ ملا کب جُدا ہوا

کس کس طرح سے ہمکو جلاتے ہیں رات دن
وہ جانتے ہیں داغ ہے ہم پر مٹا ہوا

اِدھر دیکھ لینا اُدھر دیکھ لینا
کنکھیوں سے مجکو مگر دیکھ لینا

جسدن وہ مرے قتل کے ساماں نہیں ہوگا
وہ دن بھی کبھی گردش دوراں میں ہوگا

بزم دشمن میں نہ کھِلنا گُلِ تر کی صورت
جاؤ بجلی کی طرح آؤ نظر کی صورت

بزم میں دیکھا ہے کس حسرت سے ہم نے سوئے دوست
مجھکو دشمن سے گلے مل کر جو آئی بوئے دوست

آپ اپنے کو تو چشم شوق پہلے دیکھ لے
کیا ہنسی ہی کھیل ہی یوں دیکھ لیا روئے دوست

اے وعدہ فراموش رہی تجھکو جفا یاد
یہ بھول بھی کیا بھول ہے یہ یاد بھی کیا یاد

اُستاد نے اچھا سبق عشق پڑھایا
جب اس کو بھلاتا ہوں یہ ہوتا ہے سوا یاد

حسرت آتی ہے دلِ ناکام پر
اس کو دے ڈالوں خدا کے نام پر

آئے کوئی تو بیٹھ بھی جائے ذرا سی دیر
مشتاق دید لطف اُٹھائے ذرا سی دیر

ہوتی ہیں اتنی بات کی برسوں شکایتیں
کوئی اگر کسی کو ستائے ذرا سی دیر

سب خاک ہی میں مجھکو ملانے کو آئے تھے
ٹھیرے رہے نہ اپنے پرائے ذرا سی دیر

تم نے تمام عمر جلایا ہے داغ کو
کیا لطف ہو جو وہ بھی جلائے ذرا سی دیر

دِلّی سے چلو داغ کرو سیر دکن کی
گوہر کی ہوئی قدر سمندر سے نکل کر

تمکو تو آرزو کی خلش بھی نہیں ہوئی
کیا جانو کیا گذرتی ہے اُمیدوار پر

جانچ لو ہاتھ میں پہلے دلِ شیدا لیکر
نہیں پھرنے کا مری جان یہ سودا لیکر

ناز ہوتا ہے اُنھیں مال پرایا لیکر
دُون کی لیتے ہیں میرا دلِ شیدا لیکر

دِل کا سودا جو کرے تجسے وہ سودائی ہو
دام دیتے ہی نہیں مال پرایا لیکر

رکھدیا ہاتھ میرے سو نہ پہ بُت کافر نے
صبح اُٹھنے نہ دیا نام خدا کا لیکر

اپنی آنکھوں سے تو دیکھی نہیں دل کی چوری
کیوں گنہگار رہوں میں نام کسی کا لیکر

مرے لوں درد کے میں تھوڑے ظلم سہ کر
ستم کیجئے تو تھم تھم کر جفا کیجئے تو رہ رہ کر

حضرتِ زاہد ہماری چھیڑ کی عادت نہیں
گدگدی ہوتی ہے دِل میں پارسا کو دیکھکر

ہم مٹے جس پر تیری بیساختہ وہ بات تھی
تو بھی عاشق ہو ہی جاتا اُس ادا کو دیکھکر

یہ حوروں پہ مرتا ہے سب دیکھے بھالے
نہیں کوئی عاشق مسلماں سے بڑھکر

اپنی نظر میں ہیچ ہے سارے جہان کی سیر
دِل خوش ہو تو نرگس کا تماشا کہاں کی سیر

دیکھ کر فیاض کو کہتی ہے کیا طبع بخیل
موت تھی قارون کی ہوتا اگر حاتم کے پاس

دل ہے مرا ہر ایک رفیقِ کہن کے پاس
جتنا وطن سے دور ہوں اُتنا وطن کے پاس

کامل ہو عشقِ پاک تو پرویز سار قیب
شیریں کو لائے شوق سے خود کوہکن کے پاس

اے بیکسی رہیگی نہ بے پردہ اپنی لاش
میّت خود اُڑکے جائیگی گور و کفن کے پاس

غربت سے ہم پھریں تو کہیں پھر پلٹ نہ جائیں
احباب کچھ نشان بنادیں وطن کے پاس

محبت میں تکرار کا ہے مزہ
گلے ہوں جو باہم دگر دیر تک

صبر کر اے دلِ مضطر وہ نہیں ملنے کے
آپ جن کو ہدف تیرِ نظر کرتے ہیں
تھک گئے نامۂ اعمال کو لکھتے لکھتے
کیا فرشتوں کا بُرا حال بشر کرتے ہیں
ہو چکا قطع تعلق تو جفائیں کیوں ہوں
جن کو مطلب نہیں رہتا وہ ستاتے بھی نہیں
خوب خوش باش گذر اہل صفا کرتے ہیں
نہ خفا ہوتے ہیں ایسے نہ خفا کرتے ہیں

اڑائی خاک تیری جستجو میں ہر کہیں برسوں
پھری ہے آسماں بنکر مرے سر پر زمیں برسوں
نہیں تھا تو بھی تھا وہ بیوفا آغوشِ دشمن میں
کہ میری بدگمانی نے اُسے رکھا وہیں برسوں

آپ کا حال جو غیروں سے کہا ہی مجھ سے
ہیں مرے کان گنہ گار کہوں یا نہ کہوں
ہوش جب آیا تو یہ جا تو قیامت آگئی
زندگی میری جبھی تک ہے کہ میں غفلت میں ہوں

دیکھیں تو کیسے فتنے ہیں نیچی نگاہ میں
آئینہ رکھدے کاش کوئی اُنکی راہ میں
اُمید وار رحمت باری ہوں اس قدر
ہوتا ہوں میں شریک پرائے گناہ میں
محشر میں کس طرف سے یہ آنے لگی صدا
آنا ہو آئے جسکو ہماری پناہ میں

نظر آتا ہوں نہ اُس بزم سے اٹھ سکتا ہوں
ناتوانی سے بڑے کام لیے جاتے ہیں
مول جنت کا ہوا نقدِ عبادت زاھد
ہے کہیں مال کہیں دام لئے جاتے ہیں

اپنے بسمل کا سر ہے زانو پر
کس محبت سے جان لیتے ہیں

کر چکے سب اپنی اپنی حکمتیں
دم نکلتا ہو تو ہمدم کیا کریں

معرکہ ہے آج حسن و عشق کا
دیکھئے وہ کیا کریں ہم کیا کریں

حیدر آباد اور لشکر یاد ہے
اب کے دلی میں محرم کیا کریں

ہماری طرف اب وہ کم دیکھتے ہیں
وہ نظریں نہیں جن کو ہم دیکھتے ہیں

غنیمت ہے چشم تغافل بھی اُن کی
بہت دیکھتے ہیں جو کم دیکھتے ہیں

بُرا انجام حسینوں کو مان اے واعظ
خدا گواہ یہ بندے خدا کے پیارے ہیں

وفا کرو کہ جفا اختیار ہے تم کو
بُرے ہیں یا ہیں بھلے جیسے ہیں تمھارے ہیں

زمیں پہ رشکِ مہ و مہر ہیں حسیں لاکھوں
فلک پہ وہ ہی تو چمکے ہوئے ستارے ہیں

زمانہ کیا ستائے گا فلک آزار کیا دے گا
مصیبت اس سے بڑھکر اور کیا ہو گی کہ بیدل ہوں

کہاں کی دادخواہی حشر میں جب کہا اُسنے
تراجی چاہتا ہے ہیں گنہ گاروں میں داخل ہوں

جتنی باتیں کام کی تھیں کر گئے سب اہل عشق
تو گرفتارِ محبت میں کروں تو کیا کروں

التجائیں جسقدر تھیں سب اس بتِ کافر کی ہیں
اب خدا سے عرضِ حاجت میں کروں تو کیا کروں

ہوش ہی جاتے رہیں تو آدمی کیا کر سکے
دیکھ لوں جب اچھی صورت میں کروں تو کیا کروں

دل سے وہ کافر صنم نکلے تو سب کچھ ہو قبول
جا کے مسجد میں عبادت میں کروں تو کیا کروں

تسلی مرے دل کو کیا دے رہے ہیں
مرے دل میں وہ چٹکیاں لے رہے ہیں

عجب خوبیاں خوبرویوں میں دیکھیں
بُرائی میں بھی سب سے اچھے رہے ہیں

جدھر سے وہ گذرے قیامت بپا تھی
کہ نقش قدم تک تڑپتے رہے ہیں

خط میں لکھے ہوئے رنجش کے کلام آتے ہیں
کس قیامت کے یہ نامے مرے نام آتے ہیں

تاب نظارہ کہاں دیکھے جو ان کے جلوے
بجلیاں کوندتی ہیں جب لب بام آتے ہیں

نہ کسی شخص کی عزت نہ کسی کی توقیر
عاشق آتے ہیں تمھارے کہ غلام آتے ہیں

بتوں سے اب معافی چاہتا ہوں
خدا سے کچھ کہا تھا بے خودی میں

وہ سے کر کیا کریں عشاق کا دل
دم نہیں دل نہیں دماغ نہیں

کسی ہیں داغ ہے کانٹا کسی ہیں
کوئی دیکھے تو اب وہ داغ نہیں

دم شماری دل مجبور بُری ہوتی ہے
جان کی خیر اسی میں ہے کہ تو گن ہی نہیں

یہ تو نہیں کہ تم سا جہاں میں حسیں نہیں
اس دلکو کیا کروں یہ بہلتا کہیں نہیں

کیا ہے بوسہ کا وعدہ مگر ہی وہ احسان
کوئی یہ جانے کہ دونوں جہان دیتے ہیں

وہ رنج بندے کو اپنے خدا نہیں دیتا
جو مجکو ایک مرے مہربان دیتے ہیں

واعظ بڑا مزا ہو اگر یوں عذاب ہو
دوزخ میں پاؤں ہاتھ میں جام شراب ہو

یارب شمارِ جرم سے بس منفعل نکر
تنخواہ تو نہیں ہے کہ جس کا حساب ہو

در پردہ تم جلاؤ جلاؤں نہ میں چہ خوش
میرا بھی نام داغ ہے گر تم حجاب ہو

زاہد کو بڑا ناز ہے میکش کو بڑا عجز
اللہ کو مقبول مگر دیکھئے کیا ہو

یارب بنا دے تو اسی صورت کا اور کچھ
اس آسماں سے تنگ ہیں یہ آسماں نہ ہو

واعظ بجا ہے کہیئے جو ویرانہ کو بہشت
جنت اُسیکا نام ہے آدم جہاں نہ ہو

آج مجھ سے حضرت ناصح یہ چلکر کہہ گئے
آسماں سے اب فرشتے آئینگے تعلیم کو

اپنے دل کا حال ہے دم بھر میں کچھ دم بھر میں کچھ
آگ لگ جائے الٰہی اس امید و بیم کو

اُنھیں یہ جستجو ہے مرنے والا کوئی پیدا ہو
مگر بہتر سے بہتر ہو مگر اچھے سے اچھا ہو

تری زلفیں بھی ہیں صیاد آنکھیں بھی شکاری ہیں
تماشا دیکھنے کا ہی جو میرے دل پہ جھگڑا ہو

کیوں کرتے ہو دنیا کی ہر اک بات سے توبہ
منظور تو ہے میری ملاقات سے توبہ

دُنیا میں کوئی بات ہی اچھی نہیں زاہد
اس بات سے توبہ کبھی اُس بات سے توبہ

اہل دول نہ دیکھیں مجھے چشم کم سے داغ
دولت لگی پڑی ہی میرے دم قدم کیساتھ

ظاہر میں اختلاط کی باتیں ہوا کریں
دل میں اگر نہیں ہے محبت نہیں سہی

غم جگہ دل میں پا ہی جاتا ہے
آدمی کو یہ کھا ہی جاتا ہے

گر مرض ہو دوا کرے کوئی
مرنے والے کا کیا کرے کوئی

جب پڑا ہی وقت کوئی ہو گئے ہیں سب الگ
دوست بھی اپنا نہیں بیگانہ تو بیگانہ ہے

بُرائی بچا ہی بُروں سے بنا ہے
اگر ہے تو دنیا میں مشکل یہی ہے

تو بھی اے ناصح کسی پر جان دے
ہاتھ لا اوستاد کیوں کیسی کہی

کس طرح کہوں قیس تیرے دلکو لگی ہے
نالوں سے کبھی آگ بھی محمل کو لگی ہے

کس نے یوں پیار کیا کس نے وفا ایسی کی
کیوں کریں قتل کسیکو وہ ہمارے ہوتے

تارے گن گن کے گذاری شبِ ہجرِ فراق
کیا مصیبت تھی جو گنتی کے ستارے ہوتے

زلفیں بکھری ہوئیں تمنے جو سنواریں تو کیا
کام بگڑے ہوئے عاشق کے سنوارے ہوتے

ہردم اُسیکی دُھن ہے اوسیکا خیال ہے
چھوٹے چھٹائے ربط پہ ابتک یہ حال ہے

دل لے ہی چکے ناز سے شوخی سے ہنسی سے
اب اُنکی بلا آنکھ ملاتی ہے کسی سے

کہتا ہے کہ مرجاؤ تو کچھ ہم کو یقیں ہو
بیدرد کی اس شرطِ وفا کو کوئی دیکھے

کرتا ہے امام آج بہت سہو کے سجدہ
پوشیدہ جماعت میں وہ کافر تو نہیں ہے

نظر کعبہ میں اس بُت پر پڑی ہے
کہاں جاکر مری قسمت لڑی ہے

ناوک لگا جگر پہ تو دل پر سناں لگی
کاری لگی نظر تری کافر جہاں لگی

تو اگر سُن لے تو کیا جانے کرے کیسا غرور
دیکھکر سمجھا ہے جو تیرا تماشائی تجھے

جلوہ بے پردہ وہ تو ہوتا ہے فقط ہوش ربا
وہ قیامت ہے جو چلمن کی جھلک ہوتی ہے

جسنے سونگھی ہو وہ خوشبو کوئی اُس سے پوچھے
باسی ہاروں کے جو پھولوں میں مہک ہوتی ہے

پی کر نہ توبہ کی ہو تو واعظ زباں سے جلے
یہ اعتراض کیوں ہے کہ مے خوار کیوں ہوئے

وہ دلپہ چھری پھیر گئے ناز و ادا سے
اب کوئی مرے کوئی جئے اُنکی بلا سے

ہم تیرے سوا اور ہوں کس چیز کے طالب
کیا چھوڑ دیا مانگنے والوں نے خدا سے

ہر بندۂ خدا پہ کب تک ستم رہے گا
تیرے دلمیں کافر کب تک ٹھنی رہیگی

ہزار ہیں رنگ عاشقی کے جو اُنکو بیتے تو وہ اُن کو جانے
عداوت انکو ہے آج جس سے اُسی پہ کل مہربانیاں ہیں

تمھیں کو ہم بیوفا کہیں گے تمھیں سے ہم التجا کرینگے
جو دشمنی کر سکیں نہ پوری وہ دوستی ہم سے کیا کرینگے

عکس بھی آئینہ میں چار گھڑی بعد آیا
بڑھ گئی حد سے سوا انکی نزاکت کیسی

جو معشوق کی پرسش ہی نہیں دنیا میں
اپنے بندہ سے خدا کو ہے محبت کیسی

لے ہی تو لینگے گنہگاروں کے ہوتے زاہد
یہ تو دوزخ کے بھی قابل نہیں جنت کیسی

چھیڑ ہر وقت کی اچھی نہیں یہ یاد رہے
کبھی کیسی ہے کبھی اپنی طبیعت کیسی

کہتے ہیں وہ ہماری اطاعت کریگا کیا
جس بندۂ خدا سے نہ طاعت ادا ہوئی

حوصلہ چاہیئے انساں کو پائے جو عروج
پست ہمت کو بلندی بھی جو ہو پستی ہے

داغ دشمن سے بھی جھک کر ملیئے
کچھ عجب چیز ملنساری ہے

جو پوچھا کبھی شغلِ تنہائی اُن سے
کہا گنتے ہیں ہم خطائیں تمھاری

نگہ نکلی نہ دل کی چور زلفِ عنبریں نکلی
اِدھر لا ہاتھ مٹھی کھول یہ چوری یہیں نکلی

اُٹھی دستِ دعا کیا ضعف نے ایسا گھلایا ہے
جسے میں ہاتھ سمجھا تھا وہ خالی آستیں نکلی

چین سے آپ رہیں کچھ مری پروا نہ کریں
کیا شب ہجر بلا ہے کہ مجھے کھائے گی

دِل نہیں مال تو اس کا تمھیں لالچ کیسا
تم نہیں چور تو دُزدیدہ نگاہی کیسی

اِس سے بڑھ کر تو گنہگار نہ دیکھا نہ سُنا
جب کیا عشق تو ناکردہ گناہی کیسی

بنایا ان حسینوں کو تباہی کے لیئے ورنہ
ترقی سی ترقی عالمِ اسباب کو ہوتی

میں بُرا ہوں تو بُرا جان کے ملیئے مجھسے
عیب کو عیب سمجھئے تو کہاں رہتا ہے

لامکاں تک کی خبر حضرتِ واعظ نے کہی
یہ تو فرمائیں کہ اللہ کہاں رہتا ہے

انہیں قدموں نے تمھاری انہیں قدموں کی قسم
خاک میں اتنے ملائے ہیں کہ جی جانتا ہے

داغِ وارفتہ کو ہم آج ترے کوچے سے
اس طرح کھینچ کے لائے ہیں کہ جی جانتا ہے

ایک مہمان نے آتے ہی یہ گھر لوٹ لیا
وہ جو دِل میں ہے تو باقی نہیں ارماں کوئی

کہتے ہیں وہ جلائیں گے ہم تجھکو حشر تک
دشمن کی قبر تیرے برابر بنائیں گے

وہ کم سنی میں کھیل بھی کھیلیں گے تو یہی
مٹی کی تیغ وناوک و خنجر بنائیں گے

اپنی بھی شامت آگئی توبہ کے ساتھ ہی
عہدِ شباب کے جو کہیں آشنا ملے

اللہ دے تو فقر کی دولت ہے سلطنت
جتنے فقیر مجھکو ملے بادشا ملے

بچھڑے ہوئے معشوق ملیں سبکو آلہی
تنہا کوئی جنت میں نہ جائے مرے آگے

اک چیز ہے اس عالمِ ہستی میں بشر بھی
دنیا کا طلبگار بھی دنیا سے حذر بھی

ملے زاہد پیر کو حور توبہ
وہاں ہوں گے رعنا جوان کیسے کیسے

ترا ثانی کہاں پیدا فقط کہنے کی باتیں ہیں
اگر سارا زمانہ مان لیگا ہم نہ مانیں گے

بلا سے گر کوئی اس بات کا دل میں برا مانے
مگر معشوق ہو وعدہ کا سچا ہم نہ مانیں گے

سوال اُن کا یہ ہے دنیا میں کرلو فیصلہ ہمسے
اُٹھاؤ گے اگر عقبیٰ میں جھگڑا ہم نہ مانیں گے

بڑھے تکرار کیوں پہلے ہی اس کا فیصلہ کرلو
یہ کہنا مان لینگے ہم یہ کہنا ہم نہ مانیں گے

زور و زر سے بھی کہیں داغ حسین ملتے ہیں
اپنے نزدیک تو ہے سب سے اطاعت اچھی

جب کہا میں نے کہ لو مرتا ہوں میں
بولے بسم اللہ اچھی بات ہے

محفل میں کس نے آپ کو دلمیں چھپالیا
اتنوں میں چور کون ہے پہچان چاہیئے

ہاں ناں ٹھہر ٹھہر کے اُٹھا رخ سے تو نقاب
پیدا طبیعتوں میں بہت جوش ہوگئے

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہدو
کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے

مجھکو مزا ہے چھیڑ کا دل مانتا نہیں
گالی سُنے بغیر ستمگر کہے بغیر

اُٹھے ہیں آج صبحکو منہ کس کا دیکھکر
توڑا ہے آئینہ کو وہ بیزار سب سے ہیں

جو پارسا ہیں خوف انھیں اس قدر کہاں
ڈرتے گناہگار خدا کے غضب سے ہیں

دیکھئے اُن سے ملاتا ہے خدا کون سے دن
کون سی رات ہو مقبول دعا کون سے دن

اے نجومی تجھے دعویٰ ہے تو یہ حکم لگا
کون سے وقت ملینگے وہ بتا کون سے دن

داغ سے عید کے دن بھی نہ ملے وہ آکر
یہ گیا وقت پھر آئیگا بھلا کون سے دن

رنج پر رنج دئے جاتے ہیں
اپنی کرنی وہ کیئے جاتے ہیں

طور بے طور ہوتے جاتے ہیں
وہ تو کچھ اور ہوئے جاتے ہیں

یہ عنایت پہ عنایت ہے ستم
لطف بھی جور ہوئے جاتے ہیں

گھڑیوں بڑھتا ہے حسینوں کا جمال
اور سے اور ہوئے جاتے ہیں

کرے گا بیوفائی مجھ سے تو سامان ایسے ہیں
تری جانب سے مجھکو وہم میری جان ایسے ہیں

مرے دل میں برچھی چبھو کر کہا
خبردار تو نے اگر آہ کی

یہ جرم وفا پر مجھے ارشاد ہوا ہے
بخشنے جو تجھے بخشنے والے کی خطا ہے

اب داغ کے احوال سے مطلب تمھیں کیا ہے
اچھا ہے تو اچھا ہے برا ہے تو برا ہے

دنیا میں جانتا ہوں کہ جنت ملی مجھے
راحت اگر ذرا سی مصیبت میں مل گئی

اس کو ملجائے اگر چاہت کی داد
چاہنے والے کو پھر کیا چاہیئے

بہت تکلیف پائی ہے بہت صدمے اٹھائے ہیں
طبیعت اب کہیں بے اختیار آئے تو کیا آئے

خاک اُس سے عشق نے چھنوائی تھی
وحشت میں مجنوں کی مٹی لائی تھی

سے ہے یہی افسردہ دل کو لطف باغ
ہم نے چن لی جو کلی مرجھائی تھی

فاتحہ کو بھی لحد پر نہیں آتا ہے کوئی
جیتے جی سب سے ملاقات ہوا کرتی ہے

ہیں ادائیں سی ادائیں اُس سراپا ناز کی
اک نیا انداز پیدا ہوگا جتنا دیکھئے

مجھ کو راہِ عشق میں سوجھا نہ اپنا نیک و بد
رہنما کہتا رہا رستہ ہے ٹیڑھا دیکھئے

یہ بات بات میں کیا نازکی نکلتی ہے
دبی دبی ترے لب سے ہنسی نکلتی ہے

ٹھہر ٹھہر کے جلا دل کو ایک بار نہ پھونک
کہ اسمیں بوئے محبت ابھی نکلتی ہے

بجائے شکوہ بھی دیتا ہوں میں دعا اُس کو
مری زباں سے کروں کیا وہی نکلتی ہے

ہزار بار جو مانگا کرو تو کیا حاصل
دعا وہی ہے جو دل سے کبھی نکلتی ہے

ادا ادا سے تری کھنچ رہی ہیں تلواریں — نگہ نگہ سے چھری پر چھری نکلتی ہے
سمجھ تو لیجئے۔ کہئے تو دیجئے مطلب — بیاں سے پہلے ہی مجھ پر چھری نکلتی ہے
یہ دل کی آگ ہے یا دل کے نور کا ہے ظہور — نفس نفس میں مرے روشنی نکلتی ہے
صنمکدہ میں بھی ہے حسن اک خدائی کا — کہ جو نکلتی ہے صورت پری نکلتی ہے
غم فراق میں ہو داغ اسقدر بیتاب — ذرا سے رنج میں جان آپکی نکلتی ہے

بزم سے مجھے اٹھانے کے لیئے — پوچھتے ہیں آپ کو کچھ کام ہے
جو چھید ڈالے دل کو تمھاری نگاہ ہے — جو پیس ڈالے دل کو تمھارا خرام ہے

مجرم بتوں کا بھی ہوں خدا کا بھی چور ہوں — دونوں میں ضد ہے ایک گنہ گار کے لیئے

ہمت کا ہارنا نہ مصیبت میں چاہیئے — تھوڑا سا حوصلہ بھی طبیعت میں چاہیئے
آجائے راہ راست پہ کافر ترا مزاج — اک بندۂ خدا تری خدمت میں چاہیئے
حاتم کا دل ہو۔ دولت قاروں ہو۔ عمر خضر — اے داغ یہ کسی کی محبت میں چاہیئے
دل دو طرح کا تیری محبت میں چاہیئے — راحت میں ایک ایک مصیبت میں چاہیئے
کچھ لاگ کچھ لگاؤ طبیعت میں چاہیئے — دونوں طرح کا رنگ محبت میں چاہیئے
اپنا بھی کام نکلے وہ ناراض بھی نہ ہوں — ایسے مزے کی بات شکایت میں چاہیئے

نقشے ہیں یہ اب دیدۂ دیدار طلب کے — رہ جاتی ہے پلکوں میں نگہ ضعف سے دب کے
مسجد میں تو گنتی کے مسلمان ہی دیکھے — میخانے میں جلوے نظر آتے ہیں سب کے
کیا سخت گھڑی تھی کہ مری آنکھ لڑی تھی — یہ درد یہ آزار یہ آلام ہیں جب کے

لطف ایذا طلبی کیا کہیئے — درد آرام ہوا جاتا ہے
دل ہمارا ہے چٹکی لے لو — ابھی آرام ہوا جاتا ہے

قطعہ

اب تم سے کہوں جو کچھ ہے دلمیں میرے — سب تم سے کہوں جو کچھ ہے دلمیں میرے
پہلے یہ کہو کہ ہیں نہ مانوں گا برا — جب تم سے کہوں جو کچھ ہے دلمیں میرے

دانا

دانا منشی روشن لال خلف منشی رائے کا لیتھہ باشندۂ لکھنو نواب عاشور علی خان بہادر کے شاگردوں میں تھے اور سنہ ۱۲۷۴ھ میں حیات تھے۔ چند شعر ملے درج کیے گئے۔

آتی نہیں جو زلفِ گرہ گیر ہاتھ میں	سودا ئیو! لپیٹ لو زنجیر ہاتھ میں
دیکھے بغیر چین مجھے ایکدم نہیں	رہتی ہے رات دن تری تصویر ہاتھ میں
آہن کو مس کہ جس جو کیا بن گیا طلا	ایسی ہے میرے یار کی تاثیر ہاتھ میں

دانش

دانش منشی تصدق حسین دانش خلف مولوی لطف علی متوطنِ نواح جونپور میر مونس کے شاگرد اور رشتہ دار حجی اعظم گڈھ میں سن شریف قریب ۵۰ برس کے ہے یہ انکے اشعار ہیں۔

صفتِ حور کہاں تک میں سنوں واعظ سے	ذکر کرتا ہے صراحی کا نہ پیمانوں کا
اے شۂ حسن ہوا عصر کا قاروں میں بھی	دل سے نکلا نہ خزانہ مرے ارمانوں کا
وہ میری ملاقات کو آئے مرے گھر آج	مدت میں دعاؤں نے دکھایا ہے اثر آج
درپیش ہے بتخانہ و کعبہ کا دوراہہ	اب وحشتِ دل دیکھئے لیجائے کدھر آج
اداسی چھا رہی ہے شمع بالیں کو ترستی ہے	مزار کشتۂ الفت پہ اک حسرت برستی ہے
تم اتنک وضو! پتھر کے بوسے جا کے لیتے ہو	مقرر خانۂ کعبہ سے پیدا بت پرستی ہے
غرض کیا خضر سے رہبر جنوں ہے دشتِ غربت میں	کھلیں ہیں صاف یہ راہیں بلندی ہے نہ پستی ہے
آ کر مریضِ عشق کا لاشہ اٹھائیے	مردے کو اپنے آپ مسیحا اٹھائیے

دانش

دانش حکیم احمد حسین خان دانش لکھنوی شاگرد احسان شاہجہاں پوری۔ کلام معمولی درجہ کا ہے۔ انتخاب کلام یہ ہے۔ باوجود کوشش حالات نہیں ملے۔

کہوں میں اس سے دل کا مدعا کیا؟	جو جھلا کر کہے تو نے کہا کیا؟
رہی محمل نشیں بجا سے لیلےٰ	رہ گیا پردہ قیس کے دل کا
تیر چھوڑا مرے سینے کی طرف آخر کار	لو پسند آ ہی گیا انکو نشانہ دل کا
الم میں، درد میں، آہ و بکا میں	پڑا ہے ایک دل کس کس بلا میں

خنجر یار کے گلے مل کے گور سائی نہیں وہاں اپنی	ہم نکالیں گے حوصلے دل کے رُوح پھرتی ہے گرد محفل کے
جوبن کا اشارہ ہے ڈوپٹہ سے کسی کے	کس طرح چھپاؤ گے اگر ہم اُبھر آئے

دانش

دانش - قاضی محمد بشیر الدین خلف صغر قاضی محمد رمضان علی، وطن قدیم سکندرآباد ضلع بلند شہر ہے- آجکل اجمیر میں جاگیر حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کا مدار ہیں- نوجوان شریف اور تیز طبع ہیں، قاضی نجم الدین برق شاگرد رشید مومن خان انکے حقیقی تایا تھے- قاضی صاحب کا ہنوز عنفوان شباب ہے اور فن سخن کی ابتدا ہے- آخر سہارنپوری سے تلمذ اختیار کیا ہے- کلام ملاحظہ ہو-

وہ دل چُرا کے نظر بھی چُرائے بیٹھے ہیں	پرائے مال کو کیسے چھپائے بیٹھے ہیں
تماشا ہو نہ سرے در پہ ترے جانبازیوں آہیں	کسی کے ہاتھ میں دل ہو کسی کے ہاتھ میں سر ہو
وہاں پہلے ہی وہ اپنے نگہباں آپ بن بیٹھے	بھلا پھر ہم غریبوں کی رسائی ہو تو کیونکر ہو
نہ خود آؤ نہ تم تصویر ہی اپنی یہاں بھیجو	تمہارے دیکھنے والوں کو پھر تسکین کیونکر ہو
اللہ رے درازی اُس زلف دلربا کی	بڑھ بڑھ کے آج باتیں کرتی ہے آسمان سے
کچھ لب ہی جانتے ہیں کچھ دل ہی جانتا ہے	بوسوں کی لذتوں کو پوچھو مری زباں سے
اب دل پہ آبنی ہے اب جاں پہ آبنی ہے	اِس آپکے ستم سے اِس جور آسماں سے

دانش

دانش - حافظ محمد بشارۃ الحق صاحب دانش، مولوی نورالحسن نازش کے بیٹے اور حکیم سید اولاد علی صاحب کاہش مرحوم کے پوتے تھے- آپکے بزرگوں کا وطن جونپور ہے- صاحب گنج میں ایک مسجد کے امام تھے اور اُسی مسجد میں اپنے اہتمام سے ایک مدرسہ تعلیم دینیات کا قائم کر رکھا تھا جس میں خود درس دیتے تھے- چند ہی کتابیں بھی تصنیف کی تھیں جو ہنوز غیر مطبوعہ ہیں- فن شاعری میں سید شاہ محمد اکبر صاحب ابوالعلائی داناپوری سے استفادہ کرتے تھے- عین عنفوان شباب میں ۱۳۲۹ھ ہجری میں وفات پائی مختصر

کلام درج ذیل ہے۔

یہ دل محفوظ تھا سینے میں میرے کس حفاظت سے
چُرا لیا تیری آنکھوں نے اسے کیسی شرارت سے

جو یاد آتے ہیں صدمہ ہجر کے دل کانپ جاتا ہے
شب غم ہنسنے رو رو کر سحر کی ہے کس آفت سے

قدم اٹھنے نہیں دیتی گناہوں کی گرانباری
نظر اونچی نہیں ہوتی ہے اے دانش ندامت سے

ساقی سے کہو دو ربیں ساغر آئے
ہاں دختر رز خوب نکھر کر آئے

لائی ہے انھیں بھی مئے انگور کی تاک
واعظ بھی یہاں آنکھ بچا کر آئے

دانش

دانش حکیم میرزا فدا احمد صاحب خلف حکیم مرزا غلام عباس آپکی ولادت ۱۲۸۲ھ میں بمقام لکھنو ہوئی آپکے والد نے آپکو صغرسنی کیحالت میں یعنی صرف نو برس کی عمر میں چھوڑ کر قضا کی انکے سوم کے روز جناب مرزا ابہادر ناظم صاحب نے انکو تعلیم و تربیت کیلئے مرزا محمد جعفر کے سپرد کیا انکے داماد حکیم میر علی ضامن شوق خلف رشک مرحوم کے فیض صحبت سے انھیں شاعری کا چسکا پڑ گیا اور شروع میں انھیں سے اصلاح کا سلسلہ رہا، اس عرصہ میں دیگر علمار سے استعداد علمی کی تکمیل کی۔ اور پھر کامل تیس سال تک طلبار کو درس دیتے رہے، تاریخ گوئی کی بھی مشق ہے جب خاصہ ملکہ ہوگیا تو جلال مرحوم سے اصلاح لینے لگے بیس پچیس شاگرد بھی ہیں۔ تلاش الفاظ اور بندش کا سلیقہ قابل داد ہے۔ اور مضمون پیدا کرنے کا خیال رکھتے ہیں اب مشق سخن کو ۳۰ برس کا زمانہ ہوگیا کمیٹی رسالہ معیار کے ممبر اور صاحب استعداد دیکھنے والوں میں ہیں۔

بجز اس قاتل بیرحم کے دیکھے کا کیا کوئی
تڑپنا قلب مضطر کا پھڑکنا مرغ بسمل کا

ہماری آہ عالم سوز پر وہ خوب ہنستے ہیں
ابھی بھولا نہیں جنکا ہمیں بجلی سے ڈر جانا

سمجھا نہ ہجر یار میں کس کس کو چشم تر
دل بیقرار تھا تو جگر نا صبور تھا

پابند حکم ضبط تھے بگڑے نہ اشک و درد
آنکھوں کی کچھ خطا تھی نہ دل کا قصور تھا

جگر سے قدرداں کے بعد لطف شاعری کیسا
غزل لکھنے کو اے دانش نہیں اٹھتا قلم میرا

بجز اس قاتل بیرحم کے دیکھے گا کیا کوئی
تڑپنا قلب مضطر کا پھڑکنا مرغ بسمل کا

سکھاتی ہے تمنائے شہادت میرے قاتل کو
جفا سے قتل تم کرنا وفا پوچھے مگر جانا

تا قیامت رہے یہ داغ محبت دل میں
گھر کی زینت ہے جدا روشنی خانہ جدا

اُسکو کیوں بیہوش کرتی ہے ہوائے کوئے دوست
بس گئی جسکے مشامِ جان و دل میں بوئے دوست

جس جگہ ہے قبر مجھ سے عاشقِ ناشاد کی
آسمان کی جان ہے اُتنی زمینِ کوئے دوست

آسماں کی ہے شکایت میں گلہ ہے یار کا
سمتِ دشمن آنکھ ہے روئے سخن ہے سوئے دوست

کچھ تجھی پر نہیں موقوف سبھی دیتے ہیں رنج
درد بھی مجھکو ستاتا ہے تری خو ہو کر

اے گھٹا جلدی برس کس کا تجھے ہے انتظار
شور ہو پھر میکشوں کا خانۂ خمار میں

دل لیئے در پر کھڑے ہیں دیر سے عاشق حضور
پیشکش ہو جائے انکی نذر بھی سرکار میں

خوش نصیب اسمیں ہے معلوم نہیں کون اے دل
جسکو وہ شاد کریں یا جسے ناشاد کریں

دیکھکر یہ حال میں مجنوں کو، لیلیٰ نے کہا
کونسی اِس مرے دیوانے میں ہشیاری نہیں

جل چکا پروانہ جب اے شمع پھر روئی تو کیا
قابلِ تسکین عاشق تیری غمخواری نہیں

پھول سی شکلوں سے پھولوں کا سبد قبریں ہیں
موت سا گلچین گلزارِ جہاں کوئی نہیں

حکایت دردِ دل کی دردِ دل ہے
ارے ظالم میں در گزرا بیاں سے

ابتدائے شب ابھی تو ہے فراقِ یار کی
رات یہ جتنی بڑھے گی داغ جلتے جائینگے

کیا کیا ہمنے یہاں آئے تھے ہم کس واسطے
جائینگے دنیا سے جبدم ہاتھ ملتے جائینگے

جو شبِ وصل ان آنکھوں نے سماں دیکھا ہے
تمنے موسیٰ وہ سرِ طور کہاں دیکھا ہے

دل کو دنیا سے اُٹھائے ہوئے میں بیٹھا ہوں
نہیں معلوم وہ کس وقت مجھے یاد کرے

ضبط میں اُسکے بھی تاثیر کوئی ہے کہ نہیں
جو زمانے کے ستم سہکے نہ فریاد کرے

ہے اُسی کے لیے مخصوص زمانے کی خوشی
دل کو جو دیکھ کے آئینۂ غم شاد کرے

چیختا ہوں میں در کعبہ و بتخانہ پر
کوئی بُت راہِ خدا میں مجھے آزاد کرے

ہزاروں حال بدلے سیکڑوں پہلوئے غم نکلے
مریضانِ محبت کے بڑی مشکل سے دم نکلے

کلیجا کچھ ہوا ٹھنڈا اسوقت میرے قاتل کا	لہو ہیں دلکے جب ڈوبے ہوئے نیر ستم نکلے
ڈبو دیگا زمانے بھر کو وہ طوفان آئے گا	جو دو آنسو بھی تیرے ای غریق بحر غم نکلے

داؤد

داؤد - ندیم الدولہ خلیفۃ الملک حافظ محمد داؤد خاں بہادر داؤد مستقیم جنگ دہلوی معروف بہ "حافظ داؤد" بہادر شاہ ثانی نے انکے والد حافظ محمد خلیل سے قرآن شریف پڑھا تھا۔ خود حافظ صاحب نہایت عالی حوصلہ سخی اور باہمت رئیس تھے۔ درگاہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی میں ایک وسیع باؤلی ۱۲۶۳ھ میں بنوائی جس میں قریب پچیس تیس ہزار روپیہ کے لاگت آئی ہوگی، بازار چاوڑی میں ایک وسیع مکان معروف بہ "حافظ داؤد کا کمرہ" ابتک اُنکی یاد دلاتا ہے۔ اب بیگم صاحبہ وجانہ کی ملکیت ہے، یہ خود ابتدائے تخت نشینی ابوظفر سے غدر تک داروغگی نذر و نیاز اور علاقہ خانسامانی شاہی سے مشرف رہے۔ دو چار غزلیں حافظ قطب الدین مشیر اپنے عزیز کے مشورہ سے کہیں تھیں ۱۲۸۵ھ میں انتقال کیا۔ طبیعت موزوں تھی مگر شعر کم کہتے تھے یہ چند شعر اُنکے نتائج افکار سے درج ہیں ؎

نگہ سے، ناز سے عشوے سے اور ادا سے بھرے	بزورِ عشق نہ ہم کونسی بلا سے بھرے
گو بظاہر نہ منہ دکھاؤ گے	کیا کبھی خواب میں نہ آؤ گے
مر چکا داؤد کب کا اُسکے غم میں ہمنشین	دم چرانے کا ابھی تک اُس صنم کو دھیان ہے

داؤد

داؤد - مولوی محمد داؤد ابن مولوی علی محمد صاحب وکیل عباسی متوطن امروہہ بتاریخ ۲۷ رمضان المبارک ۱۲۸۰ ہجری بمقام امروہہ پیدا ہوئے اور بتاریخ ۱۷ جون ۱۹۰۹ء بمقام فتح آباد انتقال کیا اور اُسی قصبہ میں احاطۂ عیدگاہ میں مدفون ہوئے۔ ابتدائے عمر میں عربی فارسی کی تحصیل کی۔ بارہ سال کی عمر میں محمڈن کالج علیگڈھ میں داخل ہوئے طبیعت کو درد و محبت و زندہ دلی کے عناصر کا بڑا حصہ ملا تھا۔ بارہ سال وہاں تعلیم پاکر ۲۴ برس کی عمر میں سندِ بی اے حاصل کی۔ ایام طالب علمی ہی میں شعر و سخن کا چسکا لگ گیا، اور طبیعت کی شوخی اُس رنگ کو اور بے اُڑی۔ اکثر نظمیں دوست احباب کی تفریح

طبع کے لئے لکھیں، بعد سند یابی کالج ہی میں معلم مقرر ہوئے، پھر صاحب پرنسپل کی سفارش سے نائب تحصیلدار مقرر ہو گئے اور تحصیل اترولی و آگرہ و کاسگنج و مین پوری میں قائم مقام نائب تحصیلدار رہے، اور بالآخر فتح آباد ضلع آگرہ میں جاکر مستقل عہدہ پایا، وہاں انھوں نے دو برس تک نہایت قابلیت سے کام انجام دیا۔ انکے حسن اخلاق، دیانت اور حفظ و تب سے سب حباب ان سے رضامند رہتے تھے، شعر سے شوق تھا۔ اکثر مشاعروں میں شریک ہوا کیئے، اور طرحی غزلیں پڑھیں۔ قدیم اور جدید دونوں شاہراہوں کے سالک تھے۔ اشعار سے خصوصاً مرثیہ سر دار یوسف خاں سے انکی غیر معمولی لیاقت اور معاملہ بندی اور مضمون پسند فکر کا رنگ مترشح ہے، حق یہ ہے کہ یہ مرثیہ اپنے رنگ میں فرد ہے۔ مثنوی شکوۂ یار ناحی اور ایک بیتجے کی دوستی کا امتحان انکی تصنیف ہیں اور یہ دونوں تصانیف انکی چھپ کر شایع ہوئیں۔ مولنا حالی کے اکثر اشعار کو تضمین کیا ہے، بلا کے ذکی و ذہین تھے۔ انکے کلام سے انکی شوخی، اور طبیعت داری، ذکاوت ٹپکتی ہے، تھوڑی سی مشق میں بہت اچھا ملکہ پیدا کر لیا تھا، اگر زندگی وفا کرتی تو کیا عجب کہ اس فن میں بھی نام و نمود حاصل کرتے بڑی تلاش سے کچھ کلام ملا اس کا انتخاب درج ذیل ہے:

جب پئے سیر چمن وہ گل رعنا اٹھا	پائے بوسی کے لئے خواب سے سبزہ اٹھا
تھی بزم میں غیر کے اٹھ جانے کی تشویش فضول	اس کا اب ذکر ہی کیا جو کوئی اٹھا اٹھا

ق

جب دم نزع مجھے پاؤں رگڑتے دیکھا	ہاتھ ملتا ہوا بالیں سے مسیحا اٹھا
میں نے جب وادیٔ غربت میں رکھا اپنا قدم	خار پا بوسی کی خاطر بہ تمنا اٹھا
پئے تسلیم درختوں نے جھکائیں شاخیں	میری تعظیم کو جنگل میں بگولا اٹھا
آندھیاں آئیں ہوا خواہی کا دم بھرنے کو	خیر مقدم کا ہر اک سمت سے غوغا اٹھا
پیشکش خاک لئے اکسیر کی زر ذروں نے	کچھ نہ کچھ لیکے ہر اک ساکن صحرا اٹھا
طرب و عیش کا سامان کیا تھا بھاری	کیا کہیں سر ہی تقدیر سے ہلکا اٹھا

نقدِ دل دیکے جو اندوہ و الم مول لیا
خود میں حیران ہوں یہ کیا مجھے سودا اُٹھا

شوقِ دیدار نے فرقت میں سزا دی اچھی
سیکڑوں بار میں بے چینی سے بیٹھا اُٹھا

آج ہوگی مرے نالوں کی فلک سے مٹھ بھیڑ
اب کوئی دم میں سنو گے کہ یہ پردا اُٹھا

زندگی تلخ ہے اب ضبط کئے سے حاصل
صبر کرتے تھے رہے صبر کے جتبک قابل

ہوگیا کثرتِ اندوہ سے جینا مشکل
حال بیحال کئے دیتی ہے بیتابیِ دل

اب خموشی سے زیادہ خفقان ہوتا ہے
آخر افسانۂ غم آج بیان ہوتا ہے

اِس عشق کے طفیل لڑائی رہی سدا
تقدیر سے، رقیب سے، ناصح سے، یار سے

انصاف کی یہ بات نہیں پھر کیا گلہ کروں
جب ڈالدے وہ ہاتھ گلے میں پیار سے

کیوں ہو نہ زلفِ یار کو تارِ کمر سے ربط
دستور ہے کہ ملتے ہیں سب رشتہ دار سے

رہزن اِدہر ادا ہے اُدہر زلف پُر شکن
یارب بچائیو مجھے اِس لُوٹ مار سے

قربان عشق کے کہ ہم آزاد ہوگئے
قیدِ حیا سے، شرم سے، ذلت سے، عار سے

قطعہ

جانا وہ اُنکا صبح شبِ وصل ہائے ہائے
نیچی نظر کئے ہوئے اور شرمسار سے

کچھ کچھ وہ پیچ زلفِ سیہ کے کھُلے ہوئے
وہ لال لال آنکھوں میں ڈورے خمار سے

فرطِ حیا سے گردنِ نازک میں خم ذرا
جوشِ غضب وہ سینے پہ کچھ کچھ اُبھار سے

کب تھا وفورِ خواب سے کچھ تن بدن کا ہوش
بیخود سے، بیحواس سے، بے اختیار سے

برہم ہوئی وہ بزم شبِ وصل ہوچکی
بیٹھے ہیں پھر فراق میں ہم سوگوار سے

میری طرف سے آپکے دل میں ہے کیوں غبار
تقصیر ایسی کیا ہوئی اس خاکسار سے

ناصح کی گفتگو سے مرا ناک میں ہے دم
آتے ہیں دیکھئے شترِ بے مہار سے

یہ جھوٹ اور ہمسے بس اب رہنے دیجئے
ہم بھی تو رات جھانک رہے تھے دڑار سے

قطعہ

سُن کر پیامبر سے مرا نام یُوں کہا
وہ ہی نہ دُبلے پتلے نحیف و نزار سے

معلوم ہے مجھے بڑے اُستاد ہیں جناب
یُوں دیکھنے میں سیدھے سے پرہیزگار سے

خودمجکو تجربہ ہے بس اکیا بیاں کروں
خالق بچائے ایسے شریروں کے وار سے

بندِ مخمسہ

طاقت تو رنج اُٹھانے کی ہم میں رہی ہے کب
غم جھیلنے کا آپ ہی کچھ پڑ گیا ہے ڈھب
تاب و توان و ضبط گئے دل کے ساتھ سب
اک خُو سی ہو گئی ہے تحمل کی ورنہ اب
وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا

[illegible]

تیرے نزدیک ہیں سب ایک سے کعبہ ہو کہ دیر
تیری محفل میں بھی رہتی ہے عجب طرح کی سیر
تجھکو اپنوں سے کوئی انس نہ بیگانوں سے بیر
یار کو یار سمجھتا ہے نہ تو غیر کو غیر
تو تو اچھا ہے مگر تیرے بُرے ہیں برتاؤ

دیگر

ہو کے باہم عہد و پیماں رہ گئے
مُنہ سے کہتے کہتے وہ "ہاں" رہ گئے
پُورے ہوتے ہوتے ارماں رہ گئے
وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے
مینہ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت

مسدس

غور کر دل میں ستمگر یہ جفائیں کب تک
شکوۂ جور و ستم لب پہ نہ لائیں کب تک
ظلم کی حد بھی کوئی؟ ظلم اُٹھائیں کب تک
دل میں جو آگ لگی ہے وہ دبائیں کبتک
شرح ایں آتشِ جاں سوز نگفتن تا کے
سوختم سوختم ایں برق نہفتن تا کے

بندِ مخمسہ

گر کرے قصد کسی کام کا دل میں انسان
سُنکے لوگوں سے کہ وہ گئے تھے داؤد کے یہاں
پہلے یہ دیکھے وہ اُس کام کے ہے بھی شایاں
اُن کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپکی اور آپکے گھر کی صُورت

گھبراہٹ

کیا بُری شے ہے یہ گھبراہٹ بھی جس میں آدمی
ایک منشی سے شفاخانے پہ جو مامور تھا
بات تو کچھ بھی نہ تھی، لیکن نہیں معلوم کیوں
آپ کچھ کہتا ہے مُنہ سے کچھ نکلتا ہے مگر
پُوچھا اک انگریز نے نوکر ہو تم کس کام پر
ہو گئے اُسوقت وہ سُنکر پریشاں اسقدر

میں شتر خانے کا منشی ہوں، یہ کہتے تھے وہ
کہہ گئے گھبرا کے یوں "ہوں منشی خانے کا شتر"

زمزم

ایک دن کچھ آدمی بیٹھے ہوئے
کر رہے تھے گفتگو باہم دگر

اُن میں تھا اک شخص ایسا بھی کہ جو
کر چکا تھا غیر ملکوں کا سفر

ہوتے ہیں چالاک جیسے لوگ سب
وہ مگر اوروں سے تھا چالاک تر

جھوٹ کہتا تھا مگر سچ کی طرح
اُسکی باتیں تھیں نہایت پُر اثر

ہو رہا تھا تذکرہ ہر قسم کا
کر رہے تھے بحث ہر مضمون پر

باتوں باتوں میں کہا سیّاح نے
میں عرب میں بھی رہا ہوں سال بھر

سُنکے یہ بات اور تو سب چپ رہے
سب نے اُسکا قول سچ سمجھا، مگر

ایک کے دل میں یہ شک پیدا ہوا
کیا تعجب جھوٹ کہتا ہو اگر

اِس سے کچھ حالات واں کے پوچھئے
سوچ کر یہ اُس نے قصہ مختصر

اُن سے پوچھا آپکا ہوتا تھا واں
خدمتِ زمزم میں بھی کا ہے گذر

سُن کے اُسکے منہ سے یہ سیاح نے
سمجھا زمزم نام ہے کوئی بشر

بولے جی ہاں اُنکی خدمت میں تو میں
روز حاضر ہوتا تھا وقتِ سحر

آج دنیا میں نہیں اُنکا جواب
ہے تقدس ختم اُنکی ذات پر

اب تو بوڑھے ہوتے جاتے ہیں بہت
کیوں نہوں ہیں بھی تو ستر سے اُدھر

سن کے یہ سب نے لگایا قہقہہ
اور کہا تم کو نہیں یہ بھی خبر

اِک کنوئیں کا نام ہی زمزم وہاں
آپ یہ سمجھے کہ ہے کوئی بشر

جب نہ بن آئی کوئی معقول بات
تب کہا سیاح نے یوں جھینپ کر

اُس زمانے میں تو تھے وہ آدمی
ہوگئے ہونگے کنوئیں اب کیا خبر

مرثیہ سردار یوسف خان بلوچستانی طالب علم علیگڈھ کالج سنہ ۱۸۹۶ء

خشک اور ویران صحرا میں بلوچستان کے / اک کھلا تھا پھول نازک اور نہایت خوشنما
باغبانِ دہر نے دیکھا نہ ہوگا کوئی پھول / اس سے بہتر پُرفضا اور دلفریب اس سے سوا
گلشنِ عالم میں لاکھوں گل کھلے ہونگے مگر / کم ہوا ہوگا کوئی اس سے زیادہ دلربا
لیکن اسکے واسطے موزوں نہ تھی وہ سرزمین / وہ گلِ تر ایسے ریگستاں کے قابل نہ تھا
نامناسب تھی وہاں کی خاک اسکے واسطے / تھا مضر پانی وہاں کا اور مخالف تھی ہوا
کرکے اس پر غور آخر ایک ذی تدبیر نے / وہاں کے خار و خس سے اس گل کو علیحدہ کرلیا
سرزمینِ ہند میں اک باغ دیکھا پر بہار / مختلف اقسام کے پھولوں سے جو معمور تھا
بوئے جنسیت وہاں کی آب و گل میں دیکھکر / اس گلِ نوخیز کو اس باغ میں لاکر رکھا
اس چمن میں کھل رہے تھے پھول رنگا رنگ کے / جنکی بوئے خوش سے تھا سارا جہاں مہکا ہوا
مہرباں تھا باغباں ور بار آور تھی زمین / موسمِ گل جوش پر تھا راس تھی آب و ہوا
چونکہ واں سامان ایسے روح پرور تھے بہم / رات دن ہوتی گئی اس گل کی شادابی سوا
حسن و خوبی میں ترقی دمبدم ہونے لگی / تازگی بڑھتی گئی ہوتی گئی زائد جلا
حیف چرخِ کینہ ور نے ظلم پر باندھی کمر / کردیا گلشن سے اسکو وقت سے پہلے جدا
رنگ و بو نے اسکے دکھلائے نہ تھے جوہر ابھی / ہونے پایا تھا نہ کامل طور سے نشو و نما
لیگئی قسمت اسے پھر کھینچکر سوئے وطن / جو کسی پہلو سے اسکے واسطے موزوں نہ تھا
پھر وہی موجِ بلا انگیز تھی چاروں طرف / پھر اسی طوفانِ آفت خیز کا تھا سامنا
لیکن اس گل کو کہاں ان سختیوں کی تاب تھی / ایک ہی جھونکے میں آخر کار وہ مرجھا گیا
جس چمن میں وہ گلِ رعنا رہا تھا چند روز / آج تک اسکی جدائی کا ہے وہاں ماتم بپا
گل گریباں چاک ہیں اسکے غمِ فرقت میں سب / ڈھونڈتی پھرتی ہے ہر سو اسکی نکہت کو صبا
ہے یہ مجمل ہی بیاں کافی سمجھنے کے لیئے / اسکے کہنے کی ضرورت کیا کہ وہ گل کون تھا

جسکی کل مسند نشینی کی سنی تھی خوش خبر
لُطف جینے کا اُٹھایا تھا نہ یوسف نے ابھی
جسقدر ارمان دل میں تھے وہ دل میں رہ گئے
رحم آیا اے فلک تجکو نہ اُس کے حال پر
کسکو دُنیا سے اُٹھایا اے خدا نا ترس موت
کونسے تاریک بادل میں چھپا ہے چاند وہ
اے گلِ مشکیں نفس کیوں آگئی تجھ پر خزاں
تیرے مرنیکا زمانہ تھا نہ یوسف خاں ابھی
باغِ عالم میں نہ دیکھی تھی ابھی تیری بہار
داستاں تیری کیے دیتی ہے دلکو پاش پاش
وہ تنِ نازک ترا زخموں سے ہو کر چُور چُور
جان دی ہوگی نہیں معلوم کس تکلیف سے
تیرے قاتل نے نکی بچپن پہ بھی تیرے نظر
چھوڑ کر کالج چلا تھا جبکہ تو سوئے وطن
وہ دمِ رخصت ترا زو رو کے جانا یاد ہے
کہہ رہی تھیں حسرت آلودہ نگاہیں تیری صاف
اپنے واپس آنے کا آنا نہ تھا تجھ کو یقین
کچھ دلاسوں کا نہ ہوتا تھا ترے دل پر اثر
اب یہ ثابت ہو گیا تیرا ہی کہنا تھا درست
غیر ممکن ہے کہ تجھکو بھول جائیں جلد ہم
جس طرح کھیلوں میں تھا حاصل یدِ طولیٰ تجھے

وائے قسمت آج ہم لکھتے ہیں اُس کا مرثیا
اُس کا مرنا ہر طرح بیوقت و بے ہنگام تھا
زیست کا افسوس ہے کچھ بھی نہ حظ حاصل ہوا
تو نے کس موتی کو خاک و خون میں غلطاں کیا
دل بھر آتا ہے یہ کس سے جہاں خالی ہوا
دفعۃً آنکھوں کے آگے کیوں اندھیرا چھا گیا
اے خزاں اُس پھول کو پامال کیوں تو نے کیا
کھائی ہوتی کوئی دن تو اور دنیا کی ہوا
ہائے کھلنے بھی نہ پایا تھا کہ تو مرجھا گیا
مُنہ کو آتا ہے کلیجا واقعہ سُن کر ترا
بے کفن بے گور خاک و خون میں ہوگا پڑا
کیا اذیت ہوگی جب سینے میں دم ہوگا رُکا
جسنے تیرا خون بہایا کون وہ بیدرد تھا
ہے ہمارے سامنے ابتک سماں اُس روز کا
دل سے جانیکا نہیں اُس دن کا وہ جانا ترا
ہو رہا ہے تو ہمیشہ کے لیے ہم سے جُدا
سب تجھے سمجھا رہے تھے اور تو مایوس تھا
بند ہوتا تھا نہ ہرگز آنسوؤں کا سلسلا
تھا غلط جو کوئی کہتا تھا کہ پھر تو آئے گا
مُدتوں ہوتا رہے گا ذکر کالج میں ترا
ایسی ہی علمی ترقی کا بھی تجھکو شوق تھا

سربرآوردہ رہا اسکول میں تو جس طرح	کرکٹ و فٹ بال میں بھی ویسے ہی ممتاز تھا
اب نہ تُو ہے اور نہ کالج میں ترا کوئی نشاں	خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

دبنگ

دبنگ - حافظ سراج احمد پھکڑ باشندہ مُراد آباد یہ ایک شعر اُن کا قابل اندراج ہاتھ آیا

شیخ جی کا بھی انتقال ہوا	کوئی دنیا میں مسخرا نہ رہا

دبیر

دبیر - منشی محمد ابراہیم خلف منشی ذوالفقار علی، نکوڑ تحصیل رڑکی ضلع سہارنپور وطن ہے حضرت ظہیر دہلوی سے تلمذ ہے، بارہ تیرہ برس کا عرصہ ہوا حضرت ظہیر جب راقم کی استدعا پر کامل تیئیس سال بعد دہلی اپنے وطن دس بارہ روز کے لیئے تشریف لائے اون ایام میں انکا کلام بھی حضرت ظہیر نے تذکرہ کے لیئے عنایت فرمایا تھا اور ارشاد کیا تھا کہ اگرچہ میری شاگردی کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا، تاہم یہ نوجوان ذہین اور طباع اور ہوشیار معلوم ہوتا ہے، اسکے بعد کچھ کلام براہ راست اور کچھ حضرت ظہیر نے وقتاً فوقتاً ارسال فرمایا جس کا خلاصہ درج ہے انکی عمر اب بیالیس سال کے قریب ہوگی، شعر کا سلیقہ اچھا ہے، اور مذاق شستہ اور سلیم پایا ہے، بندش چست اور تراکیب موزوں اور خوش اسلوب ہوتی ہیں، روزمرہ کی صفائی کے ساتھ نازکخیالی کا لُطف بھی موجود ہے، سنگلاخ اور مشکل زمینوں میں زور طبیعت سے اچھے اچھے مزیدار مضمون نکالتے ہیں،

بنے واماندگی سے کیوں دُعا کا تیر پتھر کا	مگر رکھتا ہے دل وہ کافرِ بے پیر پتھر کا
گرانباریِ غم کا جب بیاں کرتا ہوں حسرت سے	بنا دیتی ہے سامع کو مری تقریر پتھر کا
کیا ہے قتل مقتل میں ہزاروں بیگناہوں کو	کلیجا رکھتی ہے ظالم تیری شمشیر پتھر کا
صدائے شور و غل زنداں سے اب ہر گز نہ آئیگی	ترا دیوانہ ہو بیٹھا مع زنجیر پتھر کا
خدایا بت پرست ایسا ہوں اپنی جان تک دیدوں	ذرا مانگے تو منہ سے چہرۂ تصویر پتھر کا
نہ صرف آنکھیں ہی پتھرائی ہیں اے بت دیکھکر تجکو	سراپا ہو گیا ہوں صورتِ تصویر پتھر کا
اثر صحبت کا ہوتا ہے بلاشک اے بت کافر	بنا دے کیا عجب مجھکو تری تاثیر پتھر کا

اُچٹ جاتا ہے خنجر چلتے چلتے دستِ قاتل سے
نکل آئی ہیں پتھر کی لکیریں سرنوشت اپنی

داغ کھائے، رنج پائے، غم اُٹھائے، عندلیب
دُور ہو کم بخت، بختِ نارسائے عندلیب
کون سنتا ہے چمن میں نالہائے عندلیب
اُڑ گیا بادِ خزاں میں طائرِ رنگِ چمن
ہمصفیرانِ چمن کو قیدیوں کی کیا خبر
ایک تو ہے بیوفا تجھ میں نہیں بوئے وفا
یہ غزل اپنی پسند خاطرِ عشاق ہے

کسقدر ہے دلکش و جانبخش مقامِ کوئے دوست
کس طرح رضواں سے ہو نا اہتمامِ کوئے دوست
اے فلک کیا پوچھتا ہے تو مقامِ کوئے دوست
اللہ اللہ ازدحامِ خاص و عام کوئے دوست
اہتمامِ خلد پر ہے ناز رضواں کو اگر
سب طرف سے دیدۂ باطن کو جب یکسو کیا
کر دیا محشر بپا اُسکے خرامِ ناز نے
ہو مبارک زاہدوں کو نزہتِ گلگشتِ خلد

تعزیر کے قابل ہیں ابھی اہلِ زمیں اور
للہ ذرا صبر کرے جانِ حزیں اور
رہتے نہ ترے سایہ میں سلے چرخِ بریں ہم
تم آئینہ خانے میں ذرا جاکے تو دیکھو

بنایا سخت جانی نے تہِ شمشیر پتھر کا
الٰہی دے مجھے اب ناخنِ تدبیر پتھر کا

دِل لگا کر گُل سے کیا پھل پھول پائے عندلیب
گوشِ گُل تک بھی نہ پہنچائی صدائے عندلیب
ہے عبث نقارخانے میں صدائے عندلیب
رہگیا تکتا ہوا تاثیرِ دعائے عندلیب
کون پہنچائے چمن تک نالہائے عندلیب
دیکھ تو ہر گل ہے پابند رضائے عندلیب
ہے دبیر اس میں سراسر ماجرائے عندلیب

چلدیئے دنیا سے ہم سنتے ہی نامِ کوئے دوست
خلد سے بڑھکر ہے عز و احترامِ کوئے دوست
سطحِ عرشِ بریں ہے زیرِ بامِ کوئے دوست
ہو نہ ہو ہنگامۂ محشر ہے نامِ کوئے دوست
دیکھ جائے آکے حسنِ انتظامِ کوئے دوست
پھر جدھر دیکھا نظر آیا مقامِ کوئے دوست
نفسی نفسی کہہ اُٹھا ہر خاص و عام کوئے دوست
جھانکتے ہیں اسطرف کبکِ خوشخرام کوئے دوست

پامال انھیں شوق سے کر چرخِ بریں اور
باقی ہے ابھی ایک دمِ بازپسیں اور
اے کاش جو ہوتی کہیں وہ ہاتھ زمیں اور
ہاں پھر بھی یہ کہنا کہ ہمارا سا نہیں اور

جس دل پہ مری جان ترا نام ہے کندہ — بہتر نہیں اُس دل کے نگینے سے نگیں اور

واہ کیا کہنا ہے اِس گفتار اور رفتار کا — قابلِ تحسیں ہے نغمہ لائقِ انعام رقص
جی اُٹھے مردے ہزاروں شوخیِ رفتار سے — تم بادنی سے بھی بڑھکر گیا ہے کام رقص
حرصِ دنیا سچ تو یہ ہے سبکو کرتی ہے خراب — سیم و زر کیواسطے کرتے ہیں سیم اندام رقص

دیکھے ہیں جس کسی نے ترے پیرہن کے پھول — تنگ چمن ہیں اُسکی نظر میں چمن کے پھول
نازک بدن ہیں اتنے کہ اللہ کی پناہ — دشوار ہوگیا اُنھیں اُٹھنا پہن کے پھول
جنت کے سبز باغ دکھاؤ نہ واعظو! — وعدے ہیں آپکے شجرِ مکر و فن کے پھول
یا فق اُڑا ہے رنگ چمن تیرے خوف سے — بن بنگئے ہیں لالہ و گل بھی سمن کے پھول
کیوں بات بات میں نہ کھلیں غنچہ ہائے دل — گویا کہ مُنہ سے جھڑتے ہیں اُس گلبدن کے پھول
کس کی بہار کس کا چمن اپنے وقت پر — ہر شئے نظر کے سامنے آتی ہے بنکے پھول
فیضِ بہارِ باغِ کلامِ ظہیر سے — کھِلتے ہیں اے دبیر نہالِ سخن سے پھول

اُسکی صورت دلمیں ہے اور دل ہے مٹھی میں مری — میں لئے بیٹھا ہوں تصویر خیالی ہاتھ میں
دستِ مشاطہ میں رہتی ہے تری زلفِ دراز — ہتھکڑی پڑتی نہیں اِس لاؤبالی ہاتھ میں
نان جو بھی ہے تہیدستی میں نعمت اے دبیر — ایک پیسہ اشرفی ہو جائے خالی ہاتھ میں

حالِ دلِ پُردرد نہ محتاجِ بیاں ہے — سب عرضِ مطالب مری صورت سے عیاں ہے
ہر چند کہ تو خلق کی نظروں سے نہاں ہے — پر نور کا جلوہ ترا ہر شے میں عیاں ہے
تو کیا نہیں پہلو میں نہیں دل بھی ہمارا — ہے جائے تعجب نہ مکیں ہے نہ مکاں ہے
رکھتے تھے جو نخوت سے قدم عرشِ بریں پر — اب اُنکا زمیں پر نہ کہیں نام و نشاں ہے

یہ لیجے نقدِ دل حاضر ہے اور موجود جاں تک ہے — گراں اِس بوسۂ لب کا بہا دیکھیں کہاں تک ہے

آنا ہے تو خدا کے لیئے جلد آ کہیں — آنکھیں لگی ہوئی ہیں یہاں فرشِ راہ سے
خطِ تیرہ بختیوں کے وہی جانتا ہے خوب — پالا پڑا ہے جسے تری زلفِ سیاہ سے

ملتے ہیں ہم کسی سے تو ملتے ہیں اے دبیر نہ مدفن کا نشاں باقی نہ خاک استخواں تک ہے	الفت سے، دوستی سے، محبت سے چاہ سے مٹایا اے فلک تو نے یہاں تک ہے یہاں تک ہے
خاکساروں سے حذر ہے خاکساری سے گریز ہیں ہمہ تن وقفِ تسلیم و رضا ہوں عشق میں آپ اپنے ظلم سے رسوائے عالم تم ہوئے اے دبیر اب ہند میں یکتا ہیں مولانا ظہیر	جستجو اس پر ہوس ہے نسخۂ اکسیر کی مِلک ہے سرتیغ کی، جاگیر ہے دِل تیر کی کیا کیا تم نے جو میری نعش کی تشہیر کی دھوم تھی اگلے زمانے میں جنابِ میر کی

دبیر۔ امام کعبۂ بلاغت ناظمِ عطارد تحریر حضرت مرزا سلامت علی دبیر مرحوم

خمخانۂ جاوید کا اک جام ہے یہ بھی

اِن باکمال مرثیہ گو کے جدِ اعلیٰ ملا ہاشم شیرازی شاعر تھے جو ملا علی شیرازی کے بڑے بھائی تھے، ملا ہاشم کے بیٹے مرزا رفیع متخلص بہ رفیع۔ اُنکے فرزند مرزا غلام محمد مرحوم اُن کے بیٹے مرزا غلام حسین مغفور تھے، مرزا غلام حسین مغفور کے خلف الصدق مرزا سلامت علی دبیر مرحوم تھے الشمس الضحیٰ مطبوعۂ میر عابد علی صاحب میں وہ فرمان بھی ہیں جو شاہانِ دہلی نے مرزا صاحب کے بزرگوں کو لکھے تھے، اور جن فرمانوں سے ظاہر ہے کہ مرزا غلام محمد اور مرزا رفیع و ملا ہاشم شاہان دہلی کے میر منشی سلطنتِ ہندوستان تھے اور میرزا غلام حسین صاحب کے حقیقی نانا میرزا عنایت اللہ خاں ابن مرزا ابوظفر خاں ناظم صوبۂ کشمیر کے تھے اور میرزا غلام حسین صاحب کے ماموں مرزا اشہامت علی خاں شاہزادگانِ دہلی کے اتالیق اور خطِ نستعلیق لکھوانے پر مامور تھے۔

مرزا دبیر مرحوم کے والدِ ماجد (مرزا غلام حسین مرحوم) نے دہلی کے چند مرتبہ تاخت و تاراج ہوجانے کے بعد دہلی سے لکھنؤ میں آکر سکونت اختیار فرمائی اور اثاث البیت بیچ بیچکر شادی بھی لکھنؤ میں کی مکانات بھی یہیں بنوائے جو آج تک محلۂ نخاس میں موجود ہیں اور آج وہ محلہ کوچۂ دبیر کہلاتا ہے، بعد شادی کے دہلی میں کسی قدر اطمینان ہوجانے پر

پھر مرزا غلام حسین مرحوم دہلی میں تشریف لیگئے، اور دہلی میں سات آٹھ برس تک متوطن رہے انکا مکان بلّی ماروں کے محلہ میں تھا۔ وہیں مرزا دبیر مرحوم کی دو بڑی بہنیں اور اُنکے بڑے بھائی مرزا غلام محمد، نظیر مرحوم پیدا ہوئے اور ۱۱ رجمادی الاولی ۱۲۱۸ھ کو دہلی ہی میں وہ آفتاب بُرجِ کمال طلوع ہوا جسکو آج تمام ملک "مرزا دبیر" مرحوم کہتا ہے، مرزا دبیر مرحوم کی ذات پر دہلی کو بھی اُسی طرح فخر حاصل ہے جس طرح لکھنؤ کو، مرزا دبیر پانچ سات برس کے تھے کہ انکے والد مرحوم پھر لکھنؤ مع اہل وعیال کے آئے اور اپنے انہیں نخاس والے مکانات میں رہے، اور یہ مستغنی المزاج بزرگ مدۃ العمر خانہ نشین ہی رہے، یہ بھی قابل ذکر امر ہے کہ مرزا دبیر صاحب کو میر انشاء اللہ خان مرحوم کی نواسی بیاہی ہوئی تھیں، مرزا دبیر مرحوم کی ابتدائے مرثیہ گوئی ۔ سالے کہ نکوست از بہارش پیدا، ۱۲ برس کی عمر میں کہ مرزا صاحب ابھی درس وتدریس میں مشغول تھے، انکو شعر گوئی کا شوق ہوا۔ مگر اکثر مناقب بزرگانِ دین کہتے تھے انکے والد ماجد میر مظفر حسن ضمیرؔ (مرحوم) کی خدمت میں ان (مرزا صاحب) کو لیکر پہنچے۔ کلام کی فرمایش پر یہ قطعہ مرزا دبیر نے پڑھا۔

کسی کا کندہ نگینے پہ نام ہوتا ہے	کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہی یہ دنیا کہ جس میں شام وسحر	کسیکا کوچ، کسی کا مقام ہوتا ہے

یہ قطعہ سُن کر تمام حاضرین اور خود میر ضمیر پھڑک گئے، اور میر ضمیر مرحوم نے ارشاد فرمایا کہ صاحبزادہ تم آیا کرو میں تم کو ضرور بتاؤں گا۔ میر ضمیر ہی نے دبیر تخلص مقرر کیا۔ اور مرزا دبیر مغفور کو ایک قدرتی نیچرل شاعر پا کر دل لگا کر خوب بتایا، ادھر مرزا صاحب کا سلسلۂ درس برابر جاری تھا، یہ بات تمام لکھنؤ میں مشہور رہے کہ مرزا صاحب نے باقاعدہ تحصیل علم فرمائی تھی اور عالم وفاضل جید تھے۔ ادھر علم کی قوت اُدھر طبیعت کی تیزی۔ ان سب پر طُرہ لکھنؤ کے باکمالوں کی صحبتیں، رات دن کے علمی مباحثے۔ ان سب باتوں نے مِل جُلکر مرزا دبیر کو چند برسوں میں ایک شاعر کامل بنا دیا۔ سولہ سترہ برس کی عمر میں

ہی مرزا دبیر کا شہرہ ہوگیا، اور اب میر ضمیر صاحب نے یہ شیوہ اختیار فرمایا کہ جو کوئی اُن کا شاگرد کوئی تصنیف اصلاح کے لئے اُنکو دیتا وہ اول مرزا صاحب کو دیدیتے اور فرماتے کہ بھئی سلامت علی اول تم اسکو دیکھ کر عیوب سے پاک کردو۔ جو کوئی عیب انکی نظر سے رہجاتا اُسکو میر ضمیر مرحوم خود نکال دیتے تھے، مرزا صاحب کے علم اور نیک نفسی اور خلق و انکسار اور مہمان نوازی نے اُنکو اور بھی چمکایا اور ایسی شہرت ہوئی کہ اب دبیر کا نام لوگ چار مشہور مرثیہ گویوں، ضمیر، خلیق، فصیح۔ دلگیر، کے ساتھ لینے لگے، چنانچہ اس بات کی شاہد عادل مرزا رجب علی بیگ سرور مغفور کے فسانہ عجائب کی مندرجہ ذیل عبارت ہے۔ یہ کتاب عہد غازی الدین حیدر و نصیر الدین حیدر شاہان اودھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ اُس زمانہ تک کے تمام مشہور مرثیہ گو اس مختصر عبارت میں آگئے یہ سرور کا کمال قابلِ داد ہے۔

وہ عبارت یہ ہے

"مرثیہ گو بے نظیر، میاں دلگیر، صاف باطن نیک ضمیر، خلیق، فصیح، مرد مسکین، مکروہات زمانہ سے کبھی خبر دہ نہ دیکھا، اللہ کے کرم سے ناظم خوب، و دبیر مرغوب، سکندر طالع بصورت گدا، بار احسان اہل دول کا نہ اُٹھایا، عرصۂ قلیل میں مرثیہ و سلام کا دیوان کثیر فرمایا"

مرزا صاحب کی شہرت کا چرچا سُن کر نواب غازی الدین حیدر (اول شاہان اودھ) نے انکو یکایک بُلوا کر اپنے عزاخانہ خاص میں سُنا۔ مرزا صاحب نے رباعیوں کے بعد اور مرثیہ سے پہلے یہ مطلع فی البدیہ کہکر پڑھا۔

واجب ہی حمد و شکر جناب آلہ میں مجھ سا گدا، اور انجمن بادشاہ میں		فضل خدا سے آیا ہوں کس بارگاہ میں چرچا یہ لوگ کرتے ہیں اسوقت راہ میں
•	ذرّے پہ چشم مہر ہے مہرِ منیر کو حضرت نے آج یاد کیا ہے دبیر کو	

لکھنؤ تھوڑے دنوں میں مرزا صاحب کا اسقدر شہرہ ہوگیا کہ بڑے بڑے رئیس اور شہزادے

اِنکے مکان پر حاضر ہوتے تھے، ادھر محلات میں کئی بیگمیں اور شہزادیاں اِنکی شاگرد ہوگئیں جن میں سے ایک نواب ملکہ زمانیہ زوجۂ نواب نصیرالدین حیدر شاہِ اودھ اور دوسری سلطان عالیہ دخترِ نواب ملکہ زمانیہ اودھ تھیں، یہ دونوں شاہزادیاں مرزا صاحب کو ابّا جان کہتی تھیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ محلاتِ شاہی کی زبان قابل سند ہے اور درحقیقت ہے مگر مرزا صاحب کی زبان کا کمال یہ ہے کہ محلاتِ شاہی میں جب کسی لفظ یا محاورہ روزمرّہ کے متعلق بحث ہوتی تھی تو کلامِ مرزا صاحب سے سند لی جاتی تھی یا اُسکے فیصلہ کا حصر مرزا صاحب پر رکھا دیا جاتا تھا، اِس شہرت سے جسقدر مرزا صاحب کو فائدہ پہنچا اُتنا ہی حاسدین کا حسد بڑھتا گیا، یہاں تک کہ میر ضمیر کے بعض شاگردوں نے چاہا کہ اُستاد اور شاگرد میں ناچاقی ہوجاسے، اِس اجمال کی تفصیل میر محمد رضا صاحب ظہیر لکھنوی دارشد تلامذہ مرزا دبیر مرحوم کی زبانی جو اُن تمام مجالس وغیرہ میں شریک تھے اور جنھوں نے تنقید آبحیات مرزا دبیر کے واقعات میں سنہ ۱۳۰۳ھ میں لکھی ہے) یہ بیان کرتے ہیں کہ مہاراج میوہ رام افتخارالدولہ (لکھنؤ کے ایک نومسلم فیاض رئیس) نے ۱۹ ماہ شعبان کو میر ضمیر اور مرزا دبیر سے اصرار کیا کہ اکیسویں ماہِ رمضان کی مجلس میں آپ دونوں صاحب نیا مرثیہ کہہ کر پڑھیں، دونوں صاحبوں نے وعدہ کرلیا کہ بشرطِ فرصت نیا مرثیہ کہیں گے، مرزا صاحب نے کہ اُنکی مشق اُس زمانہ میں مثل شباب کے زوروں پر تھی۔ رات بھر میں ایک نیا مرثیہ کہا جس کا مطلع یہ ہے "ذرّہ ہے آفتاب درِ بوتراب کا"، ۲۰ کو علی الصباح میر ضمیر مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوکر پوچھا، حضور نے کچھ فکر فرمائی۔ فرمایا کہ مجھکو اتنی فرصت کہاں؟ ایک پہلے کا کہا ہوا مرثیہ ہے، اُس میں چند بند نئے کہکر لگا لئے ہیں اور مطلع بدل لیا ہے وہی پڑھ دونگا، مرزا صاحب نے اپنا مرثیہ پیش کیا۔ دیکھکر بہت خوش ہوئے، مرزا صاحب نے عرض کی یہ سب حضور ہی کا فیض ہے اِسے آپ پڑھیں میں کچھ عذر کردونگا اصرار کے بعد میر ضمیر نے منظور کرلیا، اور یہ قرار پایا کہ فضائل کا حصہ مرزا دبیر پڑھیں اور مصائب کا

حصہ میر ضمیر مشہور رہے کہ میر عابد علی بشیر شاگرد ضمیر نے عین مجلس میں میر ضمیر کو مرزا دبیر کی طرف سے بھڑکا دیا، مرزا صاحب نے چند رباعیاں پڑھکر وہی نیا مرثیہ شروع کیا، اہلِ مجلس نے تعریفوں کے پھول نثار کئے۔ جہاں تک استاد کا کلام تھا وہیں تک پڑھکر منبر سے اُترے میر ضمیر صاحب منبر پر تشریف لیگئے اور یہ فرماکر کہ یہ مرثیہ انھیں کا ہے میرا نہیں کسی پرانے مرثیہ کے چند بند اور نثر کے کچھ فقرے پڑھے اور منبر سے اُتر آئے، بعد مجلس دو خلعت دونوں صاحبوں کیواسطے آئے، میر ضمیر صاحب نے اپنی خلعت پر ٹھوکر مار کر فرمایا کہ تم اُٹھالے جاؤ، اور اُٹھ کھڑے ہوئے، مرزا صاحب نے بھی یہ فرماکر کہ جو اُستاد کے فائدہ پر اپنے فائدہ کو مقدم رکھتے ہیں اُسکو ملعون جانتا ہوں خلعت پھیر دیا۔

اب زمانے نے دوسرا پلٹا کھایا، میر ضمیر صاحب کے اکثر شاگرد نظم و نثر میں مرزا صاحب پر حملے کرتے تھے انھیں میں سے کسی صاحب کا یہ مصرع آجتک مشہور رہے " ہنام دبیر فلکِ پیر مٹا دوں " ہر مہینے کی گیارہویں کو مرزا صاحب اپنا نیا مرثیہ کہکر پڑھتے تھے چنانچہ اُسی زمانے کا اُنکے ایک سلام کا شعر ہے۔

نیا مرثیہ نظم ہوتا ہے ہر ماہ	دبیر اسکو سمجھو مہینا ہمارا

مرزا صاحب کا کوئی شاگرد میر ضمیر صاحب کے کسی شاگرد کی بدزبانی مرزا صاحب سے بیان کرتا تھا تو وہ اُسکو جواب دیتے تھے کہ تم سخت بات کا ہمیشہ نرم اور ملائم جواب دو اور اصل و افعہ سمجھا دو۔ حیاتِ مستعار باقی ہے تو یہ سب شورشیں اور سوزشیں مٹ جائینگی چند سال یہی عالم رہا، اور اس درمیان میں مرزا صاحب کی شہرت کمال بڑھتی گئی یہانتک کہ وزیر شاہ اودھ نواب علی نقی خان مرحوم کی مجلس میں مرزا صاحب نے مرثیہ پڑھا سامعین مجلس میں تمام شاہزادے اور اکثر حکام اور معززین موجود تھے جن میں سے میر ضمیر صاحب بھی ایک سامع تھے، اثنائے مجلس میں جب حضور عالم (وزیر ممدوح) نے آواز بلند تعریف فرمائی، تو مرزا صاحب نے میر ضمیر کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ یہ سب

تصدق جناب استاد کا ہے، بعد مجلس میر ضمیر صاحب نے مرزا صاحب کو اٹھکر گلے سے
لگا لیا، اور وہیں سے اپنے گھرے گئے، اگلی پچھلی باتیں دوہرائی گئیں، میر عابد علی بشیر کی
خطا ثابت ہوئی۔ میر ضمیر صاحب نے فرمایا کہ اب یہ شخص اس لائق نہیں کہ ہمارے یہاں آئے
مرزا صاحب نے دست بستہ عرض کیا کہ انکی خطا بھی میری خطا کے ساتھ معاف فرمائیے
میر ضمیر صاحب نے سکوت فرمایا اور نادم ہوئے۔ اور اسکے بعد میر ضمیر صاحب کی گھر کی
مجلس میں ہمیشہ مرزا صاحب پڑھتے رہے یہانتک کہ میر ضمیر صاحب کی سوم کی
مجلس میں بھی مرزا صاحب نے مرثیہ پڑھا۔ میر عابد علی بشیر مرحوم بھی اپنا کلام مرزا دبیر مرحوم
کو دکھلانے لگے اور مرزا صاحب کے خیر خواہ شاگرد ہو گئے تھے۔ مرزا صاحب کے مقابلہ
پر جن شاعروں نے علم شہرت بلند کرنا چاہا اُن میں صرف میر انیس کو فروغ حاصل ہوا
مرزا صاحب کی خوش فکری کا زمانہ سترہ برس کے سن سے ۱۲۳۵ھ میں شروع ہوا۔
اس کے کامل ۲۳ برس بعد یعنی ۱۲۵۸ھ میں جب مرزا دبیر کی چالیس برس کی عمر تھی میر
انیس فیض آباد سے لکھنؤ آئے، حضرت امجد علیشاہ کا زمانہ تھا، یہ میر خلیق کے فرزند رشید
تھے جو عناصر اربع مرثیہ گوئی کے ایک عنصر لطیف تھے، اُس وقت رزمیہ مرثیہ گو صرف مرزا
ضمیر، میر فصیح، اور میرزا دبیر تھے، اپنے والد کی تحریک پر انھوں نے رزمیہ مرثیہ گوئی
شروع کی، اور اسکے ساتھ ہی منبر پر تنا بھی شروع کیا۔ واقعات انیس میں درج ہے کہ میر
انیس خود اس امر کے معترف تھے کہ انکے لکھنؤ آنے کے وقت میرزا دبیر کا لکھنؤ میں اچھا
شہرہ تھا۔ میر انیس مرحوم میرزا دبیر کے ہم سن بھی تھے، اور لکھنؤ میں آتے ہی اُن کے
فروغ کا بڑا باعث یہ ہوا کہ اکثر شرفا نواب زادے جو اُنکے والد کے شاگرد تھے اُنکے طرفدار
تھے، لکھنؤ والوں کو بالمقابل کاملوں کی تعریف کرنے میں مزا بھی آتا تھا، اس لیے دو
فریق "انیسیے" اور "دبیریے" مشہور ہو گئے اور انکے روبرو بقیہ مرثیہ گو ماند ہو گئے۔
مرزا صاحب کے اکثر ہمعصر علماء اور کملاء نے اُنکی تعریف کی ہے، مثلاً شمس العلما مفتی

میر عباس "عشرہ کاملہ" میں انیس اور دبیر کی نسبت لکھتے ہیں "دونوں صاحبوں کا مذاق جُدا جُدا ہے ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیجا سکتی میر صاحب کا کلام فصیح و شیریں ہے اور مرزا صاحب کا دقیق اور نمکین ہے ع ہر پھول کی خوشبو ہے جُدا رنگ جُدا ہے"

اسی طرح شمس العلماء مولوی سید حامد حسین نے ایک مجمع میں مرزا صاحب کی مندرجہ ذیل ٹیپ

طے ہر قدم پر ایک مہینے کی راہ تھی		رویت ہلالِ نعل کی اسپ گواہ تھی	

سُنکر فرمایا کہ کسی عرب و عجم نے بھی آجتک یہ مضمون اس خوبی سے نہیں باندھا، اسی طرح تدبیر الدولہ اسیر لکھنوی اور منشی امیر مینائی دونوں کا بیان تھا کہ ہم انیس اور دبیر دونوں کو استاد مانتے ہیں اور ایک کو دوسرے پر علانیہ ترجیح نہیں دے سکتے۔ قدر دانی کمال کے متعلق یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ۱۲۹۱ھ میں مرزا دبیر نابینا ہو گئے تھے، حضرت واجد علیشاہ طاب ثراہ کلکتہ ٹیا برج میں تشریف فرما تھے کہ ایک جرمن کا ماہر آنکھیں بنانے والا ڈاکٹر ان کا ملازم ہوا، بادشاہ کے اشارے سے ایک رفیق نے مرزا صاحب کو لکھا کہ بادشاہ کی خواہش ہے کہ اگر آپ یہاں آئیں تو آپکی آنکھیں بنوا دی جائیں۔ چنانچہ مرزا صاحب کلکتہ گئے اور نواب مونس الدولہ مصاحب شاہ جمجاہ کی کوٹھی پر مہمان ہوئے اور آنکھیں بنوائیں اور عرضداشت متضمن اطلاع شاہ جمجاہ کو بھیجی، اس کی پیشانی پر شاہ ممدوح نے یہ شعر لکھا۔

گر بر سر و چشم من بیائی		بر قلب نہم کہ کیمیائی	

۲۵ ذی الحجہ ۱۲۹۱ھ کو پھر سلطانخانۂ مُبارک اور سبطین آباد کے امام باڑہ میں مرزا دبیر سے ملاقات ہوئی اور سلطانعالم نے مرزا دبیر کی تعریف اپنے مرثیہ میں فرمائی جس میں سے ایک ٹیپ مشہور ہے۔

بچپن سے اسکے دامِ سخن میں اسیر ہوں		ہیں کمسنی سے عاشقِ نظمِ دبیر ہوں	

جبتک سلطنت اودھ قائم رہی باہر کے امرا باصرار مرزا صاحب کو بلاتے رہے مگر مرزا صاحب نے وطن کی مفارقت گوارا نکی، اور یہی جواب کہلا بھیجا کہ ہماری زبان کے سمجھنے والے دلی

اور لکھنؤ کے باہر کہاں ہیں؟ مگر غدر ۱۸۵۷ء کے دو برس بعد نواب امام باندی بیگم صاحبہ کی طلب پر پٹنہ عظیم آباد تشریف لیگئے۔ اور پھر ہر سال وہاں جاتے رہے وہاں جو پہلی مجلس میں مرثیہ پڑھا اُس سے قبل مندرجۂ ذیل رُباعی بھی پڑھی جس سے اُنکے دلی خیالات ظاہر ہوتے ہیں۔ ؎

جو پھول کبھی نہ بوستاں سے نکلے — اِس دور میں جورِ آسماں سے نکلے
صد شکر کہ شہر لکھنؤ جنت تھا — آدم ٹھہرے جو ہم جناں سے نکلے

بالآخر ۳ محرم ۱۲۹۲ھ کو لکھنؤ میں مرزا صاحب نے انتقال فرمایا، اور اپنے ہی مکان میں دفن ہوئے، آپکے صاحبزادے حضرت آوج بڑے باکمال مرثیہ گو ہیں، اُنکی خدمت میں راقم کو بمقامِ لکھنؤ دو بار نیاز حاصل ہوا تھا۔ ہنگام مُلاقات حضرت نے بکمال توجہ جناب دبیر کے حالات بھی سُنائے تھے۔ مُندرجۂ بالا حالات کے لیئے راقم منشی افضل حسین ثابت کا مشکور رہے جنھوں نے ایک پورا رسالہ موسوم "خمخانۂ جاوید کا اک جام ہے یہ بھی" مرزا دبیر کے حالات میں بھیجکر خمخانۂ جاوید سے اپنی دلچسپی کا ثبوت دیا۔

ہم طالع ہما مرادِ ہم رسا ہوا — طاؤسِ کلکِ مدح اُڑا اور ہما ہوا
مطلع ہمارا مطلعِ مہر سما ہوا — اور دو حۂ کلام سراسر ہرا ہوا
مصرع ہوا کہ سروِ دارالسلام کا — عطرِ گل ارم ہوا حاصل کلام کا

[illegible]

دِل کوچۂ جمع زر پریشاں نکلا — سرگشتہ بہر سامان نکلا
ہم تو ہیں ترے شکر گزار اے گردوں — احسان کیا جو ہم پہ احسان نکلا

[illegible]

بلبل بہ زمانہ ایک گل کا نہ ہوا — محکوم امر و رسل کا نہ ہوا
بندوں کو عبث خیالِ یکتائی ہے — اللہ پر اتفاق کُل کا نہ ہوا

امام زین العابدین کی بیکسی۔ قید خانہ کا فوٹو

عابد نے سوائے خاک بستر نہ رکھا — تپ میں سر بالینِ شفا سر نہ رکھا

زنداں میں نبض ہتھکڑی نے دیکھی		جز داغ کسی نے ہاتھ دل پر نہ رکھا
کھانے کا مزہ فقط زبانی نکلا چاہا تھا کہ ہاتھ دھوئیں دُنیا سے دبیر	رباعی	باقی سامانِ عیش فانی نکلا اتنا بھی نہ اِس کنوئیں میں پانی نکلا

نیرنگی دُنیا و عبرت

دُنیا کا عجیب کارخانہ دیکھا برسوں رہا جن کے سر پہ چترِ زریں		کس کس کا نہ یاں ہمنے زمانہ دیکھا تربت پہ نہ اُنکی شامیانہ دیکھا
مر کر بھی نہ چین زیرِ افلاک مِلا اے خانہ خراب قبر تیری خاطر	رباعی	اک تارِ کفن نہ گرد سے پاک مِلا کھویا بھی جو نقدِ جاں تو کیا خاک مِلا
کس عہد میں تبدیل نہیں دور ہوا اللہ وہی ہے تو نہ مضطر ہو دبیر	رباعی	گہہ عدل گہے ظلم گہے جور ہوا کیا غم جو زمین اور فلک اَور ہوا
نمرود کو خدائی کے دعوے سے کیا مِلا		بندہ جُدا ہوا جو خودی سے خدا مِلا
مصرع کے عوض آپ سے طوبیٰ نہیں لینا اب پوچھیے کیا مانگتا ہے کیا نہیں لینا	بند	لو جنّتِ اعلیٰ بھی بہ ادبی نہیں لینا ہیں نام زباں سے کسی شے کا نہیں لیتا
جز نقدِ رضا کچھ مجھے منظور نہیں ہے		خادم ترا، مدّاح ہے مزدور نہیں ہے
پہنچا جو کمال کو وطن سے نکلا تکمیلِ کمال کی غریبی ہے دلیل	رباعی	قطرہ جو گہر بنا عدن سے نکلا پختہ جو ثمر ہوا چمن سے نکلا
سمجھے ہیں نامرادیِ دنیا کو یہ مُراد ہر عضو میں ہے دِل کی طرح سے خدا کی یاد	بند	غم اُنکے دِل میں شاد ہے دل انکا غم میں شاد قرآن پڑھنا ختم ہے اِن پہ ہم جہاد
بازوئے جنگ مثلِ ترازو تُلے ہوئے		خود رحل زین پہ، گود میں قرآن کھلے ہوئے
تن لوٹتا تھا یاں تو تڑپتا تھا سر اُدھر اک بیحواس اس طرف اک بے خبر اُدھر	بند	زخمی پدر ادھر تھا تو بیجاں پسر اُدھر دریا لہو کا بہتا تھا اِن میں ادھر اُدھر

اِس نہرِ خوں میں سر جو دبیر اُنکے گرتے تھے		مثلِ حباب چاروں طرف بہتے پھرتے تھے
بیٹھ کر خاک پہ غلطاں ہوئے وہ دونو یتیم	بند	لپٹا یوں بھائی سے بھائی کہ ہلا عرش عظیم
تیغ چمکانے لگا بچوں کے سر پہ وہ لئیم		اُٹھ کے تعظیم سے کی دونوں نے جھک کر تسلیم
خوف سے بند تھے مُنہ بات نکی جاتی تھی		استخوانوں سے لرزنے کی صدا آتی تھی

غزل کمیاب میرزا دبیر منقول از مجموعہ مرسلہ

دفن کرنا مجھکو کوئے یار میں	قبر بلبل کی بنے گلزار میں
اپنے یوسف کا عزیزو ہوں غلام	چاہیے مجھکو بیچ لے بازار میں
سر مرا لٹکا کے قاتل نے کہا	پھل لگا ہے آج نخلِ دار میں
گرمیٔ خوں کی مری تاثیر دیکھ	پڑ گئے چھالے تری تلوار میں
سر کے کٹنے کا مجھے کچھ غم نہیں	خم نہ پڑ جائے تری تلوار میں
قبر میں روزن مری رکھنا ضرور	مر گیا ہوں انتظارِ یار میں
میرا مرنا اُنکے گھر شادی ہوئی	خون کے چھاپے لگے دیوار میں
بعد مردن میرے لاشے کو دبیر	دفن کرنا کوچۂ دلدار میں

رحمت کا تری اُمیدوار آیا ہوں	رباعی	مُنہ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہوں
چلنے نہ دیا بارِ گنہ نے پیدل		تابوت میں کاندھوں پہ سوار آیا ہوں
ناداں کہوں دلکو کہ خردمند کہوں	،،	یا سلسلۂ وضع کا پابند کہوں
اِک روز خدا کو مُنہ دکھانا ہے دبیر		بندوں کو میں کس مُنھ سے خداوند کہوں
خیالِ کربلا ہے، اور میں ہوں		بہشتِ جاں فزا ہے، اور میں ہوں
چنوں موتی بیابانِ نجف کے		یہ دُرِّ مدعا ہے، اور میں ہوں
مثالِ دانہ پستا ہوں شب و روز		فلک کی آسیا ہے، اور میں ہوں
صفِ دشمن سے حر نکلا یہ کہکر		بس اب راہِ وفا ہے، اور میں ہوں

دُعا بھی مال و دولت کی نہ مانگوں
ہمیشہ یہ دعا ہے اور میں ہوں

تمنّا دولت و حشمت کی سب بے جا
دبیر آخر فنا ہے اور میں ہوں

بند

ہے عکسِ گیسو و رُخِ اکبر کہاں کہاں
سنبل کہاں کہاں ہے گلِ تر کہاں کہاں

گلزار ہیں، جناں ہیں، ختن ہیں، تتار ہیں
پھیلی ہے نکہتِ گلِ حیدر کہاں کہاں

فرقِ عدو میں سینہ میں جوشن میں زین میں
در آئی ذوالفقارِ دو پیکر کہاں کہاں

بستی میں جنگلوں میں، ترائی میں کوہ میں
سنہ کو لیے پھرا ہے مقدر کہاں کہاں

اس کشتِ روزگار میں تخمِ لقا نہیں
اس بوستاں کے پھولوں میں بوئے وفا نہیں

اس بزم کے چراغوں میں نورِ ولا نہیں
اس بحر کے صدف میں دُرِ مدعا نہیں

گھر کونسا بسا کہ جو ویراں نہ ہو گیا
گل کونسا ہنسا کہ پریشاں نہ ہو گیا

اگر وہ غیرتِ شمشاد جائے سیرِ گلشن کو
گلوئے سرو میں پہنا دے قمری طوقِ گردن کو

چمن کی بے ثباتی پر جو اس کا دھیان جاتا ہے
تو کیا روتی ہے شبنم منہ پہ رکھ کے گل کے دامن کو

رواں کرتا تھا خنجر گاہ گاہے روک لیتا تھا
عجب ناز و ادا سے اُس نے کاٹا میری گردن کو

میں کشتہ ہوں کسی گل کے مسی آلودہ دنداں کا
چڑھانا باغباں تربت پہ میری برگِ سوسن کو

دلا ان تنگ چشموں سے نہ چشمِ رحم تو رکھیو
کسی کے حال پر روتا نہ دیکھا چشمِ سوزن کو

سوادِ نامۂ اعمال کیا یہ اشک دھوئیں گے
نہ شبنم نے کیا تبدیل رنگِ برگِ سوسن کو

دبیر آئیگا کب وہ بھول کر گورِ غریباں پر
جو اکثر روندتا تھا ناز سے پھولوں کے خرمن کو

آتے تھے جوڑ توڑ غضب تیغ تیز کو
سر سے گری جدا کیا پائے گریز کو

اپنے سے گرم دیکھ کے اُس شعلہ ریز کو
برق و شرر نے نذر کیا جست و خیز کو

گھر اپنا اُجاڑ کر بسایا تجھ کو
ڈھانپا جو کفن سے منہ دکھایا تجھ کو

اے قبر کہاں نہ کی تیری تلاش
جب خاک میں مل گئے تو پایا تجھ کو

ادنیٰ سے جو سر جھکائے اعلیٰ وہ ہے
جو خلق سے بہرہ ور ہے دریا وہ ہے

کیا خوب دلیل ہے یہ خوبی کی دبیر ۔۔۔ سمجھے جو بُرا آپ کو اچھا وہ ہے

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے ۔۔۔ بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا ۔۔۔ جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

بو گل نے لی رنگ لالہ نے سرعت ہوا نے دی ۔۔۔ یہ ہر یہ کیا ہے اپنی نیابت قضا نے دی

دِل کو مرے شغل غمگساری کا ہے ۔۔۔ غفلت میں طور ہوشیاری کا ہے
گردوں کو ہے اگر سرکشی کا غرہ ۔۔۔ ہمکو بھی غرور خاکساری کا ہے

یاں شور وہاں غل ادھر آئی اُدھر آئی ۔۔۔ وہ چمکی، وہ تڑپی، وہ چھپی وہ نظر آئی
وہ تیر گئی خود میں وہ سر میں در آئی ۔۔۔ گردن سے بڑھی سینہ لیا تا کمر آئی

سِن اُسکا گھٹا تھا جو دلیرانہ بڑھا تھا ۔۔۔ مُنہ کی وہی کھاتا تھا جو منہ اُسکے چڑھا تھا

چمکی جو خود سر پہ تو سر سے نکل گئی ۔۔۔ شانے پہ جو پڑی تو جگر سے نکل گئی
سینے میں دم لیا تو کمر سے نکل گئی ۔۔۔ حیراں تھا خود بدن کہ کدھر سے نکل گئی

اُونچی ہوئی تو فرق عدو کو فرو کیا ۔۔۔ گر کر اُٹھی تو راکب و مرکب کو دو کیا

رباعی

جو پھول کبھی نہ بوستاں سے نکلے ۔۔۔ اِس دور میں جور آسماں سے نکلے
صد شکر کہ شہر لکھنؤ جنت تھا ۔۔۔ آدم ٹھہرے جو ہم جہاں سے نکلے

عباس کے غم سے چشم سرور نم تھی ۔۔۔ حالتِ شہِ بیکس کی عجب اُس دم تھی
اشک آنکھوں میں اور زباں پہ عباس کا نام ۔۔۔ رُخ زرد، کمر پہ ہاتھ، گردن خم تھی

اے ابر تری گہر فشانی کیا ہے؟ ۔۔۔ آ، دیکھ کہ یہ دُرِّ معانی کیا ہے
یاں گل ہے چراغ انوری کا بالکل ۔۔۔ اے شمع تری چرب زبانی کیا ہے

بند

اللہ جل شانہٗ وہ غفور الرحیم ہے ۔۔۔ ہم سب ہیں دردمند وہ کامل حکیم ہے
رحمان و مستعان و رؤف و رحیم ہے ۔۔۔ اُسکے سوا بھلا کوئی ایسا کریم ہے
ایمان بھی دے، مراد بھی دے عز و جاہ بھی ۔۔۔ روزی بھی بخشے۔ خلد بھی بخشے گناہ بھی

خجر حیف کیا جہاں سے سلیمان لے گئے شاہانِ دہر کونسا سامان لے گئے	بند	یوسف بھی زیر خاک سب ارمان لیگئے سب کچھ وہ لے گئے کہ جو ایمان لیگئے
کن قافلوں کو خاک نہ اس راہ نے کیا		کن یوسفوں کو غرق نہ اِس چاہ نے کیا
یہ سُن کے مطمئن ہوئے وہ غازی وغنی لوکان کی مڑی، نہ پھری مُنہ پہ مُردنی	بند	منکہ ڈھلا، نہ اشک بہا، وقت جانکنی پتھرا گیا کیسا آنکھ میں دُونی تھی روشنی
مرتے ہوئے غضب کی دلیری دکھاتے تھے		رگ رگ سے دم نکلتا تھا اور مُسکراتے تھے
مجرئی ہے سوگوارِ ماہِ حیدر چاندنی تا کمالِ چار[۱۴] دہ معصوم روشن سب پہ ہو شمر نے چاہا کہ حضرت سے جُدا عباس ہوں مال و زر کا کیا بھروسہ چاہیئے فکرِ مآل ثابت شر و آفت سے شرافت نہیں ہوتی		اشک شبنم ہیں بکا کرتی ہے شب بھر چاندنی چودھویں[۱۴] شب کو رہا کرتی ہے شب بھر چاندنی یہ نہ سمجھا۔ چاند سے چھوٹے گی کیونکر چاندنی فی المثل ہے چار دن کی اے تونگر چاندنی کاہل کی یہ پہچان ہے نخوت نہیں ہوتی
پیش اُمرا طالبِ زر جھکتے ہیں سنجیدہ ہیں یہ لوگ ترازو کی طرح		سجدے سے سوا مُجرے کو سر جھکتے نہیں ہے مال سوا جدھر، اُدھر جھکتے ہیں
دریا پہ تو ظاہر میں علمدار گئے تھا بیچ میں دریائے شہادت حائل خجر حیف کیا جہاں سے سلیمان لیگئے شاہانِ دہر کونسا سامان لیگئے	بند	باطن میں وہ کوثر کے طلبگار گئے دو ہاتھ میں اس پار سے اُس پار گئے یوسف بھی زیر خاک سب ارمان لیگئے سب کچھ وہ لیگئے کہ جو ایمان لیگئے
کن قافلوں کو خاک نہ اس راہ نے کیا ہیں وقف ہمیشہ مرے الفاظ و معانی دزدانِ مضامیں پہ نہ کر منع کی تاکید		کن یوسفوں کو غرق نہ اِس چاہ نے کیا ہاں قلزمِ شیریں کا سبھی پیتے ہیں پانی تو مجتہدِ نظم ہے، فرض اُن پہ ہے تقلید
مضمون نئے کرتا ہوں ایجاد ہمیشہ		کہتا ہے سخن حضرتِ اُستاد ہمیشہ

کہنے میں ہے تاثیر خدا داد ہمیشہ شکر خدا کہ سرقہ کی حد سے بعید ہوں آمد شہِ عادل کی ہے انصاف کی رہبر بلبل سے قفس گل سے خزاں شمع سے صرصر	بھولے سے بتا دوں تو ہے یاد ہمیشہ ہر مرثیہ میں موجد طرز جدید ہوں خرمن سے شرر بھاگتے ہیں شیشے سے پتھر شبنم سے جو سورج تو کتاں سے مہ انور
نیکی سے بدن نام سے اب ننگ جدا ہے	توبہ سے شکست آئینہ سے زنگ جدا ہے
ہر جسم سے یہ دبدبۂ شہ کا بیاں ہے تن کہتا ہے سب قافلہ دوزخ کو رواں ہے	آرام کہاں ہوش کہاں جاں کہاں ہے دوزخ کی ندا ہے نہ یہاں ہے نہ وہاں ہے
اب عقل کہاں ہوش کہاں فوج لعیں ہے	سب گرد ہوئے راہ سمند شہ دیں ہیں
اکدم میں یہ طے کرتا ہے دنیا کی حدیں سب خالی ہیں رکابوں کی طرح چلتے ہیں قالب	کیسی وہ حدیں آپ سے باہر ہے یہ مرکب نقرہ ہے نہ سبزہ ہے نہ ابلق ہے نہ اشہب
نام اس کا تصور میں گذرتا نہیں کوئی	شوخی کے سبب رنگ ٹھہرتا نہیں کوئی

درخشاں

درخشاں ماہتاب الدولہ کوکب الملک سید علیخاں بہادر درخشاں ستارہ جنگ منجم شاہی ولد میر مغل لکھنوی شاگرد تدبیر الدولہ منشی مظفر علی خاں اسیر لکھنوی اور انکے باختصاص مقربوں میں شامل تھے مشہور سبع سیارہ کے ایک رکن تھے۔ ستاروں کی مزاج شناسی کے ساتھ ساتھ فن سخن کو بھی خوب نباہتے تھے۔ انکی سخن سنجی پر استاد کو بھی ناز تھا۔ جب فتح الدولہ برق نے اپنے ایک خوش فکر شاگرد مرزا محمد رضا طور کو دربار شاہی میں پیش کیا، تو منشی اسیر نے انکی تنخواہ بھی دلوادی۔ خود درخشاں نے مولوی حیدر علی طباطبائی سے جنھوں نے انکا مختصر حال رسالہ ادیب میں شائع کیا ہے فرمایا تھا کہ میری اور آفتاب الدولہ قلق کی باریابی ساتھ ساتھ ہوئی تھی اور خطاب بھی ساتھ ہی ملے تھے، انتزاع سلطنت کے بعد برق اور درخشاں بادشاہ کے ہمرکاب کلکتہ گئے اور قلق و اسیر لکھنو رہ گئے درخشاں کا انتقال بھی مٹیابرج ہی میں ہوا، بڑے پر گو اور زود فکر سخنور تھے، دیوان تیار تھا لیکن تو اتین

کی غفلت سے برباد ہوگیا، مولوی علی حیدر نے بڑی کوشش سے کچھ اجزا اشعار ردیف الف کے بٹیا برج میں فراہم کیئے اور مضامین کی صورت میں رسالۂ ادیب میں شائع کرائے جس سے ہماری معلومات اور دستیاب شدہ کلام میں معتدبہ اضافہ ہوا جسکے لئے ہم مولانا مذکور کے ممنون ہیں، اُس کا انتخاب درج ذیل ہے، اِنکے تلامذہ میں رئیس الدولہ افسر خوشنویسان شاہی اچھا کہنے والوں میں تھے، روزمرّہ بہت صاف لکھتے تھے اور نازک خیالی بھی انکے کلام سے آشکار ہے۔ آپکے اکثر اشعار میں اخلاقی مضامین صفائی سے نظم پائے جاتے ہیں، جو ناسخ کی طرز کے مقلد کے لیئے کچھ آسان بات نہیں، خود بادشاہ اور جملہ شعرائے لکھنو اُسی خشک اور بے تاثیر رنگ کے اسیر تھے۔ الغرض تغزل کا دلفریب رنگ اِن کے کلام میں موجود ہے، مضمون کی بندش ایسی چُست ہوتی تھی کہ ردیف بول اُٹھتی ہے۔

اب کلام ملاحظہ ہو:

آثارِ صبح حشر ہیں شاید کہ اے اجل	میرا چراغ عمر جو تو نے بجھا دیا
مرنا بھی اہلِ ہوش کا ہے غافلوں کو پند	ہم سوے تو یاروں کو اپنے جگا دیا
ہم اُس سے نقد بوسے کے اُمیدوار تھے	قیمت میں دل کی یار نے خنجر لگا دیا
کہا یہ ساربان سے نجد کے وادی میں لیلیٰ نے	کہ پہچانا نہیں جاتا ہوا کیا حال مجنوں کا
ہوگی فکر معنی آشنا محتاجِ غواصی	گہر افشاں ہے خود دامن مرے دریائے مضموں کا
ظلم کرتا ہے کتابی چہرا	خطِ کوفی میں ہے قرآں میرا
خود پرستی ہے پرستش بت کی	کم نہیں کفر سے ایماں میرا
آدمیت کو فقط جوہر انسان جانا	جس میں اخلاق نہ پائے اُسے حیوان جانا
ہمکو یہ فیض ہوا عشق رخ گیسو سے	گبر نے گبر مسلماں نے مسلماں جانا
شر سے نفرت ہے ہمیں خیر سے رغبت ہے مدام	کفر سمجھا اسے ہمنے اُسے ایمان جانا
حال ابنائے زماں ہے مثل سنگِ آسیا	ایک ہے آرام سے کھاتا ہے چکر دوسرا

نیک پر ہے فوق بد کو بحرِ عالم میں تو کیا
حُسن نظر آتا ہے مجکو ایک - گو ہر دوسرا

کیوں پئے روزی کس و ناکس سے کرتا ہے رجوع
بند کر سکتا نہیں رزقِ مقدر دوسرا

دسترس میرا جو ہو پتھر سے توڑوں آئینہ
دیکھنے پائے نہ تیرا روئے انور دوسرا

ذبح کیا کرتے ہو چھوڑو باندھ کر پر بام پر
ایک کو دیکھے تو آ بیٹھے کبوتر دوسرا

اے درخشاں جسکے مضموں سے ہے روشن اک جہاں
شاہ اختر سا نہیں دیکھا سخنور دوسرا

دریائے محبت کا نہ پوچھو حد و پایاں
جی ڈوب گیا جب مجھے ساحل نظر آیا

نازک ہے فنِ شعر نہایت ہی درخشاں
کہنے سے سمجھنا مجھے مشکل نظر آیا

کوئی میرے لیئے ہے بیخور و خواب
ہمیں اتنا خیال آیا تو ہوتا

کیا شرف ذات کا گر فیض کا جوہر نہ ہوا
آبِ گوہر سے لبِ خشک کبھی تر نہ ہوا

بخیہ درکار نہیں چشم مروت کے لیئے
آشنا باز کی وحشت سے کبوتر نہ ہوا

بیشتر حالِ جہاں ہمنے پریشاں دیکھا
گھر ہوا در نہوا، زور ہوا، زر نہ ہوا

بزنگ بوئے گل پہنچے سبکروحی سے اُس جا ہم
دکھائے برچھیاں سبزہ جہاں دیوارِ گلشن کا

ہمیشہ رنج میں رکھتی ہے اپنی ہمت عالی
ہمیں ہر دوست کا احسان، گویا ظلم دشمن کا

جام ہتی ہیں صورتِ دستِ سوال بھی
گردن کو اپنی شیشۂ مے نے جھکا دیا

آئی قریب گوشۂ ابرو جو زلفِ یار
اُتری ہوئی کمان پہ چلا چڑھا دیا

کل وہ جو مجھ کو دیکھ کے بیگانہ بن گیا
میں بھی تو ہوشیار ہوں دیوانہ بن گیا

غفلت پہ اپنی کیوں نہ ہوں خونِ دل امام
جام شراب عمر کا پیمانہ بن گیا

رونق فزا ہوا جو درخشاں وہ بت کبھی
آئینہ خانہ رشکِ صنم خانہ بن گیا

جب نگاہِ مست اسکی غیر پر پڑنے لگی
ہو گیا ثابت بہکنا نرگسِ مخمور کا

چارہ سازی خلق کی کرتا ہوں گو درماندہ ہوں
بے مرمت بیشتر رہتا ہے گھر مزدور کا

کہنے کیواسطے ہیں بہت یار آشنا
لاکھوں ہیں یاں نکلتے ہیں دو چار [illegible]

ناحق ہمیں سمجھتے ہیں اغیار آشنا
ہوتے نہیں کسی کے طرحدار آشنا

قاتل سے ہے اشارۂ ابروئے ماہِ نو
دو دن تو ہو نیام سے تلوار آشنا

کب ہے برادرانِ حقیقی کا اعتماد
بے فائدہ بدلتے ہیں دستار آشنا

پوچھوں ہیں لطفِ بوسہ دُرِ گوشِ یار سے
کانوں سے ہو اگر لبِ گفتار آشنا

ہے جائے گریہ حال جہانِ خراب کا
ہو چشمِ مہر و ماہ پہ دامن سحاب کا

تکیہ پہ لطفِ عارضِ رنگیں کو دیکھنا
گویا روش پہ پھول پڑا ہی گلاب کا

کبتک پیوں ہیں ظلمتِ شب کے لہو کے گھونٹ
چھلکائے شیرِ صبح قدح آفتاب کا

کیا آئینہ میں عارضِ رنگیں کی ہے بہار
پانی میں پھول تیر رہا ہے گلاب کا

ہم حلۂ بہشت پہن کے چلے گئے
ڈھونڈا کیا کفن میں فرشتہ عذاب کا

رتبۂ اعلیٰ نہ پائے لاکھ گرا دنی بڑھے
قدِ آدم آئینہ کس دن سکندر ہو گیا

زخمیٔ تیغِ ادا شب بھر تڑپ کر مر گئے
چاندنی کا کھیت دو پھولوں کا زیور ہو گیا

زندگی بھر جز ندامت اور کیا حاصل ہوا
مجھسے فعلِ نیک یارب تیرے قابل کیا ہوا

غالب ہوئی جو نکہتِ گل پر شمیمِ زلف
غنچوں نے چٹکیوں میں صبا کو اڑا دیا

وبال اس سر کے کٹنے کا نہ بالا بالا جائے گا
دھواں اسکو نہ اے قاتل سمجھنا شمعِ روشن کا

سکتے ہیں وہ آئینہ دکھا کر مجھے بولے
پتھر پڑیں اسے شخص تری بیجبری پر

صدمے سے بچاتی ہی طبیعت کی لطافت
پانی پہ کرے کاٹ نہ شمشیر ہوا پر

جو پھول پھینک کے مارا رقیب نے اُسکو
لگا ہے رشک کا کاری خدنگ سینہ پر

کس طرح چشمِ شوق کو آئے نظر کمر
تارِ نظر سے اُسکی ہے باریک تر کمر

معدوم کوئی چیز نہیں پر دہانِ یار
غائب کوئی جہاں سے نہیں ہی مگر کمر

آیا گر اسکے راہ میں گر خط شوق کو
میرا ہے ہاتھ اور تری نامہ بر کمر

آتا ہے اُنکو اپنی نزاکت کا جب خیال
پاتے نہیں ہیں آپ وہ دو دو پہر کمر

دشت غربت میں جلائے خار و خس نے برگ و بر — منعموں کے واسطے ہے رونق کاشانہ شمع
بے گنہ کے سر قلم کرنے پہ ہے کتنا دلیر — ہو اگر حاکم تو بے گلگیر سے جرمانہ شمع
سر برہنہ مو پریشاں چشم گریاں سینہ چاک — رکھتی ہے سامان رنج و ماتم پروانہ شمع
معرکہ میں عشق کے کی سر سے طے راہ عدم — آفریں ثابت قدم تھی کس طرح مردانہ شمع
ناصحا دیکھ نہ غصہ سے سوئے طفل پلک — تیری آنکھوں میں کھٹکتے ہیں مجھے پیارے ہیں
نہ ہے اس طرح سنگ آسیا ای چرخ گردش میں — نہ ہے یوں ساغر بادہ سدا لے چرخ گردش میں
یہ یوں تسبیح دست پارسا ہے چرخ گردش میں — رہیگا نجم اختر تا کجا اے چرخ گردش میں

خاکساری کمال کی ہے دلیل — ہیں جو ناقص غرور کرتے ہیں
وعدہ روز ازل کچھ یاد ہے — غافلو آئے کیوں کیا کر چلے

طواف تھا جو کبھی دل کے گرد ہم پھرتے — جہاد تھا جو کبھی خون آرزو کرتے

درد۔ ملک الشعرا خواجہ میر درد دہلوی خلف الصدق خواجہ میر ناصر عندلیب آپکا مادری سلسلہ خواجہ بہاالدین نقشبند سے ملتا ہے۔ انکا خاندان قدیم الایام سے دہلی میں پیری مریدی کے باعث نہایت با رسوخ اور صاحب اثر سمجھا جاتا تھا، علوم رسمی سے بخوبی ماہر تھے مشہور مفتی دولت سے مثنوی مولانا روم کے سبق لیئے تھے، آپ نواب ظفر خان بہادر امیر عہد جہانگیر بادشاہ کی اولاد امجاد اور خاندان چشتیہ میں سجادہ نشین تھے۔ شاہ گلشن کے خلیفہ اور علم تصوف و باطنی میں وحید العصر اور یگانہ وقت سمجھے جاتے تھے، کلام انکا نہایت پاکیزہ فصیح اور درد انگیز ہے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں دیوان انکے موجود ہیں، میر تقی میر اور سودا کے ہمعصر تھے، خدائے سخن میر تقی میر نے ان کو آدھا شاعر مانا ہے، اسی طرح مرزا رفیع السودا بھی انکے کمال کے مقر تھے جس کا اظہار کئی مقطعوں میں کیا ہے۔ ع

سودا بدل کے قافیہ تو اس غزل کو لکھ — اے بے ادب تو درد سے بس دو بدو نہ ہو

الغرض میر درد ایوان شاعری کے ایک جلیل القدر رکن ہیں۔ ہزار ہا آدمی انکے مرید

تھے۔ قدیم متانت اور تہذیب کی ایک مجسم تصویر تھے، یہ صبر و قناعت ہی کا کرشمہ تھا، کہ سودا
میر، مصحفی، جرأت، انشا، حسرت، سوز، جیسے مشاہیر سلطنت کی تباہی اور رات دن کی
غارتگری سے تنگ آکر تلاش روزگار میں دہلی کو خیرباد کہکے بلاد شرقیہ کو روانہ ہوئے۔
مگر انکے پائے استقلال نے جنبش نہ کی اور اپنی خانقاہ میں اسی طرح بیٹھے رہے دُنیاوی
عزوجاہ کی طرف بھی التفات نہ کیا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تا دم اخیر مرجع صغیر و کبیر رہے
دربار شاہی سے کچھ تھوڑی سی جاگیر بزرگوں کی مقرر تھی اُسکی آمدنی اور نذر و نیاز سے بخوبی
بسراوقات ہوجاتی تھی، موسیقی میں چونکہ اچھی مہارت رکھتے تھے اس لیئے بڑے بڑے
گویئے اور کلاونت اپنی چیزیں بنظر صلاح و استفادہ سُنایا کرتے تھے، محرم میں مرثیہ اور
سوزخوانی کی محفل ہوتی تھی۔ خواجہ صاحب ہر مہینے کی ۲- اور ۲۴ تاریخ کو مشائخوں کی محفل
کیا کرتے تھے، اور اُس میں اکثر اُمراء و بزرگ اپنا فخر سمجھ کر آتے تھے، حتیٰ کہ خود بادشاہ
حضرت شاہ عالم ثانی کئی دفعہ تشریف فرما ہوئے، ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت بلا
اطلاع چلے آیئے، اور چونکہ پاؤں میں درد تھا ضبط نہ کرسکے اور ذرا پاؤں پھیلا دیا، اب
خواجہ صاحب کی نازک مزاجی دیکھیئے کہ وہ اس بے ادبی کی متحمل نہ ہوسکی اور اُسی وقت بولے کہ "یہ
امر فقیر کی واب محفل کے خلاف ہے" بادشاہ نے عذر کیا اور معافی چاہی، جسپر میر درد نے
فرمایا کہ "اگر طبیعت ناساز تھی تو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ چھوٹی بحروں میں جو
شعر کہتے تھے لاجواب اور بیمثل ہوتا تھا، میر تقی میر کے رنگ میں رنگ ملا دیتے تھے
بلکہ تصوف اور اخلاق کی چاشنی کے اعتبار سے انکا کلام زیادہ مؤثر اور دلآویز ہوتا تھا،
تصنیف و تالیف کا شوق بچپن سے رفیق تھا، چنانچہ اُردو دیوان کے علاوہ ایک مختصر
فارسی دیوان بھی ہے، ان دونوں کے علاوہ رسالہ اسرار الصلوٰۃ، واردات درد اُسکی شرح
میں علم الکتاب ایک بڑا نسخہ تحریر کیا جس میں ۱۱۱ متفرق رسالے ہیں۔ نالہ درد، آہ سرد، درد دل،
سوز دل، شمع محفل، حرمت غنا، وغیرہ جن کی شائقین تصوف کی نگاہوں میں بڑی

قدر و منزلت ہے آپکی اور تصانیف ہیں۔ ان کے والد خواجہ ناصر عندلیب بھی شاعر تھے۔ چنانچہ انکا بھی ایک مختصر دیوان اور رسالہ "نالۂ عندلیب" موجود ہے، اسی طرح درد کے چھوٹے بھائی سید محمد میر اثر جن کا ذکر پہلے جلد میں آچکا ہے صاحب دیوان و مثنوی "خواب و خیال" تھے۔ خواجہ صاحب کی غزل عموماً سات یا نو شعر کی ہوتی تھی، مگر مضامین سب چُنے چھٹکے ہوئے، گویا تلواروں کی آبداری نشتروں میں بھر دیتے تھے، البتہ جیسا انکے ہمعصر شعرا میر تقی میر، سودا اور درد کے شاگرد رشید قائم کے ہاں بعض الفاظ۔ جاگہ نت، ٹک، تئیں، جیدھر، جواب متروک ہیں مستعمل ہوئے ہیں انکے کلام میں بھی وہ پائے جاتے ہیں، اور یہ کوئی عیب کی بات نہیں، ہر عہد اور زمانہ کی زبان جداگانہ ہوتی آتی ہے۔ صفائی زبان، و سوز و گداز، و خوش اسلوبی محاورہ اور مضمون آفرینی پر شیدا تھے، ۲۴ صفر سنہ ۱۱۹۹ ہجری یوم جمعہ کو انتقال کیا۔ کسی مرید نے تاریخ کہی "حیف دنیا سے سدھارا وہ خدا کا مجنوں"

مقدور کسے ہے ترے وصفوں کے رقم کا	حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا
بستے ہیں ترے کوچہ میں سب شیخ و برہمن	آباد ہی تجھسے ہی تو گھر دیر و حرم کا
ہے خوف اگر جی میں تو ہی تیرے غضب کا	اور دل میں بھروسا ہے تو ہی تیرے کرم کا
کبھی خوش بھی کیا ہے دل کسی رند شرابی کا	بھڑا دے مُنہ سے مُنہ ساقی ہمارا اور گلابی کا
اکسیر پر تو ہوس اتنا نہ ناز کرنا	ہے کیمیا سے بہتر دل کا گداز کرنا
اے آنسوؤ نہ آوے کچھ دل کی بات لب پر	لڑکے ہو تم کہیں مت افشا راز کرنا
ہم جانتے نہیں ہیں اے درد کیا ہے کعبہ	جیدھر ملے وہ ابرو اُودھر نماز کرنا
مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بتخانہ تھا	ہم سبھی مہمان تھے تو آپ ہی صاحبخانہ تھا
ہو گیا مہمان سرائے کثرت موہوم آہ	وہ دل خالی کہ تیرا خاص خلوتخانہ تھا
وائے نادانی کہ بعد از مرگ یہ ثابت ہوا	خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
بجتی کو جویاں جلوہ فرما نہ دیکھا	برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں
ترے عشق میں ہمنے کیا کیا نہ دیکھا

حجابِ رخِ یار بھی آپ ہم ہیں
کھلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا

کیا مجھکو داغوں نے سروِ چراغاں
کبھو تو نے آکر تماشا نہ دیکھا

مرا غنچۂ دل ہے وہ دل گرفتہ
کہ جسکو کسو نے کبھو وا نہ دیکھا

یگانہ ہے تو آہ بیگانگی میں
کوئی دوسرا اور ایسا نہ دیکھا

سینہ و دِل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجومِ یاس اجی گھبرا گیا

تجھ سے ہمنے کچھ نہ دیکھا جز جفا
پر وہ کیا کچھ ہے کہ جی کو بھا گیا

پی گئی کتنوں کا لوہو تیری یاد
غم ترا کتنے کلیجے کھا گیا

کھل نہیں سکتی ہیں اب آنکھیں مری
جی میں یہ کس کا تصور آ گیا

میں تو کچھ ظاہر نہ کی تھی دل کی بات
پر مری نظروں کے ڈھب سے پا گیا

فلک پر کون کہتا ہے گذر آہِ سحر کرنا
جہاں جی چاہے وہاں جا پر کسی دلمیں اتر کرنا

مثلِ نگیں جو ہم سے ہوا کام رہگیا
ہم روسیاہ جاتے رہے نام رہگیا

یارب یہ دل ہے یا کوئی مہماں سرائے ہے
غم رہگیا کبھو۔ کبھو آرام رہگیا

ہم کب کے چل بسے تھے پر اے مژدۂ وصال
کچھ آج ہوتے ہوتے سرانجام رہگیا

مدت سے وہ تپاک تو موقوف ہو گئے
اب گاہ گاہ بوسہ یہ پیغام رہگیا

ساقی مری طرف بھی ٹک اُنکی نگاہ کر
لب تشنہ تیری بزم میں یہ جام رہگیا

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

جان سے ہو گئے بدن خالی
جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا

اگر یوں ہی یہ دل ستاتا رہے گا
تو اک دن مرا جی ہی جاتا رہے گا

میں جاتا ہوں دلکو ترے پاس چھوڑے
مری یاد تجھکو دلاتا رہے گا

کتنے بندوں کو جان سے مارا
کچھ خدا کا بھی تو نے ڈر نہ کیا
سب کے ہاں تم ہوئے کرم فرما
اِس طرف کو کبھو گذر نہ کیا
دیکھنے کو رہے ترستے ہم
نہ کیا رحم تو نے پر نہ کیا

قتلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا
رات مجلس میں تری حُسن کے شعلہ کے حضور
شمع کے مُنہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا
باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے
وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا
ذکر میرا تو وہ کرتا تھا صریحاً لیکن
مَیں نے پُوچھا تو کہا خیر یہ مذکور نہ تھا
محتسب آج تو میخانے میں تیرے ہاتھوں
دِل نہ تھا کوئی کہ شیشہ کی طرح چُور نہ تھا

کیا جفا کے سوا ابھی کچھ اور
اے ستمگار خوش نہیں آتا
درد ہمکو یہ رات دِن تیرا
نالۂ زار خوش نہیں آتا
یک بیک نام لے اُٹھا میرا
جی میں کیا اُسکے آ گیا ہوگا

تو اپنے دل سے غیر کی اُلفت نہ کھو سکا
مَیں چاہوں اَور کو تو یہ مجھ سے نہ ہو سکا
جُوں شمع روتے روتے ہی گذری تمام عمر
تو بھی تو درد داغِ دِل اپنا نہ کھو سکا

شاہ و گدا سے اپنے تئیں کام کچھ نہیں
نے تاج کی ہوس نہ ارادہ کلاہ کا

شیخ کعبہ ہو کے پہنچا ہم کنشتِ دِل میں ہو
درد منزل ایک تھی ٹک راہ کا ہی پھیر تھا

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا
کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا
دِل کسی چشمِ مست کا سرشار ہو گیا
کِسکی نظر لگی کہ یہ بیمار ہو گیا

کی تو تھی تاثیر آہِ آتشیں نے اُسکو بھی
جب تلک پہنچے ہی پہنچے راکھ کا یاں ڈھیر تھا

تم اوّل ہی آکر جو مجھ سے ملے تھے
نگاہوں میں جادو سا کچھ کر دیا تھا

تو ہی نہ اگر ملا کرے گا
عاشق پھر جی کے کیا کریگا

ہمنے چاہا بھی پر اُسکو جی سے آیا نہ گیا
وہاں سے جوں نقشِ قدم دِل تو اُٹھایا نہ گیا

گذرا تھا بعدِ مدت وہ سامنے سے ہو کر
سا یے کو بھی نالہ یہ وقت تھا گئی تھا؟

اُس نے قصد اگر بھی میرے نالے کو
نہ سُنا ہوگا گر سُنا ہوگا
دل زمانے کے ہاتھ سے سالم
کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا
قتل سے میرے وہ جو باز رہا
کسی بد خواہ نے کہا ہوگا
دل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں
کہیں غنچہ کوئی کھلا ہوگا
دل بھی اے درد قطرۂ خوں تھا
آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

کسی سے کیا بیاں کیجے اس اپنے حال ابتر کا
دل اُسکے ہاتھ دے بیٹھے جسے جانا نہ پہچانا

بے طرح کچھ اُلجھ گیا تھا دل
بیوفائی نے تیری سُلجھایا
ہم تو کہتے تھے مُنہ نہ چڑھ اُسکے
درد کچھ عشق میں مزہ پایا

میں اپنا دردِ دل جا کر کہا جس پاس عالم میں
بیاں کرنے لگا قصہ وہ اپنی ہی خرابی کا
گذرو ہوں جس خرابے پہ کہتے ہیں یاں کے لوگ
ہے کوئی دن کی بات یہ گھر تھا یہ باغ تھا

جان پہ کھیلا ہوں میں میرا جگر دیکھنا
جی رہے یا نہ رہے مجکو اُدھر دیکھنا
گرچہ وہ خورشید رو ہے بھی مرے سامنے
تو بھی میسر نہیں بھر کے نظر دیکھنا
سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک
اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا
ذکرِ وفا کیجے اُس سے جو واقف نہ ہو
کہتے یہ کس سے ہو تم ٹک ادھر دیکھنا
نالۂ دل کا اثر دیکھ لیا درد بس
جی میں نہ رہ جائے یہ آہ بھی کر دیکھنا

رباعی
بتخانہ برہمن کا مکرر دیکھا
کعبہ کو بھی شیخ کے میں اکثر دیکھا
دل لگنے کی صورت نہ کہیں بھی پائے
جو کچھ دیکھا سو خاک پتھر دیکھا

سیر باغ و بوستاں تو ہے میسر ہر گھڑی
آ پئے گا ہے قفس کے بھی پرانے کے بیچ
جو مزے ہیں مرگ میں سو ہمسے پوچھا چاہئے
کوئی جانے آہ کیا لذت ہے مر جانے کے بیچ

اسقدر تھا یا کرم یا ظلم رانی اسقدر
مہربانی اسقدر نا مہربانی اسقدر

کیا کہوں دل کا کسی سے قصۂ آوارگی
کوئی بھی بے ربط ہوتی ہے کہانی اسقدر

جان کو آنے دے لب تک نزع میں کب تک ہوں
دشمنی مجھ سے نکر اے ناتوانی اسقدر

ہنس قبر پہ میری کھل کھلا کر
یہ پھول چڑھا کبھی تو آکر

خارِ مژہ پڑے ہیں مرے خاک میں ملے
اے دشت اپنے کیجیو داماں کی احتیاط

دل کے تئیں گرہ سے کبھی کھولتی نہیں
ہے زلف کو بھی اپنے پریشاں کی احتیاط

داغوں کی اپنے کیوں نکرے دردؔ پرورش
ہر باغباں کرے ہے گلستاں کی احتیاط

کیجے نہ قتل اہلِ وفا جتنے ہیں یہ سب
بارے کہیں ٹھکانے لگے جستجوئے تیغ

صیّاد! اب رہائی سے کیا مجھ اسیر کو
ہے کس کو زندگی کی توقع بہار تک

لازم ہے گوشۂ شکنِ زلف میں تری
ظالم کوئی پڑا رہے مجھ سا شکستہ دل

ہمیں تو باغ تجھ بن خانۂ ماتم نظر آیا
ادھر گل پھاڑتے تھے جیب روتی تھی ادھر شبنم

اپنے ملنے سے منع مت کر
اس میں بے اختیار ہیں ہم

رباعی

اے دردؔ یہ دردجی کا کھونا معلوم
جوں لالہ جگر داغ سے دھونا معلوم
گلزار جہاں ہزار پھولے لیکن
میرے دل کا شگفتہ ہونا معلوم

ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر
مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں

اُس نے کیا تھا یاد مجھے بھول کر کہیں
پاتا نہیں ہوں تب سے میں اپنی خبر کہیں

موت! کیا آکے فقیروں سے تجھے لینا ہے
مرنے سے آگے ہی یہ لوگ تو مرجاتے ہیں

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

دردؔ یاں دو ہی پیمانوں پہ قناعت کیجے
خانۂ چشم ہے یہ خانۂ خمّار نہیں

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو!
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

سر تا قدم زبان ہیں جوں شمع گو کہ ہم
پر یہ کہاں مجال جو کچھ گفتگو کریں

مدت تلک جہان میں ہنستے پھرا کیئے
جی میں ہے خوب روئیے اب بیٹھکر کہیں

مژگانِ تر ہوں، یا رگِ جانِ بریدہ ہوں
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

ہر شام مثلِ شام ہوں میں تیرہ روزگار
ہر صبح مثلِ صبح گریباں دریدہ ہوں

کھینچے ہے دور آپ کو میری فروتنی
افتادہ ہوں پہ سایۂ قدِ کشیدہ ہوں

مرے دلکے شیشہ کو بیوفا تونے ٹکڑے ٹکڑے ہی کر دیا
مرے پاس تو وہی ایک تھا یہ دکانِ شیشہ گراں نہیں

بلا ہے نشۂ دنیا کہ تا قیامت آہ
سب اہلِ قبر اسی کا خمار رکھتے ہیں

عشوہ و ناز و کرشمہ میں سبھی جاں بخش لیک
درد مرتا ہے کوئی اُسکی دوا کرتا نہیں

داد کو تو پہونچنا معلوم ہے
کوئی یاں فریاد سنتا ہی نہیں

ہر دم بتوں کی صورت رکھتا ہے دل نظر میں
ہوتی ہے بت پرستی اب تو خدا کے گھر میں

دل تو سمجھائے سمجھتا ہی نہیں
کیجئے سودا ہے تو سودا بھی نہیں

کہیں ہوئے ہیں سوال و جواب آنکھوں میں
یہ بے سبب نہیں ہمسے حجاب آنکھوں میں

نہیں شکوہ مجھے کچھ بیوفائی کا تری ہرگز
گلہ تب ہو اگر تونے کسی سے بھی نباہی ہو

اپنے بندہ پہ جو کچھ چاہو سو بیداد کرو
یہ نہ آجائے کہیں جی میں کہ آزاد کرو

اے درد یاں نہ دل کو کسی سے پھنسائیو
لگ چلیو سب سے یوں تو یہ دل مت لگائیو

مانع نہیں ہم وہ بتِ خودکام کہیں ہو
پر اس دلِ بیتاب کو آرام کہیں ہو
ہر چند تجھے صبر نہیں درد ولیکن
اتنا بھی نہ ملیو کہ وہ بدنام کہیں ہو

تیری خوں آشامیاں مشہور ہیں اے تیغِ یار
ایک قطرہ چھوڑے تو پیوے ہمارا ہی لہو

اے درد بہت تونے ستایا ہمکو
بیدرد بہت تونے ستایا ہمکو
جاتی ہے مری جان تو راضی رہنا
لے درد بہت تونے ستایا ہمکو

جو جفا جو ہیں اُنہیں سنگدلی لازم ہے
کام تلوار کو رہتا ہے سدا سان کے ساتھ

نظر جب دل پہ کی دیکھا تو مسجودِ خلائق ہے
کوئی کعبہ سمجھتا ہے کوئی سمجھے ہے بتخانہ

ہر طرح زمانے کے ہاتھوں سے ستم دیدہ

دل بھی تیرا ہی ڈھنگ سیکھا ہے
بے خبر تیغ یار کہتی ہے
مرا جی ہے جب تک تری جستجو ہے
تمنا ہے تیری اگر ہے تمنا
ہمتیں چند اپنے ذمہ دھر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب

گر دل ہوں تو آزردہ خاطر ہوں تو رنجیدہ

آن ہیں کچھ ہے آن ہیں کچھ ہے
باقی اس نیم جان ہیں کچھ ہے
زباں تب تلک ہے تری گفتگو ہے
تری آرزو ہے اگر آرزو ہے
جس لیئے آئے تھے سو ہم کر چلے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
چل سکے بس جب تلک ساغر چلے
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

تیری گلی میں میں نہ چلوں اور صبا چلے
درد اپنے حال سے تجھے آگاہ کیا کرے
جی کی جی ہیں ہی رہی بات نہ ہونے پائی

یوں ہی خدا جو چاہے تو بندہ کا کیا چلے
جو سانس بھی نہ لے سکے وہ آہ کیا کرے
ایک بھی اس سے ملاقات نہ ہونے پائی

ہم نہ کہتے تھے ہو جو مت عاشق
پائی دل اپنی کچھ سزا تو نے

ہوا جو کچھ کہ ہونا تھا کہیں کیا جی کو رو بیٹھے
بس اب اک ساتھ ہم دونوں جہاں سے ہاتھ دھو بیٹھے

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
غافل خدا کی یاد پہ مت بھول زینہار
قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے
میں وہ فتادہ ہوں کہ بغیر از فنا مجھے

اپنا ہی دل ہے یہ کہ جہاں تو سما سکے
اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے
اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے
نقش قدم کی طرح نہ کوئی اٹھا سکے

دشوار ہوتی ظالم تجکو بھی نیند آنی
گرچہ بیزار تو ہے پر اسے کچھ پیار بھی ہے
دل بھلا ایسے کو اے درد نہ کیونکر دیجے

لیکن سنی نہ تو نے ٹک بھی مری کہانی
ساتھ انکار کے پردے میں کچھ اقرار بھی ہے
ایک تو یار ہے اور تس پہ طرحدار بھی ہے

بہ کیا درد تجھ پر مصیبت پڑی ہے
کہ دن رات نالہ ہے اور آہ ہے
نہ ملئے یار سے تو دل کو کب آرام ہوتا ہے
وگر ملئے تو مشکل ہے کہ وہ بدنام ہوتا ہے

فرصتِ زندگی بہت کم ہے
مغتنم ہے یہ دید جو دم ہے

روندے ہے نقشِ پا کی طرح خلق یاں مجھے
اے عمرِ رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے
وحدت نے ہر طرف ترے جلوے دکھا دیئے
پردے تعینات کے جو تھے اٹھا دیئے
کوئی بھی دوا اپنے تئیں راس نہیں ہے
جز وصل سو ملنے کی بھی آس نہیں ہے

آتشِ عشق جی جلاتی ہے
یہ بلا جان ہی پہ آتی ہے

ان دنوں کچھ عجب ہے میرا حال
دیکھتا کچھ ہوں دھیان میں کچھ ہے
سلطنت پر نہیں ہے کچھ موقوف
جسکے ہاتھ آئے جام سو جم ہے
درد کا حال کچھ نہ پوچھو تم
وہی رونا ہے نت وہی غم ہے

درد

درد ۔ مسٹر عزیز الدین احمد صاحب بی۔ اے۔ رسالہ معیار میں اپنا کلام شائع کراتے ہیں اس سے زیادہ حال معلوم نہ ہوا شعر ملاحظہ ہوں:۔

اُن سے مل بیٹھنے کی دیر تھی جب مل بیٹھے
ساری بگڑی ہوئی باتوں کو بنا کر اٹھے
وہ جبیں سائی سے پایا جو مقدر میں نہ تھا
لوحِ قسمت کو ہم اس در سے مٹا کر اٹھے
دیکھو لے درد کہیں غم سے اچھا نہ کہیں
ایسے آئے تھے کہ ہنستوں کو رلا کر اٹھے

دردمند

دردمند ۔ فقیہ صاحب نام، وطن آپکا دکن تھا، لیکن تربیت شاہجہاں آباد میں پائی تھی اور میرزا جانجاناں مظہر کی خدمت میں آکر آدابِ فقر کی ماہیت حاصل کی اور مرید بھی ہوئے، چند مدت عظیم آباد میں رہ کر نواب غلام حسین خان اور نواب اعظم خاں کے صاحبزادے کی رفاقت میں گذرا وقات کی، بعد ازیں پھر دلی گئے اور کچھ عرصہ وہاں قیام کر کے مرشد آباد تشریف لیگئے۔ مرشد آباد آپ کا تشریف لیجانا نواب نوازش محمد خان شہامت جنگ نواب الہ وردی خان مہابت جنگ کے بھتیجے کی طلب کے باعث ہوا

سنہ ۱۲۰۶ھ میں مرشدآباد میں انتقال کیا۔ میرزا علی لطف نے اپنے تذکرہ میں انکا ذکر کیا ہے۔ یہ اشعار کا انتخاب ہے ایک ساقی نامہ اور دیوان انسے یادگار ہے۔

پڑی اُسکی خوبی کی ازبسکہ دھوم	لیا ہاتھ قدرت کا صانع نے چوم
ارے ساقی اے جان فصلِ بہار	یہی تھا ہمارا او تیرا قرار
ہمارے بسر رنے کی یہ فصل تھی	فراموش کرنے کی یہ فصل تھی
فلک چرخ مارے گا گر صد ہزار	نہ لاویگا مجھ سا کوئی روبکار
نظر تو کرو ٹک چمن کی طرف	شگوفے کو آیا ہے مستی سے کف
چمن میں بھرا ہے نشہ یاں تلک	کہ جاتی ہے نرگس کی گردن ڈھلک
ادا سے بہکنے کی تجھکو قسم	نشہ سے بہکنے کی تجھکو قسم
تجھے ناز مستی کی اپنے قسم	تجھے خود پرستی کی اپنی قسم
ارے بیوفا بے مروّت صنم	میں دیتا ہوں تجھکو قسم پر قسم
تجھے دختر رز کی حرمت کی سوں	تجھے مغبچوں کی شرافت کی سوں
تجھے وعدہ کر بھول جانیکی سوں	تجھے اپنی سوگند کھانے کی سوں
جو تو نے کیا مے کو مجھ پر حرام	تو اتنا تو کر ظالموں کے امام
کہ تو سرکشی سے نہ کر پائمال	مرے خون کو اپنے اوپر حلال
یقیں جانیو گر نہ ہوا ایک آن	تری مہربانی کا مجھکو گمان
تو صورت نہ پکڑے ہماری حیات	نکل جائے جی نا اُمیدی کے ساتھ

دردی منشی محفوظ علی باشندۂ بدایوں، جناب کشفی سے تلمذ تھا ایک شعر تذکرۂ قلمی مرسلۂ شفیقی قاضی محمد خلیل سے اخذ کرکے درج کیا جاتا ہے۔

جب ہوگی تو ہوگی زندگانی	اتنو ہمیں موت بھی نہیں ہے

درس منشی چمنی لال باشندۂ شاہجہانپور، منشی احسان علی احسان مرحوم شاعر نامور شاہجہانپوری کے تلامذہ میں سے تھے، بریلی کے مشاعرہ میں میں نے انھیں دیکھا تھا

۳۵، ۳۶ سال کی عمر اور یہ کلام کا نمونہ ہے ❊

ہزاروں ہیں کوئی بہتر کوئی لاکھوں میں اچھا ہے
مری آنکھوں میں لیکن تو خدائی بھر میں یکتا ہے

جہاں میں گو ہر اک بت کو مسیحائی کا دعویٰ ہے
کرے مردے کو جو زندہ اسی کا نام عیسیٰ ہے

مجھی سے ہے لگاوٹ بھی مجھی سے ہے تنفر بھی
مری نظروں میں رہتے ہیں مری آنکھوں سے پردا ہے

کسی کو ایک کی ہوگی یہاں دونوں سے ہے الفت
خدا کی یاد ہے دل میں بتوں کا سر میں سودا ہے

طبیعت کو جو خوش آئے وہی بہتر سے ہے بہتر
جو آنکھوں میں سما جائے وہی اچھے سے اچھا ہے

درویش

درویش میر شاہ علی دہلوی آپ کو میر نظام الدین فخر شعرا سے تلمذ تھا، شاہ اللہ دیا کی اولاد میں تھے آخر عمر میں شعر گوئی سے توبہ کرلی تھی۔ شاہ عالم ثانی کے آخر عہد میں بعالم ضعیفی انتقال کیا ❊

درویش کو مجنوں بھی لکھا کرتا تھا عرضی
اس مملکت عشق میں استاد سمجھ کر

ایک شب بیٹھے تھے جس گھر میں کبھی یار سے مل
روز روتے ہیں وہاں کے در و دیوار سے مل

درویش

درویش۔ درویش علی نام ولد خدا بخش سہارنپور، مہدی علی خاں صاحب زکی کے تلامذہ میں ایک آزاد، شوریدہ سر، موزوں طبع شخص تھے، اور دنیوی کاروبار سے حد درجہ تنفور، ریاست رامپور سے بصلۂ خدمت آبائی کچھ وظیفہ مقرر تھا اسی پر قناعت کرکے بیٹھک مکان مذکورہ کا دروازہ بند کرکے تنہائی میں بسر اوقات کرتے تھے اور میل جول سے حتی الوسع گریز کرتے تھے ۴۰ برس کے قریب گزرے چالیس سال کی عمر میں انتقال کیا، چند شعر بروقت ترتیب تذکرہ سہارنپور سے ایک مہربان نے بھیجے درج ذیل کیئے جاتے ہیں جن سے انکی خوش مذاقی کا کامل ثبوت ملتا ہے

پڑا جو سایۂ گیسو جھجک کے ساقی نے
یہ کہکے رکھدیا ساغر کہ ہے شراب میں سانپ

بند

ہو کے قرباں میں کہا یار سے ای کافر کیش
ہے یہ انصاف کہ ہیں وہ لب پہ ہوں آج رکے نیش

طاقت آہ بھی رکھتا نہیں اب یہ دلریش
ہنس دیا سنکے ستمگر نے کہا اے درویش

ایسا ہی ہوتا ہے جب دل کہیں آ جاتا ہے

درپردہ ستم ہم پہ وہ کر جاتے ہیں کیسے	گر کیجے گلہ صاف مکر جاتے ہیں کیسے
جب ہم سے موافق نہ ہو تقدیر ہماری	کیا عقدہ کشائی کرے تدبیر ہماری

دریا

دریا۔ پنڈت رتن ناتھ دریا خلف پنڈت امرناتھ شعلہ جو سبحان علی خان کمبو کے دیوان تھے۔ باشندہ لکھنؤ اور شاگرد میر اوسط علی رشک ہیں، زبان فارسی اور دری نثر کی تحصیل عالمانہ درجے کی تھی اور بڑے زبردست ادیب اور محقق زبان تھے دس بارہ برس ہوئے پیرانہ سالی میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا، یہ چند شعر نتائج افکار کے ہاتھ آئے نذر کا درج تذکرہ کئے گئے ؛

ہے گوشِ گل کی یا کہ چراغ قمر کی لو	اللہ جانے دلکو لگی تھی کدھر کی لو
دریادلوں سے ڈرتے ہیں روشن ضمیر بھی	تھرائے کیوں نہ پانی میں شمع قمر کی لو
ذروانِ زخم پانی چراتے ہیں کیوں عبث	کم ہووےگی نہ آتشِ داغ جگر کی لو
حریص کہتے ہیں کسے خواہش دنیا کیا ہے	بے اجازت نہ مرے گھر میں ہوا بھی آئے

دریا

دریا منشی سید محمد عباس ہیڈ کلرک کچہری کورٹ آف وارڈز متھرا، آجکل کے شعرا میں ہیں باوجود مکرر تحریروں کے حالات ہم نہ پہنچے ناچار کچھ اشعار درج کرنے پر اکتفا کیا گیا۔

کعبہ و دیر میں سنتے تھے مکان ہے انکا	پائی ان سب سے مگر منزلِ جانانہ جدا
دیکھئے کھینچتا ہے کون مجھے اے دریا	درِ مسجد ہے جدا اور درِ میخانہ جدا
میں تو اس طرز اس انداز کا دیوانہ ہوں	زلف بکھری ہے الگ چال ہے مستانہ جدا
اللہ اللہ یہ ہے اعجازِ خیالِ روی دوست	آپ اپنے پیرہن سے آرہی ہے بوئی دوست
ای خوشا قسمت نکلنے کو ہے اب ارمان قتل	حلق پر خنجر ہے سینہ ہے تہ زانوی دوست
بن گئے تصویرِ حیرت چشم حیراں دیکھ کر	خود پریشاں ہوگئے مجکو پریشاں دیکھکر
تو جفائیں اور کرلے کچھ دنوں پر میرے بعد	ظلم سہنے کو ترے ای آسمان کوئی نہیں

ہو بھلا تیرا شب فرقت امین غم ہے تو	جز ترے دم کے ہمارا مہرباں کوئی نہیں
ناتواں پاکر مجھے سب قافلہ راہی ہوا	ساتھ دے بیکس کا ایسا کارواں کوئی نہیں
حشر میں ہوگا مزا جب میں کہونگا اُن سے	کھینچئے اب کچھ یہ ستم دیدہ بھی فریاد کرے
دل میں آنکھوں میں تجھے جلوہ نما دیکھا ہے	پھر بھی یہ شوق ہے کہتا ہوں کہاں دیکھا ہے
نہ کلیسا پہ ہی موقوف نہ کچھ کعبہ پر	ہر جگہ ہمنے تجھے جانِ جہاں دیکھا ہے

دقیق

دقیق - جناب میر واجد حسین صاحب وکیل ہائی کورٹ سرکار عالی نظام دکن شاید حضرت داغ سے اصلاح لیا کرتے تھے ۱۹۰۰ء کے مطبوعہ رسالوں سے کلام کا انتخاب حاضر ہے

حسرت ہی یہی زانوئے دلدار پہ نکلے	للہ ٹھہر جا کہیں اے جانِ حزیں اور
بگڑے ہی سدا بنتے ہیں سفاک کے تیور	دل لیکچا رہتا ہی مگر درپئے کیں اور
آلودۂ خوں ہو نہ کہیں آپکا دامن	جلدی سے لگا دیجئے اک ہاتھ کہیں اور
گھبرائی ہوئی باتوں سے ہوتا ہے ظاہر	جاتے تھے کہیں اور چلے آئے کہیں اور
یہ ظرف ہمارا ہے کہ ہم کچھ نہیں کہتے	ورنہ تری باتوں سے تو ہی دلکو یقیں اور

دل

دل - شیخ محمد عابد متوطنِ عظیم آباد، اپنے زمانہ کے بے مثل اور بے نظیر عالم تھے، شیخ محمد روشن جوشش تخلص آپکے بڑے بھائی مشہور شاعر تھے، صاحب سراپا سخن کا قول ہے کہ آپ جسونت رائے ناگر کی اولاد میں تھے، غرضکہ آپ سنجیدہ اطوار، حمیدہ خصال اور طریقۂ یکرنگی میں بے مثل سمجھے جاتے تھے، یہ آپکے اشعار ہیں +

تیری زلفوں سے بہت دن ہی تقصیر ہوئی	نقد جاں لیجئے حاضر ہے گنہگاری دل
نالے ہی سدا بھر بھر دن عمر کے بھرتے ہیں	ہیں نزع میں ہم تجھ بن جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
جوں آئینہ یہ ستم رسیدہ	رہتا ہے مدام آب دیدہ
نہ اُٹھا سے درپہ جو درباں نے آستیں پکڑی	برنگِ نقشِ قدم ہمنے بھی زمیں پکڑی

دل

دل - منشی بینی پرشاد دل کایستھ متوطنِ عظیم آباد پٹنہ - مدت ہوئی کہ انتقال کیا - کچھ

متفرق کلام دستیاب ہوا اُس کا انتخاب درج کیا جاتا ہے۔

پردہ اُٹھا کے تو نے ادھر کو گذر کیا ۔۔۔ عالم کے دِل میں تیری محبت نے گھر کیا
نالہ و، شور و، فغاں، بیطاقتی ہمراہ ہیں ۔۔۔ ہمتو کوچے سے ترے نکلے بڑے سامان لئے
اور روٹھ کے ہمسے جانیوالے ۔۔۔ مت رُوٹھ ہمیں گلے لگالے
دل چاہتا ہے پو لیئے ہرگز نہ یار سے ۔۔۔ پر بس نہیں چلے ہے دلِ بیقرار سے

دل ۔ زور آور خاں باشندۂ علی گڈھ، تذکرہ مرسلہ قاضی محمد خلیل سے ایک شعر قابلِ انتخاب نظر آیا۔ درج ذیل ہے، حال باوجود تلاش دستیاب نہوا۔

ساقی نے جو پلایا مجھے مَیں نے پی لیا ۔۔۔ واعظ مجھے خبر ہے حرام و حلال کی

دل ۔ عالیجناب والا خطاب اشرف الحکما رنواب لقمان الدولہ خلاطون جنگ محمد حیدرخان دِل طبیب خاص مقرب باختصاص اعلحضرت نظام الملک آصفجاہ والی دکن حضرت فصیح الملک بہادر داغ دہلوی کے تلمیذ رشید ہیں، انگریزی کا علم بھی اچھا ہے ڈاکٹری وجراحی سے اچھی طرح ماہر ہیں، خاص حیدرآباد کے باشندے ہیں، عمر ۵۰ برس کے قریب اور سٹاف سرجن ہیں، انکے والد حکیم محمد اشرف صاحب حیدرآباد کے نامی طبیبوں میں تھے، مثنوی کا وعظ بہت اچھا بیان کرتے ہیں، صوفی مشرب ہیں، شعر وسخن کا بھی شوق ہے اور اس میں نواب فصیح الملک داغ مرحوم سے فیض پایا ہے۔

مثلِ نقشِ پا۔ برباد کیوں نشاں ہوتا ۔۔۔ ہم نہ خاک میں ملتے، تو جو مہرباں ہوتا
افسانۂ گل قصۂ بلبل نہ سُنا اَور ۔۔۔ اٹھکھیلیاں کچھ اپنی دکھا باد صبا اَور
ای شعلۂ سوزانِ دروں جی نہ جلا اَور ۔۔۔ ای رنج وغم و دردِ نہاں بس نہ ستا اَور
اے گردنِ تسلیم و رضا سر کو جھکا اَور ۔۔۔ آے تیغِ ستمگار پھر ایک وار لگا اَور
اُس شوخ کی مہندی کا ہوا رنگ دوبالا ۔۔۔ خونِ دلِ عشاق جو ہاتھوں میں ملا اَور
ای خضر نہ ہادی ہو مرے راہ لو اپنی ۔۔۔ اس منزلِ عشاق کا ہے راہ نما اَور

ای ہمتِ مردانہ قدم میں نہو لغزش ... ای ابروئے خمدار پھر اک تیغ نگاہ اور
مجروح ہوا، خستہ ہوا، پس گیا، آخر ... دل اس سے زیادہ تھا سزاوار سزا اور

مسیحا کلمہ گو جسکے ہیں وہ گفتار کیسی ہے ... قیامت جسکی وارفتہ ہے، وہ رفتار کیسی ہے
شہیدِ غمزہ و ناز و ادا واقف نہ تھا پہلے ... کہ خنجر کیا ہے، کیسا تیر ہے، تلوار کیسی ہے
پریشاں زلف وا بندِ قبا مخمور ہیں آنکھیں ... کہاں سے آئے ہو، لغزش دمِ رفتار کیسی ہے
بھروسے تیری رحمت کے، سہارے تیری بخشش کے ... میرے جرمِ گنہ کی دھوم اے غفار کیسی ہے
تمہاری نرگسِ بیمار تو عینِ شفا ٹھیری ... مسیحائی کا دعوی اور خود بیمار کیسی ہے
سنبھل جاؤ کہیں اے حضرتِ دل راہ پر آؤ ... یہ رسوائی سرِ ہر کوچہ و بازار کیسی ہے

تڑپتے ہوئے چھوڑ کر غمزدوں کو ... کس آرام سے ہو گئے سونے والے
غم و، حسرت و، رنج، یاس و، تمنا ... مری لاش پر رو گئے رونے والے
قرار و توانائی، تاب و، طاقت ... جدا ہم سے سب ہو گئے ہونیوالے
دل سے وصلِ جاناں کی آرزو نہیں جاتی ... خاک ہو گئے لیکن جستجو نہیں جاتی

دل

دل - حکیم ضمیر حسن خان شاہجہانپوری - قوم کے پٹھان اور شاہ قاسم سلیمان کی اولاد میں ہیں، اگرچہ امیر مینائی کے شاگرد ہیں مگر خود اساتذۂ دہلی کے طرزِ تغزل کے پیرو ہیں جس میں درد و اثر طرزِ بیان کی نفاست کے ساتھ شاعری کی جان سمجھے جاتے ہیں۔ عربی فارسی کی استعداد معقول ہے، آجکل طبابت کا مشغلہ رہتا ہے اور کچھ زمینداری بھی ہے، دلی جذبات کے اظہار کو شاعری کا حسن سمجھتے ہیں ناول "دردِ دل" و "دلسوز" آپکی تصنیف سے ہیں نظرِ ثانی کے وقت بھی کچھ کلام موصول ہوا وہ بھی سابقہ انتخاب میں شامل کرکے درجِ تذکرہ کیا گیا۔ کلام کے ملاحظہ سے صاف مترشح ہے کہ فی الواقع انکا دعوی سچا ہے۔ شاعری کا سچا مذاق انکے ہر ایک شعر سے ظاہر ہے، اور کلام میں دلاویزی کے ساتھ بندش کی چستی، الفاظ کی برجستگی، خیالات کی نفاست اور بلندی قابلِ ستایش ہے،

بظاہر یہیں تو کہیں حضرت امیر کے تصرف کا نشان انکے کلام میں نظر نہیں آتا۔ غالباً ذاتی مطالعہ دواوین اساتذہ، فطری ذکاوت اور قابلیت انکے مذاقِ شاعری کے ممد و معاون ہوئے، ہر شعر پُر لطف اور با مزا سنجیدگی اور متانت سے معمور ہے۔

ہم اور سنگِ در ہے کسی دلنواز کا — اللہ رے عروج جبینِ نیاز کا
کیا کیا کیے سلوک پتنگوں سے شمع نے — ایک ڈھیر تھا سحر کو شہیدانِ ناز کا
جس حال میں پڑا ہوں یونہیں کاش چھوڑ دے — مجھ پر بڑا کرم ہو میرے چارہ ساز کا
عاشق کی آہ برقِ تجلی سے کم نہیں — پردہ کہیں الٹ نہ دے اخفائے راز کا
جب دل میں دردِ عشق اٹھا ہم اچھل پڑے — سمجھے کہ یہ کرم ہے کسی دلنواز کا
پہنچے تڑپ کے حضرتِ دل کوئے یار تک — دردِ جگر نے کام کیا چارہ ساز کا

بیٹھا ہے یہاں دل کو دو عالم سے اٹھا کے — اب در سے ترے عاشقِ مضطر نہ اٹھے گا

زور پر ہے ترا ابھرا ہوا جوبن کیسا — دب گیا اٹھتی جوانی سے لڑکپن کیسا
پردۂ چشم میں چھپی ہوئی بیٹھی ہے حیا — کھیلتا ہے تری شوخی سے لڑکپن کیسا
اپنی قسمت ہے جو برگشتہ تو ای حضرتِ دل — دوست بھی ہمکو برا کہتے ہیں دشمن کیسا

کیا کہوں کس آرزو کا خون ہو کر رہ گیا — دل کی دل ہی میں رہی جب کھنچ کے خنجر رہ گیا
نارسائی کا سبب کیا ہے؟ یہی شوقِ طلب — بڑھ گئے ہم اسقدر آگے کہ رہبر رہ گیا
منزلِ مقصود پر پہنچا وہی آشفتہ حال — آستانِ یار پر جو کھا کے ٹھوکر رہ گیا
دل بھی ہٹ جاتا تمنائیں اگر ہٹنے کو تھیں — رہنے والا کون ہے کسکے لئے گھر رہ گیا

جی ڈوب گیا جب یہ حقیقت ہوئی ظاہر — جس بحر میں کشتی ہے وہ ساحل نہیں رکھتا

کہوں کیا حال ای ہمدم شبِ غم کی مصیبت کا — یہ عالم تھا کہ اب نکلا، نہ نکلا پھر بھی دم میرا
مگر جمعیتِ خاطر ہے آرائش سے وابستہ — کھلے جب انکے گیسو کھل گیا سارا بھرم میرا

شامِ شبِ جدائی جو تھا قلق فزا تھا — تسکین دینے والا اک دردِ لا دوا تھا

مقتل میں رنگ لائی آخر میری خموشی
محمل نشیں کے دلمیں چبھتے تھے خارِ صحرا

ہر قطرہ خونِ دل کا اک شرح مدعا تھا
پیش نگاہ جبتک قیس برہنہ پا تھا

رنگ لایا ہے یہ ضبطِ الفتِ گیسوئے دوست
رہنما کی کیا ضرورت عشق کامل چاہیئے
بیخودی میں کچھ نہیں معلوم کس عالم میں ہوں
طالع بیدار کیا کہنا خوشی ہے اور ہم
خیر کرنا آج یارب کیوں ہے دلکو اضطراب
تھک کے جب بیٹھے تو یہ کہکر تلاشِ دوست میں
یوں مٹے گا رنج فرقت کاٹ لیں ہم خود گلا

آخر اپنے پیرہن سے چھوٹ نکلی بوئے دوست
دل جہاں تڑپے سمجھ لینا یہی ہے کوئے دوست
ڈھونڈتی پھرتی ہے مجھکو نکہتِ گیسوئے دوست
صبح کو اُٹھکر ہمیشہ دیکھتے ہیں روئے دوست
گو وہی ہم ہیں وہی گھر ہے وہی پہلوئے دوست
اے دلِ حسرت زدہ وہ سامنے ہے کوئے دوست
حضرتِ دل کون ہو منت کشِ بازوئے دوست

تن بر سر زمیں ہے دماغ آسمان پر
اقرار وصل اور پھر اُنکی زبان پر
اقرار وصل کرکے مکرنے سے فائدہ
ساقی کی چشم مست نے بیہوش کر دیا
وعدہ خلاف، عہد شکن کون وہ کہ ہم
کمسن ہیں کیا ہوا اُنکو میری حسرت نکالنی
ساقی ہمیں کو تشنہ لبی کا گلہ رہا
اُس بت کے بام تک جو پہنچتے تو لطف تھا
اے دل یہ آپ ہی کا جگر ہے کہ عشق میں

یعنی سر نیاز ہے اُس آستان پر
سو جان سے نثار ہیں اپنے بیان پر
ہاں ہاں وہی کہو جو ابھی تھا زبان پر
لینا خباب شیخ چلے آسمان پر
اچھا یہ فیصلہ ہے انھیں کی زبان پر
انکارِ وصل کھیل رہا ہے زبان پر
سب کچھ ہے اور کچھ نہیں تیری زبان پر
نالے مرے گئے تو کہاں آسمان پر
صدمے ہزار جھیل لیئے ایک جان پر

اُنکی آرائش سے رنگ بیخودی پائینگے ہم
اُسکا زانو زیر سر پھر چارہ سازی کا خیال
مجکو یہ غم سر نہیں تو عشق کا سودا نہیں

آئینہ دیکھیں گے وہ تصویر بن جائینگے ہم
ہوش میں آ چارہ گر اب ہوش میں آئینگے ہم
اُنکو یہ افسوس اب کسکی قسم کھائینگے ہم

کہتے ہیں چھپایا ہے مرا ناوکِ مژگاں | دل دیکھ کے وہ زخم جگر دیکھ رہے ہیں
دیکھو فریب زخمی تیغ نگاہ کا | قاتل سے کہہ رہا ہے کہ میں نیم جاں نہیں

مجھ سے کہاں چھپائیں گے دشمن کی چاہ کو | جو بات اُنکے دل میں ہے میری نظر میں ہے
کیا دیکھیں جامِ مے کی طرف ہم سے بادہ نوش | ساقی کی چشمِ مست ہماری نظر میں ہے

تنفر تجھکو کیا ہے مے سے زاہد | ہمیں بھی ایسی ہی نفرت کبھی تھی
ملا کے آنکھ جو اُس بُت سے گفتگو کرتے | جنابِ خضر مسیحا کی جستجو کرتے
خرامِ ناز کا انداز یوں دکھانا تھا | کہ دل کے داغ بھی مٹنے کی آرزو کرتے
اُسے قلق ہے مرا حالِ غیر سن سُن کر | یہ وقت تھا کہ کوئی فکر چارہ جو کرتے
نہیں علاج کے قابل مریضِ دردِ فراق | یہ سچ ہے مگر اپنی ہی چارہ جو کرتے
بڑے ہیں نیک بڑے پاکباز حضرتِ دل | وہ جا رہے ہیں حسینوں سے گفتگو کرتے

خون کی ہر بوند میں جوش آجکل اک دل کا ہے | اس بھروسہ پر ارادہ کوچۂ قاتل کا ہے
پاس رہکر یہ تکلف ساتھ رہکر یہ حجاب | میرے اُنکے فاصلہ گویا کئی منزل کا ہے
حسرتِ وصل اب کہاں باقی ہے بس یہ آرزو | کاش وہ کہدیں کہ تو مختار اپنے دل کا ہے
پیچھے پیچھے آرہی ہے ہائے ظالم کی صدا | آگے آگے اک جنازہ حسرتِ بسمل کا ہے
حضرتِ دل اک نیا سر ہر قدم پر چاہیئے | تشنۂ خوں ذرہ ذرہ کوچۂ قاتل کا ہے

دل - سید احمد اللہ حیدرآبادی مسکن - مولانا بیدل سہارنپوری کے شاگرد ہیں ۱۸۹۵ء میں حیدرآباد کے مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے اور اُس زمانہ میں نومشق تھے - یہ کلام کا انتخاب ہے :-

وہ سر نہیں جس میں کہ ہو سودا کسی کا | وہ دل نہیں جو دل نہ ہو دیوانہ کسی کا
جب وقتِ قتل کہا جلوہ دکھا دو تو کہا | وعدۂ قتل تھا کچھ وعدۂ دیدار نہ تھا
خنجر چلا کے حلق پہ کہتے ہیں ناز سے | دیکھا نتیجہ تم نے حسینوں کی چاہ کا

عجب ہے یہ ہمارا چلبلا دِل
جسے دیکھا اُسی کا ہوگیا دل

مست و مدہوش و دیوانہ تمھارے پیارے
پھرتے ہیں دشت میں کہتے ہوئے پیارے پیارے
قتل کیوں کرتا ہے بیجرم و خطا تو ہمکو
ہم تو پہلے ہی سے ہیں عشق کے مارے پیارے

دل
دل۔ بابو سید احمد دل جعفری ساکن لاہور، کمالِ دہلی سے کلام نقل ہوا منشی وجاہت حسین وجاہت کے شاگرد ہیں +

عمر گذری ہے آہ وزاری میں
اُسکے دِل پر اثر ذرا نہ ہوا
چاہنے والے تیرے ہیں لاکھوں
سچ یہ ہے دل سا دوسرا نہ ہوا

تعریف کیا کروں تری چشم سیاہ کی
بے چین کردیا اُسے جسپر نگاہ کی

دل
دل منشی محمد علی حسین خاں دل، نوجوان، خوشخو، استعداد علم معقول، نوشت وخواند میں مایقری محاورت رکھتے ہیں، حضرت ظہیر کے شاگرد رشید، صاحبزادہ احمد سعید خاں عاشق کے شاگرد ہیں۔ یہ چند شعر اُنکے طبعزاد ہیں۔

دشمن سے ملو شوق سے اچھا کوئی دن اَور
تم دیکھو ذرا اس کا تماشا کوئی دن اَور
بیماری اُلفت سے ہیں ناحق ہوا اچھا
آتا تو عیادت کو مسیحا کوئی دن اور
روکا ہے دِل زار کو یہ دیکے تسلی
کم بخت ذرا ٹھہر خدارا کوئی دن اور
وہ غیر تھا چھوڑا اُسے اچھا کیا لیکن
اس دل پہ تو رکھنا تھا اجارہ کوئی دن اَور

دل
دل منشی سید علی حیدر کنتوری۔ لکھنؤ میں بھی اکثر رہنے کا اتفاق ہوتا ہے نوجوان شخص ہیں آجکل کے موزوں طبع خوش فکر کہنے والوں میں ہیں اور معیار کی کمیٹی کی ہم طرح غزلیں کہتے ہیں جو کلام بروقت نظرثانی ہاتھ لگا اُس کا انتخاب تحریر میں آیا +

سب کہتے ہیں گو کعبہ کو یہ خانۂ حق ہے
اللہ پہ اے دل کوئی منزل نہیں رکھتا
حشر کے ہو جیسے منظور رہے دیدار ترا
کسکو منظور رہے انصاف کا خواہاں ہونا
جوشِ وحشت کی خبر دیتا ہے دیوانوں کو
آپ سے آپ مرا چاک گریباں ہونا

سنبھل اے دل نہ وصلِ یار کی شادی سے مرجانا	بُرا ہوتا ہے ہر اک بات کا حد سے گذر جانا
تری فرقت کا رنج و غم اُٹھایا تا دمِ آخر	نشاطِ وصل کیا شئے ہے نہ ہنسے عمر بھر جانا
جس کے سبب یگانہ و بیگانہ چھٹ گیا۔	افسوس پھر بھی مجھ سے وہ جانانہ چھٹ گیا
رہتا ہے وحشی ترا اُس وادیئے پرہول میں	رُوحِ مجنوں کانپتی ہے جو بیاباں دیکھ کر
اُن پہ بھی جنگل کی تصویریں نظر آنے لگیں	یہ بڑھی وحشت در و دیوارِ زنداں دیکھ کر
ہونگے محو شادی و غم وہ ہماری لاش پر	ہنستے جائینگے کف افسوس ملتے جائینگے

دِل — **دل**۔ جناب مرزا بہادر محمد جعفر علی خاں خلف اکبر نواب مرزا محمد عباس علی خاں بہادر جگر مرحوم سابق ڈپٹی کلکٹر و رئیس اعظم و جاگیردار لکھنؤ آبائی ریاست کے علاوہ فن سخن بھی میراث ملا ہے، تیس پینتیس ۳۵ برس کی عمر اور ذکی و طباع نوجوان ہیں۔ ہنگام ترتیب تذکرہ حالات اور کلام منگائے مگر جواب آنیکے باوصف مطلب برآری نہیں ہوئی

تیرِ نگاہِ ناز ہوئے دونوں کارگر	اک دل میں چُبھ گیا ہے مرے اک جگر میں ہے
صبحِ شبِ وصال ہے یا صبحِ حشر ہے	ای دل کچھ آج اور ہی رنگ اس سحر میں ہے

دل — **دل**۔ خواجہ دل محمد ایم اے ابن خواجہ نظام الدین مولد و مسکن لاہور تاریخ ولادت ۹ فروری ۱۸۷۸ء علوم عربیہ اور تعلیم رائج الوقت حاصل کر کے ایک کامیاب طالبعلمانہ زندگی کے بعد ۱۹۰۰ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے امتحان ایم اے مضمون ریاضیات میں پاس کیا اور اُس وقت سے اسلامیہ کالج لاہور میں سینیر پروفیسر ریاضیات کی خدمات انجام دیتے ہیں آپ کی طبیعت کو ادب اور فلسفہ کی طرف شروع ہی سے ایک لگاؤ ہے، اور شعر و اشعار کی طرف میلان لڑکپن کے زمانے سے ہی، غزل بہت کم لکھتے ہیں، نیچرل مضامین اور قومی یا طلبی نظمیں زیادہ تر لکھی ہیں، شعر و اشعار کے متعلق کسی خاص استاد سے تلمذ اختیار نہیں کیا۔ بلکہ زورِ طبیعت سے خود ہی جو آیا لکھا ہے۔ نمونۃً تھوڑا سا کلام ہدیۂ ناظرین کرام ہے

لذتِ دیدار سے مجلس ہے سب سرشار آج	عکس مے سے کم نہیں ہے عکسِ روئے یار آج

نوکِ خامہ شوق سے منقارِ بلبل بن گئی ۔ ہے صریرِ خامہ گرمِ لذتِ گفتار آج

نرگسِ مخمور کا ساغر بنانا چاہیئے ۔ تا کہ محفل ہووے مستِ شربتِ دیدار آج

دیدۂ احباب روشن ہیں ستاروں کی طرح ۔ ہوگئی ہے چشمِ اعدا کی مگر بیمار آج

کیا عجب فرصت کے باعث گرمِ رقصِ ناز ہو ۔ لوئی گردونگی صورت چرخِ کج رفتار آج

گو نہاں آنکھوں سے وہ دو تین سالوں تک رہے ۔ رل گیا آخر کو خط دیدۂ آخر کا آج

حمد باری

وہ خالق سزاوار تحمید ہے ۔ صریرِ قلم جسکی تمجید ہے

قلم سے ہوئے جسکے سب آشکار ۔ جہاں کے نگارش کدہ کی بہار

اُسی سے عیاں نقش سارے ہوئے ۔ جو چھڑکا قلم تو ستارے ہوئے

یہ سورج دیا جو خدائی کا ہے ۔ یہ دھبا سا اک روشنائی کا ہے

یہ جاذب کا کاغذ ہے یا آسماں ۔ یہ مشقِ شکستہ ہے یا کہکشاں

یہ قوسِ قزح جو نمودار ہے ۔ یہ آدھا سا اک خطِ پرکار ہے

نہ کیوں اُسکے کاموں میں ہو عقل دنگ ۔ ہیں اک خط کے اندر بھرے ہفت رنگ

درخشاں نہیں چرخ پر ماہتاب ۔ کھلی سورۂ نور کی ہے کتاب

شعاعیں ہیں مسطر لگائے ہوئے ۔ طلا کار جدول بنائے ہوئے

کریں تا کہ قدرت کو اُسکی رقم ۔ ہیں پتے ورق اور شاخیں قلم

نظر کیجیئے سطحِ تالاب پر ۔ لکھی نظم ہے صفحۂ آب پر

جو جاری کوئی باغ میں نہر ہے ۔ تو اک شعر گویا ہر اک لہر ہے

سُنو شورِ قمری فصاحت ہے یہ ۔ قدِ سرو دیکھو بلاغت ہے یہ

جو نور اُسنے چشمِ بشر میں دیا ۔ بُتِ خاک کو چرخ پیما کیا

عجب اُسکی ہر شے بنائی ہوئی ۔ ہے تل میں خدائی سمائی ہوئی

ترے مُنہ میں باقی ہے جبتک زبان ۔ کر اے دل تو تحمید خلاقِ جان

جو فقرا اوروں پہ ہو کچھ نذرِ نوروز کا کریں ٭ چاہیئے بلبل کو پہناویں گلوں کا ہار آج ٭

اے کارواں وہ وقتِ طلوعِ سحر ہوا
طیار آفتاب اٹھائے سپر ہوا
پرچم بلند صبح کا با کر و فر ہوا
کیا شہسوار تیز عناں ہمسفر ہوا

ہمراہِ آفتاب درخشاں بڑھے چلو!

ہمت ہو جنکے پاس کریں صبر کس طرح
ہو طبعِ آتشیں پہ روا جبر کس طرح
اس رہگذر میں کھو دیں وہ قبر کس طرح
اُٹھیں نہ ابھرے تو بنے ابر کس طرح

جوں دودِ آب اُٹھ کے مرجاں بڑھے چلو!

چرخ و نجوم و مشتری و زہرہ و قمر
اپنی زمیں سمجھتے تھے ساکن جسے بشر
سب ہی اپنی راہ میں بڑھتے ہیں سال بھر
کہتے ہیں وہ بھی چلتی ہے اپنے محیط پر

تم بھی بشکلِ گیتیِ دوراں بڑھے چلو!

نور جہاں کے مرقد پر جو راوی کے کنارے کس مپرسی کی حالت میں پڑا ہے دو حرف عبرت کہے ہیں

ہاں اے لبِ راوی بتا۔ کچھ رفتگاں کا ماجرا
ہے اب کہاں نور جہاں حور جہاں عصمت کی جان
کل تجھ پہ جن کا راج تھا۔ انجام انکا کیا ہوا؟
وہ بلبلِ شیریں زباں۔ وہ قمریِ ہندوستاں

تیرے کنارے ہی پڑا ٹوٹا سا جبکا آشیاں
عبرت نشاں، عبرت نشاں،

شوکت تھی جسکی پاسباں۔ چاکر سے تھے جاہ و حشم
خیل و خدم ناز و نعم، رخت و خیم طبل و علم
تھی بحر و بر کی سب سپہ۔ حاضر لیے تیغ دو دم
افسوس رکھے رہ گئے، خود چلدیے سوئے عدم

عالم میں ہے کسکو بقا؟ نامِ بقا کسنے لیا
قصرِ فنا ہے آسماں

آئی کہاں سے موت تو، ایوانِ شاہی میں بھلا
ہاں پر تری پرواز کا، آتا نہیں اُن کو نظر
اُڑ جاتی ہے جیسے مگس، گل سے عسل کو کھینچ کر
کیا پاسباں حاضر نہ تھے، جو روکتے سیر گذر
یوں کھینچ کر لیجاتی ہے، انساں سے اسکی روح کو
یا ہنس ہو جیسے ہوا، دلدل سے ریشہ کھینچ کر

رہتا ہے باقی بر زمیں۔ افسردہ گل بے رنگ بیں
بے جان جسمِ ناتواں

تضحیک چرخ پر جفا، دیکھو عیاں ہے برملا
ہے جس جگہ وہ مہ لقا، جالا ہے مکڑی نے بنا

تا سائباں کا کام دے، بیگم کے شاہی تاج پر — دو چار باقی پیڑ ہیں، یا ہٹیوں کے ڈھیر ہیں
یا چر رہی ہیں بکریاں، یا بوم کا ہے آشیاں — شاہی شکوہ و عز و شاں، اُڑ جاتے ہیں شبنم صفت

باقی نہیں رہنا نشاں

دنیا نے گو چھوڑا مگر، خدمت میں ہے نیچر ابھی — دیتی ہے پہرا رات بھر، تربت پہ اُسکی چاندنی
وہ بیگم زہرہ جبیں، مرقد سے باہر آن کر — اور سیکے مشعل ماہ کی، جاتی ہے جانب شاہ کی
حالت نہ پوچھو راہ کی، آنسو نکلتے جاتے ہیں — اور پھول کھلتے جاتے ہیں، جب بچھڑے ملتے جاتے ہیں

ہوتا غضب کا ہے سماں

اور جب اندھیری رات ہو، تربت ہی سکو بھاتی ہے — شبنم کہیں آ جاتی ہے، موتی کا سہرا لاتی ہے
دیتا ہے جگنو ٹمٹما، گورِ غریباں پر دیا — شاخیں بڑھا کر ہاتھ کو، پڑھتی ہیں گویا فاتحہ
پتّے سِسَک ہی جاتے ہیں، آتی ہے جب ٹھنڈی ہوا — حیرت کا بھی دھڑکے ہے دل، ہاں دیکھ کر ایسا سماں
عبرت نگاہی چاہیئے، انجام ہے یہ بیگماں — گو اس میں ہو شاہِ جہاں یا بادشاہِ این و آں

ہوتا ہے تربت میں نہاں

صریرِ کلک سے کیوں کر ادا ہو داستاں میری — ہر نے لائے کہاں سے دردِ دل میرا زباں میری
ہیں آوازِ جرس ہوں ہر گھڑی فریاد کرتا ہوں — جگا دے کارواں کو خواب سے شاید فغاں میری
تغافلہائے ساقی کا گلہ کیجے تو کس منہ سے — گرا دی ایک لغزش سے شرابِ ارغواں میری
میں حسنِ معنیِ صرفِ انالحق کی نزاکت ہوں — نہیں سمجھا نہیں سمجھا حقیقت کو جہاں میری
سبق لیتا ہوں اُستادِ ازل سے میں فصاحت کا — نوا سے طائر سدرہ ہے یا طرزِ بیاں میری
میں حیرت بھی ہوں آئینہ بھی ہوں محو تماشا بھی — شرر بھی، سوزِ دل بھی طور بھی برقِ تجلی بھی

رِدل

دل۔ شیخ ممتاز علی ابن شیخ شجاعت علی ضلع بارہ بنکی کچھ دن آپکو حضرت اسیر سے تلمذ رہا ہی پھر منشی فضل رسول خان واسطی بواسطہ جناب قدر بلگرامی سے مشورہ کرتے رہے تعلقہ داری معقول ہی امیرانہ بسر کرتے ہیں سنہ ۱۹۰۶ء میں ۴۵ برس کی عمر تھی

الاماں اسکی ڈھٹائی کچھ کہی جاتی نہیں — چاہنے والوں سے بھی وہ آنکھ شرماتی نہیں

عطر آگیں آپکی پوشاک سے گلزار میں	نکہتِ گل ہوش میں دو دوپہر آتی نہیں
چشم بددور آپ کی حاضر جوابی کی ہے دھوم	کونسی پھبتی ہے وہ ایسی کہ چھا جاتی نہیں
سُرخ غصہ سے ہے چہرہ کہہ رہے ہیں جوش سے	چومنے تلووں کو میرے کیوں حنا آتی نہیں
ہوش میں کیا خاک آئیں آپکے آشفتہ دل	اب صبا بھی بوئے زلفِ عنبریں لاتی نہیں

دل

دل منشی محمد حسین قصبہ بسواں ضلع سیتاپور کے باشندے اور جگر کے شاگرد ہیں گلچیں سنہ ۹۹ھ سے کلام منتخب ہوا۔

کوئی کیونکر سنبھالے اِس دلِ بیتاب کو جس میں	کھٹک ہو، درد ہو، ایذا ہو، بیتابی ہو حسرت ہو
ہماری خاک شاید تیرے دامن تک پہنچ جائے	بس ارمانِ تمنا ہے ترے کوچہ میں تربت ہو
چھڑکدے میرے زخموں پر نمک ہنس ہنس کے او قاتل	وہ راحت ہے مجھے جو تیرے ہاتھوں سے اذیت ہو
وہ پہلو میں ہے تو بھی دل ہے بے چین	نہ ہوں پہلو میں تو کیونکر بسر ہو
کسی کے غمزہ و ناز و ادا پر	تصدق جان ہو صدقے جگر ہو

دلاور

دلاور منشی سید دلاور علی ولد سید قاسم علی شاگرد حضرت داغ ـ ترتیب تذکرہ انتخاب یادگار امیر مینائی کے ہنگام میں ریاستِ رامپور میں ملازم تھے اور بڑے ذکی الطبع اور فہیم کہنے والے تھے سنہ ۱۲۳۸ھ سال ولادت ہے، مذاق سخن سلیم تھا سنہ ۱۲۹۰ھ میں ۳۵ سال کی عمر تھی۔ باوجود کوشش کے حالات معلوم نہ ہوسکے نہ کلام ہی ملا۔

کی جو شکایت تو یہ پایا جواب	آتے ہی کیوں ہو جو ستاتے ہیں ہم
قبر پر فاتحہ کے حیلے سے	گالیاں کچھ سنانے آتے ہیں
عبث بیتاب ہو کر پیار ہوتے ہیں کہا اے دل	جگایا کیا مجھے تو نے اٹھایا شور محشر کو
تم دور رہو اور یہ بے چین نہ ہو جائے	اپنا سا سمجھتے ہو مریجاں مرے دل کو
منہ لگائیں غیر کو اتنا دماغ انکو کہاں	چھیڑ تھی یہ بھی فقط میرے جلانے کے لئے

دلاور

دلاور ۔ محمد دلاور حسین خاں باشندہ موضع اٹنگا چاندپور ۔ جناب تشنہ بلند شہری سے

اصلاح لی ہے اٹھارہ بیس برس کی مشق سخن ہے۔ کلام میں کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں پائی جاتی۔ استعداد علمی بھی رسمی معلوم ہوتی ہے۔

کروں میں آنکو رسوا دعوی خون کرکے محشر میں	دلاور میرے دل سے یہ گوارا ہو نہیں سکتا
نہ ہوگی سرد یہ گرمی الفت خاک ڈالے سے	رہیگی سوزشِ دلِ مضطرب زیر زمیں برسوں
نکلتے ہمنے دیکھے ہیں بہت ارمان غیروں کے	ہماری حسرتیں خوں ہوکے بھی دلمیں رہیں برسوں
خیالِ ہمسری ہے تو کرے کسبِ ضیا پہلے	مہ نو عارضِ انور سے تیرے مہ جبیں برسوں
قدرداں دل کا خریدار دلاور ہو اگر	مفت اس جنس گرانمایہ کو ہم دیتے ہیں
اگر اُس فتنہ گر کی دل کو اُلفت ہونیوالی ہے	تو اُلفت کیا ہے اک خاصی مصیبت ہونیوالی ہے
عدو کو بھیجنے والے ہیں وہ رسمِ عیادت میں	ہمارے مارنے کی اب یہ حکمت ہونیوالی ہے
ذرا ہشیار ہو کر آئینہ پیشِ نظر رکھنا	مقابل دیکھ کر خود تم کو حیرت ہونیوالی ہے
لئے جاتا ہے اُسکا شوق ہی خود اُسکو مقتل میں	تمہارے ہاتھ سے جسکی شہادت ہونیوالی ہے
ہنوز آغازِ الفت تھا کہ دلکو ہاتھ سے کھویا	خدا جانے ابھی کیا اور حالت ہونیوالی ہے

دلاور — نواب دلاور حسین خان لکھنوی شاگرد منظر آغا مظہر مرحوم

ثنائے رُخ میں وہ رنگیں ہے داستاں میری	ملی نہ بلبلِ شیراز کو زباں میری
یہ تیغ حسن کا ہے زخم بے خرد جراح	جسے کہ داغ ہے سمجھا وہی ہے جاں میری
نکل بھی جانے دے مجھکو کہ ہو تجھے بھی قرار	تڑپ تڑپ کے یہ کہتی ہے دل سے جاں میری

دلخوش — لالہ بہادر سنگھ کہتری، راجہ خوشحال رائے دہلوی یا میر عہد اکبر شاہ ثانی کے پوتے اور غدر کے بعد ۷۰ء تک حیات تھے سرائے داداکا کٹرہ ابتک مشہور ہے ✤

ہوں ترے ہجر میں جوں دیدۂ نرگس حیران	چشم پوشی نہ کر آ اپنے گنہگار سے مل

دلریش — منشی اہل بہاری لال صاحب مختار عدالت علی گڈھ آپ کو علیگڈھ کے نامور شاعر منشی بنواری لال صاحب شعلہ سے تلمذ ہے۔ شعر ملاحظہ ہوں ✤

رہا ہے کب کوئی دنیا میں دم بھر شادماں ہو کر		ملا ہے کب کسیکو چین دم بھر شادماں ہو کر
حقیقی عشق کی عشقِ مجازی پہلی منزل ہے		چلو سوئے خدا اے زاہد و کوئے بتاں ہو کر
یہی دلریش حسرت ہے یہی دل کی تمنا ہے		کہ گذرے عمر باقی خادمِ ہندوستاں ہو کر

دلسوز

دلسوز۔ خیراتی خان دلسوز، قوم کے افغان باشندۂ علیگڈھ شاہ نصیر مرحوم کے شاگرد اور نواب ظفریاب خان خلف بیگم سمرو کی رفاقت میں تھے ۱۸۲۵ء کے قریب جیپور میں انتقال کیا، شراب بہت پیتے تھے، مزاج میں شوخی و ظرافت بدرجۂ انتہا تھی پرانے تذکروں سے کلام منتخب ہو کر درج ہوا۔

ارادہ پائے بوسی کا تھا اے بیداد گر اپنا		گرا قدموں ہی پر تیرے کٹا جسوقت سر اپنا
جگر فراق کے صدموں سے لالہ زار رہا		یہاں خزاں میں سدا موسم بہار رہا
وہ تو کہتے ہیں راز دل اپنا	ق	مت کسی اپنے یار سے کہنا
اور یہاں دل کی بیقراری سے		روز دو تین چار سے کہنا
رات تم اِس طرف جو آن پھرے		دن مرے کچھ تو مریحان پھرے
سب سہیں گے ہم اگر لاکھ بُرائی ہوگی		پر کہیں آنکھ لڑائی، تو لڑائی ہوگی

دلشاد

دلشاد۔ خلیفہ عبدالرحمن دلشاد باشندۂ خورجہ، منشی فائق ساکن ہاپڑ سے اصلاح لیتے ہیں دس بارہ برس کی مشق بھی ہے۔

نوبت ترے بیمار کی پہنچی ہے یہاں تک		جو دیکھنے آتا ہے تو دیکھا نہیں جاتا
لے جلد خبر آکے مری عیسیٰ دوراں		بیمارِ محبت سے اب اُٹھا نہیں جاتا

دلگیر

دلگیر۔ منشی چھنو لال کالیستھ سکسینہ باشندۂ لکھنؤ۔ ایام جوانی میں طرب تخلص کرتے تھے اور غزل میں یہی تخلص لاتے رہے، اوائلِ شباب میں بڑے رندانہ منش اور رنگین مزاج تھے چنانچہ اسی لاابالی عالم میں مذہب آبائی کو ترک کرکے مسلمان ہو گئے اور غزل گوئی کی بجائے مرثیہ کہنا شروع کیا، اور چونکہ صاحب استعداد تھے اِس میں اچھا نام پایا شروع میں مرزا

خانی نوازش سے تلمذ تھا، پھر شیخ ناسخ کی خدمت میں آئے۔ مراثی کا مجموعہ چھپ گیا ہے۔ میر خلیق اور فصیح انکے ہمعصر تھے، نواب سعادت علی خان اور غازی الدین حیدر کے زمانے کے مرثیہ گویوں کے سرتاج سمجھے جاتے تھے جب میر انیس نے مرثیہ کہنا شروع کیا ہے تو انکا عالم ضعیفی تھا

معطر اسکے نہانے سے لبکہ آب ہوا	حباب بحر ہر ایک شیشۂ گلاب ہوا
کسکو دکھاؤں میں یہ بھلا ماجرائے چشم باتیں تری سنا کریں اور دیکھیں تیری شکل آئے طرب تراجو وہ خوش چشم باغ میں	ناسور بن گئے ہیں عزیزو بجائے چشم وارثِ گوش یہ ہے تو وہ مدعائے چشم نرگس کے دستے کیجیو تو بھی فدائے چشم

دلگیر

دلگیر۔ ناثر بے نظیر سخنور خوش تقریر شاہ سید نظام الدین دلگیر اکبر آبادی۔ آپکے والد سید عبدالقادر شاہ صاحب قیصر اکبر آباد کے شرفاء روساء میں سے تھے جن کا سلسلۂ نسب حضرت سید عبدالقادر شاہ بغدادی تک پہنچتا ہے جو بغداد سے علم خلافت سید عبدالقادر جیلانی لیکر ہندوستان میں آئے۔ یہ علم دو سیر سونے کا ہے اور شاہ دلگیر اب بھی گیارہویں کو اسے اپنی درگاہ میں استادہ کرتے ہیں، شاہ دلگیر کے پردادا سید منور علی شاہ جو صاحب علم کے پوتے تھے آخر اٹھارھویں صدی میں جب آگرہ میں مرہٹوں کی عملداری تھی صاحب کرامات مشہور ہوئے۔ نقل ہے کہ مہاراجہ سیندھیا کی ایک لڑکی جو عرصہ سے سخت بیمار تھی شاہ صاحب کی دعا سے بالکل تندرست ہوگئی اسکے صلہ میں مہاراجہ سیندھیا نے بطور شکریہ کئی گاؤں شاہ صاحب کو بطور معافی عطا کیئے۔ حضرت دلگیر کے والد اور دادا لاٹ صاحب کے درباری بھی رہے۔ شاہ دلگیر کی ولادت ۲۳ فروری ۱۸۸۳ء مطابق ۱۴ ربیع الثانی ۱۳۰۰ھ کو آگرہ میں میوا کڑے کے محلہ میں ہوئی ابھی چودہ برس کی عمر نہوئے پائی تھی کہ خاندانی تنازعوں کے باعث باضابطہ تعلیم کا سلسلہ مسدود ہوگیا۔ تاہم ذاتی شوق مطالعہ کی بدولت فارسی اردو کا مذاق اعلی درجے کا ہے اور انگریزی میں بھی فی الجملہ مہارت حاصل کرلی ہے، عربی سے بقدر ضرورت

واقف ہیں، نثر طرازی اور شعر گوئی کا مذاق بچپن سے رفیق رہا۔ چنانچہ سترہ اٹھارہ سال کی عمر سے برابر مختلف رسالوں اور اخباروں میں مضامین لکھتے رہے کچھ عرصہ آگرہ اخبار اور مفید عام کی ایڈیٹری کے فرائض بھی انجام دیئے فن شعر میں باوجود نغزگوئی اور شیریں گفتاری حیرت ہی کہ آپنے کسی سے باضابطہ طور پر اصلاح نہیں لی پڑھنے کا انداز دلکش اور موثر ہے ۱۹۰۹ء میں دہلی کے کئی مشاعروں میں تشریف لائے اور اپنے دلپذیر کلام سے شائقین کی سامعہ نوازی کی اُس زمانے سے مؤلفِ تذکرہ سے مراسم اتحاد قائم ہوئے جو لفضلہ قائم ہیں۔

دور موجودہ کے انشاپردازوں کے زمرہ میں ہماری رائے میں شاہ دلگیر کا پایہ صفِ دوم کے صدرنشینوں میں سمجھنا چاہیئے۔ آپکا تخیل ایک عجیب جدت و لطافت کا پہلو لیئے ہوئے ہے۔ آمد۔ اور اس میں جابجا انسانی جذبات اور مناظرِ قدرت کے دلفریب نمونے ایسی سلیس و شستہ زبان میں ملتے ہیں کہ خواہ مخواہ انسان تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اب شروع ۱۳ ۱۹ء سے شاہ صاحب نے ایک رسالہ نظم و نثر موسومہ "نقاد" آگرہ سے شائع کرنا شروع کیا ہے جسکی گو ابھی پوری دو برس کی بھی عمر نہیں ہوئی تاہم وہ موجودہ رسالوں میں نہایت وقیع اور ممتاز سمجھا جاتا ہے اور اُمید ہے کہ اگر شاہ صاحب کی توجہ استقلال کے ساتھ اسکی ترتیب و تہذیب کی طرف منعطف رہی تو یہ رسالہ ادب اردو کی خدمت کا ایک قابل قدر ذریعہ ثابت ہوگا۔ آپکے اشعار میں نزاکت و جدتِ خیال۔ تلاشِ مضمون، مناسب الفاظ۔ شستگی روزمرہ و طرز ادائے بیان الغرض جملہ خوبیاں موجود ہیں پڑھیئے اور لطف اٹھایئے

کیوں نہ دھوکا ہو دہکتے ہوے انگاروں کا	شعلہ طور ہے جلوہ ترے رخساروں کا
سایۂ دامن رحمت میں ہیں عاصی زاہد	دیکھ کیا حشر میں رتبہ ہے گنہگاروں کا
جل اُٹھا آتشِ دل سے مری ہر سنگِ مزار	ڈھیر ہے بعد فنا قبر پہ انگاروں کا
ہار پھولوں کے لیئے پھرتی ہیں حورانِ جناں	آج فردوس میں میلہ ہے گنہگاروں کا

ترے آنے کی خبر جب کبھی ملجاتی ہے
موت منہ دیکھ کے رہجاتی ہے بیماروں کا

انھیں دونوں سے الٰہی رہے زنداں آباد
غل ہو زنجیر کا نالہ ہو گرفتاروں کا

قصر جنت پہ بھی دیوانوں نے لاتیں ماریں
آگیا یاد جو سایہ تری دیواروں کا +

وہ میرا گھر سمجھ کر خانۂ دشمن سے پھر آئے
مرا مطلب نکل آیا بھلا ہو بدگمانی کا

کیے سیراب زخم ای تیر قاتل آب پیکاں سے
طریقہ تونے مہمانی میں برتا میزبانی کا

جناب خضر سے کہدو عبث جینے پہ مرتے ہو
نہ ہو کھٹکا اجل کا تو مزہ کیا زندگانی کا

مے کہنہ کہاں ہے حضرت زاہد وہ آپہنچے
نئے مہمان کو دے ساقی کوئی ساغر پرانی کا

گلے پر میرے خنجر رکھ کے پھر کچھ فکر کرتے ہیں
نتیجہ دیکھیے ہوتا ہے کیا تجویز ثانی کا

چلا ہے نجد کی جانب جو کھنچ کر ناقۂ لیلیٰ
غبار قیس کو عہدہ ملا ہے پاسبانی کا

غزل میری نہیں دلگیر کچھ توصیف کے قابل
مگر مشکور ہوں اہل سخن کی قدردانی کا

ہر طرف جاتی ہیں نظریں تری ترچھی ہوکر
کبھی سیکھے ہی نہیں تیر نے سیدھا جانا

بند ہوتا ہی نہیں ملک عدم کا رستہ
رات دن رہتا ہے جاری یہی آنا جانا

کیا قیامت ہیں قیامت ہیں ادائیں انکی
دیکھکر مجھکو کن انکھیوں سے وہ شرما جانا

بتکدے دوڑ کے پہنچے کبھی کعبہ کو گئے
آج تک ہمنے ترے گھر کا نہ رستہ جانا

دم آخر ہے ٹھہر جاؤ میری بالیں پر
ابھی آئے ہو، ابھی جاؤ گے ، جانا جانا

وہ سمجھتے نہیں کچھ بھی یہ سمجھ ہے انکی
کہ مجھے غیر کیا غیر کو اپنا جانا

پہنچے دلگیر وہاں سنکے حسینوں کا ہجوم
عرصۂ حشر کو بھی کیا کوئی میلا جانا

ہیں لحد میں بھی جو یاد روئے انور میں رہا
کیا چمک کر نام لوح سنگ مرمر میں رہا

جیتے جی تھا چرخ دشمن بعد مردن ہے زمیں
جب بھی میں گردش میں تھا اور اب بھی چکر میں رہا

مجھ سے رخصت ہو کے پیری میں مرا عہد شباب
بنکے حسن شاعری شعروں کے تیور میں رہا

چین سے آکر جو بیٹھا پھر نہ نکلا حشر تک
تیر انکا بن کے ارمان قلب مضطر میں رہا

خانۂ دل کیوں نہو زاہد حسینوں کا مکاں
گھر بتوں کا مدتوں اللہ کے گھر میں رہا

چین کچھ ایسا دیا کنجِ لحد نے بعدِ مرگ
قبر میں جا کر بھی میں آغوشِ مادر میں رہا

جستجوئے یار نے مجکو پھرایا دربدر
میں نہ مسجد میں نہ کعبہ میں نہ مندر میں رہا

آتشِ عشقِ بتاں سے کوئی کیوں کر بچ رہے
یہ وہ شعلہ ہے شرر بنکر جو پتھر میں رہا

چشمِ حیرت بن کے تکتا یہ رہا ہر ایک شکل
حشر تک محوِ آئینہ۔ یادِ سکندر میں رہا

مرنیوالوں کے لیے خنجرِ بُراں کسکا
راستہ دیکھتی ہے ہمتِ مرداں کسکا

پہلوئے غیر میں وہ چین سے سو نیوالے
چاک ہے مثلِ سحر۔ دیکھیے گریباں کسکا

دلِ سا پروردہ آغوش ہو جب اُنکی طرف
پھر بھلا اور بھروسا کرے انساں کسکا

دہنِ زخم کی نیت نہیں بھرنے والی
چاہیئے کانِ نمک، مجکو نمکداں کسکا

عہد یہ ہے کہ کبھی خود نہ پئیں گے زاہد
کوئی گلرنگ دے پیمانہ تو پیماں کسکا

لدا ہوں ہوں داغوں کے پھولوں سے لالہ زار ہوں میں
خزاں کی بھی ہے جھلک جسمیں وہ بہار ہوں میں

مری جگہ ہے ہر اک دل میں خاکسار ہوں میں
کیا گھر آنکھ میں دشمن کی وہ غبار ہوں میں

غضب کا شوخ ہے دیکھو تمہارا تیرِ نگاہ
یہ تاک ہے کہ کسی کے جگر کے پار ہوں میں

اسی طرح سے نکل جائے حسرتِ پابوس
سرِ مزار ہو تم اور تہِ مزار ہوں میں

اُگا ہوں خاک سے میں بعدِ مرگ گل بن کر
جو دسترس ہو تو تیرے گلے کا ہار ہوں میں

جو ہوں تو کچھ نہیں، ہونا مرا نہ ہونا ہے
کسی کے وعدۂ فردا کا اعتبار ہوں میں

سرِ محشر تری تیغِ ادا کا کیوں نہ بسمل ہوں
ترا ہنس ہنس کے یہ کہنا کہ ہاں میں اسکا قاتل ہوں

مری اس بیخودی پر کیوں نہ آکر ہوش صدقے ہو
تمہیں غفلت میں پہچانا وہ بیخود ہوں وہ غافل ہوں

مری تقدیر میں دلگیر رہنا ہی مقدر ہے
نہ نکلی آج تک حسرت یہیں وہ حسرت بھرا دل ہوں

نہ پوچھا ہائے اُس ظالم نے اپنے دل فگاروں کو
رکھا اُمید ہی اُمید میں اُمیدواروں کو

ہمیشہ تیری فرقت میں تڑپتے ہی نہیں گذری
نہ پوچھا موت نے بھی ہائے تیرے غم کے ماروں کو

سروں پر بیکسوں کی ابر کا سایہ تھا دنیا میں — عجب کیا اُسکی رحمت گھیرے اُنکے مزاروں کو
نہ تھا ہمدرد کوئی دشتِ وحشت میں سوا اُنکے — ہماری آبلہ پائی پہ آیا رحم خاروں کو
شکستہ قبر اک میری بھی ہے گنجِ شہیداں میں — جو آنکلو ادھر تم فاتحہ دینے مزاروں کو

کلیجا کھا گئے رنج و غم و اندوہ سب مل کے — ہجومِ غم ہوا اتنا کہ حصے بٹ گئے دل کے
ستم توڑا غضب ڈھایا نگاہِ ناز نے مل کے — پڑی اُوپر مگر اندر سے ٹکڑے کر دیئے دل کے
نہ مرتے مجکو بنتی ہے نہ جینے مجکو بنتی ہے — نہ دل ہی میرے قابو میں نہ میں قابو میں ہوں دل کے

دمِ نزع حسرت بڑی رہ گئی — نظر جانبِ در لڑی رہ گئی
نہ ڈھونڈا دلِ غیر میں آپ کو — یہ اک چال ہمسے بڑی رہ گئی
دمِ نزع اسے جان آئے نہ تم — مری جان تم میں پڑی رہ گئی
اُٹھائے ہوئے ہیں ہم اک کوہِ غم — مصیبت جو سر پر پڑی رہ گئی
ہوئے مرحلے زندگی کے تمام — بس اب ایک منزل کڑی رہ گئی
گئی مرتے مرتے نہ مژگاں کی یاد — یہ برچھی جگر میں گڑی رہ گئی
وہ آئے دمِ نزع بالیں پہ جب — اجل بھی گھڑی کی گھڑی رہ گئی
ہوئے آپ رخصت مگر مجکو یاد — قیامت کی وہ اک گھڑی رہ گئی
کیا ذبح تم نے نہ دلگیر کو — یہ اک حسرت اُسکو بڑی رہ گئی

باتوں میں ہے سحر فتنہ جو کی — دل لے لیا جس سے گفتگو کی
کٹ کٹ کے دعائیں دیرہی ہیں — خنجر کو رگیں مرے گلو کی
ہو قصۂ قیس یا کہ فرہاد — اک شرح ہے لفظ آرزو کی
دل لیکے کسی کا پوچھنا ہائے — کس دل سے ہماری آرزو کی
میں چشمِ عدو میں ڈالتا ہوں — چھانی ہوئی خاک کو بکو کی
لاکھوں کا نوالہ کر رہی ہے — ہے گور بھی کس بلا کی بھوکی

خود کھو گئے ایسی جستجو کی	کہتے ہیں تلاش اسکو دلگیر

دلگیر

دلگیر۔ سید اظہر حسین عرف منا میاں مارہرہ کے باشندے اپنے بھائی جناب دلیر کے مشورہ سے شعر کہتے ہیں ۱۲۹۷ھ سے مشق سخن کرتے ہیں انکے خاندانی حالات بہ تحت ترجمہ جناب دلیر درج ہیں دوبارہ انکا اعادہ فضول ہے۔ خاصے شوخ طبع موزوں فکر ہیں بان بھی شستہ وصاف ہے

رہا دلگیر یوں بھولا ہوا دنیا و دیں برسوں	کہ رگڑی اس بت سفاک کے در پر جبیں برسوں
وہاں بھی جاکے روح قیس کو نالوں سے چونکایا	ہلائی خوب دشت نجد کی بھی سرزمیں برسوں
نہ چھوٹے گا ہمارے خون کا دھبہ قیامت تک	بت سفاک دھوئے لاکھ اپنی آستیں برسوں
اس طرز سے وہ چلتے ہیں وقت خرام ناز	گویا کہ انکے پاؤں کے نیچے زمیں نہیں
انداز گفتگو کا کچھ الجھا ہوا سا ہے	فقرہ پیامبر کا کوئی دلنشیں نہیں
عدو سے انکے لڑنے پر بجا ہے میرا یہ کہنا	دکھائی آپنے تو آج جنگ زرگری اچھی
حنا مالیدہ ہاتھوں نے سجھائی قتل عاشق کی	کسی کے خون ہونے کے لیئے ہندی رچی اچھی
برا ہو نام ہی الفت کا پوچھا ہے تو کہتا ہوں	نہ الفت حور کی اچھی نہ الفت آپکی اچھی

دلگیر

دلگیر۔ منشی عبدالوہاب خان صاحب آپکو حضرت امیر مینائی سے تلمذ رہا ہے ۱۲۹۸ھ کے حدیقۂ عادی سے کلام منتخب ہوا، امیراللغات کے دفتر میں بھی کچھ دنوں مددگار رہے زیادہ حال باوجود فکر دریافت معلوم نہوا کلام منتخب ملاحظہ ہو۔

نہ دیتے تھے تم گالیاں اول اول	نہ تھی ہاتھ بھر کی زباں اول اول
کوئی پھول مجکو بھی گلشن کا صدقہ	میں آیا ہوں اے باغباں اول اول
ہمیں کچھ فائدہ اس سے جو چہرے سے نقاب اٹھے	مزا اسوقت ہے جب پردۂ شرم و حجاب اٹھے
جھپک جائیں فلک پہ چاند سورج گر پڑے بجلی	تمہارے روئے تاباں سے مری جاں گر نقاب اٹھے
بوسوں کے بدلے مجکو وہ دیتے ہیں گالیاں	اچھی دوا ہے یہ دل بیمار کے لیئے
دلگیر کہتے تھے کہ لگاؤ کہیں نہ دل	رونا پڑا نہ تمکو دل زار کے لیئے

غیر پر لوٹ ہیں اب چھوڑ کے چاہت میری
تھی جوانی تو انھیں ناز تھا کیا کیا کل تک
آج گردوں کی طرف دیکھ کے وہ کہتے ہیں

کچھ جو کہتا ہوں تو کہتے ہیں طبیعت میری
غیر کی سنتے تھے منت نہ سماجت میری
ہائے کیا ہو گئی وہ چاند سی صورت میری

دلبیر

دلبیر۔ نواب علی محمد خاں صاحب لکھنوی۔ آپ کو حضرت عشق لکھنوی سے تلمذ رہا ہے۔ انجمن محمدی کے پریسیڈنٹ تھے ارمغان ۹۶ء سے کلام منتخب ہو کر نقل ہوا۔ بار بار لکھنو سے حالات دریافت کیے مگر کسی صاحب نے توجہ کی صرف محشر صاحب کی زبانی اتنا معلوم ہوا کہ دس برس ہوئے انتقال کر گئے اور کلام ملنا اب ناممکن ہے۔ چند شعر حاضر ہیں۔

روح عاشق قفس جسم سے آزاد نہ ہو
ملک الموت اگر شکل پریزاد نہ ہو

دل کا جلنا کیا الفت میں گوارا کس نے
اپنا گھر پھونک کے دیکھا ہی تماشا کس نے

نور سے اس رخ تاباں کے ہوئیں آنکھیں بند
بے نقاب آئے بھی وہ تو انھیں دیکھا کس نے

لب جاں بخش پہ تہمت ہی سہی مان لیا
یہ بتاؤ تو کیا پھر مجھے اچھا کس نے

لاکھ جانیں ہوں تو اک نقش قدم پر صدقے
دل کے مٹنے کا کیا آپ سے شکوا کس نے

دلبیر

دلبیر۔ نواب دلیر جنگ بہادر رئیس مدراس۔ شاید نواب کرناٹک کے خاندان کے رکن ہیں باوصف اہل زبان نہ ہونے کے اردو فارسی کی طرف بھی توجہ رہی۔ یہ چند شعر نتائج افکار سے ملے درج کیے گئے۔

دیکھنا انکو ہے ممنوع صنم خانوں کا
کچھ خفا ہو گیا اللہ مسلمانوں کا

دیکھیے عاشق و معشوق کی کیفیت کو
شمع کیا جلتی ہے جی جلتا ہے پروانوں کا

ایک گردش سے کیا مست تری آنکھوں نے
کام میخانہ میں ہے ایسے ہی پیمانوں کا

خفا کیوں ہو نکل آئے جو آنسو
یہ لڑکے ہیں نکل جاتے ہیں گھر سے

حسیں سب ایسے دلیر اٹھے چلے جاتے ہیں دنیا سے
عدم آباد میں شاید کوئی دلچسپ بستی ہے

دلبیر

دلبیر۔ نواب امراؤ بہادر ملقب بہ شمشیر بہادر ثانی۔ آپ نواب علی بہادر ثانی کے خلف دوم

اور نواب ذو الفقار بہادر والی ریاستِ باندہ کے پوتے ہیں جو خود مرہٹوں کے فرمانروا باجے راؤ اول پیشوائے پونا کے خلف اصغر شمشیر بہادر کے پوتے اور جانشین تھے، انکے خاندانی مطبوعہ حالات سے پایا جاتا ہے کہ ۱۷۲۵ء میں راجہ چھتر سال رئیس پنّا نے پیشوا باجے راؤ سے غضنفر جنگ محمد خان بنگش صوبہ دار الہ آباد کے مقابلہ کے لیئے امداد طلب کی چنانچہ باجے راؤ خود فوج لیکر اُسکی حمایت کے لیئے بندیل کھنڈ آئے اور بنگش کو شکستِ فاش دیکر راجہ کے ملک کو اُسکے چنگل سے آزاد کرایا۔ اسی معرکہ میں رئیس پنّا کے اہلِ خاندان جن میں اُنکی لڑکی بھی تھی لشکر اسلامی کی ہزیمت کے بعد آزاد ہوکر راجہ کے پاس واپس آئی۔ مگر رئیس مذکور نے اس خیال سے کہ یہ لڑکی کچھ روز مسلمانوں کے لشکر میں رہ چکی ہے اُسے اپنی دختر تسلیم کرنے میں پس وپیش کیا۔ ناچار باجے راؤ جو اُسکے حسن وجمال کو دیکھ کر دل باختہ ہوگیا تھا اُسے اپنے ہمراہ پونہ لیگیا اور داخلِ حرم کرلیا، وہاں اُسکے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا، یہ بچہ مشکل سے پانچ برس کا ہوا تھا کہ باجے راؤ کا انتقال ہوگیا، چونکہ اُسکے جوان ہونے پر سرداران ریاست نے اُسے ہندو تسلیم کرنے سے انکار کردیا لہذا بالاجی باجے راؤ پیشوا نے اُسے باندا کا علاقہ مدد معاش کے طور پر دیکر مذہب اسلام اختیار کرنے کی اجازت دیدی۔ باوجود اس ترک مذہب کے یہ خاندان قیام سلطنت مرہٹہ تک برابر اپنے آپ کو مرہٹہ طاقت کا جزو سمجھتا رہا اور باجگذار مطیع رہا۔ نواب شمشیر بہادر بانی خاندان باندا اس طرح باجے راؤ پیشوا کے خلف چہارم اور بالاجی باجے راؤ پیشوا کے برادر اصغر تھے ۱۷۶۱ء کی پانی پت کی لڑائی میں وہ زخمی ہوئے اور بموقع واپسی افواج مرہٹہ جانب دکن بھرتپور میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے، اُنکے لڑکے علی بہادر نے بامداد مادھوجی سیندھیہ بندیل کھنڈ کے اکثر اضلاع فتح کیئے اور نمک حرام غلام قادر کو جس نے واجب التعظیم شہنشاہ دہلی شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکال لی تھیں گرفتار کرکے دہلی بھیجا اور اس کار نمایاں کے صلے میں ماہی مراتب و دیگر مدارج حاصل کیئے، ایک یہ خاص رعایت بھی اُن سے کی گئی کہ اُن کے

خاندان کو شاہی مدفن قطب صاحب میں دفن ہونے کی اجازت سرکار شاہی سے عنایت کی گئی۔ چنانچہ جب نواب علی بہادر نے کالنجر میں انتقال کیا تو لاش قطب صاحب میں سپرد زمین ہونے کو دہلی بھیجی گئی، علی بہادر کے انتقال کے بعد نواب اُمراؤ بہادر کے دادا شمشیر بہادر پُونہ سے کالنجر آئے اور سرکار انگلشیہ سے ۱۸۱۲ء میں معاہدہ کیا جسکی روسے خطاب نواب باندہ اور چار لاکھ روپیہ سالانہ کا علاقہ یا پنشن زیر حمایت سرکار ہمیشہ کیلئے مسلم ہوگیا اس زمانے میں بعض وجوہ سے پیشوا نے ان کا علاقہ ضبط کر رکھا تھا، جب غدر ۱۸۵۷ء ہوا تو اس زمانہ میں نواب اُمراؤ بہادر کے والد نواب علی بہادر ثانی رئیس باندا تھے، شروع بغاوت میں انھوں نے ۳۰، ۴۰ حکام انگریزی کی جانیں بچائیں، لیکن آخر کار فوج باغی نے اُنھیں اپنی امداد دینے پر مجبور کیا، بعد خاتمۂ فساد سرکار انگریزی نے علاقہ اور پنشن سابقہ ضبط کر کے تین ہزار روپیہ ماہوار پنشن مقرر کی اور اندور بھیجدیا، جبسے یہ خاندان وہاں مقیم ہے حضرت دلیر کی پیدایش ۱۲۷۳ھ میں بمقام باندا ہوئی تھی۔ اور تعلیم راجکمار کالج اندور میں پائی آپ اور آپکے برادر کلاں نواب ذوالفقار بہادر ثانی پنشن بقدر گزارہ پاتے ہیں اور جیسی فراغبالی و آسودگی اِس قدیم خاندان کی رفعت برقرار رکھنے کو لازم ہے وہ حاصل نہیں۔ فن سخن میں آپ کو حضرت جلال لکھنوی سے فیض پہنچا ہے چنانچہ ۱۳۲۹ھ میں دیوان بھی شائع کر چکے ہیں، سیدھا سادہ کلام ہے مضمون آفرینی اور نزاکتِ خیال کی طرف توجہ کم ہے پُرگوئی البتہ ہے اور اساتذۂ سلف و حال کے کلام پر خوب ہاتھ صاف کیا ہے جس کا باعث غالباً یہی ہے کہ اُنکا کلام نظر سے نہیں گذرا۔ ہنگام ترتیب تذکرہ مع حالات دیوان ارسال کیا۔ طرز ناسخ کے مقلد ہیں کنگھی۔ چوٹی۔ محرم کے مضامین برابر نظم کرتے ہیں سرورق پر یہ شعر درج ہے۔

سخن بہتر سے بہتر اس کا ہمسر ہو نہیں سکتا	یہ دعوے سے میں کہتا ہوں کہ بہتر ہو نہیں سکتا

اِس دعوے کی صداقت کی بابت ناظرین خود فیصلہ کر لیں گے۔ ہم تو چند منتخب شعر

درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

دے ساقیا شراب ہوا چاند عید کا
محتاج میکدہ تھا فقط اس کلید کا

کیا سو رہا ہی چین سے مرقد میں بعد مرگ
زانوئے حور تکیہ ہی تیرے شہید کا

سرِ بالیں ہے وہ رشکِ مسیحا
کرگئی اب یہاں آکر قضا کیا

کیونکر نہ ہو زبان کا دعویٰ مجھے دلیر
شاگرد ہوں منیر کا سید جلال کا

کمبل بھی اوڑھنے کو انھیں اب نہیں نصیب
دیتے تھے جو فقیر کو رومال شال کا

زہد و تقویٰ کی عبث لیتے ہو زاہد ہم سے
پیتے دیکھا ہے تمھیں ہی اسی برسات کی بات

تیر مژگاں پڑا اسکیے دل پر
خوب کی تم نے چاند ماری رات

ہے سے مطلب ہی جب نہیں تم کو
کیوں کیا کرتے ہو ہماری بات

ہے جلوہ نیا کوئی تو چلمن کے ادھر آج
جاتی ہے تو پھر کر نہیں آتی ہے نظر آج

تم اُٹھ کے کہاں جاتے ہو پہلو سے ہمارے
بیٹھو ابھی دنیا سے ہے اپنا بھی سفر آج

زاہد کو آب کوثر و حور و جنان پسند
ہمکو بتاں بند و مئے ارغوان پسند

ہوئی فصل جنوں میں جوش وحشت کی خوشی
کہ زنجیروں کی بیلیں چڑھ گئیں دیوارِ زنداں پر

مے پی لو رہن رکھ کر ردا و عبائے واعظ
سوچی ہو آج ہمنے کیسی سزائے واعظ

کم معاشی میں جو رکھتے ہو بہت خرچ دلیر
بات کرتے نہیں کچھ اپنے گھر لٹنے کے خلاف

انکی زلفوں میں جو ہوتا ہی میرے دل پر بگاڑ
فیصلا کو بیچ میں دونوں کے آجاتی ہو مانگ

خوب جینے کا مزا پاتے ہیں ہم
خون دل پیتے ہیں غم کھاتے ہیں ہم

ہے یہ کیسا غمکدہ اے بزم آرائے جہاں
کتنے اس محفل میں ہیں اور شادماں کوئی نہیں

جو کعبہ میں شیخ حرم دیکھتے ہیں
وہی بتکدہ میں بھی ہم دیکھتے ہیں

بہت زہد و تقوے میں نازاں ہیں زاہد
گنہ گار تیرا کرم دیکھتے ہیں

سنیں کیونکر دلیر کی فریاد
کانوں کو بالی پتے بھرتے ہیں

کوئی حسرت اگر برسوں میں نکلی بھی تو کیا نکلی
ہزاروں حوصلے وہ ہیں جو دل کے دل میں رہتے ہیں

درد دل کا مزا وہ کیا جانیں
جن کا دل عمر بھر دکھا ہی نہیں
پھیر دیتے نہیں وہ کیوں دل کو
جب یہ کہتے ہیں کام کا ہی نہیں
رخ زیبا نہیں زلف رسا میں
یہ ہے اک صبح دو اسکی ہیں شامیں
یہ ایک نشہ محبت کا ہے وہ چارہ گرو
کہ جس کا سارے جہاں میں آثار کچھ بھی نہیں
وہ لپٹے نشہ مے میں ہیں عدو سے
یہ بیہوشی میں ہشیاری تو دیکھو

اِن روزوں خانداں کو کوئی پوچھتا نہیں
عزت ہے آدمی کی بس اب سیم و زر کے ساتھ
دختِ رز کا کئی دن سے نہیں ملتا سراغ
آج سنتے ہیں کہ قاضی کے وہ گھر بیٹھ گئی

سچ تو یہ ہے کہ بُری شے ہے تہید سنئی بھی
رہن مے کے لیئے زاہد کی ردا آتی ہے
تڑپ جاؤ گے میرا دردِ دل تم
جو سن لوگے کبھی میری زبان سے
مے کو کیونکر نہ وہ بُرا جانے
واعظ اسکے مزے کو کیا جانے

چھوڑے اُلفت وہ کیا حسینوں کی
کوسنے کو بھی جو دعا جانے

ہماری جبیں کے لیئے کعبہ زاہد
کسی شوخ کا آستاں ہو رہا ہے

بیہوش ہے اک بیخبری آٹھ پہر ہے
کچھ عاشقِ جانباز کی بھی اپنے خبر ہے

اگلا سا وہ حیف اپنا زمانہ نہ رہا
دولت نہ رہی وہ کارخانہ نہ رہا
کھو بیٹھے اُسے ایک مکاں تھا جو دلیر
رہنے کا بھی افسوس ٹھکانا نہ رہا

دلیر منشی سید امیر حسن مارہروی آپکے دادا میر داور علی دا اور مرحوم اٹاوہ کے قدیم باشندے اور ایام غدر میں سرکار انگلشیہ میں تحصیلدار تھے بصلۂ خیر خواہی سرکار سے موضع سلیم پور انعام میں ملا ہوا تھا بعد ازاں اور کچھ دیہات نواح ایٹہ میں خرید فرما کر اور مارہرہ کو پسند کر کے یہاں منتقل سکونت اختیار کی اُس میں جناب دلیر کے والد سید الطاف حسین بھی حصہ دار ہیں اور مکانات درگاہ کے قرب میں بنائے تحصیلداری سے ترقی پا کر غدر کے بعد ڈپٹی کلکٹر ہوئے اور ۱۸۹۶

دلیر

تک پنشن پاتے رہے۔ ان کا سالِ ولادت ۱۸۷۱ء مطابق ۱۲۸۸ھ ہے۔ فارسی اردو میں خاص دستگاہ ہے۔ ڈل تک انگریزی بھی پڑھی تھی۔ خلیق، نیک خصلت شخص ہیں، طبیعت نہایت شوخ اور چلبلی پائی ہے ابتدائے شعور سے شعر و سخن کا ذوق ہے، شعر اچھا کہتے ہیں۔ فنِ موسیقی سے بھی ایک گونہ لگاؤ ہے، پہلے جناب مضطر کے شاگرد ہوئے بعد میں فصیح الملک مرزا داغ سے بہ سلسلۂ خط و کتابت تلمذ اختیار کیا اور اس امر کی خاص کوشش کی کہ استاد کے رنگ میں کہیں۔ آجکل زمینداری کے انتظام کا مشغلہ ہے۔ کثرتِ مشق سے اب روز مرہ میں بے تکلفی کلام میں روانی زبان میں صفائی اچھی پیدا ہو گئی، اکثر مشاعروں میں اپنی خوش گوئی کی داد پاتے ہیں سندیلہ، رامپور، علیگڈھ کے مشاعروں میں شریک ہوئے راقم سے بریلی میں قاضی محمد خلیل کے مشاعرے میں ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ شوخیِ مضمون اور طرزِ بیان قابلِ تعریف ہے اور جا بجا حضرت داغ کے فیضان کی جھلک ان کے کلام سے آشکار ہے

روتا ہوں دیکھ دیکھ کے دیوار و در کو میں — بیٹھے بٹھائے آج مجھے ہو گیا ہے کیا
صورت نمائے حسن ہے آشفتگی مری — جو مجھ کو دیکھتا ہے مجھے دیکھتا ہے کیا
اندیشۂ فراق سے کرتا ہے ترکِ عشق — ہمت کو اے دلیر تری ہو گیا ہے کیا

مجمع اہلِ شکایت سے تمھیں کیا مطلب — کوئی دل سے کوئی تقدیر سے نالاں ہو گا

تم نے بے پردہ سامنے آ کر — صبر مجھ سے ہوا ہوا نہ ہوا
ہائے قسمت اسیرِ الفت کی — قید ہی میں رہا۔ رہا نہ ہوا

رشک یہ ہے کہ عدو نے لبِ لعلیں کو ترے — کر دیا چوس کے برگِ گلِ سوسن کیسا

ترکش میں ہے جو تیر وہ قاتل کے پاس ہیں — جو کھو گیا کہیں وہ مرے دل میں رہ گیا
ہیں سب خیال و خواب کی باتیں اے ہمنشیں — آنکھوں میں رہ گیا نہ کوئی دل میں رہ گیا
یہ سن لو اور جاؤ ہے اگر مدِنظر جانا — تمھیں آتا ہے گھر جانا ہمیں آتا ہے مر جانا
نہ اپنے دل کو دل جانا نہ اپنے دم کو دم سمجھے — تمھیں کو عمر بھر سمجھے تمھیں کو عمر بھر جانا
کوئی دم کوئی ساعت یاد سے تیری نہیں خالی — ہمیں کیا بے خبر اپنا سا تو نے بے خبر جانا
دلیر خستہ جاں کی خودکشی کو سن کے فرمایا — خدا مرحوم کو بخشے اسے کہتے ہیں مر جانا

گرہ اب کھولیے زلفوں کی لاؤ دل لگی ہو لی — بھلا تیرے سوا اے دلربا کس پر گماں ہو گا

کیا ضرورت تھی جو یہ زحمت گوارا کی گئی | کیوں مجھے ناپید ہونیکے لیئے پیدا کیا

عشق میں ضبط مدعا نہوا | آدمی ہیں بہت کیا نہوا

وہ بہت پوچھتے رہے لیکن | ہمسے اظہار مدعا نہو

بھئیں یہ ضد ہے تو دنیا کو چھوڑ دینگے ہم | یہی جہان ہے کیا دوسرا جہان نہیں

ملیگی کیوں نہ ہمیں قبر میں ستم سے نجات | کہ اس زمین کے نیچے تو آسمان نہیں

یہ سودا تو دیکھو وہاں جا رہے ہیں | جہاں سیکڑوں ٹھوکریں کھا رہے ہیں

یہ کہکر مجھے اُنکے درباں نے روکا | کریں کیا ہم اس بات کا کھا رہے ہیں

کہیں تم، کہیں ہم، یہ اندھیر کیا ہے | مُرادوں کے دن اور یوں جا رہے ہیں

اثر دے الٰہی ہماری دعا میں | ترے سامنے ہاتھ پھیلا رہے ہیں

چڑھیں طور پر ہم کو اِسکی ضرورت | یہیں سب کرشمہ نظر آرہے ہیں

مستحق ہم بھی ہیں اِس لطف کے دشمن ہی نہیں | اِس طرف بھی تو ذرا آنکھ اُٹھا کر دیکھو

روکنا دیدۂ خونبار کو اے حضرتِ دل | داغ آجائے نہ دامانِ وفا پر دیکھو

کراہے کیوں نہ وہ جو آتشِ فرقت سے جلتا ہو | مجھے پروا نہیں اسکی سُنے جو کوئی سنتا ہو

جنازے کو ہمارے دیکھ کر تم سوچتے کیا ہو | جِلا دو اپنے کشتہ کو اگر رشکِ مسیحا ہو

نہ مگر حشر ہے یہ آخری دن جسکو کہتے ہیں | قیامت ہے جو وعدہ آج بھی تیرا نہ پورا ہو

بسر ہوتی ہے کیونکر زندگی ایامِ فرقت میں | یہ اُس سے پوچھنے کی بات ہے جو جیتا مرتا ہو

بہت تو نے ڈرا رکھا تھا مقتل اور خنجر سے | یہیں ہو اور ابھی ہو فتنہ گر جو کچھ کہ ہونا ہو

خدا نا ترس ہیں کافر حسیں تو جرم کیا اس کا | خدا کو جب نہ جانیں یہ تو پھر خوفِ خدا کیا ہو

مانگو دعا کہ حشر میں اللہ بخشدے | میرا قصور ہو کہ تمھارا قصور ہو

سُن کے بتخانہ کو ہم شہرتِ اصنام چلے | کتنے دن دیکھئے اب مذہبِ اسلام چلے

دم نکلجائے تو ہو ہجر کی مشکل آسان | موت کام آئے اگر آج تو کچھ کام چلے

آج وہ میری عیادت کو جو آئے تو کہا | تم تو کل کہتے تھے ہم صبح چلے شام چلے

جو تیر آ رہا ہے وہ پار جا رہا ہے
اب دل میں کیا دھرا ہے اب دل میں کیا رہا ہے

وہ کھیل جانتے ہیں الفت کے مشغلوں کو
اک بدنصیب اپنی ہستی مٹا رہا ہے

کیا بتاؤں کیا لگاوِ یار ہو کر رہ گئی
میری دل کی مالک و مختار ہو کر رہ گئی

اس نقاہت کا برا ہو ضعف کے کہتا ہی و شوخ
ایک ہی فریاد لے بیمار ہو کر رہ گئی

ظلمتِ شامِ جدائی کب ہٹائے سے ہٹے
سامنے آنکھوں کے اک دیوار ہو کر رہ گئی

غیر کی گردن میں جب باہیں کسی کی پڑ گئیں
میری مایوسی گلے کا ہار ہو کر رہ گئی

کیا وہاں بھی جا کے پہنچی میری آہِ شعلہ ریز
کیوں ستارے گر رہے ہیں عرش سے ٹوٹے ہوئے

بخشند تجھے اپنے عاشق کا قصور
بندہ پرور کیا کرے انسان ہے

زنداں میں فتنہ گر نے کی یہ تو دستگیری
جب پانوں میرے باندھے تب ہاتھ کھول ڈالے

گل پیرہن ہزاروں سے زیادہ نازک
نظروں میں آ زمائے آنکھوں میں تو لڈالے

خونِ جگر سے اپنے لکھا تھا حال دل کا
واں خط شوق اسنے پانی میں گھول ڈالے

چودھویں سال میں پہنچے تو کہا اترا کر
جیسے ہم آج ہیں ایسا ہی مہِ کامل ہے

مجھ سے کہتے ہیں کہ تو حشر میں یہ کہہ دیجو
میرا دعوی ہے کسی پر نہ کوئی قاتل ہے

نثر کے شکوے ہیں اک انشائے غم
نظم کی فریاد اک دیوان ہے

اس قسم کھانے کے صدقے جائیے
آنکھ نیچی ہاتھ میں قرآن ہے

یہ فصاحت اور یہ آمد دلبیر
داغؔ کے فیضِ کرم کی شان ہے

کبھی راہ پر وہ نہیں آنیوالے
سلامت رہیں انکو بہکانے والے

مری روح پر ہے قیامت کا صدمہ
تجھے کھیل ہے قبر ٹھکرانے والے

تفصیل وار ذکرِ ملاقات کیجئے
کس سے ملے کہاں ملے یہ بات کیا ہوئی

گلگشتیں یہ سیریں ہی تو سارے گل کھلاتی ہیں
ستمگر تو جو رسوا ہے انہیں باتوں سے رسوا ہے

بے رخی میٹھی نظر کے ساتھ ہے
عیب کیا اچھے ہنر کے ساتھ ہے

آپ کا دربارِ کعبہ بن نجائے تو سہی	کچھ دنوں گھسنے تو دیجے اپنی پیشانی مجھے
آج سے وہ لطفِ راہ و رسم ظاہر بھی گیا	رازِ دل کہکر ہوئی کیسی پشیمانی مجھے
عقل کا کہنا سمجھ ہی میں نہیں آتا دلیر	کیا خدا جانے یہ سمجھاتی ہے دیوانی مجھے

مدعی کی شبکو قسمت کھلگئی	کچھ شبہ جیسے حقیقت سب کھل گئی	امتحانِ عشق بھی کیا سخت تھا	آدمی کی آدمیت کھل گئی

فریاد حشر میں ہے یہ اک دردخواہ کی	پرسش یہاں تو ہو مرے حال تباہ کی
رکھا نہ عشق تو نے کسی دین کا مجھے	دنیا تباہ کی مری عقبیٰ تباہ کی
افسوس دل کا حال کوئی پوچھتا نہیں	یہ کہہ رہے ہیں سب تری صورت بدل گئی
جو ہم نے کہدیا تھا وہی عشق میں ہوا	آخر ہماری جان ہی لیکر اجل گئی
عزت اسی کی اہلِ نظر کی نظر میں ہے	سب کچھ بشر میں ہے جو محبت بشر میں ہے

دلیر

دلیر۔ مرزا تصدق حسین خلفِ مرزا واجد حسین فنِ شعر میں حضرت امیر مرحوم کے صاحبزادے جناب حکیم مغفور سے مستفید ہیں کم و بیش ۳۰ برس سے مشقِ سخن کرتے ہیں۔ ۵۰ سال سے عمر متجاوز ہے ✧

مدت کے بعد دیکھنے آیا ہے وہ قمر	اے موت آج ہی تجھے آنا ضرور تھا
بجلی تڑپ تڑپ کے تھمی پر نہ یہ تھما	کس درجہ بیقرار دلِ ناصبور تھا
کہتا ہے درد مجھسے نہ بیتاب آپ ہوں	گھر سے وہ چل چکے ہیں کہیں ہونگے راہ میں
رحمت نے اسکو بڑھ کے گلے سے لگا لیا	دیکھا مجھے جو حلقۂ شرم و گناہ میں

خوشی ہے قتل کی اپنے فقط اسواسطے دلکو	کہ خونریزی کا ارماں تو رہا باقی نہ قاتل کو
وہ قاتل فاتحہ پڑھنے کو آیا ہے جو تربت پر	یہ بیجرم و گنہ مقتول ہونے کی خوشی ہے

دلیر

دلیر۔ منشی علی شبیر ساکن بمبئی رسالۂ معیار میں کچھ کلام نظر سے گزرا اسکا انتخاب ضبطِ تحریر میں آیا

گھٹا کے آتے ہی محفل میں آیا جامِ شراب	اِک آفتاب گیا اور اِک آفتاب آیا
طلسمِ حسن جو دیکھا اچٹ گئی مری نیند	لگی جو آنکھ تو عمر بھر نہ خواب آیا
دلیر میں نے تو خط انکو سینکڑوں بھیجے	مگر نہ نامے کا میرے کوئی جواب آیا

دماغ

دماغ - منشی گنگا لال صاحب خلف منشی کنہیا لال - میران پور ندرہ ضلع گیا کے رہنے والے ذی علم، خوش وضع اور نہایت متین و خلیق آدمی تھے اردو و فارسی کے علاوہ آپ کو بھاشا سنسکرت میں بھی دستگاہ حاصل تھی فن شاعری میں حضرت عرش خلف میر تقی میر کے شاگرد تھے ۱۲۶۶ھ میں بعمر ۷۰ سال اس جہان فانی سے رحلت کی - ایک دیوان غیر مطبوعہ موسومہ گلشن بیخار آپکی یادگار ہے مگر عنقا صفت ہے - بہزار کوشش یہ چند شعر دستیاب ہوئے جو ہدیۂ ناظرین کیئے جاتے ہیں ؎

تیری زلفوں سے اماں ہے کسے یار آج کی رات
انھیں دو کالوں نے رکھا ہمیں مار آج کی رات

صاف ہو وصل میں عاشق سے کدورت کیسی
میری جاں دور کرو دل سے غبار آج کی رات

دردِ دل سے جو کراہا تو وہ ہنس کر بولے
جاں بلب کون ہے آوارہ دیار آج کی رات

وہ شبِ ماہ میں آئے ہیں جو افشاں چنکر
چاندنی دوہری دکھاتی ہے بہار آج کی رات

گلشنِ حسن پر بہار نہیں
کنگھی چوٹی نہیں سنگار نہیں

قتل کو بس ہے خنجر ابرو
حاجتِ تیغ آب دار نہیں

باغِ عالم میں گل کھلاتے کچھ
لے جنوں موسم بہار نہیں

ایک ہی شکل کو دو کرکے دکھا دیتے ہیں
جوہر آئینہ قاتل تری تلوار میں ہے

دماغ

دماغ - مولوی مرزا سجاد علی لکھنوی - دور موجودہ کے خوش فکر ہیں چند غزلوں کا ماحصل درج ذیل ہے -

کیا تری معجز نما اے یار آنکھیں ہو گئیں
جو کوئی آیا پئے دیدار آنکھیں ہو گئیں

محو ہیں اتنا خیالِ دیدِ جاناں میں ہوا
دست و پا بھی ہوئے بیکار آنکھیں ہو گئیں

باغ میں وہ گل نہاں جب میری آنکھوں سے ہوا
مجھکو اپنی نظر میں خار آنکھیں ہو گئیں

اتفاقاً دید کا موقع جو ملا بھی ملا
شومیٔ تقدیر سے دیوار آنکھیں ہو گئیں

دوپیازہ

دوپیازہ - ملا عبدالمؤمن دہلوی معروف بہ ملا دوپیازہ خلفِ ملا ولی محمد - ہر گونہ علم و

فضل میں بہرۂ وافی و نصیبۂ کافی رکھتے تھے، ترکی زبان میں کامل عبور تھا چونکہ مسخراور بذلہ
سنی آپ کی طبیعت پر غلبہ کر رکھا تھا اس سبب سے فضائل علمی نے شہرت نپائی۔ محمد جلال الدین
اکبر شاہ بادشاہ عرش آشیانی کے جلیس خاص تھے، لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی کا یہ حال تھا
کہ بات بات میں پھلجھڑی کی طرح مُنہ سے پھول جھڑتے تھے، خلوت وجلوت میں ایسی
گل فشانیاں کرتے تھے کہ تمام حاضرین دربار مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ جاتے تھے، انکے
لطائف وظرائف آجتک زبان زد خلائق ہیں، مشہور زمانہ راجہ بیربل سے ہمیشہ انکی چشمک
رہا کرتی تھی اور آپس میں اکثر چوٹیں چلتی رہتی تھیں۔ ان دونوں کی نوک جھوک کے بیسیوں لطیفے
اب بھی لوگوں کی زبان پر ہیں، ملّا صاحب موصوف عرصۂ دراز تک متھرا میں مقیم رہے اور
وہی انکا اصلی وطن بھی تھا وہاں کے پنڈتوں سے اکثر گرمیٔ صحبت رہا کرتی تھی اور اسی وجہ
سے زبانِ ہندی میں بھی آپنے طبع آزمائی کی ہے اکثر فقیروں کو انکے دوہے یاد ہیں۔ فارسی
زبان میں بیشتر فکر سخن کرتے تھے اور اس فن میں علامۂ دہر ابوالفضل سے صلاح لیتے تھے
اُن واقعات کے برخلاف ایک قدیم تذکرہ میں مفصلۂ ذیل حال نظر سے گذرا جسکی صحت
میں ہمیں کسی قدر تامل ہے کیونکہ اکبر شاہ اور آصفجاہ مرحوم کے عہد میں تخمیناً دو سو برس کا
تفاوت ہے" کچھ دنوں بعد آصف جاہ نواب نظام الملک کے دامن دولت سے وابستہ
رہکر آخر عمر میں قصبہ ہنڈیا ہر وہ جو نواح قصبۂ جھیپانیر ضلع بھوپال میں واقع ہے وارد
ہوئے لوگوں سے پوچھا کہ اس بستی کا کیا نام ہے۔ کسی نے کہا " ہنڈیا" فرمایا کہ
دوپیازہ ہنڈیا میں آکر اب باہر کہاں جائے آخر ایسے بیٹھے کہ مر کر ہی اُٹھے اور اسی
خاک کے پیوند ہوئے آپ کا مزار اسی مقام پر ہے۔ ایک کتاب مسمی بہ اتراک عالمگیری
لغت ترکی زبان میں ان سے یادگار زمانہ ہے، انکے ایک سو ایک لطائف بزبان
فارسی بھی شائع ہو چکے ہیں اور" ملّا نامہ" ایک چھوٹا سا رسالہ جس سے عجیب مذاق حاصل
ہوتا ہے ملّا نامہ کے ساتھ چھپ چکا ہے۔ زبان اردو میں یہ چند شعر انکی موزونی طبع کا نتیجہ ہیں

وہ گورا گورا لڑکا بامن کا شوخ گہونا	ایسا لگے ہے مجکو جیوں کھانڈ کا کھلونا
موری کہتی و تن مان کہلی برج ہیں موری	پینم کے پیچھے ساری بیسر ہم بھگونا
دکھڑا سناؤں کاسے دے جند رکھ کہت ہے	ایسو مہا کیٹ باسوں مری لگاؤں کہونا
پیاری کو جانے بوجھا سارے نگر ہوں لین دن	ہم روم و شام و روس ہم خیر و پلونا
شوخی ہنیٹ کرت ہی چھکنی ہاتھ مل کر	نیں تاک شیخ کیتی ایسی طرح ملونا
تالی بجی ہے کیا کیا کلکھ شیخ جی کے پیچھے	رم ورب فعل ہیں بھاگا لے اوڑھا بچھونا
دو پیازہ از دل و جان قرباں چرا نبا شم	جوبن لے مدہ کا ماتا وہ سانولا سلونا
آپسے اس ہیں جو دو پیازہ چلے متھرا سوں	تا بہ پرلو نہ نکالیں گے قدم ہندیا سوں
شاہ ایراں ہے مہ چار دہم گو بالغرض	شاہ اکبر کو ہلال شب اول سمجھو
کیونکہ اسکو ہے ہر اک رات ترقی اور اسے	دن بدن روز نئے طور تنزل سمجھو
پیالہ پیم وسکا چاکھہ بیٹھے	ملت ہیں تن بدن پر راکھہ دیکھو
نہ دو پیازہ کی دلداری کرتے ہے	مگر صد گونہ ہا خواری کرتے ہے
دو پیازہ اب نکسن ہنڈیا ہیں آئے کے	ہاکھی کے ہاتھ پھنس گئے جائے ہیں جانے کے

دوست شیخ غلام محمد عظیم آباد و پٹنہ کے متوطن اور نظامت مرشد آباد میں اوائل انیسویں صدی میں ملازم تھے اس سے زیادہ حال معلوم نہ ہوسکا۔

کافر ہے جسکے دل ہیں تری آرزو ہو	کس کام کی زبان اگر گفتگو نہ ہو
صنم جو دیکھ مجکو تو کہے ہے دور آنکھوں سے	کچھ اپنا بس نہیں ظالم میں ہوں مجبور آنکھوں سے

دوست۔ سید خواجہ ولد سید حیات حیدر آباد دکن کے رہنے والے نہایت نیک طینت آدمی ہیں شیخ فدا حسین صاحب مہر سے تلمذ ہے دیوان گلزار دوست چھپ گیا ہے بقول دیگر مشہور لکھنوی کے شاگرد ہیں اور تعلقہ دار جاگیرات دکن ہیں پچاس باون برس کا سن اور یہ کلام کا انتخاب ہے*

دوست

دوست

ناصح سُنی ہیں ہم نے جہاں کی حکایتیں	جاتا ہے کون کوچۂ جاناں کو چھوڑ کر
منعم عبث ہی دولتِ دنیا پہ یہ غرور	جانا ہی ایک دن سر و ساماں کو چھوڑ کر
کون کہتا ہی کہ جلتا ہے دلِ عاشق زار	خاک ہو جاتا ہے سب جسم یہ جلتا ہی نہیں
لاکھ چاہا کہ کہوں اب ملوں گا تجھ سے	لڑکھڑاتی ہے زباں منہ سے نکلتا ہی نہیں
چُھپ گیا جب سے وہ شکل اپنی دکھا کر ای دوست	کسی صورت سے دلِ زار بہلتا ہی نہیں
دلوں میں یاد رہی دونوں طرف مرے اُسکے	میں اُسکے گھر میں رہا اور وہ میرے گھر میں رہے
جہاں ہے وہ دلِ مائل وہیں ہے	سخن ہے جس جگہ سائل وہیں ہے
نہ پوچھو حال ہم عاشق تنوں کا	جہاں دلبر ہے اپنا دل وہیں ہے
جہاں پر آپ تنہا بیٹھ جائیں	وہیں ہی جمگھٹا محفل وہیں ہے
سفر ہم ناتوانوں کا نہ پوچھو	جہاں تھک کے گرے منزل وہیں ہے

دوست

دوست منشی دوست محمد خان پٹھان۔ موزونی طبع کی امداد سے شعر کہہ لیتے ہیں ورنہ کچھ خاص بات انکے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ ایک دیوان بھی شائع کر چکے ہیں، یہ دیوان کا انتخاب ہی۔

پوچھتے کیا ہو شبِ فرقت کا حال	دل ہمارا رات بھر تڑپا کیا
جو تیری جدائی کا غم دیکھتے ہیں	وہی جلد راہِ عدم دیکھتے ہیں
سچ کہو! رہنے دو بہانے کو	کس نے روکا ہی آنے جانے کو
جو کیا ہم نے عشق میں تیرے	نکرے اب خدا کرے کوئی
بھلایا دو کیونکر بھلائی تمھاری	سمائی ہیں دل میں ادائیں تمھاری
زباں سے ہی کہتے ہیں مرتے ہیں تجھ پر	نہیں مرتے ای دوست مرجانیوالے

دُولھا

دولھا۔ نواب محمد حسن علیخاں صاحب دولہ بریلوی شاگرد نواب ہادی حسن خاں صاحب ہادی از خاندان حافظ الملک بہادر ۱۸۷۵ء میں جو بریلی میں مشاعرے ہوتے تھے اُن میں

شریک ہو کر داد غزلخوانی دیتے تھے اُس زمانے کے ایک مجموعہ میں چند غزلیں نظر سے گزریں اور کچھ شعر منتخب ہو کر درج کیے گئے، کلام میں زبان کا لطف موجود ہے تلاش الفاظ و مضامین بھی بری نہیں ؎

ذکر کس کا نہ تری بزم میں اکثر آیا زلف کابل لگیا لاکھ مِتن ہنے کیے	پر نہ ندکو رہمارا کبھی دلبر آیا کوئی افسوں نہ کبھی کام نہ منتر آیا
رزق پہنچاتا ہے ہر روز وہ رازق ہمکو دل میں عشاق کے کرتے ہیں ٹھکانا اپنا ابر ہو، دریا ہو، خلوت ہو، مُبت بے پیر ہو عشق پہ غش کھاتے ہیں ہمکو دیکھکر حور و ملک ہادئ معجز بیاں کے فیضِ صحبت کے سبب	گرچہ ہم لاکھ گنہ شام و سحر کرتے ہیں گھر میں اللہ کے مُبت دیکھو گھر کرتے ہیں تب کہیں حاصل مرادِ عاشق دلگیر ہو تم پری کی شکل ہو یا حور کی تصویر ہو کیا عجب دولہ ترے اشعار میں تاثیر ہو
محبت بتوں کی خدا کی قسم چلے آئے وہ گھر مرے بن بُلائے خفا ہمسے دولہ وہ کیوں ہو گیا	رگِ جاں کو نیشتر ہو گئی مری آہ کیا کارگر ہو گئی یہ تکرار کس بات پر ہو گئی

دولہ

دولہ۔ نواب جہانگیر محمد خاں صاحب بہادر مغفور معروف بہ نظیر الدولہ۔ نواب سکندر بیگم صاحبہ والیہ بھوپال سے پہلے انکے بھائی کی نسبت ہوئی مگر نوبت نکاح کی نہ آئی اور آخر قدسیہ بیگم صاحبہ نے اِن سے نکاح کر دیا۔ بعد بلوغ انھوں نے عنان حکومت ہاتھ میں لینے کے لیئے بہت دست و پا مارے اور ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے مگر نتیجہ انجام کو اچھا نہ ہوا اور عزیزوں اور اہلکاروں کی سازشوں سے آرام سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ صرف ایک لڑکی نواب شاہجہان بیگم پیدا ہوئی تھیں اسکے بعد سکندر بیگم صاحبہ سے آن بن رہی انجام کار چھبیس سال کی عمر میں جام فنا نوش کر کے سفر آخرت اختیار کیا، اِنکے کلام میں جو انکی صاحبزادی نے سنہ ۱۲۸۸ھ میں اپنے دیوان کے ہمراہ چھپوا کر مشتہر کر دیا ہے عاشقانہ اور معاملہ بندی کے

مضامین کثرت سے ہیں اور اُن سے اُنکے دلی سوز و گداز کی جھلک آشکارا ہے جو کچھ قلب پر گذرتی تھی بیشتر وہی نظم کر دیتے تھے تلمذ کا حال معلوم نہیں مگر کلام بامزا اور پُر لطف ہے چھ جزو کے دیوان کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

عبث ہی ساتھ پھرتا غیر کے اُس شاہِ خوباں کا
گدا کا ہرزہ گردی ہی ہنر، اور عیب سلطان کا

مساوی ہو نگاہِ لطف شہ اپنی رعیت پر
برابر مہر تاباں کے ہو ہر ذرہ بیاباں کا

قمر کی طرح کب منت کش خورشید انجم ہیں
نہیں لیتے ہیں عالی طبع ہرگز بار احساں کا

رہیگا علم کی دولت سے جو محروم دنیا میں
نہیں انسان وہ ہمرتبہ کہیئے اُسکو حیواں کا

نہ کیوں وہ شاہِ خوباں تمکنت کو کار فرمائے
سُبک وضعی سے اُٹھ جاتا ہے اکثر رعب شاہاں کا

مرے سر کے تلے سے نزع میں زانو نہ تو سرکا
ہے تکیہ زندگی کا جان پہ تکیہ مرے سر کا

کہاں مخلوق کو ہو فائدہ شاہِ خود آرا سے
گرے کب حلق میں پیاسوں کے قطرہ آبِ گوہر کا

جوں خار دل میں تھی مژہ یار کی خلش
فرقت میں اُسکی سانس بھی لینا عذاب تھا

خالی ہاتھ آیا ہوں منزل میں الٰہی کیا کروں
لُٹ گیا رستہ میں میرے ساتھ جو اسباب تھا

قتل کرنا عاشقوں کا اک قدیمی رسم ہے
چھوڑ جانا یہ جہاں یہ آپ کا ایجاد تھا

قطعہ

رہی جہانگیر اسلیئے نام اُنکا ساری خلق میں
گھر عروس دہر کا دولہ سے جو آباد تھا

تم خفا مجھ سے ہوئے اچھا ہوا بہتر ہوا
میں بھی تو ہرجائی پن سے آپکے بیزار تھا

تیری خاطر پاؤں اُن لوگوں کے اب پڑتے ہیں ہم
جن پہ ٹھوکر مارنے سے ہمکو ننگ و عار تھا

چوڑیوں میں بھی پسند دل جہانگیری ہی تھی
جن دنوں دولہ سے اُس پردہ نشیں کو پیار تھا

قطعہ

مت کہہ وہ اپنے گھر تھا وہ غیروں کے گھر نہ تھا
کیا اس سے فائدہ مجھے اے ہمنشیں ہوا

میرا وصال اُسکے تصور میں ہو گیا
مجھ تک نہ آیا میری بلا سے کہیں ہوا

کب جدا ہے مجھ سے دلبر کب میں دلبر سے جدا
ہو نہ گوہر آب سے اور آب گوہر سے جدا

روح تن سے جان بدن سے ہوش ہے سر سے جدا
کیا کشاکش میں پھنسا ہوں جب سے دلبر ہے جدا

جسکو غرض ہو جائے وہ طوبیٰ کی چھاؤں میں
بیٹھا ہوں میں تو سایۂ دیوارِ یار میں

تلووں لگی وہ آگ کہ سر سے نکل گئی
مہندی ملی جو غیر نے وہاں پائے یار میں

کاش وہ آرامِ جاں آئے تو جائے غم کہیں
اُسکی آنے کی اگر ٹھیرے تو ٹھیرے دم کہیں

ہیہات اُسکے ہاتھ میں غیروں کا ہاتھ ہو
آنکھوں سے ہم کو پاؤں نہ ملنا نصیب ہو

اِس انکسار پر ترے سہتا ہوں کیا ستم
پھر بھی یہ ہے دعا مری ایسا نصیب ہو ق

مَیں منتوں سے تجکو منایا کروں مجھے
تیری اُٹھانی رنجشِ بے جا نصیب ہو

حاجت نہیں ہے اور سے ملنے کی پھر تجھے
دولہ سا جبکہ چاہنے والا نصیب ہو

قطعہ

چاہت کو جو میری پا گیا ہے
ہر بات پہ اب وہ روٹھتا ہے

لو جو رہی دِل کو بھا گیا ہے
معلوم نہیں کہ کیا بلا ہے

اُسکے آنے کی نہ ٹھیری سو طرح غم کھا چکے
جان بھی جائے کہیں قصہ مٹے جھگڑا مٹ چکے

مجکو طعنہ اور مہرویوں سے ملنے کا دیا
ہیں بھی کچھ اب عرض کرلوں آپ تو فرما چکے

جب نہ اک بوسہ ہی دو تم اور نہ اک دشنام دو
دِل تمہیں کیونکر ملے اور اُسکی قیمت کیا چکے

خدا نے کر دیا ہے موم تمکو حق میں غیروں کے
دِلِ نازک تمہارا پر مری جانب سے پتھر ہے

یہ تو ہیں کیونکر کہوں تم ہو رہو میرا جی
فخر ہے میرا اگر تم کر رکھو اپنا مجھے

کیوں ذرا سی بات پر تم نے کیا رسوا مجھے
کہہ دیا ہوتا بُلا کر کان میں تنہا مجھے

آشنا ظاہر میں اور باطن میں بیگانہ صفت
تم نے در پردہ جلا کر خاک کر ڈالا مجھے

آنکھ پھر جانے ہی اُسکے ہو گیا بیہوش میں
گردشِ چشمِ بُتاں ہے ساغرِ صہبا مجھے

دِل کو مجھ سے توڑ کر اپنا اُسے بند اکیا
آہ ایسے آشنا کو یوں چھڑا یا آپ نے

دمِ قتل اپنی گردن کب اُٹھتی ہے پیر پھرتی ہے
رہے حسرت گلے پر جو تری شمشیر پھرتی ہے

دولہ - مرزا علی نقی تخلص دولہ شاگرد مرزا اصغر علی خاں نسیم دہلوی۔ لکھنو کے رہنے والے اور حضرت نسیم کے شاگردوں میں بڑے خوش فکر تھے۔ حضرت تسلیم و اشرف کے ہم مشق

دولہ

تھے مگر کلام اُسکے مرتبہ کو نہ پہنچا۔ عرصہ ہوا انتقال کیا۔ یہ چند شعر درج کیے گئے۔

عاشقوں کیواسطے حالِ پریشاں چاہیئے
آتے ہی فصلِ جنوں ٹکڑے گریباں چاہیئے

کل جو کی تھیں شرطیں ہمکا کیجئے ایفا ضرور
آج ہمکو بوسہ لعلِ درخشاں چاہیئے

چارہ گر تدبیر درماں عاشقوں کے درد کی
ہمکو پہلوئے صنم آغوشِ جاناں چاہیئے

گر نہیں چادر تو دولہ مہ سے مانگو چاندنی
کچھ تو بہر پوششِ گورِ غریباں چاہیئے

دولہ

دولہ جناب منشی علی احمد صاحب بدایونی ہیں بائیس برس سے مشق سخن کرتے ہیں اور رسالوں میں اپنا کلام شائع کراتے رہتے ہیں، باوجود کوشش و دریافت نہ تلمذ کی کیفیت معلوم ہوئی اور نہ کچھ حال ملا اشعار ملاحظہ ہوں

جذبہ دل اسے کہتے ہیں کہ مجنوں کے لئے
لیلیٰ پردہ نشیں نے بھی بیاباں دیکھا

ایک ہی تیغ سے عالم کو کیا تو نے حلال
اُف رے کافر کوئی ہندو نہ مسلماں دیکھا

خیر گذری نہ ہوا شوق اُسے زینت سے
سرمۂ چشم صنم خلق کا قاتل ہوتا

کون ہمدم ہے یہاں کس پہ بھروسا کیجئے
دل تو دل جان بھی ہم سے کے طرفدار نہیں

ٹھیریئے ٹھیریئے مژگاں کو نہ کیجے سیدھا
دل نہ چھد جائے ہمارا کہیں سوفار نہیں

کبتک یہ سہے درد و غم و رنج کے صدمے
اب صبر کی طاقت دلِ بسمل میں نہیں ہے

کس طرح ہجر میں بہلے گی طبیعت میری
کچھ تو کرد یجئے تسکیں دمِ رخصت میری

قبر پہ پھول چڑھاتا ہے وہ گل لالہ کے
بارِ احساں سے دبی جاتی ہے تربت میری

آپ پچتائیں نہیں سورۂ یٰسین پڑھیں
آپکے سر کی قسم وہ نہیں حالت میری

عید کے دن وہ رقیبوں سے بغلگیر ہوئے
ہاتھ پھیلائے ہوئے رہ گئی حسرت میری

دیوانہ

دیوانہ۔ رائے سرب سنگھ دیوانہ ہمشیرہ زادہ حقیقی راجہ مہانراین بہادر دیوان و مدار المہام نواب شجاع الدولہ صوبہ اودھ، یہ خود شاہجہاں آباد میں پیدا ہوئے اور عنفوان شباب میں کہ ابتدائی عہد شاہ عالم ثانی کا تھا اپنے عم نامدار کے پاس گئے اور مدۃ العمر وہیں امیرانہ شان و شوکت سے بسر کی اپنے ہمعصر رؤسا میں داد و دہش اور سیر چشمی اور قدردانی اہل علم و فن کی بدولت صاحب

امتیاز تھے ذات کے کھتری اور بڑے جامہ زیب نفیس مزاج، وجیہ و شکیل جوان تھے۔ فارسی شعر خوب کہتے تھے اور مرزا فاخر مکین سے ہنگام قیام لکھنؤ میں ہزار ہا روپیہ کا سلوک کر کے کامل ۱۲ برس اِس فن میں مشق کی تھی اور مرتبہ اُستادی حاصل کیا تھا۔ مشاعرے بھی بڑے کر و فر سے کیا کرتے تھے بنارس اور لکھنؤ میں بہت رہے اور اپنے وقت میں مستند شاعر مانے جاتے تھے۔ بہاؔر دیوان فارسی اور ایک دیوان اُردو میں ان سے یادگار ہیں۔ میر حیدر علی حیراؔن اور جعفر علی حسرؔت اُستادِ جراءت اِنکے قابل فخر شاگرد تھے ۱۲۰۴ھ میں پیکرِ وجود کو آتشِ فنا کے سپرد کیا۔ فارسی کلام دس ہزار اشعار سے کم نہ ہوگا ❖

دِل سدا تڑپے ہے میرا مرغِ بسمل کی طرح	یا کہ سیکھی مرغ بسمل نے مرے دل کی طرح
جان پر آبنی ہمدم مری خاموشی سے	بات کچھ بن نہیں آتی ہے اب اظہار بغیر
بزم میں رات بہت سادہ و پُرفن تھے ولے	گرمیٔ بزم کہاں اُس بتِ عیّار بغیر
دیکھ بیمار کو تیرے یہ طبیبوں نے کہا	ہوچکی اسکو شفا شربت و بیدار بغیر
دل ہے کہ تیری تیغ کے آگے سے ٹل نجائے	رستم کا کب جگر ہے کہ زہرہ پگھل نجائے
وے یار کہاں کہ یار باشی کیجئے	وے وقت کہاں کہ خوش معاشی کیجئے
اِک گوشہ میں بیٹھکر دِیوانہ تنہا	اب ناخن غم سے دِل خراشی کیجئے

دیوانہ

دیوانہ مرزا محمد علی جان باشندۂ بنارس ۱۸۴۱ء کے قریب روشن الدولہ کولبرک رزیڈنٹ کے وقت میں دہلی میں اُنکے پاس رہے پھر علیگڈھ میں تحصیلدار ہوگئے تھے اِس سے زیادہ حال معلوم نہ ہوسکا۔

اُس کا آخر ادھر کلام ہوا	اپنا قصّہ اُدھر تمام ہوا
آیا نہ بعد مرنے کے بھی وہ مزار پر	خاک اُسکے پیچھے آپکو ہمنے کیا عبث
میری سرگشتگی کو دیوانے	پہنچے کب آسمان کی گردش
جلتے جلتے ایک دن دیوانہ بس اُٹھ جائینگے	جوں چراغِ صبحدم ہم سینۂ سوزاں سمیت

دیوانہ

دیوانہ میر طالب علی صاحب دیوانہ مقیم بنارس شاگرد رشید سید عبداللہ وحشی بنارسی ۱۸۶۲ء میں زندہ تھے اور بریلی کے چند مشاعروں میں تشریف لاکر داد سخنوری دی تھی۔ کلام بامزا ہے اور آپکی چلبلی طبیعت کا آئینہ ہے یہ چند شعر ملے درج کیے گئے ؂

بندہ بے داموں بکا ہے آپکی سرکار میں
شوق سے بیچو کھڑا کر کے مجھے بازار میں

مجھ کو حیرت ہے لڑائی کیلئے چھوڑا ہی کیا
گالیاں دیتے ہیں وہ دشمن کو ہر دم پیار میں

ہو گیا ناز اُن کو اپنے حُسن پر حد سے سوا
جو نہ کہنا تھا کہا سب ہمنے اُسنے پیار میں

میں بتا دوں تمکو اب جو مجھ سے گر تقصیر ہو
تم کو بھی لذت ملے ایسی مجھے تعزیر ہو

یہ مزا ہے یار کے لعل نمک آلود میں
لاکھ بوسے لیکے بھی نیت نہ اپنی سیر ہو

اپنے مرنے کا کیا دعویٰ تو بولے ہنسکے وہ
بولتے ہو مرکے تم دنیا میں زندہ پیر ہو

وہ ہی دیوانے کو پہنا دو کہ وہ شاگرد ہے
حضرت وحشی کی جو اُتری ہوئی زنجیر ہو

کیا ہی دفن مجھے شاہراہ میں اُسنے
کہ ٹھوکروں میں ہمیشہ مرا مزار رہے

نہ دشمنوں کے لیئے دوستوں سے رنج کرو
کرو وہ بات کہ دشمن بھی دوستدار رہے

لڑی اشک کی جب گہر ہو گئی
تو زردی مرے رُخ کی زر ہو گئی

جو محنت پہ میری نظر ہو گئی
محبت تجھے فتنہ گر ہو گئی ؂

دیوانہ

دیوانہ منشی بشن گوپال باشندۂ شاہجہانپور ۱۸۹۳ء سے شعر کہتے ہیں اور جناب شاد دہلوی سے مشورہ کرتے ہیں زیادہ حال باوجود دریافت نہ مل سکا۔

اگر شان دیکھے مرے بُت کی زاہد
پڑھے اُس کا کلمہ مسلمان ہو کر

بتوں کی محبت نے کافر بنایا
چلے دیر کو ہم مسلمان ہو کر

جنازہ اُٹھائیں گی پریاں ہمارا
مرینگے مقدر سلیمان ہو کر

مزا تو یہ ہے میرے دل میں رہو تم
مری آرزو میرے ارمان ہو کر

زندگی کی تھی شب ہجر نہ کوئی اُمید
آگئی جان میں جان آپکے آجانے سے

آپ بھی کچھ دلِ بیتاب سے کہتے جائیں
یہ سمجھتا ہی نہیں ہو مرے سمجھانے سے

اس سے بڑھکر مجھے اب اور خوشی کیا ہوگی
یار نے عہد کیا غیر کے گھر جانے سے

گھر بنے آپکا بازار ہمیں کیا مطلب
ہمکو کیا کام ہے آئے کوئی جائے کوئی

دیوانہ

دیوانہ۔ قسیم الدین احمد دیوانہ سنہ ۱۹ء میں عدالتِ کلکٹری گیا میں امینِ محکمۂ مال تھے مولٰنا کوثر خیرآبادی سے تلمذ تھا۔

ہوا ہے عشق میں وارفتہ ایسا
دلِ ناداں نہیں سُنتا کسی کی

ہوئی برگشتہ ایسی میری قسمت
پھری ہے آنکھ مجھ سے اُس پری کی

گزرتی ہے جو دل کیا بیان ہو
نہیں اُمید اپنی زندگی کی

دیوانہ

دیوانہ۔ جناب حکیم سید باقر علی صاحب جیپوری۔ آپ حکیم سید منور علی صاحب متوطن جیپور کے صاحبزادے ہیں اور عرصۂ تیس سال سے گویا سنہ ۱۸۸۱ء سے فکرِ شعر کرتے ہیں پہلے باقر تخلص کرتے تھے پھر دیوانہ تخلص اختیار کیا چند شعر نتائجِ افکار سے درج ذیل ہیں

فصلِ گل میں مرا کیوں چاک گریباں ہوتا
گر مرے ہاتھ میں اُس شوخ کا داماں ہوتا

کرتے فرقت کا گلہ ہم نہ ستم کا شکوہ
غیر سے بھی جو یہ شیوہ ترا جاناں ہوتا

تمکو معلوم صنم حال ہمارا ہو جائے
دل تمہارا جو کسی پر کہیں شیدا ہو جائے

ناز و انداز یہ اُس شوخ ستمگر کی دلا
زندگانی جسے دشوار ہو شیدا ہو جائے

دیکھ کر حسنِ خداداد کو اُن کے باقر
آدمی کیا جو فرشتہ ہو تو شیدا ہو جائے

دیوانہ

دیوانہ۔ سید محمد فاروق صاحب گورکھپوری، دورِ موجودہ کے خوش فکر اور طباع کہنے والوں میں ہیں، نیچرل نظمیں اکثر رسالوں میں نکلتی رہتی ہیں۔

کثرتِ مشقِ تماشا دیکھنا
اُٹھ گیا آنکھوں سے پردہ دیکھنا

سب مزے دنیا کے ہیں نظروں میں خاک
لذتِ ترکِ تمنا دیکھنا

ہو کے محوِ دیدِ حسنِ گلرخان
ہو گیا میں بھی تماشا دیکھنا

اِک نظر میں خاک کر ڈالا ہمیں — کہیے صاحب تھا یہ کیسا دیکھنا
میری رسوائی کے ہو کے درپئے تم — ہو نہ جانا خود بھی رسوا دیکھنا

کیا کہیے شب جو حالِ دلِ بیقرار تھا — اب آئے اب وہ آئے یہی انتظار تھا
تیرِ نظر سے یہ، مری آہِ رسا سے وہ — دونوں نہ بچ سکے کہ برابر کا وار تھا
خارِ الم کی دل میں خلش رات ہی سے تھی — دیکھا جو صبح کو تو جگر بھی فگار تھا
اہلِ غرض سے دور جو صحرا میں جا بسا — دیوانہ سچ تو یہ ہے بڑا ہوشیار تھا

ردیف ڈال

ڈاکٹر

ڈاکٹر۔ ڈاکٹر بھولا ناتھ صاحب ملازم ریاستِ رامپور ۱۸۹۹ء - حضرت امیر مینائی کے خرمنِ فیض سے بہرہ ور تھے جدتِ خیال کے ساتھ زود گوئی اور خوش کلامی کے جوہر بھی ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں، زبان بھی بُری نہیں، طبیعت بھی شوخ پائی ہے - اشعار ملاحظہ ہوں

نیم جاں چھوڑ کے مقتل میں بچالے قاتل
تیرے کُشتے تو ابھی سانس ذرا لیتے ہیں

یادِ مژگاں کی جو ہے بادیہ پیمائی میں
خوب کانٹوں کے مزے آبلہ پا لیتے ہیں

وائے تقدیر کہ ہم پھرتے ہیں مارے مارے
غیر گھر بیٹھے محبت کا مزا لیتے ہیں

ڈاکٹر ہمکو نہیں اور کوئی بیماری
دردِ اُلفت کی جو دے کوئی دوا لیتے ہیں

اُدھر پھانسی گلے میں کاکلِ پیچاں نے ڈالی ہے
اُدھر چٹی لگائے آڑ میں کُرتی کی جالی ہے

حیا کا ہائے یہ کہنا کہ خواب ناز سے اُٹھئے
نہیں تو اب یہاں بوسہ کی چوری ہونے والی ہے

اے اجل تجھ سے بھی سخت اور مصیبت آئی
تو نہ آئی ترے بدلے شبِ فرقت آئی

تو نے اے چرخ کبھی چین سے رہنے نہ دیا
کٹ گیا دن تو بلائے شبِ فرقت آئی

بھولی صورت پہ یہ غصہ، یہ ستم، یہ شوخی
ڈھل کے کیا حُسن کے سانچے میں قیامت آئی

داورِ حشر سے فریاد بھی ہم کرنے نہ پائے
لب ہوئے بند زباں پر نہ شکایت آئی

ہو گئے فرطِ قلق سے مرے دل کے ٹکڑے
یاد اے زخمِ جگر جب تری صورت آئی

جو تصور میں بھی آئے تو قیامت آئی
وائے قسمت کہ اُسی پر ہے طبیعت آئی

ڈاکٹر سے نہ ہوا دردِ محبت کا علاج
چل دیا چھوڑ کے جس دم تپِ فرقت آئی

ردیف ذال

ذاخر

ذاخر - جناب سید فرزند حسین صاحب لکھنوی عرف اچھن صاحب لکھنؤ کے مشہور خاندان مجتہدان کے ممبر ہیں، آپ کو اپنے ماموں نواب سید اصغر حسین خان صاحب فاخر سے ابتدائے مشق سخن سے تلمذ رہا ہے، مولانا مہدی حسن صاحب ماہر آپکے رشتہ میں نانا تھے، مشق سخن خاصی ہے اور علمی استعداد بھی بری نہیں قاضی خلیل کے مشاعرے میں بریلی میں ملاقات ہوئی تھی اب غالباً پینتالیس برس کا سن ہوگا، کلام اور حالات بھیجنے کا اقرار کیا تھا مگر باوجود تقاضوں کے ایفا کی نوبت نہ آئی کچھ اشعار جو رسالوں سے چھنے گئے درج ذیل ہیں:-

آئے دن بجھے مری شور بدہ سری کا عالم
آجتک یاد ہو زینت ہیں وہ غصہ کی ادا
اسے فریاد سے اپنی نہ تم بدنام کر جانا
اتر کر قبر میں منھ سے کفن تم کیوں ہٹاتے ہو
لاش ہوتی دوش قاتل پر تو تھا مرنیکا لطف

کوئی مشکل نہیں شہروں کا بیاباں ہونا
آئینہ توڑ کے پھروں وہ پشیماں ہونا
نہ کاٹے کٹ سکے طول شب فرقت تو مر جانا
لڑکپن ہی ہماری دیکھکر صورت نہ ڈر جانا
لیکے بسمل کو لحد تک اضطراب آیا تو کیا

رہا کچھ تیغ پر کچھ آستیں پر
سیہ بختوں کی جب جاتی برتیں تھیں
لحد پر مہوشوں کا پا کے مجمع

نہ گرنے پایا میرا خوں زمیں پر
نہ بجلی بھی گری اتنی زمیں پر
ستارے ٹوٹے پڑتے ہیں زمیں پر

بیخودی قیس کہتی تھی کہ کیوں چھپتی ہے تو
تم پریشاں عاشقوں کی بھیڑ سے ہوتے ہو کیوں
کھینچ آیا خون دل آنکھوں میں اشکوں کی روانی سے
یقین مرگ قاتل کو نہیں ہے سخت جانی سے
ہزاروں حسرتوں کا بسملوں کی خوں ہوا قاتل
یہ خون قلب سے مہندی بھرے ہاتھوں کا نقشا ہے

شکل تیری خود اسے لیلی نظر آتی نہیں
ہوں اگر لاکھوں پتنگے شمع گھبراتی نہیں
نکالی سوز داغ دل نے آخر آگ پانی سے
گلے پر تیغ بعد ذبح بھی ہے بدگمانی سے
تڑپنے بھی نہ پایا کوئی خنجر کی روانی سے
جو مٹھی بند ہو دل ہے جو کھلجائے تو دریا ہے

لیا ہے دل کسیکا یا چمن سے پھول توڑے ہیں
ذرا ہم بھی تو دیکھیں آپکے دامن میں کیا کیا ہے
سرِ طور اے کلیم اللہ کیجے ہوش کی باتیں
جسے دیکھے نہ کوئی اُسکے ملنے کی تمنا ہے

نزع میں وہ دیکھنے کو آئے ہیں
دم نکلتا بھی ہے دیکھا چاہیئے
جسکے گھر میں بعد مدت کے وہ آئے
شادمانی اُسکی دیکھا چاہیئے
آکے تڑپا جائیں جس دل کو وہ خود
بیقراری اُسکی دیکھا چاہیئے
لحد میں نیند بھی ایسی کہ کچھ ہوئی نہ خبر
جگا جگا کے تھکا مجکو شورِ محشر بھی

تجھے قیب اُسنے گر جگہ دی نہ کر غرور انجمن میں اُسکی
یہ بچپنا ہے کہ عکس کو بھی وہ آئینہ سے بُلا رہا ہے
عیاں ہیں سامان سوروغم کے ہیں ظلمت و نور گردِ مرقد
کوئی حسین سر کے بال کھولے چراغ مرقد جلا رہا ہے
کچھ ایسے کانپتے ہیں ہاتھ گردن پر ستمگر کے
رگوں سے خط الگ پڑتے ہیں وقتِ ذبح خنجر کے
مجھے کیا دخل دل کو جس طرح چاہو کرو برباد
مگر اتنا سمجھ لو رہنے والے ہو اسی گھر کے
نکلتے ہیں یہ جتنے اُتنی ہوتی جاتی ہے تسکیں
ہیں آنسو کیا شبِ فرقت میں ارماں قلبِ مضطر کے
وہی احباب جن سے زیست میں کیا کیا اُمیدیں تھیں
چلے جاتے ہیں اپنے پاؤں میری قبر پر دھر کے

اثر یہ جذبۂ اُلفت کا بعد مرگ بھی تھا
وہیں وہ بیٹھ گئے قبر تھی جہاں میری

ذاکر۔ ہزار کوشش و تلاش کے باوصف اِس پُرگو شاعر کا نام معلوم نہ ہوسکا ضخیم دیوان کے معائنہ سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ دہلی سے آصف الدولہ کے وقت میں لکھنؤ گئے، اور اُنکی شاہانہ داد و دہش سے فیض اُٹھایا۔ امجد علیشاہ کے وقت تک زندہ تھے حضرت ناسخ سے معصرانہ مراسم تھے۔ پُرگو از حد تھے اور ۲۰ جزو کے قلمی دیوان میں فحش و غیر مہذب کلام کے جا بجا نمونے ملتے ہیں، ایک خصوصیت اور ہے کہ غیر مانوس ردیف اور قافیوں میں خوب طبع آزمائی کی ہے۔ اِس سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید شاہ نصیر کے شاگرد یا ہم مشق رہے ہوں، اِنکے قادر الکلام اور مشاق ہونے میں شبہ نہیں متروک الفاظ اکثر پائے جاتے ہیں۔ آخر عمر بہت غربت اور بے سروسامانی سے

ذاکر

کٹی۔ اب دیوان کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

ہمدموں کیا کہوں حالِ دلِ اپنا تمسے
سمجھے اپنا تھے جسے سو وہ پرایا نکلا

وہ دن تو مجکو ہنستے ہی بس کٹ گیا تمام
جس روز ہمکو وہ گلِ خنداں نظر پڑا

موتی مونگا اُسسے ملجاتا تھا دہلی وہ تھی
سیپ میں کوڑی کو جسنے کہ نچوڑا کیا کیا

شاہ نصیر الدین حیدر کو خدا قائم رکھے
کون کون ہمنے نہ دیکھا اُس کا نائب ہو گیا

وہ نگاہِ لطف اب اُسکی نظر آتی نہیں
عشق اپنا اُسپہ شاید آشکارا ہو گیا

نام تو باقی رہا دینے سے اُس کا دہر میں
صرف گو حاتم کا سب مال و خزانہ ہو گیا

جب مری جانب وہ نظر کر گیا
سینہ میں سو ٹکڑے جگر کر گیا

منتیں کیں میں نے بہت شوخ کی
پر نہ مرے پاس ٹھہر کر گیا

ہم کہتے ہیں یا قتل کر دیا بوسہ دو لب لینے کا
اِن دو باتوں میں تم سے اب بھی نہوا وہ بھی نہوا

شیخ جی بھوکے تھے ایسے کہ سیئیوں سے مانگ
تھا جو گھوڑے کا وہ ستیا رہیلا کھا یا

آیا پڑوسے کو جہاں قاضی کی لونڈی جو مری
جب موئے قاضی تو پھر کوئی نہ دیکھا آیا

غور کر دیکھا تو ہے رُوو ریا کا یہ مقام
کوئی بیکس کا اُٹھانے نہ جنازہ آیا

گھر میں تو ہوا اندھیرا اور دیئے مسجدوں میں
ہمنے جلائے گھی کے جا کر دیئے تو پھر کیا

احسان کرے لاکھوں رکھے مُنہ پہ تو ہیں خاک
اِس طرح کا مُو بھر ترا احسان نہ کٹے گا

میٹھی نظروں سے وہ اُس کا دیکھنا
ہائے میرے واسطے کیا سم رہا

جبتک کہ پاس دل رہا اندیشہ ہی رہا
جلانے سے دلکے اب مجھے آرام ہو گیا

ہمارے سینہ کا کیونکر نہ ہووے داغ نیا
نہ تیل بتی ہے جلتا ہے یہ چراغ نیا

دل دیکھ اُسے کس کا تماشام نہیں پتا
ہر چشم سیہ کا یہ بادام نہیں پتا

یہ بات جو میں سونچا دیکھیگا ہر اک لیکر
تصویر بنا اُسکی بہزاد بہت رو یا

پوچھا اُس شوخ سے میں نے یہ بھلا کسکے لیے
ق ڈال کر میوہ برابر کا بنا یا بیٹھا

ترشرو ہو کے لگا کہنے نہیں اس سے کیا
کیوں جور و جفا کرتے ہو پوچھا جو کسی نے
جسکو جی چاہا اُسے ہمنے کھلایا میٹھا
کہتا ہے یہ میرا ہے گنہگار محبت

یوں ہولی کھیلتے دیکھا ہے ہم نے آصف کو
گلال سیکڑوں من اُڑتا تھا عبیر سمیت
یہ ہوتا ہی نہیں معلوم کیوں یہاں سے رئیس
نکل گئے ہیں بہت مبلغ خطیبہ سمیت
جو بخشوانے گئے شیخ ماں سے اپنا گناہ
وہ بولیں بخش دیا میں نے بلکہ شیر سمیت
جو چار دن سے لگے کہنے شعر ہیں گے اب
وہ طعن کرتے ہیں سودا پہ بلکہ میر سمیت

دم غلامی کا جو کہ بھرتا ہو
بندگی اپنی سے نہ کر آزاد

عجب ہے ذاکر تماشا دیکھا کہ چند روز نہیں اپنے آگے
جنھیں نہ آتی تھی بات کرنی وہ کرتے باتیں بنا بنا کر
جو ہیں اُس شوخ نے پھینکا نگہ کا تیر گروں پر
وہیں بس ہو گیا مرغِ سحر نخچیر گروں پر
سُنا اُسکو جو ٹھوکر مار کر مردے جلاتا ہے
مسیحا ہو گئے جی اپنے ہیں دلگیر گروں پر
شفق پھولی نہیں ہرگز بہا ہے خون ونو کا
مہ و خور ہیں چلی ہے آج کیا شمشیر گروں پر
یہ گل تو کیا ہیں باغ جہاں کے منہ اُس گل دیکھ
کھاتے ہیں رشک سب گلِ باغِ جناں تلک
نازک مزاج جتنے ہیں وہ شوخ گنے نہیں
چمپے کے کہتے پھولوں کو ہیں دردِ سر کے پھول
مار کر منہ پہ طماچوں کو چھڑا دیوے نسیم
اپنی منقار سے گر گل کو اُٹھا لے بلبل

کیا حسن بیاں کروں میں اُس کا
بس دیکھ کے اُسکو مر گئے ہم
سمجھا نہ ہمیں وہ اپنا عاشق
جاں اپنی سے مفت پر گئے ہم

عیاں جو اُسنے کیا وہ عیاں تو سب پر ہے
نہاں جو اُسنے کیا وہ نہاں نہیں معلوم
موسم گل قید میں گذرا تو اے صیاد ہم
کیا کرینگے اب قفس سے تیرے ہو آزاد ہم
خوف کے مارے جو منہ پر نہیں کہتے تجکو
جان تو دل میں وہ اپنے بجدا کہتے ہیں
پی کے مے زاہد تو گلیوں میں پڑے ہیں لوٹتے
شیخ افیوں کے نشے میں بولتے ہیں ناک میں

رکھے الٰہ امجد علی شاہ کو مدام
قطعہ
دیتا دعا ہر ایک اُسے راہ باٹ میں

لندن کے تو سوا ہیں پل ایسا تھا بنا ہوتی تھی گفتگو یہی شہ اور لاٹ میں
ذاکر نے بد کے سر کو قلم کر دیں کہا بنوایا شہ نے آہنی پل راج گھاٹ میں

نہ آیا حیف وہ ظالم کہا تھا جسنے آنے کو بڑی قسمت ہے اپنی دوش کیا دیجے لگانے کو
کو سنچے سے اپنے بجھتے ہے جو اُٹھانا مجکو بیٹھنے کا بھی بتا دشت بجے ٹھکانا مجکو

آنکھ اُٹھا کر تو دیکھو میری طرف بات گو مجھ سے اب بھلا نہ کرو
یہ میں جانوں ہوں دوگے آخر رنج باہیں کر دل کو مُبتلا نہ کرو

بات آگے نہ کر سکا کوئی آنکھیں ایسی دکھا گئے سب کو
مرنے کے بعد آب ندامت میں غرق ہوں تر کرتا بار بار پسینا کفن کو ہے

ہے یقیں مجکو یہ دل میں کریں اُسکے تاثیر پُہنچیں اُس تک جو مری آہِ رسا کے جھونکے
قشقا ہے کھینچا جب سے بُت پر جمال نے اسلام تب سے ترک کیا شیخ و شاب نے
انگڑائی لیکے تو جو اُٹھا جی پھڑک گیا کیا پیاری میرے دل کو تری یہ ادا لگی
سب کالے بال ہو گئے ڈاڑھی کے شیخ کی ترکیب ایسی یاد ہے اُن کو خضاب کی
مُجھ سے وہ آزردہ یار دیکھئے کب تک رہے دل یہ مرا بیقرار۔ دیکھئے کب تک رہے

ذاکر

ذاکر۔ مولوی ذاکر علی بنارسی خلفِ مولوی فضل علی شاگردِ مصحفی صاحبِ دیوان گذرے ہیں مشاق شاعر اور بڑے سخن سنج مانے جاتے تھے نزاکتِ خیال کے ساتھ مضمون آفرینی کا بھی شوق تھا۔

شب جو باتوں میں وہ مہ پیکر بہل کر رہ گیا رنگ سو سو طرح سے گردوں بدل کر رہ گیا
لیلیٰ کا جب کہ نجد سے محمل نکل گیا آرامِ قیس لاکھوں ہی منزل نکل گیا

لالۂ صد رنگ پھولا کوہ پر تو کیا عجب کوہکن کا خون کیا کیا رنگ ابھی دکھلائیگا
شب جو نالاں بیکسی سے یہ دلِ صد پارہ تھا آسماں سے خونفشاں ہر دیدۂ سیارہ تھا
چلتا ہے وہ قیامت اُس شوخ نوجواں کا برپا ہے ہر قدم پر اک شور الاماں کا
یہی ہے گر حالِ آہِ سوزاں گرینگے جلکر فلک زمیں پر یہی ہیں نعرے تو دیکھ لینا کہ حشر ہی حشر تک زمیں پر

دِل پھر گیا حرم سے اب دیر ہیں بسا ہی
پُتلیوں تک خون ہو لختِ جگر آنے لگے

دل ہیں صنم صنم ہے لب پر خدا خدا ہی
لعلِ احمر سنگِ موسی ہیں نظر آنے لگے

جواہر خانہ زنداں کو کیا ہے چشمِ پُر خوں نے
مری زنجیر پر زنگ جڑ دیئے ہیں اشکِ گلگوں نے

طوفانِ آتشیں پہ ہے عمرِ رواں مری
تو دستِ برہمن سے مارا پڑے گا زاہد

شورِ تنورِ آب زدہ ہے فغاں مری
ناقوس اے ستمگر ٹوٹا تو سنکھیا ہے

ذاکر

ذاکر ۔ میر جان مرحوم خلف میر فخر الدین ماہر لکھنوی، اپنے والد کے شاگرد تھے سنہ ۱۲۷۴ھ کے قریب انتقال کیا، اشعار سحر آمیز کہتے تھے، اہلِ مشاعرہ اکثر انکا کلام سُن سُنکر لوٹ لوٹ جاتے تھے، یہ چند شعر انکے ہاتھ آئے، ہدیۂ ناظرین کیئے جاتے ہیں ؂

ہوتا ہے جنکو نزلہ تو ذاکر سُنا ہے یہ
سمجھے ہے ناس لینا وہ اکسیر ناک ہیں

اُس کو بھی کیسے خلق ہیں وہ زن مرید ہے
دو دانت بڑھ کے آگے کے آئے ہیں یہ نکل
ذاکر ہیں اُنکے در پہ یہ بیٹھا کہ رہ گئے

خلوت ہیں جو پڑے کوئی اپنی دولہن کے پاؤں
سمجھو تو شیخ جی کے یہ دو ہیں دہن کے پاؤں
ہل سکتے اب ذرا نہیں مجھ خستہ تن کے پاؤں

ذاکر

ذاکر ۔ مرزا ذاکر الدین بہادر گورگانی از اولادِ میرزا جواں بخت ولیعہد اول شاہ عالم ثانی چونکہ وہ خود بنارس جا رہے تھے اس لیئے انکی اولاد وہیں محلہ شوالہ ہیں مقیم رہی ۔ شاگرد مرزا قادر بخش گورگانی دہلوی، دقت پسند طبیعت پائی تھی اور اکثر مضامین اس طرح باندھتے تھے کہ صفائی سے دُور جا پڑتے تھے تاہم مشاق سخنور تھے سنہ ۱۸۸۰ء تک زندہ سلامت موجود تھے اور سرکار سے اپنی خاندانی پنشن پاتے تھے ؂

کوہکن کا سر سمجھکر روئی وہ تصویر پر
اتنا لاغر ہوں کہ پھنس جاؤں ہیں اسمیں مثلِ دام
وہ ہیں محوِ خود نمائی اور ہم محوِ خیال
کھو دیئے ذاکر مئے مایوسی و حرماں سے ہوش

جب حباب آئے نظر شیریں کو جوئے شیر پر
لپٹے گر تارِ نگاہِ مورچہ و تکبیر پر
دستِ اندازی ہو کیا تصویر سے تصویر پر
گردشِ ساغر کا شک ہے گردشِ تقدیر پر

عشق صادق کا اثر ہے آہِ آتشبار ہیں
آ بلے غنچے بنے بلبل تری منقار ہیں
چار آنکھیں اسکی ہوں چاٹے جو مجھ وحشی کا خون
دیدۂ آہو بنے جوہر تری تلوار ہیں
ہوشوں کے دھیان ہیں اکر کو استغراق ہے
ان دنوں مسکن بنایا ہی تجلی زار ہیں

خاک اڑانے کی تمنا گر ہمیں وحشت ہیں ہو
پھر زمیں سو کوس نیچی تجھ سے چرخ پیر ہو
عاشقوں کے ہاتھ پہلے کاٹتے ہیں وقتِ قتل
تا قیامت ہیں نہ کوئی ان کا دامن گیر ہو
ہوں وہ افتادہ جو بعدِ مرگ ہو اٹھنے کا قصد
موجۂ ریگِ رواں کی پاؤں ہیں زنجیر ہو
بے وسیلہ وصل معشوقوں کا ہے مجھکو پسند
پونچھ ڈالوں آنکھیں گر سرمۂ تسخیر ہو
روشنی ایسی نہ تھی ذاکر تمھاری نظم ہیں
دھیان ہیں شاید کسی کا روئے پرتنویر ہو

مری حیات کا باعث وہی نگار رہے
بجائے روح بدن ہیں خیالِ یار رہے
دبائو نعش کو گردِ نگارہ گلرو ہیں
کہ میرا حسن کے گلزار ہیں مزار رہے
دکھاؤ آتشِ رخ پر ہلالِ ابرو تم
کہ جس سے نعل در آتش یہ دلفگار رہے
جدا رخ سے زلف اے قمر ہوگئی
تماشا ہے بے شب سحر ہوگئی
شبِ وصل وصو کا تھا کیا اے خدا
ذرا آنکھ جھپکی سحر ہوگئی
یہ تڑپے پسِ مرگ مدفن ہیں ہم
زمیں ساری زیر و زبر ہوگئی

ذاکر — مولوی محمد ذاکر علی باشندۂ قدیم قصبہ شاہ پور ضلع فتحپور ہسوہ، یہ سبیل روزگار ابتدائے سن شعور سے مختلف اضلاع ہیں رہے چنانچہ ۱۸۸۶ء ہیں کئی سال سے آگرہ کی کمشنری ہیں سررشتہ دار تھے استعداد علمی معقول تھی، انکے کلام سے پایا جاتا ہے کہ فکرِ سخن ہیں مضمون پیدا کرنے کا خیال بہ نسبت ادائے بیان ہیں سلاست اور صفائی پیدا کرنے کے زیادہ رہتا تھا اس لئے باوجود اسکے کہ بڑے پرگو کہنے والے تھے کلام ہیں سادگی۔ روانی اور صفائی کا عنصر کم ہے، میرزا حاتم علی بیگ مہر کے مشورہ سے شعر کہتے تھے جو اس زمانے ہیں آگرہ کے شعرا کے سرتاج مانے جاتے تھے، اور فی الواقع ایک مسلم الثبوت استاد اور اپنے

وقت کے مشاہیر میں ہر طرح ممتاز تھے، دیوان نغمۂ بہار نامی اٹھان بیس جزو پر اُس زمانہ میں چھپا تھا، ذاکر، منشی خادم حسین رئیس، صفی امروہوی، ماہ لکھنوی، بزم اکبر آبادی وغیرہ سے ہم صحبت رہتے تھے، فارسی میں بھی ایک مجموعہ مختصر ان سے یادگار رہے۔ طولانی غزلوں میں بھی بمشکل ایک دو شعر مغلق اور پیچیدہ تراکیب سے مُعرّا نکلتے ہیں، مگر ہمنے حتی الوسع صاف عاشقانہ زبان کے اشعار چنے ہیں دیوانِ مطبوعہ کا از سرتاپا انتخاب اپنی پسند کے موافق ضیافت طبع شائقین کے لیئے مہیا کیا جاتا ہے اس میں ہمنے اخلاقی مضامین ارادتاً زیادہ چُنے ہیں۔

وہ شائق ہوں کہ اپنی جان شیریں دیکے کھاتا ہوں
بہت میٹھا ہے پھل قاتل تری شمشیر بُرّاں کا

سچ پُوچھو تو کچھ جھوٹ سے حاصل نہیں ہوتا
سرسبز کبھی دعوئے باطل نہیں ہوتا

کہدو یہ خریداروں سے مول اسکا نہ پوچھیں
جو دے نقدِ دل کوئی وہ بیعانہ ہے اُس کا

رہبر راہِ حقیقت ہے غم عشق بتاں
وہ مصیبت پڑی سر پر کہ خدا یاد آیا

یہ غم کو، مجھے کھائے جاتا ہے غم
وہ میری ہیں اُس کی غذا ہو گیا

آج تک کیا نہ ہوا اور نہ ہوگا کیا کیا
دیکھا اور دیکھیں گے دنیا کا تماشا کیا کیا

دل ہی دل میں میری باتوں سے کٹے جاتے ہیں غیر
رکھتی ہے میری زباں قاتل اثر تلوار کا

عطر ہے جس کا پسینہ وہ بدن کیا ہوگا
لب ہیں جسکے شیریں وہ دہن کیا ہوگا

بال بکھرے ہیں تو کیوں اتنے پریشاں ہیں حضور
تھوا زلف میں شانہ تو بلا سے نہ ہوا

غیر سے ہم کنار کیا کہنا؟
مجھ سے ملنے میں عار کیا کہنا؟

نہ چلا دیکھے آسمان سے کبھی
میرے مشتِ غبار کیا کہنا؟

وہ خفا مجھ سے تم اُنہیں ذاکر
سکئے جاتے ہو پیار کیا کہنا؟

پہلے کہاں تھا خاطر نہ جفا سے تو آشنا
انشا ہمیں نے اوستم ایجاد کر دیا

آفتاب رُخ پُر نور کی تابش ہے غضب
دھوپ جلنے لگے پڑ جائے جو سایہ انکا

ہم پری کہتے ہیں اُنکو وہ ہمیں دیوانہ
ایک مدت سے یہ جھگڑا ہے ہمارا اُنکا

ذاکر خوشی کے ساتھ نہ کیوں پی لیا کروں
کرتی ہے دل سے دور غمِ دو جہاں شراب

زاہد تو پی لو قسم کھانے کو اک ساغر شراب
ورنہ کب جنت میں دینگے ساقیِ کوثر شراب

ہو کے ساقی نے تنفّر جو دیا جامِ شراب
سمجھے ہم سرکہ بھی ہے داخلِ اقسامِ شراب

میں نے یوسف جو کہا کہنے لگے پیار سے آپ
کچھ مجھے مول نہیں لائے ہیں بازار سے آپ

تو نے جو بہرِ عیادت کل کا ہے وعدہ کیا
تندرستوں سے بھی اچھے ہیں ترے بیمار آج

دے چکا ساتھ خط کے صبر و قرار
اب مرے پاس کیا رہا قاصد

پھر نہ جائے خدا سے اے ذاکر
ہو کے اُس بُت سے آشنا قاصد

ہوں وہ وحشی کہ نہیں چین مجھے گھر باہر
گھر ستاتا ہے جنوں پڑتے ہیں پتھر باہر

کریں تجویز کیا منسوخیِ تحریرِ قسمت کی
خدا کے گھر سے آیا ہے یہ جھگڑا فیصلہ ہو کر

چاہیے جو اپنی خیر تو جائے نہ شر کے پاس ؂
ہو جس بشر میں شر نہ رہے اُس بشر کے پاس

ہو کے مفلس بھی نہ شاکی ہوجیے تقدیر کے ہم
شکر ہے صبر کی دولت تو بچی زر کے عوض

واں پہنچکر سب مرے ہو جاتے ہیں بیکار خط
بھاؤ میں ردی کے بکتے ہیں سرِ بازار خط

کیا خاک ہو غمِ دلِ اندوہگیں غلط
لکھا نصیب کا بھی ہوا ہے کہیں غلط

نہیں ان دو بلاؤں سے کہیں چین
جہاں دیکھو زمین و آسمان ایک

رہا ذاکر نہ بعدِ حضرتِ مہر
زمانے میں سخن کا قدرداں ایک

کترا کے نکل جاتے ہو کیوں راہ میں ہم سے
عاشق ہیں تمھارے کوئی رہزن تو نہیں ہم

گانا سُن سُنکے ترا جی سے گزر جاتے ہیں
سینکڑوں ہی تری ہر آن پہ مر جاتے ہیں

اللہ رے بیخودی نہیں اتنا بھی ہمکو ہوش
بیٹھے ہیں کسکے پاس کہاں ہیں خبر نہیں

ٹھہرے یہ پاس آپکے ممکن کبھی نہیں
لیجاتا میرے دلکا کوئی دل لگی نہیں

گھر آپکے بچشمِ گہربار آئے ہیں۔
ہم نذر دینے موتیوں کا ہار لائے ہیں

کروں میں کس کس پہ دلکو مفتوں ہیں خوبرو کم سے کم ہزاروں
خدا ہی کو اپنے کیوں نہ مانوں کہ ہے وہ تنہا صنم ہزاروں

کہوں میں کیا حال اپنے جی کا نہیں ہے پرساں کوئی کسی کا
مری مصیبت نہ پوچھو کیا ہے بلا کا ہر وقت سامنا ہے
دِل بیچتے ہیں ایک صنمِ خوش ادا کے ہاتھ
دکھائے لطف یہ گردش نے مجکو غربت میں
تمام عمر سفر میں بسر ہوئی اپنی
کہتے ہیں وہ دکھلا کے مجھے کاکلِ عارض
مثل اُس کا ندیکھا نہ جواب اس کا سُنا ہے
عاصی ہوں لاکھ پھر بھی جو تو چاہے اے کریم
پہچانو گے نہ کعبہ کا رُخ بھی جناب شیخ
بیان کیا عجب کا ہو اُسکے کہ سایہ تک جسم کو دور بھاگے

خا ہے اس میری بیکسی کا کہ ایک میں اور غم ہزاروں
دِل اپنا اُس لف میں پھنسا ہے کہ جسمیں ہیں پیچ و خم ہزاروں
قیمت وہی خوشی سے جو دیدے اُٹھا کے ہاتھ
جہاں رہے یہی سمجھے کہ ہم وطن میں رہے
مسافرانہ بھی اک دن نہ ہم وطن میں رہے
لو دیکھو کہ ہوتی ہے شب ایسی سحر ایسی
کس مُنہ سے کہیں ہم دہن ایسا کمر ایسی
جنت کو فخر تیرے گنہگار سے ملے
گھر تک جو اِن بتوں کے خدا کی قسم گئے
ملا سکے آنکھ اُس پری سے کسی بشر کی مجال کیا ہے

موت میری شکل سے بیزار ہے
پھیک دونگا پھاڑ کر فردِ گناہ
تم کہے جاتے ہو میں خاموش ہوں

زندگی کی کیا ہو صورت دیکھیے
واں مری دیوانگی کام آئے گی
میں کہوں تو بات کیا رہ جائیگی

ذاکر شیخ برکت اللہ صاحب دہلوی۔ صاحبِ دیوان ہیں، حالات باوجود کوشش مُہیا نہ ہو سکے نہ دیوان سے کچھ پتہ چلتا ہے طباع اور ذہین شخص معلوم ہوتے ہیں، زبان اور بندش دونوں اچھی ہیں اور اُس میں معرفت کا رنگ اچھی طرح نمایاں ہے، دیوان کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

کعبہ میں بتکدہ میں ڈھونڈا ہے خوب تجھکو
روزِ الست سے اِک سرشار ہم نہیں ہیں
ہر رنگ میں عیاں ہے ہر شکل میں نہاں ہے
بجلیاں دل پہ گراتا ہے ہزاروں ظالم
یہ بھی ہے جذب محبت کا کرشمہ کوئی

آخر کو ہمنے پایا دل میں مقام تیرا
عالم ہے مست پیکر وحدت کا جام تیرا
گر تو نہ دیکھے اُسکو تو ہے قصور تیرا
محفلِ غیر میں یہ آنکھ لڑانا تیرا
تیغ کھنچتی ہے کھنچا جاتا ہے کچھ دل میرا

پھر کہہ رہی ہے آبلہ پائی جنوں سے آج
سوکھی زبان ہے سرِ ہر خار دیکھنا

بت سے نفرت ہی مگر بیخود ہیں شوقِ حور میں
شیخ صاحب کی ذرا پرہیزگاری دیکھنا

کٹوا کے سر کو خوش ترا رنجور ہو گیا
اِک دردِ سر تمھارے روز کا اب دُور ہو گیا

اسقدر چمکے شبِ ہجراں کہ اختر بن گئے
دِل کے داغوں سے اندھیرے میں اُجالا ہو گیا

ہم نہ کہتے تھے نہ دیکھو آئینہ یہ کیا ہوا
کِس لئے ششدر ہوئے کیوں تمکو سکتا ہو گیا

سیلِ گریہ میں تصور اُنکی مژگاں کا رہا
ڈوبنے والوں کو تنکے کا سہارا ہو گیا

بن گئی ہے دم پہ کیا اے حضرتِ ذاکر کہو
تمکو کیوں دشوار اب راتوں کا سونا ہو گیا

پھر مجھے لیجا کے واں رسوا کیا
جو کیا اے دل بہت اچھا کیا

یہ سُنا ہے غیر سے شکوا کیا
شکر ہے کچھ ذکر تو میرا کیا

ملکے روئیں مجھ سے میری حسرتیں
حسرتوں سے ملکے میں رویا کیا

لختِ دل آنکھوں سے نکلے تو کہا
دیکھ آگے آ گیا تیرا کہا

کہاں کسی ہیں یہ خود نمائی کہاں کسی ہیں یہ دلربائی
اگرچہ دیکھی بہت خدائی پر ایک تم سا حسیں کو دیکھا

آئے ہیں بن سنور کر پہلو میں عاشقوں کے
ارماں بڑھا گئے ہیں کچھ اور رات ڈھل کر

زلف عارض پہ کھا رہی ہے بل
چھائی کالی گھٹا ہے گلشن پر

چار تنکوں نے گل کھلائے ہیں
بجلیاں لوٹ ہیں نشیمن پر

دلِ حزیں اگر تصدق ہو گیا شبہائے ہجراں پر
فغاں پر، آہ پر، فریاد پر، حسرت پر، ارماں پر

قیامت ٹھوکریں کھاتی ہے فتنہ پاؤں پڑتے ہیں
عجب انداز سے آتے ہیں وہ گورِ غریباں پر

نگاہِ لطف کی تیری یہ ادنیٰ کارسازی ہے
کہ میرے کام جو مشکل تھے آساں ہوتے جاتے ہیں

بے حجاب آج کس نے دیکھ لیا
بات کہیئے تو شیخ جی دِل کی

کیوں تیغِ دو دم آج ترے زیبِ کمر ہے
خوں ریزیِ عشاق مگر مدِ نظر ہے

محیطِ آبِ غیرت ہوں غریقِ بحرِ عصیاں ہوں
مری تردامنی سے ہو گئے لب خشک ساحل کے

ذاکر

ذاکر منشی عنایت خاں ذاکر سنہ ۱۹۰۱ء میں کراچی بندر میں ریلی برادرز کے دفتر میں کلرک تھے، اُس زمانے کی چند غزلیں ہاتھ آئیں اُنکا انتخاب موجود ہے۔

بتوں سے ہے دن رات صحبت ہماری
دکھاتی ہے کیا دیکھیں قسمت ہماری

چلو آج چلکر پئیں شیخ صاحب
کسی دن تو سن لو نصیحت ہماری

ہم اے شیخ کیا حور لیکر کرینگے
ملیگی نہ اُس سے طبیعت ہماری

وطن جاکے باہم ملیں دوستوں سے
کہاں ایسی ذاکر ہے قسمت ہماری

ذائق

ذائق۔ جناب منشی عبدالعزیز لکھنوی عرصہ تک کراچی بندر کی نیوسٹار وکٹوریہ تھیٹریکل کمپنی میں ڈراما نویس رہے، اِس روزگار کے سلسلہ میں تمام ہندوستان کی سیاحت بھی کئی مرتبہ بخوبی ہوگئی اب ۴۰ برس کے قریب عمر ہوگی سنہ ۱۹۰۱ء میں نامی پریس کانپور میں بھی ملازم رہے مفصل حالات کے لیئے بارہا احباب لکھنؤ سے تقاضا کیا، کسی سے جواب باصواب نہ آیا اشعار بہم رسیدہ کا انتخاب یہ ہے۔

نہ کہنا شب وصل ماننا کسی کا
غضب ہوگیا ضد پہ آنا کسی کا

باقی ہے میرے دل میں خدا جانے کیا اُمید
فرقت میں دم لبوں پہ ہے مرتا نہیں ہوں میں

بے دین کر دیا بتِ کافر کی چاہ نے
ڈر سے خدا کا نام بھی لیتا نہیں ہوں میں

شب بھر مجھے چھاتی سے لگائے تھا کوئی شوخ
اِس خواب کی تاثیر کا کیا دیکھیں اثر ہو

شوخی تو یہ دیکھے ستم ایجاد کی کوئی
کہتا ہے وہ ہمسے کہ تمہیں بانیٔ شر ہو

وفا کیا کرینگے کسی باوفا سے
ستم کرنے والے جفا کرنے والے

شرمندہ ہے قمر ترے گالوں کے سامنے
سنبل کو پیچ و تاب ہے بالوں کے سامنے

شوخی تمام بھول گیا چرخ کج ادا
چکر میں آگیا تری چالوں کے سامنے

ذائق

ذائق شیخ منیر اللہ کانپوری شاگرد حاذق دور موجودہ کے شاعر ہیں اور یہ کلام ہے۔

شیدائے چشمِ میگوں مستانہ ہوگیا ہے
مجنوں ہیں جو ہیں کہتے دیوانہ ہوگیا ہے

مسجد میں بیٹھکر تو پیتا ہے مے جو واعظ	تیرا طریق بالکل رندانہ ہوگیا ہے
ہم کوچۂ بتاں میں چکر لگا رہے ہیں	زاہد ہمارا کعبہ بتخانہ ہوگیا ہے
دل میں بتوں کی الفت ذکرِ خدا زباں پر	واعظ کی کچھ نہ پوچھو دیوانہ ہوگیا ہے

ذبیح

ذبیح۔ مرزا امان علی مقیم بہادر، بقول نساخ شیعہ عقائد سے توبہ کر کے سُنی ہوگئے تھے اور ۱۸۷۰ء تک حیات تھے ÷

اسقدر تو ہو رجوعِ قلبِ عاشق سوئے دوست	مُنہ جو دشمن کا نظر آوے تو سمجھے روئے دوست
یہ وہی سر ہے کہ اب ہے اپنے زانو پر سدا	بارہا اسی کو تھا میسّر تکیہ زانوئے دوست

ذبیح

ذبیح۔ نواب اسمٰعیل خاں ذبیح معروف بہ اچھّے میاں، بریلی کے رؤسا میں نواب حافظ الملک رحمت خاں کی اولاد میں تھے، محمد ابراہیم خاں کے بیٹے اور نواب عبدالعزیز خاں عزیز مرحوم کے بھتیجے تھے۔ سترہ اٹھارہ برس ہوئے پچاس برس کی عمر میں انتقال کیا۔ یہ اُسکے کلام بہم رسیدہ کا خلاصہ ہے جو بڑی وقت سے معرفت شفیقی و مکرمی قاضی محمد خلیل صاحب رئیس بریلی دستیاب ہوا ÷

حافظ آتشِ حب ہے دلِ بیتاب اپنا	آگ اُسپر ہوئی قائم وہ ہے سیماب اپنا
عشق نے ہمسے ازل ہی میں لیا تھا آرام	آنکھ بھی پائی نہ تھی جب سے گیا خواب اپنا
وہ ہوں حباب کہ قطرہ مے عادم کا تھا	اُبھار لائی ہے اِس نشہ میں ہوائے شراب
اثر شکستہ دلی کا ہے جسمِ لاغر پر	شکن کی طرح پڑا ہوں میں اپنے بستر پر
ملجائے کوئی بُت تو اُسے دل میں جگہ دیں	کعبہ کے لیئے ڈھونڈتے پھرتے ہیں صنم ہم
تسکین مجھ سے ہو جو کسی تشنہ کام کی	اے آبِ تیغ یہ بھی ہے اک بات کام کی

ذبیح

ذبیح۔ مولوی سید محمد سمٰعیل ساکن تحصیل چھپرا مؤ ضلع فرخ آباد ۱۲۶۲ھ ہجری سال ولادت ہے، نیک نفس خلیق، اور پاک باطن شخص ہیں۔ عربی۔ فارسی کی قابلیت معقول رکھتے ہیں ابتدائے عمر میں معلمی کرتے تھے، معلمی کے بعد اپنے بھائی مولوی محمد عمر مرحوم کی تحریک

سے وکالت کا امتحان دیا اور پاس ہوگئے، جب تک اِنکے برادر مذکور فتح گڑھ میں وکالت کرتے رہے یہ اور مقاموں میں رہے اُنکی رحلت کے بعد فتح گڑھ میں وکالت شروع کی اور آجتک وہیں وکالت کرتے ہیں، شعروسخن کا ابتدائے عمر سے شوق ہے، فارسی زبان میں بھی فکرِ سخن کرتے ہیں بلکہ اُردو سے زیادہ اس طرف توجہ ہے، نواب فصیح الملک جہاں اُستاد حضرت داغ دہلوی مرحوم کے جاں نثار شاگردوں میں ہیں، اگرچہ کسی وقت اپنے اُستاد کی زیارت سے مشرف نہیں ہوئے مگر انکی عقیدت اور ارادت کی وہ حالت ہے کہ جو ہر وقت کے حاضر باش کو بھی نہیں ہوسکتی، نہایت زندہ دل اور عجیب فکر طبیعت پائی ہے، اگرچہ وکالت کا کام وہ ہے جو آدمی کو دوسری طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا مگر جناب ذبیح اسکے ساتھ ساتھ اپنے تمام دلچسپیوں کے مشاغل بھی نہیں چھوڑتے شکار اور شاعری دونوں کا شوق برابر ہے۔ بلکہ یہ التزام ہے کہ سال کو تین فصلوں پر تقسیم کرکے ایک ایک فصل کے لیئے اپنا ایک ایک کام مقرر کر رکھا ہے، یعنی چار مہینے قانونی خدمت چار مہینے شاعری، چار مہینے شکار، غرضکہ عجب رنگ کے آدمی ہیں۔ زندہ دلی میں فرد ہیں۔ اکثر شاعری بھی کرتے رہتے ہیں۔ ۳۰ برس سے مشقِ سخن ہے اور بدرجۂ اوسط سب خوبیاں انکے کلام میں موجود ہیں ؛

ہاں ہٹ کے ذرا راہ سے ای گیسوں والے	بھڑ جائے نہ تجھ سے دلِ دیوانہ ہمارا
نگاہیں قیس کی ٹکرا رہی ہیں سر قیامت ہے	اُٹھادے اے صبا للہ تو ہی پردہ محمل کا
ادھر شوقِ شہادت ہے رگوں میں خون کی طغیانی	اُدھر چل چل کے رک جانا گلے پر تیغ قاتل کا
ہزاروں بیگنہ دن رات یونہیں قتل ہوتے ہیں	نہ دم رکتا ہے خنجر کا نہ دل دکھتا ہے قاتل کا

یار کے نام پہ لازم ہے فدا ہوجانا	اک اسی فرض کا باقی ہے ادا ہوجانا
پھر مجھے موردِ الزام بنانا تا حق	غیر کی بات پہ پھر مجھسے خفا ہوجانا
زلفیں تا شانہ تو جا پہنچی ہیں اب دور ہی کیا	تا کمر بڑھکے انھیں دامِ بلا ہوجانا

خلشِ نوکِ مژہ رنجشِ دل میں پس کر
نہ تو وہ نکلی نہ ارمان ہمارا نکلا

ضبط نے بھر کے طبیعت کبھی رونے نہ دیا
داغِ غم دامنِ دل سے کبھی دھونے نہ دیا

اللہ اللہ تری بیگانہ مزاجی جس سے
غیر تو غیر ہیں اپنا مجھے ہونے نہ دیا

اے ہوا تیری غرض کیا ہے کہ تو نے دم بھر
شمعِ مرقد کو مرے حال پہ رونے نہ دیا

اے بتو بندہ پروری سیکھو
حوصلہ ہے اگر خدائی کا

ہوئی پھر جو فصلِ بہاری کی آمد
ہرے پھر یہ زخمِ جگر دیکھ لینا

نظروں سے جو اترے ہیں تو سولی پہ چڑھے ہیں
اللہ غنی رتبۂ شاہانہ ہمارا

اے فلک زور پہ اپنا جو ستارا ہوتا
پاس میرے بھی کوئی چاند کا ٹکڑا ہوتا

پرتوِ رخ نہ سہی سایۂ کاکل ہی سہی
کوئی تو آ کے انیسِ شبِ یلدا ہوتا

وہ مسیحا نہیں آتا ہے تو موت آ جاتی
دردِ دل کا تو کسی طرح مداوا ہوتا

میرے مرنے پہ تو مخلوق نہ ہنستی مجھ پر
خوب ہوتا سرِ بالیں نہ مسیحا ہوتا

رخصت اے رشک کہ ہم صلح عدو سے کر لیں
دیکھ لیں ہم بھی کہ لڑتی ہیں نگاہیں کیونکر

کوئی شے عالمِ بالا سے پلٹتی ہی نہیں
اے ذبیح آتی ہیں واپس تری آہیں کیونکر

پہلو سے تیرِ یار نکالا تو اس کے ساتھ
لپٹے ہوئے ذبیح کے نکلے پارہ ہائے دل

یہ عجب بات ہے ساقی ترے میخواروں میں
مست مستوں میں ہیں ہشیار ہیں ہشیاروں میں

تھی مجھے اپنی دوا کے لئے عیسیٰ کی تلاش
وہ ملے بھی تو ملے آپ کے بیماروں میں

مناظر ہیں خدا کی صنعتوں کے
خدا رکھے خدا ساز ان کی آنکھیں

مجھ سے ظاہر میں فلک اور خفا تو دل میں
ایک عدو سر پہ سوار ایک بلا کو دل میں

پھر جان زار بھی نہ تھی عندلیب سے
چھوٹا جو برگِ گل دہنِ عندلیب سے

جلوہ ہے ایک ہم سے نہ پنہاں قریب سے
دیکھا ہے ہم نے دور سے اس نے قریب سے

کل میکدہ میں شیخ کی حالت تھی اور ہی
آتے ہیں آج تو یہ نظر کچھ ادیب سے

موسیٰ کی طرح ہوش ہم اپنے گنوائیں کیوں
کچھ اُنکے رعب حسن سے کچھ میرے خوف سے
بیوجہ مُنہ پھُلائے نہیں ہیں چمن میں پھُول
اک آنکھ سوئے گُل بھی تو اک سوئے آشیاں
مرے سینے کے ویرانے میں کیا جانے دھرا کیا ہے
ایک وہ خنجر جو چلنے کو کفِ قاتل میں ہے
آج خوش خوش جا رہا ہے قیس کیوں ناقے کے ساتھ
مجھ سے حاصل میری دلکی حسرتوں کا پوچھنا
مرگِ دشمن کی مجھے اُنکو مرے مرنے کی فکر
وسعت آبادِ جہاں ہیں جن کی گنجایش نہ تھی
نہیں سمجھتے ہیں زلف سیہ کے دیوانے
مجھے جو دیں وہ عقوبت تو مستحق ہوں میں
شب وصل اُنکے چہرے کی ضیا کچھ اور کہتی ہے
بٹھائے دیتی ہے جی گرچہ کوتہ دستیٔ قسمت
لبِ جاں بخش کے عیسیٰ نفس ہونیکا کیا کہنا
کسی کی موت قبل از وقت تو آتی نہیں ہرگز

ذکر حبیب خوش ہے لقائے حبیب سے
نکلی نہ ایک بات زبانِ رقیب سے
بھڑکا دیا صبا نے انھیں عندلیب سے
صیاد جب چھٹا تھا چمن عندلیب سے
نہ تیرا غم نکلتا ہے نہ میرا غم نکلتا ہے
ایک وہ حسرت نکلنے کو جو میرے دل میں ہے
کون تسکین بخش جنبش پردۂ محمل میں ہے
تم وہی آخر کروگے جو تمھارے دل میں ہے
ایک ارماں اُنکے دلمیں ایک میرے دل میں ہے
جمع اُن سب حسرتوں کا خون میرے دل میں ہے
کہ کھیلتی ہے سرِ یار پر قضا اُن کی
جو بخشدیں وہ خطائیں تو ہے عطا اُنکی
لپٹ کر کالی زلفوں کی بلا کچھ اور کہتی ہے
مگر مجھ سے مری آہِ رسا کچھ اور کہتی ہے
مگر تیغِ تبسم کی ادا کچھ اور کہتی ہے
مگر اُس کی ادا میری قضا کچھ اور کہتی ہے

ہیں اُنھیں حالِ زار جو سمجھاتا ہُوں
خاطر عزیز دونوں کی ہے تیر یار کو
میری بھلائیاں تو برائی میں ہوں شمار
تمھاری دلربائی کے تصدق
تُم سے تو بتو مل نہ سکی داد ہماری

ٹالنے کیلئے کہدیتے ہیں ہاں ہاں سمجھے
دم بھر مقامِ دل میں تو دم بھر جگر میں ہے
دشمن کرے جو عیب وہ داخل ہنر میں ہے
نیا دلِ روز میں لاؤں کہاں سے
اللہ سے بس اب تو ہے فریاد ہماری

قطعہ

لاغر بھی ہوئے ہم تو تماشے کی غرض سے — کھنچواتے ہیں تصویر پر بیزاد ہماری
دم ساڈھے ہوئے اور ذبیح جگر افگار — محنت کہیں ہو جائے نہ برباد ہماری

اپنی ہستی کو اگر ہم نہ مٹاتے اے جاں — پھر یہ پیدا کہیں مضمون کمر کے ہوتے

نصیب اچھے اگر اے بلبل شوریدہ سر ہوتے — پھر آتی فصل گل اور پھر ہرے داغ جگر ہوتے
دھواں آہوں کا سیدھا چرخ تک پہنچا تو حاصل کیا — کہیں ہی سرو کو دیکھا کسی نے بارور ہوتے
رقیب اپنے دلوں میں آپ ہی کٹ کٹ کے مر جاتے — ادھر ہم سر بکف خنجر بکف جب تم ادھر ہوتے
فرشتوں کوئے جاناں کی ہوا جو تم کو چھو جاتی — ہماری طرح تم بھی خاک اڑاتے دربدر ہوتے
قفس میں مجکو بازو توڑ کر کیوں قید کرتا تھا — ہوس کچھ تو بجھا لیتا جو ثابت بال و پر ہوتے

کمال ضعف سے اب پاؤں لڑکھڑانے لگے — گرا گرا مدد اے شوق لے سنبھال مجھے
دل رمیدہ وہیں پھر پھرا کے آتا ہے — ہوا ہے نقطۂ پرکار رخ کا خال مجھے

بوسہ بن مانگے رہا جاتا نہیں — گالیاں کھانے کی عادت ہو گئی
جائے آکر وہ غضب ڈھائینگے کیا — جن کی آمد اک قیامت ہو گئی
ذکر مے کیوں شیخ سنکر پی گئے — کیا کہیں صاحب سلامت ہو گئی
بھول کر یاد وطن آئی نہیں — وادیٔ غربت میں مدت ہو گئی
کی دوا جب سے ترے بیمار کی — اور ابتر اسکی حالت ہو گئی

کسی سے وہ بگڑتے ہیں کسیکو وہ بناتے ہیں — خدا جب حسن دیتا ہے شرارت آہی جاتی ہے
ہلال عید کی حسرت تو ہوگی روزہ داروں کو — مجھے میرے گلے سے یار کی تلوار ملنے کی
کیوں شراب سخن اپنی نہ ہو خوش رنگ ذبیح — اسکو نسبت بھی تو ہے داغ کے خمخانے سے

بتوں کی اگر ایسی ہی چڑھ بنی ہے — کسی دن خدائی کا دعویٰ کرینگے

ذبیح منشی باقر حسین صاحب طبیعت دار اور ذکی شخص ہیں کلام سے مشاقی بھی پائی جاتی ہے اور علمی استعداد بھی معقول معلوم ہوتی ہے ہر شعر میں بات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تلمذ

ذبیح

وغیرہ کی کیفیت نہیں معلوم ہوئی۔ الہ آباد کے رہنے والے ہیں۔ کلام بہت مزے کا اور تعقید سے پاک و صاف اور تلاش مضمون اور الفاظ سے بھی صاحبِ مذاقِ سلیم ہونا ثابت ہے ملاحظہ ہو

نہ بیٹھے چین سے اک دم کہیں ہم شادماں ہو کر
پھرایا گردشِ قسمت نے دورِ آسماں ہو کر

کروں عرضِ ہنر کیا جب نہ پایاں قدر دانی کی
کمال اپنا یونہیں مخفی رہا گنجِ نہاں ہو کر

بزنگِ نخلِ بے برگ و ثمر تھی قدر کب اپنی
رہے جبتک جہاں میں ہم رہے بارِ جہاں ہو کر

تواضع سے بنا لیتے ہیں اپنا دوست دشمن کو
کبھی ہم دور کر دیتے ہیں تیروں سے کماں ہو کر

ملی یہ سربلندی جب مٹایا اپنی ہستی کو
ہوئے مسجودِ عالم اسکے خاکِ آستاں ہو کر

خزاں کے خوف سے بلبل ہوئی ہے سوکھکر کانٹا
رہیگی آشیاں میں بھی تو خارِ آشیاں ہو کر

یہ کیسی اپنی غفلت ہے کہ یادِ حق سے غافل ہیں
عیاں ہے صبحِ پیری ہم ابھی مابینِ منزل ہیں

دلِ بے مدعا قدرِ امید و بیم کیا جانے
نقوشِ کائنات اپنی نظر میں حرفِ باطل ہیں

رہے ہم سبزۂ بیگانہ بنکر باغِ ہستی میں
حقیقت میں جدا سب سے مگر ظاہر میں شامل ہیں

ہوئی جب سلب طاقت کیا نتیجہ پرفشانی کا
ہماری کوششیں عقبیٰ میں سعیِ مرغِ بسمل ہیں

ذبیح ناتواں جو تھے کبھی آرامِ جاں اپنے
وہی افسوس دشمن کے فروغِ خانۂ دل ہیں

تمھارے ظلم کا ہمکو خیال کچھ بھی نہیں
ملال دل سے ہے تم سے ملال کچھ بھی نہیں

ذبیح عمر سریع الزوال کچھ بھی نہیں
خزان و ہجر و بہار و وصال کچھ بھی نہیں

عبث ہے ان سے توقع وفائے وعدہ کی
مآلِ کوششِ امرِ محال کچھ بھی نہیں

یہ کیسی طرزِ عمل ہے خدا سے شرم نہیں
گناہ حد سے فزوں انفعال کچھ بھی نہیں

یوں ہی گذرتے ہیں غفلت میں دن جوانی کے
ذبیح آپ کو فکرِ مآل کچھ بھی نہیں

رہے پابندِ تسلیم و رضا ہم ایسے بسمل ہیں
گلے پر خنجرِ قاتل زباں پر شکرِ قاتل ہے

نہ ہو کیوں عشق میں ڈوبی ہوئی طرزِ بیاں میری
جوانی گو نہیں لیکن طبیعت ہے جواں میری

عبث اس خاکدانِ تنگ و تیرہ میں پھنسے آکر
کہاں یہ قیدِ تنہائی وہ آزادی کہاں میری

وہ مجکو بے وفا کہتے ہیں یہ تائید کرتی ہے | الٰہی ہو گئی اُنکی زباں گو یا زباں میری
دکھایا داغ پیشانی جو اُنکو ہنس کے فرمایا | جبین فخر کی زینت ہے خاکِ آستاں میری
عیادت کے لیئے یہ کون آتا ہے دمِ آخر | چلی جو بہر استقبال جانِ ناتواں میری
تمنا ہے اُسی کی جان دی ہے جسکی فرقت میں | کھڑی ہیں کسلیئے مشتاق حورانِ جناں میری
گذرتا ہے اگر حرفِ طلب اپنے تصور میں | تو ہو جاتی ہے پنہاں شرم سے منہ میں زباں میری
یہ کیسی آہِ آتش بار یا رب دل سے نکلی ہے | دگرگوں ہو گئی حالت وہاں اُسکی یہاں میری
مجھے حرماں کی خو اُسکو عادت شکرِ حرماں کی | ترے دل کی طرح ہے کام میں ہر دم زباں میری
مرے سوزِ نہاں کا ماجرا تم شمع سے پوچھو | حقیقت کہہ رہی ہے صاف وہ آتش زباں میری
وہاں وہ شانِ آمرزش یہاں شرمِ تہیدستی | کوئی گوشہ نہیں ملتا چھپے غیرت جہاں میری
ذبیح اِس عہد میں گو اور بھی ہیں مدعی اسکے | مگر حاصل کہاں یہ خوبیِ حسنِ بیاں میری

ذبیح

ذبیح منشی محمد اسمٰعیل ذبیح باشندہ کیامٹی سعید صاحب کے حقیقی بھتیجے اور اُنھیں کے شاگرد ہیں پندرہ سولہ برس سے مشقِ سخن کرتے ہیں۔

سنورتی ہے زلفِ پریشاں کسیکی | بلا میں کوئی مبتلا ہو رہا ہے
چمن میں جو اٹکھیلیاں کر رہی ہے | یہ کس گل کا ذکر اے صبا ہو رہا ہے
وہ بُت دیکھ کر مجکو مسجد میں بولا | ذبیح آجکل پارسا ہو رہا ہے

ذبیح

ذبیح حکیم منشی محمد سلمعیل خان ذبیح دہلوی ابن مولوی ابراہیم خان سابق برانچ پوسٹ ماسٹر پہاڑ گنج پہلے دہلی میں مطب کیا کرتے تھے، اشعار میں ظریفانہ مضامین اکثر لکھا کرتے ہیں افضل الاخبار میں کئی سال تک برابر ضمیمہ میں انھیں کے مضامین نکلتے رہے اب دو تین برس سے نواب احمد سعید خان صاحب طالب جاگیردار لوہارو کی سرکار میں ملازم ہیں پچپن ساٹھ برس کے قریب عمر اور استعداد علمی بقدر ضرورت اچھی ہے ؂

دلِ مایوس میں اپنے ہزار ارماں کا مدفن ہے | گماں ہوتا ہے سینہ میں مجھے گورِ غریباں کا

مجھکو چپ کرنے ہیں رسوا یار تو ہو جائیگا	یہ سکوت آخر کو بڑھ کر گفتگو ہو جائیگا
وہ آیا حور سے پیکر فاتحہ کو	ہمارا رشکِ جناں مدفن کیسا
آئینہ سے جو کہا عکس ہوں حیرانوں کا	بول اٹھی زلف کہ سایہ ہوں پریشانوں کا
میرے زخموں نے اڑایا جو ہنسی ہیں سبکو	شور سنتے تھے بہت انکے نمک دانوں کا
ہے زیرِ قدم سیل شہیدوں کے لہو کا	عالم قدِ قاتل میں ہے سروِ لبِ جو کا
موتی کی صفا زیر ہے دانتوں کی چمک سے	اس تاب سے پل باندھ دیا آب گہر پر
قیامت تک نہ ہو گی کل تو ان کی	جئیں امید و عدہ پر کہاں تک
تاثیر سے نالہ کی پلٹ دینگے مقدر	قسمت نہیں لکھنے کو اٹھاتے ہیں قلم ہم
ملجائے کوئی بت تو اسے دل میں جگہ دیں	کعبہ کیلئے ڈھونڈتے پھرتے ہیں صنم ہم
منہ سے لگا ہوا ترے جام شراب ہو	اک دن تو اتصال مہ و آفتاب ہو
اڑا دے ہوش سب بے پیر شیخ کے دو چلو پانی کے	دکھا منکر کو بھی پیر مغاں تاثیر میخانہ
نگہیں رکھنا رند و محتسب چھپ چھپ کے آتا ہے	اٹھا چکا ہے اڑا لیجائے گا کفگیر میخانہ
رکوع و سجدہ کرتے دیکھنا متوالے رندوں کو	جو بانگِ قلقلِ مینا سے ہو تکبیر میخانہ
شراب پاک بندوں کو وہاں حوریں پلائینگی	کہیں جنت نہ ہو واعظ تری تشہیر میخانہ
تسکین تجھ سے ہو جو کسی تشنہ کام کی	اے آبِ تیغ یہ بھی ہو اک بات نام کی
خنجر کی ادائیں نہ ہوئیں جسم گلو پر	کچھ دیر تو اے حضرتِ خوں تھم گئے ہوتے
خدا جانے جو خواہش اور کچھ ہوتی تو کیا ہوتا	ذرا سے ایک بوسہ پر تمھارا دم نکلتا ہے
ہمارے وصل کا وعدہ وہ کرتے ہیں تو مجمل سا	سخن منہ سے نکلتا ہو تو اک مبہم نکلتا ہے
عہد اسنے دلا کر مجھے کی رہبری عشق	ناصح بھی مرے واسطے گویا خضر آئے
ہجر نے عاشقِ مفلس کو کیا مالا مال	کہ دُرِ اشک کی سینے پہ لڑی رہتی ہے
کہتے ہو تم زخم دل سے مسکرایا کس لیئے	تیر کی انگلی سے پوچھو گدگدایا کس لیئے

جوشِ جنوں میں بھی نہ پھرے ہم برہنہ پا	یہ آبلے ہی پاؤں کے پاپوش ہو گئے
واعظ پہ بھی تصرفِ پیر مغاں ہوا	رندوں میں آکے آپ قدح نوش ہو گئے
شوخی سے بے نقاب ہے وہ جو بزم میں	اتنی پڑیں نگاہیں کہ روپوش ہو گئے

ذبیح

ذبیح مولوی سید عبدالحی صاحب باشندہ دربھنگا (بہار) کا کچھ حال معلوم نہ ہو سکا۔ کلام ملاحظہ ہو

زندگی اپنی اسی شغل میں گذرے پیارے	لب پہ ہو ذکر ترا دل میں تری یاد رہے
کہیں معشوق بھی عاشق کی خبر لیتے ہیں	اُن کو کیا شاد رہے کوئی کہ ناشاد رہے
کہتا ہے شوقِ قتل میں ہر وار پر ذبیح	قاتل خدا کے واسطے اک وار اور بھی

ذبیح

ذبیح جناب خواجہ محمد اسمعیل صاحب ایڈیکانگ نواب ٹوھاکہ تلمیذ جناب نسیم ابوالعلائی باشندہ بنگال بعد میں حضرت داغ سے تلمذ اختیار کیا، نوجوان شخص ہیں علمی قابلیت خاصی ہے موزونی طبع کے اقتضا سے گاہ گاہ فکر سخن بھی کر لیتے ہیں اپنے آقا کے ہمراہ ہندوستان کے مشہور مقامات کی سیر بھی کی ہے یہ کلام ہے

خدا نے شوق کو کیا رہنما میرا بنایا ہے	ملا ہے منزلِ اُلفت میں یہ رہبر بہت اچھا
کبھی خالی نہیں ہیں چال سے عیاری کی باتیں	یہ کہتا ہے دمِ عہدِ وفا اکثر بہت اچھا
تم سکے اور ساری بیقراری ہو گئی رخصت	نہ گھبراؤ کہ ہے حالِ دلِ مضطر بہت اچھا
زمانے بھر میں کوئی غیر کو اچھا نہیں کہتا	کہو انصاف سے کہتے ہو تم کیونکر بہت اچھا
گلہ کیوں کروں کیا مرا سر پھرا ہے	گلے پر عنایت سے خنجر پھرا ہے
بہت دیکھے ہیں انقلاباتِ عالم	فلک عمر بھر میرے سر پر پھرا ہے

ذبیح

ذبیح۔ مولوی محمد اسمعیل خان باشندہ بھوپال۔ آجکل کے شعرا میں ہیں۔ طرزِ سخن مندرجہ ذیل اشعار سے ظاہر ہے پچیس برس کی عمر ہے۔

مانگتا ہوں پینے مے ہر دم دعا برسات کی	بھا گئی ہے کچھ ادائے جانفزا برسات کی
ایک جامِ مے کے بدلے رندِ مے آشام سے	لیگئی دل چھین کر بانکی ادا برسات کی
لطفِ دخترِ رز کی اُلفت میں کچھ آیا ہے اسے	مانگتا ہے اب تو زاہد بھی دعا برسات کی

آرہی ہے کیا ہوائے جانفزا برسات کی	جھگڑے رندوں کے ہیں سب میکدہ آباد ہیں

ذخیر

ذخیر ـ میر قربان علی ساکن فیض آباد اودھ آپکا حال صرف اسقدر معلوم ہوا کہ نغمۂ بہار رسالہ میں جو ۱۸۸۶ء میں شائع ہوتا تھا آپکا کلام اکثر چھپتا رہتا تھا ـ

ساقی کے دم سے دورِ شراب سرور تھا	وہ پاس تھا تو غم دلِ عاشق سے دور تھا
شمعِ جمالِ یار کا اک وہ بھی نور تھا	ہے اوسنئی طور پہ ناحق گمانِ برق
عاشق بھی کیا ترا ارنی گوئے طور تھا	کل کیوں سوالِ دید پہ بھنیں لن ترانیاں
چشمِ مردم پہ قدم رکھتے ہیں بروہو کر	ہوتے ہیں فیضِ تواضع سے سرافراز بشر
رہ گیا دردِ جگر زینتِ پہلو ہو کر	دلِ خود رفتہ تو جاناں کی گلی میں پہنچا
جس طرح لائی ہے ہستی میں محبت تیری	ہجرِ عاشق کو عدم میں یونہیں لیجائیگا

ذرّہ

ذرہ میرزا راجہ رام ناتھ خلف الرشید میرزا راجہ کدار ناتھ ـ امیر عہد عالمگیر ثانی وشاہِ عالم ثانی، یہ خود آخر الذکر بادشاہ کے مقرب باختصاص اور پیشکار و ناظر رہے اور چونکہ بادشاہ کا تخلص آفتاب تھا اس رعایت سے اپنا ذرّہ مقرر کیا، چاوڑی میں راجہ کدار ناتھ کی گلی اِتبک اس خاندان کی یادگار رہے

بجا ہے ایسے دیوانے کے مطلب کو روا کرنا	ترے کوچہ میں روز و شب پڑا پھرتا ہے یہ ذرّہ

ذرّہ

ذرّہ ـ میر ولایت علی در اصل کوئل علیگڈھ کے متوطن تھے مگر بسبب روزگار آگرہ میں زیادہ حصّہ عمر کا بسر ہوا شیریں سخن وفصیح البیان شاعر تھے اور اپنے اقران و اماثل میں ممتاز یہ ذکر ۱۲۶۸ھ قبل غدر کا ہے، ڈپٹی عبد العلیم نصر اللہ خاں نے اپنے تذکرہ گلشن ہمیشہ بہار میں انکا تذکرہ کیا ہے اور انکی خوش خلقی اور مسافر نوازی کی تعریف کی ہے ـ یہ انکا کلام ہے

اس برا کہنے سے کہیئے تو بھلا حاصل کیا	میں دعا دیتا ہوں تم گالیاں دیتے ہو مجھے
تجھے اس خاک اڑانے سے صبا حاصل کیا	کرتی پھرتی ہے جو مٹی کو ہماری برباد
پیچ دینے سے مجھے زلفِ دوتا حاصل کیا	کیا ملے گا مرے سودائی بنانے سے تجھے

قطع کرنا تھا مرے دستِ جنوں کو ناصح
کیوں گریباں مرا تو نے سیا حاصل کیا
دستِ قاتل کو مبارک رہے خونِ عاشق
پاؤں کیوں پڑتی ہے ناحق تو حنا حاصل کیا
عمر بھر خاک ہی چھانا کیا ہیں اے ذرّہ
اور ان مہروشوں سے تو ہوا حاصل کیا
استخواں میری نکھا مجکو ندامت ہوگی
اے ہما گر کبھی جہا سگِ جاناں ہوگا

ذرّہ منشی ہیرپرشاد نقلنویس کلکٹری سلطانپور (۲۰ نومبر ۱۸۹۸ء) شاگرد جناب للکرشن فرکھنوی چالیس سال کی عمر اور یہ کلام کا رنگ ہے۔ باوجود مکرر تحریر یہ حالات نہ ملے۔

اُمید و یاس کے جھگڑے وہ حسرتوں کا ہجوم
عجیب لطف رہا جب تک انتظار رہا
رحیم جان کے تجکو خطا ہیں کیں میں نے
کریم جان کے تجکو گناہ گار رہا
زمانہ تھا جو موافق شریک حال تھے سب
پڑا جو وقت تو کوئی نہ غمگسار رہا
تھیں کچھ اپنی یہ وعدہ خلافیاں دیکھو
تمھیں کہو کہ تمھارا اب اعتبار رہا
بڑھ گئی حد سے سوا جب سے ثقاہت میری
وہ خفا ہیں کہ اُڑائی ہے نزاکت میری
جسقدر غیر نے کی اُن سے شکایت میری
اُنکو ہوتی گئی اُتنی ہی محبت میری
باعثِ ترکِ ملاقات جو پوچھا تو کہا
آپ سے ملکے اُلجھتی ہے طبیعت میری
زاہد تو اُٹھے ہو نڈیں قیامت کیواسطے
ہمتو گناہ کرتے ہیں رحمت کیواسطے
ای شیخ جو وہاں ہے وہی بتکدے میں ہے
کعبے کو جائیں کسکی زیارت کیواسطے
چاہو قیامِ حسن تو بوسہ عطا کرو
صدقہ ضرور چاہیئے دولت کیواسطے
کند ہے خنجر بلا سے آپ چلنے دیجیے
کام کچھ تو تشنہ کامونکا نکلنے دیجیے
شوق سے تیغِ نگاہِ مست چلنے دیجیے
خوب میرے زخم کے انگور پھلنے دیجیے
سر کے نیچے ہو اگر تکیہ تو جلد آتی ہے نیند
اپنے زانو پر ہمارا دم نکلنے دیجیے
کہاں سے کٹتے ہو کسواسطے پشیماں ہو
یہ کیا ہے آج نہیں آنکھ روبرو ہوتی

ذرّہ منشی اتواری لال باشندہ کلکتہ، حضرت نساخ کے تذکرہ میں ان کا ایک شعر درج

ہے انکے دوست بھی تھے اور ۱۲۸۱ھ میں زندہ تھے۔

دلِ دار کی خاطر سے دل آزار بھی چھوڑا	الفت میں سمن رویوں کی گلزار بھی چھوڑا

ذکا، سید اولاد محمد خاں ولد سید غلام امام صادق، حضرت حسان الہند میر غلام علی آزاد بلگرامی کے حقیقی بھتیجے تھے۔ ۲۷ رجب ۱۱۵۱ھ میں بمقام بلگرام پیدا ہوئے انھوں نے حضرت آزاد کی خدمت میں تربیت و تعلیم پائی اور انھیں کی تحریک و طلبی پر حیدرآباد میں منصب عالی پر سرفراز ہوکر امتیاز خاں خطاب پایا اور بڑے اعزاز و آبرو سے بسر کی۔ آخر اسی عالی منصبی کے ساتھ بمقام اورنگ آباد دکن ۱۲۱۵ھ میں انتقال کیا۔ فارسی شاعر تھے۔ اور انکا ذکر اکثر فارسی تذکروں میں موجود ہے مگر حسب رواج زمانہ تفننا کبھی کبھی اردو بھی کہہ لیتے تھے، یہ انکے کلام کا نمونہ ہے۔

ساقی تجھے قسم ہے کرے سے بھرے ہوئے	شیشے ہیں انتظار میں کسکے دھرے ہوئے
آوارگی سے باز نہ آوے گا دل مرا	کیا فائدہ ہے اسکو مقید کرے ہوئے
تو جیسے دوستوں کو نہیں پوچھتا عزیز	معلوم ہوگی قدر ہمارے مرے ہوئے
ہمکو جلو میں دیکھتے ہی شاہِ حسن کے	بولا نقیب حسن ادب سے پرے ہوئے
برسا نہ مینہ اور نہ آنسو ترے سپلے	جنگل ذکا کہاں سے ابھی سے ہرے ہوئے

ذکا، منشی خوب چند دہلوی کا یستھ ماتھر ساکن حویلی جنگل کشور معروف گھنٹہ والی چاندنی چوک شاگرد رشید شاہ نصیر دہلوی، ایک بہت بڑا تذکرہ معروف بہ عیار الشعراء انھوں نے تالیف کیا تھا جس میں چار پانچ ہزار اردو گو شعراء کا حال قلمبند کیا تھا۔ استعدادِ علمی معقول تھی۔ ملازمت پیشہ اور صاحب دیوان تھے، مگر وہ سب ذخیرہ انکی وفات کے بعد انکی اولاد کی غفلت سے ضائع ہوگیا، اسکی ایک نقل ڈاکٹر اسپرنگر پرنسپل دہلی کالج کے پاس تھی، ممکن ہے کہ جرمنی میں ہو، انکا دیوان راقم تذکرہ کے پاس موجود ہے، قدیم الفاظ مثل اوتی، اودھیں پھر کرکے، ہوئیگا، جتنے، کیدھر، انکے کلام میں پائے جاتے ہیں ۱۲۴۲ھ میں انتقال کیا۔

کر بنائے زندگی پر اپنی سائے منعم نظر
فکر کیا کرتا ہے ناداں ہر گھڑی تعمیر کا

غافلو ڈھونڈتے پھرتے ہو جسے عالم میں
غور سے دیکھو وہ ہے دل میں تمہارے بیٹھا

بس نہیں چلتا کہیں زور آور وسے ای ذکار
یار دل کو لے گیا میں سر پٹک کر رہ گیا

سمجھا میں جسے دوست ہوا وہ ہی مخالف
اخلاص کسی کا بھی مرے کام نہ آیا

آوارہ و بدنام ہوا قیس ہی آخر
لیلیٰ پہ کسی بات کا الزام نہ آیا

بیکسی پر نہ جلا میری کسی دوست کا دل
کوئی تربت پہ دیا بالنے والا نہ گیا

ہاتھوں سے میرے یارو بینا و جام لینا
بیہوش ہوں نشہ میں ٹک مجکو تھام لینا

رکھوں ہوں خصلتِ طاؤسِ آتشبار اے ہمدم
جہاں جاوے قدم اپنا وہیں گلزار ہو پیدا

اب تو اس بت سے ہم ہوئے ہیں جدا
دیکھئے کب خدا ملاوے گا

عمرِ رفتہ نے پھر گذر نہ کیا
گئی ایسی کہ منہ ادھر نہ کیا

ہونا جو کچھ مرض کا تھا انجام ہو چکا
رخصت کرو طبیب کو یاں کام ہو چکا

ہے آپکا قیامت گلشن میں مسکرانا
لیتے ہو جی نکالے ہر ایک کلی کلی کا

کسی کا دل کوئی بیدرد گر ستاویگا
تو عاقبت میں بھی آرام وہ نپاویگا

جو توبہ کی ہے تو مجلس میں میکشوں کی نجا
کہ خوامخواہ پیالہ کوئی بلاوے گا

یہ کوہِ عشق تو فرہاد سے بھی اٹھ نسکا
ذکا کی تاب ہے کیا جو اسے اٹھاویگا

آنکھیں کھلی رہی تھیں کسواسطے ذکا کی
کیا جانے مرتے دم تک تھا انتظار کسکا

حال یوسف کا سن چکے ہم
بھائیوں سے نہ چاہ کیجیے گا

گل کرے چراغ کو ذکا اب
گھر میں ترے آفتاب آیا

مانگا جو اُن سے دِل تو وہ بولے کہ ای ذکا
لیتا ہے مال پھیر بھی کوئی دیا ہوا

روتا ہوں ای پیارے اسواسطے میں ہر دم
مٹجائے تیرے دِل سے تا سب غبار دلکا

مت چھوڑیو تو ہرگز دل کا طواف اپنے
ہے تیرے حق میں غافل یہی مکہ اور مدینا

کوئی ٹھکانا مفر نہ کوئی درا اپنا
حیرت سے بنگیا ہی تصویر اب سراپا

جہاں ہے یار ہمارا وہیں ہے گھر اپنا
کوئی کچھ کہو ذکا کو چپکا سنا کریگا

خانۂ زندگی خراب گیا
مرد تہیدست سے ہو خیر کیا
سالونے کا لگے ہے خوش غصہ
شغل مینا و مے مدام رہا

کیا رہا لطف جب شباب گیا
پاؤں گیا ٹوٹ تو پھر سیر کیا
ساتھ ہے ترشی اور سلونے کا
جیتے جی ہمکو یہ ہی کام رہا

انداز عجب طرفہ ادا آن تماشا
رہے طالع جسے یہ دولت دیدار ہو حاصل
کیا گیا عہد نوجوانی کا

ہے سر سے قدم تک تو مہر بجان تماشا
قدم پر یار جانی کے سر اپنا دہر کے سو جانا
اٹھ گیا لطف زندگانی کا

اہل دنیا کو رہے ہے رات دن دنیا کی یاد
اسقدر فرصت کہاں ہی جو کرے عقبیٰ کی یاد

لکھوں تھا خط میں تجھے لیکے دل ربا کاغذ
اٹھا قلم سے یہ شعلہ کہ جل گیا کاغذ

گہ خیال زلف گہ یاد رخ گلفام کر
یوں خیال یار میں اے دل سحر کر شام کر

ہوا ہی ابر ہی گلگشت ہے اور سبزہ سبزہ ہی
سوال جام مے ساقی ہمارا آج رد مت کر

ذکا قسمت پہ شاکر رہ نصیحت تجکو کرتا ہوں
کسی کے جاہ و حشمت پر ارے ناداں حسد مت کر

موئے سفید نکلے بعد از شباب منہ پر
دیتی ہے زندگانی دیکھو جواب منہ پر

اے ہمنشیں تو یار کا ذکر کمر نہ کر
بھولے ہوؤں کو راہ عدم کی خبر نہ کر

شعلۂ شمع کا یہ دود نہیں جلوہ نما
کھولے بیٹھی ہے لٹا اپنی فرنگن سر پر

گھر سے ٹک اپنے نکل شوخ ستمگر باہر
منتظر بیٹھے ہیں عاشق ترے در پر باہر

ہے لطف میکشی کا اسی وقت ساقیا
بیٹھے ہوں جبکہ یار برابر کے آس پاس

نہیں خوشی کا یہاں اتو نام سو سو کوس
گیا وہ ساقی و مینا و جام سو سو کوس

شہر دلی نہ کہو ہے یہ غیرت فردوس
پوچھتے کیا ہو عمارات و مکاں کی تعریف

سیر کرتا ہوں کبھی اسکی تو بیساختہ بس

منہ سے نکلے ہی مرے شاہجہاں کی تعریف

نکلے ہی اشک چشم سے میری ٹپک ٹپک
چشم ہیں سرمہ کی تحریر تو ظالم مت کھینچ
آن نکلے ہے ادہر لالہ عذار ایک نہ ایک
اُس بُتِ شوخ کو دیکھا جو سحر وقت نماز

ساغر سے مے بہ گرگئی آخر چھلک چھلک
ہی قیامت تری اِس خنجر خونخوار کی نوک
سینہ کرجائے ہی داغوں سے فگار ایک نہ ایک
اہلِ اسلام کی نیت گئی یک بار بدل

کٹی رہتے ہوئے اک عمر باہم
ہزار افسوس وہ بیگانہ نکلا
نہ کیجے اسقدر بیگانگی آپ
خیال آتا نہیں اتنا بھی ہرگز
مئے گلنار کا پیکر پیالہ

حجاب اُس کا نہیں جاتا ہے تاہم
جسے سمجھے تھے اپنا آشنا ہم
کبھی تو تھے تمھارے آشنا ہم
کہ آئے کیوں تھے اور کرتے ہیں کیا ہم
ذکا سب فکر دیتے ہیں بھلا ہم

زنہار مرے قتل سے پیارے نہ ڈرو تم
جگر ٹکڑے ہے کیوں اسکا ہوئی ہے کیسلئے پانی
مریضِ عشق کو صحت اگر ہووے تو میں جانوں
رخِ تاباں پہ چھوڑو گیسوئے شبرنگ کو اپنے
نہیں جامِ مئے گلنار کو حاجت کچھ اے ساقی

سر آگے تمھارے ہے جو چاہے سو کرو تم
کھلا ہمپر نہ کچھ حالِ پریشانِ گل و شبنم
کرے لاکھوں دوا لیکن اثر ہووے تو میں جانوں
قیامت تک پھرا پیارے سحر ہووے تو میں جانوں
تصوّر میں تری آنکھوں کے ہم مخمور رہتے ہیں

دل و جان سے معتقد ہیں اُسی کے

صنم کو ہم اپنا خدا جانتے ہیں

اِن بتوں سے تو تو کا دل نہ لگا کہتے ہیں
شہد و شکر سے وہ لبِ شیریں دو چند ہیں
کہتا ہے دیکھ سایۂ مژگاں کو طفلِ اشک
نہ آیا یار اور میں صبح تک گنتا رہا گھڑیاں
یہ بتانِ سنگدل ایکدم بھی کل پاویں نہیں

ہم ترے حق میں کہا مان بھلا کہتے ہیں
اُنکی نہ بات پوچھ کہ ہونٹھ اپنے بند ہیں
خنجر نے مجکو یہ لبِ دریا پسند ہیں
لگا دیں چشم دریا بار نے ساون کی سی جھڑیاں
عاشقوں کو جب تلک اللہ کلیاد میں نہیں

ارادہ گر کسی کے دلمیں ہووے سیرِ جنت کا
تو دیکھے اک نظر آکر جہاں آباد کی گلیاں

جو وضو سے دستِ حنائی وہ اپنے دریا پر
تو آگ لگ اٹھے یکدست وہیں پانی میں

ذکا خیال ترا کیا کسی طرف آئے
لگا رہے ہے ترا جی تو یارِ جانی میں

دنیا میں سبکو خاطرِ جہاں عزیز ہے
جاتا ہو دل سے عاشقِ شیدا کے غم کہاں

جامِ مے دے ساقیا یہ ابر و باراں پھر کہاں
ابر و باراں گر ہوا تو بزمِ یاراں پھر کہاں

بے گنہ ہرگز کسی کو قتل اے ظالم نہ کر
آدمی ہوتا ہے پیدا آہ ناداں پھر کہاں

خواب ہو جائیگا ملنا کر ہم آغوشی شتاب
ہو زلیخا دیکھئے یہ ماہِ کنعاں پھر کہاں

ہمنے کیا ہی دیکے دل اپنا سنے سوال اک بوسہ کا
سنتے ہیں کیوں آپ خفا کچھ مفت نہیں خیرات نہیں

لختِ دل یوں سرِ مژگاں پہ نظر آتے ہیں
جوں چراغاں ہوں دریا کے کنارے روشن

بیوفائی جو یہاں دیکھی رفیقوں سے ذکا
ہمسے مت پوچھ کہ وہ قابلِ اظہار نہیں

آگیا وہ دور کوئی فکر سے خالی نہیں
ہو گئی عنقا کہیں عالم میں خوشحالی نہیں

جلوہ گر وہ خوبرو ہوتا ہے گر بازار میں
رستے رہتے بند ہیں دو دو پہر بازار میں

بتوں کو جان و دل سے مانتے ہیں
خدا کو اپنے حاضر جانتے ہیں

روتے ہیں یاد کرکے ہم اُن دنوں کو پیارے
ڈالیں پھریں تھے کیسے ہم تم گلے میں باہیں

ڈرتا ہوں میں کہیں ترا پہنچا لچک نجائے
گجروں کو مت پہن تو گل اندام ہاتھ میں

کسکی دیکھی چشمِ مخمور اے ذکا
خود بخود آنے لگیں انگڑائیاں

باہم پیوستہ ہیں وہ ابروئے خمدار یوں جیسے
لڑیں دو ترک جوں لیکر کھینچ تلوار آپس میں

گرہ میں کیا ہے مری ہو میں فاقوں کا سبب
پڑے ہیں ایک دو شیشے شراب کے گھر میں

گذارہ کیسے گھر میں ہو کسی انسان قابل کا
ذکا اب قدردانوں کی ہوئیں برباد سرکاریں

شہر دہلی بھی اک تماشا ہے
آٹھ دن نو طرح کے میلے ہیں

جنبشِ ابرو سے اُس کے ہل گئی یکبیک زمیں
جس طرح بھونچال سے کرنے لگے تھر تھر زمیں

غم کے ہاتھوں تنگ ہوں یارب جاؤں کہاں　　آسماں تو دور ہے اور سخت ہی پتھر زمیں
نہیں رکھیں ہیں کدورت کسی سے اہلِ صفا　　چھپاتے عیب ہیں سب کے ہنر کو دیکھتے ہیں
حاکم اس دور کے یہاں ناسد ہیں دنی اور ظالم　　مانگے پیسا جو کوئی داغ درم دیتے ہیں
دلکو لیجاتا ہے وہ آنکھوں ہیں کچھ رکھتا ہے سحر　　دیکھکر حیراں ہوں یارو اس ہنر کو کیا کروں
اضطرابی سے نہیں اتنی خبر مانندِ موج　　گر کوئی پوچھے چلے اٹھکر کدہر کو کیا کہوں

یہ معجزۂ عشق ہے لاتی ہیں گل شمع　　ہنگام زیارت مرے مدفن پہ ہزاروں

جواب خط سے ہیں گذرا خبر تو لو یارو　　گلی سے یار کی قاصد ابھی پھر آکہ نہیں
دیکھکر کیچھو چشمی کا دعوی اس سے　　کہدو نرگس سے کہ آنکھوں کے لوائے ناخن

مدت ہیں لگی ہے آنکھ مری کھٹ کھٹ تم کراؤ مت شور ہنگام　　تعویذ نکھر طرف تربت کا جا نہیں پیارے سوتے ہیں
تم اہلِ دل کی غفلت کا احوال نہ پوچھو کچھ ہمسے　　سجتے بھی رہیگا توں پہ سدا گھڑیال تمھارے سوتے ہیں
یار کی استغنائی تو دیکھو ہم جو گئے ملنے کے لیئے　　غصہ سے بولا یوں ہم سے آکہد و گھر کو سرد مھارے سوتے ہیں

غم جس سے دلکا جائے مہیا وہ شے کرو　　موجود یعنی بزم میں مینا و مے کرو
خبر شمع کے سر کاٹے پہ زندہ ہو دوبارہ　　دیکھا نہ کسی کو کہ کوئی مر کے جیا ہو

رات وہ مطرب پسر گانے لگا جب دیس کو　　یاد کر رونے لگے پردیسی اپنے دیس کو
دل نہیں چاہتا ہے کرنے کو کسی سے خلاص　　ہر کوئی اپنی غرض کا ہمیں بندہ نظر آیا ہمکو

ملے ہے ابروئے خمدار دیکھیئے کیا ہو　　کہاں کہاں چلے تلوار دیکھیئے کیا ہو

ہر طرف خوبرو ہیں جلوہ نما　　کب تلک دل کی پاسبانی ہو
کیوں نہو اسپہ اک جہاں عاشق　　جبکہ یہ حسن اور جوانی ہو

ذکار　　**ذکار** پنڈت سری کشن ذکار کشمیری خلف پنڈت دیارام ابن عدالت دیوانی فرخ آباد ۱۸۷۶ء کے قریب زندہ و سلامت موجود تھے۔ کلام سے چند شعر درج ذیل ہیں ؎

ذرا دیکھ اے بتِ سفاک در پر شور و غوغا ہے　　ترے کوچہ میں قاتل رقصِ بسمل کا تماشا ہے

بہانے سے ہمارے خون کے غش تجکو آئیگا
اے قاتل تو کمسن ہے ابھی کیا تونے دیکھا ہے

زر و مالِ جہاں کی کچھ ہوس باقی نہیں دلکو
فقط دیدار کی اُس شوخ کی دل کو تمنا ہے

نہایت سخت جاں ہوں نہیں نہایت سخت جاں ہوں میں
نہ ٹوٹے خنجرِ بُرّاں کہیں یہ مجکو خطرا ہے

نہیں اس بُت سا کوئی سنگدل سارے خدائی میں
ہُوا عاشق تو کیوں اسکا ذکا کچھ تجکو سودا ہے

ذکا منشی بخشش محمد باشندہ گورکھپور شروع میں جناب بقا کو کلام دکھایا کرتے تھے ، پھر حضرت امیر مینائی کی خدمت میں آکر فیضیاب ہوئے اب فی الجملہ اس فن میں معقول مہارت پیدا کر لی ہے مضمون اور زبان دونوں کی طرف طبیعت کو لگاؤ ہے ، اشعار بہم رسیدہ کا انتخاب ملاحظہ فرمایئے ؛

تعظیم ہمپہ فرض ہے قرآن پاک کی
چومے جو ہمنے آپکے رُخسار کیا ہُوا

دِل لیکے دیکھتا بھی نہیں اب میری طرف
او مطلبِ آشنا وہ ترا پیار کیا ہوا

گھِسوں گا سر در پردہ نشیں پر
مٹادوں گا جو لکھا ہے جبیں پر

نشاں ملتا نہیں لیکن ترا نام
ازل سے نقش ہے دلکے نگیں پر

کہے دیتی ہیں دُزدیدہ نگاہیں
گماں ہے دِل چُرانے کا ہمیں پر

پھر جاتے ہیں روزن تک آکر
ترساتے ہیں جھلکیاں دکھاکر

ہیں تاک میں دخترِ رز کی ساقی
لیجائیں گے شیخ جی چُراکر

دکھلا کے وہ زلف مجکو بولے
اِن کالوں سے تو ذرا ڈراکر

داغوں سے ہوا لالہ زار ہے دِل
یاور نہ ہو دیکھ لو تم آکر

ہو وفا خلق میں گو سارے حسیں ہوتے ہیں
پر تری طرح جفا کار نہیں ہوتے ہیں

شیخ جی اچھا ہے میخانے میں جایا نہ کرو
بے ادب رند خرابات نشیں ہوتے ہیں

سمجھتا ہی نہیں کوئی یہ مضموں
دہن کے باب میں کیا گفتگو ہو

عدو کے سامنے یوں ظلم مجھ پر
عدو پر لطف میرے روبرو ہو

شبِ غم کی بلائیں دُور ہوجائیں
کرم فرما جو تو اسے ماہرو ہو

کہاں رنگِ حنا ای شوخ اتنا شوخ ہوتا ہے
مرے خونِ تمنّا کی ترے ہاتھوں میں لالی ہے

دِل کو آنکھ اُسکی جو بیمار بنا دیتی ہے
آ کے یادِ لبِ جاں بخش شفا دیتی ہے

اُسکے گیسو کی گھٹا یاد دلا دیتی ہے
اور رونا مرا برسات بڑھا دیتی ہے

طلبِ بوسہ پر اے یار تری ایک نہیں
سارے ارمانوں کو مٹی میں ملا دیتی ہے

لوگ کہتے ہیں جسے برقِ جمالِ معشوق
دِل میں عاشق کے بہی آگ لگا دیتی ہے

زندہ زیرِ چرخ جب تک ہم رہے
موردِ جور و ستم ہر دم رہے

ہوں شہیدِ سُرخیِ رنگِ حنا
دستِ رنگیں سے مرا ماتم رہے

کیوں غش نہ کرے صورتِ موسیٰ ہمیں آ ذکا
اِک رشکِ برقِ طور کا جلوہ نظر میں ہے

ذکائی

ذکائی - محمد ہاشم علی رامپوری - رامپور کے مشاعرہ ۱۹۰۷ء کی غزل سے دو شعر نقل ہوتے ہیں

جو پوچھا کہاں کو چلے بن سنور کر
تو بولے تمہیں کیا کہیں جا رہے ہیں

رقیبوں سے جوبن کو لٹوا رہے ہیں
مجھے دیکھنے تک کو ترسا رہے ہیں

ذکی

ذکی - نواب محمد جعفر علیخان ذکی مغفور پنجہزاری منصبدار دربار شاہ عالم، شاہ موصوف - اور شجاع الدولہ صوبۂ اودھ کے ہمراہ بہار اور بنگالہ کی مہم ۱۷۶۴ء میں شریک اور نظامت مرشد آباد کے اُمیدوار تھے۔ آخرش ناکام ۱۱۷۸ھ میں مرشد آباد میں راہیِ ملکِ بقا ہوئے کبھی کبھی فکرِ سخن بھی کیا کرتے تھے یہ اُنکے نتائجِ افکار کا خلاصہ ہے۔

سُن کے احوال مرا ناصحِ مشفق نے ذکی
ہاتھ سے ہاتھ ملے حیف سے سینہ کوٹا

خاکساری پر نہ کر موذی کی ہر گز اعتبار
جونک مٹّی میں سلے تو بھی لہو پیتی رہے

عشق میں نسبت نہیں بلبل کو پروانہ کے ساتھ
وصل میں وہ جان دے یہ ہجر میں رُوتی رہے

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں کرنا رفو
سوزنِ تدبیر گو ساری عمر سیتی رہے

ذکی

ذکی - نواب اسد الدولہ رستم الملک مرزا محمد ذکی خاں بہادر فیل جنگ عرف نواب بہادر

خلف اکبر و لیسر الدولہ دلاور الملک مرزا محمد علیخاں بہادر فیروز جنگ تخلص بہ حیدر متوطن نیشاپور۔ باشندۂ فیض آباد مقیم لکھنؤ پہلے اشرف علی فغاں پھر میر اوسط علی رشک، پھر منیر شکوہ آبادی کے شاگرد ہوئے، ان استادوں کے فیض سخن سے صاحب دیوان ہو گئے یہ انکا کلام ہے۔

گرتی شکم صاف پہ ہے آب رواں کی	یا آپ کا گرمی سے پسینے میں ہے تر پیٹ
بل کھائے بال آگ پہ رکھے اگر کوئی	اس روئے آتشیں پہ نہ کیوں پیچ کھائے زلف
اعمال بدنے مجکو نکالا بہشت سے	دوزخ بھڑک اٹھا مرے افعال زشت سے

اے زاہد و ہیں سے ہمارا اسلام ہے	کعبہ کو کون جائے جوار کنشت سے
کوچہ میں اس صنم کے بھی ملجا بنگاہ ہی	آدم کو جس خدا نے نکالا بہشت سے
توڑونگا میں نہ خاطر پیر مغاں کبھی	بنوا او میکدہ مری تربت کی خشت سے
اٹھا نہ بار ضعف کا مجھ ناتواں سے	شرمندہ ایک خس کا نہیں میں جہان سے
شکوہ تمھارا سنتے ہیں ہم ہر زباں سے	آواز ایک آتی ہے سارے جہان سے
تیرے شہید ناز کو زندہ نہ کرسکیں	عیسیٰ اتر کے آئیں اگر آسمان سے

ذکی

ذکی۔ شاعر خوش مذاق منشی مہدی علیخاں ذکی خلف شیخ کرامت علی یہ انکے بزرگ شیخ زادگان لکھنؤ سے تھے مگر انکا مولد و مسکن مراد آباد ہے۔ نواب محمد سعید خاں والی ریاست رامپور کے عہد میں برسوں وظیفہ خوار ریاست رہے پھر نواب غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ کے عہد میں لکھنؤ چلے گئے، وہاں جاکر شیخ امام بخش ناسخ کی شاگردی اختیار کی اور نواب صاحب موصوف کی شان میں قصیدہ کہکر سنایا خلعت و انعام سے مالامال ہوئے، پھر تھوڑے دنوں کے لئے دہلی آئے ان دنوں نواب مصطفیٰ خاں بہادر متخلص شیفتہ کے ہاں بزم مشاعرہ منعقد ہوتی تھی آپ بھی اس جلسہ میں شریک ہو کر مورد تحسین و آفرین ہوئے، مگران دنوں دہلی اپنے حال میں مبتلا تھی، یہاں سے بھی دل برداشتہ ہوکر سہارنپور پہنچے لیکن دل اچاٹ رہا

حیدر آباد دکن چلے گئے وہاں دولت کے فرشتہ نے جنم ہار دیا تھا، اور دن رات چاندی سونے کی گنگا جمنا بہتی تھی، وہاں اِنکے کمال کی بھی قرار واقعی قدر دانی ہوئی۔ یہ بھی اپنے فن میں اُستاد مسلم الثبوت تھے، نواب ناصر الدولہ نظام الملک بہادر والی ریاست کی مدح میں وہ وہ عمدہ قصائد کہہ کہکر پیش کئے جن میں خوب خوب صنعتیں تھیں، اِن کو سن کر اہل دربار کیا وہاں کے تمام رؤسا ادب کے ساتھ پیش آنے لگے اور نواب صاحب بہادر نے خلعت وانعام سے مالا مال فرمایا، آخر کشش حب وطن نے پھر اپنی طرف کھینچا اور مراد آباد آگئے۔ چند روز بعد لکھنؤ پہنچکر قطب الدولہ کی وساطت سے واجد علیشاہ کی سرکار میں ملازم ہوئے اور ملک الشعرا کا خطاب پایا، چنانچہ اُنکی مُہر میں ملک الشعرا شیخ مہدی علیخاں ۱۲۶۵ھ کندہ تھا، غدر کے بعد وطن میں خانہ نشین تھے کہ نواب یوسف علیخاں نے اِنکے کمال کا شہرہ سُنکر اپنے دربار میں طلب کیا، چنانچہ یہ رامپور چلے گئے اور جب تک نواب ناظم زندہ رہے وہیں رہے۔ اُنکی وفات کے بعد وہاں سے دل اُکتا گیا اور ۱۲۸۲ھ میں انبالہ پہنچے دو برس کچھ مہینے وہاں قیام کو گذرے تھے کہ پیام اجل آگیا، ماہ ذیقعد ۱۲۸۳ھ میں قضا کی۔ انتخاب یادگار میں اِنکی تاریخ وفات ۱۲۸۱ھ درج ہے مگر غلط ہے، یہ صاحب سخن مورخ بے بدل۔ فاضل بے مثل شیریں سخن، ظریف اور زود فکر تھے، طرز سخن نہایت دلفریب اور پسندیدہ ہے، ایک رسالہ عروض وقوافی میں مسمیٰ بہ یادگیر ۱۲۶۵ھ میں مرتب کیا تھا، کلیات ذکی عرصہ ہوا منشی نولکشور نے اپنے مطبع سے شائع کیا تھا۔

صرفہ اب پردہ دری میں ہے لحاظ کس کا	دامن یار ہی چھوٹا تو گریباں کس کا
لے اُڑی انجمن ناز میں دل کس کی نگاہ	چوریاں کرنے لگے غمزۂ پنہاں کس کا
باڑھ پر غمزۂ خونریز کو رکھتے ہیں حریف	دیکھئے آج نکلجائے گا ارماں کس کا
ہُوا ہے آفتاب صبح شعلہ داغ پنہاں کا	بنا تارِ شعاعی تار تار اپنے گریباں کا
غبار قیس میں جان آ گئی ٹھوکر سے لیلی کی	اُڑا جاتا ہے جگنو بنکے ہر ذرّہ بیاباں کا

کھلا کے کھلتے ہیں گل کے مدعا رخصت کا گلشن سے
صدائے الفراق آئی جو ٹوٹا زخم کا ٹانکا

سمجھ کر ساقیٔ دریا دل ان پاؤں کے چھالوں کو
زباں سوکھی دکھاتا ہے ہر اک کانٹا بیاباں کا

بہار آئی ہے قاصد جی میں رہ رہ کر یہ آتا ہے
کہ جائے نامہ بھیجیں یار کو پرزہ گریباں کا

ق

نشہ نے شوق کے جو بد شرابی کا اثر بخشا
کچھ ایسا ہوش بگڑا شب دلِ مشتاق جاناں کا

بلائیں شمع کی لیں اس رخِ تاباں کے دھوکے میں
لب ساقی سمجھ کر لے لیا بوسہ نمکداں کا

بگولے کی طرح اٹھتا ہوں میں صحرا نوردی کو
کیا ہے بے سر و پائی میں کیا پائے سفر پیدا

ذکیؔ جوں شمع اپنی زندگی جلنے ہی کٹتی ہے
کیا ہے سوزِ دل کے واسطے ہمکو مگر پیدا

خون کا دریا جو تھا سینے میں اپنے موجزن
تیر کر نکلا خدنگِ ناز اس سفاک کا

نازِ معشوقانہ کو زیبندہ ہے نشانِ حجاب
لن ترانی گو ہے جلوہ شاہدِ بیباک کا

کیا دکھاتا ہے بہار ایکے برس جوشِ جنوں
گل کھلے دیکھئے کیا چاک گریبانی کا

کشمکش گردشِ دوراں کی ہے درپے کیا کیا
سخت مشکل ہے نباہ آہ تن آسانی کا

گر بگولے بھی اٹھے خاک سے تو خاک ہے لطف
زندگی میں ہے مزا بے سر و سامانی کا

حوریں جو آئیں جائے نکیرین قبر میں
کیا کیا مزا اٹھائیں سوال و جواب کا

بسمل تری نگہ کے تڑپتے نہیں کبھی
پانی بھی مانگتے ہیں تو خنجر کی آب کا

اے نامہ بر جو پڑھ سکے وہ خط ہو رہے خموش
زنہار تو سوال نہ کرنا جواب کا

کیونکر نہ خون ہو مری حسرت بھری نگاہ
آنکھوں میں کٹ گیا ہے زمانہ شباب کا

بے لطف زندگی کی بہاریں ہیں رنج میں
عیش و طرب کے ساتھ مزا ہے شباب کا

گذری فراقِ یار میں افسوس یہ بہار
دل پر رہیگا داغ شبِ ماہتاب کا

ہیں کافرانِ عشق حرم میں سیاہ مست
دل میں صنم بغل میں ہے شیشہ شراب کا

وحشت[1] ہے آشکار زلیخا کے حال سے
آنکھیں بیان کرتی ہیں افسانہ خواب کا

دام کے پھندے قفس کی تیلیاں توڑیں تو کیا
کاش رشتہ ٹوٹ جاتا الفتِ صیاد کا

۱ نوٹ گلشنِ بیخار میں یہ شعر مرزا کیسہ شاگرد [illegible] کے نام سے درج ہے —

مزے جہاں کے اٹھائے یہ خاکساری ہیں
کہ بندگی میں تماشا کیا خدائی کا

قاصد کے ہوش گم تھے یہ طرفہ ماجرا تھا
کہتا تھا کچھ زبانی اور خط میں کچھ لکھا تھا

اک بات پر تمہاری سو جی سے ہم تھے قربان
کچھ بات اب نہ پوچھو کیا جانیے وہ کیا تھا

شب وصل اپنی گذر گئی تو سحر کو اپنا یہ حال تھا
دل و دیدہ حیرت و غم میں تھے کہ یہ خواب تھا یہ خیال تھا

تا مرگ درد عشق نہ ہم سے جدا ہوا
زیر کفن بھی ہاتھ ہے دل پر رکھا ہوا

بسے ہوئے تھے دلوں میں ہزارہا نیرنگ
طلسم ہستی موہوم اک بہانہ ہوا

تو ہوا گرم سخن اور کھل گیا راز نہاں
تو ہنسا اور غنچۂ تصویر گویا ہو گیا

کچھ اور ہے باقی ہوس کوہکن و قیس
یا دیکھ چکے کوہ و بیاباں کا تماشا

مہ کنعاں کی زلیخا نے خریداری کی
عشق نے حسن کو رسوا سر بازار کیا

گو مگو بات ہے کچھ کہہ نہیں سکتا قاصد
کہ نہ انکار کیا اس نے نہ اقرار کیا

جب سامنے کبھی وہ پریزاد آ گیا
دیوانہ پن کبھی کا ہمیں یاد آ گیا

شمع گل ہونے لگی یاران محفل اٹھ چلے
ایک میں رونے کو تنہا انجمن میں رہ گیا

آج تو انداز باتوں کا تری کچھ اور ہے
پا گئے ہم بھی کہ ہے غیروں کا سکھلایا ہوا

اس آب و گل میں اپنی تو الفت کا ہے خمیر
بیگانہ ہو نہ سبزہ بھی اپنے مزار کا

آثار صبح ہے کہ مرا حال دیکھ کر
ٹکڑے جگر ہوا ہے شب انتظار کا

ہمارے حال پہ لازم ہے رحم او صیاد
کہ پر شکستہ ہیں اور شوق ہے رہائی کا

سوچ میں تعبیر کے یوسف کو نیند آنے لگی
ماجرا خواب زلیخا کا عجب افسانہ تھا

جلوہ گر آنکھوں میں ہے شوخی نگاہ یار کی
پتلیوں کا ناچ پریوں کا تماشا ہو گیا

زہر کھایا سبزہ رنگوں کی محبت میں غرض کی
صندلی رنگوں کی غم میں درد سر پیدا کیا

دم بدم ہوتی ہے تغیر یہاں صورت حال
رنگ ہر حال بدلتی ہے تری یاد نیا

لے ہی بیٹھا وہ جان و دل و طاقت و تواں
کیوں آئے اب یہاں سے اٹھے کیا کام رہ گیا

روشنی گر لبِ دریا ہو مرے جان پسند
ہم مژہ پر کریں اشکوں سے چراغان پیدا

دیوانہ اس گلی میں دلِ زار ہو گیا
سایہ پری کا سایۂ دیوار ہو گیا

ہنسی ہنسی میں کیا تمنے زخمِ دل تازہ
نمک چھڑکنے تو ایسا کہاں مزا ہوتا

بیخود جمالِ ساقیٔ سرشار نے کیا
کارِ شرابِ شربتِ دیدار نے کیا

ہوئے بیخود غمِ تنہائی سے
کہیئے کس سے ہمیں کیا یاد آیا

بے طرح دل کو عشق کا آزار ہو گیا
کسکی نظر لگی کہ یہ بیمار ہو گیا

لائقِ سزا کے کشتۂ دیدار ہو گیا
آنکھوں سے دیکھنے کا گنہگار ہو گیا

کیا عجب ہی گر وہ پھر زندہ ہوں اے عیسیٰ نفس
لائے تو اپنے شہیدوں کا جو مدفن زیرِ پا

نشہ کی حالت میں جھٹکا کے شوخ نازنیں
لٹ جو اپنی زلف کی سمجھا وہ ناگن زیرِ پا

بوسہ لیتی ہی جو پاپوشِ نگاریں پاؤں کا
رشک سے کہتا ہے دل ہوتا کہ دشمن زیرِ پا

یہ ادا قاتل کی قابل دیکھنے ہی وقتِ ذبح
ہاتھ ہے بسمل کی آنکھوں پر تو گردن زیرِ پا

غفلت میں کام دل ہمیں بے جستجو ملا
اپنی تلاش تھی کہ نصیبوں سے تو ملا

سب ہمصفیر قید سے چھوٹے بہار میں
اِک میں اسیرِ الفتِ صیاد رہگیا

صیاد نے خبر بھی نہ لی مرغِ دل کی حیف
آخر تڑپ تڑپ کے تہِ دام رہگیا

اک برق سی چمکی نگہِ شعلہ فشاں میں
دیکھا جو بھبھوکا بدن اُس رشکِ پری کا

کیا کہا میں نے کہ جھڑکی کا سزاوار ہوا
بات کیا منہ سے نکالی کہ گنہگار ہوا

طرزِ سخن مرقعِ نیرنگ ہو گیا
کاغذ طلسم خانۂ ارژنگ ہو گیا

حُسن کی سیر ہے منظور تو رکھیئے ہر آن
آئینہ پیشِ نظر چشمِ تماشائی کا

بوسہ عارض کا لیا ہمنے بلائیں لیکر
کس تکلف سے ترے حُسن کا صدقہ اُترا

ہنسی کے لطف اُٹھے جو غضب میں یار آیا
لی جو بوسہ پہ گالی تو اور پیار آیا

چل بسے اہلِ جنوں خالی بیاباں رہ گیا
جا بجا اُلجھا ہوا کانٹوں میں داماں رہگیا

تم کہو قصہ ہمارا بزمِ حسن وعشق میں
گل کہے رودادِ بلبل شمع پروانے کی بات

ہنستا ہے وہ کہ ہونٹوں پہ سرخی ہے پان کی
آتش لگی ہے خرمنِ برقِ یمن میں آج

جوہر کی قدر کھلتی ہے معنی شناس سے
فہم سخن ہے نسخۂ علم و ہنر کی شرح

دل میں صبحِ شبِ وصل آگ لگا دیتا ہے
چھوڑ دیتا ہے جو خورشید کی چنگاری چرخ

ہر سحر طرزِ شفق سے یہ عیاں ہے کہ مدام
چشمِ خورشید کو سکھلائے ہے خونخواری چرخ

آنکھوں میں اسکی سرمۂ دنبالہ دار ہے
ہونے لگی ہنوز غزالِ ختن کی شاخ

خیالِ یار میں ہے چشمِ تر بند
پری شیشے کے اندر ہے نظر بند

لالہ رویوں کا جگر غم سے مرے داغ ہوا
تازہ گل باغِ محبت میں کھلا میرے بعد

عاشق کی بیخودی سے تو بگڑا ہوا ہے کیا
اے مستِ ناز اپنی طرف تو خیال کر

ہوئے ساقی سے خجل واہ رے کم ظرفی دل
بوسۂ لب کی طلب پہلے ہی پیمانے پر

غش ہے نگاہ شوخیٔ انداز ناز پر
جی لوٹتا ہے غمزۂ عاشق نواز پر

کشتۂ انداز سے آنکھیں پھرا تا واہ واہ
پھر ہے مکھڑا چھپا تا جان کر پہچان کر

سبز پتوں سے شہیدانِ چمن کے زخم پر
مرہمِ زنگار کے پھاہے لگاتی ہے بہار

پچھلے داغوں سے جگر پر ہیں نشاں باقی ہنوز
دیکھئے اب کے برس کیا گل کھلاتی ہے بہار

ہم دیکھتے ہی رہ گئے اور صاف نظر میں
دل لے ہی گیا وہ بتِ عیار اڑا کر

معنی کا لطف کچھ نہیں صورت پرست کو
بلبل ہنوز فریفتہ عطرِ گلاب پر

جنوں سے نے غل مچا کر خاک اڑا کر
بیاباں رکھ لیا سر پر اٹھا کر

چھپا ظلمت میں آبِ زندگانی
دھڑی مستی کی ہونٹوں پر جما کر

کھلا ہستی کا پردہ جن کے دل پر
وہ بیٹھے زندگی سے ہاتھ اٹھا کر

نہ پائے خستہ جاں مجھ سا جو ڈھونڈے
فلک خورشید کی مشعل جلا کر

چوری سے بوسہ لیجئے پائے نگاہ کا
اس رنگ سے کہ دزدِ حنا کو نہ ہو خبر

پڑ رہے ہیں آنکھ لڑتی ہے اس رشکِ حور سے
پردہ پڑ رہا ہے کہ شرم و حیا کو نہ ہو خبر

وہاں پھولوں کے بستر پہ ہیں کیا چین کی نیندیں
کانٹوں کا یہاں فرش ہے کروٹ کے برابر

منزلِ گہِ فنا کی خبر کس سے پوچھئے
جا کر وہاں پھرا نہ کوئی کاروان ہنوز

وصلِ محبوب میں ہو جاتا ہے آسان وصال
ناز و غمزے کے جو پاتے ہیں سہارے عاشق

کیونکر دلِ بیتاب پہ لگتا ہے نشانہ
ہیں سب قدر انداز ترے تیر کے مشتاق

خوں ہو دلِ بیقرار کینتک
آنسو ہوں گلے کا ہار کینتک

عشق کی آگ سے بھڑکی دلِ بیتاب میں آگ
برقِ سوزاں سے لگی چشمۂ سیماب میں آگ

آب پاشیٔ مژۂ تر کی نہ آئی کچھ کام
سوزِ فرقت سے جو بھڑکی دلِ بیتاب میں آگ

واقعی قابلِ سزا ہیں ہم
یعنی دیرینہ آشنا ہیں ہم
اے صنم یہ ستم خدا سے ڈر
عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم

قافلے والو اک ذرا ٹھہرو
پھر کے دیکھو شکستہ پا ہیں ہم

عینِ غفلت ہے زیست شکلِ حباب
آنکھ کھولی تو بس ہوا ہیں ہم

تڑپتے رہے بلکہ مرتے رہے ہم
مگر دم محبت کا بھرتے رہے ہم

بہت زندگی کے مزے ہم نے لوٹے
بہت تجھ پر اے جان مرتے رہے ہم

شب آئے نہیں قاتل کے جو دیر گذری
تجھے اے اجل یاد کرتے رہے ہم

نہیں تاب کہ دیکھوں جمالِ صنم مجھے خوبیٔ دیدۂ دید کی قسم
رخِ حسن کی جلوہ گری کی قسم غمِ عشق پردہ دری کی قسم

تجھے عارضِ رشکِ قمر کی قسم تجھے شعلۂ داغِ جگر کی قسم
تجھے شوخیٔ برقِ نظر کی قسم تجھے گرمیٔ جلوہ گری کی قسم

نگرانی تناذکی دلِ زار کو خوں کہ یہ ذوقِ سخن ہے مذاقِ زباں
تری طرز سے آتی ہے بوئے جنوں مجھے نیری ہی جگری کی قسم

ہر چند گناہ گار ہیں ہم
رحمت کے امیدوار ہیں ہم

اے حشر خبر شتاب لینا
بیتاب تہِ مزار ہیں ہم

ہو خاک سے اپنی لالہ پیدا
خونیں جگر بہار ہیں ہم

بو ہے غنچہ میں نہاں یا ترے ہونٹوں پہ ہنسی
قید شیشے میں پری ہے کہ حیا آنکھوں میں

اب سبب کیا ہے کہ کانٹا سا کھٹکتا ہے ذکی
یہ وہی دل ہے کہ رہتا تھا سدا آنکھوں میں

کہا قضا نے کہ سرگرمِ انتظار ہوں میں
پیامِ حشر ہے مجھکو کہ بے قرار ہوں میں

چمن میں سبزۂ پامال گرچہ ہوں لیکن
نظر میں گل کی کھٹکتا یہ ہوں کہ خار ہوں میں

وہ آدمی ہی کیا جو نہ ہو دردآشنا
پتھر سے کم ہے دل میں شرر گر نہاں نہیں

درکار کیا ہے عاشق و معشوق میں تمیز
دو دل جو ایک ہیں تو دوئی درمیاں نہیں

وحدت ہے درمیاں تو پھر اے دل دوئی کہاں
شوقِ وصال ہے تو سمجھ لے کہ تو نہیں

درپیش ہے ہزار مصیبت امید سے
کچھ غم نہیں ہے دل کو جو کچھ آرزو نہیں

ہم سے لیکے دل بغل میں بزمِ صنم میں آئے
شیشہ چھپا کے لائے پریوں کی انجمن میں

کیوں یادِ زلفِ جاناں قیدی ہمیں بنایا
کیوں رشتۂ محبت باندھا ہمیں رسن میں

عرس مجنوں ہے کہ صحرا میں بگولے بن کر
وجد کرتے ہوئے مستوں کے غبار آتے ہیں

دیر سے کچھ خبر خاطرِ ناشاد نہیں
دل کہاں بھول اٹھا ہوں مجھے کچھ یاد نہیں

اس پتہ سے پوچھنا قاصد مکانِ یار کو
چاندنی کہتے ہیں کسکے سایۂ دیوار کو

کچھ نہ پوچھو تپشِ دل کا ہمارے احوال
ہے وہ عالم کہ قیامت بھی تماشائی ہو

آشنا سب کا ہے تو اور کسی کا بھی نہیں
کوئی کیا تجھ پہ فدا اے بتِ ہرجائی ہو

تنگ ہوں ننگ سے اب دل میں یہ آتی ہے ترنگ
میں ہوں اور یار ہو اور عالمِ رسوائی ہو

قاتل کے ڈر سے بات بھی منہ سے نہ کہہ سکا
ہونٹوں پہ خوں ہوئی دلِ بسمل کی آرزو

لطفِ جاں بخش بھی ہے غمزۂ بیداد کیساتھ
مژدہ اے دل کہ مسیحا بھی ہے جلاد کے ساتھ

شرما کے طیش کھا کے خفا ہو کے ہنس پڑے
پاؤں پہ میں گرا جو بدن پر لگا کے ہاتھ

منت مرے جل مرنے کی پوری ہوئی لیکن
تم شمع چڑھانے کو بھی مدفن پہ نہ آئے

برقِ طپشِ آہ سے پہنچے نہ کہیں آنچ
کہدو کہ قیامت مرے مدفن پہ نہ آئے

جوہر تھے مجھ میں سب ملکوتی خصال کے
انساں بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی

ماہتابی پر جو وہ خورشید رو ہے بے حجاب
اپنے جامہ سے ہوئی جاتی ہے باہر چاندنی

دکھلا رہے ہیں رنگ گلستاں نئے نئے
پتے ہرے ہرے گل و ریحاں نئے نئے

آغازِ عشق میں یہ مزا ہے کہ اے جنوں
دامن نئے نئے ہیں گریباں نئے نئے

آوارگی کی سیر ہے اور آمدِ بہار
سودا ہے تازہ تازہ بیاباں نئے نئے

نہ ہوئی لطفِ تصور میں یہاں تابِ سخن
ورنہ شکوے تو بہت اے غمِ تنہائی تھے

خیالِ زلف میں کب دل کا داغ جلتا ہے
کہیں بھی کالے کے آگے چراغ جلتا ہے

افسردہ اشک و آہ نے ایسا کیا مجھے
جنگل کا شوق ہے نہ چمن کی ہوا مجھے

دل بستگی کسی سے مسافر کو کیا ضرور
جب دل لگا تو رہ گئے جب دل اٹھا چلے

شاید چلی ہے جنبشِ دامانِ یار سے
آتی ہے بوئے ناز نسیم بہار سے

کہنا پیامبر کہ فراموش ہے کیا
وعدہ بھی کچھ کیا تھا کسی بیقرار سے

گلدستہ بن کے آنکھوں سے گرتے ہیں لختِ دل
یہ ہار گوندھے جاتے ہیں اشکوں کے تار سے

جب یہ سنا کہ پاؤں میں مہندی لگی ہو وہاں
یہاں خوں ٹپک پڑا نگہِ انتظار سے

ہم کو ملا کے خاک میں بھی تم ہوئے نہ صاف
دل میں وہی غبار ہے اس خاکسار سے

دل چھاننے میں دیکھئے اب کس کی بن پڑے
پھولوں کے ہار الجھے تو زلفِ یار سے

اس دم ہوا مقابلہ صبحِ امید کا
آنکھیں سفید ہو گئیں جب انتظار سے

تاثیر داغِ عشق یہ دیکھو کہ بعدِ مرگ
ہر ذرہ آفتاب ہے اپنے غبار سے

بدلی اٹھی ہے موجِ ہوائے بہار سے
بجلی چمک رہی ہے فغانِ ہزار سے

طرزِ سخن سے رنگ ٹپکتا ہے اے ذکی
گویا زبان دھوئی ہے خونِ ہزار سے

اک ذرا تیغ نگہ کا جو اشارا ہو جائے
آپ کا نام ہوا اور کام ہمارا ہو جائے

یہ حسین سبز ہے زہر ہلاہل خستہ جانوں کو
یہ زنگاری ڈوپٹہ اور تم پر آسمانی ہے

دیکھو ذکی کہ اب وہ چرانے لگے نگاہ
آنکھوں کو جن کی دیکھ کے بیمار ہم ہوئے

یہ چمن کی خاک میں ہے اثر نم اشک بلبل زار سے
کہ جنوں کی لہر سی اٹھتی ہے رگ گل میں خون ہزار سے

میری آنکھوں میں ہی وہ شوخ طرحدار پری
زلف ہی بال پری شعلۂ رخسار پری

نشۂ بادۂ گلرنگ سے دیکھا یہ رنگ
انکھڑیاں شیشہ ہیں برق نگہ یار پری

دام تحریر میں مضمون دل آرا ہے اسیر
یا خم زلف سخن میں ہے گرفتار پری

لکھنو جلوہ فروشوں سے پرستاں ہے ذکی
نظر آتا ہے ہر اک شاہد بازار پری

شعلہ خو یار کو دیکھا جو ادھر سے برہم
اور بھڑکانے لگے آگ لگانیوالے

ایک نشتر ہی کہ دیتا ہے رگ جاں کو خراش
ایک کانٹا ہے کہ پہلو میں چبھوتا ہے کوئی

ہر ایک دیکھکر اسے کیوں بے قرار ہے
خورشید حشر کیا کہیں تصویر یار ہے

پیری میں بھی مزا ہی میسر اگر ہو عیش
دل کو سرور ہو تو خزاں بھی بہار ہے

مطلع صبح قیامت ہی شبیہ زخم دل
آفتاب صبح محشر داغ کی تصویر ہے

ای ذکی پوچھو نہ باعث گرمی اشعار کا
سوز دل کا حال نوک شعلہ سے تحریر ہے

محشر نے آکے قبر میں تڑپا دیا مجھے
کسکی خرام ناز کا دھوکا ہوا مجھے

بیٹھکر گور غریباں سے جو یار اٹھتا ہے
اسکے دامن کے پکڑنیکو غبار اٹھتا ہی

پیشوائی کو شتاب آئے قیامت سے کہو
کہ جہاں سے کوئی بے صبر و قرار اٹھتا ہے

نجد میں ناقۂ لیلی جو کبھی گذرا تھا
اب تلک تربت مجنوں سے غبار اٹھتا ہے

مستی لب گلگوں پر تصویر نظر آئی
یاقوت میں نیلم کی تحریر نظر آئی

پیش نظر اس رخ کی تنویر نظر آئی
پرواز تصور کی تصویر نظر آئی

جو دونوں کی لگاوٹیں ہو دیں باہم تو جفا سے چھٹے نہ ستم سے چھٹے
ہوئے لاکھ طرح کے بگاڑ مگر نہ ہم ان سے چھٹے نہ وہ ہم سے چھٹے

کبھی دیکھیں جو ابرو چشم صنم تو رہینگی نہ خواہشیں انکی بہم
دل برہمن الفت بت سے چھٹے دل شیخ ہوائے حرم سے چھٹے

تنگ ہوں میں کشمکش سے تیری ای دست جنوں
دامن دلدار کا صدقہ گریباں چھوڑ دے

بنتی ہیں مٹی کی پریاں نور کی صورت یہاں
لکھنؤ دیکھے تو دیوانہ پرستاں چھوڑ دے

بیقراری سے ہوا خوب کہ ٹوٹے پر و بال
اب تو اُمید رہائی سے رہائی ہو گی

زمیں سے لالہ نکلتا ہے داغ کھائے ہوئے
بہارِ عشق کے ہیں یہ بھی گُل کھلائے ہوئے

ذکی مرے دلِ وحشی کو مثلِ طائرِ رنگ
ہوائے طوق لیئے جاتی ہے اُڑائے ہوئے

رات دیوانگیِ شمع بھی ہم دیکھ چکے
گریۂ و خندۂ جانسوز بھی ہم دیکھ چکے

جی یہی چاہتا ہے پھر بھی کہ دیکھا ہی کریں
لاکھ باری تجھے سر تا بقدم دیکھ چکے

پیری و عہدِ شباب آہ خرابی میں کٹے
شبِ غم دیکھ چکے صبحِ الم دیکھ چکے

اب تڑپنے کی تمنا ہے تہِ تیغِ نگاہ
خنجرِ غمزۂ دمساز کے دم دیکھ چکے

اب بھی ہو جاتا ہے پیمانِ وفا میں دھوکا
جھوٹے سو بار ترے قول و قسم دیکھ چکے

اپنے بس کیا ہے کہ آغوشِ تصور میں دبے
لب بلب سینہ بسینہ اُسے ہم دیکھ چکے

دیکھئے داغ تو اب آہ و فغاں بھی سُنئے
دِل بھی دیکھو گے مرا تم کہ جگر دیکھ چکے

جو کوئی دن کو چلے شب کو ٹھہر جاتا ہے
قاصدِ عمرِ رواں آٹھ پہر جاتا ہے

میں تڑپتا ہوں پڑا نیم نگہ کا مشتاق
اے مری جان کے دشمن تو کدھر جاتا ہے

چشمِ جادو میں تری زہر ہے اور آبحیات
زندگی پاتا ہے کوئی کوئی مر جاتا ہے

ہنس ہنس کے زخمِ دل پہ چھڑکتے تو ہو نمک
پر یہاں تلک مزا ہے کہ باقی مزا رہے

زیبندہ ہے غرورِ بتِ مستِ ناز کو
اِس شرط پر کہ حسن کا عالم سدا رہے

جوہر کی قدر خاک نہ ہو جب ترے حضور
ق پھر عاشقوں کی بات مری جان کیا رہے

دزدِ حنا کا سرقہ تو اُڑ جائے ہاتھوں ہاتھ
مضمون خونِ دِل کا پڑا پیش پا رہے

گاہے غمِ فراق گہے آرزوئے وصل
کیا کیا ہو دل لگی جو کہیں دل لگا رہے

ہے وہی عہد انتظار وہی
ہم وہی، تم وہی، قرار وہی

یہاں تو جز مشتِ خاک کچھ نہ رہا
یار کے دل میں ہے غبار وہی

ہو عکس جلوہ گر جو لبِ لعلِ یار کا
نہریں لہو کی جاری ہوں خنجر کی آب سے

رات میں آئیں نظر تارِ شعاعِ خورشید
زلفِ مشکیں میں جو وہ طرۂ زرتار اُلجھے

وقفہ ہماری خاک پہ اک دم ضرور تھا
کیا لئے آئے، کیا کھڑے ہوئے، کیا ٹھہرے، کیا چلے

ہر رگِ مژگاں میں قطرے آنسوؤں کے ہیں مرے
دیکھ لے رونے میں کیا موتی پروتا ہے کوئی

ناصحا! کیوں منع کرتا ہے تو رونے سے مجھے
آہ ظالم کیا تری آنکھوں سے روتا ہے کوئی

ہر گل کو دلفگار جو دیکھے بہار میں
کیونکر نہ آہِ سرد نسیم و صبا بھرے

یہ کیا سبب کہ تلخ تر اُس لب سے بات ہے
شیریں زباں تو غیرتِ شاخِ نبات ہے

ہے سنگِ سیاہِ کعبۂ حُسن
ابرو پہ جو اُس صنم کی تل ہے

لی چہرہ پہ آستین فانوس
پروانہ سے شمع کیا خجل ہے

معشوق چھپائے کیوں نہ مکھڑا
چوری سے نگہ کی منفعل ہے

دل ہم سے جدا رہا ہمیشہ
گویا وہ ضمیرِ منفصل ہے

ذکی حکیم سید عبدالاحد صاحب ولد حکیم میر خادم علی صاحب مرحوم اصل وطن انکا نورنگ آباد ضلع بلند شہر ہے مگر میر خادم علی صاحب مرحوم بوجہ قرابت قصبہ مارہرہ ضلع ایٹہ میں جا رہے تھے اور وہیں انتقال کیا، جناب ذکی اسم بامسمی اشخص ہیں ذہانت اور ذکاوت بات بات میں ظاہر ہوتی ہے فنِ طب میں نہایت عمدہ دستگاہ رکھتے ہیں، علم مجلسی سے خوب واقف ہیں اور نہایت خوش تقریر ہیں، عرصہ دراز سے قصبۂ کاسگنج ضلع ایٹہ میں مطب کرتے ہیں۔ ابتدائے عمر میں اکثر اور اب بھی کبھی کبھی کسی خاص فرمایش سے شعر و سخن کی طرف توجہ ہو جاتی ہے۔ ترتیب تذکرہ کے وقت جو اشعار انکے وصول ہوئے وہ درج ذیل ہیں چھپن ستاون سال کی عمر ہے

شب فرقت میں رو رو کر خیالِ گلبدن ہوتا
پڑا ہے ہمکو موجِ اشک سے صحنِ چمن دھونا

کدورت دل کی مٹ جاتی ہے اشکوں کے بہانے سے
مری آنکھوں سے سیکھو دفترِ رنج و محن دھونا

یہ کس خورشید وش کی آمد آمد ہے کہ گلشن میں
ہوا دشوار شبنم کو گلوں کا پیرہن دھونا

عزیزو بعدِ مُردن مجکو نہلانا تو یوں کرنا
پھرا کر کوچۂ قاتل سے دل لینگے ذکی ورنہ
مٹانا داغِ حسرت پہلے پھر سارا بدن دھونا
ہماری زندگی سے ہاتھ اے اہلِ وطن دھونا

عاشق کو اک اشارہ ہیں گردش ہیں ٹی الدین
سرگرمی ہجوم نظارہ تو دیکھ لیں
کُشتے تمھارے دینگے لبِ گور سے جواب
نرگسی آنکھ نے مارا نری ای یار مجھے
تجھکو ہر روز گریبان کہاں سے لادوں
آنکھیں تری نمونۂ لیل و نہار ہیں
مثلِ نقاب رُخ پہ نگاہوں کے تار ہیں
اتنا تو پوچھ آکے یہ کس کے مزار ہیں
آپ سا کر لیا بیمار نے بیمار مجھے
اے جنوں اتنو میسر نہیں اک تار مجھے

خدا سے شکوۂ جورِ بتاں کیجیے تو کیا کیجیے
جفا جو، بے مُروّت، بیوفا، بے مہر، بے پروا
شکایت گل کی پیشِ باغباں کیجیے تو کیا کیجیے
ذکی یہ ہے شعارِ گلرخاں کیجیے تو کیا کیجیے

ذکی ۔ منشی محمد کریم لکھنوی، آپ بہ سلسلۂ ملازمت ریاستِ بھوپال میں ۱۹۰۰ء میں برسرِ روزگار تھے اور منشی سراج میر خان ہجر سے اصلاح لیتے تھے۔

مجھے ضد ہے کہ وعدہ لیکے اُٹھوں
کیا اُس بُت نے وعدہ بھی تو ہنس کر
وہاں تار اُسنے باندھا ہے نہیں کا
نکالا ہاں میں بھی پہلو "نہیں" کا

وابستہ دل ہی یوں تری زلفِ رسا کے ساتھ
خوش ہیں جہاں میں جام و مئے دلربا کے ساتھ
دیکھے ادا و ناز و کرشمہ تو کھو گیا
بسمل ہوا کوئی تو کوئی لوٹنے لگا
صیاد کی نگاہِ غضب اُس پہ جب پڑی
تم نے ہمارا حالِ محبت سُنا ذکی
اقبال جیسے سایۂ بالِ ہما کے ساتھ
روزِ جزا کی دیکھیں گے روزِ جزا کے ساتھ
رو بیٹھے دل کو ہم تری محفل میں لاکے ساتھ
تیغِ نظر چلی جو کسی کی ادا کے ساتھ
بجلی بھی آسماں سے گری تلملا کے ساتھ
اب کیا وفا کرے کوئی اُس بیوفا کے ساتھ

ذکی ۔ میرزا کبیر الدین گورگانی متخلص بہ ذکی ۱۲۸۳ھ میں جو دہلی میں مشاعرے ہوتے تھے اُن میں غزل خوانی کیا کرتے تھے شاید اپنے عزیز مرزا ارشد گورگانی سے اِس فن میں مستفید تھے۔

کل پرسوں کسی ہم تو ہیں حاضر ابھی صنم
عاشق تو میں ہوں یہ تو پچارا ہے ایلچی
آپ چہ روش ہیں آپکے غلماں بنینگے دوست
کیا میرے ذبح کرنے ہیں خنجر کی جستجو

خنجر نکالیے کہیں صاحب کمر سے آپ
بیفائدہ اُلجھتے ہیں کیوں نامہ بر سے آپ
ہاں ہم بشر ہیں کیونکہ ملینگے بشر سے آپ
کر دیتجے فیصلہ مرا ترچھی نظر سے آپ

ذکی

ذکی - منشی اشفاق حسین صاحب قوم کمبوہ ساکن قصبہ مارہرہ ضلع ایٹہ محکمۂ بندوبست میں ملازم اور ابتدائے عمر سے شعر و سخن کے شائق ہیں پچاس برس کے قریب عمر ہے پرانی طرز میں شعر کہتے ہیں، فارسی کا مذاق بھی رکھتے ہیں ترتیب تذکرہ کے وقت جو انکا کلام وصول ہوا اُس کا انتخاب لکھا جاتا ہے ۱۸۹۷ء میں بہ سلسلۂ ملازمت بدایوں میں تھے اور زیادہ حال معلوم نہیں ۔

سُنکر یہ بار بار تمہاری نہیں نہیں
چھوڑ آتے گر عدم میں تو رہتے تو چین سے
وحشت کا جوش پھر ہی مجھے کوہ و دشت میں
کشتے تمھاری تیغ نظر کے بھتیں ضرور
ساقی تمھارے پہنچے کہاں سے کہاں ذکی

ہاں کا بھی اعتبار اب ای نازنیں نہیں
دنیا میں آئے کیوں دل مضطر لیے ہوئے
پھرتا ہے میرے بخت کا چکر لیے ہوئے
جاوینگے پیش داور محشر لیے ہوئے
بیٹھے رہو تم اپنا مقدر لیے ہوئے

ذلیق

ذلیق - مولوی محمد نصر اللہ خان مدرس مدرسۂ اسلامی عربی حسن پور - چند شعر ملاحظہ ہوں -

اجل تو بیٹھی ہے روز ازل سے تاکے مجھے
تمھارے دل کی تمنا بھی ہو گئی پوری
اُٹھاؤ ہاتھ مرے درد دل سے چارہ گرو!
دلِ حزیں سے مرے سختیاں نہیں اٹھتیں

حیات رکھتی ہے لیکن بچا بچا کے مجھے
شب وصال وہ بوسے گلے لگا کے مجھے
خدا پہ چھوڑ دو اب واسطے خدا کے مجھے
بتو! معاف کرو واسطے خدا کے مجھے

ذوق

ذوق - الف خان ابنِ دلیر خان معروف بہ تخت عوالی نشان بسر بخشی اعظم نواب سعد اللہ خاں آپ اہلِ مروّت، آشنا پرست، صاحبِ حوصلہ، خوش سلیقہ، خوش تلاش، خوش فکر تھے - اگرچہ

مشق کم تھی مگر ذہن رسا اور فکر بجا رکھتے تھے، قدرت اللہ شوق کہتے ہیں مجھ پر انکا حق نمک بدرجۂ غایت ہے۔ الغرض شاہ عالم ثانی کے آخر عہد میں ایک خوش باش، خوش گذران رئیس تھے۔ اور علم و ہنر کے قدر دان۔ یہ انکا کلام ہے۔

لگی ہے آخر ش جا کر یہ ظالم تیرے قدموں سے
چلا قابو نہ کچھ اس خاک دامنگیر پر تیرا

اگر میری طرح سیماب دل مارے تو میں جانوں
گھوس ناز بجا ہے اب اس اکسیر پر تیرا

جب سے ان ماہ وشوں سے یہ مری آنکھ لگی
شیوا پکڑا ہے سدا چشم نے بیداری کا

کچھ ستم سا جو ستم ہو تو میں تقریر کروں
عاجز ہے کیجیے بیاں تیری ستم کی صورت

ہائے شب پوچھے تھا وہ مجھ سے کس انداز سے راز
کہہ سکا ایک نہ میں خطرۂ غماز سے راز

پہنچا ہے جب سے گوشۂ دستار پر ترے
ہے کچھ بلند عرش بریں سے دماغ گل

لخت دل اشک سے اب رہتے ہیں تہ پانی میں
گرچہ آتش نہیں آتی ہے نظر پانی میں

عکس ابرو کا تری دیکھ کے مثل شمشیر
موج دریا کی ہوئی زیر و زبر پانی میں

خدا ہی جانے کہ طفلی میں کیا بلا ہوگا
مجھے تو مار گئی یہ ادا جوانی کی

برنگ مہر و شبنم نت مری اوقات کٹتی ہے
جو سر گرداں پھروں ونکو تو رونے رات کٹتی ہے

اہل چمن کو کسی گلشن میں جستجو سے ہے
ہر سرو جو کھڑا واں جھانکے ہر ایک سو ہے

ملے کیا کیا جواہر عشق کے ہمکو خزینہ سے
جھڑے ہیں داغ اور گل کھائے سینہ پر نگینے سے

کہاں وہ دن کہاں وہ دل کہاں ہے نیزا وہ عالم
سفر کر آئے ہیں مدت میں لگجا اب تو سینے سے

جواب خط کو کب لکھتا ہے جینے پڑھتے ہی نامہ
مرا نام ہے ترا شایک قلم وے کے سفینہ سے

نکلتے ہیں ستارے دن کو بھی خورشید کے آگے
ہوئی یہ بات اب سن ترے منہ کے پسینے سے

در گوش خوباں تو ہے آفت جان
پر اس کا لالا خوبی کا بالا بلا ہے

پری، یا حور، یا غلماں، کہ نور حق تعالیٰ ہے
کہ چپ رہنے کی جا ہے اسکا عالم ہی نرالا ہے

بلا، آفت، غضب، قہر خدا وہ قد بالا ہے
فلک نے بیکسوں کیواسطے یہ فتنہ پالا ہے

نیا انداز، نئی طرزیں، نیا جوبن، نئی باتیں بلا کنٹھا ستم یہ ہے غضب چمپہ کلی تس پر	اُلہی چشم بد دُور ہوش ابھی اُسنے سنبھالا ہے گلے میں دُھگدگی آفت پڑی سینہ پہ مالا ہے
شب قصہ میں اپنے درد کی بات سُن سن کے لگا وہ کہنے ہاں ہاں	میں نے جو سُنائی تا گہانی آگے بھی سُنی تھی یہ کہانی

ذوق

ذوق - عندلیب شکرستان فصاحت وطوطی چمنستانِ بلاغت ملک الشعراء خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم دہلوی ولد شیخ محمد رمضان ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۰۴ھ کو پیدا ہوئے، انکے خاندان کے لوگ اب بھی دہلی میں جراحی کرتے ہیں، اسکے علاوہ کچھ قطعات تاریخ وفات سے بھی یہ بات ثابت ہے، نیز یہ امر کہ کسی ہمعصر تذکرہ نویس مثل شیفتہ، آزردہ، نساخ ۔صابر، محسن، منشی کریم الدین، کسی نے ولدیت کا اشارہ تک نہیں کیا جو غالباً عمداً معلوم ہوتا ہے مگر مولوی محمد حسین آزاد اُستاد پرستی کی ترنگ میں شیخ محمد رمضان کو سپاہی زادہ بتاتے ہیں، اُنکا بیان ہے کہ اُنکی زبانی تقریریں تاریخی معلومات سے لبریز ہوتی تھیں، وہ دلّی میں کابلی دروازے کے قریب رہتے تھے اور نواب لطف علیخاں نے اُنھیں معتبر سمجھ کر اپنے حرم سرا کے کاروبار سپرد کر رکھے تھے شیخ ابراہیم ذوق جب پڑھنے کے قابل ہوئے تو حافظ غلام رسول نام ایک شخص بادشاہی حافظ انکے گھر کے پاس رہتے تھے، محلّے کے اکثر لڑکے اُنھیں سے پڑھتے تھے، اِنھیں بھی وہیں بٹھا دیا۔ حافظ غلام رسول شاعر بھی تھے، شوق تخلص کرتے تھے شیخ مرحوم کو اُنکی صحبت میں بہت شعر یاد ہوگئے، نظم کے پڑھنے اور سننے میں دلکو روحانی لذت ہوتی تھی شیخ مرحوم کا قول تھا کہ میں ہمیشہ اشعار پڑھا کرتا۔ دِل میں شوق تھا اور خدا سے دعائیں مانگتا کہ الٰہی مجھے شعر کہنا آجائے، اِسی زمانے کا ایک مصرع ہے ؎ مزا انگور کا ہے رنگترے میں، (یہ فقرہ آجتک دہلی میں میوہ فروشوں کی زباں پر ہے) ایک دن خوشی میں آکر خود بخود میری زبان سے دو شعر نکلے اور یہ فقط حسنِ اتفاق تھا کہ ایک حمد میں ایک نعت میں، اِس عمر میں مجھے اتنا ہوش تو کہاں تھا کہ اس مبارک مہم کو خود اِس طرح سمجھ کر شروع کرتا کہ پہلا حمد میں ہو دوسرا نعت میں، جب یہ بھی خیال نہ تھا کہ اس قدرتی اتفاق کو مبارک

فال سمجھوں، مگر ان دو شعروں کے موزوں ہو جانے سے جو خوشی دل کو ہوئی اُس مزہ کو کبھی نہیں بھولا۔ غرضکہ شیخ مرحوم اِسی عالم میں کچھ کچھ کہتے اور حافظ جی سے اصلاح لیتے رہے۔ اِسی محلے میں میر کاظم حسین نام ایک اِن ہی کے ہم سبق تھے اور نواب سیّد رضی خاں وکیلِ سلطانی کے بھانجے بیقرار تخلص کرتے تھے، اور حافظ غلام رسول سے اصلاح لیتے تھے، ایک دن میر کاظم حسین نے غزل لاکر سنائی، شیخ مرحوم نے پوچھا یہ غزل کب کہی، خوب گرم شعر نکالے ہیں، اُنھوں نے کہا کہ ہم تو شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے، شیخ مرحوم کو بھی شوق پیدا ہوا اور اُنکے ساتھ جاکر شاگرد ہو گئے۔

کچھ دنوں بعد غزلوں کی اصلاح میں بے توجہی اور علی الخصوص تمنیر خلف شاہ صاحب کے کلام میں انھیں مضامین کے بندھنے سے شاہ نصیر سے بگاڑ ہو گیا۔ اِنکی طبیعت بھی قادر الکلامی کا سارٹیفکٹ حاصل کر چکی تھی رُو در رُو مشاعروں میں مقابلہ ہونے لگا۔ اور اصلاح کا سلسلہ بند ہو گیا۔ ان کی قدرتی طبیعت کی شوخی اور شعر کی گرمی سننے والوں کے دلوں میں اثر برق کی طرح دوڑی اور کلام کا چرچا بڑھا۔ غزلیں ارباب نشاط کی زبان سے نکل کر کوچہ و بازار میں رنگ اُڑانے لگیں اکبر شاہ بادشاہ تھے اُنھیں تو شعر سے رغبت نہ تھی۔ مرزا ابو ظفر ولیعہد کہ بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے شعر کے شیدا تھے اور ظفر تخلص سے ملکِ شہرت کو تسخیر کیا تھا۔ اِس لیئے دربار شاہی میں جو کہنہ مشق شاعر تھے مثلاً ثناء اللہ خاں فراق، میر غالب علیخاں سیّد، عبد الرحمٰن خاں احسان، برہان الدین خاں زار، حکیم قدرت اللہ خاں قاسم اور اُنکے صاحبزادے حکیم عزت اللہ خاں عشق، میاں شکیبا شاگرد میر تقی مرحوم، میر عظیم بیگ شاگرد سودا، میر قمر الدین منّت اور اُنکے بیٹے میر نظام الدین ممنون وغیرہ سب شاعر وہیں آکر جمع ہوتے اور اپنا اپنا کلام سناتے تھے، میر کاظم حسین بیقرار کہ ولیعہد موصوف کے مصاحب تھے اکثر ان صحبتوں میں شامل ہوتے تھے، شیخ مرحوم کو خیال ہوا کہ اِس جلسے میں طبع آزمائی ہوا کرے تو قوتِ فکر کو خوب بلند پروازی ہو۔ اُس عہد میں کسی امیر کی ضمانت کے بعد بادشاہی اجازت ہوا کرتی تھی جب کوئی قلعہ میں جانے پاتا تھا، چنانچہ میر کاظم حسین کی وساطت سے یہ قلعہ میں پہنچے اور اکثر دربار ولیعہدی میں جانے لگے، رفتہ رفتہ انکی قادر الکلامی نے

سکہ بٹھایا اور کچھ اسباب ایسے فراہم ہوئے کہ مرزا کاظم حسین بیقرار جو مرزا ولی عہد کی غزل شاہ نصیر
کے دکن چلے جانے کے باعث دیکھا کرتے تھے الفنسٹن صاحب کے میر منشی ہو کر چلے گئے اور
میرزا ابوظفر ان کے شاگرد ہو گئے، ابتداءً سرکار ولیعہدی سے شیخ مرحوم کا مشاہرہ چار روپیہ ہوار
مقرر ہوا۔ مولانا آزاد نے جوش عقیدتمندی ہیں آب حیات میں یہ ذکر بھی کر دیا ہے کہ نواب
الٰہی بخش خان معروف جو شاہ نصیر کے پرانے شاگرد اور اس وقت ۶۶ سال سے زائد انکی عمر تھی
اُنہوں نے حضرت ذوق کو جو بمشکل اٹھارہ برس کے تھے اپنا اُستاد بنایا اور اپنے دونوں دیوان
درستی کے لیئے دیئے۔ اس واقعہ کی تکذیب نواب ضیاءالدین احمد خان نیر و رخشان اور نواب
احمد سعید خان صاحب طالب نے خود مولانا آزاد سے مباحثہ کر کے بہ براہین قاطع کر دی تھی،
مگر افسوس کہ مولانا نے اقرار کر لینے کے باوصف طبع ثانی میں اس بیان کی تردید نہ کی بلکہ جب کئی
برس بعد دیوان ذوق خود شائع کیا تو اُس میں تحریرًا اس عبارت کو نقل کر دیا۔

اگلے سال شیخ مرحوم نے ایک قصیدہ اکبر شاہ کے دربار میں سنایا کہ جسکے مختلف شعروں
میں انواع و اقسام کے صنائع و بدائع صرف کیئے تھے اس قصیدہ پر بادشاہ نے خاقانی ہند کا
خطاب عطا کیا۔ اُس وقت شیخ مرحوم کی عمر بقول حضرت آزاد اُنیس ۱۹ برس کی تھی، ان ایام
میں میر کلو حقیر حضرت ذوق کے بڑے ممد و معاون رہے۔ ۳۶ برس کی عمر میں آپنے جملہ
منہیات سے توبہ کر لی تھی اور اُسکی تاریخ یہ کہی ع "اے ذوق بگو سہ بار توبہ"
مرزا ابوظفر بادشاہ ہوئے تو اُنہوں نے یہ قصیدہ پہلے گزرانا۔

روکش ترے رخ سے ہو کیا نور سحر رنگ شفق	ہے ذرہ تیرا مہر تو نورِ سحر رنگ شفق

اس قصیدہ کی فصاحت اور پرواز تخیل و شوکت الفاظ و نزاکت خیال قابل داد ہے۔ اگرچہ
مرزا ابوظفر ہمیشہ انھیں دل سے عزیز رکھتے اور دلی رازوں کے لیئے مخزن اعتبار سمجھتے تھے
مگر ولیعہدی میں مرزا مغل بیگ مختار تھے، جب کبھی بڑی سے بڑی ترقی یا انعام کا موقعہ آیا
تو اُستاد ذوق کے لیئے یہ ہوا کہ چار روپیہ مہینے سے پانچ روپیہ ہو گئے پانچ سے سات روپیے

ہو گئے۔ جب ظفر بادشاہ ہوئے اور میرزا مغل بیگ وزیر، تو وزیر شاہی کا سارا کنبہ قلعہ میں بھر گیا مگر استادِ شاہی کا صرف تیس روپیہ مہینا مقرر رہا۔ فطرتی طور پر ذوق بہت متین و مہذب اور منکسر مزاج تھے اس لیئے انھوں نے حضور میں اپنی زبان سے ترقی کے لیئے کچھ نہ کہا۔ اور نامساعدتِ تقدیر سے اِس رتبۂ جلیلہ استادی پر مشرف ہونے کے باوصف کبھی خوشحالی یا امیرانہ زندگی بسر کرنے کے وسائل میسّر نہ ہوئے۔ اِنکی عادت تھی کہ فکرِ سخن میں ٹہلا کرتے تھے اور اسی حالت میں شعر بھی کہتے جاتے تھے، چنانچہ اُن دنوں میں جب کوئی عالی مضمون چستی اور درستی کے ساتھ موزوں ہوتا تو اُسکے سرور میں آسمان کی طرف دیکھتے اور کہتے پھرتے۔

اے کمال افسوس ہے	یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے تجھپر کمال افسوس ہے

چند روز کے بعد مرزا مغل بیگ کی ترکی تمام ہو گئی، نواب حامد علیخان مرحوم مختار ہوئے تب استادِ شاہی کا سو روپیہ مہینا مقرر ہوا۔ ہمیشہ عیدوں اور نوروزوں کے جشنوں میں قصیدے پڑھتے تھے اور خلعت سے اعزاز پاتے تھے۔ آخر ایام میں ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہوئے جب شفا پائی اور انھوں نے ایک قصیدۂ غرّا کہکر پیش کیا تو خلعت کے علاوہ خطاب خان بہادر اور ایک ہاتھی مع حوضۂ نقرئی انعام میں ملا۔ پھر ایک بڑے زور شور کا قصیدہ کہکر گزرانا جس کا مطلع ہے

شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خوابِ راحت	نشۂ علم میں سرمست غرور و نخوت

حضرت ذوق کا سانولا رنگ تھا متوسط اندام اور چہرہ چیچک کے داغوں سے پُر تھا آنکھیں تیز اور روشن تھیں اور آواز بلند اور خوش آیند جس سے مشاعرے میں رنگ تاثیر دوبالا ہو جاتا تھا۔ اپنی غزل کسیکو پڑھنے کے لیئے ہرگز نہ دیتے تھے۔ ابتدائے عمر میں شیخ مرحوم نے معمولی درسی تعلیم پاکر شعر گوئی کی طرف توجہ کردی تھی مگر پھر رفتہ رفتہ مشاعروں کی معرکہ آرائیوں اور حریفوں کے اعتراضوں نے اِنھیں تکمیلِ علوم اور سیرِ کتب کی طرف متوجہ کیا اور فطری شوق کی مدد سے قلیل عرصہ میں وہ ایک جیّد فاضل ہو گئے اور معلومات کا دائرہ وسیع کر لیا جس کا قدرتی سامان یہ ہوا کہ راجہ صاحب رام جو مختارِ املاک شاہِ اودھ تھے اُنکے بیٹے کے لیئے ایک فاضل کامل مولوی

عبدالرزاق نامی اُستاد مقرر ہوئے۔ اتفاقاً ایک دن یہ بھی مولوی صاحب کے ساتھ چلے گئے چونکہ ان کی تیزی طبع کا شہرہ ہوگیا تھا راجہ صاحب رام نے اِن سے کہا کہ میاں ابراہیم تم ہمیشہ درس میں شریک رہو، چنانچہ اس بہانہ سے اِنکی تحصیل علمی بھی تکمیل ہوگئی، مولوی محمد حسین صاحب آزاد کہتے ہیں کہ شیخ مرحوم فرماتے تھے کہ میں نے ساڑھے سات سو دیوان اساتذۂ سلف کے دیکھے اور اُنکا خلاصہ کیا، اُساتذہ کی تصنیفات ٹیک چند بہار کی تحقیقات اور اس قسم کی صدہا کتابیں گویا اُنکی زبان پر تھیں مگر مجھے اِس کا تعجب نہیں۔ اگر شعرائے عجم کے ہزاروں شعر اُنھیں ازبر تھے تو مجھے حیرت نہیں، گفتگو کے وقت جس تڑاقے سے وہ شعر سندیں دیتے تھے مجھے اِس کا بھی خیال نہیں کیونکہ جس فن کو وہ لیئے بیٹھے تھے یہ سب اُسکے لوازمات ہیں۔ ہاں تعجب یہ ہے کہ تاریخ کا ذکر آئے تو وہ ایک صاحب نظر مؤرخ تھے، تفسیر کا ذکر آئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا تفسیر کبیر دیکھ کر اُٹھے ہیں خصوصاً تصوف میں ایک عالم خاص تھا۔ رمل ونجوم کا ذکر آئے تو وہ نجومی تھے، خواب کی تعبیر میں اُنھیں خدا نے ایک ملکۂ راسخہ دیا تھا اور لطف یہ کہ احکام اکثر مطابق واقع ہوتے تھے، علم طب کو خوب تحصیل کیا۔ مگر کام نہ کیا۔ خوف آتا کہ ایسا نہ ہو بے پروائی سے کسی کا خون ہوجائے۔ کچھ دنوں تک موسیقی کا بھی شوق رہا مگر پھر اس سے دِل برداشتہ ہوگئے

مرزا جواں بخت کی شادی کے موقعہ پر اُستادِ شاہی نے وہ مشہور سہرا پیش کیا جس کا جواب مرزا غالب نے بہ تحریک نواب زینت محل بیگم تحریر کیا۔ سہرے کی ایجاد کا فخر اِس حساب سے حضرت ذوق کا حق ہے یہ دونوں سہرے اپنی نوعیت اور تازگی مضمون وخیال کے اعتبار سے اپنا جواب آپ ہیں۔ مثنوی جالسوز بھی تصنیف کی تھی۔ لوگوں کو تعجب ہوگا کہ اتنا بڑا شاعر جو رات دن اسی شغل میں رہتا ہو اور اُس کا دیوان اتنا مختصر اِسکے متعلق پروفیسر آزاد لکھتے ہیں کہ "اس کا بیان ایک مصیبت کا افسانہ ہے، خود شیخ مرحوم فرماتے تھے کہ بچپن میں جبکہ پندرہ سولہ برس کی عمر تھی ہم نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا اور اُسے بڑے شوق سے لکھا تھا۔ پھر زمانے نے فرصت نہ دی۔ جو غزل ہوتی جُدا کاغذ پر لکھی جاتی اِسی طرح طاق میں رکھدیتے کہ فرصت میں نظر ثانی کرینگے۔ جب طاق بھر گیا

مسودے تنکے کے غلاف میں بھرے اور گھر میں دیکھ کر یا کہ احتیاط سے رکھنا، کبھی مٹکے میں کبھی ٹھلیاں میں بھرے اور گھر میں بھجوا دیئے کہ ضائع نہ ہو۔ اس طرح بہت سے تھیلے اور مٹکے ٹھلیاں بھر دیئے تھے۔ وفات کے چند روز بعد میں نے اور خلیفہ اسمٰعیل مرحوم نے چاہا کہ کلام کو ترتیب دیں سب ذخیرہ نکالا محنت نے اُسکے انتخاب میں پسینہ کی جگہ لہو بہایا۔ کیونکہ بچپن سے لیکر دم واپسین تک کا کلام انہیں میں تھا، چنانچہ اول اُنکی غزلیں اور قصائد انتخاب کرلیئے، یہ کام کئی مہینہ میں ختم ہوا۔ پہلے غزلیں صاف کرنی شروع کیں۔ اس خطا کا مجھے اقرار ہے کہ کام کو میں نے شروع کیا مگر باطمینان کیا، مجھے کیا معلوم تھا کہ اس طرح یکایک زمانہ کا ورق اُلٹ جائیگا۔ عالم تہ و بالا ہو جائیگا۔ دفعۃً ۱۸۵۷ء کا غدر ہو گیا۔ کسی کا کسی کو ہوش نہ رہا۔ چنانچہ خلیفہ محمد اسمعیل اُنکے فرزند جسمانی کے ساتھ اُنکے فرزندانِ روحانی بھی دنیا سے رحلت کر گئے" مندرجہ بالا حال بہ تغیر مناسب تذکرہ آبِ حیات سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ جو کچھ کلام اس وقت چھپا ہوا ملک میں موجود ہے یہ اس ہیچ گو اُستاد کے تمام و کمال کلام کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ اسکی تدوین و ترتیب کی حقیقت یہ ہے کہ غدر کے بعد جب دلی دوبارہ آباد ہوئی اور کسیقدر اطمینان ہوا تو اُستادِ مرحوم کے تلامذہ رشید مولانا ظہیر حضرت انور، اور حافظ ویران نے جمع ہو کر مشورہ کیا کہ اگر اس وقت اُستادِ مرحوم کا کلام جمع نہ ہوا تو پھر کوئی نام لینے والا بھی نہ رہیگا۔ الغرض حافظ ویران جو شاگرد ہونے کے علاوہ ہر وقت کے رفیق اور ہمنشین تھے اُنھوں نے اپنے حافظہ سے کلام لکھوانا شروع کیا اور مولانا ظہیر اور انور نے اُسکی کتابت کی اور اِدھر اُدھر جہاں کہیں سے اشعار فراہم ہوسکے مہیا کر کے ۱۸۶۰ء میں دیوان جو آجکل رائج ہے چھپا کر شائع کر دیا۔ اُستاد ذوق کی محاورہ بندی مضمون آفرینی، کلام کی پختگی، صحتِ زبان، سلاستِ بیان، شہرت محتاج بیان نہیں، ہر ایک مذاقِ سخن کا لذت یاب اس مزے سے واقف ہے اُنکے کلام میں جو زبان کے چٹخارے تھے اُسکا اثر پڑھنے والوں کے دلوں میں موجود ہے۔ خاقانی ہند کے شاگردوں میں۔ شاہ ظفر حافظ ویران، مولوی محمد حسین آزاد، ظہیر، انور، مجروح اور سب سے زیادہ فصیح الملک مرزا داغ مرحوم اشہر

زمانہ ہوئے، ذوق اگرچہ نازک خیالی اور مضمون بندی میں غالب اور حکیم مومن خاں کے رتبہ کو نہیں پہنچے مگر انکی خداداد ذہانت اور ہمہ دانی نے اِس کمی کو جیسا کہ چاہیئے پورا کر دکھایا۔ اسی وجہ سے مشاعروں میں جب غزل ہم طرح پڑھتے تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ مذکورالصدر نامور شعرا سے پست رہے ہیں، ابتدا میں سودا کا رنگ اختیار کیا پھر شاہ نصیر اور جرأت کی طرز پر کہنے لگے حتّیٰ کہ کثرتِ مشق سے اپنا رنگ پیدا کر لیا جس میں محاورے کے نظم کرنے کا اسلوب صحتِ الفاظ وزبان چستیِ بندش، فصاحت شگفتگیِ مضمون اور حسن ادائے بیان بدرجہ اتم موجود ہیں انہیں خوبیوں کی بدولت یہ ہر طرح اپنے بلند پایہ ہمعصروں کی ٹکر تھے اور بعض وصفوں میں اُن سے افضل۔ ایک خاص وصف جس سے اِنکی اُستادی مسلّم ہوتی ہے یہ تھا کہ اکثر پامال مضامین اِس خوبی سے اور ایسے الفاظ میں باندھتے تھے کہ اپنی جدت طرازی سے نئے خیال کا لطف اُس میں پیدا کرتے تھے، روزمرہ نہایت بے تکلفی اور صفائی سے برتتے تھے سنگلاخ زمینوں میں اپنے اُستاد شاہ نصیر کی تحریک سے خوب خوب زور طبع دکھایا۔ قصیدے بھی بڑی شان اور آن وبان کے کہے اور اپنی مسلم الثبوت اُستادی کا سکہ تمام معاصرین کے دلوں پر بٹھا دیا سوائے میر ممنون کے اُنکے معاصرین یا متقدمین میں سے کسی نے اِس زور اور شان وشوکت کے قصائد نہیں کہے، نساخ۔ گارسن ڈی ٹیسی، شیفتہ، صہبائی۔ آزردہ، جیسے منصف مزاج باکمالوں نے انھیں فن شعر کا بادشاہ اور قادر الکلام اُستاد تسلیم کیا ہے۔ فن شعر سے ازلی مناسبت قسامِ ازل نے دی تھی اور رات دن سوائے فکر شعر کے کوئی دوسرا مشغلہ نہ تھا شاہ ظفر کی رضاجوئی عقیدت کے درجے پر پہنچی ہوئی تھی۔ جسقدر کمال کا درجہ بلند ہوا اُسی قدر پندار کو پست اور خاکساری کو بلند تر کیا۔ اور اسی میں خوش تھے، قناعت وسادگی مزاج کا یہ عالم تھا کہ اگرچہ متعدد مکانات اُنکی املاک میں تھے مگر خود یہ ایک تنگ وتاریک مکان میں عمر بھر رہا کیے جسکی انگنائی اسقدر مختصر تھی کہ بمشکل ایک چارپائی اُس میں بچھتی تھی دو طرفہ اتنی جگہ رہتی تھی کہ ایک آدمی بدقت چل سکے، کھری چارپائی پر رات دن بیٹھے رہتے تھے اور مطالعہ اور فکر

شعر میں اپنا وقت صرف کرتے تھے، گرمی، جاڑا، برسات تینوں موسم اس حالت میں بسر کر دیتے تھے، کسی میلے ٹھیلے، عید، تہوار سے انھیں سروکار نہ تھا۔ جہاں اول روز بیٹھے وہیں سے مر کر اُٹھے، اِنکے اکثر اشعار قبولِ عام کی سند پا کر آجکل خواص و عوام کی زبانوں پر جاری اور دلوں میں جاگزین ہیں۔ شبانہ روز شاگردوں کے کلام کی اصلاح اور دقائق و رموز سخن کی تعلیم کے لیئے وقف تھا، آخر عمر میں اکثر بیمار رہتے تھے، آخر ماہِ صفر ۱۲۷۱ھ میں مرضِ اسہال اور ضعف نے غلبہ کیا اور شب چہارشنبہ آخری کو عالم بقا کا رُخ کیا، دوسرے روز جنازہ بڑے تزک و احتشام سے اُٹھا۔ خواجہ باقی باللہ کے قرب میں دفن کیا۔ بادشاہ کی تاریخ لوحِ مزار پر کندہ ہے۔ بادشاہ نے غمِ اُستاد سے اُس روز جشن موقوف کیا۔ اور اگرچہ دابِ سلطانی کے خلاف تھا قطعۂ تاریخ زبانِ الہام ترجمان سے ارشاد کیا اور بار بار مرحوم کے حقوق جان نثاری کو یاد کر کے افسوس فرماتے رہے

شب چارشنبہ بماہِ صفر	بحکم خداوند جان داد ذوق
ظفر روئے اُردو بنا حن زغم	خراشید و فرمود اُستاد ذوق

تخمیناً چار سو تاریخیں اِنکے انتقال کی کہی گئیں جن میں نظم "واقعۂ لعب خیز" مصنفہ عبد الکریم سوز خلف الرشید حضرت صہبائی بہت مشہور ہوئی۔ اب دیوانِ مطبوعہ کا انتخاب ملاحظہ ہو *

پنبچہ جب مول وہ بانکا جواں لینے لگا	موت کے جی میں مزے یہ پنجاں لینے لگا
مجکو ہر شب ہجر کی ہونے لگی جوں روزِ حشر	مجھ سے یہ کس دن کے بدلے آسمان لینے لگا
تیر چٹکی میں لیا اُسنے سپئے جانِ عدو	شوق کیا کیا میرے دل میں چٹکیاں لینے لگا

ہاتھ تو ہلکا پڑا تھا یار کی شمشیر کا	زخم پر تہمت سے میری کارگر اچھا ہوا
ذوق کے مرنے کی سُن کر پہلے تو کچھ رُک گئے	پھر کہا تو یہ کہا منہ پھیر کر "اچھا ہوا"
پانی طبیب دے ہے ہمیں کیا بجھا ہوا	ہے دل ہی زندگی سے ہمارا بجھا ہوا
جیتا ہمیں صلا نظر اپنا نہیں آتا	گر آج بھی وہ رشکِ مسیحا نہیں آتا
نا کو تری بزم میں کس کا نہیں آتا	پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ
ہر فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

آنکھیں مری تلووں سے وہ ملجائے تو اچھا
ہے حسرتِ پابوس نکل جائے تو اچھا

کب لباسِ دنیوی میں چھپتے ہیں روشن ضمیر
جامۂ فانوس میں بھی شعلہ عریاں ہی رہا

آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور چیز
کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

سبکو دیکھا اس سے اور اسکو نہ دیکھا جوں نگاہ
وہ رہا آنکھوں میں اور آنکھوں سے پنہاں ہی رہا

بل بے گدازِ عشق کہ خوں ہوکے دل کے ساتھ
سینے سے تیرے تیر کا پیکان بہ گیا

تھا ذوق پہلے دہلی میں پنجاب کا سا حسن
پر اب وہ پانی کہتے ہیں ملتان بہ گیا

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچے کی دیواروں کا
کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہ گاروں کا

محتسب گرچہ دل آزار ہے میخواروں کا
دیجے اک جام تو ہے یار ابھی یاروں کا

اتنا تو شور و فغاں ہو کہ چمن میں بلبل
خرمنِ گل کی جگہ ڈھیر ہوا انگاروں کا

چرخ پر بیٹھ رہا جان بچا کر عیسیٰ
ہو سکا جب نہ مداوا ترے بیماروں کا

لختِ دل اور اشک تر، دونوں بہم، دونوں جدا
ہیں رواں دو ہمسفر، دونوں بہم دونوں جدا

وصل کی شب نکہت و گل کی طرح ہم اور وہ
رہتے ہیں باہم دگر، دونوں بہم، دونوں جدا

پیرِ مغاں کے پاس وہ دارو ہے جس سے ذوق
نامرد، مرد، مرد جواں مرد ہو گیا

کریں جدائی کا کس کی رنج ہم اے ذوق
کہ ہونے والے ہیں ہم سب سے عنقریب جدا

نہ بچھڑیں دامنِ الیاس گرداب بلا میں ہم
کہ بدتر ڈوب کے مرنے سے ہے جینا سہارے کا

کہتے ہیں ذوق آج جہاں سے گذر گیا
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپ ہی مر رہا ہو اسکو گر مارا تو کیا مارا

تفنگ و تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قاتل کے
الٰہی پھر جو دل پر تاک کر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدہ کے نکرنے سے
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

وہ کون ہے جو مجھ پہ تاسف نہیں کرتا
پر میرا جگر دیکھ کہ میں اف نہیں کرتا

ای ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے ہے وہ جو تکلف نہیں کرتا

کل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا
یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

تو ہماری زندگی پر زندگی کی کیا امید
تو ہماری جان لیکن کیا بھروسہ جان کا

چشم و نگہ کو تیری بدنام کیوں کریگا
مرگ و قضا کو تیرا عاشق نہ سے مریگا

عبث جاں منتظر ہونٹوں پہ ہے وہ شوخ کب آیا
اگر جہلم کو بھی آیا تو ہم جانیں گے اب آیا

لگائی زلف کو شانے نے جب انگلی پکارا دل
یہ گستاخی بھلا رہ تو سہی اے بے ادب آیا

ہے قفس سے شور اک گلشن تلک فریاد کا
خوب طوطی بولتا ہے ان دنوں صیاد کا

واہ کیا مرہم زخم دل بیتاب بنا
آب سے نشتر تیز کے تیزاب بنا

تو اگر آپ کو دیکھے تو مری آنکھ سے دیکھ
اپنا آئینہ مرا دیدۂ پُرآب بنا

محفل میں شور قلقل مینائے مل ہوا
لا ساقیا پیالہ کہ توبہ کا قُل ہوا

اچھا تو خفا آنا جانا تو رولا جانا
آنا ہے تو کیا آنا، جانا ہے تو کیا جانا

رکھے ہے خنجر قاتل سے یہ گلو میرا
لگی جو مجھ سے کرے تو پئے لہو میرا

یوں لائے واں سے ہم دل صد پارہ ڈھونڈ کر
دیکھا جہاں پڑا کوئی ٹکڑا اٹھا لیا

موت نے کر دیا ناچار وگرنہ انسان
ہے وہ خودبیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

مسجد میں اسنے مجکو آنکھیں دکھا کے مارا
کافر کی دیکھ شوخی گھر میں خدا کے مارا

ہزار دم ہیں اسے یاد تو نے دیکھا ذوق
گیا وہ غیر کے گھر مجکو ٹال کر کیسا

شکر پردے ہی میں اس بت کو خدا نے رکھا
آج ایمان گیا ہی تھا خدا نے رکھا

کر کے بسمل مجھے کس ناز سے کہتا ہے وہ شوخ
دیکھ تر کیجیو نہ خوں سے کہیں داماں میرا

رکھتے تھے جو کشور کسریٰ و قیصر زیر پا
ہے انہیں کا آج سر یا تاج افسر زیر پا

آتی ہے صدائے جرس ناقۂ لیلیٰ
پر حیف کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا

ہنگامہ گرم ہستیٔ ناپائدار کا
چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

نالہ اس زور سے کیوں میرا دہائی دیتا / اے فلک گر تجھے اونچا نہ سنائی دیتا

آئے تو کہاں جائے نہ تا جی سے کوئی جائے / جبتک نہیں آتا اُسے غصہ نہیں آتا

ہمنے اُن سے دوستی کی، وہ ہیں کرنے دشمنی / دیکھو کیا سوچا تھا ہمنے اور وہاں کیا ہو گیا

تری چشم فسوں گر نے کہاں سیکھا تھا یہ جادو / کیا ہے اک نگہ میں اے پری تسخیر دل میرا

اُنسے کچھ وصل کا ذکر اب نہیں ہونا اچھا / وہ جو کچھ کہویں تو تم بھی کہے جانا اچھا

تم نے دشمن ہی جو اپنا ہمیں جانا اچھا / یار ناداں سے تو ہے دشمن دانا اچھا

یہاں تو دم میں نہیں دم اور شے لئے تیغ وہ دم / کہتے ہیں دیکھو نہیں دم کا چرانا اچھا

آگ ہے دل میں، درد جگر میں، آنکھ میں آنسو لب پہ فغاں / عشق نے اُنکے ذوق ہمارا دیکھو یہ ہی حال کیا

ترے ہاتھوں کوئی آوارہ اے گردوں نہ ٹھیریگا / ولیکن تو بھی گر چاہے کہ میں ٹھیروں نہ ٹھیریگا

وہ دولت کر طلب جس سے کہ دل ہو جائے مستغنی / اگر ہاتھ آئیگا گنجینۂ قاروں نہ ٹھیرے گا

کعبہ کے دیوار و در سے نور کے جلوے اٹھیں / گر پڑے سایہ مرے میخانہ کی دیوار کا

دنیا گئی کہ عشق میں ایمان و دین گیا / وہ ہل گیا تو جانئے کچھ بھی نہیں گیا

آخر گِل اپنی خاکِ درِ میکدہ ہوئی / پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

مجنوں! اسیاہ خیمۂ لیلیٰ کے گرد پھر / اے خوش نصیب تجھکو طواف حرم نصیب

بیمارِ عشق کا جو نہ تجھ سے ہوا علاج / کہہ اے طبیب تو ہی کہ پھر تیرا کیا علاج

ریشِ سفیدِ شیخ میں ہے ظلمتِ فریب / اس مکر چاندنی میں نکر ناگمانِ صبح

تھی زلف تیری سنبل صحن چمن کی شاخ / قطروں سے پر عرق کے بنی یاسمن کی شاخ

بدخصلتوں کو کرتا ہے بالانشیں فلک / اونچی ہے آشیانۂ زاغ و زغن کی شاخ

ماتھے پہ ترے چمکے ہے جھومر کا پڑا چاند / تھا وعدہ چڑھے چاند کا لا بوسہ چڑھا چاند

مُہر وہ کرتا ہے نامہ پہ مجھے آتا ہے رشک / ہائے یوں چھوئے لعاب اُسکے دہن کا کاغذ

نکلا نہیں حرف دل نشیں تھا، دہن کی تنگی سے تنگ ہو کر

نکل کے رسنہ سے چشمِ فتاں کے دل میں بیٹھا خدنگ ہو کر
وہ چشم مخمور اک نظر سے، چبھوئے لاکھوں جو نیشتر سے
تو ہو رواں ہر رگِ جگر سے، لہو مئے لالہ رنگ ہو کر

نکل گئے تھے تم جسے بیمار ہجراں چھوڑ کر
چل بسا وہ آج سب ہستی کا ساماں چھوڑ کر

اہلِ جوہر کو وطن میں رہنے دیتا گر فلک
لعل کیوں اس رنگ سے آتا بدخشاں چھوڑ کر

دل تو لگتے ہی لگیگا حوریانِ عدن سے
باغِ ہستی سے چلا ہوں ہائے پریاں چھوڑ کر

ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن
کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

کہا پتنگ نے یہ وارِ شمع پر چڑھ کر
عجب مزا ہے جو مریئے کسی کے سر چڑھ کر

ذبح کرنے کو مرے تُو چھٹتے کیا ہو تکبیر
تم چھری پھیر بھی دو نام خدا کا لیکر

لے گیا دل کون میرا ذوق کس کا نام لوں
سامنے آجائے تو شاید بتا دوں دیکھ کر

بلبل ہوں صحنِ باغ سے دُور اور شکستہ پر
پروانہ ہوں چراغ سے دُور اور شکستہ پر

وہ کہے کون ہے قربان مری چتون پر
ہیں کہوں ہیں تو کہئے ہیں کے چھری گردن پر

ہوں سر ہو چکا نہ دوبارہ حلال کر
ہیں اور دم چرا ؤنگا یہ تو خیال کر

پوچھو ابھی چلے ہیں کو لٹنے کعبہ کو اہلِ درد
ملکِ فنا ہی جائیں ذرا دل سنبھال کر

تصویر اُنکی حضرتِ دل کھینچ لائے گر
رکھد ینگے ہم بھی پاؤں پہ آنکھیں نکال کر

قاتل ہے کس مزے سے نمک پاشِ زخمِ دل
بسمل ذرا تڑپ کے نمک تو حلال کر

مجھ میں کیا باقی ہے جو دیکھے ہے تو آن کے پاس
ہیو فا وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس

ہیں تو ایسی جھجک پہ فدا ہوں کہ کان کو
شب کیا ہٹا لیا مرے موئے دہن کے پاس

صفحۂ دہر پہ یک دل نہ ہُوا ایک سے ایک
دسکئے دو حرف ہیں وہ بھی ہیں جدا ایک سے ایک

ہم اُنکی چال سے پہچان لینگے اُنکو بر قعے میں
ہزار اپنے کو وہ ہمسے چھپائیں سر سے پاؤں تک

مراد ل ایک، دُوں اُس خوش ادا کی کس ادا کو میں
کریں وہاں تو ادائیں ہی ادائیں سر سے پاؤں تک

بنایا اسلئے اس خاک کے پتلے کو تھا انسان
کہ اسکو درد کا پتلا بنائیں سر سے پاؤں تک

سو ٹکڑے ہیں ایڑی کے بزنگِ گل صد برگ
کیا دشت نوردی ہیں کرتا ہے جنوں گل

ہے روشنیِ خانۂ دل ۔ سوزِ محبت
زاہد تو بتا شمع حرم کیونکہ کروں گل

بزنگِ غنچۂ پیکان و غنچۂ تصویر
نہ دیکھا اپنا شگفتہ کسی بہار ہیں دل

کٹ سکا صیدِ محبت کا نہ قاتل سے گلا
اُسنے پتھر سے یہ رگڑا کہ ہوا چاقو گرم

ہاں تأمل دمِ ناوک فگنی خوب نہیں
ابھی چھاتی مری تیروں سے چھنی خوب نہیں

یہ نہیں شیشۂ مے، ہی کسی میخوار کا دِل
محتسب دیکھ نکر دل شکنی، خوب نہیں

ساقی لڑائیوں سے تری چاہتا ہی دل
باہم لڑا کے شیشۂ و ساغر کو توڑ دوں

احسان ناخدا کے اُٹھائے مری بلا
کشتی خدا پہ چھوڑ کے لنگر کو توڑ دوں

پھر اُس مژہ کی یاد کرے ہی تو دلمیں ذوق
نشتر چبھو کے ہیں سرِ نشتر کو توڑ دوں

گو اضطرابِ دِل کو بیاں کرتے ہم نہیں
پر جو نگاہ ہے رگِ بسمل سے کم نہیں

دیتا ہی دورِ چرخ کسے فرصتِ نشاط
ہو جسکے پاس جام وہ اب جم سے کم نہیں

مشکل ہے میرے عہدِ محبت کا ٹوٹنا
اے بیوفا یہ تیری خدا کی قسم نہیں

رُکاؤ خوب نہیں طبع کی روانی ہیں
کہ بُو فساد کی آتی ہے بند پانی ہیں

کہانیاں ہیں حکایاتِ خضر و آبِ بقا
بقا کا ذکر ہے کیا اِس جہانِ فانی ہیں

وفورِ اشک اگر سر با وج ہو اپنا
فلک بزنگِ گلِ نیلوفر ہو پانی ہیں

لگاتے تہمتِ گریہ ہیں دِل جلوں کو ترے
یہ ہیں وہی جو لگاتے ہیں آگ پانی ہیں

مزا ہے تیغِ محبت کے زخم کھانے کا
کرے جو صرفہ نہ قاتل نمک فشانی ہیں

ہفتاد و دو طریق حسد کے عدو ہیں
اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں

وہ ایک دم کہ جس ہیں میسّر ہو وصلِ یار
بہتر سمجھتے ہم اُسے عمر ابد سے ہیں

خورشید وار دیکھتے ہیں سبکو ایک آنکھ
روشن ضمیر ملتے ہر اک نیک و بد سے ہیں

وہ مست ہوں کہ رکھتے قدح کش تمناً
بنیادِ میکدہ مری خشتِ لحد سے ہیں

ہو جاتا دلِ ہجر بیٹھ کے خود گلزارِ خوں ہیں گُل
تاثیر باغِ خلد ہے تاثیر باغِ حُسن

گئی یاروں سے وہ اگلی ملاقات کی سب رسمیں
پڑا جس دن سے دل بس میں ترے اور ہوگئے ہم بس

مجھے ہو کس طرح قول و قسم کا اعتبار اُنکے
ہزاروں دیچکے وہ قول لاکھوں کھاچکے قسمیں

مستی و نا آشنائی وحشت و دیوانگی
یا تری آنکھوں میں دیکھی یا ترے دیوانے میں

اِس گلستانِ جہاں میں کیا گُلِ عشرت نہیں
سیر کے قابل ہے یہ پر سیر کی فرصت نہیں

کھاکے زخمِ تیغِ قاتل جو بجا لائے نہ شکر
کوئی بھی اُس سے زیادہ کافرِ نعمت نہیں

وقتِ پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

پھر مجھے لے چلا اُدھر دیکھو
دلِ خانہ خراب کی باتیں

واعظا! چھوڑ ذکرِ جنت و حور
کر شراب و کباب کی باتیں

سُنتے ہیں اُن کو چھیڑ چھیڑ کے ہم
کس مزے سے عتاب کی باتیں

ہم اپنے جذبۂ دِل کے اثر کو دیکھتے ہیں
وہ پہلے بزم میں دیکھیں کدھر دیکھتے ہیں

مے مِلا کر ساقیانِ سامری فن آب میں
کرتے ہیں جادو سے اپنے آگ روشن آب میں

دیکھنا آبی ڈوپٹہ مُنہ پر اُسکے وقتِ خواب
بُرجِ آبی میں ہے مہ۔ یا مہرِ روشن آب میں

کہتے تھے آنے کو خاطر سے ہماری پرسوں
ہُوئی برسوں نہ ہوئی پر وہ تمھاری پرسوں

جیتے ہی جی کیا ملکِ فنا میں ساتھ بشر کے جھگڑے ہیں
مر کے اِدھر سے جبکہ چُھٹے تو جاکے اُدھر کے جھگڑے ہیں

کیسا مؤمن، کیسا کافر، کون ہے صوفی۔ کیسا رند؟
سارے بشر ہیں بندے حق کے سارے یہ شر کے جھگڑے ہیں

ایک ایک جور و ستم پر اُنکے سو سو داغِ دل ہیں گواہ
ہم جو اُس سے جھگڑے ہیں، حق ثابت کر کے جھگڑے ہیں

غم کہتا ہے دشمن ہوں میں جلوۂ جاناں کہتا ہے میں

کسکو ٹکالوں کسکو رکھوں یہ تو گھر کے جھگڑے ہیں

بحر ہیں موتی پانی پانی، لعل کا دِل خوں پتھر ہیں

دیکھو لب و دنداں سے تمہارے لعل و گہر کے جھگڑے ہیں

حضرتِ دل کا دیکھنا عالم ہاتھ اُٹھائے دُنیا سے

پاؤں پسارے بیٹھے ہیں اور سر پہ سفر کے جھگڑے ہیں

ذوق مرتب کیونکہ ہو دیواں، شکوۂ فرصت کس سے کریں

باندھے گلے ہیں ہم نے اپنے، آپ ظفر کے جھگڑے ہیں

چشمِ گریاں نے اگر کی اس برس برسات خوب
سبز ہو جائیں گی سب میری قفس کی تیلیاں

جس جگہ بیٹھے ہیں، با دیدۂ نم اُٹھے ہیں
آج کس شخص کا مُنہ دیکھ کے ہم اُٹھے ہیں

سینہ و دل پہ مرے زخمِ جگر ہنستے ہیں
ہنسنے دو چارہ گرو ہنستے ہی گھر بستے ہیں

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن مضطر اب ہیں
وہاں ایک خامشی تری سب کے جواب ہیں

جو ہے سو پہلے میرے اُٹھانیکی فکر ہیں
محفل ہیں اُسکی ہیں کوئی چوسر کا رنگ ہیں

نہیں تدبیر کچھ بنتی پڑے سر کو پٹکتے ہیں
نہ دِل چھوڑے ہے اُسکو اور نہ ہم دل چھوڑ سکتے ہیں

مر گئے پر بھی تغافل ہی رہا آنے ہیں
بیوفا پوچھے ہے کیا دیر ہے لیجانے ہیں

ہیں دہنِ غنچوں کے وا کیا جانے کیا کہنے کو ہیں
شاید اُس کو دیکھکر صلِّ علیٰ کہنے کو ہیں

قطعہ

ہائے کل سب آشنا تیرے مریضِ عشق کے
تھے علاجِ ضعفِ دل و ضعفِ تن کی فکر ہیں

آج گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں با چشمِ پُر آب
گاہ تدبیرِ لحد ہیں گہ کفن کی فکر ہیں

زاہدِ گمراہ کے ہیں کس طرح ہمراہ ہوں
وہ کہے "اللہ ہو" اور میں کہوں "اللہ ہوں"

کبھی کرتا ہوں فغاں اور کبھی ضبطِ فغاں
نہیں معلوم وہ خوش اِس ہیں ہے یا ہے اُس ہیں

خضر ساقی ہو تو میں جام نہ لوں گر جانوں
کہ نہیں جام ہیں مے آبِ بقا ہے اس ہیں

اُس جفا کیش کے نامے کو پڑھوں کیا قاصد
جو کہ قسمت ہیں لکھا تھا وہ لکھا ہے اس ہیں

جا پڑا پانوں پہ قاتل کی تڑپ کر کُشتہ
سرد ہونے پہ بھی گرمی وفا ہے اس میں

دین کیا ہے بلکہ دیجئے ایمان بھی ہمیں
زاہد یہ بت خدا کی قسم ایسے شخص ہیں

خانقاہ میں بھی وہی ہے جو خرابات میں ہے
فرق پر یہ ہے یہاں منہ پہ ہے اور واں دل میں

ایک پتھر پُوجنے کو شیخ جی کعبے گئے
ذوق ہر بت قابلِ بوسہ ہے یاں بتخانے میں

یہ طوق اس واسطے چھوٹا ہوا قمری کی گردن میں
کہ تھا بلبل کی قسمت کا پڑا قمری کی گردن میں

باعثِ رشک ہوا عشق ہمارا ہم کو
بجھے ہے دیکھے ہے غش جسنے کہ دیکھا ہمکو

دانۂ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہمکو
آئے ہے جزو میں نظر کل کا تماشا ہمکو

کس بلندی پہ دیا عشق نے پہنچا ہمکو
کہ فلک آیا نظر خال سے چھوٹا ہمکو

ہم تبرک ہوئے اب کرے زیارت مجنوں
سر پہ پھرتا ہے لیئے آبلۂ پا ہمکو

کرتے جوں کو نہیں ہم تو سخن میں سبقت
پر وہ کچھ ہم سے سُنے گا جو کہے گا ہمکو

کھانے پینے کی قسم کھائی ہے تجھ بن ہمنے
ورنہ تھا زہر تو ہر طرح گوارا ہمکو

اِس پہ مرتے ہیں کہ کیوں غیر کو تونے مارا
وہ نصیب اُسکو ہوئی جو تھی تمنا ہمکو

اِک حلاوت ہے عداوت میں بھی اُس ظالم کی
کہ اگر زہر بھی دیتا ہے تو میٹھا ہمکو

سنگدل تین دن اب گور میں بھی بھاری ہیں
ہے سوم میں جو ترے آنیکا دھوکا ہمکو

دیکھا آخر کہ نہ پھوڑے کی طرح پھوٹ بہے
ہم بھرے بیٹھے تھے کیوں آپنے چھیڑا ہمکو

اور ہمدم تو کہاں ہو نہ ہوا حسرت دل
درد اب ہم کو تمھارا ہی تھا را ہمکو

موت ہی سے کچھ علاجِ دردِ فرقت ہو تو ہو
غسلِ میت ہی ہمارا غسلِ صحت ہو تو ہو

آتشِ فرقت میں پروانہ سا کیڑا اجل مرے
آدمی سے کیا ہو لیکن محبت ہو تو ہو

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجکو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

جس ہاتھ میں خاتم لعل کی ہے اُسی ہاتھ میں زلف سرکش ہو
پھر زلف رہے وہ دستِ موسیٰ جس میں اخگر آتش ہو

اک خون کا دریا جذب کیا ہے خاکِ کوئے قاتل نے
ہاں دفن کرو ایسے کشتوں کے ایسی ہی زمین دلکش ہو

بجا کہے جسے عالم اُسے بجا سمجھو
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

نفس کی آمد و شد ہے نمازِ اہلِ حیات
جو یہ قضا ہو تو اے غافلو قضا سمجھو

رہائی قتل پر موقوف ہو گر ہم اسیروں کی
روانی تیغ کی پابستۂ زنجیر جوہر ہو

ترے بیمار کو گر اپنے جینے کی تمنا ہو
فلک پر سُنکے ہنستے ہنستے شادی مرگ عیسیٰ ہو

دیکھا دمِ نزع دلآرام کو
عید ہوئی ہو ذوق وصلے شام کو

عبث تم اپنا رکاوٹ سے مُنہ بناتے ہو
وہ آئی لب پہ ہنسی دیکھو مُسکراتے ہو

ہوش و خرد گئے نگہِ سحر فن کے ساتھ
اب جو ہے بات اپنی سو دیوانہ پن کیساتھ

افسردہ دل کے واسطے کیا چاندنی کا لُطف
لپٹا پڑا ہے مردہ سا گویا کفن کے ساتھ

تو جان ہے جہاں کی اور جان ہے تو سب کچھ
ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ

چھوڑا نہ دل میں صبر، نہ آرام، نہ شکیب
تیرِ نگہ نے صاف کیا گھر کے گھر پہ ہاتھ

ترے کوچے کو وہ بیمارِ غم دار الشفا سمجھے
اجل کو جو طبیب اور مرگ کو اپنی دوا سمجھے

مجھے آتا ہے رشک اُس رندِ مے آشام پر ساقی
نہ جو دع ما کدر جانے نہ جو خُذ ما صفا سمجھے

حساب اصلا نہ پوچھے مجھ سے میرے دل کے زخموں کا
حسابِ دوستاں در دل اگر وہ دلربا سمجھے

ساقیا ہوں نہ صبوحی کے جو عادت والے
شورِ محشر سے بھی چونکیں نہ ترے متوالے

کس مرض کی ہیں دوا یہ لبِ جاں بخش ترے
جاں بلب ہیں ترے آزارِ محبت والے

نہیں جز شمع مجاور مرے بالینِ مزار
نہیں جز کثرتِ پروانہ زیارت والے

حرص کے پھیلتے ہیں پاؤں بقدرِ وسعت
تنگ ہی رہتے ہیں دنیا میں فراغت والے

ہم نے اُس بت کو جو دیکھا ہے نہیں کہہ سکتے
کہ مبادا کہیں سُن پائیں شریعت والے

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے
اُنکا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے

ہائے رے حسرتِ دیدار میری ہائے کو
لکھتے ہیں ہائے دوچشمی سے کتابت والے

ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوق
اسنے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

خوب روکا شکایتوں سے مجھے	تو نے مارا عنایتوں سے مجھے
واجب القتل اُس نے ٹھہرایا	آیتوں سے روایتوں سے مجھے

کل جہاں سے کہ اُٹھا لائے تھے احباب مجھے	لے چلا آج وہیں پھر دلِ بیتاب مجھے
میں نہ تڑپا جو دمِ ذبح تو یہ باعث تھا	کہ رہا مدِ نظر عشق کا آداب مجھے
ورنہ وہ شوخ کہ جو گل سے بھی نازک ہو سوا	لیوے اِس طرح سے زانو کے تلے داب مجھے
قسمت اُس بت سے جا لڑی اپنی	دیکھو احمق خدا سے لڑتی ہے
دیکھو اُس چشمِ مست کی خوبی	جب کسی پارسا سے لڑتی ہے

کوئی ہے کافر کوئی مسلمان جدا ہر اک کی ہے راہ ایماں	جو اسکے نزدیک رہبری ہے وہ اسکے نزدیک رہزنی ہے
زمیں پہ نورِ قمر کی گرمی میں صاف اظہار روشنی ہے	کہ جو ہیں روشن ضمیر اُنکو فروغ اُنکی فروتنی سے
غمِ جدائی میں تیری ظالم کہوں میں کیا مجھپہ کیا بنی ہے	جگر گدازی ہے سینہ کاوی ہے دلخراشی ہے جانکنی ہے

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے	مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے
یقیں ہے صبحِ قیامت کو بھی صبوحی کش	اُٹھیں گے خواب سے ساقی سبو سبو کرتے

مزے یہ دل کے لیئے تھے نہ تھے زباں کے لیئے	سو ہمنے دل میں مزے سوزشِ نہاں کے لیئے
بیانِ دردِ محبت جو ہو تو کیونکر ہو	زباں نہ دل کے لیئے ہے نہ دل زباں کے لیئے
چلے ہیں دیر کو مدت میں خانقاہ سے ہم	شکستِ توبہ لیئے ارمغاں مغاں کے لیئے
دعا بلا تھی شبِ غم سکونِ جاں کے لیئے	سخن بہانہ ہوا مرگِ ناگہاں کے لیئے
وہ مول لیتے ہیں جبارم کوئی نئی تلوار	مجھی پہ پہلے لگاتے ہیں امتحاں کے لیئے
مثالِ نے ہے مرا جب تلک کہ دم میں دم	فغاں ہے میرے لیئے اور میں فغاں کے لیئے
جو پاس مہر و محبت کہیں یہیں بکتا	تو ہم بھی لیتے کسی اپنے مہرباں کے لیئے
بنایا آدمی کو ذوق ایک جزوِ ضعیف	اور اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کے لیئے

جو دل قمار خانہ میں بت سے لگا چکے	وہ کعبتین چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے

کیا لیچلے گلی سے تری ہم کہ جوں نسیم
آئے تھے سر پہ خاک اُڑانے اُڑا چلے

لیجائیں تیرے کشتہ کو جنت میں بھی اگر
پھر پھر کے تیرے گھر کی طرف دیکھتا چلے

لیتے ہی دل جو عاشقِ دلسوز کا چلے
تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی
چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

کب حق پرست زاہد جنت پرست ہے
حوروں پہ مر رہا ہے یہ شہوت پرست ہے

یہ ذوق مے پرست ہی یا ہے صنم پرست
کچھ ہے بلا سے لیک محبت پرست ہے

الفت کا نشہ جب کوئی مرجائے تو جائے
یہ دردِ سرا ایسا ہے کہ سر جائے تو جائے

تیغ تو اوچھی پڑی تھی گر پڑے ہم جانکر
دل کو قاتل کے بڑھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

زخمی میں ہوا ہوں تری دزدیدہ نظر سے
جانیکا نہیں چور مرے زخمِ جگر سے

اے ذوق کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

گاہ ہجومِ یاس میں ہے دل گاہ ہجومِ حسرت میں
ہے یہ مردِ سپاہی ہمیشہ پھرتا لشکر لشکر ہے

ہاتھ اُٹھاؤ عشق کے بیمار سے
کوئی بچتا بھی ہے اِس آزار سے

صاف اک ابرِ شفق آلودہ ہے
زلف اُسکی سُرخیِ رخسار سے

لبریز صد نشاط برنگِ ہلالِ عید
سینہ میں میرے ناخنِ غم کی خراش ہے

تمکو کچھ یاد بھی ہیں پہلے وہ الفت کے مزے
بے مزہ ہونیکے لطف اور شکایت کے مزے

دیکھ کر اُسکو گیا عالمِ حیرت میں جو میں
لیک میں کیا کہوں اُس عالمِ حیرت کے مزے

بے محبت نہیں ای ذوق شکایت کے مزے
بے شکایت نہیں ای ذوق محبت کے مزے

بل بے استغنا کہ وہ یاں آتے آتے رہ گئے
اُف رے بیتابی کہ یاں تو دم ہی نکلا جائے ہے

کیوں غنچہ پریشاں نہ ہو ہوتے ہی شگفتہ
اِس باغ میں ہونا ہی دلِ شاد غضب ہے

وہ کونسا غم ہے کہ جو دنیا میں نہیں ہے
اور اس پہ بھی دلکش یہ غمِ آباد غضب ہے

دروازہ میکدہ کا نہ کر بند محتسب
ظالم خدا سے ڈر کہ درِ توبہ باز ہے

اڑ گئے خوب گلچھرّے نکل مجنوں نے زنداں سے
شرارے متصل نکلے یہاں تک سنگِ طفلاں سے

کہ ہر سو گلفشانی ہے شرارِ سنگِ طفلاں سے
کہ چمکے ہے سرِ مجنوں پہ بجلی سنگِ باراں سے

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گذار یا اِسے رو کر گذار دے

اِس جبر پر تو ذوق بشر کا یہ حال ہے
کیا جانے نے کیا کرے جو خدا اختیار دے

پئیں مے آشکارا کسکی ہمکو ساقیا چوری
خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

بد نہ بولے زیرِ گردوں گر کوئی میری سُنے
ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سُنے

وشا ہو کالی نے جبکی دلکو تو وہ منوں کے اثر سے کھیلی
دہاں کا کُل کا تیری مارا نہ منہ سے بولی نہ سر سے کھیلی

دردِ دل سے لوٹتا ہوں کسکو میرا درد ہے
ہوں ہیں لفظِ درد جس پہلو سے اُلٹو درد ہے

کھلتا نہیں دل بند ہی رہتا ہے ہمیشہ
کیا جانے کہ آجائے ہے تو اسمیں کدھر سے

یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنیکی خبر دیتی ہے

یوں نگہ نکلی ہے چشمِ یار سے
مست جیسے خانۂ خمّار سے

تم دو گھڑی کو آؤ تو ہیں لب پہ جان کو
ٹھیرا رکھوں کہ ابھی یاں دو گھڑی ہی

اپنو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائینگے
مرکے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

ہم نہیں وہ جو کریں خون کا دعویٰ تجھپر
بلکہ پوچھے گا خدا بھی تو مکر جائیں گے

لائی حیات آئے قضا لیچلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

غنچے تری غنچہ دہنی کو نہیں پاتے
ہنستے ہیں مگر تیری ہنسی کو نہیں پاتے

ہم متاعِ دوا اپنا کسیکو نہیں پاتے
تم پاتے ہو ہمکو تو چھری کو نہیں پاتے

جا کے اکبار نہ پھرنا تھا جہاں سے ہمکو
بیقراری ہے کہ سو بار لیئے پھرتی ہے

دم کو ہمارے سینے میں اک دم نہیں قرار
یہ وہ غریب ہے کہ مسافر وطن میں ہے

ہمارے سینہ میں وہ آہِ آتشیں ہے ذوق
جو برق دیکھے تو فی النار والسقر ہو جائے

راتوں کو نہ ہو حق کرا ے شیخ مناجاتی
سوتے ہوئے چونکیں گے رندانِ خراباتی

بیقراری کا سبب ہر کام کی اُمید ہے
نااُمیدی ہو تو پھر آرام کی اُمید ہے

شبِ ہجراں بسر نہیں ہوتی
نہیں ہوتی سحر نہیں ہوتی

ہوس میں کعبہ کی کیوں شیخ بتخانے سے گم رہے
یہاں تو کوئی صورت بھی ہے وہاں اللہ ہی اللہ ہے

مری طاعت سے اب تو معصیت بھی عار کرتی ہے
مری توبہ پہ توبہ توبہ استغفار کرتی ہے

باقی ہے شیخ کو ابھی حسرت گناہ کی
کالا کرے گا منہ بھی جو ڈاڑھی سیاہ کی

مرچیں سی لگ رہی ہیں زخمِ جگر کو میرے
مصروفِ چارہ دیکھا کیا چارہ گر کو میرے

نہ پوچھو کہ دل شاد ہے یا حزیں ہے
نہیں یہ بھی معلوم ہے یا نہیں ہے

گل تو کھل کھلکر بہار اپنی صبا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

لاشے کو پھینک دیجے میرے کہ دفن کیجے
مردہ بدستِ زندہ جو چاہیے سو کیجے

اے ذوق بس نہ آپ کو صوفی جتائیے ق
معلوم ہے حقیقتِ ہو حق جناب کی

نکلے ہو میکدے سے ابھی منہ چھپا کے تم
داب ہوئے بغل میں صراحی شراب کی

تو بھلا ہے تو برا ہو نہیں سکتا اے ذوق ق
ہے برا وہی کہ جو تجھکو برا جانتا ہے

اور اگر تو ہی برا ہے تو وہ سچ کہتا ہے
کیوں برا کہنے سے تو اسکے برا مانتا ہے

ساقیا عید ہے لا بادہ سے مینا بھر کے
کہ مے آشام پیاسے ہیں مہینا بھر کے

ذوقا

ذوقا۔ ذوقا شاہ بنارسی مجذوب تھے غدر سے پیشتر شرف الدین احمد کے پاس میرٹھ میں رہا کرتے تھے عرصہ ہوا انتقال کر گئے۔

نے بام کی ہیں زیب نہ زینت کسی در کے
ہم باٹ کے روڑے ہیں اِدھر کے نہ اُدھر کے

قدر تم نے صاحب نجانی ہماری
گئی رائگاں جانفشانی ہماری

ذوقی

ذوقی۔ شاہ ذوقی درویش خانہ بدوش شعر دردمندانہ کہتے اور صاحبِ تصوف و اخلاق برگزیدہ تھے اٹھارھویں صدی کے وسط میں حیات تھے، یہ چند شعر انکے ہیں۔

اُس کا شکوہ نہ گاہ کیجئے گا
جس طرح ہو نباہ کیجئے گا

اپنی یہ چاہ اسکی وہ صورت	اے عزیزاں نگاہ کیجئے گا
اسکے دیوانہ بن کے عالم کو	دیکھ کر واہ واہ کیجئے گا
اپنے ذوقی کے گھر میں مشفق من	گہ کرم گاہ گاہ کیجئے گا

ہے ہاتھ کماں اسکے اب تیر ہے اور میں ہوں	تدبیر ہے لاحاصل تقدیر ہے اور میں ہوں
ہر شب وہ کماں ابرو کہتا ہے سر مجلس	کل صبح کو میداں میں نخچیر ہے اور میں ہوں
رکھ ہاتھ وہ قبضہ پر برہم ہو لگا کہنے	اب تو ہے ترا سر ہے شمشیر ہے اور میں ہوں
یوں ریختہ کہنے کو عالم میں ہزاروں ہیں	بدنام پر اے ذوقی اک میر ہے اور میں ہوں

جلد آ اجل جو تجھکو آنا ہے	ورنہ کوئی دم میں دم روانہ ہے
تمکو ڈھونڈے کہاں کوئی ذوقی	نہ ترا ٹھور نے ٹھکانا ہے

ترے کوچے میں ہم بھی آج لے تلوار بیٹھیں گے	رقیب روسیہ کو بیدھڑک ہی مار بیٹھیں گے
جو غیروں کو تم اپنے منہ لگاؤ گے تو بولیں گے	نہیں تو مثل نے خاموش ہو لاچار بیٹھیں گے
یہ ذوقی بھی ترے غمزہ سے ڈرتا نہیں ہرگز	اٹھاؤ گے جو در سے جا پس دیوار بیٹھیں گے

عشق میں نہ سیم نہ زر چاہیئے	آہ میں کچھ اپنی اثر چاہیئے
ذوقی آوارہ ترے قتل کو	خاص کوئی تیغ و تبر چاہیئے

ذوقی۔ سید عبدالواحد خلف سید اشرف درگاہی بلگرامی، ولادت انکی ۲۹ ربیع الاول ۱۱۷۰ھ بمقام بلگرام واقع ہوئی۔ مولوی سید محمد مؤلف تذکرہ تبصرۃ الناظرین خلف الصدق علامۂ سعیدیل میر عبدالجلیل بلگرامی لکھتے ہیں کہ سید ذوقی خوش طبع اور شیریں زبان تھے طبعیت برجستہ رکھتے تھے۔ فارسی شعر خوب کہتے تھے اور تخلص اپنا واحد کرتے تھے آپنے ادایک دیوان ابو اسحاق اطعمہ ولایتی کے مذاق میں لکھا ہے (ابو اسحاق ایک ولایتی شاعر ہے جس نے اپنے اشعار میں کھانوں کا بہت تذکرہ کیا ہے، یہ انھیں کا شعر مشہور ہے ؎

پس از سی سال بر اسحاق شد تحقیق این معنی	کہ بورانی است بادنجان و بادنجان بورانی

سید ذوقی نے بھی شیرینی کے ذکر سے اپنے کلام میں حلاوت پیدا کی اور دیوان کا نام شکرستانِ خیال رکھا، وہ دیوان چھپ بھی گیا ہے دو چار شعر اُس میں سے ضیافتِ ناظرین کے لیئے لکھے جاتے ہیں ؂

بہیں بسوئے چپاتی بدیدۂ انصاف	کہ بے وصالِ شکر حالتِ نزاراں چیست
غرض ز موسمِ برسات اولہ بندی ہست	وگرنہ ایں ہمہ تمہیدِ ابر و باراں چیست

در کارِ خیر حاجتِ ہیچ استخارہ نیست	اہمال در تناولِ فرنی چرا کنید
مزعفر بیا بدم برخوانِ نعمت	مُربّا گر بود نورٌ علےٰ نور

غرض اس طرز میں کہتے کہتے اُردو کی طرف بھی عنان توجہ مبذول کی، اِن دنوں ریختہ غزل سرائی کی ابتدا تھی، خانِ آرزو، آبرو وغیرہ کا زمانہ تھا۔ جناب ذوقی خود صاحبِ منصب تھے، اور قصبۂ راہون ضلع لدھیانہ میں حاکم تھے، اُنھیں ایام میں زمینداروں سے کسی معاملہ میں تکرار ہوگئی اور ۱۱۳۴ھ میں مارے گئے، یہ اُن کا اُردو کلام ہے۔

عشق کا دل پر ستم اچھا ہوا	مر گیا بیمارِ غم اچھا ہوا
بہ نہوگا یہ دو لے سے ای طبیب	جب کیا اُسنے کرم اچھا ہوا
زور ہی آباد تھا دل کا نگر	کر گیا تاراج غم اچھا ہوا

ذہین۔ حافظ محمد اسمٰعیل خان ذہین دہلوی نبیرۂ حافظ محمد داؤد خاں مرحوم داروغۂ نذر و نیاز حضرت بہادر شاہ ثانی (جن کا ذکر داؤد تخلص کے تحت میں آچکا ہے) شاگرد حافظ غلام دستگیر مبین، بڑے وجیہ اور شکیل جوان تھے مگر صحبتِ بد نے ایسا خراب کیا کہ چند ہی روز میں اپنے دادا کی ہزار ہا روپیہ کی املاک برباد کر کے تباہ و خستہ ہوگئے، بیگم صاحبہ بھوپال کی سرکار سے کچھ وظیفہ ملتا ہے اُس سے بسر اوقات کرتے ہیں۔ بازار چاوڑی میں جو وسیع دیوانخانہ اب نواب دوجانہ کی ملکیت ہے اُنکے دادا کا تعمیر کردہ ہے۔

نام اُس صنم کا دل سے بھلایا نجائیگا	ہے نقش کا لحجر یہ مٹایا نہ جائے گا

شعلہ ہوں برق کا جو مجھے چھیڑتے وہ جلے
عشاق صدمہ ہائے قیامت اٹھائینگے

ہستی کا نقش مہری مٹایا نجائے گا
جب تک فلک زمیں پہ گرایا نجائے گا

ذہین

ذہین۔ حافظ مولوی حکیم نور الحسن صاحب کیرت پور نہٹور ضلع بجنور کے سادات رضوی سے آپکے والد ماجد مولانا محمد ظہور الحسن صاحب مشہور اور بے مثال فضلا میں تھے، آپ پیدایش کے پانچویں سال نابینا ہو گئے تھے پھر بھی قرآن مجید حفظ کر لیا۔ کتب درسیہ کی تکمیل کے بعد علم طب حکیم مولوی رحیم اللہ صاحب بجنوری سے حاصل کیا۔ عربی۔ فارسی، اردو، تینوں زبانوں میں نظم ونثر تحریر فرماتے ہیں، کلام بطور نمونہ ہدیۂ ناظرین ہے اُن کا بیان ہے کہ کئی برس اخبار کے اڈیٹر بھی رہے ہیں۔

فتنے پس پس گئے دب دب گئے محشر کیا کیا
آبلے پھوٹ کے روئے مری تنہائی پر
بعد مُردن وہ عیادت کے لیئے آتے ہیں
ترے فراق میں دریا بھی قتل کرنا ہے

فتنۂ قامت جو مرے گھر سے خراماں نکلا
کفِ پا سے جو کوئی خارِ مغیلاں نکلا
جان نکلی ہوئی آئی میرا ارماں نکلا
دکھائی موجِ صبا نے حباب میں تلوار

فتنہ زا ہے تری دزدیدہ نگاہی کیسی
مجھ سیہ بخت کا جب نام لکھا دفتر میں
حسرت ویاس والم ساتھ چلے قبر میں بھی
کیا اسی رات سے ہی صبح قیامت کی نمود
سیرِ نازِ لن ترانی آج موسیٰ دیکھیئے
میرا رونا دیکھئے اور اُنکا ہنسنا دیکھئے
جاتی دم بدم لیتے ہیں وہ آنکھوں کو مل کے
دل وجان ودین وایماں اک ادا میں چھین لیتا ہے

لاتی ہے مملکتِ دل پہ تباہی کیسی
پھیلی تقدیر کے دفتر میں سیاہی کیسی
دیکھنا میرے رفیقوں نے نباہی کیسی
شبِ فرقت میں ہے اللہ سیاہی کیسی
طور پر جو کل نہ دیکھا تھا وہ جلوہ دیکھئے
مینہ برسنا دیکھئے بجلی کا گرنا دیکھئے
اشارہ ہی مری جانب کہ آؤ سو رہیں چل کے
کوئی دیکھے کرشمے اس بتِ کافر کی چھل بل کے

ذہین

ذہین۔ نواب مرزا کاظم علیخاں صاحب بیرسٹرایٹ لا۔ آپ انگریزی، عربی، ناگری وغیرہ

ہیں کامل دخل رکھتے ہیں۔ ۱۲۶۴ھ ـ ۷۴ برس کی عمر ہے، نواب مرزا باقر علیخاں صاحب بہادر دام اقبالہم نواب صاحب نسبش محل کے مجھلے صاحبزادے ہیں۔ آپنے ایک مثنوی بھی تصنیف فرمائی ہے ۱۸۹۸ء میں ولایت تشریف لیگئے وہاں سے جون ۱۹۰۱ء میں بیرسٹری پاس کرکے تشریف لائے، آپ کو پولیٹیکل معاملات میں نہایت دلچسپی ہے، راقم تذکرہ کے محب بے ریا ہیں، بارہا ہنگام قیام دہلی اور لکھنو میں صحبتیں رہیں۔ خلیق، زندہ دل، متواضع، امیرزادے ہیں۔ کچھ کلام آپنے عنایت فرمایا اُس کا انتخاب حاضر ہے:

دیا دل ذہین اُس ستمگر کو اپنا
کہا ہائے تم نے نہ مانا کسی کا

تیرے ہی در کے ہیں گدا، مال جہاں کا ذکر کیا
اور تو کچھ نہیں رہا، نذر کو تیری لائیں کیا

نزع میں آئے ہیں عیادت کو
اے قضا تو ذرا توقف کر

میں تو حرم میں زاہدا راہ بھٹک کے آگیا
پھر خدا نہ جی جلا، یاں ہے کہاں دو دو دل

چشم و رخ و دہان یار، سب کریں دل طلب ہزار
ایک تھا کر دیا نثار، اتنے کہاں سے لائیں دل

ترس کھانا تو کیسا رقص بسمل کی ہوں تعریفیں
خدا شاہد بڑا ہی ظلم یہ صیاد کرتے ہیں

ہے وقت نزع میرا آرہی ہے آخری ہچکی
ذرا تو اے قضا تھم جا وہ مجکو یاد کرتے ہیں

مسیحا ہو اگر آؤ کہو تم میری میت پر
نہیں کہدو کہ سب کچھ یوں ہی ہم ارشاد کرتے ہیں

بے سبب کب فلک کو گردش ہے
میری تقدیر اس میں شامل ہے

دل نہیں، پوچھتے ہو کیا یارو
میرے پہلو میں مرغ بسمل ہے

کوہکن! کیوں؟ وہی ہوا آخر
ہم نہ کہتے تھے چاہ مشکل ہے

رات کا حال جھوٹ کہتا ہوں
آنکھ مجھ سے ملائیے تو سہی

کیا ذہین پھر کسی پہ دل آیا
چپ ہیں کیوں کچھ بتائیے تو سہی

میں تو ہندو نہ تھا مسلماں تھا
بت کو سجدہ کرا دیا کس نے

تڑپتا ہوں میں اک مدت سے دختر رز کی خواہش میں
پلا دے آج تو تھوڑی مجکو یار تھوڑی سی

اک تو کرتا ظلم اُس پر پُوچھنا کیا حال ہے | اب نہ مُنہ کھلوائیے سرکار رہنے دیجئے

مثنوی

خط کو پڑھتا ہوں گو میں سو سو بار | سیر ہوتی نہیں طبیعت یار
کل تھی شادی کی دھوم دھام جہاں | صفِ ماتم بچھی ہے آج وہاں
مُنہ جو ڈھک کر کبھی نہ سوتے تھے | تنگ گوشے میں گور کے ہیں پڑے
کل جہاں تھا بہار کا جوبن | آج بادِ خزاں کا ہے مسکن
اب نہ شیریں ہے اور نہ ہے فرہاد | اب نہ وہ باغ ہے نہ ہے شداد
ہے کہاں قیس اور کہاں لیلیٰ | قبر تک کا پتہ نہیں لگتا
موت کے آگے کیا بشر کی چلے | پیر و پیغمبر اس سے جب نہ بچے

ذہین

ذہین۔ مولوی سید واجد علی لکھنوی شاگرد محمد مصطفےٰ خورشید لکھنوی مرحوم۔ یہ چند شعر اُنکے ملاحظہ ہوں۔

نہ سنگدل کوئی تم سا ملا زمانے میں | ہزار دیکھے جفا پیشہ بھی ستمگر بھی
خدا بچائے یونہیں روز قتل کرتے تھے | کمر میں آج تو شمشیر بھی ہے خنجر بھی
اِس ایک تیر نظر نے کئے ہیں دو بسمل | جگر کے ساتھ تڑپتا ہے قلبِ مضطر بھی

ذہین

ذہین۔ منشی سید غلام مصطفےٰ مخزن اور ادیب وغیرہ رسالوں میں آنکی نظمیں شائع ہوتی ہیں عموماً اخلاقی مضامین نظم کرتے ہیں اور حق یہ ہے کہ حق شاعری ادا کر دیتے ہیں، الفاظ صاف و شستہ و تراکیب دلنشیں اور مناسب موقع مسلسل نظمیں جن میں قوتِ فکر کا پورا امتحان ہوتا ہے اکثر بہت اچھی لکھتے ہیں، ایک نظم موسومہ "شعور" قابلِ دید ہے۔ معرفت اور تصوف کے رنگ میں اکثر طبع آزمائی کرتے ہیں اور فرائض انسانی و طرز معاشرت و تمدن وغیرہ کے مسائل پر بھی اُنکی متعدد نظمیں ہیں، ۳۵، ۳۶ برس کی عمر اور یہ کلام کا انتخاب ہے۔

عہد قیصری

جسے تو چاہے عزت دے جسے تو چاہے ذلت دے | کسیکی فہم میں کب راز یہ آتا ہے قدرت کا

سبب امن واماں کا عہدِ شاہِ عدل گستر ہے
زمانہ جارج پنجم کا ہے آرام و راحت کا

سبب آرام و راحت کا عدالت ہے کہ سلطاں کو
ہی کی ہی ضرورت ہے یہی شیوہ حکومت کا

رعایا پر رعایت کی نظر ہے شاہ پر واجب
اطاعت شاہ کی کرنا فریضہ ہے رعیت کا

عدالت ہی سے ہے تالیفِ قلوبِ خلق کا باعث
عدالت ہی سبب ہے حق تعالیٰ کی عنایت کا

سمجھنا حق کو حق ناحق کو ناحق سخت مشکل ہے
اہم ہے کام سب کاموں میں انصاف و عدالت کا

زمانہ جارجِ پنجم کا کیا اچھا زمانہ ہے
کہ باعث امن عالم کا ہے دور اسکی حکومت کا

مرقعے ہمنے شاہانِ سلف کے غور سے دیکھے
نظر آتا نہیں قیصر کوئی اِس شان و شوکت کا

انسان ....

ہوتے ہیں اپنے مقاصد میں وہ اکثر کامیاب
نامرادی میں بھی ہوتے ہیں جو ہمت آشنا

طالبِ دنیا پریشاں حال رہتے ہیں مدام
ہیں بڑے آرام و آسایش میں عزلت آشنا

او بشر او خاک کے پتلے تجھے اتنا غرور
تیرے ہمجنس اور پھر تو ہی رہے ان سے نفور

نشۂ زر نشۂ رز کی طرح کیوں چڑھ گیا
ہوگئی الٹی سمجھ کیوں؟ کیا ہوا تیرا شعور

سمجھے ہیں محروم سائل سہکے ذلت کا بھی غم
مفلسوں کو کب سمجھتا ہے تو او منعم! غیور

اے بشر تجھ پر نہوتا فضل اگر اللہ کا
تجکو کب ملتی یہ عزت، یہ شرافت، یہ شعور

کر خدا کا شکر کیا تھا کیا سے کیا تو ہوگیا
جو ہو کرنا آج کرلے کل تو ہے روزِ نشور

ہو کے انسان پھر کرے تو ہی جفا انسان پہ
کیا یہی ہے آدمیت کا شعار اے بے شعور

زمانہ ساز

نکالا کرتے ہیں جو لوگ مکر و زور سے کام
سمجھنے لگتے ہیں وہ آپ کو زمانہ ساز

کچھ ایسے کاذب و مکار و چلتے پرزے ہیں
کہ خیر و شر کو بنا لیتے ہیں نشیب و فراز

سمجھتے ہیں وہ یہ معنے زمانہ سازی کے
کہیں رہینِ تملق کہیں بنیں غماز

برائیوں پہ عمل کرکے پھر یہ کہتے ہیں
زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

جو ایسے لوگ ہیں وہ سرخرو نہیں ہوتے
برا ہو انکا جو کرتے ہیں اِس برائی پہ ناز

مصیبتوں میں جو رہتے ہیں صابر و شاکر
وہی ہیں قابلِ تکریم و لائقِ اعزاز

لالہ کو بے ثباتیٔ عالم کا داغ ہے
گل کی طرح گذار دیئے یاں ہنسکے زندگی

یوں دیکھنے کو باغ میں خنداں ہے چند روز
باغ جہاں میں صحبتِ یاراں ہے چند روز

جیسا ظاہر ویسا باطن اسکا ہو کیونکر یقیں
دیکھکر صورت کو ہو ظاہر کسیکے دل کا حال
بعض مکّار اپنا ظاہر گو بنا لیتے ہیں خوب
آزمانے پر مگر ہوتا ہے ظاہر اُسکا حال
ظاہریِ اخلاق پر لوگوں کے کیا ہو اعتبار
ایسی لذت ہی نہوتے ہیں کہ ہو جنمیں نہیں
بُعدِ فرقت گر نہو تو لطفِ قربت میں نہیں
پاس جو ہو دولت اُسکی قدر کم کرتے ہیں ہم
ہے یہی باعث وطن میں قدر جو ہوتی نہیں
ہمکو اچھی ہی نظر آتی ہے ہر شے دُور سے

ہو نہ جبتک امتحان ظاہر و باطن نہیں
ہو نہ جبتک اُسکی سیرت کا ہمیں علم و یقیں
اور کھُلتا ہی بمشکل ہو جو اُنکے دل نشیں
جعلساز اُنسے زیادہ کوئی دنیا میں نہیں
ہو نہ باطن کی بھی جبتک آزمایش ہے ذہین
لطف جو دوری میں ہے قربت میں آتا ہے کہیں
اور عسرت گر نہو تو لطف عشرت میں نہیں
دُور جو ہو یاد اُسکی ہر گھڑی کرتے ہیں ہم
کوئی ہم میں سے نکلتا ہے جو فرد بہتریں
ہے جو پنہاں شاد ہم ہوتے ہیں ذکر جور سے

.....

فنا

سب ہیں فانی کیا زمیں کیا آسماں کچھ بھی نہیں
آہ سے مظلوم کی ڈر ظالم نخوت پرست
ظاہری احسان سے جب ممنون کرنا ہے غرض

اِک خدا کو ہے بقا دونوں جہاں کچھ بھی نہیں
سامنے جسکے زمین و آسماں کچھ بھی نہیں
مہربانی یہ تو ہے نامہرباں کچھ بھی نہیں

جہاں میں ہے یہ دلیلِ شرافتِ انساں
گزارے عمر دو روزہ وہ نیک نامی سے

اُمیدِ خیر پہ مبنی ہو عادتِ انساں
یہی ہے باعثِ آرام و راحتِ انساں

ہو جو چھوٹا تم سے اُسپر چاہیئے لطف و کرم
جو بُری ہے بات نفرت اُس سے ہو جائیگی خود

جو بڑا تم سے ہے خاطر اُسکی اور عزت کرو
نیک کاموں ہی کی تا مقدور تم عادت کرو

کرتی ہے عیب و ہنر کو آشکارا گفتگو
غور پہلے کرتے ہیں بعد اُسکے دانا گفتگو

جوہر انساں کا ہے آئینہ گویا گفتگو
تا نہ آفت میں پھنسائے بے محابا گفتگو

جب چٹکتی ہے کلی تو صاف آتی ہے صدا
عرضِ مطلب میں رکھو ہر جا خیالِ اختصار
ای خرد ور دل بدست آور کہ حج اکبر است
چاہیئے تمکو مخاطب کے مراتب کا لحاظ
جس سے کچھ جائے مخاطب ہے وہ بیجا گفتگو

ہے گلِ راحت خموشی اور ایذا گفتگو
بارِ خاطر بار ہا ہوتی ہے بیجا گفتگو
جس سے دلکو رنج پہنچے وہ بھی ہے کیا گفتگو
سوچ لے پہلے سے کرنا چاہیئے کیا گفتگو
جو نہ کھینچے دلکو سامع کے تو وہ کیا گفتگو

زندگانی کا زمانے میں بھروسا کیا ہے
پاک نیت ہے تو سب کام سنور جائیں گے
اشرف الخلق ہو کچھ پاس بھی ہے عزت کا
منعمو! بیع و شری سمجھے ہو احسان کو تم
حق نے پیدا کیا طاعت کے لیئے انساں کو
سخت دشوار ہے انسان کی پہچان ذہین

جز فنا ہونے کے انساں میں رکھا کیا ہے
تم خطاوار نہیں تو تمھیں کھٹکا کیا ہے
کام کیا کرتے ہو تم اور تمھیں زیبا کیا ہے
نہیں منظور جو شہرت تو یہ چرچا کیا ہے
جو نہ طاعت کرے خالق کی وہ بندا کیا ہے
دوست کہتے ہیں کسے آپنے سمجھا کیا ہے

بھلائی کیئے جا شرافت یہی ہے
نکوئی میں کر نام شہرت یہی ہے
وہ کوشش ہی کیا ہے جو اپنے لیئے ہو
کسی سے نہ مکر و دغا کر جہاں میں
نکر دشمنی دوستی کی ہے جس سے
جو اعلیٰ ہو اپنے کو سمجھے وہ ادنےٰ
ہر چیز کو فنا ہے یارب تجھے بقا ہے
احساں میں جب غرض ہو احسان ہی وہ کیا ہے
گر ہو نہ آدمیت وہ آدمی ہی کیا ہے
چشمِ کرم بشر سے ؟ ذلت کا سامنا ہے

اطاعت یہی اور طاعت یہی ہے
بھلائی کے کر کام راحت یہی ہے
تو غیروں کے کام آ کہ ہمت یہی ہے
یہی آبرو پاسِ عزت یہی ہے
یہی ہے مروّت محبت یہی ہے
یہی خاکساری شرافت یہی ہے
تو مالکِ حقیقی دُنیا جہان کا ہے
کیوں نام کی ہے خواہش کس کا نشاں رہا ہے
جو بیکسوں کو پوچھے کیا اسکا پوچھنا ہے
اللہ سے طلب کر جو تجھکو مانگنا ہے

ہونا ہے جو وہ ہوگا کیوں رنج کر رہا ہے ✽ ہے عمر تیری کتنی کیوں غم میں مبتلا ہے ✽

ردیف رائے مہملہ

راجہ

راجہ۔ راجہ راج کشن مغفور رئیس کلکتہ، آپکے والد مرحوم مہاراجہ نبا کشن بہادر جو کلائیو کے دیوان اور اپنے وقت کے مقتدر اور معزز امرا کے سرتاج تھے، مرزا جان طپش دہلوی سے تلمذ تھا، نساخ اور مولنا حبیب الرحمن کا بیان ہے کہ انکا ایک ضخیم دیوان اردو میں تھا، مگر جس تذکرہ کو دیکھا اُس میں صرف ایک ہی شعر نظر سے گزرا، انکے بیٹے راجہ انوپ کشن بہادر بھی شعر کہتے تھے اور کنور تخلص کرتے تھے۔

گر شب کو نہ تم پاس مرے آؤگے صاحب	تو مجکو سحر تک نہ یہاں پاؤگے صاحب

راجہ

راجہ۔ راجہ بہادر نام خلف راجہ شتاب رائے صوبہ دار پٹنہ عظیم آباد۔

یہ زخم دل ہمارے مرہم تلک نہ پہنچے	ہم اُن تلک نہ پہنچے وہ ہم تلک نہ پہنچے

راجہ

راجہ۔ بلاس رائے پسر دیوان مانرائے۔ شوق لکھتے ہیں کہ صاحب اقتدار عالی ہمت از شاگردان حسن علی شوق طبیعت مناسب اور موزوں پائی تھی۔ یہ انکا کلام ہے۔

اِس واسطے کسی کی نہ تجکو نظر لگے	انجم بنے سپند بنا مجمر آفتاب
سُنکر ترے جمال کو اب ڈھونڈتا پھرا	لیکر سحر سے شام تلک گھر گھر آفتاب
یہانتک ہی تیرے چہر پکا اب دیلیں سے آ رشک	آتش میں جل کے ہوگیا جوں اخگر آفتاب

راجہ

راجہ۔ رئیس با تمکین مہاراجہ بلوان سنگھ بہادر راجہ خلف ارشد مہاراجہ چیت سنگھ تاریخ میں انکا حال اس طرح درج ہے کہ جب راجہ چیت سنگھ کے والد راجہ بلونت سنگھ نے وفات پائی نواب شجاع الدولہ نے تمام عہدناموں کے برخلاف چاہا کہ علاقہ بنارس پر اپنا دخل کرلیں لیکن سرکار انگلشیہ نے قدیم شرائط کی پابندی بلحوظ خاطر رکھکر راجہ چیت سنگھ کو سندِ موروثی پر متمکن کردیا۔ راجہ موصوف حسب قرار داد سابقہ سالانہ زر خراج معینہ ادا کرتے رہے لیکن ۱۷۷۸ء میں سرکار انگریزی نے کچھ فوج کمکی طلب کی اور اخذ زر بھی کرنا چاہا

راجہ نے ان اُمور کو اپنی مقدور سے خارج پاکر عذر کئے جو مسموع نہ ہوئے اور وارن ہسٹنگز گورنر جنرل خود اس معاملہ کے تصفیہ کے لیئے بنارس آئے اور راجہ کی گرفتاری کا قصد کیا، اِس امر سے تہلکۂ عظیم مچ گیا اور چاروناچار جانبین سے فوج کشی کی نوبت آئی آخرالامر والی بنارس مہاراجہ چیت سنگھ نے ۱۷۸۱ء میں شکست پاکر گوالیار کو پناہ گاہ مقرر کیا تو عالیجاہ نے طریقۂ مہمانداری کا مسلوک کرکے پانچ لاکھ سالانہ کی جاگیر علیحدہ کر دی - بعد وفات مہاراجہ چیت سنگھ مہاراجہ بلوان سنگھ چالیس سال تک آگرہ میں تشریف فرما رہے، نظیر اور مرزا حاتم علی مہر کے شاگرد تھے بڑے قادر الکلام، مشاق، ذکی اور طباع سخنور تھے تلاشِ مضامین نو کی طرف میل خاص تھا اور اُسکے ساتھ ہی زبان کی صفائی کا اسقدر خیال تھا کہ کیا مجال کہ اسلوب بیان میں ذرا بھی دقت یا اُلجھاؤ پیدا ہو، مشکل زمینوں میں خوب خوب شعر نکالتے تھے شاعروں کے بڑے قدردان تھے ہمیشہ دولتخانے پر مشاعرے ہوا کرتے تھے اور شعرا سے ہر طرح سے مسلوک ہوتے تھے قوم کے ترکرما برہمن تھے اِنکے مورثِ اعلیٰ راجہ منسارام کو محمد شاہ نے پندرہ لاکھ سالانہ خراج پر علاقہ جات جونپور - غازیپور، بنارس کا صوبہ دیا تھا، سرکار انگلشیہ سے دو ہزار روپیہ ماہوار پنشن مقرر تھی، ۱۷۹۹ء سال پیدایش تھا - صاحب دیوان مسمیٰ بہ گل ریاض مطبوعہ عظیم الاخبار پریس آگرہ ۱۲۷۰ھ تھے، ایک کتاب موسوم بہ چتر چندرکا بھی اِن سے یادگار ہے، دیوان نہیں ملا، البتہ تلاش سے بیس پچیس غزلیں ہم پہنچیں اُنکا انتخاب حاضر ہے اُنکے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف و مشکل زمینوں میں کس قابلیت اور ذہانت سے سخن کیا ہے، اِنکی قادر الکلامی اور مشاقی قابلِ داد تھی - کیوں نہو استعدادِ علمی کے علاوہ ذہانت اور خوش فکری خداداد تھی - انتخاب کلام سے لطف اُٹھایئے ؛

تو ہے وہ گل کہ نام ترا باغِ دہر میں	وہ دو پہر وظیفۂ مرغِ سحر ہوا
خانۂ دل میں خدا و شل بتوں کا نکلا	کعبہ ہم سمجھے تھے جسکو وہ کلیسا نکلا
صاف قاتل سے ہنوں اتنا کہ یقیں ہے دمِ قتل	میرے خوں کا بھی نہو تیغ پہ دھبّہ پیدا

کالا ہے ماہتاب کہ گورا ہے ماہتاب
پردہ نشیں سے پوچھیں گے کیسا ہے ماہتاب

یہ پیر چرخ خادم دیرینہ ہے ترا
دست فلک میں پھول کا پنکھا ہے ماہتاب

حسرت سے قیس دیکھتا ہے چاند کیطرف
کیا نقش پائے ناقۂ لیلیٰ ہے ماہتاب

آنچ یتی تلوار کی برق غضب
ہو گیا کشتہ ترا قاتل کباب

آیا وہ مہکش تو سیخ شمع پر
ہو گئے پروانے سر محفل کباب

کیا سوتی ہے لیلیٰ تو پڑی خواب لحد میں
روتا ہے کھڑا قیس بچارا سر تربت

اے قیس تری جاں کی نہیں خیر نہیں خیر
خالی ہے کھڑا ناقۂ لیلیٰ سر تربت

حلال کرتا ہے کسکو ہلال شام کیوقت
فلک پہ خون ہے کچھ لال لال شام کیوقت

نصیب اعدا نہ ہو سایۂ پری سر پر
چمن میں پھرتے ہو تم کھولے بال شام کیوقت

خیال زلف میں راجہ نگہ کے مرتا ہوں
تو ایسی باتیں نہ منہ سے نکال شام کیوقت

مطیع خوبوں کی خلق پائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت
صنم بھی کرنے لگے خدائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت

جنھیں تھا دعوائے میرزائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت
نصیب ہے اب برہنہ پائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت

صنم کدہ سے کسے تھی فرصت حرم میں آنا ہے اتفاقاً
غضب ہے ہم اور پارسائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت

شروع کی ہیں نے چھیڑ اسنے تو مجھ سے تیوری چڑھا کے بولے
تو ہم سے کرتا ہے ہاتھا پائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت

مری تو قسمت میں گالیاں ہیں رقیب کو ہو نصیب بوسہ
مجھے تو سم دے کے اسے مٹھائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت

فقط مجھی کو نہیں ہے الفت مطیع شاہ و گدا ہیں راجہ
صنم بھی کرنے لگے خدائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت

کعبہ نہ گئے دیر سے تکفیر کے باعث
اللہ کو بھولے محبت بے پیر کے باعث

بے یار کوئی کام ہو ممکن نہیں ناصح
جی لگ گیا فرہاد کا تصویر کے باعث

روشنی داغ جدائی کی فقط کافی ہے
ڈھیر مجنوں کا نہیں شمع لگن کا محتاج

آبلہ گنبد مرقد ہے کفن دامن دشت
نہ تو ہیں طالب تربت نہ کفن کا محتاج

عرق آلودہ رخ یار کو لے راجہ دیکھ
گل جنت نہیں یہ نہر لبن کا محتاج

جیتے جی حال نہ پوچھا نہ بیمارِ عشق کا
ہونٹوں پہ جان شوقِ شہادت سے آگئی
گردش لکھی ہی سر میں تو چکر ہی پاؤں میں

اُٹھتی ہے نعش اب تو ذری چل کسی طرح
قاتل دکھا دے مجھکو تو مقتل کسی طرح
اِک قصہ بر زمیں ہی تو اک داستانِ چرخ

عاشق کا رنگ زرد ہے پوشاکِ یار زرد
کیسا خیالِ ہجر شبِ وصل آگیا
عاشق کا رنگ زرد نہ ہو کیونکہ ہجر میں

پھولی بسنت باغ میں آئی بہار زرد
یا سرخ تھا میں یا کہ ہوا ایکبار زرد
کردیتی ہے خزاں شجر و برگ و بار زرد

کچھ مزا دیگی جو بوسہ کی حلاوت لب پر
حالتِ نزع میں ہے قند کی حکایت لب پر
ضعف کیسا ہی یہ کیسی ہی نقاہت مجھ کو
عزم بوسہ کا تصور میں اگر میں نے کیا
عشوہ و ناز اس انداز کا دیکھا نہ سُنا
دل پہ صدمہ ہو کہ ہو جاں پہ اذیت راجہ

جاں بہ دمِ مرگ رہیگی کئی ساعت لب پر
دم نکلنے نے مچائی ہی قیامت لب پر
نالہ دل سے نہیں آتا ہی سلامت لب پر
پڑ گیا نیل ہوئی ختم نزاکت لب پر
شوخی آنکھوں میں ہی ظاہر ہی شرارت لب پر
آنے پائے نہ مگر حرفِ شکایت لب پر

اے آئینہ رُو جھانک کے غرفہ سے ذرا دیکھ
قاتل سے کہیں کیا دلِ افگار کا احوال

ایک خلق کھڑی نقش بدیوار ہے باہر
ہر وقت وہاں میاں سے تلوار ہے باہر

کہتے ہیں جسکو دخترِ رز میری جان ہے
ہوتے ہو تلخ اب لبِ شیریں کے بوسے سے
لے راجہ باغبان نے صیاد سے کہا

دِل کا گمان ہے مجھے بوتل کی ڈاٹ پر
تمنے ہی دل کو پہلے لگایا تھا چاٹ پر
قمری کا سر اُڑا دے عنادل کی کاٹ پر

صرفِ بالش نہ ہوئے بلبلِ گلزار کے پر
وہ سیہ بخت ہوں روشن ہو اگر شمعِ مزار
شش جہت میں ہی یہی ظلم عنادل کے نصیب
اب کبوتر کو مرے طاقتِ پرواز نہیں

کچھ بھی کام آئے نہ اس طائرِ بیکار کے پر
جمع پروانے ہوں گُل کردیں لگے مار کے پر
دو کے پر باندھے گئے کترے گئے چار کے پر
گر پڑا چونچ سے خط ڈال دیئے ہار کے پر

شیخ ناراض ہو ہم سے کہ برہمن روٹھے
ہونگے پابند نہ ہم سبحۂ و زنار کے ہم

موتی پہ گماں ہوتا ہے سبزے کا ہر اک کو
ہے عکسِ خطِ سبز سے جبڑے کا گہر سبز
میں ابرِ تنک کا کبھی احسان نہ لونگا
کر دیگا مرے صحرا کو تو اک دیدۂ تر سبز
اِک جھاڑ زمرد کا بنا سروِ چراغاں
داغ تنِ سم خوردہ ہوا راجہ یہ سر سبز

مانی اُس نے منگائی ہے تصویر
کھینچدے جائے جسمِ لاغر خط
اُسکی صورت تو جا کے دیکھے گا
میں نہ دونگا تجھے کبوتر خط

بعد مُردن بھی کھُلی رہ گئیں آنکھیں میری
تھا مری چشم کو از بس ترے دیدار کا حظ
ہم تو حیران رہیں صورت کو تری پردہ نشیں
آئینہ روز اُٹھائے ترے رخسار کا حظ
میر و سودا و حزیں، آتش و ناسخ ہوتے
روبرو اُنکے اُٹھاتا جو ترے اشعار کا حظ

معلوم نہیں ہاتھ کریگا وہ کدھر صاف
تلوار رلی جاتی ہے ہوتی ہے سپر صاف
مرغانِ قفس کو نہ تو دانا ہے نہ پانی
صیاد گذرتے ہیں انھیں آٹھ پہر صاف

شاید کہ بہار آئی جو مرغانِ گرفتار * منقار سے اُڑنے کے لیے کرتے ہیں پر صاف

یہ کسکو ڈھونڈتی پھرتی ہے اضطراب میں برق
گھٹے زمیں گھٹے گردوں گھٹے سحاب میں برق
کسی کے نورِ رخِ مہروش پہ عاشق ہے
یہ گرتی پڑتی جو پھرتی ہے اضطراب میں برق

اے قضا اور دے دو چار قدم کی مہلت
مجھ تنِ زار سے ہے کوچۂ جاناں نزدیک
ضعف سا ضعف ہے اب چاک نہیں ہو سکتا
دستِ وحشت سے ہے ہر چند گریباں نزدیک
چشمِ بد دور تری آنکھوں سے نسبت کیا ہے
چل دکھا دوں میں ہرن یاں ہے بیاباں نزدیک

مرنے کا تو کچھ غم نہیں پر غم ہے یہ راجہ
مہمان ہے دردِ جگری اور کوئی دم

آستانِ یار پر ہم جبہہ سائی کرتے ہیں
دیکھیں کیا ہوتا ہے قسمت آزمائی کرتے ہیں
کوئی مرتا ہے کوئی جیتا ہے اُنکے حکم سے
اللہ اللہ آجکل بت بھی خدائی کرتے ہیں
شر بڑھے گا روٹھنے میں راجہ صاحب خیر ہے
آپ معشوقوں سے بھی اب برائی کرتے ہیں

کیا جانے کہاں قافلہ ہمسفراں ہے
یارانِ عدم کی نہیں آتی ہے خبر کچھ

شعر چوٹی کے سنکے کہتا ہے
میرے پیچھے بلا پڑی کیسی
میں نے دشمن بغل میں پالا تھا
آہ اس دل نے کی دغا کیسی
سُرخ ہاتھوں کو کر چکے خوں سے
اور پھر چاہیئے حنا کیسی
ٹھنگئی شکل نقش پا کیسی
پس گئی چال پر حنا کیسی

اقلیم کبھی زیرِ نگیں رہتی تھی راجہ
اب حرف بھی غالب ہیں نگیں پر نہیں گے
دست مشتاق نے زلفوں کو بنایا افعی
صاف پیدا کفِ موسیٰ کا اثر ہاتھ میں ہے
دانتوں پر موتی تصدق کرکے جانی بھیجئے
جاں بلب ہوں ابتو آبِ زندگانی بھیجئے
کشتۂ ابرو کو کیجے دفن بیت اللہ میں
قیدیٔ گیسو کو صاحب کالے پانی بھیجئے
ہنستے ہی ہنستے یقیں ہے مجکو شادی مرگ ہو
آپ اگر اپنا دوپٹہ زعفرانی بھیجئے
ہیں بے خبر ایسے کہ خبر ہم نہیں رکھتے
دل ہم نہیں رکھتے ہیں جگر ہم نہیں رکھتے
جس جا پہ گرے تھک کے وہی گھر ہے ہمارا
دیوانے ہیں، سودائی ہیں، گھر ہم نہیں رکھتے
کیا مٹیہ تصدق کریں کیا نذر دیں تمکو
دل ہم نہیں رکھتے ہیں جگر ہم نہیں رکھتے
کس تاک پہ آتا ہے تو اے دردِ محبت
دل ہم نہیں رکھتے ہیں جگر ہم نہیں رکھتے
رولائے روئے لیلیٰ جان کر دوڑا عبث مجنوں
بھلا کب چاندِ مہتابِ راجہ ہاتھ آتی ہے

زلف کی یاد حکایت آئی
اور شب بڑھ گئی آفت آئی

وہ پیام یار لایا اسنے کھولی فال نیک
پائے قاصد چومئے اور دستِ عامل چومئے

یہ سچ ہے کہ تلوار کی ہوتی ہی بڑی آنچ
کیا قہر ہے تیغ نگہِ یار کی گرمی
بُت اگر سنگدل ہے اے راجہ
کرلے باتوں میں اسکو تو پانی
دوستوار شک کے ہم خو معانی سمجھے
سایۂ یار کو بھی دشمن جانی سمجھے
نامہ لکھے کوئی کیا، کیا کوئی قاصد بھیجے
وہ نہ خط سمجھے نہ پیغام زبانی سمجھے
سُن کے افسانۂ حالِ دلِ مضطر بولا
قصہ خواں دور ہو چل تیری کہانی سمجھے

راجہ

راجہ۔ مہاراجہ سر دگبجے سنگھ صاحب بہادر کے، سی، ایس، آئی۔ والیٔ ریاست بلرامپور و تلسی پور اودھ آپ قوم کے جوار راجپوتوں میں سے تھے، اور انکے بزرگ گجرات چمپانیر سے اودھ آنکر یہاں کے علاقہ جات کے بزور شمشیر مالک ہوئے تاج الدین غوری کے وقت میں سرکار شاہی سے اِنکے بزرگوں کو بہڑائچ کا علاقہ واسطے آبادی و کاشت کے انتظام، خراج پر عنایت ہوا، یہاں اکونہ کا قصبہ انہوں نے آباد کیا اور ریاست کی بنیاد ڈالی۔ راجہ جے نراین سنگھ برادر سر راجہ صاحب کے وقت تک ۱۸ راجہ یکے بعد دیگرے مسند نشین ہوئے۔ آبائی زمینداری پر مسند نشینی کے وقت مہاراجہ صاحب عمر صرف اٹھارہ سال کی تھی۔ اترولہ کے تعلقہ دار راجہ محمد خاں نے اِن پر فوجکشی کا ارادہ کیا تو یہ خود اُسپر جا چڑھے اور اُسکی گڑھی کو لوٹ لیا، سمت ۱۸۹۷ میں راجہ درشن سنگھ شاہ اودھ کی طرف سے ناظم مقرر ہوئے اُنہیں مہاراجہ سے پرخاش تھی، انھوں نے انکے نائب گجادر سنگھ سے بذریعۂ تہدید بلرامپور خالی کرالیا مہاراجہ اُن ایام میں اپنی شادی کرنے بالسنی گئے ہوئے تھے، یہ سنکر بہت مغموم ہوئے اور نیپال چلے گئے، وہاں مہاراجہ جنگ بہادر نے بہت مدارات سے رکھا اور امداد کا وعدہ کیا رزیڈنٹ نیپال کی تحریک پر شاہِ اودھ نے درشن سنگھ کو معزول کردیا اور مہاراجہ پھر اپنے علاقہ پر قابض ہوگئے، سمت ۱۹۰۵ میں ملتی پور کے راجہ دگراج سنگھ کو اُسکے بیٹے دگ نراین سنگھ نے معزول کردیا، واجد علیشاہ کے حکم سے مہاراجہ نے اُنکی امداد کرکے دگجراج سنگھ کو پھر قبضہ دلادیا اور اپنا حق مقررہ معہ ایک گانوکے لے لیا۔ اِسی طرح سے مختلف معرکوں میں مہاراجہ نے اپنی بہادری اور اولوالعزمی کے جوہر دکھائے ۱۸۵۶ء میں سرکار اودھ پر انگریزی تسلط ہوگیا انہوں نے فوراً چارلس ونگ فیلڈ کمشنر بھڑائچ کے پاس حاضر ہوکر علاقہ بلرامپور کی قبولیت داخل کردی اور اپنی حسن خدمات سے صاحب کو از حد رضامند رکھا۔ تھوڑے دن بعد جب غدر ہوا، مہاراجہ حسب الطلب پانچسو سوار لیکر کمشنر کی امداد کو گئے اور قریباً سو انگریزی خاتون اور بچوں کو اپنی زیر حفاظت رکھکر سرکاری علاقہ میں بھیجدیا، اور قلعۂ بٹوہان کا قبضہ

بھی کرلیا۔ ۱۸۵۸ء میں جب سرکار نے دوبارہ گونڈا فتح کیا، مہاراجہ فسروں سے ملے اور چونکہ تلسی پور اور بالنسی کے راجہ باغی ہو گئے تھے اُن کا علاقہ بھی بطورِ انعامِ خیر خواہی حاصل کیا اور لکھنؤ کے ۱۸۵۹ء کے دربار میں اول نمبر کی کرسی پائی، سات ہزار کا خلعت اور مہاراجہ بہادر کا خطاب عطا ہوا، اور اختیارات دیوانی و کلکٹری بھی عطا ہوئے، برٹش انڈین ایسوسی ایشن (انجمن تعلقہ داران اودھ لکھنؤ) کے روزِ اجلاس سے آخر زمانۂ حیات تک وایس پریسیڈنٹ رہے اور جملہ مہمات ملکی و انتظامی میں حکّامِ وقت کے معتمد علیہ و ممتاز مشیر سمجھے جاتے تھے خود مختار والیانِ ملک سے بھی اچھے مراسم قائم کیے، وایسرائے کی کونسل کی ممبری کا اعزاز بھی عنایت ہوا الغرض اودھ کے تعلقہ داروں میں اپنی دور اندیشی، حزم و احتیاط، نکتہ رسی، قابلیت حسنِ انتظام کی بدولت سربرآوردہ رکن تھے، علوم و فنون کے بھی بڑے قدر دان تھے، چنانچہ لکھنؤ کی سلطنت کے مٹنے کے بعد اکثر پرانے رئیسوں کی خاندانوں کی پرورش اور باکمال لوگوں کی غور و پرداخت آپکی سرکار سے ہوتی رہی، اپنے حسن انتظام سے علاقہ کا بندوبست بھی بہت اچھا کیا اور اس میں معقول اضافہ کرتے رہے۔ اُردو شعر و سخن کی طرف بھی توجہ تھی اور صاحبِ دیوان تھے منشی جواہر سنگھ جوہر شاگرد خواجہ وزیر سے جو آپکے مصاحب تھے تلمذ تھا شکار کا بیحد شوق تھا، اُنکی قدر اندازی اور دلیری کے بڑے بڑے انگریز معترف تھے تمام اوقات فرصت اِس مشغلے میں صرف فرماتے تھے، بلرامپور جو ایک گاؤں تھا انکے حسن انتظام سے ایک شاندار قصبہ بن گیا، اسی طرح اپنے علاقہ میں جابجا چاہات، تالاب، پل اور سرائے بنوا کر اولوالعزمی کے ثبوت کے علاوہ علاقہ کو آباد اور رعایا کو خوش کیا ۱۸۸۲ء میں مہاراجہ نے (جن کا صلبی فرزند انکی حیات ہی میں قضا کر گیا تھا) لاولد انتقال کیا اور دو مہارانیاں بیوہ وارث چھوڑیں جن میں سے مہارانی خورد نے حسب وصیت مہاراجہ مرحوم مہاراجہ صاحب حال کو متبنّیٰ بنا لیا اور مہاراجہ کی ریاست کو برقرار رکھا۔ احسن التواریخ اور چند اَور کتابیں بلرامپور کے متعلق آپکی زیرِ سرپرستی شائع ہو چکی ہیں، موزونیٔ طبع کے اقتضا سے شعر کی طرف بھی کبھی کبھی

توجہ ہوجاتی تھی اور کثرتِ اشغال اور عدیم الفرصتی کے دیکھتے یہ امر کچھ کم باعثِ حیرت نہیں ہے کہ آپکے اشعار اسقدر صاف شستہ فصیح و بلیغ ہیں، کلام ہم رسیدہ کا انتخاب حاضر ہے۔

تیری صورت دیکھکر لیلیٰ کو آئیگا حجاب
میری صورت دیکھ کے مجنوں بہت شرمائیگا

گئے وہ دن کہ حسینوں کو پیار کرتے تھے
نہ ولولے رہے اپنے نہ وہ شباب رہا

خم کھلے، شیشے کھلے ہی میکدہ کا در کھلا
مغبچوں ہم پر نہ مضمونِ خطِ ساغر کھلا

خوابِ مخمل جن گل اندا موں کو فرشِ خار تھا
موت نے تربت میں انکو خاک بستر کردیا

گیا صحبت میں جب بے مفسدوں کی
مزاجِ اصلاح پر آیا نہ اُس کا

اے صبا ہے کسی عارض کا انھیں بھی سودا
باغ میں ہوتے ہیں گل چاک گریباں پیدا

اللہ غنی حسن پہ کسدرجہ ہے مغرور
وہ اپنا کبھی پاؤں زمیں پر نہیں رکھتا

راجہ بھلا ہے دزدِ حنائی کا کیا قصور
دل اپنا اپنے ہاتھ سے خود ہمنے کھو دیا

حُسن سے عشق نہ ہو جسکو وہ انسان کیسا
منکرِ قدرتِ حق صاحبِ ایماں کیسا

عشق میں تیرے ہوا ہے اے صنم
ایک مذہب کا فرو دیندار کا

رنج و غم دلکو مرے دیتے ہو یہ تو سمجھو
ہمنے کس ناز و نعم سے اسے پالا ہوگا

ہم جو گھر اُسکے گئے جانے شبِ تاریک میں
شعلۂ دل آگے آگے مثلِ مشعل ہوگیا

مجھے بھی ہر گھڑی کی بد مزاجی خوش نہیں آتی
کہونگا پھر جو میں کچھ طبعِ نازک پر گراں ہوگا

اپنی نظر بھی اکثر انسان کو لگی ہے
آئینہ میں نہ دیکھو منہ بار بار اپنا

جیسی کہوگے ہمکو ایسی سنوگے ہمسے
کب چپ رہیگا وہ جو حاضر جواب ہوگا

دیکھ کر لیلیٰ کو یہ خوش ہوکے مجنوں نے کہا
دو گھڑی دم سے ترے جنگل میں منگل ہوگیا

نام مشہور ہوا رشکِ مسیحا راجہ
پر انھیں فکرِ علاجِ دلِ بیمار ہی کب

محتسب ٹوٹیں گے ساتھ اُسکے کئی کاسہ سر
سُن لے رندوں پہ بہت کچھ ہی حقِ جامِ شراب

کیا تلون ہے مزاجِ یار میں
شام کو اقرار تو انکار صبح

انساں چلے وہ چال کہ جو ہو جہاں پسند
جہاں سے ہو وہ کام جو ہو یزداں پسند

دل بیچنے کھڑے ہیں ترے گھر کی راہ پر
ارزاں ہے مول لے جو اسے اک نگاہ پر

ہے نمود سبزۂ خط عارضِ جاناں کے پاس
آئے خضرِ تشنہ لب یا چشمۂ حیواں کے پاس

کس طرح ہم نہوں اُس ابروئے خمدار سے خوش
جو دلاور ہیں سدا رہتے ہیں تلوار سے خوش

آپ ہی آپ کچھ اغیار جلے مرتے ہیں
خود بخود آب جو ہو آپ کو ہے سے لخلاص

روشنی ہے عاشقوں کے دم سے باغِ دہر میں
بلبلوں کو اے گلو سمجھو گلستاں میں چراغ

پامال آج وہ ہیں جو کل تک نہال تھے
کھلتا نیا ہے روز تری انجمن میں گل

یاد آئی جو اُسکی جنت میں
حور کو دھیان میں نہ لائینگے ہم

بال کھوے ہیں کسنے چوٹی کے
کیا پریشان دن گذرتے ہیں

صغرسن میں پہنو پھولوں کے نہ ہار
تم ابھی ایجانِ من خود پھول ہو

یار کے پاس اُڑ کے چلا جائے گا نامہ
ابتو خود سیکھ گیا کار پیمبر نامہ

بے یار کیا بیان ہو تقریر خواب کی
یُوسف سے چلکے پُوچھئے تعبیر خواب کی

راحت

راحت۔ مرزا محمود بیگ خلفِ مرزا احمد بیگ سپاہی پیشہ تھے۔ آبا و اجداد کا اصلی وطن روم تھا مگر دلّی میں رہتے تھے، غدر سے پیشتر فوجی ملازمت ترک کر کے خانہ نشین اور علائق سے دست بردار ہو گئے تھے، فنِ سخن میں مومن خان دہلوی سے تلمذ تھا۔ ایک مثنوی موسوم بہ دہشت عدل اور ایک واسوخت علاوہ غزلیات کے ان سے یادگار ہیں، یہ اُنکے پاکیزہ اور صاف شستہ کلام کا انتخاب ہے۔

کچھ جان سی آتی ہو مریجان میں قاتل
پانی ترے خنجر میں ہو کیا آبِ بقا کا

کھلایا مجھے غم پلایا مجھے خون
ہوا جب میں ناکام جہاں تمھارا

غیروں سے جو اشارے محفل میں ہیں تمھارے
سمجھیں وہ یا نہ سمجھیں پر یہ غلام سمجھا

صبر و قرار تاب و تواں رفتہ رفتہ سب
آجائیں گے کہیں سے دلِ فتنہ گر ملا

اشک آنکھوں سے نکلکر زیرِ مژگاں تھم گیا
دم نہ لے سایہ میں کیونکر تھا مسافر دور کا

ہم سے وہ بھی چھٹے اور یہ دلِ شیدا چھوٹا
یاد کس کس کو کریں خیر جو چھوٹا چھوٹا

لے گیا رات کو باتوں میں لگا کر اُن کو
کیونکہ قائل نہوں راحت تری تقریر کے ہم

اجل پہلے آوے کہ وہ پہلے آویں
یہی راہ مدت سے ہم دیکھتے ہیں

روئے قاتل سے خجالت کیوں نہو روزِ جزا
ساتھ میرے ایک عالم ہو لیا فریاد کو

آنکھیں بھر آئیں مہر سے اُس رشکِ ماہ کی
سینے پہ رکھ کے ہاتھ جو اک میں نے آہ کی

قاتل تو ایک بوسہ مجھے دے کے قتل کر
لازم ہے کچھ تو دینی دیت بے گناہ کی

راحت

راحت منشی بشیر محمد خاں صاحب دلی کے رہنے والے اور حکیم ثناء اللہ خان صاحب کے پڑوتے ہیں ۱۲۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے دادا حکیم محمد علیخاں صاحب کے سایۂ عاطفت میں تعلیم و تربیت پائی اور انھیں سے فن سخن میں اصلاح لینے لگے۔ کچھ دنوں ریاستہائے جودھپورا ور بانسواڑہ میں بتقریب ملازمت بسر اوقات کی۔ اب ریاستِ اودیپور میں انسپکٹر کسٹم ہیں۔ آپکی طبیعت میں تاریخی واقعات کے نظم کرنے کا شوق خداداد ہے اور اس صنفت میں معقول دسترس بہم پہنچائی ہے، کئی مثنویاں آپکی تصنیف کردہ ہیں جن میں ایک موسومہ "درشا دیانہ سخن" ۱۹۰۸ء میں مہاراجہ سردار سنگھ بہادر والئے جودھپور کی تقریب تخت نشینی پر تصنیف کی تھی۔ ایک اور ضخیم مثنوی آپ نے لکھی ہے جس میں ۳۹ ہزار اشعار ہیں اور ابتدائے آفرینش سے خاندانِ لودہی تک کے حکمرانوں کے واقعات نظم ہیں، مثنوی ہذا کا نام "شاہنامہ جدید" ہے اسکے پانچ حصہ ہیں۔ غزنین نامہ، غوری نامہ، خلجی نامہ، تغلق نامہ، لودہی نامہ، آپنے اِس مثنوی میں قدیم راجگان ہند کے طرز حکومت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے اور رزم و بزم کے واقعات اور مسلمان حملہ آوروں سے ہندو راجاؤں کی معرکہ آرائیوں کو بوضاحت قلم بند کیا ہے۔ آجکل سلطنتِ مغلیہ اور زمانہ موجودہ کی تاریخ کہہ رہے ہیں۔ چونکہ آپکی طبیعت کو وقائع نگاری سے مناسبت خاص

ہے اِس وجہ سے کسی اور صنف شاعری میں طبع آزمائی نہیں کرتے۔ انتخاب کلام حسب ذیل ہے

مہاراج پرتھوی راج اور سلطان شہاب الدین غوری کی پہلی معرکہ آرائی نہر سرستی پہ

لگی چلنے باہم چھری اور کٹار　　ہوئے سر تنوں پر ہزاروں نثار
ٹرازن سے خنجر چلی سن سے تیغ　　ہزاروں ہی کشتہ ہوئے بیدریغ
جواں زخم پر زخم کھانے لگے　　شجاعت کے جوہر دکھانے لگے
کسی نے رنگے خون میں اپنے ہاتھ　　عدم کو گیا کوئی آقا کے ساتھ
زمیں پر تھا کشتوں کا پشتہ بندھا　　ہر اک سمت تھا خون کا دریا بہا
بدلنے لگا جب لڑائی کا طور　　کیا اپنے لشکر پہ راجہ نے غور
یکایک بڑھی ہاتھیوں کی وہ صف　　جواں نکلے پیچھے سے نیزہ بکف
وہ تھے قوم کے سب کے سب راجپوت　　وہ بانکے ولا ور بہادر سپوت
گرے فوجِ شہ پر وہ سب ایکبار　　ہوئے قلب تیروں سے انکے فگار
کمانوں نے گوشہ لیئے اپنے موڑ　　دیا تیروں نے اپنے ترکش کو چھوڑ
جو افغاں تھے فوراً وہ پیچھے ہٹے　　اُدھر خلجیوں نے بھی گھونگٹ لیے
لڑائی کا جب یہ ہوا بندوبست　　ہوئی فتح سے شاہ کی پھر شکست
شکستہ ہوا میمنہ میسرہ　　ہوا قلب کی فوج کا فیصلہ
لڑائی سے تیروں کی عاری ہوئے　　نمک خوار سارے فراری ہوئے
نہ مطلق ہوا شاہِ غزنیں ملول　　گھرا ایسا تھا جیسے کانٹوں میں پھول
نظر کھانڈے راؤ کی اُسپر پڑی　　سپہدار کی آنکھ اُس سے لڑی
سپہدار نے بھی بجرأت تمام　　کیا رستمی کا وہاں پر یہ کام
دیا ہاتھی کے منہ پہ نیزہ لگا　　حریفوں کو دی اپنی جرأت دکھا
کیا کھانڈے راؤ نے پھر اُسپہ وار　　تو نشانہ نشانہ بنا ایک بار

نہایت ہی سخت اسکو پہنچا گزند
جھکا اپنے گھوڑے سے وہ ارجمند
مد دِ غیب سے اُسکی فوراً ہوئی
یکا یک غلام آن پہنچا کوئی
لیا اپنے مالک کو فوراً سنبھال
کسی پر نہ ہرگز کھُلا اس کا حال
سپہدار کا پھر نہ پایا نشاں
نہ آیا نظر کوئی غیر جواں

جس باغ میں مہاراجہ سردار سنگھ صاحب بہادر جودھپور کی برات اُتاری گئی تھی اُس باغ کی تعریف

مقام اِک جداگانہ ہے شہر سے
سہیلی کی باڑی سے موسوم ہے
تمام اُس کا سبزہ ہے زیرِ نظر
کھڑے جھومتے جابجا ہیں شجر
نئے رنگ کا ہے وہاں کا چمن
کہیں پر ہے نسریں کہیں نسترن
نمودار ہیں صاف قدرت کے کھیل
کہیں ہے چنبلی کہیں رائے بیل
گلاب اور گیندے کی رونق ہے خاص
چمن میں ہے حاصل انھیں اختصاص
نمودار نرگس کا ہے امتیاز
عیاں چشم ہے اُسکی واں نیمباز
صحن میں نمایاں ہے حوضِ کلاں
وہ ایسا ہے جیسے کہ دریا رواں
لگے اُس میں فوارے ہیں بیشمار
نئے طور کے ہیں وہاں آبشار
غرض ایسا ہے پُر فضا وہ مقام
ہُوا دولھا کا اِس جگہ پر قیام

راحت سیّد عابد حسین بریلوی ۱۸۲۰ء میں زندہ تھے اِس سے زیادہ کچھ حال معلوم نہ ہوا، یہ چند شعر اُنکے ہیں۔

حشر کے دن یہ کہونگا میں خدا سے پہلے
شکل محبوب دکھا اپنی لقا سے پہلے
پہلے مُنھ چوم لوں میں گالیاں و بنا پیچھے
چاہیئے جرم کا اثبات سزا سے پہلے
عارضِ حور کی تعریف نہ کر لے واعظ
کر مقابل مرے گُل کے کفِ پا سے پہلے

راحت لالہ بھگونت رائے راحت ولد منشی دیندیال رئیس قصبہ کاکوری نواح لکھنؤ آپ کو حضرت آغا حسن امانت لکھنوی سے تلمذ تھا اور فنِ سخن میں اچھی مہارت حاصل تھی

صاحب علم وفضل وناز کخیال وطبیعت دار شخص تھے، آپنے مثنوی "زہرہ وبہرام" اور مثنوی "گلدمن" لکھی تھیں جواب کمیاب ہیں۔ بعد تلاش ایک مثنوی "سوزِ عاشقانہ" دستیاب ہوئی۔ جس کا انتخاب ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے واجد علیشاہ کے زمانہ سلطنت میں حیات تھے بعد غدر انتقال کیا +

مظہرِ عشق یا خدا ہو دل — مصدر صدمۂ جفا ہو دل
کوچۂ عشق کا ہو رسوائی — روئے زیبا کا ہو تماشائی
گل پہ گل روز سینکڑوں کھائے — بےکلی سے ذرا نہ گھبرائے
لاکھ زخمی ہو خنجرِ غم سے — سیکڑوں کوس بھاگے مرہم سے
سینچے ہر دم لہو سے خاروں کو — خار دیتا رہے ہزاروں کو
گل پہ گل کھاکے مایۂ غم ہو — سبزۂ شاخِ نخلِ ماتم ہو
زخم اُس کا ہو رفو برسوں — اور ٹپکا کرے لہو برسوں
بس رہے غم کی آرزو برسوں — عیش کی ہو نہ جستجو برسوں
قبلۂ رُخ کے روبرو برسوں — چشمِ تر سے کرے وضو برسوں
بدلے رونے کی پھیر نہ خو برسوں — پائی اشکوں سے آبرو برسوں
مثلِ گل روئے زخم خنداں ہو — سوزشِ عشق سے نمک داں ہو
تڑپے اس طرح خاک پر مضطر — طعن کی جا ہو رقصِ بسمل پر
روز تشنہ رہا ہو تیرِ مژگاں سے — ہوئے سیراب آبِ پیکاں سے
آبِ شمشیر سے بجھائی پیاس — چاہ سے غرق خوں ہوئے وسواس
بیٹھے بیٹھے خدنگِ مژگاں کھائے — تو وہ خاکِ شوق سے بن جائے
شمع رخسار کا خیال رہے — غم سے پروانہ جمال رہے
زلفِ خمدار کا خیال رہے — غم سے پروانہ جمال رہے

بحر الفت میں آشنا ہو کر
مثل غواص بیدھڑک ہو کر
اسقدر عشق میں فنا ہو جائے
دامن دشت میں اڑائے خاک
آبلوں سے نقش اپنا جمائے
غم سے ہر داغ لالہ زار رہے
جوش پیدا ہو اس قدر غم کا
زلف خوباں ہو پاؤں کی زنجیر
چشم سے اسقدر ہو خوں فشاں
وہ ترقی پہ زور سودا ہو
وہ مزہ کوہ و دشت کا پائے
عاشق رنگ عارض گل ہو
عشق زہرہ جبیں ہو دامن گیر
سرو قد پر فدا ہو سو بار
اشک برسائے چشم گریاں سے
آتش عشق سے جلے ہمہ تن
فخر سمجھے سدا ملامت کو
شکل دولاب چرخ سی بنجائے
ایسا سوز دروں سے ہو بیتاب
کوئے دلدار کو حرم سمجھے
اُسکے کوچے میں جب گذر ہو جائے

کشتی درد کا بنے لنگر
جی پہ کھیلے وہ اپنے آٹھ پہر
اپنے خالق کا آشنا ہو جائے
بیکلی سے کرے گریباں چاک
ہر سر خار سے پتا ملجائے
درد و حرماں سے درد و زار رہے
رنگ سوسن ہو باغ ماتم کا
حلقۂ طوق ہو گریباں گیر
رشک گلزار ہو تن عریاں
جسکے نالے میں شور دریا ہو
رشک فرہاد و قیس بن جائے
گلشن درد و غم کا بلبل ہو
مثل ہاروت چاہ میں ہو اسیر
مثل قمری کرے نہ طوق سے عار
برق چمکائے آہ سوزاں سے
خرمن ننگ پر ہو شعلہ فگن
کھو دے سرمایۂ ندامت کو
در جاناں پہ روز چکر کھائے
غم سے بنجائے ماہی بے آب
جائے سجدہ در صنم سمجھے
صاف مر مر کے خاک در ہو جائے

شمع ساں ہو فدائے بیداری
ہو نمک پاشِ زخم پر ہر دم
سر میں ہر دم جنوں کا جوش رہے
ہر گھڑی صید چشمِ یار رہے
الغرض عشق ہو ترا یا رب
طاقتِ زورِ عشق دل پر دے
جبتلک اپنے تن میں جان رہے
دل میں اس لطف سے سما جائے
پی کے مے ساغرِ محبت سے
عاشقِ زار اب ترا ہوں میں
رائگاں کر نہ میری محنت کو

اشک سوتے میں بھی رہیں جاری
پر نہ دکھلائے صورتِ مرہم
دشمنِ صبر و عقل و ہوش رہے
چنگلِ باز کا شکار رہے
اپنا سودائی تو بنا یا رب
بے پر و بال ہوں مجھے پر دے
راتدن بس ترا ہی دھیان رہے
جس طرف دیکھوں تو نظر آئے
مست ہو جاؤں جامِ وحدت سے
ترے کوچے کا بس گدا ہوں میں
ذوق دے اپنے غم سے راحت کو

راحت۔ دہلی کے ایک نامعلوم ریختی گو تھے، کچھ منتخب کلام درج تذکرہ کیا جاتا ہے۔

جب سے وہ بانکا سجیلا دل کو ہے بھایا ہوا
میں اپنی ایڑی چوٹی پہ صدقہ کروں اسے
رو گی تم تو وہ آجائیگا بیٹا پھر ابھی

انگ لگتا ہی نہیں گوئیاں مرا کھایا ہوا
یہ مردوا نگوڑا تو لٹھ ہے گنوار کا
تم جو چپکی ہو رہی ہو آ کے ہتوا پھر گیا

دودھ لینے کا ارادہ تھا جو دوڑا یا تھا لٹھ
جورو بیٹی ماں بہن کا کچھ نہیں کرتے خیال
کونسی بھری کٹ ملک لوگو نبی بیٹھی رہوں
پوتی پوتوں والی ہو کر لال جوڑا پہنوں میں

لوچ لی انگیا مری دیکھو موئے بندر کی بات
گھر میں آکر صاف کہدیتے ہو تم باہر کی بات
نند کی باتیں سنوں ہے ہے کہ میں ڈیور کی بات
مجکو تو بچی یہ ڈھا چوچلا آتا نہیں

کھلا تو پوتا ، ہوئی پوری آرزو تیری
لحاظ آیا کسی کا نہ تجکو عصمت جان

دوگانا لعل سا بیٹا جنی بہو تیری
غلام سے گئی پکڑی جہنم میں تھو تیری

راحت۔ سیّد عابد حسین صاحب بریلوی ۱۸۷۰ء میں زندہ تھے اس سے زیادہ کچھ حال معلوم نہوا یہ چند شعر انکے ہیں۔

حشر کے دن یہ کہونگا میں خدا سے پہلے
شکل محبوب دکھا اپنی لقا سے پہلے

پہلے مُنہ چوم لوں پیچھے گا بیاں دینا پیچھے
چاہیئے جرم کا اثبات سزا سے پہلے

عارضِ حور کی تعریف نکر اے واعظ
کر مقابل مرے گل کے کفِ پا سے پہلے

راحت۔ محمد نثار علی صاحب رامپوری آجکل کے شعرا میں ہیں، تلمذ کا حال معلوم نہوا کہ کس سے ہے۔ یہ کلام ہے۔

کہتے ہیں جسکو محشر وہ دن بھی آرہا ہے
بیداد کرنے والے کیا تو سُنا رہا ہے

رنج و الم مصیبت دردِ فراق، الفت
وہ کیا جئے جو اتنے صدمے اُٹھا رہا ہے

میں نے ہی اُنکو چاہا دنیا سے کیا نرالا
مجھپر ہی یہ ستم کیوں ای چرخ ڈہا رہا ہے

ناز و نیاز دونوں ک لطف دیر ہے ہیں
وہ تیغ اُٹھا رہا ہے یہ سر جُھکا رہا ہے

ویران ہوگئے ہیں ان روزوں دیر و کعبہ
جو ہے وہ انکے در پر چکّر لگا رہا ہے

راحت۔ محمد رئیس الدین خان حضرت فیروز شاہ خاں فیروز رامپوری سے مشورۂ سخن کرتے ہیں ۱۸۹۸ء میں جوان تھے۔

اُدھر سے محتسب جب آج پھر احتساب اُٹھے
تماشا ہوا اُدھر سے رند بھی پیکر شراب اُٹھے

بھلا دُنیا میں کیا ندکو رہے اب اُسکے اُٹھنے کا
جو اُٹھے بھی ترا مقتول تو روزِ حساب اُٹھے

کوئی تدبیر ایسی ہو کہ وہ خلوت میں کُھل کھیلے
ادھر دل سے حجاب اُٹھے اُدھر رُخ سے نقاب اُٹھے

راحم۔ منشی شیخ رحیم بخش راحمؔ تاجر بافتا رو رئیس شہر کانپور وطن آبائی لکھنؤ ہے، مگر اب مدّت سے کانپور مسکن ہے انکا کارخانہ تجارت اسباب چرمی مشہور دیار و امصار ہے، اوائل عمر سے فن سخن کا ذوق رہا ہے منشی سیّد آغا علی شمس شاگرد ملک الشعرا قاضی محمد صادق خان سے تلمذ اختیار کیا، صاحبِ دیوان مطبوعہ ہیں شعرا کانپور میں اچھے ہیں موزونی طبع اور خوش زبانی کلام سے آشکار ہے، انتخاب دیوان ہدیہ ناظرین ہے۔

اے مسیحا ہو بُرا اس حسرتِ دیدار کا
دم لبوں پر آ گیا آخر ترے بیمار کا

کبتک ای قاتل نہ نکلے گی تمنا قتل کی
حشر تک دامن نہ چھوڑوں گا تری تلوار کا

خشک کامانِ شہادت کے گلے ہو جائیں تر
پانی اے قاتل جو مل جائے تری تلوار کا

ق

ترے مجروح کو شبِ مہ میں
ذوقِ جامِ شراب نے مارا

چاندنی گو ہے مہلکِ زخمی
پر مجھے آفتاب نے مارا

مُنہ اگر چوم لیا کیجئے عفو تقصیر
جُرم ہوتے نہیں دنیا میں بشر سے کیا کیا

طفلِ اشک آنکھ میں میری ہی کبھی وہ من میں
ناز کرتا ہے پسر اپنے پدر سے کیا کیا

بیکسی روئی سرِ تربت مجاور غم ہوا
دھوم سے اُسکے شہیدِ ناز کا ماتم ہوا

اُس کا حامی ہو ساقیِ کوثر
مجھکو دے جو بچائے آبِ شراب

شرم بھی آنکھ میں پردے سے نکلتے کیونکر
نہیں شرم نزاکت سہی چلتے کیونکر

نہ نزاکت سہی مہندی وہ لگاتے ہونگے
آ کے تلوؤں سے دلِ زار کو ملتے کیونکر

نہیں مہندی کسی غیر سے وعدہ ہوگا
صادق القول ہیں وعدے کو بدلتے کیونکر

نہیں وعدہ لٹیں شانوں پہ لٹکی ہونگی
بوجھ اُٹھا کر جو وہ چلتے تو سنبھلتے کیونکر

نہ کھُلی لٹ سہی گیسو کو بناتے ہونگے
کنگھی چوٹی کے وہ پیچوں سے نکلتے کیونکر

لو فرضنا کہ نکلنے بھی تو دانائی سے
مونگ چھاتی پہ رقیبوں کی وہ دلتے کیونکر

ساغر و شیشے کو کیوں توڑتا ہے عہد شکن
توڑتا ہے جو مجھے تو دلِ اغیار کو توڑ

بجھائیں تشنگانِ وحشتِ اُلفت پیاس مقتل میں
سبیل اک فی سبیل اللہ رکھدی آبِ خنجر کی

راز

راز۔ مرزا حاجی راز گورگانی دہلوی۔ مرزا رمضانی کے بیٹے اور مرزا صابر کے شاگرد تھے نظام الدین اولیا کی درگاہ کے قریب رہتے تھے۔ کئی برس ہوئے انتقال کر گئے۔

پھر دلِ سودائی کو اس زلف کا سودا اُٹھا
بیٹھے بٹھلائے یہ کیسا دردِ سر پیدا ہوا

اب تو میری طرح بے چین وہ رہنے لگے
یہ ہمارے آہ و نالہ کا اثر پیدا ہوا

کوچہ و بازار ہیں جن کے سبب رسوا ہُوا
جان و دل دونوں فدا کر دیئے اُس پر ہم نے
میرے ہی دم تلک آباد رہے گا گلشن

پھر اسی غارتگر دل پر یہ دل شیدا ہُوا
اس طرح کوئی سہے گا نہ جفا میرے بعد
کو بکو خاک اُڑائے گی صبا میرے بعد

راز

راز۔ عالیجناب صاحبزادہ محمد عبید اللہ خاں صاحب بہادر فیروز جنگ، سی، ایس، آئی فیلو پنجاب یونیورسٹی متخلص بہ راز خلف نواب وزیر الدولہ مرحوم والی ٹونک ایس پریسیڈنٹ کونسل و مدار المہام ریاست ٹونک، نواب ابراہیم علیخاں بہادر والی حال ٹونک کے عم بزرگوار تھے جنگ کابل ۱۸۷۹ء میں جبکہ ان کی صرف تیئس برس کی عمر تھی صاحب زادہ موصوف نے سرکار انگلشیہ کی نمایاں خدمات کی تھیں جس کے صلہ میں خلعت فاخرہ و خطاب و دولت انگلشیہ نے عطا کیئے، صاحبزادہ موصوف غالباً فن شعر میں منشی سلیمان خان اسد لکھنوی سے مشورہ کرتے تھے۔ نواب صاحب کی اپنی ذاتی جاگیر اُنیس ہزار سالانہ کی تھی علاوہ ازیں آٹھ سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ ریاست سے ملتا تھا۔ سر نیویل چیمبرلین کی سفارت کے ہمراہ ۱۸۷۸ء میں کابل گئے واپسی پر ریاست کی طرف سے افتخار الامرا فخر الملک فیروز جنگ کے خطاب سے مفتخر ہوئے ستمبر ۱۹۰۷ء میں انتقال فرمایا۔ تا دم رحلت وزارت کے عہدے پر فائز رہے پچاس برس سے کچھ کم عمر پائی۔

جو دوست تھے دلی وہ سب اغیار بن گئے
روئے جو ہم تصور دندان یار میں
بیٹھے بٹھائے رنج اُٹھائے ستم سہے
چتون وہاں پھری کہ یہاں دل ہوا دو نیم
مجھ سے کس روز ہوئی آپکی چتون سیدھی
با کلیم ایک ہی جلوہ نے یہ ہیبت چھائی
آب خنجر نے ترے پیاس بجھائی دم نزع

بہکانے والے آپکے سب یار بن گئے
آنسو کے قطرے موتیوں کے ہار بن گئے
دل دیکے تم کو مفت گنہگار بن گئے
ابرو وہ میرے واسطے تلوار بن گئے
کس دن انداز ادھر کج نظری کے نہ رہے
دل میں پھر حوصلے باقی ارنی کے نہ رہے
شاکی او ترک ہم اب تشنہ لبی کے نہ رہے

راز

راز۔ عالیجناب نواب مرزا عباس علیخان بہادر راز عرف نواب سلطان صاحب خلف نواب محمد رضا خان عرف نواب شمشاد الدولہ بہادر رئیس لکھنؤ شاگرد حضرت جلال لکھنوی۔ کلام میں کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں موزوں طبع بیشک ہیں۔ دس برس ہوئے انتقال کیا۔

تجھے بھی کچھ خبر او بے خبر ہے	کہ کیا کیا تیرے چرچے ہیں جہاں میں
خدایا خیر ہو دل آج میرا	لیئے جاتا ہے پھر کوئے بتاں میں
نظر ملتے ہی پہلو میں نہ تھا دل	غضب کا سحر ہے چشمِ بتاں میں

وفا کے نقش بھی دل سے مٹائے دیتے ہیں	مجھے وہ یاد سے اپنی بھلائے دیتے ہیں
میں باز آیا نصیحت سے آپ کی ناصح	مرا تو آپ کلیجہ پکائے دیتے ہیں
خیال انکا کروں یا گناہ کو دیکھوں	لبوں سے وہ مرے ساغر ملائے دیتے ہیں

جسکو تلووں سے تو نے مل ڈالا	تھی اسی دل میں آرزو تیری
یوں کیا ایک بے گناہ کو قتل	مچ گئی دھوم چارسو تیری

راز

راز۔ سید فیاض احمد راز سب انسپکٹر پولیس کھیڑی، منشی طفیل احمد کے بیٹے اور ریاض خیرآبادی کے حقیقی بھائی خیرآباد کے قدیم باشندے اور منشی امیر مینائی کے تلامذہ میں ہیں سنہ ۱۸۶۰ء سالِ ولادت ہے، آدمی ذہین اور خوش فکر ہیں۔ یہ کلام کا انتخاب ہے۔

تم جو اٹھے جگر میں ٹیس اٹھی	درد بھی اٹھ کھڑا ہوا دل کا
دلِ عاشق میں ناز سے آؤ	لطف خلوت میں آئے محفل کا
سخت جانی یہ تھی کہ مان گئی	تیغ لوہا تمہارے بسمل کا

کوچۂ دشمن میں دل اے دلربا جاتا رہا	ہاتھ سے میرے تمہارا آشنا جاتا رہا
خونِ دشمن کی ملی مہندی نہ تونے ہاتھ میں	بعد میرے کیا تجھے شوقِ حنا جاتا رہا
طور پر بیخود ہوئے موسیٰ تو کیا اے برقِ طور	دیکھنے والوں کا اسکے حوصلہ جاتا رہا
ہے آج شب وصلِ عدو اس کی سحر ہو	راضی ہوں نہ ہو میری شبِ غم کی سحر آج

یہ کس کے کوچے سے پامال ہو کے اُٹھی ہے　　کہ چھا رہی ہے مری خاک آسماں ہو کر

اُلجھائے ہوئے چلتے ہیں دل زلفِ رسا ہیں
ہم لوگ لگاتے ہیں گرہ موجِ ہوا ہیں
کھینچے تو بہت زور سے کعبے ہیں موذن
پر اُسنے نہ نکلتا رہا ناقوس صدا ہیں
اُٹھ چلنے کو جوبن نے انھیں اور اُبھارا
آئی جو جوانی تو بھرے اور ہوا ہیں
کس پیار سے کس شوق سے سو بار بلایا
لائے راز نہ آیا اثر آغوشِ دعا ہیں

سب نہ دنیا فلکِ پیر مرے دشمن کو　　تھوڑی تھوڑی رہے ہر رنج ہیں شرکت میری

تیغ نظر سے پھولوں کے ٹکڑے اُڑا دیئے
لڑوا گئے چمن ہیں مجھے عندلیب سے
اظہارِ دردِ دل پہ کہا مسکرا کے یہ
کہدینگے جاکے حال تمھارا طبیب سے
جلوہ کسیکی برقِ تجلی کا اے کلیم
دیکھا ہے تمنے دور سے ہینے قریب سے
حضرتِ دل مچلے ہیں جنکے لیئے
کچھ کریں وہ بھی علاج انکے لیئے
شیخ جی! تقوی جوانی ہیں ہو کیا
ہے تقدس آپکے سن کے لیئے
مرغوب کسی بت کو ہے فریاد کسیکی
محبوب کسی دل کو ہے بیداد کسیکی
تو بھی کوئی معشوق ہے شوخی و ادا ہیں
بنتھ ہیں بھی ہے خو بودلِ ناشاد کسیکی

راز　**راز** منشی امتیاز احمد خاں صاحب عرف پیارے خاں رامپوری، ریاستِ رامپور وطن ہے اور وہیں رہتے ہیں۔ آپکا عرف بہت مشہور رہے، آپ پہلے میاں احمد علی صاحب رسا سے تلمذ رکھتے تھے، پھر منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی کے زمرۂ تلامذہ ہیں داخل ہو گئے۔ آپ مدتوں منشی صاحب مرحوم کے رفیق و ہم صحبت رہے اور مشاعروں ہیں ساتھ شریک ہوئے ہیں آپنے جسقدر اپنے اُستاد سے فیض حاصل کیا ہے چند خاص تلامذہ کے علاوہ اور کسی کو حاصل نہیں ہوا، آپکے کلام کا رنگ امیر مینائی کے کلام سے بہت ملتا ہے اور چستی بندش اور شوکتِ الفاظ بہت ہی ہمیشہ مضمون لکھتے ہیں اور بہت اچھا لکھتے ہیں۔ آجکل ٹھیکہ داری دیہات کا شغل ہے۔ کسی خاص وجہ سے آپنے پانچ چھ سال سے شاعری کی طرف توجہ کم کر دی

ہے۔ کبھی شاذ و نادر شعر کہہ لیتے ہیں، ہاں اپنے تلامذہ کو برابر اصلاح دیتے ہیں۔ آپ مشاعرہ میں کبھی شریک نہیں ہوتے اور اپنے کلام کی شہرت سے بہت بچتے ہیں، آپ نے کلام کے جمع کرنے کی طرف کبھی توجہ نہیں کی، جس دوست یا شاگرد کے ہاتھ لگا وہ لیگیا، بڑی کوشش سے جسقدر ہاتھ لگا اُس کا انتخاب درج ذیل کیا جاتا ہے۔

ہوا ازل میں جو تقسیم حسن اعضا کو
تری کمر کے بھی حصہ میں بال بھر آیا

خیال میں بھی جو آئی ہے شکل عاشق کی
جھجک کے کہتے ہیں تو کون ہے کدھر آیا

خبر بتوں کی جو لایا ہزاروں سجدے کیے
صنم کدے سے خدا ہو کے نامہ بر آیا

نکل کے شانہ کی گلیوں سے جب چلا گیسو
اُلٹ کے شانے پہ دل میں مرے اُتر آیا

یہ کون حشر میں فریاد کرنے آتا ہے
پکارتی ہے خموشی ارے کدھر آیا

قصور عشق درم قتل بخشوانا ہے
لٹک کے سر مرا قاتل کے پاؤں پر آیا

ہوائے شوق میں دونوں بڑھے تیز رو لیکن
تمھارے کوچے میں پہلے قدم سے سر آیا

اُٹھے جو بزم سے در پر لگا لیا بستر
کہ راز دل سے نکل کر زبان پر آیا

ضیائے رُخ نے چڑھائی ہے نور کی چادر
مرادیں مانگتے یہ کون قبر پر آیا

ہوئی جو راہِ خودی طے تو یار تک پہنچے
بڑھے جو آپ سے آگے تو اپنا گھر آیا

باہیں گلے میں ڈال کے منہ چوم ہی لیا
فرمایئے وہ آپ کا انکار کیا ہوا

رولا کر مجکو وہ سب بے درد بولا
ہنسی کی بات کا شکوہ نہ کرنا

وہ منت سے ترا محشر میں کہنا
ترے صدقے مجھے رسوا نکرنا

محبت راز کی تم دل میں رکھنا
کبھی اِس راز کو افشا نہ کرنا

اے عشق قبر حسرتِ مردہ کی یوں بنا
چھوٹا سا آبلہ ہو دلِ بیقرار کا

لڑے جو اُنسے نظر ضبط آہ کر لینا
کلیجہ تھام کے نیچی نگاہ کر لینا

بُرے ہیں ہم تو پھر اچھا بُرے کہاں جائیں
بُروں سے بھی ہے مناسب نباہ کر لینا

پرانی رسم ہے زاہد نہ چھوڑنا اسکو — ارے بہشت میں بھی کچھ گناہ کر لینا
عصا بھی چاہیئے بیمار کے سہارے کو — اُٹھے جو آنکھ تو نیچی نگاہ کر لینا
وہ دل میں آتے ہیں ای چشم خاک آلودہ — بہا کے اشکِ طرب صاف راہ کر لینا
کسی کا آنکھ چرانا وہ چھپ کے غیروں سے — وہ مجھکو دیکھ کے نیچی نگاہ کر لینا

سلام

عباس کو دریا کی لڑائی تھی تماشہ — پانی میں نظر آتے تھے خنجر تہِ خنجر
بلبل کیطرح مست تھا قاتل بھی مہک سے — حضرت کا گلا تھا کہ گلِ تر تہِ خنجر
ڈوبے جو لہو میں شہِ دیں شمر پکارا — مریخ بنا مہرِ منور تہِ خنجر
حضرت کا گلا موج تھا دریائے کرم کی — فوارۂ رحمت ہوا آ کر تہِ خنجر
اے راز ہے یوں مصرعِ روشن تہِ مصرع — جس طرح چمکتا ہوا خنجر تہِ خنجر

لپٹے تھے ایک روز کسی کی کمر سے ہم — ابتک چھپے ہوئے ہیں خود اپنی نظر سے ہم
دب دب گئے ہیں ضعف میں بار نگاہ سے — کٹ کٹ گئے ہیں جنبشِ تیغ نظر سے ہم
آ کر شبِ وصال اجل کیا بنائیگی — چھپ جائینگے لپٹ کے تمھاری کمر سے ہم
حسرت نہ تھے رقیب کے دل کی گرہ نہ تھے — حیراں ہیں کیوں نکالے گئے اُنکے گھر سے ہم
گیسو نہ تھا جو سر پہ چڑھا یار رقیب کو — آنسو نہ تھے جو گر پڑے اُنکی نظر سے ہم
وہ وہ سنائی ہیں کہ بہت ہی کرے گا یاد — اے راز آج خوب ہی دشمن پہ برسے ہم

ستم میں بھی تو پہلو اُنکی زینت کے نکلتے ہیں — ہمارے خوں شدہ دلکو حسیں تلووں سے ملتے ہیں
سہارے سے کسی کے ناتواں رستے میں چلتے ہیں — عصا تھامے مژہ کا آنکھ سے آنسو نکلتے ہیں
شگافِ سینہ، سوراخِ جگر، چاکِ دلِ عاشق — محبت کی گلی سے سیکڑوں رستے نکلتے ہیں
تمھاری مانگ کے عاشق ہیں شیخ و برہمن دونوں — یہ وہ رستہ ہے جس میں دوست دشمن ملکے چلتے ہیں
یہ کس بدمست کی ہے پیشوائی کون آتا ہے — کہ اُٹھا ابر نکلی شیشے سے مے جام چلتے ہیں
کھٹک آج آنسوؤں کی دے رہی ہے یہ خبر مجھکو — چھپے تھے دل میں جو کانٹے وہ آنکھوں سے نکلتے ہیں

پڑی پھر دستِ نازک پر مصیبت کنگھی چوٹی کی
وہ بولے کیا ہی جلکر وصل کی شب جب ذرا چھیڑا
کوئی حسرت نہیں نکلی کوئی ارماں نہیں نکلا
یہ اس الفت کے صدقے ہوں ہیں اس نفرت کے قربان

وہ کیا چھپنائے ہیں مہندی چھڑا کر ہاتھ ملتے ہیں
الٰہی ٹوٹ جائیں ہاتھ ظالم کیسے چلتے ہیں
محبت میں حسینوں کی فقط آنسو نکلتے ہیں
جگہ ہو راز کی دل میں مگر صورت سے جلتے ہیں

اِنکارِ وصل جان ہی لیکر رہیگا آج
آئینے اُنکے آپ ہی میں ہم نہیں رہے

اب کیا کرو گے آکے وہ جھگڑا ہی مٹ گیا
ہے اپنے بعد بھی وہی رنگ اُنکی بزم کا

عکسِ رُخِ نگار ہے جامِ شراب میں
جب کہا "جان ہو قربان" تو جلکر بولے

یہ جو مُنہ پھیرے دمِ نزع الگ بیٹھے ہیں
صدقے ساقی چشم مے آشام کے

راز کو سب دل میں دیتے ہیں جگہ
چاہنے والے کی ہر ایک تمنا ہے بھلی

لاکھ جانیں مری قرباں ہوں اِس رونے پر
وہ عجب در ہے کہ مانگے نہیں عزت جاتی

بٹھایا ہے کس کسکو پہلو میں اُنکے
بُرا ہو ترا گردشِ آسمانی

دمِ واپسیں منتظر ہوں کسیکا

ابکے "نہیں" زباں پر آئی کہ ہم نہیں
جب وہ نہ تھے تو ہم تھے جو وہ ہیں تو ہم نہیں

جو کبھی ڈھونڈتی تھیں تھیں اُنمیں دم نہیں
جلسے وہی ہیں لوگ وہی ایک ہم نہیں

یا آفتاب ہے قدح آفتاب میں۔
"جاں تو ہم ہیں تمھاری ہمیں قربان کرو"

اُلٹے کہدے کوئی وہ مشکل مری آساں کرو"
ایک دو گھونٹ اِس چھلکتے جام کے

آپ کیوں دشمن ہیں میرے نام کے
آپ پورا جسے کردیں وہ سوال اچھا ہے

آپ آنسو نہ بہائیں مرا حال اچھا ہے
اپنے اللہ سے ہر ایک سوال اچھا ہے

اُٹھاتا ہے حشر آسمان کیسے کیسے
کہ وہ پھر گئے پھر یہاں آتے آتے

تھیں اِس لئے ہچکیاں آتے آتے

قتل کرکے میرے قاتل کو پشیمانی ہوئی
شغلِ مے نے رنگ و روغن شیخ کا چمکا دیا

نیچی نظریں کہہ رہی ہیں سخت نادانی ہوئی
لوگ سمجھے ذکرِ حق سے شکل نورانی ہوئی

اُن کو آنکھوں میں جو رکھا ہے تو نظریں لوٹ ہیں
ایسے للچائے ہُوں سے بھی نگہبانی ہوئی

بے سبب اُس در پہ اپنی جبہہ فرسائی نہ تھی
مٹ گیا قسمت کا لکھا صاف پیشانی ہوئی

دشت سے جاتا ہوں گھر کو کچھ تو تحفہ چاہیئے
خاک تھوڑی سی گرہ میں باندھ لوں چھانی ہوئی

ہوش میں آیا دلِ بے خود تو وحشت بڑھ گئی
ڈوب کر کشتی مری اُچھلی تو طوفانی ہوئی

دل جگر دونوں کو غم اُس دوست کا چٹ کر گیا
خانہ ویرانی ہوئی اچھی یہ مہمانی ہوئی

رو رہا ہوں دوستوں کی سرد مہری دیکھکر
جسقدر گاڑھی چھنی تھی اُتنی ہی پانی ہوئی

اللہ اللہ آپ کی زلفِ پریشاں کا اثر
بس بے گر سر کی قسم کھائی پریشانی ہوئی

کھنچ گئے دل سب کے کچھ ایسی کھنچی تصویر یار
صدقے خاموشی ہوئی قربان حیرانی ہوئی

راز نے کیا کہدیا چپکے سے اُنکے کان میں
اُٹھ گئے شرما کے کچھ ایسی پشیمانی ہوئی

جمی جس دن سے آکر خانہ دل میں نہیں نکلی
کسی پردہ نشیں کی یاد بھی پردہ نشیں نکلی

راز منشی محمد حسین خاں راز جلال آبادی شاگرد حضرت احسان شاہجہاں پوری باوجود تلاش حال نہ ملا۔ یہ غزلوں کا خلاصہ ہے۔

ہمیں وہ خانۂ صیاد میں ملا آرام
خیال دل میں نہ آیا کبھی رہائی کا

تمنا اُن کی بر آئے الٰہی
بلا سے جان جائے عاشقی میں

فصلِ بہار میں تو اسیروں کو چھوڑ دے
صیاد تیرے دل میں ترحم ذرا نہیں

کرو تم گرفتار زنجیرِ گیسو
کہ ہم وحشیوں کی سلاسل یہی ہیں

دیوانہ ہوا جاتا ہے مجنوں کی طرح دل
یہ بھی کسی صاحبِ محمل کے لیئے ہے

راز جناب شیخ عنایت اللہ صاحب سکندر آبادی تلمیذ حضرت خورشید سکندر آبادی۔ رسالہ "ید بیضا" میں چند غزلیں نظر سے گذریں اُن کا انتخاب ضبط تحریر میں آیا۔

اذیت پاک باطن کو نہیں ہوتی ہے دشمن سے
کہ دامانِ نگہ کسدن ہے اُلجھا خارِ مژگاں میں

غضب ہے راز اتنی بات پر تم جان دیتے ہو
کہ بہر فاتحہ وہ آئیں گے گورِ غریباں میں

بہت دیکھا مگر اے بیوفا تجھسا نہیں دیکھا — حسینوں میں حسیں کوئی جوانوں میں جواں کوئی
یہ سچ ہے رازؔ تم کو اس بتِ بدخو سے الفت ہے — بھلا بے وجہ کھاتا ہے کسی کی گالیاں کوئی

راز

رازؔ حکیم محمد باقر صاحب لکھنوی شاگرد جناب رشیدؔ لکھنوی۔ بار بار احباب لکھنؤ سے اِن کے حالات دریافت کئے اور خود انکو بھی رشیدؔ صاحب کی معرفت خط بھیجے مگر کوئی جواب نہ ملا۔ لاچار صرف کلامِ منتخب پر اکتفا کیا جاتا ہے، ذکی، طبّاع اور خوش کلام سخنور معلوم ہوتے ہیں اور اُستاد کے فیضانِ صحبت کا اثر بھی کلام سے پیدا ہے۔

کافی ہے یہ کہ آپ پہ دل مبتلا ہوا — اب کیا بتائیں آپ سے ہم اور کیا ہوا
دلبر جو ہاتھ آپنے رکھا تو کیا ہوا — پہلے سے اور دردِ محبت سوا ہوا
اُٹھ اُٹھ کے خفتگانِ زمیں دیکھنے لگے — کس کے خرامِ ناز سے محشر بپا ہوا
یارب یہ کیسی آگ تھی دل میں کہ روزِ حشر — نکلا مزار سے مرا لاشہ جلا ہوا
ہو دل کا حال چہرے کی زردی سے آشکار — لے رازؔ دردِ عشق چھپایا تو کیا ہوا
جو چُپ[لہ] ہوگی زبانِ تیغ محشر میں تو کیا ہوگا — پکاریگا شفق بن کر لہو قاتل کے داماں کا
تغافل کی کوئی حد ہے لحد پر فاتحہ پڑھنے — وہ کب آئے نشاں جب مٹ گیا گورِ غریباں کا
الٰہی خیر ہو کیوں خود بخود دل منہ کو آتا ہے — بندھا ہے ہچکیوں کا تار گھبراتا ہے دم میرا
کہوں اے شمع کس سے قصّہ سوزِ دروں اپنا — نہیں جز بیکسی کوئی انیسِ شامِ غم میرا
یہ بہار خار بنکر تری آنکھ میں کھٹکتی — جو ہماری طرح نرگس تجھے انتظار ہوتا
کشتگانِ نرگسِ مخمور کو ہنگامِ حشر — فرشِ خوابِ مرگ سے اُٹھنا گراں ہو جائیگا
وقتِ پیمانِ وفا اتنا بھی اُسنے کہدیا — دل سلامت ہے تو اک دن امتحاں ہو جائیگا
تیرِ جاناں جبکہ کھٹکا دلمیں مجھسے بولی تو — اب علاجِ شدّتِ دردِ نہاں ہو جائیگا

کہیں سودائیانِ عشق بھی پابند ہوتے ہیں — بچھائے لاکھ کوئی سلسلہ زلفِ پریشاں کا
الٰہی کیوں مرے دلمیں خلش رہ رہ کے ہوتی ہے — ملا ہے خارِ حسرت میں مزہ کیا تیرِ جاناں کا

لہ امیرؔ مینائی کے مشہور مطلع سے مضمون لڑ گیا ہے ⁂

چمن میں ایک جنوں بیساختہ گل کو ہنسی آئی
کوئی ٹانکا جو ٹوٹا بخیۂ چاکِ گریباں کا

پسِ مُردن چڑھائے بیکسی نے پھول حسرت کے
بندھا تربت پہ سہرا تارِ اشکِ شمعِ گریاں کا

دل وجاں کوچۂ قاتل میں ہم اے راز کھو بیٹھے
لُٹا تاریک شب میں قافلہ اُمید وارماں کا

خیر ہے یہ آپ کیوں گھبرا گئے ہنگامِ حشر
ہاتھ میں مجنوں کے لیلیٰ کا گریباں دیکھکر

کیا کریں کیونکر بچیں مینا و مے سے ناصحو
ٹوٹ ہی جاتی ہے توبہ بزمِ رنداں دیکھکر

کیسے وہ دن تھے یہ اپنی زندگی کی کائنات
صبحِ محشر ہمنے دیکھی شامِ ہجراں دیکھکر

شہر سے گھبرا کے نکلا تھا کہ آفت آگئی
پاؤں پھیلانے لگی وحشت بیاباں دیکھکر

بات کیا ہے کوئی پوچھے تو مسیحا سے ذرا
روئے دیتے ہیں رُخِ بیمارِ ہجراں دیکھکر

غضب ہو جان لے لیتے ہیں یہ بت دلربا ہوکر
الٰہی دی یہ قدرت تو نے بندۂ خدا ہوکر

یہ کیا آخر ہوا ناکام کیوں شرما کے جاتے ہو
لٹے وعدے سے تم تو آئے تھے تیغ آزما ہوکر

تھی اُمید لیکن بعدِ مردن روحِ عاشق کو
کیا مسرور ہا سے رونقِ بزمِ عزا ہوکر

بس اس اُمید پر عاشق تمھارے مٹتے آخر
کہ شاید ہو کبھی اپنی رسائی خاکِ پا ہوکر

وہ بت اور اے دل پسیجے کسی سے
یہ ہم ہیں کہ پتھر کو پگھلا رہے ہیں

عدم کے جانیوالو اک ذرا دم بھر ٹھہر جاؤ
کہ ہم بھی ساتھ چلنے کے لیئے تیار بیٹھے ہیں

بہت کچھ دلمیں لیکر آئے تھے لیکن کہیں کیونکر
کوئی اپنا نہیں محفل میں سب اغیار بیٹھے ہیں

پُوچھا جو میں نے دل کا پتہ کچھ بتایئے
بولے مجھے خبر نہیں ہوگا یہیں کہیں

اے نیند ایک چشم زدن کو تو آ کبھی
شاید کہ آئے خواب میں وہ نازنیں کہیں

دل سے چلے ہیں اشک بجھانیکے واسطے
سوزِ جگر سے آگ لگی یا یقیں کہیں

چلا جب خاک اُڑانے تیرا سودائی بیاباں کو
پکاری روحِ مجنوں چاک کر وحشی گریباں کو

پسِ مردن وہ کب آئے لحد پر فاتحہ پڑھنے
فلک جب بے نشاں بھی کر چکا گورِ غریباں کو

نہ جنت سے غرض اے راز مطلب ہے نہ دوزخ سے
یہ کس کافر کے پیچھے چھوڑ بیٹھے دین و ایماں کو

نہ آئے دیکھنے کو، آ بیٹے جنازے پر
وہ دل جلا ہوں چھری پھیریئے جو گردن پر

نیاز مند کی کوئی تو آرزو نکلے
کٹیں رگیں تو عوض خون کے دھواں نکلے

پان کھا کر جو کوئی آتا ہے
کس سے پوچھے کوئی حقیقتِ عشق
چل بسا اب ترا مریض فراق

خون ہنس ہنس کے وہ رلاتا ہے
دیکھئے جس کو اپنی گاتا ہے
اور دم بھر دم آتا جاتا ہے

نشۂ مے سے نہ تھے ہوش بجا بھول گئے
میرا افسانہ انھیں اور تو سب یاد رہا
میری قسمت! میری تقدیر! مقدر میرا!

رات کی بات بھی کچھ یاد ہے یا بھول گئے
حرف مطلب پہ جب آئے تو کہا بھول گئے
دل کے دیتے ہی وہ سب عہد وفا بھول گئے

یہ جو فسوسناک حالت ہے
کھینچکر تیغ وہ یہ کہتے ہیں

حضرت عشق کی بدولت ہے
کون آمادۂ شہادت ہے

دل کے حالوں سے انکی کوچے ہیں
اک ذرا سا سوال ہوتے ہیں

شور ہنگامۂ قیامت ہے
اور نہ کچھ عرض ہو نہ حاجت ہے

راز۔ جناب علی احمد صاحب راز سکندرہ حال باوجود کوشش نملا طبیعت کا رنگ کلام سے ظاہر ہے

آنکھیں تو گئیں ہائے مگر دیدۂ دل ہیں
آندھی کی ہوا برق کا دم دیکھ چکے ہیں
وہ مجبور ہے نخوت ہیں کسے چھیڑ رہے ہو
اے راز ضعیفی ہے مگر جی کو نہ ہارو

باقی ہے وہی حسرت دیدار کسیکی
آگے نہ بڑھی عمر سے رفتار کسیکی
مانے گا نہ مست مئے پندار کسیکی
دیکھ آئیں چلو گرمی بازار کسیکی

راسخ۔ سخن سنج باکمال شیخ غلام علی صاحب راسخ عظیم آبادی، شاگرد رشید ملک الشعرا میر تقی میر دہلوی، نامور شعرائے سلف میں سے گذرے ہیں، صاحب دیوان تھے اور اپنے وقت کے استادوں میں شمار کیئے جاتے تھے، بزرگوں کا وطن شاہجہاں آباد تھا۔ لیکن انکی ولادت پٹنہ عظیم آباد میں ہوئی، ابتدائے مشق میں میر و سودا کے ہمعصر، شاہ گھسیٹا عشق کے شاگرد میرزا محمد علی فدوی اور میرزا اشرف کو غزلیں دکھائیں لیکن خدائے سخن میر تقی میر سے شرف تلمذ حاصل کرنے کے بعد اس امر کا اعلان پسند نہ کیا اور تا دم اخیر

میر صاحب مغفور کی عقیدتمندی کا دم بھرتے رہے جسکا نیازمندانہ اعتراف انکی غزلیات کے متعدد مقطعوں سے ہوتا ہے، میر صاحب موصوف کی خدمت میں پہلی مرتبہ شرف باریابی حاصل کرنے کا حال بیان کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ مشہور ہے کہ جب شیخ صاحب دلی میں وارد ہوئے اور میر صاحب کے اشتیاق ملاقات میں آنکے در دولت تک پہنچے تو باریابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ کیونکہ میر صاحب جس طرح سخنوری میں بیعدیل تھے اسی طرح نازک دماغی اور تنک مزاجی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے پھر شیخ صاحب جیسے گمنام مسافر کی رسائی انکے حضور تک کیونکر ممکن تھی، آخر جب کوئی صورت نظر نہ آئی تو شیخ صاحب نے یہ شعر بہ تقریب حصول ملاقات ایک ماما کے ہاتھ لکھکر ارسال خدمت کیا۔

خاک ہوں پر توتیا ہوں چشم مہر وماہ کا	آنکھ والا رتبہ سمجھے مجھ غبار راہ کا

میر صاحب ہزار مغرور اور مستغنی المزاج آدمی تھے مگر کمال اور اہل کمال کے قدردان تھے۔ بیتابانہ باہر نکل آئے ڈیوڑھی میں بوریہ کا فرش بچھایا گیا اور دونوں باکمال ایک جا ہوئے۔ راسخ مرحوم نے اپنا دیوان بنظر اصلاح پیش کیا۔ میر صاحب نے جابجا سے دیکھکر فرمایا "وہ بھی تم سمجھے بوجھے آدمی ہو تمھیں اصلاح کی کیا ضرورت" شیخ صاحب نے اصرار کیا کہ کچھ تو دست مبارک سے بناکر عزت افزائی فرمایئے۔ صاحب "نوائے وطن" لکھتے ہیں کہ میر صاحب نے دست خاص سے اس شعر کو "مرتے دم اُن کا ذکر جب آیا زبان پر + نیند آگئی ہمیں تب اسی داستان پر" یوں اصلاح فرمائی +

"تا خواب مرگ ذکر تھا اُن کا زبان پر	نیند آگئی ہمیں تو اسی داستان پر

اور اپنا دیوان عنایت کرکے کہا کہ "یہی تمہاری اصلاح کیا کرے گا"

حضرت راسخ ۱۱۶۲ھ میں پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ایک یہ بھی روایت ہے کہ موضع "سائین" جو پٹنہ سے دس کوس کے فاصلہ پر ہے آپکا مولد ہے ۱۲۲۱ھ تک مختلف مقامات مثلاً کلکتہ غازیپور، لکھنؤ اور دہلی کی سیاحت میں مصروف رہے، آخر کار ۱۲۲۲ھ میں اپنے وطن مالوف

کی طرف مراجعت کی، اُس زمانہ میں پٹنہ مرجع ارباب کمال تھا اور شاعری کا تمام امیرزادوں اور رئیس زادوں میں رات دن چرچا تھا، ایسی پُرلطف صحبت پاکر یہیں کے ہو گئے، اور عمر کا بقیہ حصہ یہیں گذرا۔ آپ میانہ قد، گندمی رنگ، آزاد طبیعت انسان تھے عظیم آباد پٹنہ کے اکثر مشاعروں میں شریک ہوکر داد سخن دیتے رہے، بزم سخن میں دوزانو بیٹھے رہتے تھے اور جب شعراء غزلیں پڑھتے تھے تو یہ آنکھیں بند کئے جھوما کرتے تھے، اپنی غزل پڑھتے وقت آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھ جاتا تھا اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ دو چار ہی شعر پڑھکر رک جاتے تھے۔ بیشتر کلام تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے جس سے آپکے صوفی المشرب ہونے کا پتہ چلتا ہے، بعہد پیرانہ سالی ۷۶ برس کی عمر پاکر ۲۲ رجمادی الآخر ۱۲۳۸ھ میں واصل بحق ہوئے اور محلہ لودی کٹرہ عظیم آباد میں دفن ہوئے ۱۳۱۱ھ میں انکا کلیات خیر المطابع عظیم آباد سے چھپکر شائع ہوا ہے۔ ۷ مثنویاں بھی ان سے یادگار ہیں، جملہ اصناف سخن میں دسترس تھی۔ مثنویوں کی وہی زبان ہے جو میر کی ہے۔ فصاحت و شیریں زبانی مضمون کی پاکیزگی و سلاست بیان انکی شاعری کا خاص جوہر ہیں اور زبان اور مضمون کی متانت دوش بدوش ہے۔ حضرت راسخ بڑے آزاد مزاج تھے مرتے دم تک کرایہ کے مکان میں رہے، موسیقی سے کچھ لگاؤ تھا۔ چنانچہ سنا ہے کہ جبتک سُروں سے دل گداز نہو جاتا شعر گوئی کی طرف متوجہ نہوتے تھے، یہ بھی سنا ہے کہ جب مہین کُرتہ پہنے ہوتے تو انکے قلب کی تڑپ لوگوں کو محسوس ہوتی۔ مشاعرہ میں غزلخوانی کے وقت شاعر کی تعریف کرنا خلاف ادب مشاعرہ سمجھتے تھے، البتہ بعد اختتام صحبت کلمات تحسین و آفرین ادا کرنے میں دریغ نفرماتے اولیاء اللہ کے مزاروں سے بھی بڑی عقیدت تھی اور اکثر گھنٹوں ایسے مقامات پر اپنا کلام پڑھا کرتے تھے، کلام کا انتخاب ہدیۂ ناظرین ہے۔

رُخ زیبا دیا گل کو، دلِ بے صبر بلبل کو	اسے خنداں کیا پیدا اُسے نالاں کیا پیدا
نہالِ حُسن کو کس کس روش بخشی ہی زیبایش	چمن میں عشقبازی کے گلِ حرماں کیا پیدا
مدعا عالم سے اپنا ہی فقط دیدار تھا	دید کو اپنی یہ آئینہ اُسے درکار تھا

دل سے آگے کیوں بڑھا تو اے طلبگارِ وصال
پھر اُدھر ہی جا وہی گھر جلوہ گاہِ یار تھا

کفر بھی اک شان جلوہ کی اُسی دلبر کی ہے
شیخ کیوں تو برہمن سے برسرِ انکار تھا

کب دیت خواہ بنا راسخ اپنے قاتل سے ہوا
وہ تو دست و تیغِ قاتل ہی کا جانبدار تھا

شوق کی باتوں کا کس نامہ میں طومار نہ تھا
ہمنے کب خط اُنھیں لکھا کہ وہ طومار نہ تھا

دیکھنے سے ترک جو نظارۂ دلدار کیا
آہ پرہیز نے دُونا ہمیں بیمار کیا

برسوں رہا ہے صدمہ کشِ رشک آہ دل
یہ نسخہ ہے کچھ آب زدہ کچھ جلا ہوا

ہوا دیوانہ ہر فرزانہ تیرا
بہت فرزانہ ہے دیوانہ تیرا

دل قیمتی ہوا جو شکست آشنا ہوا
یہ شیشہ ٹوٹنے سے جواہر بہا ہوا

مت پوچھئے مجھ سے حال میرا
حیرت زدہ کیا بیاں کرے گا

جاں جسم پہ اب گراں ہوا ہے غم
کتنا مجھے ناتواں کرے گا

آتا ہے نظر کچھ اور رنگ آہ
کیا دیدۂ خونفشاں کرے گا

غافل تو بھی تو رفتنی ہے
کب تک غمِ رفتگاں کرے گا

شاگرد ہیں ہم میر سے اُستاد کے راسخ
اُستادوں کا اُستاد ہے اُستاد ہمارا

ہے بندگی آزادی میں ایجاد ہمارا
کرتے ہیں ادب مردمِ آزاد ہمارا

دل کی قیمت شکستگی سے بڑھی
قلب تھا کامل العیار ہوا

معمورِ طرب رکھے دل دوست نے دشمن کے
آنکھوں کو محبتوں کی آنسو سے بھرا رکھا

عقل والوں کے نہ آیا پیچ میں راسخ کبھو
یہ بھی اُسکی ذی شعوری تھی کہ سودائی رہا

پیشتر تم تھے جہاں اب سببِ تسکین ہے
اِس مکاں کے در و دیوار کو دیکھا کرنا

اپنے دیوانوں کا سرخیل بنایا مجکو
ہوا پر اُنھیں منظور تماشا کرنا

منفعل دل کو اضطراب رہا
جان پر تجھ بن اک عذاب رہا

بے حجابی کے بعد بھی مجھ سے
اسکو اک طور کا حجاب رہا

وے تھے خواہاں مری خرابی کے
میں اسی واسطے خراب رہا

ڈوبے رہے ہم شراب عنبر کے ساتھ ۔ راسخ اپنا جگر کباب رہا

راسخ کو ہے میر سے تلمذ ۔ یہ فیض ہے انکی تربیت کا

دشمنی در پردہ کی ای وائے تمنے کیا کیا ۔ آپ تو پردے میں بیٹھے اور ہمیں رسوا کیا

کب میرا خریدار ہو موجود وہ جفا کا ۔ بندہ تو ہوں پر عیب بڑے مجھ میں وفا کا

سونپا ہوا داغ انکا تازہ ہی سدا رکھا ۔ ہمنے اِس امانت کو چھاتی سے لگا رکھا

ملیں حضرت راسخ ہمسے اگر تو یہ پوچھینگے انکی جناب میں ہم ۔ کہو قبلہ و کعبہ وہ کیسا تھا گل بغض کا نٹا سا جسکی ہوا نے کیا

قطعہ

علائق سے آزادگی تھی میسر ۔ جنوں جن دنوں اپنا زنجیر پا تھا

نہ تھی فکر پوشش کی دیوانگی میں ۔ اِس اندیشہ کو میں نے تہ کر رکھا تھا

نہ بالیں کی خواہش نہ بستر کی حسرت ۔ نہ پروا کلہ کی نہ فکر قبا تھا

فقط گرد کی تہ تھی پیراہن تن ۔ نہ کچھ پاس اپنے کچھ اسکے سوا تھا

کیا ہائے کیا تو نے ای ہوشیاری ۔ لباس اپنے تن پر وہی خوشنما تھا

حیا کے پردے میں مارا ہے ایک عالم کو ۔ شہید میں تو ہوا اُن شرمگیں نگاہوں کا

گذرے جو وہ خیال میں تو نازکی سے ہائے ۔ یہ رنگ ہو کہ پھول ہو جیسے ملا ہوا

ہو ضبط آب ٹوٹے ہوئے ظرف میں کہاں ۔ دِل چاک ہو گیا ہی جو آنسو رواں ہے اب

راسخ اِس عہد میں متاع وفا ۔ کیمیا کی طرح سے ہے نایاب

صورت ہمارے حال کی بگڑی سی دیکھ کر ۔ قاصد نے انکے آنکی دلسے بنائی بات

زندہ ہے نام میر راسخ سے ۔ کوئی ہے شاعروں میں ایسا آج

کہاں کا دام فقط ہے تری نظر صیاد ۔ جو چاہے صید ہوں ہم دیکھ ٹک ادھر صیاد

جفا یار کی گر ہو مخصوص میری ۔ تو ہرگز نہ شاکی ہو شکر جفا کر

فلک تجھسے خواہان شاہی نہیں ہم ۔ ہمیں کوچہ یار کا تو گدا کر

شہر آشوب

کب خذف ریزہ بیقدر کو کہتے تھے لعل ۔ پوتھ کو پوتھ سمجھتے تھے گہر کو گوہر

دیکھتے سر پہ کمینے کے اگر زر کا تاج
خاک آلودہ نظر اہلِ ہنر گر آتا
کیا زمانہ تھا کہ تھی اہلِ لیاقت کی قدر
وضعداروں سے سبک وضع دبے رہتے تھے
وہ نسق ہی نہیں بالعکس ہے اس کا اب تو
ننگ ہیں وے جو حقیقت میں صفِ پائیں کے
قابلِ صدر نشینی ہیں مجالس میں جو لوگ
چغد اور بوم نے پایا ہے ہما کا رتبہ
اس زمانے کے بھی کیا مرتبہ داں ہیں میر
فتنیاں کے تئیں دیں بخشش کہ تا نامی ہوں
کوئی محتاج جو سائل ہو تو ہوں چیں بہ جبیں
بو علی سامنے گر آ کے سلام انکو کرے
آوے ملنے کو اگر کوئی سفاہت پیشہ
سن کے ان باتوں کو مجھ سے لگا کہنے وہ دوست
چشمِ قربان کی مانند ہوں حیراں ہمہ تن
ربط کچھ بالش و بستر سے بھی باقی نہیں اب
آہ صدموں سے غموں کے ہوں ز خود رفتہ سدا
ہے نشہ طرفہ مرے سر میں کہ بن پیا ہوں میں
کثرتِ غم سے دل از بسکہ ہے ویران و خراب
داغ پر داغ ہیں سینے میں ستاروں کی طرح

قطعہ

کفشِ پا سے بھی ٹھہرتا تھا نظر میں کمتر
اسکو دیتے تھے بٹھا بتوقیر جگہ آنکھوں پر
سنگ گوہر سے نہ ہو سکتا تھا ہرگز ہمسر
دخل کیا سفلہ چلے محترموں سے بڑھ کر
بے ہنر خوش ہیں خراب و رذیل اہلِ ہنر
بزم میں صدر نشیں ہوتے ہیں جا کر اکثر
سخت مشکل سے ہے ہوتا صفِ نعال انکا گذر
زاغ کے آگے ہے طوطی یوں ہیں اک مشتِ پر
فہم کا انکی بھلا وصف نہ کیجے کیونکر
ہے سلیمان کی انگشت کا گر انگشتر
دیجے دشنام کہیں اسکو نکالو باہر
سرسری سے ہوں انسے دیکھ کے کچھ دست بسر
تا درِ خانہ اسے لانیکو جاویں اٹھ کر
جو کہا تو نے نہیں فرق ہے اس میں یکسر
دل ہوں مفلس کا پریشاں ہوں میں سرتاسر
سوؤں ہوں اوڑھ کے مہتاب کی شب کو چادر
محوِ اندوہ ہوں ایسا کہ نہیں اپنی خبر
ہر سحر اٹھ کے مے خونِ جگر کا ساغر
کیا کہوں گذرا ہے اس رات سے گویا لشکر
آسمانِ غم کا غرض ٹوٹ پڑا ہے مجھ پر

عموماً کاش محوِ جلوہ فرمائی نہ ہوتے تم
جگہ دل میں مرے کرتے جو ہرجائی نہ ہوتے تم

تمھاری التفاتِ خاص ہی وجہ جنوں تھی یاں
تماشا ہم نہ بنتے گر تماشائی نہ ہوتے تم

نہ پہنچے حیف دل تک اے مقیمانِ درِ کعبہ
جو یاں آتے تو واں محوِ جبیں سائی نہ ہوتے تم

جہاں ہے قحبۂ رعنا نہیں گر ہوتی بینائی
تو اے اہلِ جہاں اسکے تمنائی نہ ہوتے تم

جز داغ ہے کیا دلِ حزیں میں
لالہ ہی اُگے ہے اِس زمیں میں

گالی میں بھی اُنکی جو مزا ہے
کب ہے وہ حلاوت انگبیں میں

اب اور لگا ہونے ایجاد گلستاں میں
راتوں کو لگا رہنے صیاد گلستاں میں

کافی ہیں لئے ابر ہائے دیدہ میری چشمِ تر
دامن آگے تم سمندر کے نہ پھیلایا کرو

آغوش کے بھی جا لگیں ہماری کہیں نصیب
کیا ہو کبھو جو لگ کے گلے سو رہا کرو

ملتا ہوں اُنکے حسرتِ پابوس میں جو ہاتھ
کہتے ہیں بیٹھے ہاتھ تم اپنے ملا کرو

راسخ علاقہ دل کا نہ ہو دلبروں کے ساتھ
تم اہلِ دل ہو حق میں مرے یہ دعا کرو

گردوں نے طرفہ قلبِ درد آشنا دیا ہے
یعنی ہمیں یہ شیشہ ٹوٹا ہوا دیا ہے

کتنی گراں بہا ہے پاؤں کی اُنکے ٹھوکر
قیمت میں اُسکی سر کو ہمنے جھکا دیا ہے

کبتک غبار ہمسے جی میں رکھوگے صاحب
ان نے تو خاک ہی میں ہمکو ملا دیا ہے

سنتے تھے ہوش افزا جلوہ کو ہم تمھارے
سو ہمکو تو دِوانا ان نے بنا دیا ہے

آہ عالم کی ہم اس وضع سے حیران ہوئے
دشت یاں شہر ہوئے شہر بیابان ہوئے

کیوں نہ وے مدعیٔ معرفتِ حق ہووے
جو شناسندۂ ماہیتِ انسان ہوئے

دم میں آزاد کیا قید سے ہستی کی ہمیں
تیغِ قاتل کے تو ہم بندۂ احسان ہوئے

عبث اُس سے بیٹھے ہو دل لگا چلو راسخ اب کہیں یاں سے تم
روش اُن عزیزوں کی خوب تھی جو دلِ اس چمن سے اُٹھا گئے

ہوئے ہیں ہم ضعیف اب دیدنی رونا ہمارا ہے
پلک پر اپنی آنسو صبحِ پیری کا ستارا ہے

قطعہ

شرفِ میکدہ بیاں کیا ہو
یہاں کے رند افضلِ زمانہ ہوئے

غمِ شریفِ حرم کو یہ ہے کہ حیف
نہ گدائے شرابخانہ ہوئے

وقت چلنے کے علاقوں کی خلش نا تھی ہمیں	اسلیئے جی کو ہر اک شے سے اٹھایا ہمنے
خواہشیں جمع تھیں دل میں کیا انکو وداع	کوچ سے آگے ہی سامان لٹا یا ہمنے

مثنوی

اے عشق امام ہے تو میرا
دیں ہے اسلام ہے تو میرا

تو جاں ہے جسم ناتواں میں
ہووے جو نہ تو تو پھر کہاں میں

ہے اک کفنی سوز عفرانی
اشکوں کا ہے رنگ ارغوانی

کپڑوں کے نہ بند میں رہا میں
اس قید سے ہو گیا رہا میں

پوشش سے تو میں نے ہاتھ اٹھایا
عریانی کو پیرہن بنایا

جب سے ہوئی تجھ سے آشنائی
بیگانگی بسکہ مجھکو بھائی

ہے طرفہ مزا تیری جفا کا
جی جانتا ہے مری وفا کا

تو حاکم کشور وفا ہے
محشو وحشیاں ترا گدا ہے

تجھ سے جو بہت لطیف رعنا
چھنوائی انھیں سے خاک صحرا

آتش دی دلوں کو آہ تو نے
گھر لاکھوں کیئے سیاہ تو نے

شعلے سینوں سے گہہ اٹھائے
گاہے جگر آب کر بہائے

شاہوں کی تباہی تو نے چاہی
کشکول بنائے تاج شاہی

وارفتہ کفر تجھ سے دیندار
تسبیحیں بنائیں تو نے زنار

سجادوں سے خلق کو اٹھائے
صحرا میں برہنہ پا پھرائے

درہم ہوا دہر تیرے ہاتھوں
برہم ہوئے شہر تیرے ہاتھوں

پانی میں بھی آگ تو لگا دے
گرمی تری دشت کو جلا دے

تو عقل کے ہوش کھو سکے ہے
جو چاہے سو تجھسے ہو سکے ہے

تجھ سے ہوا دست کفر بالا
تو چاہے اگر تو دخت ترسا

دیں چھین لے سارے زاہدوں کا
عمامہ اتارے زاہدوں کا

راسخ

راسخ۔ نواب ظفریاب خان راسخ مقیم لکھنؤ خلف مُلّا میاں حافظ الملک نواب حافظ رحمت خاں والی کھیٹر کی اولاد میں اور صاحبِ دیوان تھے ۱۲۸۵ء میں انتقال کیا، نواب منصور خان مہر سے تلمذ رکھتے تھے، فنِ شعر سے عشق تھا، شبانہ روز یہی مشغلہ رہتا تھا، خواجہ آتش اور شیخ ناسخ کے ہمعصر تھے اور اپنی کثرتِ مشق کے باعث عزو وقار کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ طرزِ سخن میں ناسخ کے مقلد معلوم ہوتے ہیں۔ بڑی تلاش سے کچھ کلام ہاتھ آیا اُس کا انتخاب حاضر کیا جاتا ہے۔

منزلِ مقصود کا پایا سُراغ　　خضر میرے پاؤں کا چکّر ہوا

گو مگو اُس شوخ کا اقرار ہے بھی اور نہیں　　میرے ملنے سے اُسے انکار ہے بھی اور نہیں
لاغری سے ضعف ایسا ہے کہ شکلِ عکسِ خس　　بسترِ غم پر ترا بیمار ہے بھی اور نہیں
چین ہے دیکھے نہیں اور دید سے جاتی ہے جان　　وہ تجلّی قابلِ دیدار ہے بھی اور نہیں
خامشی سے دل جلے کہنے سے جلتی ہے زبان　　حال اپنا قابلِ اظہار ہے بھی اور نہیں
گہہ اُٹھا لیتا ہے گہہ سینہ پہ رکھتا ہے وہ ہاتھ　　سانس لینا اب ہمیں دشوار ہے بھی اور نہیں

اُس آبِ حیات سے جُدا ہُوں　　مچھلی کی طرح تڑپ رہا ہوں

دکھایا صانعِ قدرت نے اب تیرے کفِ پا کو　　سُنا کرتے تھے ہم اعجازِ روشن دستِ بیضا کو
دلِ بے آرزو کون و مکاں کا ہے تماشائی　　رکھا خالی ازل سے ہم نے آغوشِ تمنّا کو
تیور چڑھا کے رہ گئے تم کیوں اُٹھا کے ہاتھ　　چھوٹا ہے نیمچہ تو لگاؤ بڑھا کے ہاتھ
دریائے حسن اور بھی دو ہاتھ بڑھ گیا　　انگڑائی اُس نے نشہ میں لی جو اُٹھا کے ہاتھ

مفتونِ صنم یہ دلِ دیوانہ ہوا ہے　　یہاں کعبہ نثارِ درِ میخانہ ہوا ہے

دیکھنے نکلا جو وہ خورشید منظر چاندنی　　دُھوپ سے بھی ہے چمک میں آج بہتر چاندنی
اب اندھیرے اور اُجالے پھرتے ہیں وہ دربدر　　دھوپ دکھلاتا پدر جن کو، نہ مادر چاندنی
خیالِ زلفِ پیچاں شامِ غربت کی سیاہی ہے　　تصورِ روئے تاباں کا خیالِ صبح گاہی ہے

دلِ وحشی کو ہے خارِ غمِ ہجراں سے آسایش
علاجِ خونِ فاسد رنگ آخر نوکِ نشتر ہے

عبورِ بحرِ آفت خیزِ ہستی ہے بجز دیں
شبکہ وحشی تعلق سے مری کشتی کا لنگر ہے

بے دیدۂ گریاں ہو کہاں دل کی صفائی
روشن نفساں رہتے ہیں ہر وقت وضو سے

راسخ

راسخ۔ میاں عنایت محمد خاں راسخ، خلف عادل شاہ خاں باشندۂ رامپور ۱۲۸۹ھ میں نواب غوث محمد خان رئیس بھوپال کی نواسی نصیر بیگم سے عقد ہو جانے کے باعث بھوپال میں سکونت اختیار کی فنِ سخن میں شیخ احمد علی رسا سے تلمذ تھا، چند غزلیں منیر شکوہ آبادی کو بھی دکھائی تھیں، انکی تالیف سے ایک رسالہ واجب العمل مطبع نظامی میں چھپ چکا ہے۔ شاہجہاں بیگم صاحبہ بھوپال کی قدردانی سے بزمرۂ اخوان الریاست وظیفہ خوار ہیں ۱۳۰۲ھ میں سینتیس برس کی عمر تھی، یہ کلام کا رنگ ہے۔

سرِ تسلیم خم ہر کافر و دیندار رکھتا ہے
بڑھا طاقِ حرم سے رتبہ کیا محرابِ ابرو کا

حرم کی پردہ پلکیں ہیں شریف کعبہ مردم ہیں
دکھایا آنکھ نے اُس بُت کی رتبہ طاقِ ابرو کا

راسخ

راسخ۔ منشی سعادت علی خان دہلوی تربیت یافتہ حکیم مومن خان۔ نیک طینت، خلیق اور طباع نوجوان تھے اور غدر سے پہلے زندہ و سلامت تھے۔ یہ دو شعر انکے طبعزاد ہیں۔

ہوں تو آنکھوں میں پر نہیں یہ خبر
سُرمہ ہوں، یا غبار ہوں، کیا ہوں

ہیں بنائے جہاں سہی لیکن
جبکہ ناپائدار ہوں کیا ہوں

راسخ

راسخ۔ شاعرِ باکمال سخنورِ عدیم المثال مولٰنا عبد الرحمن راسخ دہلوی الملقب بہ خلاق المعانی خلف مولوی محمد حسین صاحب فقیر بانی مدرسۂ حسینیہ دہلی۔ فقیر استاد ذوق کے شاگرد اور صاحبِ دیوان نعتیہ تھے جو چھپ گیا ہے۔ حضرت راسخ قصبۂ نیت نواح پانی پت کے رہنے والے تھے مگر جناب راسخ کی عمر کا بڑا حصہ دہلی ہی میں گذرا اور یہیں تعلیم و تربیت پا کر بڑے ہوئے اوائلِ عمر سے مطالعہ اور کتاب بینی کا شوق بیحد تھا۔ ابتدائے شباب میں "افضل الاخبار، ہمشیال پنچ دہلی پنچ۔ چلتا پرزہ، و خیر خواہ عالم" کے برسوں ایڈیٹر رہے۔ اِنکی ظرافت پسند طبیعت کے

بہت سے نمونے ان پرچوں میں موجود ہیں، کملائے دلّی سے مختلف علوم و فنون میں سبق لیکر ایسی استعداد پیدا کرلی کہ خود ایک زبردست اور جیّد عالم سمجھے جانے لگے، وعظ بالخصوص بہت اچھا کہتے تھے۔ فقہ، معقول، منقول، اور کتب حدیث پر کامل عبور تھا، مثنوی مولانا روم کی جو شرح مرحوم نے لکھی وہ صوفیائے کرام میں بڑی وقعت اور عظمت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے اور در حقیقت انکی زندگی کا بہت بڑا کارنامہ یہی ہے۔ اوائل مشق سخن میں مرزا ارشد سیف الحق ادیب، پنڈت جواہر ناتھ ساقی وغیرہم کے ہم مشق اور ہم صحبت رہے، اور اپنی میانہ روی خوش مذاقی۔ اور صلح کل پولیسی سے علمی صحبتوں میں امتیازی نظر سے دیکھے گئے، میدان مناظرہ میں کئی بار مولانا شوکت میرٹھی وغیرہ سے مباحثہ ہوا، مرحوم کے دو دیوان تھے جن میں سے دوسرا ہنوز غیر مطبوعہ انکی بیوی کے پاس موجود ہے، دیوان اول مرآۃ الخیال جو ۱۳۱۲ھ میں چھپا شوخی زبان، مضمون، بلندی فکر، جدت خیال، تازگی مضمون کا ایک قابل قدر آئینہ ہے۔

۱۸۸۵ء سے ۱۹۱۷ء تک کامل ۳۲ برس دہلی میں اُستاد مانے جاتے رہے، ساٹھ ستر تلامذہ بھی تھے جن میں بابو ونایک پرشاد طالب بنارسی مقیم بمبئی۔ چندی پرشاد شیدا، پیارے لال رونق دہلوی بڑے باعقیدت تلامذہ اور قابل ذکر ہیں۔ دہلی کے مشاعروں کے رکن سمجھے جاتے تھے، حضرت داغ مرحوم نے انکے اکثر اشعار کی داد دی اور متعدد موقعوں پر دہلی کے نوآموز شعراء کو تحریک کی کہ راسخ کی دہلی میں موجودگی میں غزل انہیں کو دکھاؤ۔ دہلی سے باہر شاعری کی شہرت کی ابتدا رسالہ "زبان" جاری کرنے کے بعد ہوئی اور تلامذہ کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ دوسرے دیوان پر مولانا کو خاص طور پر ناز تھا کیونکہ یہ اُنکے پختہ غور و فکر اور قادر الکلامی کا نتیجہ تھا۔ اُس کی غزلوں کے اکثر اشعار نہایت پھڑکتے ہوئے تھے، اسقدر شہرت اور ناموری حاصل کر لینے کے بعد یہ حیرت انگیز بات ہی کہ مولانا نے وفات سے چار سال پیشتر عاشقانہ شاعری سے توبہ کرکے درس و تدریس اور وعظ کو اپنا مشغلہ بنا لیا مگر تلامذہ کی اصلاح کا سلسلہ بدستور جاری تھا توبہ کے بعد سے تا دم مرگ مولانا نے عشقیہ شعر نہیں کہا۔ آغا شاعر نے حق ہم وطنی و دوستی

مصرع تاریخ وفات "ہائے راسخ فرد کامل کم ہوا" کہہ کرادا کیا، بعارضۂ بواسیر ۲۹ ستمبر ۱۹۰۶ء کو بعمر ۹۴ سال انتقال فرمایا۔ تین بیٹیاں صغرسن اپنی یادگار چھوڑیں۔

کہدو بسمل سے کہ اک ہاتھ جگر پر رکھے
قاتل وہاں زخم سے آتی ہے یہ صدا
اور اک ہاتھ سے تھامے رہے دامن اُن کا
بیر جسم ایک ہاتھ میں قصہ تمام تھا

کیا چھپاتے ہو ڈھل گیا جوبن
دل عاشق میں داغ ہے کسکا
وہ جو چوری کا مال تھا نہ رہا
کعبہ میں یہ چراغ ہے کسکا

ملا کے لائے تھے زمزم میں مغبچے لیکن
جناب شیخ کی قسمت ہی میں ثواب نہ تھا

جینا ہے خضر بتوں پہ مرنا
مرنے میں ہے لطف زندگانی کا

الٰہی حور ہو حصہ کسی سید سے مسلماں کا
ہمیں وہ چاہیئے معشوق جو بانکے سے ہو بانکا
کسی میکش کو دیجئے تختہ انگور کی خدمت
جناب شیخ ٹھیکہ لیجئے ہیں باغ رضواں کا
لہو بھی چار چلو بڑھ گیا مشق ستم ہوکر
ترے چہرے پہ قاتل رنگ ہے خون شہیداں کا

ملا لو قیس سے فرہاد سے مری تصویر
یہ حال کس کا ہوا ہے یہ حال کسکا تھا

مرشیوالو نکا الٰہی کہیں پردہ ڈھک جائے
دھجیاں ہو کے پڑے لاش پہ دامن انکا

دل سے یاد دوستاں جاتی نہیں
بارہا سمجھا چکا ہوں بارہا

فکر تھا ہوتی ہے کیونکر مفت کی بار حلال
قاضی صاحب کے سبب یہ مسئلہ حل ہوگیا

رکھدیا گلشن میں بلبل کا قفس
مرحبا صبا دکیا کہنا ترا

کچھ دکھاتا ہے کچھ چھپاتا ہے
شعبدہ ہے یہ آنکے آنچل کا
سر حشر چھپتے پھروگے کہاں
دل زار منتپر مچل جائیگا

قیامت ڈھائی مجھپر حشر توڑا اُس ستمگر نے
عدو کو قبر پر لایا ستم ٹوٹا غضب آیا

ہمنے جان و دل کے حصے کر دیئے
وہ خدا کی۔ یہ تمھارے نام کا
پی بھی لے ناصح ناداں مری خاطر سے
یوں سمجھ جسنے پلائی وہ گنہگار رہا

اپنے جنوں کا آپ ہی کرتے ہیں ہم علاج — تعویذ دھو کے پیتے ہیں مجنوں کی گور کا
کچھ تم بھی بولتے ہو چلا کوڑیوں کے مول — نیلام کر رہا ہوں دلِ نا اُمید کا

اپنے بیگانے ہیں، بیگانے ہیں اپنے راسخ — وہ یگانہ ہوں ہیں۔ اپنوں کا نہ بیگانوں کا

تیری دشنام کے مزے ہے ہے — مُنہ میں تیری زبان ہے گویا
ٹھوکریں مارتے ہیں نعش پہ وہ — پس کشتن بھی جان ہے گویا

خشک و تر کو تری چاہت نے سکھایا کیا کیا — ڈوبنا مچھلیوں نے شمع نے جلنا جانا
مفت بکتا نہیں فردوسِ بریں محشر میں — ہاتھ خالی نئے بازار میں کیسا جانا
حوروں کے واسطے مرتا ہوں میں کیا فرمایا — کچھ نہ سمجھا جو مجھے مردہ دل ایسا جانا
ہم بھی ہیں، تم بھی ہو، محشر بھی ہے، اللہ بھی ہے — بڑے سچے ہو تو کل معرکہ میں آجانا

رس کس نے لیا تری مسی کا — نیلم کا ہے رنگ پھیکا پھیکا
صدقہ ہے یہ غیر کی خوشی کا — جلنا ہے مری لحد پہ گھی کا
گلشن میں مسی ملی جو تُو نے — دم گُھٹنے لگا کلی کلی کا
ہے چھوٹی سی عمر میں قیامت — فتنہ ہے وہ چودھوی صدی کا
پرچھائیں سے ڈر کے کہتے ہیں وہ — سایہ نہ ہو یہ کسی پری کا

پہلو میں ہے یگانہ تیرِ قاتل — یہ یار ملا ہے دل لگی کا — راسخ کی خبر وہ شوخ کے بولے — حوروں نہیں تھا دھیان جنتی کا

ترے جھوٹے وعدوں سے ہوں نیم بسمل۔ تڑپنے کو ہے جاں پھڑکنے کو ہے دل
مگر تجکو شاباش بے رحم قاتل۔ نہ کچھ اس سے مطلب نہ کچھ اُس سے مطلب

کوچۂ زلف میں پھر دل ہے ڈھونی دینے کو — بوسے لے دیکھے بلا کو کہیں ٹالو جھٹ پٹ
تو فندقیں لگائے ہیں دس ٹکڑے دل کروں — ایک ایک کو اُتاروں تری پور پور پر
آنسو ذرا تھمے تھے کہ آنکھیں اُبل پڑیں — ڈُوبیں گی کشتیاں لبِ دریائے شور پر
یہی جنوں ہے تو دیکھ لینا رہینگے مرکر بھی دشت پیما — نکال پھینکے گی قبر ہمکو ہماری وحشت سے تنگ ہوکر

چوڑیاں سبز تیرے ہاتھوں میں
شاخِ طوبےٰ رہی ہری ہو کر

نکتہ گیری کے سبب نکتہ نوازی کے طفیل
خُلد سے شیخ ہے دوزخ سے ہے کافر باہر

بھوں چڑھی، غصہ چڑھا، تیور چڑھے
یہ چڑھائی! عاشقِ دلگیر پر؟

قاتل اوچھے وار پر ہے منفعل
زخم منہ آنے لگے شمشیر پر

تم لڑے مجھ سے کہ قسمت لڑ گئی
مر مٹا میں خوبیٔ تقریر پر

بل کی پینے لگیں زلفیں ترے رخساروں پر
سانپ کے منہ میں کبھی ہوں کبھی انگاروں پر

چشم و ابرو کے شہیدوں کی ولادت بھی نیاز
تیر کے ٹکڑوں پہ ٹوٹی ہوئی تلواروں پر

لڑکھڑاتے ہیں قدم زہد کے اے پیرِ مغان
توبہ اب ٹوٹ کے گرنے کو ہے میخواروں پر

رندوں پیو پلاؤ کہ آئی ہے صبحِ عید
توبہ کو پھینکدو سرِ بازار توڑ کر

آ بتکدہ میں زاہدِ مغرور ایک دن
زنارِ کبر اور بتِ پندار توڑ کر

دم نہیں، جان نہیں، حال نہیں، تاب نہیں
درد پہلو سے اُٹھے لیجے سہارا کس کا

تربتِ حضرتِ راسخ پہ چڑھائیے تیور
تمنے غصہ بھی اُتارا تو اُتارا کس پر

زاہد خیالِ حور ہے ملکرِ خدا سے بھی
ناحق شناس ہے منکرِ مکافات اتو چھوڑ

مر کے بھی ہیں ترے بسمل تشنہ کام
مانگتے ہیں تیغ کا پانی ہنوز

پھرتی رہیں گی دِلّی کی گلیاں نگاہ میں
راسخ بہشت میں بھی رہونگا وطن کے پاس

میرے جنازے پر یہ لبِ گور نے کہا
مر مر کے پہنچا ہے یہ مسافر وطن کے پاس

دل میں ہزار تیر جگر میں ہزار زخم
راسخ یہ خارزار ہے میرے چمن کے پاس

میں مسلماں ہوں فرض ہے بوسہ
مصحفِ لاجواب ہے عارض

نہ اُٹھا آپ سے خنجر اُٹھوں دنیا سے میں کیونکر
مجھے ناطاقتی تم کو نزاکت ہو گئی مانع

لگائی بھی ستمگر تیغ جھوٹے ہاتھ سے تو نے
عدو کو خلد سے جھوٹی شہادت ہو گئی مانع

کئے شباب میں جتنے گناہ عفو ہوئے
سُنا ہے میں نے جوانی ہے خواب میں داخل

پلادے پیاسوں کو اے تیغِ یار دو دو گھونٹ
کہ ہے سبیل لگانی ثواب میں داخل

نہیں ہیں جن کے معاصی شمار کے قابل
وہی ہیں رحمتِ پروردگار کے قابل

واعظ سے سن چکے ہیں قیامت کی پیاس ہم
بوتل بغل میں لینگے کفن میں گلاس ہم

قاتل نمک چھڑک کے تماشا تو دیکھ لے
کہتے ہیں زخمِ دل کہ نہیں ناسپاس ہم

سبو سے کام ہے، بوتل سے کام جام سے کام
وہ رند ہم ہیں کہ رکھتے ہیں اپنے کام سے کام

قطعہ

کہتا ہے یہ ہند لاکھ کھا کر قسمیں
گوروں میں ہیں قتلِ بے گنہ کی رسمیں
سنتا ہی نہیں کوئی فغانِ درویش
سچ ہے کہ نہ ہو کوئی کسی کے بس میں

گرہ دل کی کھلے یارب صفِ محشر برآتی ہو
وہ بُت پلّے سے پلہ باندھ کر نکلے قیامت میں

نظر آتی ہے آئینہ میں اُنکی شانِ یکتائی
رلا دیتے ہیں صورت دیکھنے والے کی صورت میں

راسخ اِس سینے میں اللہ کا دیا ہے سب کچھ
آگ ہر داغ میں ہے داغ ہیں ہر سو دل میں

کروٹیں سینکڑوں لیں سینکڑوں پہلو بدلے
چین سے درد نہ بیٹھا کسی پہلو دل میں

پرتو فگن ہے عارضِ ساقی شراب میں
دو آفتاب ڈوبے ہیں اک آفتاب میں

گذری سیاہ کاری میں یارب تمام عمر
آدھی شباب میں کٹی آدھی خضاب میں

مجھ سے گناہ گار کو دوزخ میں ڈال کر
دوزخ کو ڈال رکھا ہے ناحق عذاب میں

راسخ اُمیدِ عفو یہ کہتی ہے بار بار
دھوئے گئے گناہ ہمارے شراب میں

راسخ کی فاقہ مستی سے اللہ کی پناہ
کھاتا ہے سوکھے ٹکڑے بھگو کر شراب میں

میرے سینے میں نہیں یار کے خنجر میں نہیں
دم بھی کیا چیز ہے دم بھر میں ہے دم بھر میں نہیں

عشق تجھ سے زلفِ پرخم کیا کریں
چھیڑ کر برہم کو برہم کیا کریں

قیامت کی ہے برپا آئینہ میں عکس کاکل نے
بلائیں لینے جاتے ہیں پریشاں ہوتے جاتے ہیں

تپ غم سے سنبھلنے کا نہیں اے چارہ گر راسخ
سنبھلنا جسکو سمجھا ہے سنبھالے ہیں سنبھالے ہیں

نوجوانی ہے نئے تم ہو نرالا جوبن
بالا بالا نہ اترائے کوئی الا جوبن

چولی مسکی ہے گریبان پھٹا پڑتا ہے
ہوش تو تم نے سنبھالا نہ سنبھالا جوبن

دیکھنا ہوتی ہیں غیروں کی نگاہیں رہزن
لُٹ نجائے کہیں یہ نازکا پالا جوبن

ٹکڑے ہوجائینگے گر آئیگی میخواروں میں
کام توبہ کا نہیں ایسے گنہ گاروں میں

راسخ تفتہ جگر بوئے کباب آنے لگی
خوش بیاں تجھ سے بہت آتش بیاں گنتی کے ہیں

وہی راسخ تو ہیں کل تک جو تنجانے کے دربان تھے
بنے بیٹھے ہیں حضرت چار دن سے ویں نیا ہونیں

مبارک بادہ خواروں کو کہ دن ساون کے آتے ہیں
ہوا بدلی ہے بادل ریش قاضی بنکے آتے ہیں

میرے مرنے کا وہ ماتم کیا کریں
مرنے والا مرگیا غم کیا کریں

کام پھرنے سے ہی تھیں گھر گھر
شام دیکھو نہ دوپہر دیکھو

ادھر حوروں کا دعوی ہوا دھر نیر اتقاضا ہو
تماشا ہے شہید ناز پر جنت میں جھگڑا ہو

خدا چاہے تو آئینگے عبث کہتے ہو عدوں پر
ہمیں معلوم ہے صاحب خدا چاہے نہ تم چاہو

تمنّا ہے پڑے بھر پور سر پر ہاتھ قاتل کا
الٰہی جو مری تقدیر کا لکھا ہے پورا ہو

بحرِ وحدت نے دیا رتبۂ قلزم مجکو
مجھ میں گم تمکو کیا تم میں کیا گم مجھکو

حیرتِ حُسن تجلی نے کیا گم مجھکو
صفِ محشر میں عبث ڈھونڈتے ہو تم مجھکو

کاش پنہاں رہیں دونوں کی نظر سے دشمن
ہیں ہی ہیں تمکو دکھائی دوں نہیں تم مجھکو

بیتاب دلکو قول کے چھلّے سے باندھ لو
منتھی میں گر نہ رہ سکے پلّے میں باندھ لو

دُنیا نہیں یہ حشر ہے رہجاؤگے الگ
تم پلّہ کھینچکر مرے پلّے سے باندھ لو

نزع میں جب حالِ راسخ غیر ہو
یا الٰہی خاتمہ بالخیر ہو

الٰہی ایسے ساون میں اگر برسے نمک برسے
ہمارے زخم پھیلائے ہوئے بیٹھے ہیں من کو

پھیر لو بوسے لبِ گلفام سے
غیر کے جھوٹے مرے کس کام کے

حشر کے دن سکۂ خونِ شہید
بیٹھ جائے گا وہ پٹہ تھام کے

سیکھ لے ہمسے کچھ آدابِ تلاوت واعظ
یا صنم لب پہ رہے ہاتھ میں قرآن رہے

سلامت نہیں رہتی توبہ کسی کی
حسینوں سے صاحب سلامت بری ہے

جام ٹوٹے ترے سر پر تو بلا سے واعظ
میکدہ سے تری توبہ تو سلامت آئی

کس سے وعدہ ہے مری جان کہاں جاتا ہے
تیرے صدقے ترے قربان کہاں جاتا ہے

کوچۂ زلف سے روکا ہے یہ کہہ کر دل کو
بیٹھ کمبخت، کہا مان، کہاں جاتا ہے

خم کے خم پی کے بھی ہم نے تو نہ دیکھا زاہد
کس طرح جاتا ہے ایمان کہاں جاتا ہے

تیر سینے میں چبھو کر یہ کہا قاتل نے
رستہ نکلا ہے تری جان نکلنے کے لئے

تو نے دیکھی ہے اک پری واعظ؟
شیشے میں لال ہوتی ہے

نیت شب حرام ہے زاہد
دن کو پی لے حلال ہوتی ہے

حسرت کے یہ معنی ہیں کہ مر کر بھی نہ نکلے
امید اسے کہتے ہیں جو ہرگز نہ بر آئے

وہ ہاتھ مجھے چاہیئے وحشت ترے قرباں
جو ہاتھ گریباں سے چلے تا جگر آئے

الٰہی ہم گنہگاروں کا محشر ہو الگ سب سے
قیامت ہے یہ رسوائی سر بازار کیسی ہے

خنجر یار سلامت رہے دم خم تیرا
تو نے میعاد قضا نامتناہی کر دی

مہر کی آنکھ سے اس چہرہ کی یکتائی پہ
حسن خط نے خط طغرا میں گواہی کر دی

ہوں شہید خط لب میرے کفن کی رنگت
آسماں نے کبھی خونی کبھی کاہی کر دی

غیر بنا کر کبھی پہنچا کبھی قاصد بن کر
میری صورت تری چاہت نے جو چاہی کر دی

[illegible]

ادھر تو آنکھ ملاؤ کہاں گذاری رات
تمہاری نیچی نگہ سے ہے انفعال مجھے

ہمیں کو تم سکھاتے ہو ہمیں کو
ہمیں سے سیکھ کر چالیں ہمیں سے

بشر کو چاہیئے پاس دل بشر رکھے
کسی کا ہو کے رہے یا کسی کو کر رکھے

جہان شعلہ رو سے گرم محفل ہم بھی رکھتے تھے
کبھی تھی جان ہم میں بھی کبھی دل ہم بھی رکھتے تھے

بوسہ مانگا تو بولے وہ راسخ
شامت آئی ہے موت آئی ہے

قتل کس کو کر دیا ظالم کہ چہرے پر ترے
چار چلو خون ہے اور دو دو انگل نور ہے

راشد

راشد۔ مرزا انجاور شاہ راشد ابن مرزا خدا بخش گورگانی، سادہ کاری، کارچوبی، سوزنی کا کام اپنے ہاتھ سے خوب بناتے تھے۔ چھالیا کی انگوٹھی۔ چھلّے، ڈبیاں وغیرہ بڑی صنعت سے بنا کر تیار کیا کرتے تھے، موزونی طبع کی بدولت کبھی کبھی مشاعروں کی طرحوں پر طبع آزمائی کر لیتے تھے ۱۹۱۱ء میں قریب ۵۰ برس کے سن میں انتقال کیا۔

وہ حال پوچھتے ہیں بتلائے کون یارب
جو عاشق ہو گیا تیرا کسی کا ہو نہیں سکتا
جسے زندہ کیا عیسیٰ نے وہ قدرت کا مارا تھا
جسے مارا بتوں تم نے وہ زندہ ہو نہیں سکتا
حسیں لاکھوں ہیں دنیا کے ہزاروں ما ہوش دیکھے
تمہارا سا کسی کا حسنِ زیبا ہو نہیں سکتا
جو بندہ ہے وہ بندہ ہے جو مولا ہے وہ مولا ہے
سبھی کچھ ہو گیا بندہ یہ مولا ہو نہیں سکتا
بھلا اس بے وفا کے وعدہ پر اتنا یقیں راشد
جو پورا کرنا بھی چاہے تو پورا ہو نہیں سکتا

کم گوئی نے بھلا یا یہاں ربط ہی سخن کا
اگرچہ حورِ جنت ہو یہ شیدا ہو نہیں سکتا

کتنے ہی وعدے کیے لیکن نہ آئے ایک دن
کیونکہ جانوں نہ ہے یہ مستحکم ترا اقرار خوب
اور اگر سچ ہے یہ تسکین دل کچھ تو بتا
تیرے تو اقرار میں بھی ہے بھرا انکار خوب

راضی

راضی دیوان جانی بہاری لال جی مرحوم، آپ ذات کے ناگر برہمن اور آگرہ کے قدیم رئیس تھے آگرہ کالج میں تعلیم پائی تھی اور فارسی انگریزی کے علاوہ عربی سے بھی ماہر تھے، پہلے اعظم گڈھ کے مدرسہ میں ماسٹر رہے پھر آٹھ برس بنارس کے مدرسہ میں پڑھاتے رہے وہاں سے ۱۸۴۶ء میں پلٹن نمبر ۶۲ میں میرمنشی ہو کر سات برس تک بنگالہ، ڈھاکہ، کلکتہ، الہ آباد، اٹاوہ میں رہے بعد میں ریاست بھرتپور میں وکیل رزیڈنسی راجپوتانہ مقرر ہوئے، پھر مہاراجہ سجن سنگھ بہادر والیٔ میواڑ کے کئی برس اتالیق رہے، اکثر جلیل القدر حکام اردو فارسی میں انکے شاگرد تھے۔ مرزا غالب مرحوم کے دوست قلبی تھے، آخر عمر میں کچھ دیوان ہو گئے تھے، ان کا دیوان ۱۲۸ صفحوں پر مطبع دربار کچھ واقع بھاؤنگر میں ۱۲۷۷ھ میں چھپا تھا۔ علاوہ ازیں گلستان بوستاں انوار سہیلی کا اردو نظم میں ترجمہ کر کے شائع کیا تھا۔ بڑی ذکی الفہیم، خوش خلیم بزرگوار تھے استادی

نہیں کی تھی، پیرانہ سالی میں ہنیں برس ہوئے انتقال کیا، اُنکی زود گوئی اور پُر گوئی قابلِ تعریف تھی۔ اکثر زمینوں میں چو غزلہ کہتے تھے، تلاشِ مضمون اور الفاظ اچھی تھی۔ حکام کی تعریف میں قصائد بھی اچھے اچھے کہے ہیں۔ جن سے اُنکی قابلیت مسلّم ہے ۱۲ اخلاقی مضامین نظم کرنے کا شوق تھا۔ با این ہمہ بعض مقامات پر فحش کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ دیوان کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

کروں شکوہ میں کیا اُس شوخ کی نامہربانی کا
یہاں تک اب ہوا ہے زور مجھپر ناتوانی کا

دمِ رخصت دیا مجکو نہ اک چھلا نشانی کا
کہ تن کو جان اور جاں کو ہے تن موجب گرانی کا

رُو نما گلزار میں وہ غیرتِ گل ہو گیا
جس سے جیتے جی بنایا تھا مرے گھر نے تنور
دیکھا راضی ذرا تا ثیر عکسِ گلعذار

ہر چراغ گل ہوائے رشک سے گل ہو گیا
شکر ہے اُس سے جنازہ کا تجمل ہو گیا
تیل میں منہ اُسنے دیکھا روغنِ گل ہو گیا

رُخ تاباں سے اُسکے کیا ہی نسبت مہر تاباں کو
شعاع مہر سے بہتر ہی عالم اُسکی چلمن کا

اثر اچھوں کے دل میں کر نہیں سکتی بُری صحبت
جدا ہمسے وہ رہسکتا ہی پر ہم رہ نہیں سکتے
کوئی مارا ہوا تیروں کا بچ جائے تو بچ جائے
وہ سجدہ پیشِ بُت کرتا ہے یہ محراب کے آگے

نہیں ہوتا تاثر من میں جیسے سانپ کے پھن کا
ہمارا عشق جاناں سے ہی جیسے جان سے تن کا
مگر بچتا نہیں تاکا ہوا اس ترچھی چیتوں کا
خدا ہر جا ہی قضیہ ہے عبث شیخ و برہمن کا

جستجو سے نئے گر کوئی پیغامبر پیدا کیا
کیوں نہ اچھوں کو بُرے گھیرے رہیں اللہ نے
نہ دوا فائدہ کرتی ہے کیسکی نہ دُعا
کافور ہے گورا گال اُس کا
کب بستر گل پہ آتی ہے نیند
امتحاں کر خوشی سے خنجر کا
دل بھی دشمن ہوا اُس دشمنِ جاں کی خاطر

رشکِ دیدارِ صنم نے دل میں ڈر پیدا کیا
خاروں میں گل پتھروں میں سیم و زر پیدا کیا
چشم بیمار نے کیسا مجھے بیمار کیا
فلفل ہے سیاہ خال اُس کا
گل تکیہ نہ ہو جو گال اُس کا
بار ہے دوش پر مرے سر کا
ہم جسے سمجھے تھے اپنا وہ بھی اپنا نہ ہوا

چھپاتی ہے بدی سیرت کی، صورت
مکاں سے عیب چھپتا ہے مکیں کا

سو بوسہ دو گے ہوکے جو ناخوش تو کچھ نہیں
اک بوسہ لاکھ بوسے ہیں دو گے جو پیار کا

دیکھنا ترچھی نگہ سے اس بت بے پیر کا
کام کرتا ہے دل عشاق پر شمشیر کا

ہم نشیں رخ کو عرق میں وہ نہاں رکھتے ہیں
دیکھئے آب میں آتش کو عیاں رکھتے ہیں

مشرک ہیں کہیں جو مجکو مشرک
میں ایک صنم کو مانتا ہوں

تو چاہ نچاہ مجکو میں تو
جی جان سے تجکو چاہتا ہوں

یکساں ہے مجکو یاد رخ و زلف یار کی
اپنی نظر میں شام و سحر دونوں ایک ہیں

رہی تلاش بنارس میں کو بکو مجکو
ملا نہ کوئی وفادار خوب رو مجکو

ضرور نکلے گی میرے مزار پر نرگس
کہ دید یار کی از بس ہے آرزو مجکو

ہجر جاناں میں لہو پیتا ہوں غم کھاتا ہوں
نہ غم آب ہے مجکو نہ غم ناں مجکو

گردشیں میں نے اٹھائی ہیں تری آنکھوں کی
کیا ڈرائیگی بھلا گردش گیہاں مجکو

مارنا منظور ہے گر عاشق دلگیر کو
چھوڑ ابرو کی کماں سے اس مژہ کے تیر کو

پست ہمت روتے رہتے ہیں سدا تقدیر کو
صاحب ہمت ہمیشہ کرتے ہیں تدبیر کو

غیر ممکن ہے کہ ہوویں صاف صورت نرم دل
سخت رکھتا ہے بایں نور و صفا دل آئینہ

اس رخ صاف و لب گلگوں کا گر پڑ جائے عکس
ہو یقیں گل طوطیا چاہیں عنادل آئینہ

اب رحم نکر قتل میں زخمی جو کیا ہے
تکلیف ہے بسمل کو ترحم میں زیادہ

زلف و رخ کا دھیان جب آیا مجھے
رات دن آئے نظر یکجا مجھے

کیوں دکھایا کرتے ہو چاہ ذقن
چاہتے ہو چاہ میں ڈالا مجھے

مست رہتا ہوں خیال چشم یار
رات دن ہے ساغر صہبا مجھے

اس پری چہرہ نے سایہ ڈال کر
کرلیا ہے اپنا دیوانہ مجھے

تجکو لاثانی کہا ہے اے پری
دیکھ کر آئینہ مت شرما مجھے

مفت رسوا ہیں چاہ میں تیری
کچھ نہ ٹھیرے نگاہ میں تیری

کوئی چڑھتا نہیں ہے آنکھوں میں
ہے جو صورت نگاہ میں تیری

کھینچ لیتا ہے دل کو آنکھوں میں
ہے وہ جذبہ نگاہ میں تیری

نکر دیں سیراب کرتے ہیں قاتل
ترے آب خنجر کا پیاسا گلا ہے

بُرائی سے اچھوں کو ہوتی ہے نفرت
تُو اچھا ہے پھر کیوں ترا دل بُرا ہے

ہماری خرابی کا باعث عزیزو
یہ حسن و جوانی یہ ناز و ادا ہے

وہ ہے حال خورشید کا اُسکے آگے
جو خورشید کے سامنے ماہ کا ہے

پردہ جو رُخ سے دور مرا دلربا کرے
ہر ذرہ مہر بن کے قیامت بپا کرے

بیوفاؤں سے دوستی کر کے
کیوں ولا مُفت خوار ہوتا ہے

سیل اشک اپنا اگر یوں ہی رواں ہے کچھ دنوں
ایک دن کاخِ فلک تم دیکھنا مسمار ہے

دل کو دل سے راہ ہوتی ہے اگر سچ ہے یہ بات
تو مرا محبوب مجھ سے کس لیئے بیزار ہے

کتاب ہے مجھے اُلفت ہے اِس لیئے راضی
نہیں کتاب سا کوئی رفیقِ تنہائی

خط نے اُسکے رُخ کو قرآں کے برابر کر دیا
ورنہ اس قرآن کو حاجت نتھی تفسیر کی

ہمارا دل تو وہیں رہتا ہے جہاں دلبر
یہ جسمِ زار اگرچہ پڑا کہیں پہ رہے

دوبارہ پیر جواں ہوئے دیکھ کر جسکو
فریفتہ جو رہے ایسے نازنیں پہ رہے

جیا ہے ترے عشق میں جو موا ہے
مُوا ہے ترے عشق میں جو جیا ہے

مشکل ہے زندگی ترے بیمارِ عشق کی
چاہے کوئی دعا کرے چاہے دوا کرے

ہے وصل میں موجود مگر ہجر میں غائب
دل سا بھی جہاں میں کوئی خود کام نہیں ہے

آرام سے جاہل کی گذرتی ہے ہمیشہ
عاقل کو یہاں ایک دم آرام نہیں ہے

شیخ جی آپ کی نصیحت سے
عشق اور اُستوار ہوتا ہے

ماہ سے یار کو مذو نسبت
ماہ تو داغ‌دار ہوتا ہے

بھول جاتا ہے آپ کو کم اصل حسن تسخیر سے نہیں خالی	کچھ بھی گر اقتدار ہوتا ہے عشق بے اختیار ہوتا ہے

راضی

رضی منشی یعقوب خان آپ کو خواجہ وزیر لکھنوی سے تلمذ تھا۔ قاضی محمد جلیل صاحب کی بیاض سے ایک شعر نقل ہوا ؎

جو سر ترے قدموں پہ مر جاں نہیں رکھتے	کچھ اور بلا رکھتے ہیں وہ سر نہیں رکھتے

راضی

رضی۔ مولوی جلیل الدین احمد راضی صدیقی مقیم تلہراودہ، حضرت احسان شاہجہانپوری کے شاگردوں میں نامور ہیں اور مولوی نذیر الدین احمد صاحب کے بیٹے ہیں چالیس بیالیس برس کا سن ہے، شعر صاف اور اچھا کہتے ہیں، یہ انکے کلام کا انتخاب ہے :-

کیا کیا لگا وٹیں جگر و دل نے کیں مگر کہتے تھے سب ہے حشر کی منزل بہت کڑی	ناوک فگن کا رخ نہ ادھر سے ادھر ہوا دیکھا تو آنکھ موندتے یہ طے سفر ہوا
عرصۂ حشر میں دیوانہ ترا کیا آیا پاؤں کس شوق سے نرگس نے لئے آنکھوں پر ایسی رچتی کہ کبھی رنگ نہ زائل ہوتا ماہ و خورشید کو جب طاقت نظارہ نہیں	اہل محشر کے لئے ایک تماشا آیا سیر گلزار کو جب وہ گل رعنا آیا تیری مہندی میں مرا خون جو شامل ہوتا تاب پھر کس کی تھی جو تجھ سے مقابل ہوتا
اللہ رے ظلم دوست کہ لاکھوں ستائے دل ہے یہ بھی تو کہو کہ محبت کے جرم پر جتنی حیا تھی وصل کی شب ہنسنے لوٹ لی نرگس میں کب وہ بات جو ہے چشم یار میں میں بھی ہوں بیقرار مرا دل بھی بیقرار	پھر بھی یہ فکر ہے کہ کوئی ہاتھ آئے دل تجویز کی ہے کونسی تم نے سزائے دل اب چھیننے کی وہ نگہ شرمگیں نہیں آنکھیں وہی ہیں چوٹ کریں جو ہزار میں دو بیقرار دفن نہوں اک مزار میں
تماشا کیجئے کس کس کا ہے سراپا ناز ہائے چالیں یہ تمہاری یہ تمہارے انداز	پکارتی ہے ادا ایک ایک ادھر دیکھو رول میں تو آؤ نظر کو نہ خبر ہونے دو

او دل یہ کس کی جستجو ہے | یا سیر عدم کی آرزو ہے
مٹ جائیگی تجھپہ آبرو ہے | کھو جائیگی اپنی جستجو ہے

کیوں ذبح میں سختیاں یہ قاتل
دم ہجر میں کیوں نہیں نکلتا
سب نذر ہے تیری اے غم یار

پتھر تو نہیں مرا گلو ہے
یہ بھی کوئی دل کی آرزو ہے
جتنا مرے جسم میں لہو ہے

وہ کہتے ہیں چہ خوش تیرے لئے گھر چھوڑ دیں اپنا
اسی منہ سے مسلمانی کا دم بھرتے ہو کیا کہنا

سکھاتا ہے یہاں ای خانماں برباد یہ کیسی
خدا کی یاد میں آ اصنی بتوں کی یاد یہ کیسی؟

راغب — مرزا اسجان قلی بیگ ایران اصلی وطن اور دہلی جائے پیدایش تھی، یہیں تعلیم اور تربیت پاکر شاہ عالم ثانی کے زمانے میں جوان ہوئے، سعادت یارخان رنگین کے بے تکلف یار اور اُنھیں کے شاگرد تھے، اور باوصف اسکے کہ انشاء اللہ خاں اور رنگین محب یکرنگ تھے انکے اور سید انشا کے ہمیشہ مناظرے ہوا کئے اور نوبت ہجو تک پہنچی۔ چند شعر ملے درج ہوئے۔

ہوتا ہے تازہ آہ سے ہر دم جو داغ دل
ای شام غربت آہ کدھر ڈھونڈیئے اسے

روشن ہے باد گرم سے اپنا چراغ دل
پایا نہ ہمنے زلف میں بھی کچھ سراغ دل

منہ دو پٹے میں چھپایا اُسنے | دل کو پردے میں لبھایا اُسنے

رشک چمن جو اُٹھ گیا، آج ہمارے پاس سے
اپنے برنگ گل یہاں، اُڑ گئے کچھ حواس سے

راغب۔ حافظ یار خان خلف الصدق نواب ذوالفقار خان ابن حافظ الملک حافظ رحمت خان نصیر جنگ، جوان وجیہہ صاحب حوصلہ، مجمع قابلیت، صاحب علم و فن، خوشنویس، انشا پرداز، کبھی کبھی شعر فارسی اور ریختہ میں کہہ لیتے تھے۔ یہ چند شعر اُنکے کلام سے تذکرۂ قدرت اللہ شوق سے منتخب ہوئے۔

بسان شانہ گر کوئی کرے سو ٹکڑے اپنا دل
وہ جانے مو بمو احوال اُس زلف پریشاں کا

کل مجھے دیکھکر مرا گل رو | اپنی مجلس میں کیا ہی لال ہوا

میں تو اُسکے عشق میں ہر لحظہ دُکھ پاتا رہا
اور وہ بیدرد اک بوسہ پہ ترساتا رہا

مجھے محفل میں اپنی گر بٹھاؤ گے تو کیا ہوگا	گھڑی دو چار اگر مکھڑا دکھاؤ گے تو کیا ہوگا
نہ ہوگا فرق کچھ صاحب تمہاری قدر و عزت میں	کسی رُوٹھے کو اپنے گر مناؤ گے تو کیا ہوگا

ہم ہوں اور تم ہو اور شبِ مہتاب	ہو گزک اور شراب خواری ہو
وہ ہو اور ناز و غمزہ و عشوہ	میں ہوں اور درد و آہ و زاری ہو
غیر سے چاہ جب تمہاری ہو	دیکھئے شکل کیا ہماری ہو

کیا تم سے کہوں میں نے دیا دل اُسے کیسے	الفت سے، مروّت سے محبت سے، نہ ایسے

راغب

راغب منشی احمد حسین شاہجہان آبادی برادرزادۂ حافظ محمد بخش عرف حافظ ممو، ترتیب تذکرہ مرزا صابر کے ایام میں جوان خوش فکر تھے، اور تیز طبعی اور خوش اخلاقی کے باعث اپنے اقران میں ممتاز۔ طبیعت کی روانی کا نمونہ اشعار ذیل ہیں۔

چھٹ گئے آرام سے راحت کا سامان ہو گیا	بڑھتے بڑھتے دردِ دل آخر کو درماں ہو گیا
یارب اسے تو چین دے مجھکو نہ دے نہ دے	جلتا ہے میرے حال پہ دل غمگسار کا
کیا فہم ہے وہ اپنی شکایت سمجھتے ہیں	شکوہ اگر کروں روشِ روزگار کا
آوے بھی وہ اگر تو نہ آوے اِسے یقین	کیا حال ہو گیا دلِ اُمیدوار کا
اِس کو ہے کیا صبا نے جہاں سے اُٹھا دیا	چھوڑا نہ ایک ذرّہ ہمارے غبار کا
ترغیب خلد اور مجھے راغب خدا سے ڈر	کیا کم ہے لطف خلد سے کچھ کوئے یار کا
میں نے کہا سر کٹتے ہیں کیا کیا نہ ملے لطف	کہنے لگے لے آؤ اگر ہے کوئی سر اور

راغب

راغب۔ جناب محمد عثمان خاں صاحب برہانپوری شاگرد مولانا فقیر الدین صاحب چشتی برہانپوری، حالات معلوم نہ ہو سکے، یہ کلام ہے

ازل سے عاشقِ صادق ہوں میں تو کوئے جاناں کا	سمائے گا مری نظروں میں کیا گلزار رضواں کا
مہِ کنعاں کے پلہ سے گراں نکلا بہت پلہ	جو تولا حسن میزانِ نظر میں حسنِ جاناں کا
لیا بوسہ جو میں نے تو حیاتِ جاوداں پائی	ہوا گویا دہانِ یار چشمہ آبِ حیواں کا

تری دریادلی مشہور ہے عالم میں اے ساقی
مجھے تھوڑی سی مے ملجائے صدقہ تیری دوکان کا

سفر درپیش ہے ملک عدم کا
کمر کی جستجو ہے اور میں ہوں

کوئے صنم کی دیکھ لی جس روز سے بہار
باغ بہشت گر گیا اپنی نگاہ سے

جادو بھرا ہوا ہے عجب چشم یار میں
دل سینکڑوں کے چھین لیے اک نگاہ سے

دونوں جہاں میں اس کا ٹھکانا کہاں رہا
تو نے جسے گرا دیا اپنی نگاہ سے

دیکھا ہے جب سے عارض تابان یار کو
خورشید و ماہ گر گئے اپنی نگاہ سے

خواب میں آ کے ذرا شکل دکھائے کوئی
میری سوتی ہوئی تقدیر جگائے کوئی

ہو کے بے پردہ اگر بام پہ آئے کوئی
جلوۂ حسن سے پھر تاب نہ لائے کوئی

دیکھکر آئینہ کس ناز سے فرماتے ہیں
میں بھی دیکھوں تو مرے سامنے آئے کوئی

اپنے گیسو کی درازی کا اگر دعوی ہے
میرے طول شب فرقت سے ملائے کوئی

نہ جائیگی شب غم بیقراری
یہی کہتا ہے درد اٹھکر جگر سے

کئے دیتا ہے مرغ دل کو بسمل
کسی کا دیکھنا ترچھی نظر سے

وہی دشمن ہوا راغب تمہارا
جسے دیکھا محبت کی نظر سے

ایک نیا شعبدہ قاتل کا عیاں ہوتا ہے
دہن زخم میں تیر آ کے زباں ہوتا ہے

رخ پر نور سے کس طرح جدا ہوں زلفیں
کب الگ شعلۂ آتش سے دھواں ہوتا ہے

راغب

راغب منشی محمد یعقوب بخش ساکن بدایوں، دور موجودہ کے کہنے والوں میں ہیں رسالۂ نیرنگ رامپور سے کلام منتخب ہو کر نقل ہوا، بریلی کے مشاعرے میں اکثیں دیکھا تھا۔ کلام درج ذیل ہے:۔

کسدرجہ ہوش مجھسے بیگانہ ہو گیا ہے
دیوانگی پہ اپنی دیوانہ ہو گیا ہے

دیوانوں کا تمہارے کچھ ہی عجیب عالم
دیکھا جسے انھوں نے دیوانہ ہو گیا ہے

ساقی کی یاد میں جب بھر آئے اشک میگوں
آنکھوں کا ہر پیالہ میخانہ ہو گیا ہے

تیر نظر کی قیمت کیا دوں تجھے الٰہی	یہ نقد جان و دل تو بیعانہ ہو گیا ہے
دل پلک مارے ہیں سینہ سے باہر آیا	یہ کشش تجھ میں ہے اے جنبش مژگاں کیسی
ہائے مسجد ہے یہ میخانہ نہیں اے واعظ	کیا بتاؤں تجھے ہے توبہ رنداں کیسی
دل سوزاں تجھے کس شمع شبستاں کی ہے یاد	تجھ میں لو ہے یہ چراغ تہ داماں کیسی
التجا یار کی پھر کیوں ہو جو فانوس ہو دل	وہ تو بس میں ہو خوشامد تری درباں کیسی
تری صورت سے یوں ظاہر ترے صانع کا جلوہ ہے	کہ جیسے تجھ کو دیکھا ہے خدا کو بھی دیکھا ہے
مری چپ سے زمانہ بھر میں راز عشق افشا ہے	خموشی ترجمان آرزو شرح تمنا ہے
ترے خار مژہ سے ربط اپنا جیتے جی کا ہے	کہ ان کانٹوں سے دامن جامہ ہستی کا الجھا ہے

رافت۔ شاہ رؤف احمد رافت خلف شعور احمد شیخ احمد سرہندی کی اولاد میں۔ اور جرأت کے شاگرد تھے فارسی و ریختہ دیوان اور مثنوی یوسف زلیخا ان سے یادگار ہیں سنہ ۱۲۴۷ھ میں بعمر پینسٹھ برس راہ کعبہ میں وفات پائی، شعر گوئی میں مشاق تھے اور بڑے زبردست عالم تھے، رامپور میں پیدا ہوئے لیکن کئی مرتبہ دہلی آکر برسوں یہاں رہے خاندان شاہ غلام علی صاحب میں بیعت کر لی تھی

رقیبوں سے ہل مل کے وہ نازنیں	مجھے خاک و خوں میں ملانے لگا
ہوئے جو چاہنے کے اپنے چرچے تو شک بھرا ہے چشم تر میں	ستارہ کش جو ہم سے بیٹھا وہ اپنے گھر میں ہے اپنے گھر میں
یہ کس کے مژگاں کے آہ یارب بھرے ہیں تیر ہماری بر میں	کہ مثل غربال پڑ گئے ہیں ہزاروں روزن دل و جگر میں
وصل کی شب ہی ہی گھڑیاں کیسی بے آئین بجیں	تب آیا وہ راحت جاں جب تین پہر پر تین بجیں
ادا و انداز ناز و عشوہ جو کچھ ہے اس شوخ فتنہ گر میں	نہ وہ پری میں نہ حور میں ہے نہ ہے وہ غلماں میں نے بشر میں
لگا نہ جراح اسپہ مرہم کہ داغ جاوے تو جائیں مر ہم	یہ کہتے ہیں سوختہ جگر ہم چراغ اجڑے ہوئے نگر میں
جس نے بالوں میں ترے عطر بسا دیکھا ہے	اس پہ آئی ہے بلا ہم نے بسا دیکھا ہے
ترا مجنوں ہوں اے پیارے اگر تو رشک لیلیٰ ہے	گیا جنگل کو تھا وہ میں نے بھی صحرا کی لے لی ہے

رافت

رافت۔ مولوی محمد عبد الرؤف خان رآز باشندۂ اندور ۱۹۰۹ء میں موجودہ والیہ بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم کے بچوں کے اتالیق تھے اور انھیں ایام میں سرکار عالیہ کے پرائیوٹ سکرٹری کے خدمات بھی انجام دیتے تھے، کچھ عرصہ ریاستِ اندور میں بھی ملازم رہے، حضرتِ داغ سے شعر سخن میں مشورہ کرتے تھے۔ پھر کچھ عرصہ پیسہ اخبار لاہور کے سب اڈیٹر رہے، اب معلوم نہیں کہاں ہیں، یہ چند شعر انکے نتائج افکار سے درج کئے جاتے ہیں ؀

ہم جس جگہ کھڑے ہیں وہیں کے وہیں تو ہیں
اٹھنا بھی ہے جو پاؤں تو پیچھے ہٹا ہوا

ق

ہم سے ہماری قوم کا کیا کام بن پڑا
کیا فرض اپنے ملک کا ہم سے ادا ہوا

بغض و حسد کا حال یہ ہے جل مرے وہیں
دیکھا کسی کا باغ جو پھولا پھلا ہوا

یاں بھائی ڈوب جائے جو آنکھوں کے سامنے
دیکھا کرے گا بھائی تماشا کھڑا ہوا

کس توقع پر سنائیں حالِ دل
پھر وہی کہدینگے تم "ہم کیا کریں"

وہ سمجھتے ہیں اسے بھی اک ہنسی
روکے ہم اے چشمِ پرنم کیا کریں

ایک تو ظلم کرو اور پشیماں بھی نہ ہو
اور پھر اس پہ یہ طرہ کوئی نالاں بھی نہو

خود نہیں مجھ سے طلب کرتے وہ یہ چاہتے ہیں
دل کا دل ہاتھ لگے اور کچھ احساں بھی نہو

آفتیں سارے جہاں میں ہیں ہمارے دم سے
ہم زمانے میں نہوں تو شبِ ہجراں بھی نہو

لیجئے چھین کے دل آئے تھے مہماں بنکر
آپکی طرح کسیکا کوئی مہماں بھی نہو

یا خدا اسلئے وہ کہتے ہیں ڈرانا کیا ہے
تو سہی حشر میں تیرا کوئی پرساں بھی نہو

تو بتاتا ہمیں یا کہ وہ سچ مان گئے
نامہ بر سچ تو بتا ہم ترے قربان گئے

میری دعوت پہ وہ فرماتے ہیں لو اور سنو
تم نے دیکھا ہی کبھی ہم کہیں مہمان گئے

بھلے اور برے پر نہیں حصر کچھ
طبیعت تو ہے آگئی آگئی

یہ میری جبیں پر عرق آگیا
یہ میری ہی تو آنکھ شرما گئی

تمھیں واسطہ بھلا غیر سے	سراپا مجھی پر تو یہ چھا گئی
نہ بگڑو بہت اب بناوٹ سے تم	وہ ہونٹوں پہ دیکھو ہنسی آگئی
تو اے شیخ یاروں سے اُلجھا اگر	سمجھ لے کہ شامت تری آگئی
اور کے وصل سے ظالم تری حسرت اچھی	لاکھ آرام سے اک تیری مصیبت اچھی
جب گیا میں درِ دولت پہ یہی فرمایا	ان سے کہدو کہ نہیں آج طبیعت اچھی

رافت

رافت منشی محمد عبد الغنی خان حیدر آبادی سکن شاگرد جناب فصیح الملک داغ دہلوی۔ یہ چند شعر انکے نتائج افکار سے درج کیے جاتے ہیں۔

بعد میرے قاصدِ خانہ خراب آیا تو کیا	کامیاب آیا تو کیا ناکامیاب آیا تو کیا
گھر خدا کا ہے نہیں اس میں اجارہ شیخ کا	کوئی مسجد میں اگر پیکر شراب آیا تو کیا
اب چھین کے پی جاتے ہیں زندانِ خرابات	ہاں ساقی بدست انھیں سر پہ چڑھا اور
آئے تھے جب ہم تو خالی ہاتھ آئے تھے یہاں	جب یہاں سے ہم چلے تو داغِ حسرت لیچلے
برابر لگے آگ دونوں طرف سے	اگر ہے تو سوزِ محبت وہی ہے

راقب

راقب منشی امام الدین نام راقب تخلص اپریل ۱۸۷۳ء میں قصور ضلع لاہور میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی والد ماجد کا نام شیخ امیر بخش صاحب تھا تعلیم معمولی ہوئی مگر حصول شاعری و زباندانی کے شوق میں اکثر دہلی و آگرہ میں رہے۔ ۱۸۹۴ء میں اپنا کلام حضرت تسنیم بھرتپوری کو دکھایا، بعدہٗ فصیح الملک بہادر نے خود مزین با صلاح کیا۔ قصائد وغیرہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں، مہاراجہ فریدکوٹ کے دربار میں کئی سال سے قصیدہ پیش کرتے ہیں اور اس ریاست سے کچھ وظیفہ بھی مقرر ہے۔ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

گھر کیا سینے میں غم نے تو ہوئی جاں رخصت	میزباں جانتے تھے ہم جسے مہماں نکلا

لوگ کہتے تھے کہ راقب تو فرشتہ خو ہے
وہ تو دلدادۂ اندازِ حسیناں نکلا

دونوں طرف سے جان بڑی ہی عذاب ہیں
قابو میں دلربا ہے نہ دل اختیار کا

جھک گئیں انکی نگاہیں شرم سے صبحِ وصال
کچھ تو تھکیں کچھ اور بھی بیمار آنکھیں ہو گئیں

یہ ستم دیکھو کہ کہتے ہیں مجھے
انکو کیوں بوسے ندوں جنکے لیئے

سب بجا، سب سچ، کہ میں بدنام ہوں
یہ تو فرماؤ ہوا کن کے لیئے

ایک کے دس دس بتانے وہ لگے
ہائے کیوں بوسے نہ گن گن کے لیئے

خیال ہٹتے ہٹتے ہٹے گا کسی کی الفت کا
مرض یہ گھٹتے گھٹتے گھٹے گا بہت پرانا ہے

چھپایا تیرے رخساروں کو بڑھکر تیرے بالوں نے
غضب ہے توڑ ڈالا مورچہ گوروں کا کالوں نے

لے لیا ہے دل تو لیلے جان بھی
مہربانی بھی ترا احسان بھی

ان لبوں سے ایکدن نکلی نہ ہاں
وہ گل لالہ ہیں نافرماں بھی

مر گیا تو مرمٹیں سب حسرتیں
میزباں بھی لٹ گیا مہماں بھی

سامنے بیٹھ کے دلکو جو چرائے کوئی
ایسی چوری کا پتہ خاک لگائے کوئی

وہ تو روٹھے ہی تھے لو موت بھی اینٹھی ہے
اس بُرے وقت میں کس کسکو منائے کوئی

راقم

راقم - لالہ بندراین صاحب راقم دہلوی - اِنکے سلسلۂ شاگردی کی نسبت تذکرہ نویسوں میں اختلاف ہے، اکثر ان کو مرزا رفیع سودا کا اور بعض مرزا مظہر کا شاگرد بتاتے ہیں - مگر مرزا مظہر کی شاگردی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا - البتہ اوائل مشق میں انھوں نے میر صاحب سے ضرور اصلاح لی تھی جس کی بابت خود میر تقی میر اپنے تذکرہ میں اشارہ کرتے ہیں کہ "بندرابن راقم از شاہجہاں آباد دست مشقِ سخن از مرزا رفیع میکند، قبل ازین با فقیر نیز مشورتِ شعر می کرد" میر صاحب کی تحریر کی تائید قدرت اللہ خاں نے بھی اپنے تذکرہ میں کی ہے راقم، فنِ سخن میں کامل دستگاہ رکھتے تھے اور شعر خوب کہتے تھے، چنانچہ میر حسن نے بھی اپنے تذکرہ میں انکی رسائی طبع کا بدین الفاظ اعتراف کیا ہے "بندرابن راقم بسیار پست قد

ولیکن بلند فکر ست" انکا اندازِ کلام خود اس بات کا شاہد ہے، انتخاب ملاحظہ ہو ÷

حامی کا میرے اُس سے لیکر جواب پھرنا
پیر واسطے خدا کے قاصد شتاب پھرنا

اک وہ بھی دن تھے راقم جو تھا ہمیں میسّر
گلشن میں ساتھ اُسکے پیتے شراب پھرنا

کہے کیا دردِ دل بلبل گلوں سے
اُڑا دیتے ہیں اُسکی بات ہنس کر

اے عشق مجھے تو اس طرح مار
تا یار کہے کہ "ہائے عاشق"

قطعہ

کام عاشقوں کا کچھ تجھے منظور ہی نہیں
کہنے کی ہی یہ بات کہ "مقدور ہی نہیں"

کہنا تھا کون یہ کہ خوشی ہی جہاں کے بیچ
اسباب کا تو یاں کہیں مذکور ہی نہیں

ای باغباں نہیں ترے گلشن سے کچھ غرض
مجھسے قسم سے لے چھیڑوں اگر برگ و بر کہیں

اتنا میں چاہتا ہوں کہ میں اور عندلیب
آپس میں دردِ دل کہیں ٹک بیٹھکر کہیں

مری بدشرابیوں سے کریں توبہ میگساراں
زہے وہ عمل کہ ہووے سببِ نجاتِ یاراں

سُنا کن سنے حال میرا کہ جوں ابر وہ نہ رویا
رکھے ہے مگر یہ قصہ اثرِ دعائے یاراں

قطعہ

یہانتک قبول خاطر کیجے تری جفا کو
تا سب کہیں کہ راقم رحمت تری وفا کو

مژگاں سے دل بچے تو ٹکڑے کرے ہی ابرو
یہ کہہ کے میں نے اُس سے جب اپنی داد چاہی

کہنے لگا کہ ترکش جسدم کہ ہووے خالی
تلوار گر نہ کھینچے پھر کیا کرے سپاہی

راقم

راقم۔ خلیفہ غلام محمد راقم دہلوی۔ لکھنؤ جانے سے پیشتر حکیم قدرت اللہ خان قاسم سے عربی فارسی کی انشا پردازی کے سبق لیتے تھے اور شاعری میں بھی ان ہی شاگرد تھے، علم پیشہ تھے اور طب میں دخل تھا۔ خوشنویسی میں فرد تھے، فارسی شعر کا بیشتر اور اُردو کا کمتر شوق تھا۔

فرقت میں تری جو مر گئے ہم
عشاق میں نام کر گئے ہم

بس عاشقی کر چکے مریجاں
غصہ سے ترے جو ڈر گئے ہم

ہاتھ میں اُسکے کچھ تو چمکے ہے
تیغ ہے یا کٹار ہے کیا ہے

جب میں نے کہا تم نے ملاقات اُڑا دی
تو اُسنے ہنسی میں یہ مری بات اُڑا دی

نے دیر میں کچھ ہے نہ حرم میں کچھ ہے دنیا ہے طلسمات عجائب راقم	رباعی	نے ہستی میں کچھ ہے نہ عدم میں کچھ ہے دم میں کچھ ہے اور ایک دم میں کچھ ہے

راقم

راقم۔ مظفر علی راقم خلف شیخ رستم علی متوطن چار کلیانہ ۱۲۷۰ھ میں ستر برس کی عمر تھی غدر کے دوران میں انتقال کیا مولانا عبدالباقی مغفور سے زبان فارسی اور فن سخن کی اصلاح کی تھی فارسی شعر بھی کہتے تھے ٭ یہ کلام کا نمونہ ہے۔

غیر تدویر نہیں ہیں بُتِ عیار کے کار تیغ مت کھینچ میاں ہاتھ کو پہنچے نہ ضرر آفریں دستِ جنوں تجکو کہ دم کے دم میں اِک جہاں قتل کیا جنبشِ ابرو نے تری آج صحرا میں بہے دیدۂ تر سے دریا		دم نہیں دیتے ہیں اور ہوتے ہیں اغیار کے یار تیرِ مژگاں ہے خود آرا دلِ بیمار کی مار کر دیئے خوب مرے جامہ و دستار کے تار کیا ستم دیکھیے دکھلائیں گے تلوار کے وار وار کے وار رہے اور رہے پار کے پار

راقم

راقم۔ خواجہ قمر الدین خان خلفِ اکبر خواجہ بدر الدین خان عرف خواجہ امان مترجم بوستان خیال، حضرت غالب دہلوی مرحوم کے رشتہ میں بھتیجے ہوتے تھے، مدۃ العمر خاندانی اعزاز کے لحاظ سے گورنمنٹ انگلشیہ کے پنشن خوار رہے اور ریاستِ جیپور سے بھی مہاراجہ رام سنگھ جی کے وقت سے روزینہ دار تھے اور دہلی چھوڑ کر وہیں جا رہے تھے، فن سخن کا موروثی مذاق تھا اور بڑے مشاق اور پُر گو سخنور تھے۔ جوانی میں بڑے وجیہ شکیل، جامہ زیب شخص تھے حضرت غالب، مومن، شیر، آزردہ، سالک، شیفتہ، ظہیر، کی صحبتیں دیکھے ہوئے تھے دیوان موسوم بہ "نغمۂ اردو" ۱۲۹۸ھ میں چھپا تھا جس کا نسخہ عطیۂ مصنف راقم کے کتب خانہ میں بھی موجود ہے، درجہ دوم کے شعرا میں اعلیٰ پایہ رکھتے تھے مضمون آفرین طبیعت پائی تھی۔ زبان و بیان میں سلاست اور بندش میں چستی، ترکیب کی استواری انکے اشعار کا خاص جوہر ہیں، ستر برس سے زیادہ عمر پا کر چھ سات برس ہوئے انتقال کیا۔

شق ہو گیا ہی سینہ جفاؤں سے یار کی		اب رازِ عشق ہمسے چھپایا نجائیگا	

رہنے دو زخم دل کو امانت ہے یار کی
احسان چارہ ساز اٹھایا نہ جائیگا

کس دل سے کہتے ہو کہ تجھے خاک میں ملائیں
تم سے تو خاک میں بھی ملایا نہ جائیگا

قدرت سے نقشہ قدِ دلدار بن گیا
اللہ سے بھی اب تو بنایا نجائے گا

کس کی بیتابی دل حال پریشاں کسکا
تم چھری پھیر بھی دو چارۂ درماں کسکا

مجکو وہ یاد کرے ہوش کی بتوا قاصد
جسکے لب پر نہ کبھی نام خدا کا آیا

آنکھ میں سحر ہے کافر کی کہ اُسکے گھر میں
جو تماشے کو گیا بن کے تماشا آیا

آجاؤ پھرتے چلتے کبھی غمکدہ میں تم
آنکھوں سے ہم بھی دیکھ لیں آنا بہار کا

لکھ دیتا وصل یار جو میرے نصیب میں
کیا اِس میں کچھ بگڑتا تھا پروردگار کا

کیا پوچھتے ہو حال کبھی دل میں بیٹھکر
آنکھوں سے دیکھو لطف مرے انتظار کا

آئے تھے اگر ملنے دم بھر تو ٹکے ہوتے
کچھ میری سُنی ہوتی کچھ آپ کہا ہوتا

محشر کی عقوبت کا اندیشہ نہیں ہمکو
وہ ہو لیا یاں ہمپر جو روزِ جزا ہوتا

پوچھا ہے مزاج آپنے آہا مرے دل کا
قدرت میں کُھلا آج نصیبا مرے دلکا

کیا بہار عمر اپنی کیا نشاطِ زندگی
جب مدارِ زندگانی حسرتوں پر رہگیا

پروانہ چیز کیا ہے فدا شمع پر ہوا
مرنا تمھیں دکھائیں گے جینا اگر ہُوا

وہ تو مہمان تھے رہتے نہیں آخر جاتے
تجکو بدنام مگر وقتِ سحر ہونا تھا

آئے نہ دو محتسبِ شہر اگر آ ہی گیا
اب تو لب پر قدحِ آتش تر آ ہی گیا

وہ ایسے دِل میں آگئے ہیں بیخبر رہا
دیدار جو نظارہ سوئے رہگذر رہا

ہم ہیں اور کشمکشِ مشکل دشوار میں دل
عشق کا لطف بھی آساں نہیں حاصل نہوا

طور پر جلوہ ہُوا موسی کو جس تنویر کا
تھا وہ اک سرمایہ اپنی آہِ آتش گیر کا

عین شبِ وصال تھا ساماں فراق کا
کچھ شام ہی سے عالم صبح نشور تھا

واعظ کے روکے رُک سکتے ہیں ہمسے حریفِ مے
جنت میں جا پئیں نہ ملے یاں اگر شراب

لوگ ایسا نہ ہو سمجھیں کچھ اَور
دیکھکر مجھکو نہ شرمائیں آپ

کبتک لیئے پھرے گی مجھے جستجوئے دوست
کبتک کنوئیں جھکائیگی اے آرزوئے دوست

قیس و فرہاد کی شہرت ہو خدا کی قدرت
حوصلہ عشق کا کس کس نے کیا میرے بعد

اے دِل گلہ کی یار سے اب گفتگو نکر
آزردہ اور خاطر آزردہ خو نہ کر

کعبہ ہو صنم خانہ ہو تفریق سی کیا بحث
سر ہمکو جھکانا درِ جانانہ سمجھکر

جان مٹھی میں دھری ہے کوئی تمکو دیدے
جھوٹے وعدوں پہ غلط آپکے اقراروں پر

کبھی سایہ میں کھڑا ہوں تو سرک جاتا ہے
یار کے کوچے میں دیکھے در و دیوار کے ناز

گھر بھی اپنا نہ ہوا خانۂ دلدار کے پاس
باتیں سُنتے ہی کبھی بیٹھکے دیوار کے پاس

ہم ڈاک بٹھا دینگے شبِ وعدہ نظر کی
آنکھوں پہ بٹھا کے انھیں لے آئینگے گھر تک

ناخن بڑھے ہوئے ہیں اگر چارہ گر نہیں
کر لینگے اچھے زخم جگر اس دوا سے ہم

کیوں ہمکو کوئی پوچھے تعلق نہیں جسے
اچھے ہیں یا بُرے ہیں کسی کی بلا سے ہم

اے نالہ ہائے ہجر تمھیں جانتا ہوں میں
جب بجھ گئے ہو آگ لگا کر رہے ہو تم

جس بزم میں گئے ہیں ہنسا کر اُٹھے ہیں ہم
جب تم سے بات کی ہے رولا کر رہے ہو تم

کل کون جیئے کون مرے کسکو بھروسا
ملجاؤ بس اب وعدۂ فردا نکرو تم

اللہ رے لاغری کہ تن آسانیوں میں ہم
اتنے گھلے کہ مل گئے روحانیوں میں ہم

وہ ملا مجکو مقدّر جو مقدر میں نہیں
محفلِ یار میں ہوں گردشِ ساغر میں نہیں

کسی سے دِل لگانا ہمنشیں سودا اسکو کہتے ہیں
مرض بیٹھے بٹھائے مول لینا اسکو کہتے ہیں

جب ان ناکامیوں پر منحصر ہے زندگی اپنی
خدایا مرگ کیا ہوگی جو جینا اسکو کہتے ہیں

جفا کر لو، ستا لو، دیکھنا محشر کے میداں میں
کہ دامن ہاتھ میں کسکے ہے کسکا مُنہ گریباں میں

میں وہ ناکامِ ازل ہوں کاتبِ تقدیر نے
مجھ سے پُوچھا کیا لکھوں میں نے کہا کچھ بھی نہیں

جوشِ مستی میں چلے آئے کہاں تم راقم
یہ تو مسجد ہے چلو خانہ خمار نہیں

دیکھا ہوا ہی اپنا وہ باغِ نعیمِ خلد
جز انبساطِ خاطرِ اربابِ دیں نہیں

زاہد نجات کے لیئے طاعت نہیں ضرور
کچھ بندگی ہی ذریعۂ عفوِ خطا نہیں

مفت مل جائے تو کعبہ میں پئیں یہ واعظ
یاں حریفِ می و میخانہ بنے بیٹھے ہیں

کہتے ہیں پینے کو وہ دیکھئے کیا دیتے ہیں
وہ بھی یاں دیتے ہیں یا روزِ جزا دیتے ہیں

کیا دھرا ہے نرگسِ بیمار میں
مستیاں ہیں اور چشمِ یار میں

حسن وہ حسن جسے دیکھنے کی تاب نہیں
جلوہ وہ جلوہ کہ چھپتا پسِ جلباب نہیں

دہر میں عیش کے سامان ہیں مہیا سب کچھ
ایک تم جلوہ گرِ عالمِ اسباب نہیں

کیا سبک ہو گئے عریانیِ تن سے مر کر
دوش پر جاتے ہیں اور زحمتِ احباب نہیں

ہنگامِ بے حجابی یہ شمع بھی بجھا دو
رہنے نہ پائے کوئی بیگانہ انجمن میں

تیرِ نظر سے تیری دونوں چھدے پڑے ہیں
دیوانہ رہگذر میں فرزانہ انجمن میں

ٹھہو کی اب تو حالت ہے دلِ بیتاب و مضطر میں
کہ گل پر رقصِ شبنم جلوۂ خورشید انور میں

لبِ غیر آج تھا ساغر پہ دورِ آتشِ تر میں
کہ موجِ مے گریزاں ہے لبِ ساغر سے ساغر میں

نہیں معلوم کس کس کا لہو خنجر نے چاٹا ہے
کہ ہر جوہر بہ رنگِ گل ہے موجِ آبِ خنجر میں

تقاضا حسن کے کہتے ہیں یہ صورت ہی بلا کی
کوئی منہ پہلے بنوا لے بلائے پھر ہمیں گھر میں

ہمیں نسبت ہی صہبا سے کہ ہم ہیں نسلِ آدم میں
ہمارا حصہ ہے راقم شرابِ حوضِ کوثر میں

زبانی مرنے والے سینکڑوں عیار ہوتے ہیں
محبت کرنے والے لاکھ میں دو چار ہوتے ہیں

قیامت ہی زلیخا اور یوسف کی خریداری
غضب ہے حسن کے سودے سرِ بازار ہوتے ہیں

دعائے وصل وہ مانگے کہ جسکے ہاتھ خالی ہوں
مرے ہاتھوں میں دامانِ خیالِ یار رہتے ہیں

خوب نکلے جستجوئے یار میں
خار دامن میں ہیں دامن خار میں

ہم تو اپنی حسرتوں کو ایک دن
دفن کر آئیں گے کوئے یار میں

کچھ ایسی بن گئی تصویر اسکے دستِ قدرت سے
رہا حیراں بنا کر آپ صورت آفریں برسوں

اُمید وصل کی رکھیں اور آپ سے رکھیں
گو یا کہ عمرِ خضر کی ہم آرزو کریں

تم سے نہ کہیں حال تو پھر کس سے کہیں ہم
یا اُسکو بتا دو کوئی تم سے جو سِوا ہو

وفاداروں میں ملتے ہو دکھاؤ کچھ وفا کر کے
اسی بیگانہ داری پر کہیں ہم - با وفا تم ہو

تمھارے گھر سے ہم نکلے خدا کے گھر سے تم نکلے
بھلا ایمان سے کہدو کہ کافر ہم ہیں یا تم ہو

مقصد تمھارے ہاتھ ہے قسمت خدا کے ہاتھ
جو کچھ خدا سے ہو وہ تمھاری زباں سے ہو

کیا ہو گا مسیحا سے کسی اور کو لاؤ
جس نے کہ علاجِ دلِ بیمار کیا ہو

وہ کام نہیں یاں کہ بنے چارہ گروں سے
وہ درد نہیں یاں کہ مسیحا سے دوا ہو

خوشامد سے بگاڑا آپ ہم نے اُسکی عادت کو
بنایا اپنا دشمن خود جتا کر منہ سے اُلفت کو

کہتے ہیں آنے کو وہ آئیں نہ آئیں دیکھئے
شوق میں کبتک ہمیں رستہ دکھائیں دیکھئے

کام تدبیر نہ تاثیرِ دعا کرتی ہے
وہی ہونا ہے جو تقدیر خدا کرتی ہے

آہ کو سمجھے تھے تسکیں کی دوا کرتی ہے
کیسی تسکیں مری حالت کو سِوا کرتی ہے

ایک دن وصل ہوا تھا یہ قیامت آئی
آجتک لیتی ہے بدلے شبِ ہجراں ہمسے

غیروں رات وہاں رہتے ہیں اب لُطف گیا
کل چھٹا آج چھٹا کوچۂ جاناں ہمسے

ایک دن رسم و رہِ غیر میں جائیگی ضرور
آبروِ عشق کی، شرم آپکی غیرت میری

یادگاروں میں اسد کی ہے یہ بندہ راقم
کیا ہوا بزمِ سخن میں نہیں شہرت میری

جاتے ہیں گلہ کرنے گلہ کر نہیں سکتے
ہلتے نہیں لب شوخیٔ گفتار کے آگے

تاثیر تو ہے میری نگاہوں میں بھی لیکن
چلتی نہیں اُس شوخِ فسونکار کے آگے

حسینوں سے نکر الفت دلِ ناشاد کہتے تھے
لہو رلوائیں گے کافر ستم ایجاد کہتے تھے

کس کا جوابِ نامہ مگر پارہ ہائے خط
اُڑتے ہوا پہ دیکھنا دو چار آئیں گے

نازِ دلدار بھی نہیں اُٹھتا
ناتوانی سے ناتوانی ہے

ہاں کلک کوئی زمزمۂ دلستاں رہے
اندازِ دلفریبیٔ اہلِ زباں رہے

تھم ہجوم نا اُمیدی! اب جواب آنیکو ہے — مژدہ تسکیں! ابکے قاصد کامیاب آنیکو ہے

لذّتِ قتل کہاں پُرسشِ صمصام میں ہے — عشرتِ مرگ تو کچھ عشوۂ اصنام میں ہے

ایسی ہوگی نہ کسیکی شبِ غم کی صورت — صبحِ محشر میں نہ ہوگا وہ مری شام میں ہے

خوب کٹتی ہے شبِ ہجر کہ بیکار نہیں — دل کسی یاد میں ہے نالہ کسی کام میں ہے

یاں بہار آئی ہے ساقی ابھی آرام میں ہے — آنکھ ساغر پہ ہے دِل بادۂ گلفام میں ہے

یار کیا صحبتِ یارانِ مے آشام میں ہے — بیقراری سے جو شب بھر دلِ ناکام میں ہے

وعدۂ یار وفا ہوگا نہ گھبرائے دِل — وہ بھی دن ہوگا اگر گردشِ ایام میں ہے

عاشقی کھیل نہیں خاک نہ سمجھے راقم — رخصتِ جان بھی آغاز کے انجام میں ہے

کہتے ہو کہ ہم غیر سے ملتے نہیں حاشا — کہدوگے قسم کھاکے یہ اغیار کے آگے

"وہ کسی سے نہیں ملتے" کہتے تھے تم تو — یہ کیا کر رہے ہو، یہ کیا ہو رہا ہے

حقیقت مری آپ کیا پوچھتے ہیں — مقدر کا پورا لکھا ہو رہا ہے

جانتا ہوں کہ اُسے دیکھ کے دم جاتا ہے — پھر اُسے دیکھنے جاتا ہوں یہ سودا کیا ہے

تیر سینے میں نہیں، پھانس کلیجے میں نہیں — پھر خلش کیسی ہے، یہ دِل میں کھٹکنا کیا ہے

تم رہو غیر رہے، تم کو مبارک عشرت — ہم چلے جائیں گے محفل سے ہمارا کیا ہے

اللہ رے خوئے شوخ اُلٹ کر نقاب آپ — لیتا صبا کا نام بگڑ کر عتاب سے

ساماں نئے نئے ہوں شبِ وصلِ یار میں — مے ابر سے برستی ہو جام آفتاب سے

عیش کی رات مقدر سے اگر ہوتی ہے — بات کرنے نہیں پاتے کہ سحر ہوتی ہے

حسنِ زیبا لاکھ نظروں سے چھپاتے جائیے — اور کھلتا جائے گا جتنا چھپاتے جائیے

مجھسے ملنے کو وہ آتے ہیں کھلے تیرے نصیب — مژدہ ہو اے دلِ بیمار قیامت آئی

اُن کو اغماض کہ پیکاں کو نہ ضائع کیجے — یاں جگر تشنۂ بیدادِ نشانی مانگے

ہائے راقم نہ رہے حضرتِ غالب سر پر — قدر فرزند کی ہوتی ہے پدر کے ہوتے

برسوں گذر گئے یہی سُننے کہ آؤ گے	وعدوں کی انتہا ہے نہ حد انتظار کی
وصل ہو یا اور ساماں کچھ نہ کچھ ہوگا ضرور	آرزوئے عاشقِ دلگیر کچھ کہتی تو ہے
رات سے مضطرب ہے دلِ راقم	دیکھیے آیا یہ بے قرار کسے
ڈھونڈھا کئے جہاں میں کوئی باوفا ملے	جتنے ملے ہمیں وہ غرض آشنا ملے
مقتل میں آج آؤ چھُری سے گلا ملے	اُلفت کا امتحاں ہو جفا سے وفا ملے
اک ہم ہیں بے نصیب کہ دشنام بھی نہیں	اک وہ ہیں جنکو بوسہ لبِ التجا ملے
ہونیکو ہے شاید کوئی سامان خدا ساز	جو شام سے ہی اور ہی رونق مرے گھر کی
واعظ ڈرا نہ تو ہمیں روزِ حساب سے	کر لینگے توبہ مرنے سے پہلے شراب سے
خضر کو دیئے یارب عمر کی کیوں رائگاں تونے	کسی عاشق کو دی ہوتی یہ عمر جاوداں تونے

رام پرشاد ۔ منشی رام پرشاد کایستھ سکینہ لکھنوی داروغہ سرکار نواب سر محسن الدولہ بہادر نواسہ حضرت غازی الدین حیدر داماد حضرت محمد علیشاہ، بڑے طبّاع، صاحب لیاقت و سلیقہ شعار اہلکار تھے۔ اپنے آقا کا اعتماد کلّی ان پر تھا۔ اور جملہ انتظام انھیں کے ہاتھ میں تھا، حسین آباد کے امام باڑے کا بھی (چونکہ نواب صاحب اُسکے متولی تھے) تمام نظم و نسق سالہا سال انکے ہی ہاتھ میں رہا۔ اور تمام متعلقین انکی نیک نیتی اور حسن سلوک کے مدّاح رہے ۲۵ برس کے قریب ہوئے انتقال کیا ؛

ہائے اِس مہمانسرا سے ہاتھ خالی گھر چلے	بارِ عصیاں مفت ہمتو اپنے سر پر دھر چلے
غور کر کے خوب دیکھا کوئی بھی اپنا نہیں	خوابِ غفلت میں عبث ہم عمر ضائع کر چلے
گو کہ ہونا ہے وہی لکھا ہے جو تقدیر میں	ہر بشر کو چاہئے کچھ کام اچھے کر چلے
رام پرشاد اُن کو جنت میں پلا جامِ طہور	تشنہ لب جویاں سے بھر ساقیِ کوثر چلے

راوی ۔ مصاحب علی خلف منشی اکرام علی ساکن قصبۂ نادون متصل بلگرام۔ مرزا مہدی کوثر کے صاحب دیوان شاگرد اور وقتِ ترتیب تذکرہ سراپا سخن زندہ تھے۔

کیونکر نہ باندھوں کھاکے میں حسنِ جگر کمر	ملکِ عدم کو باندھ گئے ہمسفر کمر
مانی سے کھنچ سکے تری تصویر کس طرح	ہوش و حواس ہو گئے گم دیکھ کر کمر
یہ جوشِ گریہ یادِ کمر میں ہے ان دنوں	رویا میں جس جگہ ہوا پانی کمر کمر
بدزیب یہ ردیف ہے راوی نہ فکر کر	ایسے ہی باندھ لائینگے اہلِ ہنر کمر

ربط منشی دیبی پرشاد خلف منشی موہن لال کالیستھ بھٹناگر عدالتِ دیوانی ضلع مراد آباد میں ۱۸۵۸ء میں پیشکار تھے اور ملک الشعرا شیخ مہدی علی خاں ذکی کے ارشد تلامذہ میں گنے جاتے تھے انکے بھائی منشی کنہیا لال بھی شاعر تھے اور ضبط تخلص کرتے تھے۔ تذکرہ شعرائے ہنود سے کچھ کلام انتخاب کیا گیا، بڑے ذکی، فہیم، اور طباع نکتہ سنج تھے، چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

اجل بھی تو نہیں آتی برا ہو سخت جانی کا	الم کبتک اٹھائیں یار کی نامہربانی کا
یہی ہیں لذتیں تو ہجر بغیں کیا کیا نہ رو ئینگے	اگر یاد آئیگا پیری میں عالم نوجوانی کا
بہیں وہ نشتر نگیں ہر عضو کو دزدیدہ تکتے ہیں	ہوا ہے عشق انکو آپ اپنی نوجوانی کا
اٹھا کر آنکھ بھی حوروں کو جنت میں نہ دیکھیں گے	رہا دھڑکا جو ایسا ہی کسی کی بدگمانی کا
نہ پوچھ اے ربط حالِ دل غضب میں جان آئی ہے	برا ہو عشق کا یارب بھلا ہو نوجوانی کا

رباعی

ہر طرح سے آپ تو ستائیں کیا خوب	ہم شکوہ زبان پر نہ لائیں کیا خوب
دیں گالیاں آپ ہم ہنسی میں ٹالیں	اور آپ ہنسی میں روٹھ جائیں کیا خوب

جو مصرع ایک ہی عشوہ و غمزہ ایک مصرع ہے	تمھاری شانِ محبوبی عجب دلچسپ مطلع ہے
جہاں ہے وہ قصیدہ پڑھتا ہے حمدِ باری کا	ازل مطلع ہے جس کا اور ابد جس کا کہ مقطع ہے
مشابہ ہے مگر اس میں کہاں ہے یہ دل آویزی	ثریا کیا ہے جو کچھ آپ کا جھومر مرصع ہے
ادا و عشوہ، ناز و غمزہ ہیں یہ چار رکن اسکے	قدِ موزونِ جاناں بھی عجب برجستہ مصرع ہے
اسی کے ہیں یہ سب نقش و نگار اے ربط کھول آنکھیں	مصور ہے وہ ممدوحِ زمان عالم مرقع ہے

ربط نواب مظفر علیخان صاحب برادر و تلمیذ حضرت حسان الہند نواب رضوان علی خان رضوان

رئیس مراد آباد ان کے بزرگ بڑے صاحب جاہ و ثروت تھے، انقلاب زمانہ سے وہ حالت نہیں رہی پھر بھی آسودگی سے بسر اوقات کرتے ہیں، رات دن شعر و سخن کا مشغلہ رہتا ہے معمر آدمی ہیں کلام کا انتخاب حاضر ہے۔

مُرادوں کے دن ہیں جوانی کی راتیں
اُمنگوں پہ آیا ہے جوبن کسی کا

لاکھ قرباں کریں ہم تجھ پہ دل و جاں اپنا
تو نہ ہوگا کبھی غارتگرِ ایماں اپنا

یہ تری زلف پہ واریں گے وہ چہرہ پہ ترے
لائے ہیں نذر کو دل گبر و مسلماں اپنا

رو رو کے یاد آتے ہیں دندانِ یار آج
ہے صبح سے بندھا ہوا اشکوں کا تار آج

لائی شمیمِ گیسوئے جاناں مگر صبا
کیوں کوڑیوں کے مول ہے مشکِ تتار آج

ہنس ہنس کے وارِ تیغ کے قاتل نے جو کیے
زخموں کی بدھی بن گئی پھولوں کا ہار آج

اٹھا نقاب تو خورشیدِ حشر کا چمکا
جو بکھری زلف تو آئی بلا مرے سر پر

بہار آئی جنوں خیز ہے چمن کی ہوا
رگوں نے کر لیا گھر اپنا نوکِ نشتر پر

ہوا نہ رتبۂ شہادت کا ہمکو ربط نصیب
گلا اٹھا کے رکھا بار بار خنجر پر

لگا دیں آگ تیرے دل میں ظالم
دکھا دیں آہِ سوزاں کا اثر ہم

چمک کر داغِ اُلفت ہیں یہ کہتے
چراغِ طور ہیں شمس و قمر ہم

وہ بلبل ہوں رہا ہوں میں پسندِ باغباں برسوں
نہالِ عیش پر اپنا رہا ہے آشیاں برسوں

کسی پہلو نہ نکلا میں ترے زندانِ اُلفت سے
لیے قیدِ محبت نے نہ کیا کیا امتحاں برسوں

صبا نے خاک اڑائی جستجو میں تیری مدت تک
پھرا بر باد موجِ بوئے گل کا کارواں برسوں

چین آتا ہی نہیں دم بھر فراقِ یار میں
کب تلک تڑپا کروں میں یا الٰہی کیا کروں

حلقۂ گیسوئے پُر خم سے رہائی نہ ہوئی
پیچ پر پیچ دیئے زلفِ دوتا نے ہم کو

ربط طاقت بھی رسائی کی ہمیں تا ملکوت
پھینکا اسفل کی طرف مکر و ریا نے ہم کو

اُن پہ نظر کرے گی نہ رحمت اِلٰہ کی
کچھ واعظوں نے قدر نہ جانی گناہ کی

غل ہے کہ ہاتھ ہاتھ کو آتا نہیں نظر
محشر میں دھوم ہے مرے روزِ سیاہ کی

سب بیگناہ رحمتِ غفار دیکھکر
حسرت سے شکل تکتے ہیں اہلِ گناہ کی

زمیں جگر میں آتی آسماں زیر و زبر ہوتے
ہمارے نالہ ہائے دل جو کچھ بھی با اثر ہوتے

ہدف تیرِ ستمگر کے جو دونوں دل جگر ہوتے
ہجوم شوق کے ساماں ادھر ہوتے اُدھر ہوتے

ترکِ مے سے کیا بُری گت ہوگئی
توبہ کیا کی ہمنے آفت ہو گئی

جو اضطراب بسملیں جو سوزش جگر میں ہے
سیماب موج میں ہے نہ برق و شرر میں ہے

یوں مفت یہ شوخی نہیں پائی ہے حنا نے
سینچا ہے اسے مدتوں خونِ شہدا نے

یہ عشق وہ ظالم ہے کہ اللہ بچائے
برباد کیئے اسنے گھرانے کے گھرانے

چھپ جاؤگے کیا عیسیٰ کے پہلو میں ہاں بھی
تسلی کبھی عاشق کی جو محشر میں خدا نے

یا ہمنے سکھائے تھے انھیں حسن کے انداز
یا ہمکو پڑے ناز حسینوں کے اُٹھانے

لو تیر و کماں ہاتھ میں دل یہ ہے جگر یہ
ہاں دیکھیں تو تم کیسے اُڑاتے ہو نشانے

ہے کچھ تو جو بلبل سے چٹکنے لگے سب گل
کیا پھونکدیا کان میں غنچوں کے صبا نے

ابرِ نیساں کی طرح ہجر میں رلواتی ہے
یاد تیری دلِ مضطر سے کہیں جاتی ہے

شوخیٔ خامۂ بہزاد بھی چکراتی ہے
رنگ بنکر تری تصویر اُڑی جاتی ہے

جب اُلٹ جاتا ہے گیسو رخِ نورانی سے
شبِ تاریک میں بجلی سی چمک جاتی ہے

رابط۔ شیخ امام الدین ساکن قصبہ کانٹ ضلع شاہجہانپور۔ کریم بخش فرقت سے ۱۸۹۴ء سے اصلاح لیتے تھے اُس زمانہ کا کلام پیامِ عاشق سے نقل ہوا۔ رابط

دہانِ زخم کو یہ آرزو ہے اے سفاک
نمک چھڑک کے تڑپ کا مزا چکھا دینا

نہ پھر جڑے گا جو ٹوٹا ہمارا شیشۂ دل
کہیں نظر سے نہ اے سنگدل گرا دینا

سنا ہے فتنۂ محشر ہے آپکی رفتار
یہ آرزو ہے کہ چلکر ذرا دکھا دینا

نکلجائے ترا دم ہچکیوں میں مدعا یہ ہے
اسی باعث سے تو اے رابط انکو یاد آیا ہے

رحم

رحم - راجہ نیم چند۔ حیدر آباد دکن کے منصبدار اور باوفر رئیس ہیں، شعر و سخن کا بھی گاہ گاہ مشغلہ ہو جاتا ہے عمر ۳۵ سال کے قریب ہے، بار ہا کلام اور حال کے لئے لکھا مگر جواب نہ آیا۔

تم نہ سننا کبھی ہیں درد انگیز	دل اُمیدوار کی باتیں
ہے لگاوٹ کا یہ نرالا ڈھنگ	ظلم کے ساتھ پیار کی باتیں
اسی واسطے ناصحا دل بنا ہے	خطا کیا ہوئی گر کسیکو دیا ہے

رحمٰن

رحمٰن - محمد عبد الرحمن خان مرحوم رحمٰن تخلص ۸ رجون ۱۸۵۷ء کو فرخ آباد میں پیدا ہوئے۔ انٹرنس تک تعلیم پائی سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں پہلے منصرم ججی خفیفہ ڈیرہ دون ہوئے پھر ۱۹۰۵ء میں ڈیرہ دون سے بعہدۂ منصرم ججی فرخ آباد کو تبادلہ ہوا۔ اور یہاں بعارضۂ تپ دق ۱۰ستمبر ۱۹۰۶ء کو انتقال فرمایا۔ ناول نویس بھی تھے، حکام نے خوش ہو کر اُنکے لئے تحصیلداری کی سفارش کی مگر حیات نے وفا نہ کی۔ فن ہنوٹ کے کامل اُستاد تھے، فقیروں سے خاص ارادت تھی ایک کتاب لطائف رحمانی لکھی تھی جس میں عملیات وغیرہ درج ہیں۔ اخبار و نکی نامہ نگاری بھی کی آپکے دو صاحبزادے بھی موجود ہیں ایک جدت اور دوسرے فطرت تخلص کرتے ہیں۔ اُنھوں نے آپکی چند غزلیات بھیجیں جن کا انتخاب درج ذیل ہے۔

ماہ کامل سے جبیں کو ترے اچھا دیکھا	رشک خورشید منور رخ زیبا دیکھا
رات کے آنیکو کہتا ہوں تو وہ کہتے ہیں	شب کو خورشید کہیں تمنے نکلتے دیکھا
بار احسان سے جراح کے چھوٹا صد شکر	دل مجروح میں ناسور بہا خوب ہوا
کیسی نوک مژہ کے نشتر لگے ہوئے ہیں ہزاروں لپر	بہا ہے حسرت کا خون ہو کر ہیں غرق خنجر کی آب میں
یا الٰہی وہ رہے فرمانروائے ملک حسن	کشور دل کی ہمارے جس سے ویرانی ہوئی
دست بستہ جب کہا کچھ عرض کرنا ہے حضور	ہنسکے بولے کیا کہوگے بات ہی جانی ہوئی
مسکی محرم۔ بند ٹوٹے رنیلگوں رخسار ہیں	غیر کے گھر آپ کی کیا خوب مہمانی ہوئی
بہ گیا آنکھوں کا سرمہ لاکھا ہونٹوں سے اُڑا	آئینہ دیکھا تو سخت اُنکو پشیمانی ہوئی

رات کی باتوں کا جب اُن سے کیا کچھ تذکرہ	اُٹھ گئے شرما کے کچھ ایسی پشیمانی ہوئی

باغ میں پھول سے رخسار دکھا کے تمنے	گل و بلبل کا کیا خون لڑا کے تمنے
آنکھوں میں سُرمہ کا دنبالہ غضب ڈھاتا ہے	پر نکالے ہیں نئے تیر قضا کے تمنے
اچپلاہٹ میں ہے سنجیدگیِ اہلِ شباب	ڈھنگ سیکھے ہیں نئے شوخی میں حیا کے تمنے
یاد آئی ہے تمھیں گرمیِ صحبت کس کی	کس لئے کھول دیئے بند قبا کے تمنے
کاٹ دی شاخِ طربِ مزرعِ دل سے میرے	لُطف دیکھے نہ ذرا نشو و نما کے تمنے
دیکھئے جسکو وہ پڑھتا ہے تمھارا کلمہ	کیا سکھایا ہے یہ بندوں کو خدا کے تمنے

رحمٰن

رحمٰن - منشی ضیاء الرحمٰن شاگرد معجز بریلوی - قاضی محمد خلیل صاحب کے مشاعرے کی غزل سے چند شعر درج ہیں ٭ جوان آدمی ہیں اور یہ کلام ہے -

جسے کہتے ہو تیر آہ دنیا سے نرالا ہے	یہ جسکے دل سے نکلا ہو اسی کے دلمیں بیٹھا ہے
نہ جاؤ اُسکی بالیں سے کوئی حسرت نہ رہجائے	تمھارے سامنے ہی دم نکلجائے تو اچھا ہے
بُرا تم جسکو کہتے ہو وہ اچھا ہو نہیں سکتا	جسے کہتے ہو تم اچھا بُرا بھی ہو تو اچھا ہے

رحمت

رحمت - رحمت علی رحمت فرا بتدار و شاگرد امام بخش صہبائی - مثنوی نالۂ بلبل - حدیقۂ رحمت و مثنوی شکایتِ فلک، اِن سے یادگار ہیں - فارسی شعر بھی کہتے تھے - کتب درسیہ و رسائل عروض کو بہت تحقیق و تدقیق سے پڑھا تھا - عرصہ ہوا انتقال کیا - یہ چند شعر اُنکے طبعزاد ہیں -

دل ہی نایاب بہت شوخیِ جاناں کی قسم	ہدفِ تیر ہے جاں کاوشِ مژگاں کی قسم
طعنے اتنک ہیں کہ رُخ کی مرے کیا قدر تھیں	ہیں نے اک روز کہیں کھائی تھی قرآن کی قسم
تھا غمزہ تیر سے سے ہوا اور تیز تر	پرسش میں تیغ کی ہے بہت دخل آپ کو
رحمت یہ عمر اور ورع خیر ہے تجھے	بتّا تو کیوں لگائے ہے عہدِ شباب کو
ابر بہار کی سی مجھے چشمِ تر ملے	جوں برق مضطرب مجھے یارب جگر ملے
تیرہی کچھ یہ طور نرالا جہان سے ہے	ورنہ یہ رسم ہے کہ بشر سے بشر ملے

رحمت

رحمت پنڈت گنگا پرشاد ولد پنڈت موتی لال کشمیری لکھنوی شاگرد حضرت امانت ۱۲۶۹ء میں بروقت ترتیب تذکرہ سراپا سخن انکا عالم شباب تھا عرصہ ہوا قضا کر گئے۔ کلام ملاحظہ ہو:

ہم رند کس طرح نہ دعا دیں اُٹھا کے ہاتھ
دیتا ہے جام پینے کو ساقی بڑھا کے ہاتھ

مَلتا ہوں غم سے ہیں کفِ افسوس راہ میں
چلتے ہیں ساتھ غیر کے جب وہ ملا کے ہاتھ

اے غیرتِ مسیح ترا عشق لے گا جان
ہے موت میری اس مرضِ لادوا کے ہاتھ

رحمت خوشی سے پاؤں نہ پھیلاؤں کس طرح
دیکھوں گلے میں اپنے جو اس مہ لقا کے ہاتھ

رحمت

رحمت حکیم حافظ محمد رحمت اللہ رحمت باشندہ بنارس اوائل مشق میں برسوں خلیل الدین حسن ظاہر بنارسی سے اصلاح لیتے رہے پھر جب ۱۸۹۸ء میں حضرت داغ حضور نظام کے ہمراہ بنارس گئے اُنکی خدمت میں حاضر ہو کر شرف تلمذ حاصل کیا۔ بڑے پُر گو کہنے والے ہیں کچھ تلامذہ بھی کر لیئے ہیں، دیوانِ غیر مطبوعہ تیار ہے، شعر گوئی میں اچھی مہارت ہے۔ صفائی مضمون اور زبان کا خیال رکھتے ہیں، بندش بھی چست ہے، تعقید سے بھی احتراز کرتے ہیں الغرض بدرجہ اوسط تمام خوبیاں انکے کلام میں موجود ہیں۔

ہے اہلِ حشر کو بھی قصد کیا ٹھکانے کا
کیا جو وعدہ قیامت میں مُنہ دکھانیکا

ایک ہی جلوہ میں غش کھا کے گرے تم رحمت
کونسی بات یہ تھی دل کو سنبھالا ہوتا

میرے پہلو سے وہ اُٹھ کر چل دیئے
اور کیا بیتابیٔ دل سے ملا

ہائے اب دل کھو کے پچھتاتا ہوں میں
کیوں کسی زہرہ شمائل سے ملا

ہو نہو اس میں بھی کوئی چال ہے
وہ نہ جانے ہمسے کس دل سے ملا

لیکے آئے داغِ حسرت دل میں ہم
خوب تمغہ اُن کی محفل سے ملا

دوست دشمن کو برے کہیئے تو سہی
کون کس دل کون کس دل سے ملا

حق کا ملنا تو بہت آسان ہے
آدمی البتہ مشکل سے ملا

جان کر دوں اُنکے قدموں پر فدا
جب وہ سمجھیں گے کہ یہ دل سے ملا

تو نہیں ملتا جو مجھ سے کیا ہوا — تیر تو تیرا مرے دل سے ملا
بے وفا مشہور عالم میں ہوئے — بس یہ ہم کو عہدِ باطل سے ملا
اب ہے رحمت ہاتھ دل پر کس لیے — اور آنکھیں شوخِ قاتل سے ملا

تیغ کھنچ کر رہ گئی خنجر نکل کر رہ گیا — آج قاتل مجھ پہ کیوں تیور بدل کر رہ گیا
دل سے کہتے تھے نکر ضبطِ فغاں مانا نہیں — آپ اپنی آگ میں کمبخت جل کر رہ گیا
سچ بتا اے شمعِ محفل کس لیے روتی ہے تو — یہ پڑی ہے راکھ کس کی کون جل کر رہ گیا
جب اٹھائی یار نے روئے منور سے نقاب — کوئی غش کھا کر گرا کوئی سنبھل کر رہ گیا
پا گیا اچھی جگہ لیتا نہیں جانے کا نام — دل مرا مٹھی میں اس بت کی مچل کر رہ گیا

وحشتِ دل! مجھے گھر جانے دے — اے جنوں چھوڑ دے داماں میرا

کیا کہوں دل کے عوض کیا یہ صنم دیتے ہیں — رنج دیتے ہیں، الم دیتے ہیں غم دیتے ہیں

ہوا ہے دامنِ دل پرزے پرزے — کسی سے چاک یہ کیونکر سیئے جائیں

تری تصویر گر دیکھیں تو ہو وہ بیخودی طاری — نہ آئیں ہوش میں حورانِ فردوسِ بریں برسوں

وقتِ زینت چھیڑنے پر میرے ہو ہو کر خفا — ہائے یہ کہنا کسی کا بال سلجھانے بھی دو
دل جگر مائل ہیں دونوں اس کی چشمِ مست پر — لطف ہے میکش بھی دو ہیں اور میخانے بھی دو

حیا کیا کام ہے خلوت میں تیرا — ترا اس وقت میں آنا ستم ہے

عجب حال ہے اس دلِ مضطرب کا — یہی رہنما ہے یہی راہ زن بھی
قیامت کے اے بت ہیں انداز تیرے — فدا جس پہ ہیں شیخ بھی برہمن بھی

موسمِ گل ہے یہ حسرت ہے مجھے ای ساقی — توبہ توڑوں ترے ٹوٹے ہوئے پیمانے سے

یقیں تیری باتوں کا کیونکر نہ آئے — کہ برسوں سے وعدہ وفا ہو رہا ہے

بے طرح آج تم سنورتے ہو — ہیں ارادے کہاں کے جانے کے
درد سینے میں لب پہ آہ و فغاں — یہ نتیجے ہیں دل لگانے کے

بتاؤ تو میری یا مدعی کی
بتوں کو بھی الفت ہے کیسی
جو دل سے دوست نے بھی دشمنی کی
کوئی امید رکھے کیا کسی کی
زمانے کے ہوئے ارمان پورے
مگر نکلی نہ حسرت میرے جی کی
کہو تو کیا یہی لازم تھا تمکو
ہمارے دشمنوں سے دوستی کی
وہ مہر و فاتحہ پڑھنے جو آیا
چڑھی مرقد پہ چادر چاندنی کی
عدو سے حال دل خود کہہ رہا ہوں
بڑی ہوتی ہے حالت بیخودی کی
سنبھالے دلکو اپنے خاک ناصح
طبیعت ہو جو بے قابو کسی کی
کہو تو کیوں سہے یہ بناسنورنا
مریجاں جان لوگے کیا کسی کی
خدا کی یاد بھی کچھ کرلو رحمت
بہت تم نے بتوں کی بندگی کی
عدو کے نام سے انکو پیام بھیجا ہے
جو کھ گئے تو مزا ہوگا دل لگی ہوگی

یہاں کے مرنے والے بھی مزا پاتے ہیں جینے کا
کہیں فردوس سے بڑھکر زمین کوئے قاتل ہے
محشر کا نمونہ وہ بت ہوش ربا ہے
انداز قیامت کے ہیں قیامت کی ادا ہے
لیتی تو ہر اک شخص کی جاں اسکی ادا ہے
بدنام مگر مفت زمانے میں قضا ہے

رحمت محمد رحمت اللہ خلف حافظ محمد عبداللہ خاص بلندشہر کے متوسط الحال باشندوں میں سے ہیں عمر تقریباً ۲۸ سال ہے مذاق شعر اگرچہ جدید ہے مگر دو چار سال ہی کی کثرت مشق نے قریباً پرگو کردیا ہے منشی سید محمد ناظر حسین صاحب ناظر سکندرآبادی ملازم ریاست ٹونک کے شاگرد ہیں اور مدرسۂ اسلامیہ بلندشہر میں مدرس ہیں۔ کلام درج تذکرہ ہے *

جو آئی تیرے آنے سے وہی رونق تھی محفل کی
اڑا جو تیرے جانے سے وہی تو رنگ محفل تھا
ستمگر مجھ سے لیکر کیوں اسے پامال کر ڈالا
بڑے نازوں کا پروردہ یہ مجھ ناشاد کا دل تھا
دل ناشاد کی میرے نہ سمجھی قدر کچھ تم نے
یہ گلدستہ نظر کے سامنے رکھنے کے قابل تھا
اک لفظ کن سے کی ہی معمور بزم عشرت
دو حرف سے ہے ظاہر سب کچھ کمال تیرا

سبزۂ خط ہو چلا آغاز کیوں حیراں ہو تم
اسکے سایہ سے بچا ناچور ہے اے باغباں
ہو کے کاہیدہ ہنے اندوہ سے شکل ہلال
ہوش و حواس کیا ہوئے عشاق سے پوچھ
دلمیں کھٹک رہا ہے سر خار آرزو
کہا جب آپ اپنو آفت جاں ہوتے جاتے ہیں
غضب کرتے ہو تم اُبھرا ہوا جوبن دکھاتے ہو
جوبن اُبھر کے کہتا ہے اُٹھکا شباب ہیں
کرتے ہو آج شیخ جی ہمکو نصیحتیں
جہاں ہیں رسم سحر اُس آنکھ کے کاجل سے نکلیگی
یوں چاند سے تو بڑھکے ہیں پر یوں اُس سے سوا ہی
اقرار یہ تم وصل کا کرتے تو ہو لیکن
جب اُن سے کہا لیتے دو زلفوں کی بلائیں
کیا پوچھتے ہو عشق میں مشہور ہے رحمت

بیٹھنے والا ہے اب ہالے کے اندر آفتاب
صاف اڑا لیجائے گا رنگ گل تر آفتاب
یار کے بدلے ہوئے تیور جو دیکھے آفتاب
بیخود ہوئے ہیں جلوۂ دیدار دیکھکر
اسکو نکال دیجئے بہت بیقرار ہوں
تو فوراً ہنسکے فرمایا کہ ہاں ہاں ہوتے جاتے ہیں
دل رحمت میں پیدا اورماں ہوتے جاتے ہیں
تم لاکھ رکھو ہیں نہ ہوں گا حجاب میں
کیا کیا نہ ہوگا منفعل نے شباب میں
یہ عالمگیر ظلمت نور کی مشعل سے نکلیگی
اُس میں کوئی انداز نہیں تجھ میں ادا ہے
مانع نہ ہو وہ - شرم سے بھی پوچھ لیا ہے
کس ناز سے بولے کوئی دیوانہ ہوا ہے
ہاں جان بھی دیدیگا وہ - دل دے ہی دیا ہے

رحمت

رحمت تخلص نام تاریخی ظفر علی مشہور محمد رحمت اللہ خلف شیخ عبداللہ خان نقشہ نویس میرٹھ اصلی وطن ابتدائی تعلیم و تربیت دلّی میں پائی - عربی فارسی بقدر ضرورت مولوی شاہ محمد عبدالحکیم صاحب صدیقی المتخلص بہ جوش حکیم سے پڑھیں اور اُنھیں سے فن شعر میں تلمذ حاصل کیا شعر میں روزمرہ کے دلی جذبہ کا مطلب بآسانی ادا کر لیتے ہیں پہلے میونسپل بورڈ غازی آباد میں کلرک تھے فی الحال ایکاؤنٹنٹ آفس میرٹھ میں ہیڈ کلرک ہیں انتخاب کلام یہ ہے -

ادھر پہلو سے وہ اُٹھا اُدھر پہلو میں درد اُٹھا
ہوا گھٹ گھٹ کے دلمیں خون ارمان و تمنا کا

جفا پیشہ جسے سمجھے تھے وہ آرام جاں نکلا
نتیجہ تجھ سے گر نکلا تو یہ ضبط فغاں نکلا

دن کو رو رو کے روز شام کیا / کام کا پر نہ کوئی کام کیا
حیف دو روزہ زندگی کے لیئے / ہمنے کیا کیا نہ اہتمام کیا
یہ تو کہیئے کہ آپنے رحمت / کچھ وہاں کا بھی انتظام کیا

ستارا اوج پہ ہی بخت ہے رسا دل کا / کہ آج پوچھتا ہے حال بے وفا دل کا
نہ تجھسے ملتے نہ سہتے اذیتیں شب و روز / بُرا کیا جو کہا ہمنے کر دیا دل کا
وہ آئے بھی تو خفا بیٹھے بھی تو چین بجبیں / بہار میں بھی نہ غنچہ مرا کھلا دل کا
یہ کیا خبر تھی کہ ہو جائے گا وہ بد ظن اور / بُرا کیا جو کہا اُس سے ماجرا دل کا
خدا جانے وہاں پر ہے وہ کیا سامان دلچسپی / کہ آتا ہی نہیں واپس گیا شہر خموشاں کا

کون کہتا ہے کہ وہ دل لیگیا دل لے گیا / دل تو ہے پہلو میں پر کیا جانے کیا جاتا رہا
عشق میں اُس چشم میگوں کے بہت بہکے تھے ہم / تُرشرو جب وہ ہوا سارا نشہ جاتا رہا

خوش ہم رہے اپنی مستی پر / قہقہہ سنکے رات بلبل کا
بیفائدہ کرتا ہے یہ تعریف جناں کی / واعظ نے ابھی [illegible] نہیں دیکھا

سب سے موافقت کریں اپنا یہ فرضِ عین ہے / لائے کسی کو رو برو دور زماں کو کیا غرض
آپکو جب مٹا دیا جیتے ہی جی۔ تو بعد مرگ / سنگ لحد لگائیں کیوں نام و نشاں کو کیا غرض
یار کے بزم عیش میں بار ملے۔ تو کس لیئے / چھوڑ کے سنگ آستاں جائیں جناں کو کیا غرض
جبکہ بہار باغ عمر رہگذر فنا میں ہو / نکلے چلے تباؤ کیوں باد خزاں کو کیا غرض
جہاں کی عارضی راحت کا کُھل گیا عقدہ / ہنسی کے ساتھ جو آنسو بھر آئے آنکھوں میں
درد مرض عشق جو ٹلجائے تو جانیں / یہ پھانس کلیجے سے نکلجائے تو جانیں
دشوار ہے اُس زلف کے پھندے سے نکلنا / سر سے یہ بلا اپنے جو ٹلجائے تو جانیں
کر فصل بہاری میں کرم اتنا تو صیاد / لٹکا دے قفس ہی کو مرے صحن چمن میں

دونوں میں ایک نور کا پرتو ہے جلوہ گر / اپنے حساب ذرہ ہو یا آفتاب ہو
مقتل میں تشنہ کام شہادت ہوں شوق سے / قاتل پلادے گر ترے خنجر میں آب ہو

کہاں سے لاؤں لُٹتے دِل خدایا	ادا ہر ایک اُسکی دلستاں ہے
بگڑنے کا سبب پوچھا تو بولے	ہمیں چاہا یہ کچھ تھوڑی خطا کی
ایک ہی پردہ کے اُٹھنے سے ہوئے بیخود کلیم	سامنے بے پردہ وہ آئے تو کیا ہونے لگے

رحمت

رحمت منشی محمد رحمت اللہ رحمت برادر خورد میر نادر علی برتر غازی پوری شاگرد رشید حضرت ظہیر دہلوی، حالات باوجود کوشش نہیں ملے مجبوراً صرف کلام درج کر دیا گیا ؎

آئے ہیں دن شباب کے رحمت کیواسطے	اِسکو اُٹھا رکھو نہ قیامت کیواسطے
جنّت سے کیا غرض ہمیں کوچہ میں آپکے	دو گز زمین مل گئی تربت کیواسطے
گل شمع کے اُدھر ہیں اِدھر داغ دِل مرے	اچھی بہار آئی ہے تربت کیواسطے
پورا ہوا نہ وعدہ فردا کسی طرح	کیا کیا دِلائے اُنکو قیامت کیواسطے
بولے وہ عرضِ حال پہ جھنجھلا کے اِسطرح	نہ کر رکھو اسے تو قیامت کیواسطے
یارب بتوں کو رحم بھی دینا ضرور تھا	سیرت بھی ہونی چاہیئے صورت کیواسطے
رحمت کسی کے نقشِ قدم کو نہ چھوڑنا	تعویذ کوئی چاہیئے تربت کیواسطے

رحمت

رحمت ۔ مولوی رحمت علی صاحب فرسٹ اورنیٹل ٹیچر مدرسۂ سرکاری ڈیرہ غازیخان دَور موجودہ کے شاعر اور بڑے زود فکر اور پُر گو ہیں ابتدائی چند غزلیں حضرتِ داغ مرحوم کو دکھائی تھیں مگر ہنوز مشقِ سخن پختگی کو نہ پہونچی تھی کہ اُنکا انتقال ہو گیا۔ اُس وقت سے بطور خود کہتے ہیں زیادہ تر طرزِ جدید میں طبع آزمائی کرتے ہیں، کلام رسالوں میں شائع ہوتا رہتا ہے چالیس پچاس برس کا سن ہے، ایک ضخیم مثنوی موسومہ "وفائے رحمت" بطور تاریخ ہندوستان و انگلستان جشن تاجپوشی کی تہنیت میں شائع کرا چکے ہیں اُس سے اِنکی کثرتِ مشق کا اندازہ ہو سکتا ہے شعر کا مذاق بھی بُرا نہیں ۔ جو کلام ہم پہنچا اُس کا انتخاب درج ذیل ہے ۔

ہندوستاں کے ہم ہیں ہندوستان ہمارا	کہنے کی بات ہی یہ ہے یہ کہاں ہمارا
رہتے ہیں دیس میں یوں پردیس میں ہیں گویا	ہے یہ زمیں ہماری نے آسمان ہمارا

جو زندگی میں اپنی آیا نہ کام یارو!	کیا قبر پر وہ ہوگا پھر نوحہ خواں ہمارا
ہوتی مغائرت کم جو اک زبان ہوتی	شاید بنے وسیلہ اُردو زباں ہمارا
ہم جان جانتے ہیں تم غیر جانتے ہو	حالانکہ جانتا ہے تم کو جہاں ہمارا

قطعہ

ایک کے ہیں تو ایک ہو جائیں	ایک ہی کے جہاں ہیں دونوں
نہ سہی رشتہ یہ تو رشتہ ہے	ایک گھر میہمان ہیں دونوں
رستے دو ہیں الگ مکینوں کے	اک گلی میں مکان ہیں دونوں
وہ ہمارے نہ اُنکے ہم گویا	بیکسی کے نشان ہیں دونوں
کر کے باہم لڑائیاں جھگڑے	ہو گئے ناتوان ہیں دونوں
پیس ڈالیں گے پاٹ چکی کے	یہ زمیں آسمان ہیں دونوں
گو رہیں دور راز تو اک ہو	جیسے دل اور زباں ہیں دونوں
آئیں آپس میں فیصلہ کر لیں	مفت کیوں دیتے جاں ہیں دونوں
مل کے ہم دونوں ایک جاں ہوں اگر	پھر تو اپنے جہان ہیں دونوں

رحمتی

رحمتی۔ کنور سکھراج بہادر رئیس اعظم و میونسپل کمشنر عظیم آباد پٹنہ۔ کنور صاحب موصوف کنور سہیرا لال صاحب ضمیر مرحوم خلف الصدق راجہ پیارے لال اُلفتی دہلوی کے فرزند رشید تھے شعر و سخن سے طبیعت کو لگاؤ تھا آپنے ۱۸۷۰ء متعدد مشاعرہ پٹنہ میں کیئے۔ ذی مروت صاحب اخلاق اور لئیق رئیس تھے اور شعرا کے بڑے قدردان تھے، اُردو فارسی دونوں زبانوں میں مشق سخن کرتے تھے۔ کنور صاحب موصوف کے دادا راجہ پیارے لال جو قوم کے کایستھ تھے شاہ عالم ثانی کے عہد میں دہلی چھوڑ کر عظیم آباد میں قیام پذیر ہوئے تھے، عرصہ ہوا انتقال کر گئے، اِنکے کلام کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

جب آپ ہی کو پاس نہیں رسم و راہ کا	کیا فائدہ جو ہو بھی ارادہ نباہ کا
جب سلسلہ جنباں یہ تری زلف سیاہ ہو	عاشق ترا کس طرح نہ زنجیر بپا ہو

دکھا کر وہ گئے ہیں جب سے اپنی زلف شبگوں کو	بلائیں آرہی ہیں میرے سر پر دیکھتے جاؤ
کرنے کے لیئے دعائے قاتل	زخموں کا کھلا دہن ہمیشہ

رحیم

رحیم - مرزا رحیم بیگ رحیم شاہ جہاں آبادی الاصل ولد میرزا امیر بیگ، سرونج میں رہتے تھے حکیم بو علی خاں کے طب ہیں اور محمد بخش نادان کے شعر و سخن میں شاگرد تھے پہلے نثر تخلص تھا ۱۲۷۷ھ ہجری میں حسب فرمایش حکیم احسن اللہ خاں قصص الانبیا کو نظم کیا تھا ۱۲۹۴ھ میں حیات تھے شعر و سخن کا مذاق شستہ تھا فارسی شعر بھی خوب کہتے تھے - چند غزلوں کا انتخاب درج ذیل ہے

وہ دل ہیں کس کسکو کہ اک جان کے خواہاں ہیں بہت	غم جُدا، فکر جُدا، درد جُدا، یار جُدا
خدا جانے کہ وقت ذبح کیا انداز قاتل تھا	کہ نعرہ ہے لب ہر زخم سے اللہ اکبر کا
جو لکھتا ہوں بیاں اپنے دل بیتاب مضطر کا	تڑپتا ہے ہر نگ نبض عاشق تار مسطر کا
بل بے گرمی آبلوں کی آب کیا تیزاب تھا	پاؤں پڑتے ہی مرا خار بیاباں جل گیا
کہنے ہی کی بات ہے کہنے دو لائے تو کوئی	مجھسا عاشق دیکھکر معشوق منا دیکھکر
پس مردن بھی ہم بار ندامت لیچلے سر پر	کہ اڑ کے خون کے چھینٹے پڑے داماں قاتل پر
ابتک تو ہجر میں ہیں فقط تن پہ کھائے گل	تقدیر دیکھیں آگے کو کیا کیا کھلائے گل
ایک سینہ ہے روکے کس کسکو	تیر کو، تیغ کو، کہ خنجر کو

رحیم

رحیم محمد عبد الرحیم خاں رحیم باشندہ پٹنہ حضرت داغ دہلوی سے اصلاح لیتے تھے اور پندرہ سولہ سال ہوئے اجمیر کے آڈٹ آفس میں اکونٹنٹ تھے، اُسکے بعد کا کچھ حال معلوم نہ ہوا -

پڑ گیا شاید کچھ اُس پر میری قسمت کا اثر	ہے دگرگوں رنگ ہر دم عالم ایجاد کا
آج پھر وعدہ کیا ہے وصل کا کل کیطرح	دیکھیے اللہ نا لاک اب ہم اُنکی یاد کا
شاعری کو فخر حاصل ہے جناب داغ سے	مدعی پڑھنے لگے کلمہ مرے اُستاد کا
اُنکو جب مجھ سے کچھ نہیں مطلب	پھر وہ کیوں امتحان لیتے ہیں
اُنکا اک کھیل ہے اعجاز مسیحا کیسا	بات کی بات میں مُردے کو جلا دیتے ہیں

نیک بندے ہیں خدا کے آپ تو
جگر پہ تیر لگانا جتنا جتا کے مجھے
تمام عمر اٹھاؤں نہیں جبین نیاز
نہیں ہے وجہ وہ مجھ سے کھنچے ہیں

شیخ صاحب آپ کی کیا بات ہے
ستم کے لطف بمقتضٰی آئیں کچھ جفا کے مجھے
ملیں نشان اگر تیرے نقش پا کے مجھے
عدو نے کچھ نہ کچھ ان سے جڑی ہے

رحیم

رحیم منشی بھگو خان خلف باری خاں زمیندار مرزا پور ضلع قنوج ۱۸۶۸ء میں قصبۂ قنوج سے انھوں نے ایک شعر و سخن کا گلدستہ پیام عاشق نامی جاری کیا جس میں گرد و نواح کے شعراء کے علاوہ کبھی کبھی اساتذہ کا کلام بھی درج ہوتا تھا عطر کا کارخانہ بھی اسکے ساتھ تھا۔ دس بارہ برس جاری رہکر وہ رسالہ بند ہو گیا۔ طبیعت دار شخص تھے زیادہ حال معلوم نہ ہو سکا۔ کلام یہ ہے

اگر پاکباز آئینہ ہے تو کب ہے
تم اپنے ہاتھوں سے بدنام خود ہی ہونے ہو
ہماری موت کو بھی ہائے نیند سمجھے ہیں
لال غصہ میں جو اب ہے رخ جاناں کب تھا
آتے آتے رہگیا وہ مہ جبیں بالائے بام
ایک بوسہ کا ہوں طالب لطف کا ہوں شیفتہ
دل بہلنے کا نہیں حوران جنت میں رحیم
نگہ پھیرو نہ الفت کو بڑھا کر
ایک کروٹ بھی نہ بدلی صبح تک اللہ ری نیند

ترے پاس مطلب ہی کیا ہے کسی کا
یہ کیا کہ نام مرا سن کے سر جھکا دینا
وہ بھولے پن سے یہ بولے اسے جگا دینا
چاند تھا چودھویں کا مہر درخشاں کب تھا
کیا چمک کر رہگیا اختر مری تقدیر کا
سمجھے اب مطلب مری الجھی ہوئی تقریر کا
مر گئے پر بھی تصور ہے بت بے پیر کا
گلا کاٹو نہ یوں ملکر کسی کا
آپ کا سونا مگر میرا مقدر ہو گیا

ضعف سے جان بھی اپنی ہو گرانبار مجھے
آنکھ کمبخت سے ڈر رہتا ہے ہر بار مجھے
تو مری جان ہے اور جان ہے ہر اک کو عزیز
جب کہا میں نے اٹھائے نہیں جاتے ہیں ستم

بوجھ ہے سینکڑوں من کا بدن زار مجھے
کہیں رسوا نہ کرے حسرت دیدار مجھے
کو سنا اب نہ خبردار خبردار مجھے
بولے جھنجھلا کے تو پھر کرتے ہو کیوں پیار مجھے

وہ مجھسے کہتے ہیں غصہ میں جان جائے تری
روٹھ کر چل تو دیئے ہیں مگر اب حال یہ ہے

میں کہہ رہا ہوں مگر جان تو ہے تو میری
راہ تکتے ہیں کہ پھر ہمکو بلائے کوئی

رحیم

رحیم۔ منشی رحیم بخش ٹھیکہ دار انار کلی لاہور۔ آپ کو حضرت بیان یزدانی رئیس میرٹھ کے فیض صحبت سے شعر وسخن کا شوق ہوا، اور انھیں کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ۱۸۹۵ء میں لاہور کے مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ یہ کلام کا خلاصہ ہے۔

پروانہ میرے جلنے کی اُس شمع رو نے کی
گلزار آگ کیسے ہوئی تھی خلیل پر

کیا موم دل تھی شمع دل اُس کا پگھل گیا
دل اپنا کیسے آتش ہجراں سے جل گیا

بہارستان داغ دل ہے موسم تیر باراں کا
نہ سیکھا ڈھنگ اتنک نا لہائے گرم کا میرے

گل داغ جگر پھر کھل رہا ہے غنچہ پیکاں کا
سبق گو میں نے بلبل کو دیا برسوں گلستاں کا

ہیں وہ عاصی کہ ہے فیض ایک جہاں پر اپنا
گو ترے عشق میں غارت ہوا برباد ہوا
خوف ہے گرمیٔ خورشید قیامت کا کسے

ابر رحمت ہوا دامن جو ہوا تر اپنا
نہ ہوا پر نہ ہوا دل میں ترے گھر اپنا
تیرے دیوار کے سایہ میں ہے بستر اپنا

زندگی بحر جہاں میں ہے بشر کی ایسی
بلبلا پانی میں جس طرح اُٹھا بیٹھ گیا

پھول نقش پا ہوئے جب وہ خراماں ہو گیا
داغ دل گل بن گئے سینہ گلستاں ہو گیا

جس روش پر وہ چلا رستہ گلستاں ہو گیا
شاخ ناوک ہو گیا اور غنچہ پیکاں ہو گیا

مر گئے ہیں ہم خیالِ دیدۂ مخمور میں
ایک موسیٰ تھا وہاں یاں سینکڑوں غش ہو گئے
میں ہوں یا زاہد ہو دونوں ایک ہی سے ہیں تباہ

چاہیئے تربت ہماری سایۂ انگور میں
ہے تفاوت شمع رو میں اور چراغ طور میں
میں فراق یار میں اور وہ فراق حور میں

رحیم

رحیم۔ مولوی سید محمد عبدالرحیم شاہ خلف مولوی سید حبیب اللہ شاہ نام کنچپورہ وطن بہ تقضائے شوق طبعی صاحب دیوان اور کلام میں جابجا مذاق سلیم کی جھلک پائی جاتی ہے، چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں ✣

رتبہ اپنا اب زمیں پر آسماں سے کم نہیں
شبِ ہجراں کو موت آئے تو روزِ وصل پیدا ہو

دل میں نقشہ کھنچ گیا ہے چاند سی تصویر کا
الم نکلے تو رستہ ہو خوشی کے دل میں آنیکا

بام پر ہم نے رخِ یار کا جلوہ دیکھا
سحر آنکھوں کا نگاہوں کا کرشمہ دیکھا

چشمِ تر، خاک بسر، چاک گریباں دل زار
عشق کا ہم نے یہ دنیا میں نتیجہ دیکھا

اب تو مٹائی سے مکرنے کا نتیجہ کیا ہے
دلکو مٹھی میں چھپا رکھا ہے دیکھا دیکھا

وصل کی شب میں ترقی ہوئی ارمانوں کی
حوصلے بڑھ گئے جب یار کو تنہا دیکھا

افسوس کہ بالیں پہ اجل آ ہی پکاری
آیا نہ عیادت کو مگر یار ہمارا

کل تلک داغ کلیجہ پہ نظر آتا تھا
آج اُس داغ میں ناسور ہوا خوب ہوا

مجھ مریضِ عشق کو تو نے اگر اچھا کیا
نام تیرا بھی مسیحائے زماں ہو جائیگا

تو رکھوں تاجِ شاہی سر پہ میں اُسکے مقابل میں
اگر مجھکو میسر آئے تکیہ اُسکے زانو کا

سر سے عدو کے رشک کے شعلہ نکل گئے
مہندی لگا کے پاؤں نہیں نکلے جو گھر سے آپ

فرقتِ یار میں مر جائیں گلا کاٹ کے ہم
ملک الموت کا دیکھا کریں رستہ کبتک

آنکھ کا لگنا برا ہوتا ہے دیکھا تو نے
اب بھلا رات تو مکو ہم رہتے ہیں بیدار کہ تو

رخشاں

رخشاں۔ عالیجناب نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر مرحوم جاگیردار ریاستِ لوہارو خلف اصغر فخر الدولہ نواب احمد بخش خان والی ریاستِ فیروز پور۔ نواب احمد بخش خان نے اپنے حین حیات بڑے لڑکے شمس الدین احمد خاں کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا اور پرگنہ لوہارو جوہارا جہ اور نے بطور انعام دیا تھا اپنے چھوٹے صاحبزادوں امین الدین احمد خان اور ضیاء الدین احمد خان کو بطور مددِ معاش دیدیا تھا۔ چند سال بعد نواب شمس الدین احمد خان کی حرکاتِ زبوں کے باعث ریاستِ فیروز پور ضبط سرکار ہوئی مگر ریاستِ لوہارو بحال رہی نواب صاحب ممدوح نواب اسد اللہ خاں غالب سے علاوہ قرابت قریبہ کے سلسلۂ تلمذ رکھتے اور انکے خلیفہ اول تھے، انتظام ریاست شروع سے نواب امین الدین خاں کے سپرد رہا اور

اُنکی وفات کے بعد اُنکے بلند نام صاحبزادے نواب علاؤ الدین خان مسند نشین ہوئے اور نواب ضیاء الدین خان صرف جاگیردار نسلاً بعد نسلٍ تصور کیے گئے، نواب صاحب بڑے کور رؤساء شاہجہاں آباد میں نہایت ذی اقتدار اور بارسوخ تھے۔ انکی اعلیٰ خاندانی ذاتی شرافت اور علم و فضل کیوجہ سے حکام وقت اِن پر خاص توجہ مبذول فرماتے تھے نواب صاحب اعلیٰ درجے کے سخن سنج اور سخن فہم اور تاریخی معلومات کا سرچشمہ مانے جاتے تھے۔ اور بڑے غیور اور پابند وضع رئیس تھے۔ بلوۂ غدر کے بعد انکی ذات والا صفات دہلی میں غنیمت سمجھی جاتی تھی، چنانچہ جو شخص کسی فن کا ماہر یا کامل دہلی آتا تھا تو آپکے فیض صحبت سے ضرور مستفید ہوتا تھا، علم تاریخ سے نہایت ذوق رکھتے تھے چنانچہ جس وقت الیٹ صاحب سکرٹری گورنمنٹ ہند نے اپنی ضخیم تاریخ ہند مرتب کی تو فراہمی حالات و تواریخ قدیم میں نواب صاحب نے بڑی امداد کی، فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں گاہ گاہ فکر سخن فرماتے تھے، اُردو میں رخشاں اور فارسی میں نیّر تخلص کرتے تھے ۱۳۰۲ھ میں انتقال فرمایا اور درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح واقعۂ مہرولی میں دفن ہوئے تاریخ وفات مولوی رضی الدین خان دہلوی نے جو سالۂ حضرت امیر پنجہ کش خوشنویس میں ایک بے بدل خوشنویس تھے صوری و معنوی تاریخ کہی ہے اور بہتیل مادہ ہے جس پر مصرع مولانا حالی نے لگائے ہیں وہو ہذا

چون ضیاء الدین احمد خان رشید	رخت از دنیا سوئے دار السلام
گفت ہاتف با رضی سالِ وفات	روز شنبہ سیزدہ شہر صیام ۱۳۰۲ھ

حضرت نیّر رخشاں کا کلام متانت سے پُر۔ عالمانہ مذاق سے معمور ہے اپنے اُستاد والاقدر کے تلمیذ رشید تھے، چنانچہ کلام میں بھی اُنھیں کی طرز کا اتباع ہے اِنکی اور اِنکے خاندان کی زبان دہلی میں مستند مانی جاتی ہے۔ پاکیزہ اور نازک خیالات کی بندش خاص انھیں کا حصہ ہے کاش نواب احمد سعید خان صاحب طالب کہ خود بھی اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں اپنے والدِ مغفور کا کلام چھپوا دیں تاکہ نوابصاحب مرحوم کی پُرفیض زندگی کی دوامی یادگار

رہ جائے، آپکے بڑے صاحبزادے نواب شہاب الدین احمد خاں کا انتقال آپکی حیات ہی میں ہوگیا تھا اُنکے بیٹے جناب سائل دور موجودہ کے مشہور کہنے والوں میں ہیں۔

ممنوں نہیں ہے برق و سموم و شرار کا
رکھتا ہے حکم جلنے میں عاشق چنار کا

جب اپنے شغل سے دلِ خونیں نہ باز آئے
پھر کیا گناہ دیدۂ خونابہ بار کا

آنکھوں میں بوالہوس کی کھٹکتا ہوں مثلِ خار
احسان ہے یہ مجھپہ مرے جسمِ زار کا

سر پیٹے، سینہ کوٹے، کہ فسوس میں ملے
عاشق کو ہاتھ چاہئیں ناچار چار چار

زہے سربلندی شہیدِ وفا کی
کہ اس در پہ سر ہو چڑھانے کے قابل

جب چاہو آؤ دل میں کہ ہے آپکا مکان
یہاں خوفِ شحنہ و خطرِ پاسباں نہیں

گر انتہا نہیں ستم و جورِ یار کی
شوقِ زیادہ جو کو مرے بھی گراں نہیں

حیرت میں ہوں کہ نوکِ مژہ نیشتر مثال
کھبتی ہے گر جگر میں تو کیوں خونچکاں نہیں

ہے دوستی صدق دشمن و بیشی دروغ دوست
کیا رشک صلح جس میں صفا درمیاں نہیں

نکلے آنکھوں سے وہیں جذب ہوئے دامن میں
بجز اشکوں کے کوئی گوہر نایاب نہیں

جتنے ہو نغمہ سرا اتنے ہی خونریز بھی ہو
چھیڑ نشتر کی چلی جائے جو مضراب نہیں

کعبے کو دیر سے چلے سنکر شراب میں
مستوں کو کیا تمیز عذاب و ثواب میں

دار القضا کہاں رہی میخانہ بن گیا
ہیں مست جمع محکمۂ احتساب میں

پیری وہ مفلسی ہیں نہ لو نام مے کہ اب
لطف ارتکاب میں نہ اجر اجتناب میں

سپ کے گرنے کا ہے خیال ہمیں
ساقیا لیجیو سنبھال ہمیں

شب نہ آئے جو اپنے وعدے پر
گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں

تیرے غصے نے ایکدم میں کیا
مُردۂ صد ہزارہ سال ہمیں

دل میں ہضم ہیں یا سعئے باقی
کسی صورت نہیں زوال ہمیں

طالع بد سے نیرِ رخشاں
اپنے ہی گھر میں ہے وبال ہمیں

کیا پہنچے تو فرشتہ کا جس جا گذر نہ ہو
بیت الصنم ہے شیخ خدا کا یہ گھر نہ ہو

چل کر خرامِ ناز سے برپا کرے وہ حشر
گربا زبریں کا اُسے خوف وخطر نہ ہو

رخشاں جو آتے آتے ابھی رک گئے ہیں اشک
آنکھوں میں آ گیا کوئی لختِ جگر نہ ہو

کر کے نو مید ہمیں قتل سے پہلے یکسر
خون رُلوا چکے کیا خون کا دعویٰ کیجے

بعد اک عمر جو آئے تو خجل ہوں کیونکر
آنکھیں پتھرائی ہوئی اُنکی تہ پا کیجے

ہے تصور مرا اُس خاطرِ نازک پہ گراں
جتنا ہو اپنے کو ہر غم سے گھلایا کیجے

نقش بر سنگ ہے دھیان اپنا تمھارے دلپر
خوش ہوں مٹنے کا نہیں لاکھ مٹایا کیجے

بوالہوس اور بھی مرنے کی کرینگے خواہش
لیکے گل قبر پہ رخشاں کی نہ آیا کیجے

چاک یکسر مرا گریباں ہے
دِل کا محضر میرا گریباں ہے

لاغری میں بریدہ ناخن سے
مختصر تر میرا گریباں ہے

رات سینہ سے سینہ کس کا ملا
کہ معطر میرا گریباں ہے

سینہ کا چاک کرنا سکھلایا
میرا رہبر مرا گریباں ہے

رخشاں ۔ **رخشان** منشی خیرات علی خاں رخشان باشندۂ فرخ آباد ۱۳۶۹ھ میں تذکرہ سراپا سخن کی ترتیب کیوقت حیات تھے، غالباً منیر شکوہ آبادی سے تلمذ تھا۔

گردش میں ایسے آ گئے مجھ بیوطن کے پاؤں
پھرنے سے باز رہ گئے چرخ کہن کے پاؤں

عکسِ شفق ہے پائے بلوریں میں اے پری
حنا ری لگی نہیں ہیں عقیقِ یمن کے پاؤں

کیونکر اٹھائیں رنگِ حنا کے وہ بار کو
نازک زیادہ گل سے ہیں اُس گلبدن کے پاؤں

ہے بعد مرگ بھی رہی رخشاں کو بے کلی
اندر کفن کے ہاتھ ہیں باہر کفن کے پاؤں

رخشان ۔ **رخشان** محمد عزیز الدین صاحب رخشان آپ قاضی محمد حسام الدین آزردہ ساکن قدیم قصبہ جیور ضلع بلند شہر کی اولاد میں سے ہیں۔ کارخانۂ تجارتِ نیل کی بدولت قاضی محمد رفیع الدین انکے جد امجد نے خاصا نام پایا سنہ ۱۸۸۲ء سال پیدایش ہے، اپنے ماموں حکیم منشی فضل احمد

کے زیر تربیت رہکر فارسی انگریزی شروع کی، فارسی کی تحصیل تو معمولی تکمیل کو پہنچ گئی۔ پندرہ برس کی عمر میں اردو میں ٹدل پاس کر کے آپنے شعر و سخن کا شوق کیا اِس زمانے میں ارمغان نام ایک گلدستہ حضرت احسان شاہجہاں پوری کے زیر اہتمام نکلتا تھا چنانچہ آپ حضرت احسان شاہجہانپوری کے شاگرد ہو گئے پہلے رسوا تخلص تھا پھر بہ تجویز استاد زخشان تبدیل کر لیا۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں عدالت ججی گوالیار میں مولانا مقصود حسن حیرت کے نائب تھے پندرہ بیس غزلوں کا جو ارسال کی تھیں مندرجۂ ذیل خلاصہ ہے۔

لے لیا جو بوسہ میں نے بندہ پرور کیا ہوا
پیار میں لب رکھدیئے پیارے لبوں پر کیا ہوا

پہلے جسپر اک نظر پڑتی تھی ہوتا تھا نثار
وہ کرشمہ تیرا اے چشمِ فسونگر کیا ہوا

حضرتِ موسیٰ نے غش کھایا تھا جسکو دیکھکر
اے صنم وہ جلوۂ روئے منور کیا ہوا

یہ مریضِ عشق سے کہنا کسی کا وقتِ نزع
زندگی کیوں ہو رہی ہے تمکو دوبھر کیا ہوا

لیکے دل جب آپنے عشاق کو بوسے دیئے
آپ کا احسان پھر کہیئے کسی پر کیا ہوا

کوئی دنیا میں کسی کا کسی سے ... نہیں

دیکھ لی اپنے سے بڑھکر مہِ کنعاں کی شبیہ
اب حسینوں میں کبھی نام نہ لینا اپنا

اے شہِ حسن فقیروں کو بھی خیرات ملے
دیدے اک بوسۂ رخسار ہی صدقہ اپنا

تمنے خوش ہو کے دیا تھا تو لیا تھا ہمنے
دیکھئے ناخوش ہو تو اب پھیر لو بوسہ اپنا

آس ... ... پاس

قیامت کو دکھاؤنگا اثر جب سوزِ پنہاں کا
جہنم کو جلا دیگا شرارہ آہِ سوزاں کا

خیال آتا نہیں یا رب وفائے عہدِ پیماں کا
بُت کافر پہ سایہ پڑ گیا کس نامسلماں کا

عبادت میں بھی رہتا ہے تصور حور و غلماں کا
خدا ہی ہے نگہباں شیخ تیرے دین و ایماں کا

خموش اے واعظِ ناداں یہاں جب سے نظر میں ہیں
تصور نے مرے کھینچا ہے نقشہ بزمِ جاناں کا

عزیز الدین ہوں زخشاں تخلص ہے وطن جیور
سخن گوئی میں ہوں شاگرد احسانِ سخنداں کا

رزاق۔ حاجی محمد عبدالرزاق خان مرحوم خلف اسحٰق خان، خاندان حافظ الملک رحمت خان سے تھے، دیوان گلشنِ نعت انکی تصنیف سے شائع ہو چکا ہے سنہ ۱۸۸۲ء میں انتقال کیا

رزاق

لیاقت علمی خاصی تھی۔ خوشنویسی سے بسر اوقات کرتے تھے یہ چند شعر نعتیہ کلام سے منتخب ہوئے

اُس ذات کو آتا نہ اگر جوشِ محبت
ظاہر ہے کہ ہوتا نہ ظہور ارض وسما کا

آدم کو جو سجدہ نہ کیا حکمِ خدا سے
ابلیس ہوا کبر سے پابند بلا کا

رزاق سے رزاق کی ہر دم ہے تمنا
کر مجکو سلامی نہ کسی شاہ و گدا کا

رزم

رزم - مہاراج بینی مادہو قنوجیہ متوطن بیج راجپور - زخمی کاکوروی کے تلمذ سے بہرہ ور ہیں -
پیام عاشق ۱۳۰۸ھ سے یہ چند شعر منتخب ہوئے -

آئینہ کو دیکھا نگہ غور سے ہم نے
صاف اُس سے زیادہ تراز انو نظر آیا

ہیں شمع منور کہوں اِسکو تو بجا ہے
سانچے ہیں ڈھلا یار کا بازو نظر آیا

اے رزم ہیں سمجھا کہ ہے تقدیر کا کچھ بل
برہم جو مجھے یار کا گیسو نظر آیا

رزم

رزم - سید محمد حنیف رضوی بلگرامی، آپ کو اوائل سن شعور سے شاعری کا شوق ہے حضرت
حمد بلگرامی کے خرمنِ فیض سے بہرہ ور ہیں - کلام بہم رسیدہ کا انتخاب یہ ہے -

جور وستم کا کیوں نکروں شکوہ کیا سبب
کچھ آپکا اجارہ ہے میری زبان پر

تڑپا رہے ہو کس لیئے بیمار ہجر کو
یہ ظلم کیا روا ہے کسی ناتواں پر

بدلی گھری ہوئی ہے شرابی ڈٹے ہیں خوب
میلا ہے آج پیرِ مغاں کی دکان پر

دامن ہیں توڑ توڑ کے پھولوں کو بھر لیا
بلبل کا صبر بھی نہ پڑا باغباں پر

رزم

رزم - صاحبزادہ محمد محمود علی خان نائب تحصیلدار رامپور - جناب بزم اکبر آبادی سے مشورہ
سخن کرتے ہیں ۱۸۹۹ء میں زندہ وسلامت موجود تھے -

غیر سے لکھوا کے بھیجا ہے میرے خط کا جواب
کیا کہوں اے ہمدمو لکّھا مری تقدیر کا

یہ مزا یہ لطف دنیا کی کسی شے میں نہیں
کیوں نہ کھائیں شوق سے عشاق پھل شمشیر کا

صبح ہوتے ہی چلے آئے جگر تھامے حضور
یہ اثر ہے عاشقوں کے نالۂ شبگیر کا

پھر ترحم کی نظر سے دیکھتے ہیں وہ مجھے
ہے چمکنے کو ستارہ رزم کی تقدیر کا

نہ تھے مجھ سے یوں بدگماں اول اول	ہر ایک بات کا میری اُنکو یقین تھا

رزم

رزم۔ شیخ خورشید حسن قدوائی لکھنوی، باوجود تلاش حالات میسّر نہ ہوئے۔ چند شعر پیش کش ہیں۔

اپنی قسمت میں جو نہ تھا نہ ہوا	کیا گلہ گر وہ آشنا نہ ہوا
وائے تقدیر میں حِنا نہ ہوا	اسی حیلہ سے ہوتی پابوسی
یہ بھی اے بخت نارسا نہ ہوا	نہ سہی وصل دید تو ہوتے
کیا مرا ذکر جابجا نہ ہوا	تم جو کہتے ہو میں ہوا بدنام

رسا

رسا۔ مرزا کریم الدین رسا گورگانی شاگرد حافظ غلام رسول شوق پرُانے سخن سنج تھے، اسّی برس کی عمر پاکر غدر سے بیشتر انتقال کیا انکے بڑے صاجزادے میرزا رحیم الدین حیا بڑے نامی شاعر گذرے ہیں انکا مفصل ذکر جلد دوم میں چھپ چکا ہے، رسا صاحب دیوان تھے مگر کلام غدر کی لوٹ کی نذر ہوا۔ یہ چند شعر ملے درج کیئے جاتے ہیں *

سچ کہو دل لگا کے کیا پایا	بیوفاؤں سے اے رسا تمنے
جو اِس طرح ہو دل پریشاں تمہارا	پریشاں حالونکی حب قدر جانو
سوا اُسکے وہ کیا تھا اور جو ہمنے چھپا رکھا	دل و دیں و قرار و ہوش تک تو دیدیا تم کو
ہم کہیں دیکھا کریں صورت تمہاری رات دن	تم کہو دل لیکے دکھلاؤں نہ اپنی شکل میں
کرتا کسی پہ ظلم کوئی اسقدر نہیں	باز آستا تو ہمکو بہت عشوہ گر نہیں

رسا

رسا۔ سرآمد اُدبا میر احمد علی رسا ابن میر امام الدین رامپوری شاگرد رشید علی بخش بیمار۔ اسکے بزرگ رامپور میں ملتان سے آئے تھے، خوش فکر، رنگین طبع وارستہ مزاج شخص تھے سنہ ۱۸۵۶ء میں ۵۶ سال کی عمر تھی، لیاقت علمی بہت اچھی تھی اور مدام مشغلۂ سخن رہتا تھا مگر وارستگی مزاج کے باعث کلام کے فراہم کرنے کی نوبت نہ آئی ورنہ کافی ذخیرہ چھوڑا تھا۔ کلام میں متانت اور پختگی بندش کے علاوہ اُستادانہ رنگ کی جھلک موجود ہے

مولٰینا عبد العلی مدراسی فروغ تخلص انکے رشید شاگرد تھے بالاخر ۲۰ شوال ۱۲۹۲ھ میں بمقام لکھنؤ سفر آخرت اختیار کیا ؎

تاریخ او نوشت فروغ از سر الم	احمد علی چہ صاحب فضل و کمال بود

منشی محمد امیر اللہ صاحب تسلیم مرحوم نے بجواب عریضہ ۷ محرم ۱۳۰۹ھ سال وفات تحریر فرمایا تھا رامپور میں انکے بیسیوں شاگرد تھے۔ صاحبزادے اوج تخلص کرتے ہیں۔

ہائے نیچی وہ شرمگیں آنکھیں	اور حیرت سے دیکھنا میرا
رنگ لائیگی درازی خدنگ ناز کی	دل جگر کا، اور جگر دل کا عدو ہو جائیگا
کوئی شکل بہر تسکیں دل بدگمان نکلتی	مجھے بات کا کسیکی اگر اعتبار ہوتا
کبھی فرش راہ دل ہی کبھی سوئے در ہیں آنکھیں	نہ وہ مجھ سے وعدہ کرتے نہ یہ انتظار ہوتا
قسمت اُس کان ملاحت سے جدا کرتی ہے	کون اب زخم جگر پر نمک افشان ہوگا
رہ گئی شرم فرشتوں کے اُٹھائے نہ اُٹھا	یہ گرانبار میرا نامۂ اعمال ہوا
ارمان وصل دل سے نکلنا محال ہے	آنسو نہیں کہ دیدۂ تر سے نکل گیا
سنینگے وہ مقرر میرے درد دل کا افسانہ	جگر تھامے ہوئے بیٹھے ہیں اہل انجمن اپنا
ملا یا خاک میں تو نے سپہر خانہ خراب	وہ دل مرا جو تمنائے یار کا گھر تھا
کیوں اس عتاب کا میں سزاوار ہو گیا	کیا تیری بندگی سے گنہگار ہو گیا
المدد اے نگاہ ہوش ربا	جوش ہے شکوۂ تغافل کا
نہ تھا وہ میں کہ مجھے تاب ناز بیجا ہو	یہ کیا ہوا کہ ترا میں نیاز مند ہوا
بہار عشق میں چہرے سے اُڑ گئی رنگت	بہ فصل گل میں نیا موسم خزاں دیکھا
وہ ہوئے رخصت سحر آئی قیامت انکے ساتھ	صور کا نالہ ہوا اللہ اکبر کا جواب
بہکے ہوئے کلام میں مرتا ہوں غم سے میں	آتی نہیں خیال میں پیغامبر کی بات
نہ انتظار کی تکلیف پوچھئے مجھ سے	گذر گئی جو گذرنی تھی جان مضطر پر

پوچھتے ہیں مجھ سے جب جاب رو دیتا ہوں ہیں — کیا کہوں اُن سے گذر اس انجمن میں کیوں نہیں

ملتی خبر نہیں دلِ خانہ خراب کی — پوچھیں نشاں کس سے کہاں جستجو کریں
یارب یہ دل، یہ جوشِ ہوس خاک میں ملے — کبتک ہر ایک بات کی ہم آرزو کریں
تیرِ نگاہِ یار سے دونوں کو عشق ہے — دل سامنے کریں کہ جگر رُوبرو کریں

ہائے گھبرا کے وہ خلوت میں کسی کا کہنا — لیکے آئے ہو رسا آج کہاں تم مجھکو

گزری کسی کے دل میں جہاں وہ نگاہِ ناز — پہنچی وہیں اجل بھی برابر لگی ہوئی

کھلا ہے اے رسا بابِ اجابت — مگر فرصت نہیں مجھکو دعا کی
فسردہ دل چمنِ روزگار میں آئے — خزاں کو ساتھ لیئے ہم بہار میں آئے

اُف اُف سے سوزِ عشق یہ آتش فشانیاں — اک آگ سی جہاں میں ہے گھر گھر لگی ہوئی
شکستِ رنگ پہ اپنے نثار ہوتا ہوں — یہ میرے پاس نشانی ہے اُنکی محفل کی
اِس لیئے اُس کا تصور بھی نہیں کرسکتا — وہ پریشاں نہ کہیں خاطرِ برہم میں رہے

رسا۔ قاضی عوض علی باشندۂ مارہرہ مرزا حاتم علی مہرؔ کے شاگرد ہیں یہ چند شعر اُنکی یادگار ہیں۔

جان نثار آپکے دم آپکا بھرنیوالے — شکوۂ رنج و مصیبت نہیں کرنیوالے
لاکھ سکھلائیں اُنھیں ہم روشِ مہر و وفا — وہ قدم بھی نہیں اِس راہ میں دھرنیوالے
دق ہو وصل ہو غم اُلفت ہو شب فرقت ہو — ڈھونڈ لیتے ہیں بہانہ کوئی مرنیوالے

رسا۔ حکیم عبداللہ خان صاحب دہلوی۔ غدر سے پہلے دہلی میں زندہ تھے یہ دو شعر اُن کے ہیں

ہے دیدہ فرشِ راہ کہ آتا ہے کوئی بُت — دلکو ہے انتظار کہ ہوں پائمال کب
اطلاق ہے شراب کا دونوں پہ زاہدا! — یہ ہے اگر حرام تو وہ ہے حلال کب

رسا۔ صاحبزادۂ محمد ابراہیم شاہ رسا خاندان ٹیپو سلطان میسور سے تھے اور کلکتہ میں رہتے تھے مولوی سید علی حیدر، حیدر سے تلمذ تھا ۱۸۹۰ء میں ۳۰ برس کی عمر تھی کلام کا رنگ اشعار ذیل سے ظاہر ہے۔

تمکو ہے ناز اپنی صورت پر
شکر کرنا پڑا سب مجھے اُلٹا
ہمکو ہے ناز اپنی اُلفت پر
وہ بگڑنے لگے شکایت پر

ناصحا رونے سے آزردہ رہا تو میرے
اُلفتِ نرگسِ فتاں کا تماشا دیکھو
دیکے تسکین نہ پونچھے کبھی آنسو میرے
دشتِ وحشت میں قدمبوس ہیں آبلہ ہو میرے

رسا۔ میر عابد حسین خلف اصغر جناب میر وزیر علی صبا لکھنوی، آپ کو حضرت آتقا لکھنوی سے تلمذ ہے جو جناب صبا کے خلف اکبر اور انکے برادر بزرگ ہیں، حالات کے لیئے بارہا لکھنو لکھا مگر کچھ جواب بجز سکوت نہ ملا۔ اشعار ذیل اُنکے ہیں:

تُو نے جسے ظالم نگہ قہر سے تاکا
حیراں ہوا ششدر رہا بیتاب ہوا وہ
ہوتے صفتِ آئینہ حیراں دم زینت
واقف ہی جہاں میں حج قناعت کے مزے سے
فی الفور نشانہ وہ ہوا تیر قضا کا
تمنے جسے دیکھا جسے جھانکا جسے تاکا
انداز اگر دیکھتے تم اپنی ادا کا
بس بھیک کا کاسہ ہی اُسے ہاتھ دعا کا

رسا۔ نواب مرزا شبیر علیخاں لکھنوی، آپ لکھنو کے ایک موقر خاندان کے رکن تھے اور نواب بندہ علیخاں زیبا مرحوم سے تلمذ تھا۔ شوخ اور چلبلی طبیعت پائی تھی۔ استعداد علمی کے ساتھ ساتھ شعر کا مذاق بھی اچھا تھا، مشاقی اور پختہ کلامی بھی تھی۔ تین چار برس کا عرصہ ہوا بطریق سیر بمقام پورنیہ بنگال گئے ہوئے تھے وہاں کسی دشمن نے بضرب گولی انکا کام تمام کر دیا۔ ۵۰ برس کے قریب عمر پائی، دو صاحبزادے یادگار چھوڑے مگر باوجود دس بارہ مرتبہ استفسار حال کرنے کے مفصل حالات نہ ملے۔ اب کلام ملاحظہ ہو۔

جھائیں کرکے تنہا کس لیئے بدنام ہوتے ہو
مکر جانا، نہ تم اقرار ہی کرنا قیامت میں
مشکل کہیں خدا سے بتوں کی تھی بندگی
ایجانِ حسن وعشق کا سارا فتور تھا
ستم کرنے لگے جب آسماں تم بھی ستا لینا
ہماری موت کا جب ذکر آئے سر جھکا لینا
دیکھا جو بتکدہ کو حرم سے بھی دور تھا
میرا قصور تھا نہ تمہارا قصور تھا

جو ہو گئی معاف وہ غیروں کی تھی خطا
بخشا گیا نہ جو وہ ہمارا قصور تھا

مشہور ہے جو عشق وہ تھا میرا انکسار
کہتے ہیں جسکو حسن تمہارا غرور تھا

او بُت اللہ سے کیا شکوہ بیداد کریں
ابھی ہیں آتا ہے تجھی سے تری فریاد کریں

راہ اسواسطے رکھتے ہیں خدا و بُت سے
ایک گر ظلم کرے ایک سے فریاد کریں

دشمنی غیر کی رکھنے کو تو رکھیں دل میں
یہ ہو کیونکر کہ اُسی سے تجھے پھر یاد کریں

نہوگا خلد میں جا کر شباب کا احساں
یہ بات خوب ہے مرنے میں نوجواں کے لیئے

جو دل دُکھاؤ تو آہیں بھی ہمکو کرنے دو
ستم کرو تو اجازت بھی دو فغاں کے لیئے

نہ آئی گھر مرے کیا جانے کیا سمجھ کے قضا
یہاں تو جان بھی حاضر ہے میہماں کے لیے

دیکھئے دیکھئے پھر آپ چلے جاتے ہیں
اب نہ کھیلے گا مرے دل سے سنبھلنے کے لیئے

وہ بھی کم سن ہیں ابھی دل بھی ہے میرا ناداں
ایک سے ایک زیادہ ہے مچلنے کے لیئے

جفائیں کیں جو مجھے طالب وفا دیکھا
وفائیں کیں جو مجھے خوگر جفا سمجھے

عداوت جو مجھ زار سے آگئی
فلک نے مٹایا زمیں کھا گئی

مِلا تا تھا دونوں کو اک عمر سے
وہ ابتک نہ آئے اجل آگئی

یہ کیوں نا اُمیدی سے بدلی اُمید
الٰہی مرے دل میں کیا آگئی

مرے پھول اچھی طرح ہو گئے
کسی کو سوم میں ہنسی آگئی

دیگا تڑپ تڑپ کے دلِ مضطرب خبر
مجھسے چھپا چھپا کے نہ مہمان جائیے

غیروں کے منہ سے ہی کبھی آپ نے کہیں
اُنکا ہے ہم اُٹھا لینگے احسان جائیے

مرنے کو قتل میں بھی بر آئے گی آرزو
کہنا رقیب ہی کا کہیں مان جائیے

ہم عاشقوں کے خون سے منکر ہیں آپکو
محشر میں اس طرح نہ پریشان جائیے

جو چاہتے ہیں وہ کرتے ہیں بُت زمانے میں
فلک بھی مفت میں بدنام ہے مقدر بھی

رسا منشی رحیم بخش رسا دہلوی مترجم نظارۂ مقیم گورکھپور چند شعر نتائج افکار سے درج ہیں۔

بخت کوتاہ ہے بنتا نہیں کچھ کام رسا	گو کہ ہے فکر رسا ذہن رسا، نام رسا
محفل میں انکی آج ہے آفت کا اہتمام	وہ آپ کر رہے ہیں قیامت کا اہتمام
بجلیاں دیکھنے والوں پہ گراتے آئے	تم جدھر آئے ادھر آگ لگاتے آئے
ہزار ان سے محبت کا میں کروں اظہار	وہ میری بات کا لیکن نہیں یقیں کرتے
وصل کی شب دیکھنا دشمن کی باتوں کا اثر	بات بھی وہ کی جو دشمن کی تھی سکھلائی ہوئی

رسا۔ منشی غلام محی الدین شاگرد ڈاکٹر احمد حسین خاں مائل۔ دکن کے خوش مذاق لوگوں میں ہیں، اشعار ملاحظہ ہوں ؎

دکن کی جان ہندوستان کا دل	نظام الملک آصف جاہ عادل
تڑپ کر یار کو تڑپائے گا دل	شرارت میں ہے بجلی سے سوا دل
اک آفت تھی بلا تھی روگ تھا دل	بہت اچھا ہوا جاتا رہا دل
مزا رگ رگ میں دردِ عشق کا ہے	کہ ہر ہر عضو میرا بن گیا دل
مزا جب ہے کہ یوں کایا پلٹ ہو	مرا تجھکو ملے تجھکو میرا دل
نظر تو مل گئی لیکن ہے جب لطف	کہ دل سے بھی ملے یوں ہی ترا دل

رسا۔ محمد وجیہ الدین خان باشندۂ حیدرآباد دکن خلف بہار الدین خان ۱۸۸۶ء میں چوبیس پچیس برس کا سن تھا اس وقت سے برابر شعر و سخن کا مشغلہ ہے، علمی استعداد اور معلومات اچھی ہیں۔ ذکی اور قابل شخص ہیں طبیعت شوخ اور رنگین پائی ہے اور اسکی جھلک کلام میں بھی صاف مترشح ہے، صفائی روزمرّہ، چستی بندش، اسلوب بیان اچھا ہے، ہر شعر میں مضمون پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، دکن کے موجودہ شعرا میں سب طرح اچھے ہیں اور اپنے استاد ڈاکٹر مائل کے ارشد تلامذہ میں انکا شمار ہے، اکثر رسالوں میں انکا کلام نظر سے گذرا۔ کچھ اشعار ضیافت طبع شائقین کے لیے درج کیے جاتے ہیں ؎

وقتِ آرایش نظر پڑتے ہی مضطر ہو گیا	خود تڑپ کر عکس آئینہ سے باہر ہو گیا

دل جگر داغدار کرتے ہیں
سینے کو لالہ زار کرتے ہیں
آئینہ دیکھ کر بہت کمسن
عکس کو اپنے پیار کرتے ہیں

چٹکیاں لیتی ہے رہ رہ کر تمھاری یاد میں
تیری ہی شوخی کے ہیں انداز تیری یاد میں
بوسے لے لیکر لب زخم جگر نے لے لیا
تھا مزہ جو کچھ زبانِ خنجرِ جلاد میں

اللہ رے ضعف یوں بھی کوئی ناتواں نہ ہو
روؤں تو میری آنکھ سے آنسو رواں نہ ہو
مہماں جو آکے سینے میں پیکانِ یار ہو
صدقہ ہو دل، جگر ہو فدا جاں نثار ہو
پہلے تو دل کو لیتے ہیں نیچی نگاہ سے
پھر پوچھتے ہیں کس لئے تم بیقرار ہو
انگڑائیاں وہ لیتے ہیں تن تن کے بار بار
کیونکر نہ جوشِ حسرتِ بوس و کنار ہو
دل کشمکش ہے مرا گر تم ستم ایجاد ہو
ہاں ستم پہ ہو ستم، بیداد پر بیداد ہو
ہاتھ میں تصویر تیری جیب میں تیری مثال
آنکھ میں تیرا تصور دل میں تیری یاد ہو
دل میں گر شیخ و برہمن کے نہ تیری یاد ہو
کیوں اذاں کا شوق ہو ناقوس کی فریاد ہو
پائے ساقی پر گرائے نشۂ صہبائے عشق
میکدے میں حسن کے یوں مست کی افتاد ہو
دولتِ دیدار تم کو مل گئی کیا اے رسا
آج خوش خوش ہو بہت بشاش ہو دلشاد ہو

کوئے دلبر میں نہ جانا چاہیے
دل کے کہنے میں نہ آنا چاہیے
وقت یہ تیوری چڑھانے کا نہیں
پھول مرقد پر چڑھانا چاہیے
دیکھنا ہے صورت دلبر اگر
دل کو آئینہ بنانا چاہیے

مریجاں کیا کہوں فرقت میں نالہ کیوں نکلتا ہے
خیال اکثر ترا سینہ میں دل چٹکی سے ملتا ہے
ترا خنجر بھی تیری طرح ہے مجھ سے خفا قاتل
گلے سے جب لگا لیتا ہوں میں رک رک کے چلتا ہے
اگر پیر مغاں کا یہ نہیں اعجاز لے ساقی
تو میخانے میں ساغر کیا سبب بے پاؤں چلتا ہے
جگر تیری شراکت اے دلِ پروانہ کیوں کرتا
سمجھ ناداں پرائی آگ میں کوئی بھی جلتا ہے
کڑی ہے عشق کی منزل سمجھ کر رکھ قدم اے دل
کہ اس رستہ میں رہرو ٹھوکریں کھا کر سنبھلتا ہے

کرتے ہیں کبھی ہم جو دعا ہاتھ اُٹھا کر
وہ کہتے ہیں منظورِ خدا اور ہی کچھ ہے

وہ تاب کہاں صاعقہ طور میں موسیٰ
برقِ نگہ ہوش رُبا اور ہی کچھ ہے

مرنے کو مرے جان کے غش دیتے ہیں چھینٹے
سمجھے ہوئے کچھ ہیں وہ ہوا اور ہی کچھ ہے

مرنے جو لگا آکے وہ بولے سرِ بالیں
کہتے ہیں جسے شرطِ وفا اور ہی کچھ ہے

کچھ اور ہی شکوا تھا ملے تھے جو سرِ شام
اب صبح شبِ وصل گلا اور ہی کچھ ہے

عشق کا داغ مرے خانۂ دل کا ہے چراغ
روشن اس شمع سے ہے بزمِ محبت انکی

چٹکیاں لیتے ہیں وہ نیچی نظر سے دل میں
شرم کے پردے میں رہتی ہے شرارت انکی

کیوں گلِ داغِ عشق ہو نہ عزیز
آتی ہے اِس چمن سے بُو تیری

رسا۔ میر علی احمد رسا شاگرد میر علی اوسط رشک جہانتک تحقیق ہوا رامپور کے رہنے والے تھے

جگر ہے خشک تو ہی چشم ابر تر کی طرح
ہمارا ظاہر و باطن ہے بحر و بر کی طرح

کس آب و تاب کی ناف و کمر تمہاری ہے
کوئی گہر ہے کوئی رشتۂ گہر کیطرح

گلے وہ عید کو آکر ملے خفا بھی ہوئے
بڑھا گھٹا میں اِسی چاند میں قمر کیطرح

یہ کیسے بدر ہو دم بھر کو آئے گھر میرے
اڑھائی دن تو رہو ایکجا قمر کی طرح

عیاں نہاں ہو تم اے یار دوست دشمن سے
صفا ہو شیشہ میں پتھر میں ہو شرر کیطرح

تمہارے جھانکنے سے دل کبھی نہیں بھرتا
سمائے دیدۂ روزن میں ہو نظر کی طرح

وہ باتیں چھانٹتے ہیں پاتا ہو نہیں نشو و نما
رسا عداوتِ احباب ہے تبر کیطرح

رسا۔ بلبل شاخسارِ معانی عندلیب گلشن خوش بیانی منشی حیات بخش رسا مصطفےٰ آباد ضلع بلند شہر کے رہنے والے ہیں استعدادِ علمی رسمی ہے مگر ذہانت و طباعی نے اُس کمی کو جیسا کہ چاہئیے پورا کر دیا ہے کلام میں انتہائی شوخی اور معاملہ بندی کا پیرایہ بیمثل ہے ۔ ۴۰-۴۲ سال کی عمر ہے، حضرت داغ کی وفات کے بعد سے انکے کلام میں پختگی اور رنگینی کی ایک خاص شان پیدا ہوگئی ہے اور اب مشہور کہنے والوں میں انکا شمار ہے، بات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، دہلی کے مشاعرے میں

اِن سے ملاقات ہوئی تھی، اکثر علیل رہتے ہیں، فالج کی وجہ سے چلنے پھرنے سے قدرے معذور بھی ہیں اور ہاتھ میں رعشہ بھی ہے مگر طبیعت کی شوخی کلام میں رنگ دیئے ہی جاتی ہے پڑھنے کا انداز بہت اچھا اور دلکش ہے، عاشقانہ مضامین بہت اچھے اسلوب سے باندھتے ہیں بندش چست اور روزمرہ بہت صاف ہے، مشاق بھی اعلیٰ درجے کے ہیں اور فی البدیہہ بھی خوب کہتے ہیں، نواب فصیح الملک داغؔ مرحوم کے تلامذہ میں حضرت بیخودؔ دہلوی اور سائلؔ کے ہم پلہ ہیں۔ اکثر اشعار حضرت داغؔ کے رنگ میں ایسے ملتے ہیں کہ اُن پر حضرت داغؔ کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔ افسوس کہ نظر ثانی تذکرہ کے ایام میں انتقال کر گئے۔ ۴۸-۴۹ برس کی عمر پائی۔ کلام ملاحظہ ہو:-

اُنکی خدمت میں رسا بھی ہوگا　　کبھی یُوں حکمِ خدا بھی ہوگا

مجھ پہ جو تُو نے ستم ڈھایا ہے　　کہیں دنیا میں ہُوا بھی ہوگا

آپ سا کوئی نہیں دُنیا میں　　آپ نے یہ تو سُنا بھی ہوگا

رازِ اُلفت کا چھپانے ہو عبث　　یہ چھپائے سے چھپا بھی ہوگا

صبر والوں کا بھی دن آئیگا　　ایک دن روزِ جزا بھی ہوگا

محفلِ شعر میں ہو آئیں چلو!　　آج سُننے میں رسا بھی ہوگا

ساقی جو دیئے جائے یہ کہکر کہ پئے جا　　تو میں بھی اسپے جاؤں یہ کہکر کہ دیئے جا

جانے کی جو ضد ہے تو مجھے زہر دیئے جا　　اتنا تو کہا مان لے اتنا تو کیئے جا

کچھ اور نہ کر مجھ پہ جفائیں تُو کئے جا　　کچھ اور نہ لے میری دعائیں تو لیئے جا

گستاخ نہ ہو وصل میں اے دستِ تمنّا　　کچھ دیر ابھی اُنکی بلائیں تُو لیئے جا

کہتا ہے کسی شوخ کا مجھ سے یہ لڑکپن　　ارمان کیئے جا ابھی ارمان کیئے جا

کیا لذتِ تعزیر نے مجبور کیا ہے　　آتا ہے یہی جی میں کہ تقصیر کیئے جا

کمبخت رسا تیری رسائی نہیں ممکن　　تو خُوب سا اس نام کو بدنام کئے جا

آہ ہوتی مرے لب پر نہ یہ نالا ہوتا　　ایک بھی تُو نے جو ارمان نکالا ہوتا

ہو گئے ضد سے مری سینکڑوں تیرے عاشق
میں نہ ہوتا تو کوئی چاہنے والا ہوتا ؟

کیا سنبھالو گے کسی کے دلِ بیتاب کو تم
اپنے اُبھرے ہوئے جوبن کو سنبھالا ہوتا

اپنی محفل سے مجھے تم نے نکالا تو کیا
کوئی ارمان مرے دل کا نکالا ہوتا

شکر ہے دیکھ اُنھیں دل کوئی جھگڑا نہ ہوا
میرا تیرا نہ ہوا، اپنا پرایا نہ ہوا

خواب میں بھی تو نظر بھر کے نہ دیکھا اُنکو
یہ بھی آدابِ محبت کو گوارا نہ ہوا

غیر نے بات تو کی بات تو پوچھی میری
خیر سے تم کو تو اتنا بھی سلیقہ نہ ہوا

محوِ حیرت ہیں تو دونوں ہیں تری محفل میں
ہم سے پردا ہوا آئینہ سے پردا نہ ہوا

اُنکی یہ خوبیٔ اخلاق کہ وعدہ تو کیا
میری یہ شومیٔ تقدیر کہ ایفا نہ ہوا

ہم سے ای پیرِ مغاں عظمتِ میخانہ نہ پوچھ
تو سلامت ہے تو کعبہ ہے یہ میخواروں کا

نگہِ یاس سے ہر ایک کا منہ تکتے ہیں
حال دیکھا نہیں جاتا ترے بیماروں کا

اُسکو جنت بھی عطا ہو تو جہنم سمجھے
جسپہ سایہ ہے ترے کوچے کی دیواروں کا

حشر کے روز بھی اپنا نہیں کوئی افسوس
کیا ٹھکانا ہے رسا اُنکے طرفداروں کا

آیا نہ رحم سُنکے بھی تجھکو ماجرائے دل
پہلو میں تیرے دل ہے کہ پتھر بجائے دل

حیران ہو کے رہ گئے وصفِ عدو سے ہم
تصویر بن گئے ہیں تری گفتگو سے ہم

تو قتل گر کرے تو مریں آبرو سے ہم
ہوں تجھسے سرخرو جو نہائیں لہو سے ہم

ساقی ہمارے صبر کی ہے شرم تیرے ہاتھ
بیٹھے ہیں دور ساغر و جام و سبو سے ہم

جب ڈھونڈنے پہ آئے تو کعبہ ہے کتنی دور
کیوں تھک کے بیٹھ جائیں تری جستجو سے ہم

اُنکو جفا سے کام ہے ہمکو وفا سے کام
لاچار اپنی خو سے ہیں وہ اپنی خو سے ہم

مایوس ہو کے وصل سے اُس بت کے ای رسا
کرتے ہیں التجائے سفارش عدو سے ہم

ایک دل ناز تھا جسپر وہ کیا نذرِ بتاں
ہائے اب کس کا سہارا ہے جو فریاد کریں

مجھ سے دیکھا نہیں جاتا کہ ستم ہو اُسپر
میرے آگے وہ مرے دل پہ نہ بیداد کریں

ہم بتائیں کسکو ہمدم کیا کریں
ہمسے برگشتہ ہے عالم کیا کریں

وہ بھی تنگ آئے ہیں اپنے حسن سے
مر رہا ہے ایک عالم کیا کریں

آگ لگ جاتی ہے دونی چارہ گر
زخمِ دل پر رکھکے مرہم کیا کریں

مری فریاد پر انجان بنکر مسکراتے ہیں
قیامت ہیں وہ اِس انداز سے جھوٹا بناتے ہیں

قیامت سے نہیں کچھ کم خرام ناز بھی اُن کا
قدم لیتے ہوئے آتے ہیں فتنے جب وہ آتے ہیں

کدورت مرنیوالے سے نہیں رکھتا ہے کوئی بھی
مری ہستی مٹاکر کیوں وہ تربت کو مٹاتے ہیں

گھڑی بھر کے لیئے تو اپنے دلکو میں تسلّی دوں
ذرا ہی بیخودی دم لے تصور میں وہ آتے ہیں

نہ کیونکر رشک آئے ہمکو اُن لوگوں کی قسمت پر
وہاں جنکی رسائی ہے وہاں جو آتے جاتے ہیں

نخوت بھی اِن بتوں کی عجب دلپسند ہے
اُتنا ہی پیار آتا ہے جتنا غرور ہو

کوچہ تمھارا چھوڑکے جنت میں جائے کیوں
تم ہو تو کیا کسیکو تمنائے حور ہو

جی چاہا جدھر چھوڑ دیا تیرِ ادا کو
چٹکی میں اُڑائے ہوئے پھرتے ہیں قضا کو

سجدوں کا بھی موقع نہ رہا اہلِ وفا کو
پھر پھر کے مٹاتے ہیں وہ نقشِ کفِ پا کو

یوں ہمنے چھپائی ہے ترے وصل کی حسرت
جس طرح چھپاتا ہے خطاوار خطا کو

اب چھوڑ رسا عشقِ بتاں دیکھ کہا مان
کمبخت تجھے منہ بھی دکھانا ہے خدا کو

کہتے ہیں لاکھ بار تصوّر میں آئیں ہم
کوئی ہمارا دل سے طلبگار بھی تو ہو

پھر عیادت کو آئے وہ میری تو یہ کہا
دیکھیں کسی کو کیا کوئی بیمار بھی تو ہو

اشک سے یارب مرے طوفاں بپا کیوں نہ ہو
قطرۂ ناچیز تو چاہے تو دریا کیوں نہ ہو

شام ہی سے وصل کی شب کا سویرا کیوں نہ ہو
آپ جس گھر میں ہوں اُس گھر میں اجالا کیوں نہ ہو

دلکی خواہش پر ہمارا اُن کا جھگڑا کیوں نہ ہو
جب اُنھیں پیارا ہے دل پھر ہمکو پیارا کیوں نہ ہو

دن ہے کم اور داستانِ غم ہماری ہے بہت
روزِ محشر اپنے جی میں تھوڑا تھوڑا کیوں نہ ہو

نیچی نظروں سے نہ دیکھو سرِ محشر دیکھو
دادخواہوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھو

ہو کے شمشیر بکف سیر گھڑی بھر دیکھو
مرنیوالوں کی وفا تیغ کے جوہر دیکھو

سنگدل تم تھے تو دل تم سے لگانا ہی تھا
پڑ گئے ہائے مری عقل پہ پتھر دیکھو

جی میں پچھتاؤ گے برباد اگر مجھکو کیا
ہوگا پھر چاہنے والا نہ میسّر دیکھو

وعدۂ حشر ہے پھر وہ بھی زمانے بھر سے
کوئی دامن نہ پکڑ لے سرِ محشر دیکھو

اُنکو دشمن سے جو اُلفت ہے تو پروا نکرو
اے رسا تم بھی کسی اور پہ مرکر دیکھو

[illegible]

رُخ سے پردہ نہ اُٹھا دیکھ پڑا رہنے دے
اے پری ہوش زمانے کے بجا رہنے دے

تیر کھینچا ہے تو پیکاں بُتِ سفاک نہ کھینچ
اِسکو تو میرے کلیجے سے لگا رہنے دے

دل کو پامال نہ کر رُوح کو بے چین نہ کر
ایسی بیداد نہ کر ایسی جفا رہنے دے

اُن تک تو رسائی نہیں کہنے کو رسا ہے
کمبخت نے یہ نام بھی بدنام کیا ہے

ہو شکوۂ بیداد رسا کی ہے یہ طاقت؟
یہ اُس سے مری جان نہ ہوگا نہ ہوا ہے

[illegible]

عدو کے گھر نہیں آتی بلائے ناگہاں کوئی
وہاں کیا یا الٰہی دوسرا ہے آسماں کوئی

ستانے کا نتیجہ اُس ستمگر کو بھی ملجائے
ملے اِس آسماں کو بھی الٰہی آسماں کوئی

نہ تھے بیداد گر تم کس طرح ہم حشر میں کہدیں
عدالت ہے یہاں کیونکر ملائے ہاں میں ہاں کوئی

کسی کا دل چُرا لو تم تو یہ کیسی قیامت ہے
تمہارے بھولے پن پر کر نہیں سکتا گماں کوئی

ذرا دیکھے تو ہے جاں نثاروں کی وفاداری
ذرا خنجر تو لے لینے تو بیٹھے امتحاں کوئی

مجھے دشمن سے ملنے کا کسی سے ہی یہی ڈر تھا
کہیں رسوا نہ ہو جائے نصیبِ دشمناں کوئی

رسا کی داستانِ غم کا سننا کوئی آساں ہے
سُنانیکے لیئے نوکر تو رکھ لو قصّہ خواں کوئی

[illegible]

نصیحت اپنی رہنے دے رہِ اُلفت میں اے ناصح
پڑی ہے تجکو سمجھانے کی اپنا دم نکلتا ہے

دو قدم چلکے دکھا دو تو قیامت کا مزا
حشر سے پہلے ہی اک محشر بپا ہونے لگے

حشر میں بولے اُنھیں دیکھ کے مرنیوالے
وہ چلے آتے ہیں دل لیکے مکر نیوالے

وہ عالی ظرف ہے یا ہم ہیں کھلجائیگا دم بھر میں
ہمیں زاہد پلا دیکھے ہمارے ساتھ پی دیکھے

مری تصویر لیکر ہاتھ میں کس ناز سے بولے
خدا سمجھے تیری نیت سے گر ہمکو کوئی دیکھے

الٰہی کس کی آمد ہے سر بالیں دم آخر
یہ کس کی پیشوائی کو مری جان حزیں نکلی

ساقی ترے کرم سے کیا لطف آ رہا ہے
کوئی تو پی رہا ہے کوئی پلا رہا ہے

آئینہ خود نمائی انکو سکھا رہا ہے
کیا ظلم کر رہا ہے کیا قہر ڈھا رہا ہے

چوری گیا گیا دل لیکن غضب تو یہ ہے
دل کا چرانیوالا آنکھیں چرا رہا ہے

آنسو بہا رہا ہے وہ سوزِ دل پہ میرے
خود ہی لگا کے ظالم خود ہی بجھا رہا ہے

انکو تو ہنسنے چاہا وہ یوں سنا رہے ہیں
اے چرخ کینہ پرور تو کیوں ستا رہا ہے

کوچے میں دشمنوں کے ہم اور سجدہ کرتے
نقشِ قدم کسی کا سر کو جھکا رہا ہے

آزردہ غیر سے ہیں لینا ہو مِنی بلائیں
رُوٹھے ہیں وہ کسی سے کوئی منا رہا ہے

آئے تھے سُننے کہنے اُنکے ستم کا قصہ
اِس کا علاج کیا ہے اب پیار آ رہا ہے

یہ کم سنی یہ باتیں یہ سادگی یہ گھاتیں
کوئی سکھانیوالا اُن کو سکھا رہا ہے

کوچے میں ان بتوں کے آنے دیا نہ شاید
سنتے ہیں اب رساؔ بھی کعبہ کو جا رہا ہے

یہ دیکھا ہی بُری قسمت کا رونا لوگ روتے ہیں
مجھے تقدیر روتی ہے مری تقدیر ایسی ہے

بلا سے غیر کے در پر کرینگے ہم جبیں سائی
اگر مرضی تری ہے اے کاتب تقدیر ایسی ہے

عجب حیرت میں ڈالا ہے اس اندازِ خموشی نے
کیا تصویر ہمکو بھی تری تصویر ایسی ہے

بوقتِ ذبح قاتل کا بڑھایا دل یہ کہہ کہکر
کہ تو قاتل ہے ایسا اور تری شمشیر ایسی ہے

کیسی ادا کر کوئی بھا گئی | غضب آ گیا اک بلا آ گئی
خزاں چل بسی فصلِ گل آ گئی | چلو میکشو وہ گھٹا چھا گئی

مدت سے اپنی جان پہ کھیلے ہوئے ہیں ہم
یہ سر جدا ہے جسم سے یا تم رقیب سے

وفا کرتے ہیں ہم پھر بھی ہمیں تم سے ندامت ہے
اسے کہتے ہیں اُلفت بندہ پرور یہ محبت ہے

کسی دن دیکھیو تیرے ہی قدموں پر یہ سر ہوگا
جو قاتل ہم سلامت ہیں جو قاتل تو سلامت ہے

سو بار صدقہ ہو کے بھی چاہتا ہے جی
سو بار اور آپکے قربان جائیے

سب قصۂ حسن کے عوضِ تمنا پہ یہ کہا
بس ہو گیا دماغ پریشان جائیے

آپ سے حورِ جناں بھی مات ہے / آپکی کیا بات ہے کیا بات ہے
روز و شب فرقت کے دونوں ہیں بلا / رات دن ہے دن سے بدتر رات ہے

انداز دلفریب ہیں شوخی بلا کی ہے / ہر بات لاجواب مرے دلربا کی ہے
جس پر مٹا اُسی نے مٹایا غریب کو / تقدیر ہی خراب دلِ مبتلا کی ہے
یہ حال اب تو ہے ترے بیمارِ ہجر کا / کہتے ہیں چارہ گر بھی کہ مرضی خدا کی ہے

یارب جو تو بھی اُن کا طرفدار ہو گیا / ہم اور کسکو داورِ محشر بنائیں گے
ہے دم میں دم تو راہ پہ لا دینگے ہم تجھے / زندہ رہے تو دل میں ترے گھر بنائیں گے
زاہد جو تجھ سے اُلجھے کسی روز مے پرست / ظرفِ وضو کو توڑ کے ساغر بنائیں گے

ہاتھ ملتا ہوں کہ کیوں حشر میں کی تھی فریاد / اُنکی نیچی ہے نظر مجکو پشیمانی ہے
آگیا ہجر میں کوئی تو ذرا دل ٹھیرا / پھر وہی میں ہوں وہی میری پریشانی ہے
جب نہ تھے سامنے میرے تو پریشانی تھی / اب جو وہ سامنے آئے ہیں تو حیرانی ہے

عاشق کو تیرے لاکھ کوئی رہنما ملے / تیرا پتہ ملا ہے نہ تیرا پتہ ملے
تم مجھ سے آملے کبھی دشمن سے جا ملے / جب یہ مزاج ہے تو کوئی بنتے کیا ملے
جب دیر میں یہ دیکھا کہ اپنا گذر نہیں / کعبے کے جانیوالوں میں مجبور جا ملے
زاہد ہے تو ہی بندۂ اللہ ہم نہیں؟ / کوئی حدیث ہے کہ تجھی کو خدا ملے
دیکھو رسا چلے تو ہو تم توبہ توڑنے / در پر نہ میکدے کے کوئی پارسا ملے

بے بات وہاں ظلم ہے بے جرم سزا ہے / ایسے سے نباہے بھی تو کیا کوئی نباہے
پرائے دل کا ستانا روا ہے کب تمکو / یہ کس حدیث میں آیا ہے کس کتاب میں ہے
مجھے کچھ اور بھی کمبخت کے سوا کہیے / کہ یہ تو لفظ ازل سے مرے خطاب میں ہے
ہمیشہ کی ہے دربار پہ جبیں سائی / یہ بندگی بھی الٰہی کسی حساب میں ہے
یہیں جو فیصلہ کرنا ہے ہم سے فیصلہ کر لو / قیامت پر نہ رہنے دو قیامت پھر قیامت ہے

آنے کو نظر میں مری سو فتنہ گر آئے
تجھسا نظر آیا ہے نہ تجھسا نظر آئے

کرتا ہوں دعائیں تو یہ آتی ہیں ندائیں
تو ہو کسی قابل تو دعا میں اثر آئے

کرتا ہی وہی دل میں رسا کے جو ٹھنی ہے
سمجھانیکو سمجھاتے ہیں سب اپنے پرائے

ترے بیمار میں ہے کہنے کو جانِ زار باقی ہے
نہ ہونے کے برابر نبض میں رفتار باقی ہے

رکھیں گے غیر دردِ محبت کو دل میں کیا
یہ نور رسا کے دل میں رسا کے جگر میں ہے

بدلی اُدھر نظر تو ادھر بھی بدل گئی ✤
اُنکی ہماری آنکھوں ہی آنکھوں میں چل گئی

مجرم ہے اور پرسشِ اعمال حشر میں
کیونکر کہوں کہ شانِ کریمی بدل گئی

دونوں کو سوزِ عشق نے آخر کیا تمام
پروانہ پہلے جل گیا پھر شمع جل گئی

پہلے تو آپ نے دل کو مرے چاک کر دیا
پھر کہہ دیا کہ جا تری حسرت نکل گئی

دو گھڑی کے لیئے انسان کو خواب آتا ہے
بند ہو جاتی ہیں آنکھیں جو شباب آتا ہے

محبت یہ ہے آدابِ محبت نام اِس کا ہے
کہ لب تک لا نہیں سکتا ہوں جو دل میں تمنا ہے

نہ پھرنا اپنے وعدوں سے سمجھ کر حشر کو اپنا
وہاں انکا اور عالم ہے وہاں انکی اور دنیا ہے

ترے اقرار سے دلکی جلن میں پڑ گئی ٹھنڈک
ترا حرفِ تسلی مرہمِ داغِ تمنا ہے

نوشتہ میری قسمت کا کہاں سے اُسکے ہاتھ آیا
کہ جو کچھ خط میں لکھا ہے مری قسمت کا لکھا ہے

تمھیں جو مانگنا ہو اے رسا اللہ سے مانگو
بڑی سرکار ہے اُسکی بڑا وہ دینے والا ہے

گیا ہی بن سنور کر غیر کے گھر میہماں کوئی
اب ایسے میں نہیں آتی بلائے ناگہاں کوئی

وہ دم بھر کو سہی لیکن تسلی ہو تو جائے گی
وہ جھوٹی ہی سہی لیکن کرے تو مجھسے ہاں کوئی

کریں اقرار وہ پورا ہمیں باور نہیں آتا
ہم ایسے ہیں ہمارے حال پر ہو مہرباں کوئی

حالِ دل کہنے میں کیسے وہ خفا ہونے لگے
عرضِ مطلب پر نہیں معلوم کیا ہونے لگے

عشق کا چرچا کہیں ہی حسن کا چرچا کہیں
تذکرے میرے تمہارے جا بجا ہونے لگے

خط لکھا تھا میں نے میرے نامہ بر کی کیا خطا
آپ سے کیوں بگڑے وہ آپ پر کیوں خفا ہونے لگے

مجھ سے لاغر کی شبِ غم کیا کہوں کیونکر کٹی
جو شکن بستر پہ تھی تلوار ہو کر رہ گئی

غیر کا مذکور بھی کوئی پیامِ وصل تھا
کس لیے نیچی نگاہِ یار ہو کر رہ گئی

اے رسا کچھ بھی رہی سب داد خواہی حشر میں
جب وہاں نیچی نگاہِ یار ہو کر رہ گئی

پی کے کر لیتا ہوں توبہ جب سے یہ دستور ہے
دل بھی روشن ہے مرا منہ پر بھی میرے نور ہے

غیر سے ملنے کے شکوہ پر قیامت ڈھا گیا
اُسکا یہ کہنا کہ دل سے آدمی مجبور ہے

میں سوالِ وصل کر کے اس ادا پر مٹ گیا
ہنسکے فرمایا کہ یہ درخواست نامنظور ہے

حشر میں اللہ سے فریاد اُن کے ظلم کی
اے رسا یہ بات تو شرطِ وفا سے دور ہے

دل میں کسیکو رکھو دل میں رہو کسی کے
سیکھو ابھی طریقے کچھ روز دلبری کے

فرقت میں اشکِ حسرت ہم کیا بہا رہے ہیں
تقدیر رو رہی ہے پردے میں بیکسی کے

آئے اگر قیامت تو دھجیاں اڑا دیں
پھرتے ہیں جستجو میں فتنے تری گلی کے

دیکر مجھے تسلّی بے چین کر رہے ہو
ہنستے ہو وعدہ کر کے قربان اس ہنسی کے

یہ حضرتِ رسا بھی دیوانے ہو گئے ہیں
چکّر لگا رہے ہیں اک شوخ کی گلی کے

عدو سے اُسنے اگر کچھ ملال ہو جائے
رسا کی پھر تو نہ پوچھو نہال ہو جائے

بڑی ہی دھوم سے دعوت ہو پھر تو زاہد کی
یہ مے جو چار گھڑی کو حلال ہو جائے

ہجومِ حشر میں کیا ہمسے حالت ہو بیاں دل کی
بھری محفل میں کیونکر کوئی کہدے داستاں دل کی

وہ مجھ سے اُسنے ان بن ہی سہی شکوہ نہیں اسکا
مگر شامت ہی بھری اور آنکے درمیاں دل کی

سنایا حالِ دل اُنکو تو یوں منہ پھیر کر بولے
کسی نے منہ لگایا چھیڑ بیٹھے داستاں دل کی

فرصت ملے تو آنکھ ملے مجھ غریب سے
آئینہ دور ہو کہیں اُنکے قریب سے

بیٹھیں وہ اُسکے سوگ میں اور میرے سامنے
اللہ موت دے مجھے پہلے رقیب سے

محشر میں اُسنے شرم سے نیچی نگاہ کی
ترکی تمام کی مری فریاد و آہ کی

ہم بوند بھر شراب کو ساقی ترس گئے
یہ دن بہار کے یوہیں ایسے برس گئے

کرتے رہا کہ سیر چمن کو ترس گئے	صیاد تیرے صدقے اسیر قفس گئے
اٹھتے کہاں ہیں نقشِ قدم کی طرح سے ہم	اب تیرے ہو رہے ترے کوچہ میں بس گئے
مدت ہوئی یہ خانہ خرابی ہے اور ہم	سمجھا وطن اسی کو جہاں رات بس گئے
نقشِ قدم نے آپ کے مجبور کر دیا	ہم کوچۂ رقیب میں کیا اپنے بس گئے
دیکھوں نہ آنکھ اٹھا کے بھی حورِ بہشت کو	ایسے کسی کے جلوے اِن آنکھوں میں بس گئے
کنجِ قفس میں رہنے کی عادت سی پڑ گئی	آزاد ہو کے بھی نہ اسیرِ قفس گئے
رسا کو دل میں رکھتے ہیں رسا کے جاننے والے	وفا کی قدر کرتے ہیں وفا کے جاننے والے
یہ وہ کافر ہیں بُت ایمان اپنے رہے ہی آتے ہیں	خدا کو ماننے والے خدا کو جاننے والے
وفا کی آزمایش کا سلیقہ تو ذرا سیکھو	بنو تو آشنا، نا آشنا کے جاننے والے
ترا کوچہ ہے ظالم اور مریضانِ محبت ہیں	کہاں جاتے ہیں اس دار الشفا کے جاننے والے
کیا ذکرِ وفا میں نے تو یوں منہ پھیر کر بولے	زمانے سے مٹے رسمِ وفا کے جاننے والے
بتوں کے جاننے والے خدا کو جان جاتے ہیں	بتوں کو جانتے ہیں کیا خدا کے جاننے والے
خدا کا جاننا بس تھا تو کیوں دنیا میں آئے تھے	خدا کے پاس ہی رہتے خدا کے جاننے والے
رسا کو سب نے سمجھایا مگر سمجھا نہ کچھ ظالم	ہوئے مجبور اس مرد خدا کے جاننے والے
ہوا ہے زرد مریجان پھول سا چہرہ	عدو سے ملکے یہ کیا اپنا حال کر بیٹھے

رسا۔ سید احمد حسین رسا لکھنوی، جگت پور ضلع رائے بریلی میں ۱۹۰۱ء میں قیام تھا، حالات باوجود تلاش بہم نہ پہنچے، اشعار ملاحظہ ہوں۔

تمھاری چال کا مارا اٹھا ہے ناز کا کشتہ	مسیحا کے جِلانے سے بھی اچھا ہو نہیں سکتا
ستا لو جلنا جی چاہے زباں سے اُف نہ نکلے گی	مرے منہ سے کبھی شکوہ تمھارا ہو نہیں سکتا
دمِ رحلت وہ آئیں یا نہ آئیں سب برابر ہے	کسی صورت سے اب بیمار اچھا ہو نہیں سکتا

رسا۔ جناب سید ابوالحسن صاحب خلف راجہ میر محمد حسین صاحب شاگرد جناب ہنیر ۱۸۸۷ء

ہیں حیات تھے اِس سے زیادہ حال معلوم نہ ہوا۔ چند اشعار درج ہیں۔

تڑپتا ہے سسکتا ہے تمہاری آشنائی ہیں
میں روتا ہوں جو نام اُس بت کا لیکر تو وہ کہتا ہے
شوقِ دیدار میں بس موت کا چلتا ہی نہیں
کس طرح ضبط کروں دل نہو جب قابو میں
دعوتِ ناوکِ دلدار کروں خاک رسا

نہ مرتا ہے نہ جیتا ہے دلِ مضطر جدائی میں
رسا رسوا کرو گے تم ہمیں ساری خدائی میں
دم مری آنکھوں میں اٹکا ہے نکلتا ہی نہیں
یہ تو کمبخت سنبھالے سے سنبھلتا ہی نہیں
دل سے اک خون کا قطرہ تو نکلتا ہی نہیں

رسا

رسا سید محمد اسمعیل باشندہ گیا، انکا بیان ہے کہ انکے بزرگ ہمدان سے آئے تھے، نئی طرز میں اکثر طبع آزمائی کرتے ہیں رسالوں میں انکا کلام بھی اکثر چھپتا رہتا ہے، زبان اور مضمون دونوں کا خیال رکھتے ہیں طبیعت کا رنگ ملاحظہ ہو۔

وہ فصد کر رہے ہیں اگر لالہ زار کا
زلفیں ہیں یہ گھٹا ہیں چھائی ہی باغ پر
ناصح خیالِ توبہ ہے لیکن میں کیا کروں
ہل چل یہ میکدے میں نہیں آج بے سبب
اپنے خنائی ہاتھوں کی مٹھی کو کھولدے
تختے کھلے ہوئے ہیں پھولوں کے باغ میں
کس چشمِ سرمگیں کا ہیں کشتہ ہوں اے رسا

آ میں کھلا ہے باغ دلِ داغدار کا
سُوباف کھل گیا ہے عروسِ بہار کا
مجبور ہوں کہ ہے ابھی موسم بہار کا
تقوی ہے ٹوٹتا کسی پرہیزگار کا
کچھ کچھ پتا چلا ہے دلِ بے قرار کا
جوبن نکھر رہا ہے عروسِ بہار کا
آ ہو طواف کرتے ہیں میرے مزار کا

کیا دھواں دھار گھٹا اٹھی ہی میخانے سے
حلق پر تیغ دو دم رکھ کے بھی پھیر ہی گئی
رہے ہر حال میں تقدیر پہ شاکر انسان
قتل کے بعد ہے یہ حسرت و افسوس عبث

ساقیا نور کا منہ برسے گا پیمانے سے
کیا بلا تجکو ستمگر مرے تڑپانے سے
سب بنے کام بگڑ جاتے ہیں گھبرانے سے
جی نہ اٹھونگا میں ظالم ترے پچتانے سے

حمد

حمدِ خالق میں عندلیبِ قلم
گلفشاں ہے زہے نصیبِ قلم

غنچے دیتے ہیں یوں چٹک کے صدا — وحدۂ لاشریک ہے وہ خدا
پھول بوٹوں میں رنگ قدرت کا — پتا پتا گواہ صنعت کا
کوئی سمجھا نہ آجتک یہ راز — سرو قمری میں کیوں ہے راز و نیاز
کرتی ہے نالہ و بکا بلبل — گل تر پر ہے کیوں فدا بلبل
کیسے کیسے حسیں کیے پیدا — نازنیں مہ جبیں کیے پیدا
باغ عالم کو زیب و زینت دی — لوٹ ہو جائیں دل وہ صورت دی
دیکھکر جلوہ اُس کی قدرت کا — ہے فرشتوں میں شور صلِ علیٰ
حمد کرتے ہیں اُسکی جن و بشر — اُسکے اوصاف ہیں زبانوں پر
ایسی آنکھیں کہاں سے لائیں ہم — اُسکی قدرت کو دیکھ پائیں ہم
ذاتِ باری کو کوئی کیا جانے — آپ اپنے کو وہ خدا جانے

رسا

رسا۔ منشی سید شاہ عبد العزیز بہاری شاگرد مولانا عبد الاحد شمشاد لکھنوی ۱۸۹۳ء سے مشقِ سخن کرتے ہیں اور اپنے اُستاد کے تلامذہ میں ممتاز ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

بہشت میں بھی نہ چھوٹے گی مے کشی مجھ سے — وہاں بھی ہاتھ میں بوتل شراب کی ہوگی
کلیم کو جو جھلک طور پر دکھائی دی — نقاب چہرے سے اُس شوخ کے ہٹی ہوگی
تمھارے حسن میں بے شک زوال آئیگا — ہمارے عشق میں ہرگز نہ کچھ کمی ہوگی

رسا

رسا۔ مرزا غلام مصطفٰے صاحب مددگار ناظم اُمور مذہبی ریاست حیدرآباد دکن۔ پہلے شاید رسوا تخلص تھا اور مہاراجہ پیشکار مدار المہام کی سرکار میں ملازم تھے۔ حضرت داغ کے تلامذہ میں صاف اور اچھا کہنے والوں میں ہیں۔ حالات کے لیئے متواتر خط بھیجے مگر جواب نہ ملا۔ مجبورًا اندراج کلام پر اکتفا کیا گیا۔

قسمت پر اپنی ناز کرے سبزہ زار ہند — آتا ہے پایہ تخت میں پھر تاجدار ہند
دِلّی میں مثل رحمتِ باری پئے جلوس — لندن سے آرہا ہے شہ کامگار ہند

قائمقام سارے زمانے کے جمع ہیں
آتے ہیں سب رئیسِ عقیدت شعارِ ہند

وہ روشنی ہے شہر میں راتوں کو آجکل
جسکی ضیا سے ایک ہیں لیل و نہارِ ہند

شاہنشہا ورود سے تیرے کچھ اور ہے .....
تزئینِ ہند و رونقِ ہند و بہارِ ہند

پہلے سے شانِ ہند کی کچھ کم نہیں مگر
آنے سے تیرے اور بڑھا افتخارِ ہند

جس شان سے سواری اقدس رواں ہوئی
تاریخ میں رہیگی یہ اک یادگارِ ہند

شاہا جلو میں تیرے رسالوں کے وہ پرے
ایک ایک جن میں رستم و اسفندیارِ ہند

جاندار بن کے چلتی ہے روز وغا سپاہ
قبضے میں تیرے تیغ جواہر نگارِ ہند

قطعہ

تھی خانہ جنگیوں سے نہ فرصت کبھی
کب تھا کسی زمانے میں یہ اقتدارِ ہند

کیا چین سے گذرتی ہے تیرے زمانے میں
اے شہریارِ لندن و اے تاجدارِ ہند

بے انتظامیوں کا نہیں دخل اب کہیں
سنجیدگی سے چلتے ہیں سب کاروبارِ ہند

اب ایک ہی ہے مشرق و مغرب کا بادشاہ
کیونکر نہ دو لتوں میں بڑھے اعتبارِ ہند

زندہ کیا حضور نے اکبر کے نام کو
کیوں خلق آپ کو نہ کہے افتخارِ ہند

وہ جو رسا ہے بندۂ دیرینۂ نظام
دیتا ہے یوں دعا تجھے اے تاجدارِ ہند

فرخندہ و مبارک و مسعود و سازوار
دربار ہو یہ اے شہِ عالی تبارِ ہند

پھولے پھلے زمانہ میں گلزارِ خسروی
گل پھول تا کھلائے چمن میں بہارِ ہند

آباد و شاد امپرر و امپرس رہیں
ہو جاں نثارِ شاہ ہر اک جاں نثارِ ہند

جتنے رئیس ہند ہیں سب پر ترا یہ لطف
سب مانتے ہیں تجھکو کہ ہے تاجدارِ ہند

آصف سے اتحاد کا محکم ہو رابطہ
ہے وہ رفیقِ دولتِ عظمت مدارِ ہند

رستم

رستم منشی رستم علیخان رستم، الہ آباد کے باشندے اور ۱۸۹۹ء میں مرزا پور میں مقیم تھے رسالہ پیامِ عاشق سے کلام نقل ہوا۔

کٹ گئی عمر مگر تو نہ کٹی کاٹے سے
طول کس درجہ ترا اے شبِ ہجراں دیکھا

اُن نرگسی آنکھوں کے تصور میں ہوں بیمار	نیند آنکھوں میں آتی نہیں اک دم شبِ فرقت
درپیش عدم کا ہے سفر ساتھ چھٹا آج	لے تجھ سے بھی رخصت ہوئے ایامِ شبِ فرقت
سب چھوٹ گئے اپنے نچھوڑا مجھے رستم	تا عمر رہی ہے مری ہمدم شبِ فرقت

رُسوا — **رُسوا**۔ لالہ آفتاب رائے رُسوا جوہری ساکن شاہجہاں آباد عہدِ اکبر شاہ ثانی (۱۸۰۶-۳۷) دائم الخمر اور بازاروں میں غزلیں پڑھتے پھرا کرتے تھے، مرتے وقت وصیت کی کہ شراب میں غسل دینا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا یہاں تک کہ کپڑوں پر بھی شراب چھڑکی گئی مگر روایت ہے کہ جنازہ اُٹھاتے وقت کسی کو بھی شراب کی بُو نہ آئی، یہ کلام بہم رسیدہ کا خلاصہ ہے ؏

رُسوا ہوا، خراب ہوا اور بدر ہوا	اِس عاشقی کے پنتھ میں جس کا گذر ہوا
مست ہو کر گر پڑے ہیں ہر طرف دیوار و در	ابرِ رحمت ہے برستا یا برستی ہے شراب
قفس سے چھُٹ گئے ہم اور چمن میں جانے نہیں	اُڑیں تو پر نہیں رکھتے چلیں تو پائے نہیں
رُسوا بھی اِس زمانے میں مجنوں سے کم نہیں	کوئی جا نہیں زمیں پہ کہ اشکوں سے نم نہیں
وصل میں بیخود رہے اور ہجر میں بیتاب ہو	اِس دیوانے دل کو رُسوا کس طرح سمجھایئے

رُسوا — **رُسوا**۔ شیخ محمد عبد الحمید رُسوا ابن شیخ امداد علی متوطنِ غازیپور مقیم آگرہ چند فارسی غزلیں مرزا نوشہ غالب کو دکھائیں تھیں۔ اُردو میں مرزا مہر سے اصلاح لی تھی ۱۲۸۱ھ میں پیدا ہوئے تھے اِسکے سوا اور کچھ حال دستیاب نہ ہو سکا۔ کلام حاضر ہے۔

اگر دل مومنوں کے زاہدو اعرش خدا ٹھیرے	بتوں نے جب اُنھیں چھینا تو پھر بتلاؤ کیا ٹھیرے
کہا میں نے ذرا ٹھیرو تو دل لے دلربا ٹھیرے	کہا اُس گیسوؤں والے نے اب کسکی بلا ٹھیرے
دلِ مضطر ہمارا سینۂ سوزاں میں کیا ٹھیرے	کہاں سیماب آتش دونوں باہم ایکجا ٹھیرے
لبِ جاں بخش کی تیری ہوئی کشتی جو اے قاتل	عجب کیا ہے جو اُنکی خاک بھی خاکِ شفا ٹھیرے

رُسوا — **رُسوا**۔ صاحب طبع رسا منشی کفایت علی رُسوا اکبر آبادی، قاضی سیّد محمد ہاشم علی مغفور کے خلفِ اصغر ہیں، بمقام آگرہ پیدا ہوئے، اِنکا خاندانی سلسلہ سیّد علی ہمدانی سے ملتا ہے

مولوی سید گلزار علی اور مولوی محمد بشیر سے تحصیل عربی فارسی کی کی فن سخن میں شروع میں مرزا خادم حسین صاحب رئیس اکبرآبادی سے تلمذ اختیار کیا اور اُنھیں کے ارشاد کی تعمیل میں سُہیل تخلص کیا، لیکن چونکہ طبائع و مذاقِ سخن میں اختلاف تھا کچھ دنوں بعد نواب فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کے تلمذ سے بہرہ یاب ہوئے، شوخی فکر اور طبیعت کا چلبلا پن کلام سے ظاہر ہے ۱۸۹۰ء میں گوالیار جاکر ملازم سرکار سیندھیہ ہوئے اب عدالتِ دیوانی ضلع سکرواری میں اہلمد ہیں سن شریف قریب چالیس بیالیس سال کے ہے، طبیعت کا چوچلا مفصلہ ذیل اشعار سے ظاہر ہے۔

یہ کلیجہ ہے میرا، دل ہے میرا، دم ہے میرا
غم دیا، رنج دیا، داغ دیا، درد دیا،
تیری خاطر سے رقیبوں کا بھی اپنے شکوہ

آپ نے تیر کو پہلو سے نکلنے نہ دیا
اُسنے سب کچھ دیا ارمان نکلنے نہ دیا
دل میں آیا تو سہی منہ سے نکلنے نہ دیا

ملے جو قسمت سے ایسا موقعہ تو لطف آئیگا زندگی کا
ملے تھے قسمت سے وصل کی شب مذاق کیسا یہ مجکو سوجھا
سوال ہوگا تو اور ہی کچھ جواب دینگے وہ اور ہی کچھ
یہ یا ملال ہوگا ذرا اُنھیں انفعال ہوگا
گلے سے اپنے لگاؤ اُنکو شکایتوں سے حصول رُسوا

مزا تو جب ہے کہ وصل میں ہو زبان کیسی دہن کیسا
بگڑ گئے وہ شکایتوں سے نتیجہ نکلا یہ دل لگی کا
مزا تو آئیگا حشر کے دن ہماری اُنکی چلی کٹی کا
وہ چھپ کے نکلے عدو کے گھر سے یہی تو ہے وقت بندگی کا
لگا ہی قسمت سے ہاتھ یہ دن نہیں ہے موقعہ چلی کٹی کا

کون کرتا ہے الٰہی یہ شرارت مجھ سے
یہ جلا یکا نیا ڈھنگ کیا ہے ایجاد
کون سنتا ہی ہماری کہ کریں داد طلب
ہم تجھے قتل کرینگے سرِ محشر آکر

خط یہ خط مجھکو جو گمنام چلے آتے ہیں
غیر کے خط بھی مرے نام چلے آتے ہیں
ہائے محشر سے بھی ناکام چلے آتے ہیں
ابتو نوٹس یہ مرے نام چلے آتے ہیں

آنکھوں آنکھوں میں اشارہ ہے کہ لو آئیے دل
حضرتِ درد کو آتا ہے تکلف کیسا

پردے پردے میں وہ مطلب کی سنا دیتے ہیں
آپ جب اُٹھتے ہیں تو مجکو بٹھا دیتے ہیں

کیا صلہ ہمکو ملیگا یہ زباں سے کہدو
اپنا دل دیجئے گنہگار بنئے کیا کہنا ؟

کھو دیا جسنے ہمیں دونوں جہاں سے رسوا
کسی کے روئے انور کا تصور ہو تو ایسا ہو

مزا اِس آمد و شد کا قیامت تک رہے باقی
دل یہ خالی نہیں رہتا کبھی ارمانوں سے

یہ نیا حکم ہے قائل ہوں تری شوخی کا
پھر امنگوں کا ظہور اس دلِ ناشاد میں ہے

نارسائی ہمیں سنواتی ہے باتیں کیا کیا
مجھ سے ناخوش ہو جو تم ہیں بھی خفا ہوں سنئے

دربدر ڈھونڈھنے سے فائدہ، حاصلِ مطلب
وہ اگر ظلم بھی کرتے ہیں تو ہے مہر و وفا

آپ ہمتیل ہیں یکتا ہیں مگر یہ سمجھئے *

ہم نشانِ دلِ گم گشتہ بتا دیتے ہیں
عاشقوں کو وہ سزا روزِ جزا دیتے ہیں

ہم تو اُس کو سنے والے کو دعا دیتے ہیں
ہٹائے سے نہ ہٹتا ہو مٹائے سے نہ مٹتا ہو

مٹے حسرت اگر کوئی تو پھر ارمان پیدا ہو
روز گھر اپنا بھرا رہتا ہے مہمانوں سے

نہ تو اپنوں سے ملوں اور نہ بیگانوں سے
کچھ ترا رحم بھی شامل تیری بیداد میں ہے

یہی دھبّہ تو بڑا دامنِ فریاد میں ہے
ایک سے ایک بھلا عالمِ ایجاد میں ہے

یار کا گھر تو ہمارے دلِ ناشاد میں ہے
یاں گذارش بھی تو داخل مری فریاد میں ہے

کوئی رُسوا سا بھی اِس عالمِ ایجاد میں ہے

رسوا

رُسوا۔ سیّد محمد اصغر رُسوا خلف میر وزیر علی اخگر مرحوم لکھنوی، حضرت رشید لکھنوی کے باعقیدت تلامذہ میں ہیں، خوش فکر شیریں کلام شاعر ہیں، بندش اور مضمون دونوں کا لحاظ رکھتے ہیں، یہ کلام کا نمونہ ہے ؛

ہمنشینوں سے چُھپا کر انھیں چاہیں کیونکر
سر سے ٹلتی ہیں حسینوں کے بلائیں کیونکر

مجھ سے کیا پوچھتے ہو ناز و کرشمہ کیا ہے
وصل کی رات ہی پہلے یہ بتا دو مجکو

نہ سہی عشق۔ مروّت بھی ہے آخر کوئی شے

چُھپ سکینگی یہ محبت کی نگاہیں کیونکر
یا خدا ہوتی ہیں مقبول دعائیں کیونکر

قتل کی اپنے بتا دوں انھیں راہیں کیونکر
تم کسی بات پہ روٹھو تو منائیں کیونکر

رسم بڑھ جائے کسی سے تو گھٹائیں کیونکر

کرتے ہیں زندۂ جاوید مجھے کاٹ کے سر
آب شمشیر نہیں آب بقا دیتے ہیں

عبث کھٹکا ہے چشم باغباں میں
کہ اب کیا تھا ہمارے آشیاں میں

قتل کا مانع ہیں اے قاتل نہیں
پر ابھی یہ ہاتھ اس قابل نہیں

دیکھتا ہوں گو تصور میں تجھے
چاہیئے جو لطف وہ حاصل نہیں

کام کیا مجھ دل شکستہ کا وہاں
شمع کشتہ لائق محفل نہیں

باغ عالم میں جو سونگھا پھول پائی تیری بو
ہر ورق گل کا مزین تھا تری تصویر سے

بڑھ گئی زلف سے سب راز سر بستہ کھلا
مدعا پایا تیری الجھی ہوئی تقریر سے

ابھی تلاش رہ میکدہ میں تھے واعظ
تم اس گھڑی ہمیں گویا کہ خضر راہ ملے

ہنسی ہنسی میں بھی ہو سر کدورت لیا ہی بوسہ جب بے اجازت
مٹی ہے تقدیر کی یہ صورت ہنسا ہنسا کر رلا رہا ہے

فقط لہو کا تھا ایک قطرہ بہا وہ آنکھوں کی راہ سارا
دبا ہے ہو جو دل ہمارا تو تم ہیں پہچان کیا رہا ہے

چھپایا راز محبت اپنا کہ پی گیا آنسوؤں کا دریا
یہ رنگ رخ کو کہو کروں کیا یہ درد دل کا بتا رہا ہے

کچھ عبث آفت میں جان عاشق دلگیر ہے
ضعف دامنگیر ہے وحشت گریباں گیر ہے

یہ سمجھ کر مجھ سے منہ پھیرے ہوئے بیٹھے ہیں وہ
زخم دل کے واسطے سوزن نگہ کا تیر ہے

ہے گماں تسکین کا ہی ظلم کی بس انتہا
اس پہ پچھتاتا ہے قاتل دل میں میرے تیر ہے

بیخودی شوق جواب خط میں دیکھے تو کوئی
ایک ہی مطلب ہو لیکن سو جگہ تحریر ہے

یاں دم آنکھوں میں ہے اور واں یہ گذرتی ہے خبر
آنکھ بیمار نے اب کھولی ہے حال اچھا ہے

یہ کہہ کے آج وہ ہمت بڑھا گیا میری
تری وفا سے پشیماں ہوئی جفا میری

رسوا

رسوا: منشی سید باقر حسین صاحب لکھنوی ملازم میونسپل کمیٹی لکھنو۔ داغ دہلوی کی شاگردی کا دم بھرتے ہیں اور مسن آدمی ہیں، یہ انکا کلام ہے ۔

پری ہو، حور ہو، یا آدمی ہو
تلاش خوبرو ہے اور میں ہوں

کیوں نہ پروانہ ہو دل شمع حجاب یار کا
ہے فروغ عشق عاشق کے لئے پیغام عشق

وہ بات بات پہ تیغ ستم دکھاتے ہیں	قضا کا سامنا ہے پر قضا نہیں آتی
ہٹا دے بیچ سے مشتاق کی دیوار آئینہ	تماشائے فروغ حسن سیرت دیکھنے والے
صدمۂ ہجر سے جو دل کی ہوئی ہے حالت	کس طرح چیر کے پہلو کو دکھائے کوئی
کہا جو میں نے کہ مانگو تو دل ہیں نذر کروں	تو ہنس کے بولے ہیں التجا نہیں آتی

رسوا

رُسوا پنڈت گنگا پرشاد صاحب تذکرہ ہنود سے کلام لیا گیا۔ ملاحظہ ہو:

ائے پری کوچے سے تیرے کیوں قدم اٹھتا نہیں	پڑ گیا مجھ پر بھی کیا سایہ تری دیوار کا
تھے مجھے ہنگامۂ محشر پہ کیا کیا اعتراض	جب تلک دیکھا نہ تھا عالم تری رفتار کا

رُسوا

رُسوا منشی سید اولاد حسین بریلوی از سادات نو محلہ، آپ ریاستِ جیپور کی کونسل عالیہ میں وکالت کرتے تھے، پھر ناظم بھی ہو گئے تھے ۱۹۱۲ء میں انتقال کیا، بڑے نکتہ فہم نکتہ رس سخن سنج تھے، لیاقت علمی بہت اچھی تھی، شعر کا شوق بہت کم تھا مگر جب کہتے تھے تو خوب کہتے تھے، فی البدیہہ شعر کہنے کی اچھی مہارت تھی، قاضی محمد خلیل صاحب کی زبانی چند اشعار سُنے وہ درج کیے گئے:

بہار چھا گئی آنکھوں میں جب سُرور آیا	شراب پینے سے کافر کے مُنہ پہ نُور آیا
شراب چھوڑ کے نیت ہوئی ہے ڈانواڈول	یہ کیسی توبہ کہ ایمان میں فتُور آیا
ہماری آنکھ کی اللہ رے مستیاں بے مے	کسی حسیں پہ نگہ جب پڑی سُرور آیا
لوگ کہتے ہیں کہ عالم میں بہار آئی ہے	دیکھتے ہم جو گذرتے سوئے زنداں ہو کر
اک جہاں کشتۂ انداز خود آرائی ہے	آپ جو چاہیں کریں آپکی بن آئی ہے
ہم اتنی زیست میں تنگ آ گئے ہیں حضرتِ خضر	کہاں سے لاتے جا کر عمرِ جاوداں کے لیئے
ہمیں یہ شرم رُسوا مانع ترکِ محبت ہے	کہینگے خود غرض تھے چار دن کی آشنائی تھی
وُہی فغاں ہے، وُہی آہ ہے، وُہی نالہ	خدا کے فضل سے اپنا جو حال تھا سو ہے

رُسوا

رُسوا، مولٰنا فیض احمد صاحب بدایونی، بار بار حالات کے لیئے لکھا گیا، مگر باوجود اقراروں کے

کچھ اطلاع نہ ملی، مکرمی و محبی قاضی محمد خلیل صاحب کی بیاض سے کلام نقل ہوا۔

قطعہ

بتخانوں میں دے پھرا اذانیں
لیکن نہ کسی نے یوں بھی پوچھا
ناقوس بھی کعبہ میں بجایا
بے وقت یہ راگ کس نے گایا

تم جسے چاہو چڑھا لو سر پر
کوئلیں بولیں پپیہے کوکے
بد دماغی ہے فقط میرے ساتھ
ہم جو چپ ہوں تو سڑی کہلائیں
ورنہ یوں دوش پہ کاکل ٹھہرے
روز و شب شیشہ سے قلقل ٹھہرے
کان کی بات مری غل ٹھہرے
شیخ چپ ہوں تو توکل ٹھہرے

محفل میں اسکی دور کھڑے ہیں ادب سے ہم
کرتا ہوں ورد اسلیئے دیتے ہیں جان سے
کہتے ہیں جسنے چھوڑی خودی وہ خدا ہوا
ہیں اسکے منتظر کہ اشارہ کرے کوئی
مجکو پسند ہے کہ تقاضا کرے کوئی
درگذرے ہم خدائی سے بندہ کرے کوئی

رسوا

رسوا۔ جناب مرزا ہادی حسن صاحب رسوا، حاجی مرزا ولی جان بیگ کے بیٹے بریلی کے باشندے اور حضرت اسیر کے شاگرد ہیں، آپنے جو تقریظ خمخانۂ جاوید پر لکھی ہے وہ جلد دوم کے آخر میں درج ہے۔ کلام کا نمونہ حاضر ہے

نظر آتی ہے جورِ چرخ سے ویرانی عالم
روتے ہیں اپنے حالِ شکستہ پہ صبح تک
آنکھوں سے دلمیں کھینچتے ہیں عکسِ روئے یار
رخ میری سمت اور نظرِ لطف غیر پر
رہا رازِ محبت سوزِ پنہاں میں نہاں برسوں
کسیکی پردہ پوشی دل سے منظورِ نظر رکھی
سوالِ وصل پر وہ بن گئے تصویرِ خاموشی
بنا یہ جسمِ خاکی مرکب جاں مدتوں رسوا
کھلی آنکھیں نظارہ کرتے ہیں خوابِ پریشاں کا
سنہ ڈھانکتے ہیں وہ اِن چاکِ سحر سے ہم
فوٹو کا کام لیتے ہیں تارِ نظر سے ہم
اپنی نظر میں گر گئے آنکی نظر سے ہم
کیئے اسرارِ دل رنگِ پریدہ نے عیاں برسوں
رہا طفلِ سرشک آغوشِ مژگاں میں نہاں برسوں
رہا رنگِ حیا چشمِ مروت میں نہاں برسوں
چلی ریگِ رواں میں کشتی عمرِ رواں برسوں

بہار آئی الٰہی خیر ہو دستارِ واعظ کی
کہ وحشی مائل چاکِ گریباں ہوتے جاتے ہیں

یقیں ہے کوئی دم میں حشر برپا ہونیوالا ہے
کہ خورشید قیامت داغِ ہجراں ہوتے جاتے ہیں

جنوں نے زور پکڑا آمدِ فصل بہاری ہے
گل و بلبل بہم دست و گریباں ہوتے جاتے ہیں

جگر سے داغ حسرت ٹوٹتے جاتے ہیں شب وعدہ
نئے گلدستے زیب طاقِ نسیاں ہوتے جاتے ہیں

رسوا ۔ منشی سید افضال حسین شاگرد احسان شاہجہانپوری، آجکل کے شعرا میں انکا شمار ہے قاضی خلیل کے مشاعرہ کی غزل میں سے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

دل جرم محبت کا کیے جاتا ہے اقرار
بیخوف بھی مجرم کوئی ایسا نہیں ہوتا

جھپکے گی برق طور سے کیا عاشقوں کی آنکھ
اس میں تجلیاں ہیں تری جلوہ گاہ کی

زبانِ غیر کی تاثیر و بدے نطق میں یارب
کسی کے سامنے اب قصدِ اظہار تمنا ہے

ہوا سنگِ جفا سے چور لیکن اُف نکی دل نے
ندی آواز جسنے ٹوٹکر بھی یہ وہ شیشا ہے

مری آنکھوں سے دل میں بے تکلف تم چلے آؤ
کوئی تمکو نہ دیکھے گا کہ یہ پردہ کا رستا ہے

رسوا ۔ بابو ہر کشنداس رسوا، کلرک سدرن پنجاب ریلوے مقیم دہلی شاگرد آغا شاعر قزلباش دہلوی

ساقیا مجکو وہ مخمور دکھا دے آنکھیں
ہوں ندیدہ مئے گلرنگ کے پیمانوں کا

قد توں ہو نہ سکا جب تری ابرو کا جواب
ٹھوکریں کھائیں ہلالِ سُمِ توسن ہو کر

نیچی نظروں سے ہوئے جاتے ہیں بسمل لاکھوں
حشر برپا ہو اگر آنکھ اُٹھائے کوئی

یاد آتا ہے شبِ وصل کسی کا کہنا
ہاتھ ٹوٹیں جو ہمیں ہاتھ لگائے کوئی

کر دیا پامال اِس صورت سے رسوا کا مزار
ٹھوکروں پر ٹھوکریں آتے ہوئے جاتے ہوئے

رسوا ۔ منشی شیخ محمد وحید باشندۂ ضلع سارن محرر سررشتۂ رجسٹری تحصیل بانس گاؤں۔ بیس برس سے مشق سخن کرتے ہیں اور جناب وسیم خیر آبادی کے تلامذہ میں داخل ہیں چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

دلی کیا اسکے ہاتھوں میں حنا ئے خونِ بسمل ہے
قیامت آج جوبن پر عروسِ تیغ قاتل ہے

ذرا دیکھو تو بیرحمی نہ دیکھا مُڑ کے قاتل نے
کہ مقتل میں تڑپتا خاک پر کس طرح بسمل ہے

غریقِ عشق ہیں ہمکو نہیں ہے خضر کی حاجت
ہمارا رہنما دل ہے ہمارا پیشوا دل ہے

وہ کُشتہ ہوں کہ مجکو مار کر ظالم پشیماں ہیں
کٹا جاتا ہے خنجر پانی پانی میرا قاتل ہے

رشک

رشک محقق علمِ شعر زائر کربلائے معلّیٰ میر علی اوسط رشک مرحوم خلف میر سلیمان باشندۂ فیض آباد مقیم لکھنؤ شاگرد رشید امام الشعرا شیخ امام بخش ناسخ مرحوم، آخر عمر میں کربلائے معلّیٰ میں سکونت اختیار کی تھی، علمِ زبان کے زبردست محقق اور ایک ضخیم و مبسوط لغتِ اُردو کے مؤلف تھے لیکن افسوس ہے کہ وہ لغت شائع نہیں ہوا، جناب رشک اپنے زمانے کے مشاہیر شعرائے لکھنؤ میں شمار ہوتے تھے اور انکے شاگرد بھی بکثرت تھے، تاریخ گوئی میں اچھا ملکہ حاصل تھا انکے دو دیوان مسمیٰ بہ نظمِ مبارک و نظمِ گرامی غدر سے پیشتر چھپے تھے اب کمیاب ہیں، بڑے پُرگو اور زود فکر کہنے والے تھے مگر رعایت لفظی اور ضلع جگت کے دام میں اسیر لکھنؤ کے اُستاذہ میں انکا شمار ہے مگر بیشتر حصہ اشعار کا خشک کلامی اور بد مذاقی کے عیوب سے پاک نہیں کہا جاسکتا دُور از قیاس تشبیہ و استعارہ برتنے کے شوقین اور اصلی مفہوم شاعری سے بے خبر تھے اِس لئے اکثر مضامین حد درجہ مبتذل باندھ جاتے تھے تاہم بعض بعض جگہ اِنکی زورِ مشق اور استعداد کامل سے اچھے شعر بھی نکل جاتے تھے، طبیعت کا رنگ ظاہر کرنے کے لئے کچھ اشعار انکے خاص رنگ کے بھی درج انتخاب کر دیئے ہیں گو ہمارے مذاق کے خلاف ہیں، اِنکے تلامذہ میں منیر شکوہ آبادی مرتبۂ اُستادی رکھتے تھے، حضرت رشک نے ۱۲۸۴ھ میں بعمر ۷۰ سال انتقال فرمایا۔

دیکھیے اللہ کی یہ قدرتیں
سنگ سے بُت بُت سے خدا ہو گیا

یوں بھی نہ پوچھا کبھی صیاد نے
کون رہا، کون رہا ہو گیا

غمزہ نہ اُٹھ سکا دلِ شیدا اُٹھا لیا
کس چیز کو اُٹھانے گئے کیا اُٹھا لیا

کاہید گی جسم اگر یونہی رہے گی
ہمکو بھی ہمارا تنِ لاغر نہ ملے گا

یا ساتھ ترے سوئینگے یا قبر میں جاکر
مدفن تو ملے گا جو ترا گھر نہ ملے گا

بوسہ ہمیں دینا ہی ہے تو دے دونوں لبوں کا
یوں تو مزۂ قندِ مکرر نہ ملے گا

جس رات نقاب اُس مہِ کامل نے اُلٹ دی
تاروں کو نشانِ مہِ انور نہ ملے گا

ایکدن کام ہی آجاتا ہے کھوٹا پیسہ
داغِ سینے کا چراغِ شبِ ہجراں ہوگا

پتھر کسیکا دل ہے کسیکا دل آئینہ
ششدر ہوں کارخانۂ پروردگار کا

جن دنوں آشوبِ عالم حسنِ چشمِ یار تھا
جسکو دیکھا نرگسِ بیمار کا بیمار تھا

دن کو کیونکر بے نقاب آتا وہ رشکِ آفتاب
پردۂ شب سے جسے اکثر حجاب آیا کیا

بے ثباتی بحرِ دُنیا کی کھلی جس روز سے
ہر فلک چشمِ تصور میں حباب آیا کیا

سیب کا پوست ہے وہ جلدِ ذقن
جلدِ پستاں انار کا چھلکا

قیس کو تھا حجاب ہم نہ ہوئے
کہ اُٹھا دیتے پردہ محمل کا

آتشِ عشق نے مجھے فکر سے پاک کر دیا
صورتِ نخلِ شعلہ ہوں غم نہیں برگ و بار کا

دیکھا جو چشمِ غور سے دونوں کا حال ایک ہے
گردشِ چشمِ یار کا گردشِ روزگار کا

اس سے دلوں کو چین ہے اس سے ہے شورشِ جہان
یار ہیں، آفتاب ہیں، فرق ہے نور و نار کا

رہا دنیا میں جبتک میں خیالِ زلفِ جاناں تھا
زمانہ زندگی کا مو بمو خوابِ پریشان تھا

جلایا باغ ایسا آتشِ رخسارِ جاناں نے
کہ ہر گل داغ تھا جو سرو تھا سروِ چراغاں تھا

اے عشق تیری بندہ نوازی کا ہوں غلام
محمود کو غلام بنایا ایاز کا

اللہ رے موسمِ بہاری
ابکے ہے فلک سے تا زمیں سبز

فرشِ نفیس خاک ہے، بستر اگر نہیں
کنجِ لحد میں چین کرینگے جو گھر نہیں

اقرار کا یقین، نہ انکار کا یقین
تیری زبان پہ ہے اِدھر ہاں اُدھر نہیں

تو ہی جیسا اس خم و چم کا کوئی گلرو نہیں
یہ خمِ ابرو نہیں یہ حلقۂ گیسو نہیں

پھیر لاتا جا کے میدانِ عدم سے کتنی بار
توسنِ عمرِ رواں پر کیا کروں قابو نہیں

بحرِ دُنیا کی نہایت کا نہیں کھلا بیڑا
کشتیٔ عمر جدھر جائے اُدھر جانے دو

آہیں بھر لونگا تو کچھ بات سنائی دیگی
ناصحو پہلے یہ آندھی تو ٹھہر جانے دو

وہ بے نصیب ہوں جو کروں فصدِ میکشی
خونِ جگر شراب بنے دِل کباب ہو

جو جو عذابِ وحشتِ جنوں ہمنے جھیلے ہیں
اُن سب کا روحِ قیس کو یارب ثواب ہو

سر کھا گئے بک بک کے نصیحت سے مرے دوست
ملتے ہیں جنوں میں مجھے پتھر سے زیادہ

کعبہ کی راہ لی درِ دلدار چھوڑ کر
پایا اسی سے حاجیوں کو سال بھر تباہ

اُنکا مزاج غیر جو آکر بدل گئے
کچھ کہہ کے وہ زبان برابر بدل گئے

جو دے تو حاتم طے ہے نہ دے تو قاروں ہو
طرح طرح سے زمانے میں نام ہوتا ہے

ذرا سے رنج میں ہمکو حلال کرتے ہو
اِسی سے کہتے ہیں غصّہ حرام ہوتا ہے

کھول کر زلف کہا اژدرِ موسیٰ کیا ہے
ہاتھ چمکا کے وہ بولے یدِ بیضا کیا ہے

راستہ صبح تک اے رشکِ قمر دیکھیں گے
آج ہم شام سے آہوں کا اثر دیکھیں گے

اِک بتِ بدگماں سے ملنے پر
سارے عالم کی بدگمانی ہے
شبِ ہجراں سحر ہوئی تو کیا
کسے اُمید زندگانی ہے
اب تو باتیں بھی ہو گئیں موقوف
آرنی ہے نہ لن ترانی ہے

کہیں زلفوں سے دل آنکھیں نہ لے لیں
اندھیری رات میں چوری کا ڈر ہے

پورا ہوتا ہے چاند ایک ہی رات
ماہِ عارض ہمیشہ کامل ہے
چپکے سنتا ہوں بات ناصح کی
کہ خموشی جوابِ جاہل ہے
بے دلیل اُسکو ہمنے پہچانا
عقل ناقص ہے فہم کاہل ہے

کیا ہی جسمِ آدمی کو جلد کھا جاتا ہے غم
دشمنی ایسی نہیں دیمک کو جرمِ چوب سے

چار دن چین سے کھا سردِ ہوا کے جھونکے
گھات میں لگ رہے ہیں بادِ فنا کے جھونکے
گرمیاں اور نئی اُس بتِ کافر کی یہ ہیں
ٹھنڈی آہوں کو سمجھتا ہے ہوا کے جھونکے
ابر ہے، باغ ہے، دریا ہے، وہ گلفام نہیں
آج برباد ہوئے سردِ ہوا کے جھونکے

ہجر میں آئی ہو برسات پڑا جلتا ہوں
اے خدا ابھا طیں جائیں یہ ہوا کے جھونکے

جنبش جو مژہ کو ہوئی برہم ہوئیں زلفیں
یہ سانپ سمجھ جاتے ہیں بچھو کے اشارے

فصل گل آئی بہار توبہ سے ہو جائیگی
ریش زاہد پنبۂ مینائے مے ہو جائیگی

شوق اگر یوں ہی رہا آوازِ مطرب کا مجھے
آہ جو منہ سے نکل جائیگی لے ہو جائیگی

کہاں یہ لطف چینے سے اگر پائی کمر پتلی
تمھارے ہونٹ پتلے انگلیاں پتلی کمر پتلی

تجھے تشبیہ حیوانوں سے کیوں انساں تجھے دیں
نہ وحشت چشم آہو میں نہ چینے کی کمر پتلی

فقط تجھ میں عناصر نے عجب ترکیب پائی ہے
بدن شفاف شانے گول قد موزوں کمر پتلی

اچھی رفل کی گولی کا ہی توڑ نل میں بھی
مژگانِ یار میں ہے اگر لاگ تیر کی

مژگانِ چشم تر کا یہ عالم ہے ہجر میں
پھبتی ہے مو بمو رگِ ابرِ مطیر کی

ہم عشق سے بیتاب ہیں تم حسن سے مغرور
تقصیر ہماری ہے نہ تقصیر تمھاری

صبح و مہ و خورشید ہوں یا شمع شب افروز
کس کس میں نمایاں نہیں تنویر تمھاری

پھر نہ ٹھیریںگی چمن میں بلبلیں
جس دن اے گلگوں قبا دیکھا تجھے

کہاں سے لایئے کارِ ثواب کی فرصت
غم فراقِ بتاں سے عذاب رہتا ہے

وہ بادہ کش جو جلائے جگر جلانے دو
کہ اتفاق شراب و کباب رہتا ہے

آیئے! جب مزاج میں آئے
خانۂ دل حضور کا گھر ہے

چھیڑ اُسنے یہ ہنگام ملاقات نکالی
جس بات میں رنجش ہو وہی بات نکالی

ای رشک رقیبوں سے ملاقات نکالی
نظارۂ جاناں کی عجب گھات نکالی

تعظیم کے حیلے سے اُٹھایوں کر نہ بٹھایا
ہم گھر میں گئے تو یہ مدارات نکالی

بے وصل جو روتا ہوں تو ہو کر متبسم
فرماتے ہیں بے فصل کی برسات نکالی

شرمندہ ہے رخِ گلِ تر روئے یار سے
شبنم کا وہم ہے عرقِ انفعال سے

یہ خونِ دل پیا کہ ہوئی زندگی حرام
جبتک جیا کیئے یہی ہمکو حلال ہے

ہم بادہ خوار جانتے ہیں ایک مسئلہ
زاہد جسے حرام کہے وہ حلال ہے

دِل مرا کعبہ ہے تو ایمان ہے
لے پری ہیں جسم ہوں تو جان ہے

تو نے رکھی سان پر تلوار اگر
شہر کو بس لیجیو حسن سان ہے

تن جوشِ خوں سے لال ہے دل داغدار ہے
سودائیان فصلِ جنون پر بہار ہے

تیرِ نگاہِ یار کا پلّا نہ پو سے چھپے
دیکھا تو سنبرِ طائرِ گردوں شکار ہے

رگِ جاں میں چھپیں گے آج دن بھر تیر یا نشتر
وفورِ یادِ مژگاں ہے خیالِ روئے جاناں ہے

وہاں پلکوں کی جنبش ہے یہاں کانٹے کھٹکتے ہیں
یہاں حال پریشاں ہے وہاں زلفِ پریشاں ہے

فصلِ گل آئی نہ اُٹھے خانۂ خمار سے
الحذر زہد و ورع سے توبہ استغفار سے

خونِ خم پیتا ہے کھاتا ہے لبِ مے کے کباب
محتسب کے ہوش اڑتے ہیں ترے میخوار سے

چھوڑیئے تکلّف لڑا تا اب طلوعِ حسن ہے
کاٹیے تیغِ سیہ تو ابروئے خمدار سے

بعدِ مُردن خاک کا انبار یا لوحِ مزار
اے اجل اسکے سوا کیا خاک پتھر چاہیئے

جادۂ راہِ عدم کو شرطِ کامل ہے وجود
خانہ بربادی کو بھی پہلے کہیں گھر چاہیئے

بھیج پیغام اے صنم اک آدمی مختار کر
ہے اگر دعویٰ خدائی کا پیمبر چاہیئے

بات یہ بطنِ صدف سے خوب ہاتھ آئی ہمیں
لطف یہ ہے ہاتھ خالی دل تونگر چاہیئے

رُوح شبہائے جُدائی میں فنا ہو جائیگی
یادِ زلفِ عنبر افشاں اژدہا ہو جائیگی

حُسن آئینہ بھویں ہونگی یہ تلواروں سے تیز
زلف سمجھے ہو جسے کالی بلا ہو جائیگی

ہو گئے مرغانِ فلک پرّاں تک تیرے شکار
جنبشِ موجِ ہوا زنجیرِ پا ہو جائیگی

وہ سیہ کارِ زمانہ ہوں کہ میرے عکس سے
آرسی خورشیدِ محشر کی توا ہو جائیگی

بے قربِ یار خواہشِ ہستی بعید ہے
جینا مضر ہے ہجر میں مرنا مفید ہے

کوچۂ قاتل وہ جنت ہے جہاں ہیں یک قلم
خون کی نہریں سپر پھول پھل تلوار کے

صُورت اگر یہی ہے وفورِ حجاب کی
اے ماہ چہرہ کیا تجھے حاجت نقاب کی

آیا ہوں کعبہ میں رہِ میخانہ بھول کر
یعنی خطا سے راہ چلا ہوں ثواب کی

شیشوں کو محتسب نے جو توڑا تو کیا ہوا
دلہائے میکشاں میں جگہ ہی شراب کی

روزِ سیاہِ دہر سمجھ رنگِ عارضی
دو چار روز رہتی ہے رنگت خضاب کی

ہوں اسیرانِ بلا میں وہ گنہگار قدیم
کبھی کھلتا نہیں دیکھا درِ زنداں جسنے

جرم سفاک نہیں خون مرا اسپر ہے
تیر کھینچا مرے دل سے مع پیکاں جسنے

نہ دیکھ چشمِ حقارت سے ای حباب مجھے
ثباتِ عمر پہ آتا ہے خود حجاب مجھے

آدا آدا میں نمک زخم پر چھڑکتا ہے
جو بات بات میں کرتا ہے وہ کباب مجھے

میں ایکبات میں رکھتا ہوں لاکھ دلمیں جواب
وہ ایکبات میں کرتا ہے لاجواب مجھے

ہو عرش پر تو آپ کو زیرِ زمیں سے گنے
ہر دم کو آدمی نفسِ واپسیں سے گنے

سینے کے داغ ہوکے میں گنواؤں رات بھر
تارے خدا کرے وہ بتِ مہ جبیں سے گنے

گنتے ہیں اے کریم ترے عفوِ بیحساب
اپنے گناہ ہمنے کسی دن نہیں سے گنے

اٹھ گئے ہم سفرِ ہمنفساں سے پہلے
چمن اپنا ہوا پامال خزاں سے پہلے

آدمی وہ ہے جو انجام نہ بھولے اپنا
گور کی فکر ہو تعمیرِ مکاں سے پہلے

ہیں قدِ عارضِ جاناں کی شبیہیں اے رشک
باغ میں سرو و گل آئے ہیں کہاں سے پہلے

ہم سیہ بختوں کا سولی پر چڑھانا اَور ہے
دارِ عیسیٰ اَور ہے زلفِ چلیپا اَور ہے

ایک موسیٰ غش ہوئے تھے اس سے لاکھوں مر گئے
جلوۂ حق اور ہے تیرا جھمکڑا اَور ہے

دردِ سر نغمۂ بلبل سے سوا ہوتا ہے
دم مرا بادِ بہاری سے ہوا ہوتا ہے

یہ ہے تحقیق کہ تقلید سے کیا ہوتا ہے
پوجنے سے کہیں پتھر بھی خدا ہوتا ہے

ایک دن عید کا دنیا میں تو غم کا عشرہ
رنج آرام سے وہ چند سوا ہوتا ہے

نہ گدگدائیے اتنا کہ آدمی رو دے
ہنسا ہنسا کے رلانیکو کون کہتا ہے

اگر رقیب کے پیچھے میں ہوں نہیں ای رشک
تو پھر پتنگ اڑانے کو کون کہتا ہے

حقیقی کو مجازی کر دیا بے امتیازی نے ۔۔۔ تماشے کے دکھائے کھیل مجکو عشقبازی نے
بڑھایا اوج ہجر عاشقان و کبر معشوقاں ۔۔۔ ہماری ناز برداری نے اُنکی بے نیازی نے
محبت ہمنے چھوڑی جب بڑھی تکرار آپس میں ۔۔۔ کیا کوتاہ سب جھگڑا زبانوں کی درازی نے

رشک

رشک - جناب بابو گنگا پرشاد صاحب بلند شہری ،ہیں بائیس برس ہوئے حیات تھے اور گاہ گاہ فکر سخن بھی کر لیا کرتے تھے۔

جب سے اُن کو گالیوں کی خو پڑی ۔۔۔ ہمکو بھی سُننے کی عادت ہو گئی
شب آپکی بسر ہوئی کل کسکے گھر میں ہے ۔۔۔ چہرہ اُداس دیکھتا ہوں درد سر میں ہے

رشک

رشک - مولوی حفیظ اللہ خان رشک سابق ہیڈ مولوی اسکول تال ریاست جاورہ آب وکیل ہو گئے ہیں حضرت فصیح الملک مرزا داغ کے پُرانے شاگرد ہیں، خوش کلام، شیریں زبان تیز طبع شخص ہیں، اُستاد کے رنگ میں کہنے کا بہت شوق ہے، پچاس برس کے قریب عمر ہے زبان صاف اور مذاق شُستہ و سلیم ہے۔

مری نگاہوں سے پُوچھ اپنے حُسن کا عالم ۔۔۔ کہ سادگی میں بھی اپنی تُو وضعدار رہا
خدا دکھائے نہ پھر وہ گھڑی جُدائی کی ۔۔۔ نہ پُوچھیئے جو ان آنکھوں کو انتظار رہا
اے شوخ دل بھی تیری طبیعت سے کم نہیں ۔۔۔ رہتا نہیں کبھی کسی پہلو قرار پر
مجکو ستم کی بھی نہیں اُمید آپ سے ۔۔۔ سینے سے دل نکالدوں کس اعتبار پر
لیئے جاتا ہے مجکو شوق اُڑائے راہ اُلفت میں ۔۔۔ ہوا سے بھی ہوں آگے دو قدم اس ناتوانی پہ
پامال ہو یا ٹھوکریں کھا کھا کے سنبھل جاتے ۔۔۔ دل ڈالدیا اب تو تری راہ گذر میں
نازاں تم اپنے حُسن پہ مجکو یہ ناز ہے ۔۔۔ چھانٹا تمھیں کو میری نگہ نے ہزار میں
سُناتا ہوں جو حالِ دل تو جھنجلا کر وہ کہتے ہیں ۔۔۔ مرے جاتے ہو کیوں جلدی ہے کیا سُن لینگے فرصت میں
مقدر کا نوشتہ جبہہ سائی سے کہیں مِٹتا ۔۔۔ عذاب ہجر کیوں ٹلتا کہ یہ تھا میری قسمت میں
مجھے کچھ دین و دنیا کی خبر مُطلق نہیں سچ ہے ۔۔۔ چھٹے کونین کے غم سے پھنسے جو دامِ اُلفت میں

جلایا دل، جگر پھونکا، لگائی آگ سینہ میں
قیامت کی ہے گرمی سوزشِ داغِ محبت میں

کیا بنا ہوگے محبت بس اجی بیٹھے رہو
دیکھ لی چشمِ مروت بس اجی بیٹھے رہو

قرب کیسا دور کی صاحب سلامت بھی نہیں
ہے اسی کا نام اُلفت بس اجی بیٹھے رہو

دل کی حالت پوچھنے پر ہو گئے اتنے خفا
یہ بھی تھی کوئی شکایت بس اجی بیٹھے رہو

غیر کی تعظیم ہو وہ بھی ہمارے سامنے
خوب کی قدرِ محبت بس اجی بیٹھے رہو

مجھ سے جو وعدہ کئے جائیں عدو سے ہوں وفا
سن چکا ہوں حقیقت بس اجی بیٹھے رہو

رشک نے دیکھے ہیں تم سے سیکڑوں محشر خرام
کیا اٹھاؤ گے قیامت بس اجی بیٹھے رہو

اچھا لڑا نصیب کہ ملتے ہی آنکھ سے
ظالم نے برچھیوں پہ وہیں دھر لیا مجھے

منزل ہے دور گھات میں بیٹھے ہیں راہزن
پہنچا دے ساتھ خیر کے میرا خدا مجھے

اللہ رے تیری شانِ کریمی کہ بے طلب
لائق نہ تھا میں جس کے وہ تو نے دیا مجھے

ہے مانعِ دیدار ترے حسن کا جلوہ
پردہ ہے عجب طالبِ دیدار کے آگے

میں نے جو کہا کیجئے کچھ دل کا مداوا
کہنے لگے رکھ دو مری تلوار کے آگے

کہتے ہیں رشکِ زار کا اب غیر حال ہے
ہونٹوں پہ دم ہے آنکھ اُٹھانی محال ہے

اک دم نہ یہ ہوا دلِ مہجور سے الگ
تم سے رفیق بڑھ کے تمہارا خیال ہے

محشر میں بن گئے وہ مرے دل کے مدعی
گویا انھیں کی چیز انھیں کا یہ مال ہے

دل کا مزاج تیری طبیعت سے کم نہیں
گر یہ مچل گیا تو سنبھلنا محال ہے

اے رشک بزمِ یار کہاں مدعی کہاں
کس وہم میں پڑے ہو تمھیں کیا خیال ہے

کیوں نہ ملتا درہم داغِ جگر
مستحق ہم تھے اسی انعام کے

سر کٹا کیوں نہیں اب سینۂ زخمی سے بسمل کے
کوئی ارمان باقی رہ گیا کیا دل میں قاتل کے

ہمیں وہ بت ہمارا حضرتِ زاہد مبارک ہو
کریں گے گلشنِ فردوس میں کیا حور سے ملکے

لبوں کو دوں نگاہوں کو نہ دوں یہ ہو نہیں سکتا
ذرا خنجر عنایت کیجئے ٹکڑے کروں دل کے

ابھی تو دم بہت باقی ہے قاتل تیرے بسمل میں
یہ کیوں مڑ مڑ کے چلتی ہے تری تلوار کیسی ہے

رشک

رشک - جناب علی اوسط صاحب فتحپوری از بازماندہ نبیرہ سید لطف حسین داغ مرحوم جو حضرت ناسخ لکھنوی کے شاگردوں میں تھے، پیام یار ۱۸۹۳ء سے کلام نقل ہوا۔

مری آہ و زاری نجائیگی خالی
کریگی ترے دل میں گھر دیکھ لینا

نہیں سہل کچھ دعوئ عشق کرنا
ذرا اسکے لائق جگر دیکھ لینا

تری یاد ہیں سب ستمگار باتیں
وہ دلدوز طعنے دل آزار باتیں

تری مست آنکھوں نے ہنگامِ مستی
وہ کیں جیسے کرتے ہیں ہشیار باتیں

نہیں ضعف سے تابِ گفتار باقی
کرے تجھسے کیا تیرا بیمار باتیں

مار ڈالا چلا چِلا کے مجھے
ظلم کی یار انتہا بھی ہے

جب کہا تم پہ جان دیدوں گا
بولے ایسا کہیں ہوا بھی ہے

رشک حالِ دلِ حزیں اپنا
تم نے اُس شوخ سے کہا بھی ہے

تیغِ ابرو سے کیوں نہ قتل کیا
یہ شکایت رہیگی قاتل سے

محبت میں کوئی فنا ہو رہا ہے
کوئی محوِ ناز و ادا ہو رہا ہے

جو کرتا ہوں نالے تو کہتے ہیں ہنسکر
بناؤ تو لے رشک کیا ہو رہا ہے

غمِ دنیا و دیں سے ہوگئی کیسی سبکدوشی
لگی دل کی ہماری آبِ خنجر سے بجھی اچھی

حواسوں میں خلل ہے ناصحِ ناداں کو بکنے دو
نہ ہمتے حور اچھی ہے نہ کتنے ہے پری اچھی

جہاں تک کھائیے اسکو کبھی سیری نہیں ہوتی
ترا غم ای ستمگر اسقدر لذت فزا کیوں ہے

رقیبِ روسیہ کا کام ہے کیا کوئے جاناں میں
نکالو اسکو شیطاں ہے یہ جنت میں گھسا کیوں ہے

سبب پوچھو ہمسے اُنکی رنجش ہائے بیجا کا
جفائیں کل سے کرتی ہیں ہمیں تو چاہنا کیوں ہے

سوالِ وصل سنکر کس لیے گردن جھکاتے ہو
ذرا سی بات ہے لو مان لو شرم و حیا کیوں ہے

رشک

رشک - عالیجناب مستغنی الالقاب ناصر الملک مخلص الدولہ مسعود جنگ امیر الامرا فرزند

ولپذیر دولت انگلشیہ کرنل ہز ہائینس نواب سر حامد علیخان بہادر جی۔سی۔آئی۔ای
ایڈیکانگ شہنشاہ معظم قیصر ہند۔ والیٔ رامپور۔ آپکے والد نواب مشتاق علیخان نواب کلب علیخان
مرحوم کے دوسرے صاحبزادے تھے آپکی ولادت ۳۱ اگست ۱۸۷۵ء میں ہوئی اور صغر سنی میں ۲۰
فروری ۱۸۸۹ء میں اپنے والد کی وفات کے بعد مسند نشین ہوئے۔ نواب صاحب کے اجداد آخر سترھویں
صدی میں سرحدی علاقہ سے وارد ہندوستان ہوئے اور کچھ عرصہ لشکر شاہی میں خدمات کرنیکے بعد
بدایوں کے متصل انھیں ایک علاقہ لطور جاگیر ملا۔ علی محمد خان نے بارہ کے سیدوں کے برخلاف محاربات
میں بڑی ناموری حاصل کی اور نوابی کا خطاب پایا۔ احمد شاہ ابدالی کے حملہ کے ایام میں علی محمد خان
نے اپنی قوت بہت بڑھالی اور رفتہ رفتہ روہیلکھنڈ کا بہتر حصہ اُنکے قبضہ و تصرف میں آیا۔ اُنکی وفات
کے وقت چونکہ اُنکے فرزند شہنشاہ دہلی کے دربار میں لطور یرغمال نظر بند تھے اس لیے علاقہ کا
انتظام انکے چچا حافظ رحمت خان کی سپردگی میں رہا جب دربار دہلی نے اُنھیں رہا کر دیا تو کچھ باہمی
تنازعات کے بعد علاقہ جملہ رشتہ داروں میں تقسیم ہو گیا۔ چنانچہ چھوٹے بیٹے نواب فیض اللہ خان کو
رامپور کیٹر کی جاگیر ملی جسکی آمدنی اُس زمانے میں چھ لاکھ کے قریب تھی۔ مرہٹوں نے جب انکے
علاقہ پر فوجکشی کی تو انھیں نواب شجاع الدولہ سے امداد طلب کرنی پڑی۔ چنانچہ ۴۰ لاکھ روپیہ کی
ادائگی کے اقرار پر مرہٹوں نے علاقہ خالی کر دیا، چونکہ نواب شجاع الدولہ کو حسب وعدہ یہ رقم ادا نہیں
کی گئی اُنھوں نے ایصال زر کے لیئے علاقہ پر جبراً قبضہ کر لیا۔ اس ہنگامہ میں نواب حافظ رحمت خان مقتول
ہوئے ۱۷۷۴ء میں پندرہ لاکھ روپیہ ادا کرنے پر نواب فیض اللہ خان رامپور کے مستقل نواب مقرر
ہوئے۔ بیس برس بعد جب انھوں نے انتقال کیا تو انکے چھوٹے بیٹے غلام محمد خان نے اپنے بڑے
بھائی محمد علیخان کو قتل کر ڈالا اور ریاست پر قبضہ کر لیا لیکن نواب وزیر نے انکو شکست دیکر نواب محمد علیخان
کے خردسال بیٹے احمد علیخان کے حقوق تسلیم کر کے مسند نشین کر دیا ۱۸۰۱ء میں نواب سعادت علیخان نے یہ
تمام علاقہ سرکار انگریزی کے سپرد کر دیا اور نواب احمد علیخان ظل حمایت سرکار برطانیہ میں آ گئے نواب
احمد علیخان کے لاولد وفات پا جانے کے باعث نواب محمد سعید خان انکے چچا زاد بھائی جو اس زمانہ میں

دہلی میں ڈپٹی کلکٹر تھے حقدار ریاست تسلیم کئے گئے۔ اور انکی وفات کے بعد ۱۸۵۵ء میں نواب حال کے پردادا نواب سر یوسف علیخان مسند آبائی پر متمکن ہوئے۔ فساد غدر میں سرکار انگریزی کی خیر خواہی کے صلہ میں انھیں ایک وسیع علاقہ ایکسو پچاس مواضعات کا بطور انعام مرحمت ہوا۔ نواب کو بڑے صلح کل، نیک نفس، شریف پرور، عادل اور فیاض حکمران تھے اور مرزا غالب مرحوم کے بڑے عزیز شاگرد تھے، اور خود بھی فن سخن کے زبردست ماہر تھے انکے دیوان کے ملاحظہ سے معلوم ہوسکتا ہے کہ مرزا غالب سے انھیں کسقدر عقیدت تھی اور انکے فیض تعلیم کا کسقدر اثر انکے اشعار سے ٹپکتا ہے۔ نواب یوسفعلیخان نے ۱۸۶۵ء میں بعالم شباب انتقال کیا اور نواب کلب علیخان انکے جانشین ہوئے جنھوں نے ۱۸۸۷ء میں بائیس برس نہایت ناموری سے حکومت کر کے رحلت فرمائی۔ نواب صاحب حال کو جون ۱۸۹۶ء میں اختیارات حکومت عطا ہوئے، آپ یورپ، امریکہ، جاپان کی سیر اپنی نابالغی میں فرما چکے تھے، انگریزی و فارسی زبانوں میں آپکو معقول دستگاہ حاصل ہے۔ تفنن طبع کے طور پر گاہ گاہ شعر و سخن کی طرف بھی چند سال سے توجہ فرمانے لگے ہیں، اور منشی امیر مینائی کے بڑے صاحبزادے منشی محمد احمد صاحب قمر و صریر آپکی استادی سے مشرف ہیں، ہز ہائنس کی شادی نواب صاحب جاورہ کی ہمشیرہ سے ہوئی ہے افواج انگریزی میں نواب صاحب کو آنریری کرنل کا اعزاز حاصل ہے اور جی سی آئی ای کا بھی خطاب ملا ہے۔

کہنے کو تو میں حال دل زار کہوں گا ⁂ پر کہنے سے کیا فائدہ بیکار کہونگا

کچھ سبزہ کے آثار ہیں چہرہ پہ تمھارے ⁂ اب پھول سے رخسار کو گلزار کہونگا

خود مرنے لگا تم پہ یہ جو چاہو سزا دو ⁂ سرزد ہے ولکی خطا اسکو گنہگار کہونگا

شوخی سے کہیں آپ چھپائیں مرے دلکو ⁂ میں آپ کی زلفوں کا گرفتار کہونگا

دم بھر میں جو بیمار کو کر دیتی ہیں اچھا ⁂ ان نرگسی آنکھوں کو میں بیمار کہونگا

مجبور ہوں ایسا جو وہ بگڑینگے تو بگڑیں ⁂ مطلب کی ہے جو بات اُسے سو بار کہونگا

دنیا میں جو تم یوسف ثانی ہو تو اچھا ⁂ اس دل کو تمھارا میں خریدار کہونگا

کونین میں جب کوئی کڑی رشک پہ آئی ⁂ میں آپ سے یا حیدر کرار کہونگا

جو ہو قاتل کبھی وہ دوست اپنا ہو نہیں سکتا
وہ بُت جلّاد ہے ہرگز مسیحا ہو نہیں سکتا
خدا کا گھر تھا دل اسمیں محبت اب بتوں کی ہے
غلط ہے کہتے ہیں سب کعبہ کلیسا ہو نہیں سکتا
کبھی جب بات مطلب کی تو وہ کہنے لگے ہنسکر
کہ سب کچھ اور ممکن ہے پر ایسا ہو نہیں سکتا
شفا کیسی؟ دوا کیسی یہ سب بیکار باتیں ہیں
محبت کا جو ہے بیمار اچھا ہو نہیں سکتا
تمھارے عشق ہیں کیسی محبت رشک نے جھیلی
مگر تم سے ذرا سا کام اس کا ہو نہیں سکتا

حسینوں میں تھے انتخاب اوّل اوّل
غضب تھا تمھارا شباب اوّل اوّل
ترے ننھے ہاتھوں کے قربان ساقی
پلائی تھی جن سے شراب اوّل اوّل
ہوئے ظلم سہنے کے الفت میں خوگر
بہت تھا ہمیں اضطراب اوّل اوّل
وہ بچپن وہ بیباکیاں اب کہاں ہیں
نہ تھا انکو ہمسے حجاب اوّل اوّل
وہ ترچھی نظر، اور بانکی وہ چتون
ادا تھی ہر اک لاجواب اوّل اوّل
سلامت رہے میکدہ تیرا ساقی
ملی جس سے ہمکو شراب اوّل اوّل
بتاؤ تو کیوں ہو گئی ہم سے نفرت
ہمارا تھا عاشق خطاب اوّل اوّل
حسینوں سے ملنے کا لپکا بُرا ہے
اسی سے ہوئے ہم خراب اوّل اوّل
محبت وہ کرنے لگے آخر آخر
جنھیں تھا بہت اجتناب اوّل اوّل
ابھی ابتدا ہے مگر رشک سنتے
کہی ہے غزل لاجواب اوّل اوّل

کیا کیا ستم کئے ہیں سُرخی نے لب کی تیرے
یہ خون عاشقوں کے سب ایک پان پر ہیں
کیسا ہے دل لگانا پوچھے تو کوئی ہم سے
جتنے مزے اُٹھائے ابتک زبان پر ہیں
بچپن ہوا ہے رخصت، آتی ہے اب جوانی
رنگت نکھر رہی ہے جوبن اُٹھان پر ہیں
آنکھیں تری غضب ہیں، تیری بھویں ستم ہیں
دو تیغے ہیں گویا اور دونوں سان پر ہیں
جتنے اُٹھائے صدمے اُلفت میں رشک ہمنے
مشہور ہیں وہ قصّے سب کی زبان پر ہیں
حیا سے سرنگوں وہ ہو گئے جب وصل میں پوچھا
خطا ہمسے ہوئی ہی کیا، بتاؤ تو خفا کیوں ہو

والد ماجد کے زیر سایہ فارسی عربی کی تحصیل کی اور کچھ دنوں مفتی صدر الدین خان آزردہ سے عربی کی درسیہ کتابیں بھی پڑھیں۔ تیس سال کی عمر میں زمانہ کی ضروریات کا لحاظ کرکے انگریزی کی طرف بھی توجہ کی اور اس زبان میں بھی فی الجملہ مہارت حاصل کرلی، مولنا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی زیر نگرانی شیفتہ مرحوم برسوں اِنکے اتالیق رہے اور آخر وقت تک رشکی مرحوم کے اُنسے نہایت اخلاص مندانہ اور خوشگوار تعلقات قائم رہے، شیفتہ مرحوم کی وفات کے بعد آپ اُنکی جاگیر اور املاک واقعۂ جہانگیرآباد ضلع بلند شہر کے وارث اور قابض ہوئے اور اپنی ذاتی لیاقت اور وجاہت سے سرکاری حکام میں اچھا رسوخ پیدا کیا چنانچہ پرگنۂ بلند شہر میں مجسٹریٹی کے اختیارات انھیں حاصل تھے۔ ۱۸۹۰ء میں صوبہ متحدہ پنجاب سے آپ وسیرائے کی کونسل کے منجانب سرکار ممبر نامزد ہوئے۔ ۱۸۹۵ء میں سرکار انگلشیہ سے خطاب خان بہادری اور نوابی انھیں عطا کیئے گئے، اُسی سال میں کونسل آف ریجنسی رامپور کے ریونیو ممبر مقرر ہوئے اور دو برس تک اِس عہدہ کے فرائض عمدگی سے انجام دیتے رہے شعر وسخن کے گہوارہ میں پرورش پائی تھی یہ کیونکر ممکن تھا کہ اس فن سے دلبستگی نہ ہو۔ اگرچہ شیفتہ کی مسلم الثبوت اُستادی کا درجہ انھیں حاصل نہ ہوا تاہم انھوں نے اُنکی شہرت کمال کو خوب سنبھالے رکھا اور اس میں بلند مرتبہ حاصل کیا، اساتذۂ ایران کے کلام کے دلدادہ تھے اور اُردو میں مرزا غالب اور مومن کا رنگ مطبوع طبع تھا۔ اِسی وجہ سے اُنکے کلام میں آخر الذکر دونوں اُستادوں کے اثر کا پرتو صاف جھلکتا ہے، بہت پختہ مشق اور سلیم المذاق سخن سنج تھے متانت کے ساتھ شوخی دست گریبان ہے ترکیب بندش اور انداز بیان میں دلپذیری اور دلکشی کے علاوہ اُستادانہ رنگ موجود ہے راقم تذکرہ کے والد مغفور سے رشکی کے دوستانہ تعلقات تھے اور اسی وجہ سے راقم تذکرہ کی التجا پر انھوں نے ۱۸۹۷ء میں اپنے کلام کا خلاصہ جس میں پانچسو اشعار کے قریب درج ہیں عنایت فرمایا تھا جس کا انتخاب اب ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ مرحوم اپنے ضلع کے رؤسا میں اپنی صائب الرائی، نیک نیتی، سادگی اور ایمانداری کیوجہ سے ہر دلعزیز تھے مرحوم نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی، چنانچہ اُنکے چھوٹے بھائی نواب محمد اسحٰق خان اُنکے

بعد وارث ہوئے، زندہ دلی، مروت، اخلاق، منکسر مزاجی، الغرض اُن تمام صفات سے جو پُرانے رئیسوں کے زیور سمجھے جاتے تھے موصوف تھے اور اساتذۂ سلف کی ایک عمدہ یادگار تھے، خاندانی تعلقات کے باعث اکثر دہلی آتے رہتے تھے، انجام کار ۲۰ مئی ۱۸۹۹ء کو عارضۂ ورم و دست میں عازمِ ملکِ جاودانی ہوئے اور شبِ عاشورہ کو اپنے والد کی قبر کے پہلو میں احاطہ شاہ نظام الدین اولیا میں پیوند زمین ہوئے، مولانا حالی نے اُنکی وفات پر فارسی میں ایک قطعۂ تاریخ لکھا تھا جس سے اُنکے دلی خلوص اور رنج کا اظہار ہوتا ہے "بخشش زحق" ۱۳۱۷ھ مادۂ تاریخ وفات ہے۔ افسوس کہ مولانا حالی نے بھی ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو انتقال فرمایا۔

گلشن میں کوئی دید کے قابل نہیں رہا — وہ درد خیز شورِ عنادل نہیں رہا
سینے سے ہائے یاس نے سب کچھ مٹا دیا — جس دل میں درد تھا مرے وہ دل نہیں رہا
تکلیف جاں گسل تھی بہت گرچہ نزع کی — پر میں تمہاری یاد سے غافل نہیں رہا
ہمسر کو دیکھتے ہی خود آرائی چھوڑ دی — کیوں آئینہ تمہارے مقابل نہیں رہا
قاتل کو دیکھنا ہی پڑا مر کے بار بار — کچھ بے اثر تو نالۂ بسمل نہیں رہا
مجنوں طبیعتوں کا فقط راہبر ہے شوق — گرچہ سراغِ ناقہ و محمل نہیں رہا
بے اجر وہ شہید ہے جو قتل گاہ میں — ہر لحظہ محوِ صورتِ قاتل نہیں رہا
رشکی کی آپ چل کے زیارت تو کیجیے — یہ ہے غلط کہ اب کوئی کامل نہیں رہا

اثر صحبتِ غیر کا ہو گیا — کہ پھر سست عہدِ وفا ہو گیا
مرا عقدۂ بخت کھلتا نہیں — ترا یہ بھی بندِ قبا ہو گیا
تری بزم میں جمع ہیں خاص و عام — اگر میں بھی آیا تو کیا ہو گیا
نشیمن ہے اسکا ترے دام میں — قفس سے ترے جو رہا ہو گیا
مری بے خطائی ہوئی جلوہ گر — کہ ایسے کا ناوک خطا ہو گیا
وہ آئے تھے میری بھی چوری سے رات — مرا چونک پڑنا بلا ہو گیا

ٹپکنے لگے جس سے بیگانگی — حقیقت میں وہ آشنا ہو گیا
میلنوں کو ہے رشک اور کیوں نہ ہو — کہ رشکی غلام آپ کا ہو گیا

بے وفا تجھ سے کیا نہیں ہوتا — ایک وعدہ وفا نہیں ہوتا
قیس کی دھوم مچ رہی ہے مگر — عشق اس سے سوا نہیں ہوتا
ہم وہ گم کردہ راہ ہیں کہ کبھی — خضر بھی رہنما نہیں ہوتا
شائبہ جور کا نہ ہو جب تک — لطف میں کچھ مزا نہیں ہوتا
غیر پر وہ نگہ پڑی ہی نہیں — تیر ان کا خطا نہیں ہوتا۔
قتل میں میرے کیا تامل ہے — عشق میں خوں بہا نہیں ہوتا
چھیڑ دیتے ہیں انکو ہم بھی کبھی — گرچہ کچھ مدعا نہیں ہوتا
ایک رشکی ہمیں نہیں ہوتے — ورنہ واں اور کیا نہیں ہوتا

آنکھیں ملائیں ہی عبث تم کو احتراز — آنکھیں ہیں دل نہیں کہ ملایا نجائیگا
گر ایکبار رخ سے نقاب اسکے اٹھ گیا — پھر راز دل کسی سے چھپایا نجائیگا
نبضیں چھٹی ہیں آنکھوں میں دم ہے لبوں پہ جان — آؤ کہ کوئی دم میں بلایا نجائے گا
اغماض بے سبب تو کسیکو نہیں پسند — روٹھو نہ تم کہ ہم سے منایا نجائے گا
رنگِ شکستہ واسطۂ عرضِ حال ہے — گو مجھسے حرفِ شوق سنایا نجائیگا

کیا کیا بنا کے ہم نے سنایا رقیب کو — مضمون تیرے نامۂ الفت طراز کا
کب ٹوٹتی ہے توبہ ہماری شراب سے — لیکن ہے ڈر تری مژۂ نیم باز کا
ہیں عشق کی تمام یہ نیرنگ سازیاں — مطلب ہے ایک اصل میں ناز و نیاز کا
رشکی ہے عید جاتے ہیں سب عیدگاہ کو — حضرت بھی چل کے پڑھ لیں دوگانہ نماز کا

اسقدر خوف ہوا تمکو مرے جاں کسکا — یہ نہ سوچے کہ ہے نالہ شرر افشاں کسکا
خاکساری کی اٹھائے ہوئے ہیں جس لذت — وہ دو عالم بھی نہ لیں تخت سلیماں کسکا

چارہ گر فکرِ علاجِ دلِ وحشی ہے غلط | کوچۂ یار ہی چھوٹا تو گلستاں کس کا
مانعِ مرگ ہوا اور مصیبت دیکھو | تھا تصور مرے دل میں شبِ ہجراں کس کا
ہمنے پایا ہے تصرّف کہ دلمیں سب کچھ | شوقِ سرگشتگی وحشت و بیاباں کس کا

لطفِ شرابِ ناب سے زاہد جو دور تھا | اس کا دماغ محوِ شرابِ طہور تھا
کچھ خانۂ رقیب بھی ایسا نہ تھا قریب | دولت سرا سے کلبۂ احزاں جو دور تھا
بے وجہ انتظار اگر فرض تھا ہمیں | بے وعدہ آپ کو بھی تو آنا ضرور تھا
مجھ سے نہ کچھ بگاڑ نہ اعدا سے آشتی | ایسا کچھ اپنے حسن پہ اُن کو غرور تھا
شکوے ہمارے سارے غلط ہی سہی مگر | لو تم ہی اب بتاؤ کہ کس کا قصور تھا
رشکی کی وضع ہمکو نہایت ہی تھی پسند | اربابِ عشق میں وہ نہایت غیور تھا

رنجش کا اگرچہ کوئی سبب درمیاں نہ تھا | لیکن وہ آپ صلح کریں یہ گماں نہ تھا
مانگی تھی اُسنے جان تو غیروں پہ آ بنی | حالانکہ اک ہنسی تھی فقط امتحاں نہ تھا
اک محشرِ خیال دلِ تنگ تھا کہ کیوں | در پر تمھارے رات کوئی پاسباں نہ تھا

کہتے ہیں لوگ جانستاں ہیں آپ | کیونکہ پھر اک جہاں کی جاں ہیں آپ
دَیر میں ہے پتہ نہ کعبے میں | پھر جہاں دیکھئے وہاں ہیں آپ
مشورے کل تو ہم سے ہوتے تھے | آج اعدا کے میرزباں ہیں آپ
لائقِ قتل میں ہی ٹھیرا ہوں | سچ تو یہ ہے کہ قدرداں ہیں آپ
اُسکو بھی رام کر لیا رشکی | کس قیامت کے خوش بیاں ہیں آپ

[illegible]

کون پھر بادیہ پیما ہو خضر کی صورت | جب وطن ہی میں میسّر ہو سفر کی صورت
ہر قدم پر ترے آنکھیں ہی نہیں بچھتی ہیں | دل بھی جاتا ہے ترے ساتھ نظر کی صورت
دل میں لگا ہک سے کوئی چیز جو چبھ جاتی ہے | پھر نہیں سوجھتی کچھ نفع ضرر کی صورت

کیا کہا بیخودی میں اُس بت سے | گئی برسوں کی دینداری آج

شب کسی سے ہوئے ہو ہم آغوش　　شوخیاں وہ نہیں تمھاری آج
خاک میری ہے اُنکے دامن پر　　آئی کام اپنی خاکساری آج
شمع نے رشکِ روئے روشن سے　　جل کے کاٹی ہے رات ساری آج
وہ منانے کو آتے ہیں رشکی　　نبھ نہیں سکتی وضعداری آج

لطف ظاہر کر دیا دردِ نہانی دیکھکر　　رحم نے پائی ہے قوت ناتوانی دیکھکر
جو کہ ملتی ہو ہماری سرگذشتِ عشق سے　　قصہ خواں کہتا وہاں ایسی کہانی دیکھکر
تجھ سے گو ملتا نہیں داغِ غمِ ہجراں تو ہی　　شکر ہے جیتے تو ہیں تیری نشانی دیکھکر
اب بلائے آسمانی بھی بھلی لگنے لگی　　آپکے سر پر دوپٹہ آسمانی دیکھکر
اُس رمیدہ وش کو کیا حالِ دلِ محزوں لکھوں　　جو خفا ہو ربطِ الفاظ و معانی دیکھکر
ہے دگرگوں ابتدائے عشق میں رشکی کا حال　　رحم آتا ہے مجھے اُسکی جوانی دیکھکر

کوئی بتائے کہ کیا ہے نقاب میں داخل　　اگر نہیں مہِ انور سحاب میں داخل
محلِ شکوہ نہ مجکو رہا نہ اعدا کو　　کہ شوخیاں ہیں تمھاری حجاب میں داخل
دہانِ زخم مرے تشنہ لب ہیں دیر نکر　　کہ آبِ تیغ بھی قاتل ہے آب میں داخل
ہمارے قتل کو اعدا ثواب کہتے ہیں　　خدا کرے کہ نہیں ہو ثواب میں داخل
کچھ ایسے سوئے کہ گویا ہوئی ہے صورتِ یار　　ہمارے طالعِ خفتہ کے خواب میں داخل
مآلِ کار ہو جو کچھ مگر خوشی یہ ہے　　کہ میرا نام بھی ہے انتخاب میں داخل

ہو جائیں بے خطر ستمِ آسماں سے ہم　　تاثیر ایسی آہ میں لائیں کہاں سے ہم
سیکھی ہیں یا اُسنے چرخ سے کج ادائیاں　　طرزِ فسوں اُڑائینگے چشمِ بتاں سے ہم
نکلے نہ آپ تا ہوئے اغیار سے اگر　　پھر کام لینگے نالۂ آتش فشاں سے ہم
ٹپکا جو ایک اشک بھی دشمن کی آنکھ سے　　دریا بہائیں گے مژۂ خونچکاں سے ہم
رشکی ترا بیان یہ جادو ہے یا فسوں　　بے چین ہو گئے ہیں تری داستاں سے ہم

قطعہ

وہ جفا کرکے نہیں ہوتے خجل
یہاں گلہ کرنے سے شرماتے ہیں ہم

یا کبھی خود عشق میں تھے مبتلا
یا اب اِس قصہ سے گھبراتے ہیں ہم

یا کبھی ہم آپ تھے محتاجِ پند
آج یار رشکی کو سمجھاتے ہیں ہم

اہلِ دل سے نہ کبھی آپ سنیں گے نالہ
چاک دل میں ہے مگر چاک گریباں میں نہیں

ہجر میں ہمنے تصوّر سے لیا ہے وہ کام
حسرت اب کوئی بھی باقی دلِ نالاں میں نہیں

غیر کو بھی ہے سرِ دشت نوردی شاید
وہ مزا اب خلشِ خارِ مغیلاں میں نہیں

عشق رشکی کا زمانے سے جدا ہے گویا
بندۂ بُت ہے مگر فرق کچھ ایماں میں نہیں

کہیں لیجاؤ لیکن آ رہونگا کوئے جاناں میں
قفس سے جب چھٹیگی آئیگی بلبل گلستاں میں

نہ سلجھےگی تمھاری اور دشمن کی قیامت تک
اگر اُلجھا ہمارا دل تمھاری زلفِ پیچاں میں

مرے دستِ جنوں کو باز رکھا خوب حکمت سے
رفو گر نے تری تصویر رکھی چاکِ گریباں میں

شکوہِ کوئے جاناں جب نظر آئیگی اے رشکی
نصیبوں سے جو جا پہنچے کبھی تم باغِ رضواں میں

بدلی فروغِ برق کی مانع نہ ہو سکی
حسن نظر فروز ہے ظاہر نقاب میں

آئے تو اُنسے حال کچھ اپنا نہ کہہ سکا
کیا جانے ہو گیا مجھے کیا اضطراب میں

ہو کر خفا عدو سے مٹاؤ نہ امتیاز
تخصیص کی اُمید ہے مجھکو عتاب میں

مے پی نہیں کہ مست ہوئے بادہ کش تمام
ساقی کے رُخ کا عکس پڑا جب شراب میں

ہی قیدِ اختلافِ صور سے جسے نجات
دریا کو دیکھتا ہے وہ موج و حباب میں

اِس عنایت کے بھی قابل یہ گنہگار نہیں
سینکڑوں خون کیا کرتے ہو دو چار نہیں

مجکو اور غیر کو ہے لطف کا اُنکے دھوکا
ورنہ اُنکو تو کسی سے بھی سروکار نہیں

یار کے قول کی تکذیب سزاوار نہیں
ورنہ ظاہر میں محبت کے کچھ آثار نہیں

جو سماجت سے ہوا کام وہ ناکامی ہے
آپ آئیں تو عنایت نہیں اصرار نہیں

مسیحائی کا تیری شور ہو جائے
اگر پھیرے ترا بیمار گردن

یہ منصب بلند ملا جسکو مل گیا — ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

ہمارا تم کو فکرِ امتحان ہو — ستم ہے ہم کہاں ہیں تم کہاں ہو
محبت اُسکی بھی غالب کہ کھل جائے — اگر ظاہر میرا دردِ نہاں ہو

تم سے گلہ نہیں ہے ہمارا قصور ہے — اوپر اُٹھائیے نگہِ شرمسار کو
ہم پہلوئے رقیب ہیں وہ دیکھنا ہی آج — رشکی تمھارے جذبۂ بے اختیار کو

مزا اُلفت کا جانِ زار سے پوچھ — یہ نکتہ واقفِ اسرار سے پوچھ
ہمارے عشق کا چارہ جا کے ہمدم — شمیمِ کاکلِ دلدار سے پوچھ
مرے پامال ہونے کی حقیقت — خود اپنی شوخیٔ رفتار سے پوچھ
ہمارا دردِ دل کچھ ہم سے مت لے — کچھ اپنی نرگسِ بیمار سے پوچھ
تو اپنی قدر اے کانِ ملاحت — ہمارے سینۂ افگار سے پوچھ
بھلا رشکی کو قدرِ فصلِ گل کیا — یہ کیفیت کسی میخوار سے پوچھ

وہ روشنی جو آپکے رخ کی نقاب ہے — کہتے ہیں اُس سے نور رُبا آفتاب ہے
لب ہائے زخم میرے بہت تشنہ کام ہیں — دیکھیں تو کسقدر ترے خنجر میں آب ہے
وقتِ وفائے وعدۂ دشمن اگر نہیں — پھر تیری بات بات میں کیوں اضطراب ہے
رشکی کلام کیا ترے حسنِ کلام میں — دیوانِ عشق میں ورقِ انتخاب ہے

تم نے سوئے غیر کیا نظر کی — کچھ کم ہے خلش مرے جگر کی
ملتی نہیں آج ہم سے کیوں آنکھ — کس شغل میں تم نے شب بسر کی
کچھ گریہ اُٹھائے موجِ طوفان — کچھ چھیڑ ہو آہ میں اثر کی
کیا اُس نے دیا جواب یارب — مہمل سی ہے بات نامہ بر کی
کہتے ہیں جسے اُمیدِ موہوم — تصویر وہ ہے تری کمر کی
اُس شوخ نے کی مری عیادت — کچھ رہ گئی بات چارہ گر کی

بیتابیٔ دل نے تیرے رشکی
الفت کی کہاں کہاں خبر کی

غصہ آتا ہے پیار آتا ہے
غیر کے گھر سے یار آتا ہے

دل ملانی اگر نہیں منظور
ابر کیوں بار بار آتا ہے

اب بھی ملجاؤ گر وہ ٹھہر بن
رفتہ رفتہ غبار آتا ہے

کچھ نہ پوچھو وہ ماجرا جب یار
یاد بے اختیار آتا ہے

نہیں معلوم گل میں کیا نہاں ہے
جو بلبل اسقدر گرم فغاں ہے

مرا احوال سنکر بے تکلف
کہا کیا سچ یہ ساری داستاں ہے

مگر دیکھا نہیں اہل زمیں کو
کواکب پر جو ناز آسمان ہے

وعدوں پہ ٹالتے ہی رہے عمر بھر مجھے
آخر فرشتہ جانتے ہو یا بشر مجھے

مانا کہ قصد غیر کے گھر کا نہ تھا مگر
رستے سے اُلٹے پھر گئے کیوں دیکھکر مجھے

ہرچند دل سے اسکو بھلاتا رہا مگر
یاد آگیا کسی نہ کسی بات پر مجھے

ایسی کہانیاں کہیں رشکی نے درد خیز
کمبخت نے نہ سونے دیا رات بھر مجھے

کوئی واقف ہو کیا درد نہاں سے
قلم قاصر زباں عاجز بیاں سے

کیا کیا سحر تمنے آج رشکی
عدو کا شکوہ اور اُنکی زباں سے

دیا ہے پنجۂ غم نے ہزار بار فشار
دل حزیں میں ہے لیکن ہنوز تو باقی

ہمارا جرم محبت ہے ایسی دے تعذیر
رہے نہ کوئی ترے دل میں آرزو باقی

ساقی بزم غیر آپ بنے
ہمکو خون جگر پئے ہی بنی

وہ جو شرما گئے تو انکی خطا
اپنے ذمہ نہیں لیئے ہی بنی

تھے جو ساقی کے ناز توبہ شکن
رات رشکی کو بھی پئے ہی بنی

یہ رشک ہے کہ نہ دیکھیں ہماری آنکھیں بھی
تمھیں رکھا ہے تصور میں بھی چھپائے ہوئے

ہزار رنگ بدلتا ہے دم میں تو اے دل
مگر کسی کے یہ انداز ہیں اُٹھائے ہوئے

رضائے یار میں جو جان بچی ہو وار رشکی
فرشتے دوش پہ نعش اسکی ہیں اٹھائے ہوئے

نمایاں ہے گر سرگرانی تمھاری
تو در پردہ ہے مہربانی تمھاری

جیئیں اور بھی گو دم واپسیں ہے
سنائے کوئی گر کہانی تمہاری

تمہاری محبت کا ہے نقش دل پر
یہ کافی ہے ہمکو نشانی تمہاری

اُلفت اک آگ ہے اور آگ پہ اے چارہ گرو
کہیں سیماب بھی ٹھیر لیا ہے جو یہ دل ٹھیرے

آہِ صباح و نالۂ شبگیر کر چکے
کرنی تھی جو وصال کی تدبیر کر چکے

وہاں بات کے جواب میں بھی ہو مضایقہ
خط کا مرے جواب وہ تحریر کر چکے

اُنکو ہوا ہے شکوۂ بیداد سے ملال
کیا پیش جائے عذر کہ تقصیر کر چکے

مسجد میں آکے اور ہی عالم دکھلائیے
بتخانے کو تو عالم تصویر کر چکے

تدبیر کب بتانے کو احباب آئے ہیں
جب کام ہم حوالۂ تقدیر کر چکے

آیا خیال بے گنہی کا اُنھیں تو کب
جسوقت وہ مجھے تہِ شمشیر کر چکے

رشکی وہ خود ملیں تو ملیں ورنہ اُنسے ہم
کرنی تھی جو وصال کی تدبیر کر چکے

حذر اُس نرگسِ سحر آفریں سے
کہ جو فتنہ ہے اُٹھتا ہے وہیں سے

وہ باتیں جو کہ تھیں اُن سے چھپانی
غضب ہے کر رہا ہوں میں اُنھیں سے

سنائے جوشِ وحشت میں عدو کو
ہوئے تھے مشورے جو ہمنشیں سے

رہے گا حشر تک زندہ جسے تم
کروگے قتل دستِ نازنیں سے

بتوں میں کیا نہیں وحدت کا جلوہ
بتا دے کوئی ہمکو اہلِ دیں سے

ہزاروں مہر و اُلفت کی ادائیں
سمجھ لیتے ہیں ہم تیری نہیں سے

وہ پھرنا گو یہ کو رشکی کہاں ہے
ہوئے ہیں آپ بھی اب تو ہمیں سے

نہیں ہیں سب یہ برتاؤ اُسکے
مگر کچھ لاگ ہے رشکی تمھیں سے

پایا قصور غیر کا مجکو سزا ہوئی
ایسی تو ایکبار نہیں بار ہا ہوئی

تم بھی کہوگے آہ گر اپنی رسا ہوئی
وہ چرخ کیا ہوا وہ زمیں آج کیا ہوئی

پوچھو ہمیں سے عشق کے بیمار کا علاج
آخر کو موت سے ہوئی جو کچھ شفا ہوئی

(از دیوان قاضی فضل حقؔ)

رشید

رشید - قاضی کبیر حسن صاحب متوطن مچھلی شہر جس زمانہ میں مرزا قادر بخش صاحب بہادر صابر دہلوی دہلی سے بنارس جاکر مقیم ہوئے یہ آنکے خرمن فیض سے بہرہ ور ہوئے۔ یہ واقعہ سنہ ۱۸۷۰ء کے قریب کا ہے عرصہ ہوا انتقال کر گئے ؂

ہوں زنگ بن کے مہر سپہر کمال کا — یعنی عروج اپنا ہے مطلع زوال کا
شاداب آب گریہ سے ہی گلشن مراد — پانی سبب ہے تازگی ہر نہال کا
یہ زخم یادگار ہے اُس تیغ ناز کا — سمجھا تا ہے یہ مجکو خیال اندمال کا

رشید

رشید - سخنور یکتا مرثیہ گوبے ہمتا جناب سید محمد مصطفےٰ مرزا عرف پیارے صاحب رشید لکھنوی، آپ سید احمد مرزا صابر مرحوم کے صاحبزادے ہیں جو میر انیس کے داماد تھے گویا جناب رشید میر انیسؔ مرحوم کے نواسے ہیں، جناب رشید کے ودھیالی خاندان میں سید حسین مرزا صاحب عشق بڑے نامور مرثیہ گو تھے جو انکے والد کے چچا تھے، اِسی طرح جناب تعشق مرحوم جو شعرائے لکھنو میں غزل گوئی میں لاجواب اور بے مثل کہے جا سکتے ہیں جناب رشید کے دوسرے چچا تھے، جناب رشید نے حضرت عشقؔ اور تعشقؔ سے جملہ نکات فن شاعری اور مرثیہ گوئی سبقاً سبقاً حاصل کیئے، اگرچہ آپ کو فطرتی طور پر اس امر کا بڑا ناز ہے کہ ہیں حضرت انیسؔ کا نواسہ اور انکی زبان اور کمال کے ورثہ کا حقدار ہوں مگر انکے کلام میں بجائے انیس کے رنگ کے جناب عشقؔ اور حضرت تعشقؔ کی تقلید، عقیدت اور پیروی کا زیادہ اثر نمایاں ہے، مرثیہ گوئی کی مشق کرنے سے پیشتر بھی جناب رشید بحیثیت ایک غزل گو کے لکھنؤ میں خاصی شہرت حاصل کر چکے تھے، جناب عشقؔ اور تعشقؔ کی وفات کے بعد انہیں حصولِ شہرت کے زیادہ موقعہ ملے اور مرثیہ گوئی میں اپنے خاندان میں امتیازی رکن خیال کیئے جانے لگے، مرثیہ میں بھی بہار یہ رنگ برتتے ہیں اور لوگ بھی اُسے پسند کرتے ہیں تحقیق الفاظ اور صحت روایات کا بھی حتی الوسع خیال رکھتے ہیں، پندرہ برس سے نواب بہرام الدولہ بہادر رئیس حیدرآباد دکن کے [illegible] کی مجلسوں میں جو ۱۲ سے ۱۴ محرم تک

نہایت تزک وشان کے ساتھ منعقد ہوتی ہیں آپ طلب کیئے جاتے ہیں اور بعد اختتام مجالس عموماً پندرہ سو روپیہ آپ کو نذرانہ ملتا ہے، سفیر ایران متعینہ کلکتہ کے ہاں بھی گاہ گاہ ربیع الاول میں آپ تازہ تصنیف مرثیہ پڑھنے کے لیئے بلائے جاتے ہیں، خاص لکھنؤ میں بھی اکثر جلسوں میں آپکا کلام سنا جاتا ہے خصوصاً آنوجی کی مسجد میں ہر سال ایک نیا مرثیہ پڑھتے ہیں حضرت کی پیدایش ابتدائے جلوس واجد علیشاہ میں ہوئی تھی اور اب ۶۸ سال کی عمر ہے، نہایت دُبلے اور کمزور شخص ہیں، انکسار اور تواضع میں شاعرانہ مبالغہ کو بہت کام فرماتے ہیں۔ گفتگو بہت تکلف سے کرتے ہیں الغرض قدیم لکھنؤ کے مصنوعات اور تکلفات کی زندہ یادگار ہیں اپنی امتیازی حیثیت کو ہر وقت نظر میں رکھتے ہیں، تلامذہ بھی خاصی تعداد میں ہیں۔ سوز عشق، حسرت کے مضامین اچھے پیرایہ میں اکثر انکے کلام میں ملتے ہیں، زبان بہت صاف اور شستہ برتتے ہیں جو انکا خاندانی ورثہ ہے، بعض بعض اشعار ایسے صاف اور اعلیٰ درجہ کے کہہ جاتے ہیں کہ جن سے انکا کمال سخن مسلّم ہوتا ہے، کم وبیش پچاس غزلوں کا انتخاب درج ذیل ہے جس سے انکے رنگ طبیعت کا پورا پورا اندازہ ہوسکتا ہے۔

کہتے ہیں شبنم وگل عالم نیرنگ کا حال
کوئی ہنستا ہوا نکلا۔ کوئی گریاں نکلا

قیس کا دست تمنا کس قدر چالاک تھا
محمل لیلیٰ کا پردہ سو جگہ سے چاک تھا

آج داغوں کے گلوں نے رشک جنت کردیا
کل یہی دل تھا کہ اک صحرائے وحشتناک تھا

مہربانی سے شریک ابتو ذرا ہوجانا
دفن ہولے مرا لاشہ تو خفا ہوجانا

کہے دیتے ہیں زیادہ نہ ستاؤ ہمکو
دیکھو اچھا نہیں ہے دل کا بُرا ہوجانا

دل جو پہلو سے جدا ہے تو عجب کیا اسکا
دیکھنا قبر میں اعضا کا جدا ہوجانا

ہمت عبد سے معبود کی ہمت ہے بلند
ہم جو مانگیں گے کہیں اُس سے سوا اُٹھائیگا

رباعی

کیوں کنج لحد کے منفعل جاؤنگا
کہنے کے لیئے مطلب دل جاؤنگا

پیری سے ہونگا منکسر اور رشید
جھکتے جھکتے زمیں سے مل جاؤنگا

عجب حال تھا جب مبتلائے الفت تھے
کہ دل پہ جبر بھی کرنے کا اختیار نہ تھا

کیا تھا گو تری تیغِ نگہ نے صد پارہ
مگر ذرا بھی مرے دل کو انتشار نہ تھا

پسِ مردن رہائی کا ہے غم دلہائے نالاں پر
وفاداروں کی روحیں روتی ہیں درہائے زنداں پر

اجل کے آئے تو ہوا احسان اس بیمارِ ہجراں پر
نشاں جسکی لحد کا ہے زمینِ کوئے جاناں پر

زلیخا حال کی اپنے خبر دیتی تھی یوسف کو
کہ جب کی آہ گھر میں برق چمکی آکے زنداں پر

گھٹے جاتے تھے دم چھوٹے جو تھے دن شام سے پہلے
نہیں معلوم کیونکر رات گذری اہلِ زنداں پر

اے سوزِ عشق خوب بڑھایا وقارِ دل
ہر آبلہ ہے آج سرِ اعتبارِ دل

دونوں نے خوب شاد کیا ہمکو اے رشید
سو جان سے جگر کے تصدق نثارِ دل

دہن ہائے زخم خوں روتے ہیں میرے حال پر
تیغ کیسی سنگدل ہے چشم جوہر نم نہیں

اے شبِ غم صبح ہو جائے گی یا آئیگی موت
فیصلہ دم بھر میں ہے یا تو نہیں یا ہم نہیں

رواں عدم کو ترے جاں نثار ہوتے ہیں
دیار چھوڑتے ہیں بے دیار ہوتے ہیں

یہ طاقتیں ہیں تمہارے ناتواں میں
جو تڑپے حشر آجائے جہاں میں

سلام

ہنس ہنس کے کہہ رہا ہے جلانا ثواب ہے
ظالم یہ میرا دل ہے چراغِ حرم نہیں

اس نے زمانہ دیکھ کے سیکھا ہے شور و شر
تم کمسنی میں فتنۂ محشر سے کم نہیں

نکل آئیں ہیں موجیں کوثر و تسنیم سے باہر
خبر پہنچی ہے پیاسے حضرتِ شبیر آتے ہیں

گرے ہیں رن میں اکبر دوڑے ہیں ہر سمت سے اعدا
مٹانے کو رسول اللہ کی تصویر آتے ہیں

غرور اب کیا بڑھیگا خم ہوئے اس درجہ پیری سے
ہم اپنے سر کو اپنے پاؤں سے ٹھوکر لگاتے ہیں

رباعی

سو رنج ہیں روز کم سے کم کھاتا ہوں
جو کوئی نہ کھا سکے وہ غم کھاتا ہوں
پیری کی طرف دیکھ کے آتی ہے شرم
جب اپنی جوانی کی قسم کھاتا ہوں

رباعی

پیری سے رہا نہ کوئی چارا ہمکو
قوت کا قویٰ کے تھا سہارا ہمکو
تنہا موت آکے کیا بنالیتی رشید
پیری نے شریک ہوکے مارا ہمکو

آپ کو شک ہے کہاں ٹوٹے تھے تارے رات کو
دمبدم آنسو ٹپکتے تھے ہمارے رات کو

کیں وہ بعدِ وصل باتیں بڑھ گیا پھر شوقِ وصل
ہیں وہی نکلے تھے جو ارمان سارے رات کو

الفتِ رخ میں ہے وحشت یادِ گیسو میں بجا
دن کو صحرا میں ہیں دریا کے کنارے رات کو

دل جگر لینے پھر آئے صبح کو کہتے ہوئے
رہ گئے بستر پہ دو موتی ہمارے رات کو

آپ نے پوچھا نہ جان و دل جگر نے لی خبر
دردِ فرقت میں نہ کس کس کو پکارے رات کو

ڈھونڈتے پھرتے ہیں دل کو صبح سے آج اے رشید
دلربا تھا ایک پہلو میں ہمارے رات کو

فرماتے ہیں نہ عشق کا دعویٰ کرے کوئی
کیا فائدہ ہے کیوں ہمیں رسوا کرے کوئی

مجنوں نے راہِ عشق میں چومے مرے قدم
الفت میں اتنی بات تو پیدا کرے کوئی

مار ڈالیگی مجھے یہ خوش بیانی آپکی
موت کا پیغام آئیگا زبانی آپ کی

زندگی کہتے ہیں کسکو موت کسکا نام ہے
مہربانی آپ کی نامہربانی آپ کی

آپسے ملکر گلے راحت سے آجاتی ہے نیند
سبزۂ خوابیدہ ہے پوشاکِ دھانی آپکی

مجھسے دن بھر دل کہا کرتا ہے قصہ آپکا
رات بھر میں دل سے کہتا ہوں کہانی آپکی

بڑھ چکا قد بھی عروجِ حسن کی حد ہو چکی
اب تو قابل دیکھنے کے ہے جوانی آپکی

تم نے ہمسے ابھی باتیں کیں کہ رسوائی ہوئی
پھول سے چہرہ کی رنگت ہے جو سنولائی ہوئی

صاف گویا آتشِ رخ سے دھواں اٹھنے کو ہے
لو طبیعت ہاتھ سے جاتی رہی آئی ہوئی

بڑھ گئی زینت جو آئینہ مقابل آگیا
اس دوئی سے اور دونی انکی یکتائی ہوئی

قبر تک تو آگیا میں دوست تھے ساتھ اے رشید
کس طرح اب وہ نہ یاد آئے کہ تنہائی ہوئی

عطا حیاتِ ابد بھی ہو کاٹ گردن بھی
شریکِ آبِ خضر میں ہو آبِ آہن بھی

ہماری زندگی و موت کے ہو تم رونق
چراغِ بزم بھی ہو اور چراغِ مدفن بھی

دکھایا سیل کا انداز آبِ پیکاں نے
شکستہ خانۂ دل بھی ہے خانۂ تن بھی

کھلا جو ٹانکے لگانے میں حالِ زخمِ جگر
تو روئی خون کے اشکوں سے چشمِ سوزن بھی

عندلیبوں کی اسیری کا زمانہ آیا
آج پھر جانب گلشن قفس و دام چلے

بے وفا کہکے پکارا دم آخر تو نے
وائے تقدیر کہ ہم لیکے یہ الزام چلے

شراب پیتے ہیں میخوار نصیرے تا رمضان
شروع کرتے ہیں شوال کے مہینے سے

نہ تھا یہ دکھنا دھڑکنا ہی کوئی امر عظیم
صدائے ماتم ابھی آرہی تھی سینے سے

دکھائی دینگے عجائب تمام اے زاہد
بڑھیگا نشۂ عرفان شراب پینے سے

نقاب الٹی تھی کیا اے مہر طلعت روئے روشن سے
گلی میں جسکو دھوپ آئی تھی تیرے در کے روزن سے

انھیں تسکین دینے جاؤ جاتے ہو جو گلشن سے
برنگ خار گل لپٹے ہوئے آتے ہیں دامن سے

خس و خاشاک اڑا جلکر ہوائے گرم آہوں کی
ہزاروں بجلیاں پیدا ہوئیں میرے نشیمن سے

بہار آئی قفس میں بلبلوں کے دل ہڑکتے ہیں
کہ غنچوں کے چٹکنے کی صدا آتی ہے گلشن سے

بہت شبنم سے دھویا پر گلابی رہگئی رنگت
کسی صورت نہ چھوٹا خون بلبل گل کے دامن سے

زیادہ صرف ہوگا آج پانی تیغ قاتل کا
شہیدان وفا کو غسل ہوگا آب آہن سے

رشید احباب میرا امتحاں بیکار کرتے ہیں
کہا سو مرتبہ واقف نہیں میں شعر کے فن سے

خاک حسرت لیگئے دلہائے ویران لیگئے
آپکے دیوانے ساتھ اپنے بیاباں لیگئے

لاکھ تدبیروں سے میرے دل کی خاطر جمع کی
خوب سمجھا کے وہ گیسوئے پریشاں لیگئے

سیئے جاتے ہیں کفن آپکے دیوانوں کے
چاک دامن کے ہیں ٹکڑے ہیں گریبانوں کے

وصلت [illegible] شب بھر تو رہی سر میں ہوا
صبح کو بزم میں پر اڑتے ہیں پروانوں کے

دل جگر بٹتے ہیں کلمہ ترا املاک تن میں
ساری بستی میں یہ دو گھر ہیں مسلمانوں کے

قہر [illegible] آج چلی تیغ نگاہ ساقی
چور شیشے ہوئے ٹکڑے ہوئے پیمانوں کے

ناامیدی نہ ہو کیوں آس نہ کیونکر ٹوٹے
ٹوٹ جائے دل میخوار جو ساغر ٹوٹے

خود رہا ہوگئے یوں تڑپے اسیر زندان
زلزلہ آگیا، دیواریں گریں، در ٹوٹے

آپ کہتے ہیں کرو ترک محبت میری
رشتۂ الفت کا بتا دیجیے کیونکر ٹوٹے

سلام

رحم دل تم ہو تو عشاق پہ کیونکر ہو ظلم — تم تو نازک ہو دل ان لوگوں کے کیونکر ٹوٹے

گو ہے ماہِ رمضاں دیدے دہن کا بوسہ — کچھ نہیں خوف جو روزہ لبِ کوثر ٹوٹے

ہے عرق ماتھے پہ سرخ منہ پہ زلفوں کی نقاب — ہے عیاں رفتار سے آتے ہیں شرماتے ہوئے

فتنۂ محشر صدا دیتا ہے جب چلتے ہیں آپ — ہم بھی آتے ہیں جلو میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے

کھنچکے دم آیا لبوں تک روح گھبرانے لگی — سچ بتاؤ کیا اشارہ کر گئے جاتے ہوئے

اپنی اپنی جا ہر اک مغرور ہے اے شاہِ حسن — لاکھ بل کھاتے ہیں گیسو تا کمر آئے ہوئے

جس طرح زخمی ہوا ہے دل مجھے معلوم ہے — میں نے دیکھا خود نگہ کے تیر کو آتے ہوئے

کرتے ہیں جمع اشک ہمارے ملائکہ — حوروں کے کان کے لئے گوہر بنائینگے

شہ دامنِ رضائے خدا کو یہ دینگے طول — اپنا کفن مزار کی چادر بنائیں گے

عقدے الفت کے سب اے رشکِ قمر کھولدیئے — سینہ یوں چاک کیا داغِ جگر کھولدیئے

آنکھیں کھولے ہوئے سب دیکھ رہے ہیں تجھکو — دیکھے جانے کو یہ عشاق نے در کھولدیئے

امتحان حسرتِ پرواز کا منظور ہوا — ذبح کرکے مجھے صیاد نے پر کھولدیئے

شرم آئیگی مجھے لوگ سمجھ جائیں گے — ہنستے گیسو مرے لاشے پہ اگر کھولدیئے

ہے مسافر نواز تیغ تری — ہمکو رخصت کیا گلے سے ملکے

ایک ظالم نے کسیکو آج زخمی کردیا — یہ نہیں معلوم کس کا دل ہے کس کا تیر ہے

کرتے ہیں تن کے قفس خالی نئی تدبیر سے — مرغِ جاں اڑتے ہیں پر لیکر تمہارے تیر سے

کشتۂ لاغر کو اپنے دفن کردیجے فقط — غسلِ میت ہو چکا آبِ دمِ شمشیر سے

آپ لیجائیں انھیں یا وسکے ٹکڑے جوڑ دیں — میری خاطر جمع ہو جائے کسی تدبیر سے

روح جبتک جسم میں ہے خارِ غم کی ہے کھٹک — دل سے یہ کانٹا جو نکلے گا تو نوکِ تیر سے

رباعی

نزع میں رشکِ مسیحا کا خیال اچھا ہے — گو برا وقت ہے لیکن مرا حال اچھا ہے

بالوں کی سیاہی آہ بہہات گئی — کہتے ہیں جوانی جیسے وہ رات گئی

پیری نے زبان کی فصاحت کھودی	رباعی	تو صبح ہوئی، رات گئی، بات گئی
طفلی نہ رہی، کہ تھی وہ جانے والی		کیا رہتی، جوانی تھی مٹانے والی
پیری کو رشید بس غنیمت سمجھو		اب فصل نہیں ہے کوئی آنے والی
آج معلوم ہوئے دل کے خیالات مجھے	سلام	تم سے حال اپنا کہا کرنے نہ دی بات مجھے
یادِ ایام کہ تھا وصل کے تڑپنے میں مزا		لطف دیتے تھے ستم آپکے دن رات مجھے
قبر میں سب سے زیادہ ہے یہ ایجاں تکلیف		تم سے جاتی رہی امیدِ ملاقات مجھے
آستانے پہ ترے آکے یہ رتبہ پایا		کہ نظر آتے ہیں جنت کے مکانات مجھے
عشق میں کرکے فقیری بھی نہ کچھ ہاتھ آیا		نہ حسینوں سے ملی عشق کی خیرات مجھے
طالبِ دید سے یوں بیخبری کرتے ہیں		آپ سویا کئے آنکھوں میں کٹی رات مجھے
زیرِ خنجر کہتے تھے شاہ اب ملا لطفِ حیات		یوں بسر ہو گر تو عمرِ جاودانی چاہیئے
جب صدا آتی ہے کیا درکار ہے کہتے ہیں شاہ		بس ترے بندے کو تیری مہربانی چاہیئے
کیا کریں کیونکر چھپائیں تشنگی شاہِ غیور		ہونٹوں کی خشکی کہے دیتی ہے پانی چاہیئے
ایسا بھی نہ انقلاب دیکھا ہوگا	رباعیات	کب میری طرح شباب دیکھا ہوگا
کہتا ہوں جو میں کہ تھی جوانی میری		پیری کہتی ہے خواب دیکھا ہوگا
پیری میں غمِ راہِ جناں کیونکر لیں	ایضاً	منزل پہ ٹھہر کے دم ذرا دم بھر لیں
لیٹے ہیں لحد میں اے فرشتو نہ اٹھاؤ		چلتے ہیں ذرا کمر تو سیدھی کر لیں
ہر چند بہت ملول و دلگیر ہوں میں	ایضاً	کیا فائدہ کیوں بیاں کروں پیر ہوں میں
دیکھو مجھے پوچھنے سے کیا حاصل ہے		پیری وہ ہے کہ جسکی تصویر ہوں میں
پیری نے حواس ہوش سب کھوئے ہیں	ایضاً	کب عہدِ جوانی کے لئے روئے ہیں
ہشیار شباب میں تھے پیری میں ہیں غش		شب بھر جاگے تھے صبح کو سوتے ہیں
ساعت معلوم اجل کے آنیکی نہیں	ایضاً	پھر بھی کچھ فکر یہاں سے جانیکی نہیں

پیری یہ نہیں بارِ گنہ سے خم ہوں
اب مجکو مجال سر اُٹھانیکی نہیں

ایضاً
پیری میں غم و ملال کب اُٹھتے ہیں
ہوتا ہے قلق بیٹھ کے جب اُٹھتے ہیں
جھکتا تھا جوانی میں گراں بہرِ رکوع
گھٹنوں پہ ہاتھ رکھکے اب اُٹھتے ہیں

ایضاً
دنیا کے نہ رنج و درد و غم کو دیکھو
کس حال میں ہیں اہلِ عدم کو دیکھو
پیری کا تماشا ہوا گر مدِ نظر
یارانِ شباب آؤ ہمکو دیکھو

ایضاً
افسوس جوانی کی نہ کچھ غور ہوئی
ہوتی تھی جو کیفیت بہر طور ہوئی
دانتوں نے کیا قصد جُدا ہونے کا
آنکھوں کی بھی اب ہمسے نظر دور ہوئی

ایضاً
کب کوئی بلا ہمسائی سے رُکی
یک لحظہ نہ موت زندگانی سے رُکی
پیری ہی کا نام گو ضعیفی ہے مگر
پر ایسی قوی ہے نہ جوانی سے رُکی

مرے لہو کو ہوس ہے کہ اُڑ کے جا پہنچوں
ہوائے شوق میں اُڑتا ہے اُنکا دامن بھی
تیرے بیمار تک آنے نہیں پاتا کوئی
بیکسی دور سے کہہ دیتی ہے حال اچھا ہے
ذبح میں بھی کی گئیں ہم پر بہت سی تہمتیں
سینکڑوں طوفان اُٹھے آبِ دمِ شمشیر سے
وقتِ آخر مری آواز سُنی رحم آیا
اُسکی قدرت ہے ان آہوں کا رسا ہو جانا
نزع میں ہیں پاؤں میرے کوئے جاناں کی طرف
چاہتا ہوں وہاں پہنچ جاؤں کسی تدبیر سے

رشید

رشید ۔ جناب مولوی رشید احمد صاحب رامپوری مولوی فاضل پاس ہیں رامپور کے مدرسہ میں تکمیلِ علم کرکے حضرت خلیل حسن صاحب خلیل کے فن سخن میں شاگرد ہوئے ۔ بہر برس کے قریب عمر ہے استعداد عالمانہ ہے اور فن سے واقف ہیں کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو :-

شبِ وصل اپنے شادی مرگ ہونے سے کھلا عقدہ
جسے ہم جان سمجھے تھے وہ تھی دلدار کی حسرت
ابھی ہو جائے مثلِ گل شگفتہ بات ہی کیا ہے
ذرا تم پوچھ لو ہنسکر دلِ بیمار کی حسرت
ترا خنجر ہو گردن پر ترا پیکاں ہو سینے میں
یہ ارمانِ مضطرب دل کا وہ جانِ زار کی حسرت
پیامِ قتل نے بھی روح سی اک پھونکدی تن میں
رگوں میں دوڑتی پھرتی ہے تیغِ یار کی حسرت

یا رب کسی کا حشر میں ہو جائے سامنا
آئے ہیں اتنی دور بڑی آرزو سے ہم

ساقی ترے بغیر ہے یہ میکدہ کا حال
ہم سے خفا ہے جام خفا ہیں سبو سے ہم

جلنا پڑیگا یوں یہ خبر کیا تھی اے رشید
دل کیوں لگائے بیٹھے تھے اُس شعلہ رو سے ہم

کیا پوچھتے ہو دردِ محبت کی لذتیں
اس رنج کو خوشی سے بدلتا نہیں ہوں میں

ہاں ہاں ضرور آؤ گے مجکو یقین ہے
کیوں بار بار کہتے ہو جھوٹا نہیں ہوں میں

جب کہا میں نے کہ میں غیر کو مرتے دیکھوں
جل کے وہ بولے کہ تم خود ہی نہ مر کر دیکھو

تمنے دنیا کے تماشے تو بہت دیکھے ہیں
کوئی دم سیر مرے دل میں بھی رہکر دیکھو

بدنام فلک تم سے زیادہ تو نہیں ہے
ہے وہ بھی ستمگر مگر اتنا تو نہیں ہے

اِک طور ہے کیا جلوہ ہر اک شے میں ہے اُسکا
موسٰی سا کوئی دیکھنے والا تو نہیں ہے

محفل میں رشید آیا تو کیا آپ کا بگڑا
چپ بیٹھا ہے کچھ آپ سے کہتا تو نہیں ہے

نام آجاتا ہے جانیکا تو ہل جاتا ہے دل
تم چلے جاؤ تو کیا جانے مرے دل پہ بنے

نہ دیکھیں اُنھیں، دل نہیں مانتا
یہ مانا کہ ہیں دیکھے بھالے ہوئے

بتوں کی بُرائی رشید اسقدر
بڑے آپ اللہ والے ہوئے

رشید

رشید، مولوی حافظ رشید الرحمٰن نقشبندی، مولٰنا احسان علی خان احسان رامپوری کے تلامذہ سے ہیں اور دورِ موجودہ کے موزوں طبع کہنے والے ہیں چند شعر درج کئے جاتے ہیں

وہی ہے پاؤں جو ہو حلقۂ زنجیر کے قابل
وہی سر ہے جو ہو قاتل تری شمشیر کے قابل

جو شوق صید بازی ہو اِدھر آ اے شکار افگن
ہمارا طائر دل ہے ترے نخچیر کے قابل

وہ ظالم کشتۂ حسرت کا لاشہ دیکھکر بولا
پھراؤ کو بکو اسکو کہ ہے تشہیر کے قابل

دل چیز کیا ہے پائیں اشارہ تو جان تک
قرباں ہزار بار کریں آپ پر سے ہم

بام پر پھر خدا ابتو دکھا دے جلوہ
ہم تری راہ سرِ راہ گذر دیکھتے ہیں

رضا

رضا حمید الدین چاندپوری خلف حکیم مولوی کلو، تذکرہ شرف الدین احمد میرٹھی ہیں انکے

یہ دو شعر درج ہیں ٭

قطعہ

آہ کیا دن تھے کہ ہم ساتھ ترے ای گلرو — دو قدم صحن خیاباں میں چلے بیٹھ گئے
اب یہ حالت ہے کہیں چھپکے ترے کوچہ میں — ہیں گنہگار جو دیوار تلے بیٹھ گئے

رضا مرزا جیون شاگرد فخر الشعرا میر ممنون غدر سے پہلے قضا کر گئے،

تمھارے وصف دنداں میں یہ ہمسے شعر ہوتے ہیں — کہ گویا رشتۂ مضمون میں موتی پرتے ہیں

غیر سے گرم اختلاط ہے وہ — ہم بھی سنتے ہیں اور جلتے ہیں

کون سے وحشی کی اسکو اسقدر ہے یاد آہ — سنگ سے اتبک بھرا جو دامنِ کہسار ہے

رضا مرزا محمد رضا متوطن بلدۂ لکھنو، انکو مرزا رفیع السودا سے تلمذ تھا، زیادہ حال معلوم نہ ہوا ایک غزل اور چند شعر بمشکل دستیاب ہوئے درج کیے جاتے ہیں۔

سمجھتے ہو تم خوب غیروں سے ملنا — کیئے پر بہت اپنے پچتایئے گا

لائی ہے بہار ابکے برس اسقدر آتش — ہے جائے شگوفہ کے ہر اک شاخ پر آتش
یہ سوز نہانی ہے مرے سینے میں کس کا — جلتا ہے جگر پر نہیں آتی نظر آتش
وہ سوختہ جاں ہوں کہ تپ آہ سے جسکے — سلگانے کو لیتا ہے ہمیشہ سقر آتش
میناکے چڑے سینے میں کیونکر نہ پھپھولا — ہے بادۂ گلگوں کی نپٹ تیز تر آتش
دوزخ کا بھی کچھ خوف رضا ہمکو نہیں ہے — کرتی ہے دم سرد سے میرے حذر آتش

یارب یہ آرزو میری پاؤں میں گل نجائے — جبتک کہ یار آوے یہاں دم نکل نجائے
کس کس کا جور و ناز اٹھایا کرے یہ دل — چھوڑے اگر مژہ بھی آنکھوں کا بل نجائے
شام ہجراں گر نہ بیتابی کرے دل کیا کرے — دم بدم ہوتی ہے آفت سر پہ نازل کیا کرے

رضا میر محمد رضا برادرزادہ میر تقی ایک غزل انکی ایک پرانے تذکرہ میں نظر سے گذری جو خوشگوئی پر دلالت کرتی ہے زیادہ حال نہیں معلوم ہوا وہ شعر یہ ہیں۔

تم جو کہتے ہو مت نظر تو لگا — تمکو میری نظر لگی لگے

شمع رو تو نہ ہووے جس گھر میں	پھر وہ تاریک گھر لگے نہ لگے

رضا — **رضا** میرزا علی رضا، عاشق مزاج، مجنوں منش، از خود رفتہ بزرگ تھے، اگرچہ خود شاعری کے اظہار سے گریز کرتے تھے مگر شعر اچھا کہتے تھے، تذکرۂ گلشن بیخار ۱۲۵۰ھ میں بھی دو شعر انکے درج ہیں اور ظریفی نویس انھیں لکھا ہے، مولوی شرف الدین میرٹھی نے میر رضا علی نام اور لکھنؤ وطن درج کیا ہے

رہا عالم یہ شب اپنا کہ اس بن دل جو گھبرایا	کبھی تکیے سے سر ٹپکا کبھی پتھر سے ٹکرایا
جس دل کو قلق سے نے آہ گھیرا ہوگا	آنکھوں میں پھر اسکے اک اندھیرا ہوگا
کیوں گرد سے اپنے کو بچاتا ہے رضا	اس خاک میں آخر کو بسیرا ہوگا
ہدف ناز جو کل سینہ کا صندوق ہوا	تیر جو دل میں لگا سو لب معشوق ہوا
جو اکبار میں دیکھنے تجھکو پاؤں	بلائیں بھی لیلوں تصدق بھی جاؤں
مت پوچھو رضا کا کچھ حال غم تنہائی	اک دل تھا سو کھو بیٹھا اک سر ہی سو سودائی
کبھی آکے آکے خفا ہوئے جو گئے تو جا کے بُلا لیا	کبھی لیٹے لیٹے مچل گئے کبھی بیٹھے بیٹھے بگڑ گئے
ستم زمانے سے مجھپہ دن جو برے ایکبار یہ پڑ گئے	وہ جو آشنا تھے سو مر گئے وہ جو دوست تھے سو بچھڑ گئے

رضا — **رضا** رامپور کے رہنے والے کوئی خوش کلام شخص تھے اور ۱۲۸۱ھ کے قریب زندہ تھے،

اب کوئی لحظہ میں مجنوں پہ بلا آتی ہے	جرس ناقۂ لیلی کی صدا آتی ہے

رضا — **رضا** مولوی غلام رضا لکھنوی۔ قاضی محمد خلیل صاحب کی بیاض سے ایک شعر نقل ہوا۔

لو مبارک ہو رضا کا مٹ گیا نام و نشان	تم بھی رسوائی سے چھوٹے غیر بھی بے غم ہوا

رضا — **رضا** مولوی محمد برکت اللہ، آپ لکھنوی ہونے کے علاوہ علمائے فرنگی محل سے مستفید ہیں اوائل مشق سخن میں مولوی انعام اللہ انعام لکھنوی سے تلمذ اختیار کیا پھر جب مشق بڑھی تو حضرت امیر مینائی کی خدمت میں حاضر ہو کر زانوئے تلمذ تہ کیا، عربی فارسی کی استعداد عالمانہ ہے اور ان دونوں زبانوں میں بہت سی کتابیں اور رسالے مختلف مضامین پر آپکی

تصنیف سے شائع ہو چکی ہیں، اب مشق سخن کو بائیس چوبیس برس کا عرصہ ہو گیا ہے۔ راجہ اشفاق علیخاں تعلقہ دار محمدی ضلع کھیری انکے شاگرد اور قدر دان ہیں، انھوں نے آپکا دیوان بھی سالِ گذشتہ میں شائع کرادیا ہے، جس کا ایک نسخہ راقم تذکرہ کو بھی عنایت کیا شعر خاصہ کہتے ہیں اور پرگو بھی معلوم ہوتے ہیں۔ زبان بھی بری نہیں مضمون کیطرف ذرا توجہ کم ہے

ذرا آسان ہو جاتی مصیبت بس یہ مقصد تھا
نہ آئے پاس تو کیا نزع میں نکلا نہ دم میرا

یارب دعا ہے تجھ سے کہ روزِ وصال میں
ٹکڑا ملا دے کوئی شبِ انتظار کا

آگے آگے تری رحمت کے فرشتے ہونگے
ٹھاٹھ ہو گا سرِ محشر پہ گنہگاروں کا

تارے گنا کبھی، کبھی رونا
رات دن ہے یہ مشغلہ دل کا

کیسے بے چین نہ ہو بعدِ فنا دل میرا
بیٹھا رونا ہی سرہانے مرے قاتل میرا

کفر و ایماں میں ہیں یہ جھگڑے بکھیڑے کس لئے
ایک ہی ہونا ہے ڈورا سبحہ و زنار کا

ہوائے آہ مجنوں لاکھ لائے آندھیاں لیکن
نہ ہوگا فاش پردہ حشر تک لیلیٰ کے محمل کا

مسیحا نے کہا ہر ایک سے یہ دیکھکر مجکو
خدا پر چھوڑ دو اسکو یہ اچھا ہو نہیں سکتا

جو اس شہر میں سے پوچھا نشان مسکن کا
بتا دیا مجھے اس نے مکان دشمن کا

کعبہ و بتخانہ کوئی بھی خدا کا گھر نہیں
مفت کا جھگڑا ہی شیخ و برہمن میں دیکھنا

خار ابھی ہے اسی بت کا طرفدار
عبث ہے حشر میں فریاد کرنا

تم باذنی سے کیا زندہ مجھے
لاش پر وہ معجزہ دکھلا گیا

ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے صیاد کے رضا
دیکھا جو اسنے باغ میں خالی قفس پڑا

کل جو وعدے پہ نہ آپ آئیے گا
مجکو زندہ بھی پھر نہ پائیے گا

کیا کروں یارب سرِ محشر یہ کہتا ہی وہ بت
مجکو شرمندہ نکر تو ہے کے خواہاں داد کا

ہاتھ رکھکر مرے سینے پہ وہ فرماتے ہیں
ہم بھی دیکھیں کہ تڑپتا ہے ترا دل کیونکر

کر رخصت انکو نہیں کے ولاء صبح وصل تو
رونے کیواسطے تو پڑا ہے تمام روز

اب کے بہار میں ہے عجب جوش مےکشی
زاہد کو بھی ہے خانۂ خمار کی تلاش

روتا بھی ہوں تو چھپ کے ہیں گوشہ میں رات کو
رسوائی کا ہے اسکی مجھے اسقدر لحاظ

وہ کھڑے ہیں سامنے گردن جھکائے حشر میں
کھولنا اب کیوں نہو مجکو لب اظہار اشتیاق

بوسہ جو مانگا لب کا تو منہ پھیر کر کہا
کرتے نہیں ہیں بات کسی لالچی سے ہم

جو انکے در پہ جا کر ہم کبھی فریاد کرتے ہیں
تو ہنسکر کہتے ہیں پوچھو تو کسکو یاد کرتے ہیں

اسیر زلف ہو کر یوں بسر ہم عمر کرتے ہیں
کہ پوری جیسے قیدی قید کی میعاد کرتے ہیں

بھٹکتے پھرتے ہو ہر سو اکیلے دار فانی میں
خضر کیا لطف ہے ایسی حیات جاودانی میں

نہ نیند آتی ہے راتوں کو نہ سکھ سے دن گذرتے ہیں
تمہارے چاہنے والے نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

دھرا ہے سامنے آئینہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہیں
عجب صورت ہے انکی جسکو وہ خود پیار کرتے ہیں

رضا ہیں محو ایسے یاد میں ہم اس پری رو کے
نہیں معلوم کسکو دل دیا ہے کس پہ مرتے ہیں

کسی کے سوز الفت سے جگر دل ایسے جلتے ہیں
کہ سانس آتی نہیں منہ سے مرے شعلے نکلتے ہیں

ملنے کو آتے ہیں اپنے اور بیگانے سبھی
عید کا دن ہے گلے لگجاؤ شرماتے ہو کیوں

یہ بھی اک ادنیٰ اثر ہے جھوٹے وعدوں کا عدو
آپ کا اقرار وصل اور وہ مجھے باور نہو

کریم اپنی کریمی کی شان دکھلا دے
وہ دے مجھے کہ کبھی حاجت سوال نہو

کسی کی تیغ کا ہے یادگار زخم جگر
الٰہی حشر تلک اسکا اندمال نہ ہو

جاتے ہیں خالی ہاتھ جہان خراب سے
بے توشگی ہی توشہ ہمارے سفر میں ہے

پہلے میں ہنستا تھا دیوانوں کو اے گیسو مگر
دیکھکر زنداں میں اب ہنستے ہیں زندانی مجھے

بنے گا سینۂ پرغم نمونہ رنج و راحت کا
وہ دلپر ہاتھ رکھینگے جگر سے تیر کھینچیں گے

کسی کا خون کرنے سے تمھیں کیا فائدہ ہوگا
بھلا یہ بھی کوئی ضد ہے جگر سے تیر کھینچیں گے

مرا دل لے لیا باتیں بنا کے
کہاں جاتے ہو اب یہ گل کھلا کے

وعدہ پہ نہ آنے کا سبب پوچھا تو بولے
کیا یاد دلایا تھا مجھے آ کے کسی نے

دل ہجر میں کس طرح سے بہلے گا بتاؤ
ہمدم ہو اک تشنہ ہوں تیغ ابروئے مخمور کا
وعظ کی محفل میں مے پیکر ابھی آتے ہیں ہم
آج گلچیں نے قدم باغ میں کیا رکھا ہے
پاس آتے دیکھکر مجکو کہا اُس شوخ نے
مرنا جینا نیک و بد کا جب بھی ہیں ہو اختیار
بجلیاں بنکر پلٹ آتے ہیں آہ ہوکے شرر
محتسب ہیں ور میخوشی غلط بالکل غلط
بوسہ لیا ہے اُس بُت یکتا کے خال کا
تیرے تقویٰ کا میں اُسوقت ہوں قائل ای شیخ
یہ پوچھتا ہے نزع میں وہ عیسیٰ زمان

نالۂ ہم نالہ و فریاد کرینگے
خندۂ زخم جگر بھی خندۂ مستانہ ہے
واعظا وہ دو قدم پر سامنے میخانہ ہے
شور بلبل نے قیامت کا مچا رکھا ہے
آپ کو کہنا جو ہو کچھ مجھسے کہیئے دور سے
کیوں گنا ہونکی ہو پرسش بندۂ مجبور سے
لُطف پوچھو ان مصائب کے دل رنجور سے
مست ہوں نظارۂ چشم بت مخمور سے
اللہ بخشدے گا وہ بخشنہ نواز ہے
وہ صنم پاس ہو اور تجکو خدا یاد رہے
اب تو ہم آگئے کہو جینے کی آس ہے

رضا

رضا مولوی قاضی عنایت رضا خلف شیخ غلام موسیٰ ساکن قصبۂ بدایوں سے تلمذ تھا۔ قوت حافظہ کا یہ حال تھا کہ ہزار ہا شعر از بر تھے، یہ اُن کا منتخب کلام ہے۔

کلام دونوں کے ہیں مخالف کرے وہ قاتل بھی کل کہنا
اگر ہو یاروں سے تم مخالف موافق اغیار کے نہ رہنا
مونس ہی مرا کوئی نہ ہمدم شب فرقت
کیا کہیئے کہ کیوں جیتے رہے ہم شب فرقت
ہُوں جو رہی پہ خوش کہ اُسے یاد تو رہا
گیا ہوں آپ سے میں کس کی میزبانی میں

زبان خنجر کہے ہی بس بس گلو کہے ہی کمی نہ کرنا
نکری ہو گر ہماری خاطر رقیب کی بھی خوشی نہ کرنا
ہاں ساتھ جو دیتا ہے تو اک غم شب فرقت
تھا پیش نظر وصل کا عالم شب فرقت
اُس شوخ سے تھی مجکو امید ستم کہاں
الٰہی دل میں ہیں مہمان کون کئے ہوئے

رضا

رضا۔ جناب شیخ رضا عباس صاحب خلف شیخ علی عباس صاحب وکیل شاگرد جناب عاشق لکھنوی ۱۸۸۷ء میں لکھنؤ کے رسالہ نغمۂ بہار میں انکی غزلیں چھپا کرتی تھیں چند شعر منتخب ہوئے

رند مشرب ہوں میں پابند نہیں مذہب کا
آج میخانہ میں ہوں کعبہ میں کل جاؤں گا

کیوں شہید ناز کے غم میں ملے حسرت سے ہاتھ
دست نازک سے ترے رنگِ حنا جاتا رہا

جھیل ڈالیں سختیاں روزِ فراقِ یار کی
اب قیامت کا بھی دل سے وعدغا جاتا رہا

منتوں سے ایک بوسہ پر ہوا راضی وہ شوخ
سب وہ برسوں کا گلا شکوا رضا جاتا رہا

اس قدر شوقِ اسیری تھا دلِ ناشاد میں
دام سے چھٹکر پھر آیا خانۂ صیاد میں

رنگ اور بہار اور فضا اور ہی کچھ ہے
ان روزوں گلستاں کی ہوا اور ہی کچھ ہے

مر کے ملجاتی ہے دنیا کے بکھیڑوں سے نجات
پاؤں پھیلائے ہوئے سوتے ہیں سونیوالے

کھلی آنکھ جب قبر میں ہم یہ سمجھے
مسافر کو راحت کی منزل یہی ہے

رضا۔ مرزا رضا حسین بیگ صاحب رضا بریلوی خلف مرزا فدا حسین بیگ تنیس[۳۳] برس ادھر بریلی کے مشاعروں میں غزلخوانی کیا کرتے تھے اور حضرت حکیم نیاز احمد خان ہوش کے تلمذ سے بہرہ یاب تھے، طب میں بھی دخل تھا بیس برس ہوئے انتقال کیا ۴۵ برس کی عمر پائی

رضا

پھینکدو نگاہیں تجھے چیر کے پہلو یدل
شکوۂ جورِ بتاں کچھ جو زباں پر آیا

کچھ عجب دیکھی کشاکش عشق کے بازار میں
موت بھی آتی نہیں عاشق کو ہجر یار میں

فاتحہ پڑھنے جو آئے قبر پر وہ سیمتن
خاک ہو جاتا نہ کیوں حق میں مرا اکسیر ہو

صاحبِ حیرت ہیں دنیا کے حوادث سے پرے
قید کب دامِ قفس میں طائرِ تصویر ہو

مانند کرشے چاندنی کے کھیت کو اسکی چمک
جس مرقعہ میں تمھاری چاند سی تصویر ہو

دورِ گردوں سے گلا ہمکو نہ شکوا یار سے
لے رضا راضی ہیں ہم جو خواہش تقدیر ہو

قسم لو، قول لو، بوسہ نلو نگار زلف کا میں
معاف بہر خدا اب مری خطا ہو جائے

وصالِ یار میسر ہو کس طرح مجھکو
نہ جذب دل میں ہے تاثیر کچھ نہ آہ میں ہے

خطا ہم سے کیا ستمگر ہو گئی
جو اب تیری ٹیڑھی نظر ہو گئی

مرادِ دلی کیوں بر آتی نہیں
مری آہ کیا بے اثر ہو گئی

سفیدی سے بالوں کی عقدہ کھلا　　کہ عمر دو روزہ بسر ہو گئی
ٹھکانا نہ تو ہم فقیروں کا پوچھ　　جہاں شب کو بیٹھے سحر ہو گئی
پلٹکر نہ پائے گا زندہ مجھے　　جو ناخیر اے نامہ بر ہو گئی
شیخی بے فائدہ ہے بلبل کی　　چند روزہ بہار ہے گل کی
کرنہ پامال گل کو باد خزان　　جان جاتی رہے گی بلبل کی

رضا

رضا مبین الرضا خان بدایونی، قمر الحسن قمر بدایونی سے تلمذ ہے، جوان آدمی ہیں، حال باوجود تلاش نہ ملا اشعار ملاحظہ ہوں:۔

صبا سے ہیں کہنے کو تھا حال دل　　وہ سننے سے پہلے ہوا ہو گئی
عجب کیا اگر دل کی چوری کھلی　　گرہ زلف جاناں کی وا ہو گئی
بُرائی بھلائی محبت کی کیا　　جو ہونے تھی وہ اے رضا ہو گئی

رضا

رضا جناب داروغہ مرزا رضا حسین صاحب تلمیذ حضرت حکیم مرحوم لکھنوی زمانہ حال کے شعرا میں ہیں حالات باوجود تلاش نہ ملے:۔

کیئے ہیں آپنے قابو میں لاکھ دل کیونکر　　جب ایک اپنی طبیعت پہ اختیار نہ تھا
پیادہ حشر میں سر کو جھکائے کیوں آئے　　جو خون آپکے سر پر مرا سوار نہ تھا
وہ خود بخود مرے گھر بے بلائے کیوں آئے　　مری طرح سے جو دل اُنکا بیقرار نہ تھا
میں کس اُمید پہ کرتا معاملہ دل کا　　مجھے جب اُنکا اُنھیں میرا اعتبار نہ تھا

رضا

رضا میرزا نظیر حسین رضا، باشندہ عظیم آباد، میر حامد حسین نکہت کے شاگرد ہیں کلام کا نمونہ یہ ہے

رہتا ہے اک زمانے سے گردش میں ہیں تدنا　　جویا یہ پیر چرخ ہے کس رشک ماہ کا
ہاتھوں سے دل سنبھال رہے ہو چال ہے　　دیکھا اثر غریب کی فریاد و آہ کا
چارہ گر کو ہے حذر مجھ زار سے　　الاماں اس عشق کے آزار سے
خاک کر ڈالا اُسے جس پہ گری　　الاماں برق نگاہ یار سے

رضا

رضاؔ نواب محمد رضا خان رضا خلف نواب حسین دوست خاں بہادر شہرت رئیس و جاگیر دار اول کنڈہ صوبہ مدراس نبیرہ نواب شمس الدولہ سبازر جنگ معروف بہ چند اصاحب والی ملک کرناٹک سنہ ۱۸۵۵ء سال ولادت ہے عمر پچاس سال کے قریب ہوگی حضرت سلامت علی دبیر سے تلمذ رہا ہے مرثیہ، غزل، قصیدہ، رباعی، مجملہ اصناف سخن ہیں دخل حاصل ہے چند شعر ملے وہ درج کئے جاتے ہیں۔

دوست دشمن، عدو یگانہ ہوا
ہم اُسی بیوفا پہ مرتے ہیں

رباعی

دنیا میں دبیر سخن آرا نہ رہا
دنیا رہی باقی تو رضا ہمکو کیا
کس قدر منقلب زمانہ ہوا
جس کا وعدہ کبھی وفا نہ ہوا
اوج فلک نظم کا تارا نہ رہا
افسوس ہے اُستاد ہمارا نہ رہا

اب شنی سے بڑھی عمر چلی فصل شباب
بس ہو چکا پا نزاب باندھو اسباب
یہ شیخ و برہمن ہیں کیسے الٰہی
یہ کیا بت پرستی یہ کیا دینداری
یاں سجدہ و جُبہ زنار و ناقوس
ہماں ذوق نفس و ہماں بادہ خواری
سمجھے دیکھوں کیونکر ہے ضدین کا جمع
خفی تو ہیں مظاہر، نو نوری میں جاری

رضا

رضاؔ منشی شیخ رضا حسین خلف شیخ مہدی علی نبیرۂ شیخ مہدی علی عرف راجہ میاں متوطن لکھنؤ کتب درسیہ مولوی ہادی علی رشک وغیرہ اساتذہ سے پڑھیں، فن سخن میں حضرت آسیر مرحوم سے تلمذ رہا سنہ ۱۸۸۶ء میں حیدرآباد دکن میں وکالت کرتے تھے اور سنہ تینتیس برس کی عمر تھی یادگار ضیغم سے کلام منتخب ہو کر درج تذکرہ کیا گیا۔

رہی گرمی نہ باقی نام کو خورشید محشر میں
قیامت کی تری بیتی سیکشوں کے دامن تر میں
خیال عارض جاناں نہیں اس دیدۂ تر میں
حریر شعلہ کا پیوند ہے پانی کی چادر میں
عجب ہنگام ہیں میخانۂ ہستی میں ہم آئے
نہ میخانہ میں ساقی ہے نہ مے باقی ہے ساغر میں
وفائے وعدۂ دیدار میں ہے خوف محرومی
کدھر ڈھونڈیں کدھر جائیں بڑا مجمع ہے محشر میں

رضا

رضا مرزا ظہیر الدین گورگانی دہلی، صاحب عالم مرزا رحیم الدین حیا کے صاحبزادے ہیں جو شاہزادگان دہلی میں نامور استاد فن گذرے ہیں، اپنے والد کی وفات کیوقت سے سرکار رامپور کے وظیفہ خوار ہیں اور وہیں رہتے ہیں۔ ۱۴ برس کے قریب سن ہے شاعری کا شوق بھی ورثہ آبائی ہے۔ کلام ملاحظہ ہو

گلچیں کو تو غرض ہے پھولوں کے توڑنے سے	بلبل پہ یہ ستم ہیں یا باغباں پہ ہیں +
وہ داستان فرقت سنکر یہ کہہ رہے ہیں	دن رات جھوٹے قصے تیری زبان پہ ہیں
دشمنی کرنیکا پھل دشمن کو خود لجائے گا	آہنوالا ایک دن اسکے لیئے مشکل کا ہے
ہم کہیں تو کیا کہیں کوئی سُنے تو کیا سُنے	کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا جو مطلب دل کا ہے
کیا کہوں ہیں عشق میں جو ہیں مصیبت جان پر	کیا بتاؤ نہیں جو بیتا بی سے عالم دل کا ہے

رضا

رضا منشی علی رضا سیتاپوری شاگرد میر تجمل حسین محمد آبادی

ایک بوسہ لب شیریں کا کوئی بات نہ تھی	گالیاں مفت میں دیں تمنے ترش ہو کر
وصل میں اُس مہ خوبی سے منور تھا جو گھر	اب برستی ہے اداسی اُسی کاشانے سے
آپکے حسن نے کیا خوب درانداز ی کی	گل ہے بلبل سے جدا شمع ہے پروانے سے

رضا

رضا سید علی رضا رامپوری۔ آجکل کے کہنے والوں میں ہیں، چند شعر ملاحظہ ہوں ۔

اک آپکی بدولت سو صدمے جان پر ہیں	غم کے پہاڑ ٹوٹے مجھ ناتواں پر ہیں
میری وفا کے قصے مشہور ہیں جہاں میں	تیری جفا کے چرچے سبکی زبان پر ہیں
وہ پیاری پیاری صورت ہر دم ہیں بس رہی ہے	وہ بھولی بھولی باتیں سبکی زبان پر ہیں
سب مجھے ڈر ہے شب فرقت میں کہیں اے گردوں	تو نہ اڑ جائے مرے نالہ شبگیر کے ساتھ

رضا

رضا مولوی محمد رضا صدیقی شاگرد صمیم علی شاہ صاحب صمیم بلند شہری، آپ آگرہ آباد کے باشندے اور خاندان صدیقیہ چشتیہ سے بیعت ہیں، موجودہ زمانہ کی طرز میں بھی کہتے ہیں اور عاشقانہ رنگ میں بھی۔ علی گڈھ میں اکثر سکونت رہتی ہے بندش چست اور زبان صاف ہے

اڑتا ہے آسماں تک سر سے دھواں ہمارا	چھونکے نہ ہمکو اک دن سوز فغاں ہمارا

حسرت نے راحتوں کی قوت مٹا کے چھوڑی شمع سحر کی صورت آخر ہے دور اپنا	ہے تدعی جہاں میں ہر ناتواں ہمارا بزم جہاں میں بگڑا گو یا سماں ہمارا
یہ بہار افزا لہو کس خندۂ بسمل کا ہے ہے یہ مرگ نامرادی یا کہ شادی مرگ ہے یا الٰہی درد فرقت اک گھڑی بھر کو بجائے اے اجل تو آنیوالی تھی تو پہلے کیوں نہ آئی	دامن گلزار دامن خنجر قاتل کا ہے سر ہے میرا اور زانو رحمدل قاتل کا ہے بس یہی تو اک سہارا عاشق بیدل کا ہے ابتو جو احسان ہے وہ خنجر قاتل کا ہے

رضا

رضا۔ محمد موسیٰ رضا باشندۂ چھپرا۔ آپ کو جناب فہیم گورکھپوری سے تلمذ ہے بارہ چودہ برس سے مشق سخن کرتے ہیں اور خاصہ کہہ بھی لیتے ہیں۔

عدو کے غم میں مرجھائے ہوئے سے پھول ہیں گویا اثر جذب محبت میں الٰہی ہو تو اتنا ہو تڑپکر جان دیتے ہیں مریض عشق فرقت میں خدا ہی کو مٹانا تھا ہمیں انکی محبت میں دکھایا جذب الفت نے پس مردن اثر اپنا	ذرا دیکھو تو آئینہ میں رنگت اپنے گالوں کی کہ حالت آکے خود پوچھیں وہ اپنے خستہ جانوں کی گھڑی بھر دیکھ جاؤ آکے صورت مرنیوالوں کی شکایت آسماں کی ہے نہ ہمکو انکی چالوں کی کہ تربت پر نظر آتی ہیں شکلیں خوش جمالوں کی

رضوان

رضوان۔ نواب محمد واجد علی خان صاحب بہادر رضوان ٹمکاری والہ، ولد نجابت علیخان بہادر خلف ارشد نواب سید محمد خان بہادر غضنفر جنگ بادن ہزاری فرمانروائے فرخ آباد بڑے خوش رو اور خوش کلام امیر تھے، اہل کمال کی نہایت قدردانی فرماتے تھے، علماء فضلاء غریب وغربا فقیر وشعرا کی بہت خاطرداری کرتے تھے، نیکوکاری میں مصروف رہنا اپنا خاص شیوہ قرار دیا تھا، نثر ونظم اردو فارسی دونوں خوب لکھتے تھے، تحریر وتقریر کی طرز نرالی تھی، طبیعت بہت عالی پائی تھی۔ کلام معجز نظام منشی سید اسمٰعیل حسین منیر کو دکھاتے تھے ۱۲۹۱ھ میں انتقال فرمایا، منیر مرحوم کو بھی انکے مرنے کا بہت قلق ہوا، قطعات تاریخ انکے غم فراق میں انکے کلیات میں موجود ہیں، کلام بہم رسیدہ کا انتخاب حاضر ہے۔

میری بغل سے وہ گل رعنا نکل گیا
کیوں ہو رہے ہو شرم کی گھڑی شب وصال

دل پکڑے پھر رہا ہوں کلیجہ نکل گیا
انگیا مسک گئی کہ وہ پٹہ نکل گیا

ہم قتل ہو کے بھی نہ جدا ہونگے یار سے
صندل میں رنگیں آپ کہ پہلو نہیں بسائیں
بے جان سیئے چھوڑ چکی شام جدائی
اے نیند کہاں رہتی ہے مجکو یہ بتا دے

بات اپنے سر کے ساتھ ہی سر تیغ زن کیساتھ
بو عطر محبت کی دو لائی نہیں دیتی
گھٹتی ہوئی یہ شام دکھائی نہیں دیتی
آنکھوں کو تری شکل دکھائی نہیں دیتی

رضوان

رضوان سخنور خوش فکر میرزا شمشاد علی بیگ رضوان کہین برادر مرزا قربان علی بیگ سالک حیدرآبادی مولد دہلی مسکن مرزا نوشہ غالب کے بڑے عزیز شاگرد تھے سبقاً سبقاً مرزا صاحب سے انھوں نے فارسی پڑھی بلکہ خود مرزا صاحب کا کلام ان سے پڑھا تھا۔ نواب احمد سعید خان طالب اور منشی بہاری لال مشتاق کے ہم صحبت و ہم مشق تھے شطرنج ہمیشہ کھیلتے تھے دو تین چھوٹے چھوٹے رسالے "شمل" بساط فرنگستان" انکی تالیف سے یادگار ہیں، بڑے ملنسار حلیم، خوش طبع، خلیق، خوش فکر نوجوان تھے، چندے الور میں وکیل اور ڈپٹی مجسٹریٹ رہے تھے ۱۲۹۳ھ میں انتقال کیا، ۴۴ برس کی عمر پائی، حضرت سالک کو انکی وفات سے سخت صدمہ پہنچا۔ مندرجہ ذیل اشعار انکے نتائج فکر سے ہیں جن سے متانت اور پختہ کلامی کی شان ہویدا ہے، طبیعت وقت پسند پائی تھی اور نازک خیالی کی طرف میلان خاطر تھا۔ بلند پروازی اور رسائی فکر کی بدولت اپنے ہمسروں میں ممتاز تھے۔

اپنی نظروں میں وہاں کی ہی تجلی کہ جہاں
شعلہ طور کو بھی حکم ہے موسائی کا

کیا خاک کوئی پائے مزا اعتدال کا
نظارگی ہوں اسکے رخ پر جلال کا
اشیا میں پہلے بھی وہ حیرت فزا رہا
گھیرا ہے جس غبار الم نے جہان کو

انکا ہے ایک کھیل تغیر خیال کا
پروانہ چراغ ہوں بزم خیال کا
کیا پوچھنا ہے اسکے فروغ جمال کا
وہ ایک ذرہ ہے مرے گرد ملال کا

دنیا کے اعتبار سے حاتم سخی سہی | ورنہ یہ سب ظہور ہے اُسکے نوال کا

گم کردگانِ راہ کو ہو نقشِ پا دلیل | مل جائے گر نشان ترے پائمال کا

آئینہ دارِ ذات ہے آئینۂ صفات | ہے ذرہ ذرہ آئینہ اُسکے جمال کا

شیریں ہی کیا جواب ترا گو خلاف ہے | مُنہ بند کر دیا ہے مگر سوال کا

دیتے ہیں بے طلب مئے مقصد بقدر ظرف | شرمندہ اے کلیم ہوا کیوں سوال کا

پیتا ہوں بادہ اوک سے تا خو پڑی رہے | کوثر پہ جامِ زر نہ پیالہ سفال کا

جب وعدۂ وصال کی میعاد ہی نہیں | کیجے حساب کس لیے پھر ماہ و سال کا

آسودگانِ خاک نہ چونک اٹھیں پھر کہیں | آہستہ ذکر چاہیے اُس بُت کی چال کا

میری شبِ وصال قیامت نہیں اگر | کیوں منحصر ہے حشر پہ ہونا وصال کا

سُن لیتے ہیں عجب نہیں آ جائیں راہ پر | جمنا چلا ہے رنگ ہمارے مقال کا

صحرا ہی اور ہیں ہوں مرا سر ہے اور کوہ | کیا پوچھتے ہو حال مجھ آشفتہ حال کا

رضوان خدا کو مان یہ ظاہر پرستیاں | کمبخت کچھ بھی خوف ہے تجھکو مآل کا

وہ تو گئے ہیں دکھا کے اثرِ قُم مجھکو | اور آتا ہے مسیحا پہ تبسم مجھکو

غم سے بدلی ہے یہ صورت کہ نہ پہچانے کوئی | تیری اُلفت نے کیا دیر میں یوں گم مجھکو

جسنے کھایا تھا وہ پاداش کو پہنچا یارب | کیوں کھپاتی ہے مرے خواہشِ گندم مجھکو

حُسنِ اشیا کے تماشے میں ہوں محوِ وحدت | عین توحید ہوئی کثرتِ مردم مجھکو

نظر آتی نہیں چھپ بیٹھ کے بھی تجھسے نجات | ابتو مانع نہیں یارائے تکلم مجھکو

پاؤں پھیلا کے جہاں سوؤں وہاں نیند آ جائے | دامنِ دشت ہے یا بسترِ قاقم مجھکو

جب سماتا ہے تصور میں وہ پہلا نقشا | نظر آ جاتے ہو کعبہ میں بتو تم مجھکو

کیوں سنوں تیری کہ سُننے نہیں دیتا ہے خمار | شیخ سمجھائے تو دے پہلے کوئی خم مجھکو

ناتوانوں کے نصیبوں میں کہاں ہیں جنات | لے اُڑی ساتھ مرے گرد نسیم مجھکو

کیا لطفِ زندگی دلِ غم مبتلا کے ساتھ
بہرِ جہاں کو آئے بھی تو کس بلا کے ساتھ

گر جاؤ گے نظر سے جو ٹوٹی وفا کی آس
جانے بھی دو کہ ضد نہیں اچھی وفا کے ساتھ

یارب ستم کے بدلے وہ مُبت بھی مِلا تو کیا
ہو کوئی شب بھی عیش کی روزِ جزا کے ساتھ

آنے سے تیرے تا ہو نہ ہمسایہ کو خبر
کرتے ہیں نالہ ہم تری آوازِ پا کے ساتھ

ہیں خوش ہُوں ضعف سے کہ رسائی کی ہے امید
شاید گذر ہو کوئے صنم میں ہوا کے ساتھ

کیا معتقد مسیح کے ہوں دم ہی دم ہے وہاں
سب کا علاج فرض نہیں اک دوا کے ساتھ

ہو یہ گرہ نہ ناخنِ تدبیر سے بھی وا
وابستہ میرے کام ہیں بندِ قبا کے ساتھ

شرمِ ستمگری سے بن آتا نہیں انھیں
انداز لطف کا دلِ غم آشنا کے ساتھ

بیتابیاں نہ کیونکہ ہوں آئینہ دارِ راز
شوخی غضب ہے اُسکی نگاہِ حیا کے ساتھ

ہم پاسِ وضع سے رہے ناکام بیشتر
نازک دماغیاں بھی ہیں یاں التجا کے ساتھ

رہنے دو نزع میں کہ انھیں مرگ کی ہے آس
مر جاؤنگا مسیح، دمِ جانفزا کے ساتھ

ہم مر گئے خوشی میں وہ یاں آئے اِس طرح
یہ ظلم کس سے کہیے کہ مارا وفا کے ساتھ

گو یادِ حق میں ہوں مگر آتی ہے جان سی
اب بھی بتانِ شوخ کی آوازِ پا کے ساتھ

رضواں وُہی ہُوا کہ جو کچھ تھا خیال میں
کیوں بحث کیجیے داورِ روزِ جزا کے ساتھ

عشق کا نام دوسرا کیا ہے
مرضِ موت کے سوا کیا ہے

کہہ چکے آپ سُن چکے ہم پھر
کہتے ہو کیجئے ماجرا کیا ہے

لُٹ چکے مِٹ چکے پھرائے گردوں
ہمپہ اور جور کر رہا کیا ہے

خود تماشا ہے خود تماشائی
کون جانے وہ خود نما کیا ہے

میں تو موسیٰ نہیں کہ ہوں محروم
جلوہ پردے میں اے خدا کیا ہے

آہ کو اپنی کیا کروں ضائع
چرخ کیا چرخ کی بنا کیا ہے

دِل لگا ایسے بھولے سے رضواں
جو سمجھتا نہیں ادا کیا ہے

حُسن حیرت نہیں تو پھر کیا ہے؟
اُسکی قدرت نہیں تو پھر کیا ہے
چشم جادو ہے اور بلا ہے نگاہ
غمزہ آفت نہیں تو پھر کیا ہے
گر بہارِ ظہور حبِّ ظہور
عین وحدت نہیں تو پھر کیا ہے
عشق بے جذبہ و کشش بیکار
دل میں اُلفت نہیں تو پھر کیا ہے
تیز کرتا ہے دشنہ کو دمِ قتل
یہ مروّت نہیں تو پھر کیا ہے
کوئی اُس کوچے سے نہیں پھرتا
ہاں وہ جنّت نہیں تو پھر کیا ہے
اُسکی رفتارِ فتنہ زا رضواںؔ
گر قیامت نہیں تو پھر کیا ہے

شہرِ دہلی کو اگر ہند کا دل کیجیے فرض
حضرتِ قلعہ کو ٹھیرائیے جانِ دہلی
گر نہوں ہم تو ہو بازار میں گرمی کیونکر
ہم ہی تھے جنسِ گراں ارزدکانِ دہلی
دستِ یغمائے فلک سے نہ رہا کچھ باقی
ہاں مگر واسطے نامے کے زبانِ دہلی
ہے عدم کی تجھے منظور خدایا رونق
کہ اُٹھایا اُنھیں جو لوگ تھے جانِ دہلی
انتہا گم شدگی کی ہے عدم ہو جانا
ہمنے پایا نہ عدم میں بھی نشانِ دہلی

رضوان جناب ابو المظفر مولا بخش صاحب باشندۂ آرہ شاگرد جناب آتشؔ مرحوم شاگرد رشید ناسخؔ مرحوم، جناب رضوان نے ابتدا میں کئی سال جناب مولوی حافظ عبد الحمید حمیدؔ سے اصلاح لی پھر آتشؔ کے شاگرد ہوئے جس زمانہ میں حضرتِ داغؔ کلکتہ گئے ہیں آپ بھی اُن مشاعروں میں شریک ہوئے تھے پرانے مشاق ہیں ۵۰ برس سے زیادہ عمر ہے یہ کلام ہے

شمع رویوں کو ہمارے دل کی گو پروا نہ تھی
دل ہمارا عشق میں اُنکے مگر پروانہ تھا
دیر سے رضواںؔ کہو کعبہ کا کرتا عزم کیا
کعبہ جسکو کہتے ہیں وہ بھی تو اک بتخانہ تھا
ملا دیا جو اسے خاک و خوں میں خوب کیا
یہی سزا تھی دلِ بیقرار کے قابل
شبِ وصال یہ کیا پیشکش کروں اُسکی
کہ جانِ زار نہیں نذرِ یار کے قابل

کیوں جاں دے کسی کے لیے کوئی کیوں مرے
دنیا میں جب کسیکا کوئی آشنا نہیں

ہمصفیرو! فصلِ گل فرقت میں خوش آتی نہیں
زمزمہ سنجی عنادل کی مجھے بھاتی نہیں

یہ سوالِ وصل کا اُسنے دیا مجکو جواب
یاد رکھو مجکو ایسی دل لگی بھاتی نہیں

تھی شبِ وصلت وہ جس میں صبح تک سوتے نہ تھے
ہے شبِ فرقت یہ جس میں موت تک آتی نہیں

نامہ بر وہ تا نہیں کیوں مجکو پیغامِ قضا
وہ نہیں آتے نہ آئیں موت کیوں آتی نہیں

خونِ شہیدِ ناز بھی لو رائگان گیا
مقتل سے وہ چلے گئے دامن سنبھال کے

تسکین دہی کے حیلے سے سینہ پہ رکھکے ہاتھ
باتوں میں لے گیا وہ مرا دل نکال کے

کیوں نہ دل عاشق کا صرفِ نالۂ پیہم رہے
غیر جب دن رات اُسکا مونس و ہمدم رہے

راہ لے اپنی تجھے کیا کام ہمسے اے خضر
غم تجھے کیا دُور منزل سے رہے تو ہم رہے

جنابِ شیخ بھی چُپکے سے پی لیں
وہ مہ پیکر اگر دے جام بھر کے

مٹا دونگا نشاں تک سنگِ در کے
اُٹھونگا اب تو تیرے در سے مر کے

نہ نکلی ہیں نہ نکلیں گی کبھی دل سے کسی عنواں
تمنائیں، مُرادیں، آرزوئیں حسرتیں دلکی

رہیں وہ میری آنکھوں میں یہی ہے حسرت آنکھونکی
وہ ہوں رونق فزا دل میں یہی ہے آرزو دلکی

نرالے ڈھنگ ہیں دنیا سے اُس شوخِ ستمگر کے
پشیماں جور سے کیا ہو وہ نازاں ہے ستم کر کے

تڑپتے ہیں گلی میں بیوفا کی سینکڑوں زخمی
چھری کے، تیر کے، تلوار کے، برچھی کے، خنجر کے

کہا کیوں سنگدل اُنکو شبِ وصلت پشیماں ہوں
نہیں کچھ بولتے منہ سے بنے بیٹھے ہیں پتھر کے

بھرے سو جام خالی کر چکے اغیار اے ساقی
رہے ہم منتظر محفل میں تیرے ایک ساغر کے

نہیں کہتے ہوئے بدنام ہم خود مار کر اُنکو
یہ کہتے ہیں نہیں رُسوا کیا عشاق نے مر کے

پھریں آوارہ ہم برسوں رہیں وہ بزم دشمن میں
یہ گردش ہے ستاروں کی کرشمے ہیں مقدر کے

وہ آتے ہیں مگر یہ یاد رکھنا حضرتِ رضوان
ہماری ہی شکایت وہ کرینگے دیکھنا ہم سے

میں ہوں وہ کشتۂ سوزِ فراقِ شعلہ رخاں
زمین جل گئی تربت بنی جہاں میری

نہ وہ شباب نہ وہ دل نہ جوششِ مستی
وہ پیشتر کی اُمنگیں گئیں کہاں میری

رہا حشر میں بھی وہ محشر خرام	قیامت سے بھی چوٹ چلتی رہی

رضوان۔ عالیجناب نواب رضوان علیخان صاحب رئیس اعظم مراد آباد عرف محمود اختر آپ عضد الدولہ نواب محمد عظمت اللہ خان دلیر جنگ ناظم صوبہ روہیلکھنڈ زماں شاہی کے خاندان سے ہیں، عربی فارسی کی تعلیم رئیس زادوں کی طرح گھر پر ہوئی اور آپکو فی الجملہ علوم متداولہ میں مہارت تام حاصل ہے، نعتیہ کلام کہنے کا عرصہ سے شوق ہے اور عاشقانہ شعر کی طرف توجہ کم ہے، اِس صنفِ خاص میں آپکا کلام قابلِ ستایش ہے، اور حضرت امیر نواب فصیح الملک مرزا داغ اور حضرت جلال و محسن جیسے اُستادانِ مسلم الثبوت نے آپکی مشاقی اور خوش فکری کی داد دی ہے۔ آپ کا بیان ہے کہ مرزا غالب مرحوم سے زمانِ قیام رامپور میں آپکو نسبتِ تلمذ حاصل ہوئی تھی، نہایت پُرگو اور مشاق سخنور ہیں اور اِس صنف شعرگوئی میں صدہا باذاق شاعر آپ سے فیضیاب ہیں، پچاس ساٹھ جزو کے دو دیوان اور متعدد مختلف نظمیں آپکی تصنیف سے موجود ہیں جب حج کو گئے تو قصیدہ کے صلہ میں حاکم مکہ خالد پاشا نے آپ کو حسان الہند کا خطاب دیا تھا۔ آپکی عمر ۶۶ سال کی ہے آپکا کلیات موسوم بہ "تصویر خوبی" چھپ گیا ہے، بہار احمد آبادی آپکے تلامذہ میں نامور ہیں ؏

شب کو یاد آتا ہے جب وہ مہِ انور اپنا	چاندنی میں میں بچھا لیتا ہوں بستر اپنا
لیگیا کون اِسے آئینہ سمجھکر اپنا	آج پہلو میں نہیں ہے دلِ مضطر اپنا
حسرتِ دید میں ہم پھرتے ہیں آنکھوں کیطرح	ڈھونڈتا ہوں کا اُلٹ پھیر ہے چکر اپنا

اگر ہو جائے شیوہ ترکِ لذاتِ جہاں تیرا	نہ چھوڑے زندگی بھر ساتھ عیشِ جاوداں تیرا

آپ بوسے دیئے گئے ہوتے	ایک دن سب حساب ہو جاتا
شمع پروانہ بن کے اُڑ جاتی	تو اگر بے نقاب ہو جاتا

زلف کو میں نے چھوا ہو تو مجھے سانپ ڈسیں	خود بخود تم ہوئے جاتے ہو مرے سر کیونکر
اُنکی تصویر سے بھی میری تسلّی نہ ہوئی	اب میں بہلاؤں تجھے اے دلِ مضطر کیونکر

جائے بل ابروئے پُرخم سے نکلکر کیونکر
خواب میں دیکھتا ہوں چاند سے رخسار کا رنگ
آنکھ سے چہرہ سے باتوں سے عیاں ہوتا ہے
بیگناہوں کے لہو میں جو نہا کر نکلی
ہجرِ جاناں میں نہیں پہلا سا وہ نار رضوان

تیغ سے ہوگا جُدا تیغ کا جوہر کیونکر
خوب چمکا ہی مرے طالعِ بیدار کا رنگ
چھپ نہیں سکتا ہی ساقی کبھی میخوار کا رنگ
کسقدر شوخ ہی قاتل تری تلوار کا رنگ
اب بدلنے لگی ہی مرے دیدۂ خونبار کا رنگ

دِل ہے یا کوئی مرقع ہے پریزادوں کا
ہو کوئی بات تو کچھ اُس کا تدارک کیجے
کب داغ یہ دل پر شبِ ہجراں میں لگے ہیں
کب داغِ محبت دلِ حیراں میں لگے ہیں
مسند نشیں ہیں آگے مرے بوریا نشیں
آنسو ٹپک کے آنکھ سے افسوس تھم گئے
جا کے بیٹھا نہ کر اے بُت تو مسلمانوں میں
ساقیا جلد پلا دے کہ بڑی دیر سے مست
عید کا دن ہے گلے ملکے چھُری پھیر بھی دو
سبزۂ خط میں ہے اُنکے لبِ لعلیں کی نمود

سینکڑوں بستے مرے دل میں حسیں رہتے ہیں
خود بخود وہ تو عبث چیں بجبیں رہتے ہیں
نایاب کنول انجمنِ جاں میں لگے ہیں
آئینے جلو خانۂ جاناں میں لگے ہیں
کیا سربلندیاں ہیں مرے انکسار میں
ابرِ بہار کھُل کے نہ برسا بہار میں
تیری اُلفت خلل انداز ہے ایمانوں میں
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں میخانوں میں
جوشِ تکبیرِ شہادت کا ہی قربانوں میں
پھول لالہ کا کھلا ہے یہ ہرے دہانوں میں

پردہ اُٹھتا ہے کسی کے رُخِ نورانی سے
ہیں مستحق رحمتِ حق اہلِ معصیت
زلفیں ہٹیں تو وہ رُخِ تاباں نظر پڑے

برق چمکے تو سہی شمس و قمر دیکھیں تو
ہر بنے گنہ سے کہہ دو گنہگار بھی تو ہو
اِن بادلوں سے چاند نمودار بھی تو ہو

وہ معنی ہوں کہ مضمونِ فنا ہے زندگی میری
ابھی فرشِ زمیں پر تھا ابھی عرشِ بریں پر ہوں
ذقن ہی چاہ تِل ہی ڈول رسی زلفِ پیچاں ہی

وہ مطلب ہوں کہ ہستی سے ہی بہتر نیستی میری
کہاں سے لے اُڑی مجکو کہاں تک بیخودی میری
جو پانی کھینچ سکے تو کھینچ لے تشنہ لبی میری

تحریر داغ کہنی ہے جادو بیاں مجھے
خط میں لکھا امیر نے ہے نکتہ داں مجھے

دانتوں وہ نسیمچہ کا بچپن زباں مجھے
چٹکی بھی ہی نہ کسے میں جو ہے شست آسماں مجھے

سب مے لٹادوں ساقیٔ کوثر کے نام پر
ساقی بنائے اپنا جو پیرِ مغاں مجھے

سب بہاریں باغ کی دم میں فنا ہو جائینگی
جب ہوا باندھیں گی آہیں بلبلِ ناشاد کی

ایکدن بھی تجھکو رحم آیا نہ اے صیاد حیف
گو اسیرانِ قفس نے مدتوں فریاد کی

تکلیف روا رکھو نہ پیرِ کاہ کسیکی
ہاں تیکھے نہ چھپوائے کہیں آہ کسیکی

پلکیں جو نظر پڑ گئیں ناگاہ کسیکی
برماتی ہوئی دل کو چلی آہ کسیکی

نوکر بھی مجھے رکھکے نہ بت دیتے ہیں تنخواہ
سہیے بندگی ماہ سے تنخواہ کسیکی

عشاق کو اتنا نہ ستائے بتِ ظالم
فریاد نہ سن لے کہیں اللہ کسیکی

کھل گیا زخمِ جگر پھر کھل گیا
بخیہ گر بخیہ پہ بخیہ چاہیے

بوتل سے مضمونوں کی جسوقت بھری نکلی
مستانِ معانی میں غل تھا کہ پری نکلی

جب خنجرِ خم کھا کر آہِ سحری نکلی
زخموں میں لدی نکلی داغوں میں بھری نکلی

پروانوں نے جب چھیڑا اُس رخ پہ فدا ہو کر
رونق ہوئی محفل سے شمعِ سحری نکلی

جنت میں جو گائے کو رضواں کی غزل لائیں
غلماں میں پڑا یہ غل حوروں میں پری نکلی

رضی

رضیؔ سیف الدولہ سید رضی خان بہادر صلابت جنگ امیر دربارِ اکبر شاہ ثانی۔ ذوق مرحوم کے والد انکی سرکار میں ملازم تھے۔ سرکارِ کمپنی بہادر کی طرف سے دربارِ شاہی میں وکیل تھے اور ایکہزار روپیہ ماہوار مشاہرہ پاتے تھے سنہ ١٢٥٠ھ میں انتقال کیا۔ شعر و سخن سے بھی مانوس تھے یہ انکا کلام ہے۔

مرتے قتل کرتے ہیں وفا ئے ہیں
میرا کام ہوگا ترا نام ہوگا

سوتے پلنگ پر وہاں وہ تو خوشی کی دھن میں
یاں ہم نے رات کاٹی ساری کڑھن میں

بِن عشق آدمی کی ذرا شان ہی نہیں
جسکو نہو وے عشق وہ انسان ہی نہیں

دیکھ ٹک شمع کو عاشق کے ستانیوالے	اس طرح جلتے ہیں اَوروں کو جلانیوالے
رضیؔ سے صنم کیوں بُرا مانتا ہے	یہ تیرا ہے بندہ خدا جانتا ہے

رضیؔ

رضیؔ ۔ قاضی محمد حسین رضیؔ مرحوم باشندہ نارنول علاقہ ریاست پٹیالہ، آپ نظامت شیخاواٹی جے پور کے قصبہ سنگھانہ میں شعبان ۱۲۵۸ھ میں پیدا ہوئے اور ایام شباب میں مولانا سلیم الدین صاحب تسلیم نارنولی سے جو بڑے مشہور شاعر اور ادیب گذرے ہیں اصلاح لینی شروع کی، اُنکے انتقال کے بعد کچھ روز اُنکے بھائی مولوی سلطان الدین مبین سے بھی مشورہ لیتے رہے محرم ۱۳۲۴ھ میں ۶۶ برس کی عمر پاکر انتقال کیا، کامل بیالیس برس ریاستِ جیپور میں مختلف خدمات پر مامور رہے آخر عمر میں محکمہ اپیل میں اہلمد خزانہ تھے، بہت پُرگو اور زود فکر شاعر تھے۔ دو تین گھنٹہ مشق سخن التزام کے ساتھ مدۃ العمر کرتے رہے، نعت اور سلام کہنے کا آخر عمر میں زیادہ شوق ہوگیا تھا۔ ایک عاشقانہ اور نعتیہ دیوان اور ایک مجموعۂ سلام اور چند مثنویاں اُنکے بیٹے قاضی ممتاز حسین مدرس جیپور چاندپول سکول کے پاس اُنکی تالیف سے موجود ہیں، مولانا حسرت موہانی نے ایک انتخاب سلام ہا ابھی حال میں بطور ضمیمہ اُردوئے معلی شائع کردیا ہے اُس میں سے بھی چند شعر درج کیے جاتے ہیں، اُنکی شیریں زبانی اور خوش کلامی اور چستی ترکیب و بندش ہر شعر سے ظاہر ہے۔ عاشقانہ اور نعتیہ دونوں طرح کا کلام ملاحظہ ہو۔

از سلام

نہ سمجھی کوفیوں نے ہائے کچھ تقریر اس شہ کی
کیا ہی بند کیوں آل عبا پر آب داللہ کو
اب جد جسکے ہوں مختار مالک حوض کوثر کے
زہرا کا دل دُکھے کہ رسالت مآب کا
بکھرے ہوئے ہیں کان رسالت کے سب گہر
آباد یہ ہوا ہے اُجڑ کر نبی کا گھر

جو تفسیر و مفسر تھا کتاب آسمانی کا
یہ کیا برتاؤ ہے ای میر بانو میزبانی کا
ملے اسکو نہ مرتے دم تک اک قطرہ بھی پانی کا
زندہ رہے مگر نہ لپر بوتراب کا
کیوں طشت زر سے نہ بیابان کربلا
اللہ رے نصیب بیابانِ کربلا

گردوں کو رشک ہی تو بجا ہی عجب نہیں
پُر ہے نجوم عرش سے دامانِ کربلا

سینچا ہے باغباں نے شہیدوں کے خون سے
اللہ رے بہارِ گلستانِ کربلا

مٹ گیا جب ہر جوان آلِ احمد کا نشان
تب ہوا روشن رضی نام و نشانِ کربلا

عاشقانہ

میں ہوں آشفتہ بیاں میری زباں سے نہ سنیں
زلف سے پوچھ لیں حال اپنے پریشانوں کا

جس طرح فرض ہے مومن پہ طوافِ کعبہ
یوں ہی عشاق پہ ہے طوافِ صنم خانوں کا

اک جگہ کا نہیں پابند جو ڈھونڈے سے ملے
تیرا وحشی تو بگولہ ہے بیابانوں کا

صبحدم کچھ بھی نہ تھا بزم میں جز شمع خموش
ہاں مگر ڈھیر تھا ایک سوختہ پروانوں کا

حسرت سے کی نظر سوئے گردوں امام نے
اصغر کو گود میں ہدفِ تیر دیکھ کر

بتوں سے لئے اک حرم دیگر خدا کو
عجم سے لے لیا ہندوستان تک

شب غم ہمدمو وہ ذکر چھیڑو
سحر ہو جائے ختم داستاں تک

ہیں اُنکے ساتھ ہوں ہمرنگ سایہ
وہ مجھ سے دُور بھاگیں گے کہاں تک

سلام

شمر پڑھتے تھے رجز کہ امام زماں ہیں ہم
مقبول بارگاہ خدائے جہاں ہیں ہم

ایمان و کفر کا سا ہے ہم تم میں تفرقہ
ایذا رساں جو تم ہو تو راحت رساں ہیں ہم

تم سر بسر ہو آتشِ دوزخ کے سوختہ
صحنِ ریاضِ خلد کے سروِ رواں ہیں ہم

شبیر صبر و شکر میں یکتا ہیں فرد ہیں
حضرت کا ایک دل ہے مگر لاکھ دریا

شور تھا فوجِ عدو میں جاں نثارانِ حسین
تیر سے ڈرتے نہیں آبِ دمِ شمشیر ہیں

شبیر اور بیعت فاسق غلط غلط
ممکن نہیں کہ نور سما جائے نار میں

مجبور ہوں مشیّتِ پروردگار سے
دونوں جہاں ہیں ورنہ مرے اختیار میں

رضی رخصت نہ تھی اہلِ حرم کو آہ و زاری کی
جو روئیں بھی تو روئیں بیبیاں آہستہ آہستہ

ہوا جب قتل سب لشکر تو شہ کو جانبِ مقتل
اجل لیکر چلی دامن کشاں آہستہ آہستہ

حریصِ حکومت نہیں ابن حیدر
حسن کر چکے ترک جب حکمرانی

سلام اُسپر جو سبطِ مصطفےٰ ہی ابن حیدر ہے
شکیب جانِ زہرا قوتِ بازوئے شبر ہے
کہیں نیزوں کے پھل ہیں اور کہیں آبِ دمِ خنجر
اِسی کا نام کیا چھائی آلِ پیمبر ہے

مُسلماں ستاتے ہیں آلِ نبی کو
یہ حقِ رسالت ادا ہو رہا ہے
یہ کیا ستر قدرت ہی باوصفِ طاقت
اِمام آج بیدست وپا ہو رہا ہے
فلک ٹوٹ پڑتا نہیں کیوں زمیں پر
سرِ شاہ تن سے جُدا ہو رہا ہے

اے مُجرئی شبیر سے بڑھکر کوئی کیا دے
ممکن نہیں انسان بھرے گھر کو لٹا دے
ٹھانی یہی کہ لے نہر کو اعدا سے سو لیلی
اللہ رے عباسِ دلاور کے ارادے
اب کوئی دم میں فراقِ جسم و جاں ہونیکو ہے
شاہ کا حق سے وصالِ جاوداں ہونیکو ہے
دفن ہونیکو ہیں مقتل میں ستارے عرش کے
اب زمینِ کربلا بھی آسماں ہونیکو ہے
خشک ہوجائے فراتِ کوفہ کیا بہتا ہے تو
شہ کے سوکھے حلق پر خنجر رواں ہونیکو ہے

عاشقانہ

رُخ زیبا ترا دلکش قدِ رعنا ترا دلجو
باایں خوبی تری ناآشنایانہ ادا کیوں ہے

بے گناہی نے ہماری بھی وہ بدلے تیور
ایک تلوار بھی قاتل سے لگائی نہ گئی
اُنکے آنے کی دمِ نزع مرے یاروں ہے
کوئی جھوٹی سی خبر بھی تو اُڑائی نہ گئی
بن گیا میرے مقدر سے رگِ گل ہر خار
دشت میں بھی خلشِ آبلہ پائی نہ گئی
وہ بات کہہ رہے ہو کہ جسکا نہ سر نہ پاؤں
کسکی زبان شکوہ طرازِ جفا ہوئی
تدبیرِ چارہ گر نہ ہوئی کوئی کارگر
آخر مریضِ عشق کو مرکر شفا ہوئی
ایکدن بھی تو نہ نکلی حسرتِ عیش و نشاط
رفتہ رفتہ صرفِ غم ساری جوانی ہوگئی
اب تو خوش ہو جل بُجھے دل اور جگر دونوں مرے
لے ترے مطلب کی اے سوزِ نہانی ہوگئی
خبر تمنائے اجل اب نہیں خواہش کوئی
جب سے اُمید شفائے دلِ بیمار گئی
کیا بُرا ہے اثرِ مشقِ تغافل دیکھا
آپ بدنام ہوئے جانِ طلبگار گئی
سہتا ہوں اِس غرض سے ستم ہائے ناروا
اُس بیوفا کے گھر میں بنا نا ہی گھر مجھے

دلمیں مرے رہے کہ جگر میں کہیں رہے	جاں سے عزیز تر ہے وہ تیر نظر مجھے
جز شوق کسکو ساتھ رکھوں راہِ عشق میں	ایسا کہاں ملیگا کوئی ہمسفر مجھے
یہ کسکی چشم مست کی گردش کا ہے اثر	تقوی پرست میکش و مینوش ہو گئے
ناطاقتی میں بار گراں تھا ہمیں سو ہم	سر نذر یار کرکے سبکدوش ہو گئے
قیامت اوّلِ شامِ بلا ہے	شبِ غم کی سحر لاؤں کہاں سے
نہیں چھپتا چھپائے رنگِ وحشت	ٹپک جاتا ہے اندازِ بیاں سے

رضی

رضی۔ سید غلام شبیر صاحب الہ آبادی منصرم توشہ خانہ رامپور د ۱۸۹۱ء شاگرد رشید جناب شیخ مہدی علیخان ذکی مرحوم، بقول گلکدۂ ریاض مرادآباد وطن تھا، انکی ایک غزل جو درجِ ذیل ہے بہت مشہور ہے اور اکثر جگہ گائی بھی جاتی ہے اپنی خوش فکری اور شیریں کلامی کی بدولت ہمعصروں میں ممتاز تھے، اب غالباً خانہ نشین ہیں۔

شور پیدا کیا خموشی نے	ضبط بھی اختیار کا نہ رہا
کٹ گئی ہائے رات باتوں میں	وقت اظہارِ مدعا نہ رہا

جب خدنگِ ناز ہی دلمیں نہ میرے رہ سکا	تیغ کیا ٹھیرے گی مجھ سینہ سپر کے سامنے
اے نگاہِ شوق آخر کب تلک یہ حسرتیں	لا گلِ حسنِ صنم دامن میں بھر کے سامنے
یاد میں یارانِ ہم مشرب کی آنسو گر پڑے	ساقیٔ گلرو جو لایا جام بھر کے سامنے
مزے کے دن ہیں امنگوں پہ ہیں وہ آئے ہوئے	اترائے پھرتا ہے جوبن پری بنائے ہوئے
جو پاس بھی مرے بیٹھے تو کسمسائے ہوئے	بدن چرائے ہوئے اور کچھ چھپائے ہوئے
کسی کا ہائے وہ راتوں کو چھپ کے یوں آنا	چھڑے چڑھائے ہوئے پائینچے اٹھائے ہوئے
نگاہِ ناز سے بیساختہ نہ دیکھا کر	انھیں اداؤں کے ظالم ہیں ہم ستائے ہوئے
ہیں ایک ہم کہ ترستے ہیں انکی صورت کو	ہیں ایک وہ کہ گلے سے انھیں لگائے ہوئے
رضی شباب جو کھویا گیا ہے پیری میں	ہم اسکو ڈھونڈتے پھرتے ہیں سر جھکائے ہوئے

رضی

رضی۔ ڈاکٹر زیرک حسین باشندۂ امروہہ خلف وشاگرد ناطق الملک مؤمن حسین صفی کئی سال ہوئے بھٹنڈہ میں افسر شفاخانہ تھے انکے والد جناب صفی بڑے مشاق اور زود فکر شاعر تھے اوائل عمر میں اکثر آگرہ میں قیام رہا۔ ذہین اور طبیعت دار شخص ہیں کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو

عشق کسکو آیا کون چلا کوہ طور سے
موسیٰ کہو تو کچھ سر کہسار کیا ہوا

دولت جو ہاتھ آئے تو دل بھی کھلا رہے
مٹھی رہی جو بند تو زردار کیا ہوا

واعظ خدا کو بھی تو نہیں بھولا ہوا نہیں
بت یاد ہیں اگر تو گنہگار کیا ہوا

یوسف کو میرے لئے نہ لیا دیکے نقد دل
آئے جو مشتری بن کے خریدار کیا ہوا

اسی لئے مری شمع حیات گل کی تھی
کبھی چراغ بھی روشن مزار پر نہ کیا

صفیں کی لٹ گئیں گردش سے چشم کی ساقی
نگاہ مست نے کس کس کو بے خبر نہ کیا

جسنے تلوا بھی ترا اے مہ تاباں دیکھا
چاہ سے پھر نہ رخ یوسف کنعاں دیکھا

فتنہ بیدار رہا کیجئے موقوف خرام
آپ کی چال نہیں حشر کا ساماں دیکھا

کہتے ہیں خیر ہو یارب سر سودائی کی
خواب میں گیسوئے شبگوں کو پریشاں دیکھا

بیخودی شرط ہے جب تو انھیں پائے کوئی
آپ آئینہ ہو اگر آپ سے جائے کوئی

توبہ کر لی ہے تو کیا توڑ نہیں سکتے ہم
اب بھی پی جائیں خوشی سے جو پلائے کوئی

دیتی ہے عاشق و معشوق کی رنجش بھی مزا
کوئی روٹھا ہوا بیٹھا ہو منائے کوئی

اپنے دل پر وہ ذرا ہاتھ تو رکھکر دیکھے
اے رضی دل جو دکھاتا ہے پرائے کوئی

یہ جو ہریا باغباں دیکھو کہ جس پر آشیانہ تھا
وہی ڈالی مرا دل توڑنیکو توڑ ڈالی ہے

رضی

رضی۔ سید رضی حیدر رضی۔ دور موجودہ کے کہنے والے ہیں ایک غزل کے چند شعر رسالہ مخزن سے درج کیے جاتے ہیں۔

زیبا ہے رخ یار پہ دامن حجاب کا
گویا ہے آفتاب پہ دامن سحاب کا

مستانہ چشم جوش جوانی دکھا گئی
نشہ چھپا نہ بادۂ حسن شباب کا

رہنے نہ دینگی شوخیاں اُنکی نگاہ کی
آنکھوں ہیں اب گذر نہیں ممکن حجاب کا
حیراں ہوں مجھ سے کیوں وہ خفا ہو گئے رضیؔ
غصہ کی کوئی وجہ نہ باعث عتاب کا

رعایت

رعایت۔ سید رعایت علی رعایت لکھنوی خلف امانت علی امانت لکھنوی و برادر حضرت فصاحت لکھنوی، عرصہ ہوا انتقال کر گئے۔

باندھی ہے کیا ہمارے دلِ سرد نے ہوا
گردوں پہ دل فرشتوں کے لہرائے جاتے ہیں
بوسہ ہنوز مصحفِ رُخ کا نہیں لیا
قرآن کی وہ جھوٹی قسم کھائے جاتے ہیں
بنتی ہیں بیڑیاں ترے دیوانے کے لئے
حدّاد ڈھونڈ ڈھونڈ کے بلوائے جاتے ہیں
یارب کمر بتوں کی بچانا دمِ خرام
ہر ہر قدم پہ ناز سے بل کھائے جاتے ہیں

رعب

رعب۔ شیخ حکیم محمد حنیف علی رعب قریشی انصاری باشندۂ شاہ آباد آپکی کنیت ابو الصواب ہے حضرت جلال لکھنوی مرحوم سے فیض سخن پہنچا ہے، چند غزلوں کا انتخاب درج تذکرہ کیا جاتا ہے، جس سے معلوم ہوگا کہ ہر طرح کے مضامین نظم کرتے ہیں فی الجملہ مہارت ہے:

حل ہوا صبحِ قیامت سے یہ عقدہ ورنہ
کسکو باور تھا شبِ غم کا سحر ہو جانا
جگر اُٹھے کہ ترے کوچہ میں گذریں ہر روز
یاد ہمکو تو ہے اکدن وہ گذر ہو جانا
سُنتے ہیں کعبہ کی تعریف تو یاد آتا ہے
وہ صنم خانہ سے اللہ کا گھر ہو جانا
کسکے جلوے کا ہوں یارب محو دید
کس کا آئینہ ہے حیرانی مری
جو دل لگاتے ہیں دیتے ہیں جان آخر کار
اِس ابتدا کی یہی انتہا نکلتی ہے
یہ کہہ رہی ہے تری چشمِ شوخ خلوت میں
کہ آنیوالی ہے شوخی حیا نکلتی ہے
نشاں اثر کا سرِ عرش تک نہیں چلتا
جو ڈھونڈنے کو ہماری دعا نکلتی ہے
وہ ٹل بھی جائے یہ جاتی ہے جان ہی لیکر
قضا سے بڑھکے کسی کی ادا نکلتی ہے
جزو جزوِ تن نمونہ اضطرابِ دل کا ہے
شوق میرا حوصلہ گویا لبِ قاتل کا ہے
لذتِ ایذا سے ہی کیا کیا خجل پاسِ ادب
لیجئے قاتل کو شکوہ شوخیٔ بسمل کا ہے

شوخیاں بیتاب ہیں اک جلوۂ مستور کی	ٹوٹنا بہتر طلسم ہستئ باطل کا ہے
خلش نے اسکی ربط اتنا بڑھایا اے تغافل خو	کہ دل کو عشق ہے اب تجھ سے بڑھکر تیرے پیکاں سے
سخنور سیکھ لیں او بت سخن گوئی سخندانی	تری چشم سخنگو سے مری طبع سخنداں سے
ترا اقرار بھی رکھتا ہے اک انکار کا پہلو	نہیں سے ہے جو کچھ مطلب ہی مقصود ہے ہاں سے
نماز عید قربان۔ رُخ بسوئے کعبۂ ابرو	وضوئے طفل دل کر پہلے آب چشم گریاں سے
سوال بوسہ سے رعب اور وہ بھی یوں سر محفل	نکلوائیگی اک دن ناصبوری بزم جاناں سے

رعب

رعب منشی محمد علیخان خلف قلندر بخش خان مرحوم ساکن حیدرآباد دکن، آپ کو میرزا ضیا دہلوی گورگانی سے تلمذ حاصل ہے۔ یہ کلام کا نمونہ ہے۔

مستحق رحمت حق کا تو نہیں اے زاہد	ایک دھبہ بھی تو مے کا ترے دامن میں نہیں
جسمیں سب خواب ہوئیں ہوگئے ارمان خیال	اُس کیا پاس بھی اتنو دل ویراں میں نہیں
حور و غلماں میں ہیں جو وصف وہ سب تجھمیں ہیں	تجھمیں جو بات ہے وہ حور میں غلماں میں نہیں
میری وحشت کے لیئے چاہیئے وسعت ایسی	کہیں دنیا میں نہیں حشر کے میداں میں نہیں

رعد

رعد منشی محمد عابد علی بلگرامی مدرس دوم مدرسہ حیدر گڑھ اودھ (۱۸۷۴ء) منشی غلام حسین قدر بلگرامی کے تلامذہ میں سے تھے۔

جس کا دل چاہیں پھنسا لیں وہ انھیں فن ہے یاد	جانتے سارے زمانے کے ہیں منتر گیسو
جو ہی حال رہا انکے اُچکّے پن کا	دل کو لیجائیں گے یہ صاف اُڑا کر گیسو
روز و شب ایک جگہ جسنے نہ دیکھے ہوں کبھی	دیکھ لے جا کے وہ اب رُخ کے برابر گیسو
صحبت یار میں تعظیم و ادب سیکھ گئے	سر سے کھلتے ہیں تو گرتے ہیں قدم پر گیسو

رعد

رعد منشی حب لال صاحب نام، رعد تخلص، قوم سے کایستھ سری واستو ہیں اصل وطن تو موضع ہنڈیا ضلع الہ آباد ہے مگر چونکہ آپکے والد منشی گنیش پرشاد زمیندار نے انکو صرف چار برس کا چھوڑ کر انتقال کیا اس لیئے منشی مادھو پرشاد انکے چچا اور رسائے بہادر منشی انندی پرشاد

ممبر کونسل گوالیار نے جو پھوپا تھے انھیں اپنے کنارِ شفقت میں لیا اور پرورش و تربیت کرتے رہے اِس لیئے تعلیم کا زمانہ زیادہ تر فتح پور ہسوہ میں گذرا۔ ۱۸۹۸ء میں امتحان وکالت پاس کر کے بھنڈ میں وکالت شروع کی۔ اب تقریباً ۳۷ برس کی عمر ہے اور ریاست گوالیار کی طرف سے خاص بھنڈ میں ۱۹۰۸ء سے آنریری مجسٹریٹ ہیں۔ ضروری تعلیم سے فارغ ہیں شعر و سخن کا مذاق سلیم ہے، طبیعت میں جدت پسندی اور بندش شعر میں صفائی ہے اگرچہ کثرت مشاغل زیادہ گوئی کے مانع ہیں مگر جو کچھ کہتے ہیں بہت سلجھا اور عیوب سے پاک ہوتا ہے، اگر حضرت داغ کی زندگی وفا کرتی تو بلا شک انھیں ترقی کے وسائل زیادہ میسر ہوتے تاہم انکی صفائی زبان، مہارت روزمرہ، اور رسائی فکر، نفاست و چستی بندش قابل ستایش ہیں ۱۹۰۲ء میں حضرت داغ سے تلمذ اختیار کیا۔ اُنکے انتقال کے بعد منشی حیات بخش رسا سے مشورہ کرنا شروع کیا، دیوان تقریباً ردیف وار مکمل و زیر ترتیب ہے۔ انتخاب کلام نذر ناظرین ہے۔

مزہ تھا زندگی کا گر مسرت سے جیئے ہوتے
مژہ نے اور نگاہِ ناز نے دلبر ستم ڈھایا
بلا کی دلفریبی ہے نگاہِ ناز میں اُنکی
یہ کیا معلوم تھا حسرت نہ نکلے گی نہ نکلے گی
مرے جاتے ہو کیوں اے رعد آتا ہی وہ دن بھی

یہ کیا جینا ہے مر مر کے جیئے جب نیم جاں ہوکر
وہ خنجر بنکے چلتی ہیں وہ چھبتی ہیں سناں ہوکر
اشارہ پاتے ہی دل چل دیا کیا شادماں ہوکر
یہ سمجھے تھے کہ دل میں آئی ہے یہ مہماں ہوکر
کہ اُنکو تم لگاؤ گے گلے سے شادماں ہوکر

پھر ہے وہ کہنا کہ نہیں ہمسا کہیں اور
دل پھیر دے لیکر یہ کرے کوئی یقین اور
اُسکے ہیں دل جانتی دل جاہے وہ جانان
تم چیز ہی کچھ اور ہو اک حسن پہ کیا ہے
بن ٹھن کے وہ بگڑے ہیں نئی ضد کوئی دیکھے
جلوہ ترا کچھ ناز نہیں دلمیں جو چھپ جائے تو

لو دیکھ لو ہے دلمیں تمھارا سا حسیں اور
جا لیں نگہ ناز کرے جا کے کہیں اور
یہ اُنکے ہیں وہ اِنکے اگر ہیں تو ہمیں اور
ایسے تو زمانہ میں ہزاروں ہیں حسیں اور
مچلے ہیں کہ آئینہ میں ہے ہمسا حسیں اور
تم سمجھے یہاں کھل گیا اے پردہ نشیں اور

جلوہ رخ انور کا دکھا دو دمِ آخر
حسرت ہی مرے سامنے بیٹھی ہیں کچھ دیر

دیوانہ کے منہ حضرتِ ناصح نہ لگیں آپ
وہ شکر کو سمجھے ہیں گلہ وائے مقدّر

دلبر کی جگہ درد رہا کرتا ہے دل میں
کھا کھا کے قسم وصل کا اقرار کرو لاکھ

کیا بات ہے اُس کوچۂ دلدار کی اے رعد

کچھ دہر کی جہان ہے یہ جانِ حزیں اور
ارمان دمِ نزع سوا اسکے نہیں اور

کیا فائدہ دو چار اگر اُسنے کہیں اور
میں نے تو کہا اور ہوا ذہن نشین اور

گھر اور کا تھا ہائے ہوا اُسمیں مکیں اور
اندازِ سخن مجکو دلاتا ہے یقیں اور

ہے آب ہوا اور وہاں کی ہے زمیں اور

چاہنے والے کو اپنے تم بھی چاہو کوئی ہو
ہیں وہ بیخود ہوں نہیں مجکو کسی سے واسطہ

وائے تنہائی یہ حسرت ہے کہ آجائے کوئی
بحث کچھ اپنے پرائے سے نہیں اے ہمنشیں

دل جب اپنا ہی نہیں تو کوئی لیجائے اسے
منہ میں بھر آتا ہے پانی جام مے کو دیکھ کر

یوں ہی رہا جو ربط ترے سنگ در کے ساتھ
دل تھام کر میں بیٹھ گیا اُسکی بزم میں

ویران کر دیا مرے دل کو مٹا دیا
اُٹھتے ہی خواب ناز سے وہ آگئے میرے گھر

دل لے گیا جہاں نہ گذر تھا خیال کا
دل میں جو رکاوٹیں ہیں تو ظاہر میں اختلاط

اے رعد بھولتا نہیں مجکو دم سحر

قدر کے قابل ہے جو دل سے فدا ہو کوئی ہو
دوست دشمن آشنا نا آشنا ہو کوئی ہو

وہ نہیں تو کوئی آفت ہو بلا ہو کوئی ہو
کام آئے وقت پر درد آشنا ہو کوئی ہو

ناز ہو، چتون ہو، شوخی ہو ادا ہو کوئی ہو
شیخ ہو یا متقی ہو۔ پارسا ہو کوئی ہو

مٹ جائیگا نوشتۂ تقدیر سر کے ساتھ
دیکھا تھا اُسنے ہائے مجھے کس نظر کے ساتھ

یوں دشمنی کرے نہ کوئی اپنے گھر کے ساتھ
لپٹا ہوا اثر تھا دعائے سحر کے ساتھ

پہنچے ہیں ہم کہاں سے کہاں راہبر کے ساتھ
ایک ایک عیب اُنکا ہے سو سو ہنر کے ساتھ

پھر پھر کے اُنکا دیکھنا وہ چشم تر کے ساتھ

بڑھ گئی جب خوب حیرانی میری
مٹ گئی ساری پریشانی مری

جلوۂ جاناں کی دیکھی ہے جھلک — یہ پتہ دیتی ہے حیرانی مری
ڈھونڈتی ہے اُسکے رازِ کُنہ کو — کسقدر ہے عقل دیوانی مری
ناصحا مجکو خدا پر چھوڑ دے — تُو مجھے کرنے دے من مانی مری
کیا سوالِ وصل پر اُمّید ہو — بات تم نے کونسی مانی مری
یا نکالو دل کو پہلو سے مرے — یا مِٹا دو یہ پریشانی مری
یہ نہ تھا معلوم ہے وہ بے وفا — دیدیا دِل وائے نادانی مری

آپ سے جب آشنائی ہوگئی — دین و دنیا سے رہائی ہوگئی
کون میری سی کہے گا حشر میں — اُس طرف ساری خدائی ہوگئی
آئینہ سے چار آنکھیں جب ہوئیں — اُنکی آپس میں لڑائی ہوگئی
جب عنایت کی نظر اُنکی ہوئی — مہرباں مجھپر خدائی ہوگئی
ظلم اتنا کیوں کیا جو روزِ حشر — مدعی ساری خدائی ہوگئی
مجھسے کیا مِٹتیں مری دشواریاں — غیب سے مشکل کشائی ہوگئی
اُنکو اب پردہ دری کا ہے خیال — کیوں مرے دل میں صفائی ہوگئی
آگئیں اُن میں لگاوٹ بازیاں — چتونوں میں دلربائی ہوگئی
رعدؔ سے بولے وہ ہنسکر وصل میں — تیری ظاہر پارسائی ہوگئی

نہ پوچھیں میرے ہمدم کیفیت میری مصیبت کی — شبِ غم کی گھڑی ایک ایک گذری ہے قیامت کی
الٰہی خیر کرنا آج پھر لی دل نے وحشت کی — نگاہِ شوخ نے کسکی خدا جانے عنایت کی
بہت بچپائے ہم اُس فتنہ گر سے کیوں محبت کی — یہ کیا بیٹھے بٹھائے جان پر برپا قیامت کی
ترا وہ دیکھ لینا شرمگیں چتوں سے رہ رہکر — مرے دلمیں تڑپ ہو ہو کے رہجانا قیامت کی
نگاہِ ناز نے چُپکے سے آکر دل میں چٹکی لی — تمھاری آنکھ نے پھر دیکھ لو مجھ سے شرارت کی
دِل آیا بھی تو کس ظالم پہ اپنا ہائے دل آیا — محبت بھی جو کی تو کس ستمگر سے محبت کی

نظر آئینہ رو پر پڑتے ہی وہ بے خودی چھائی
دل آیا بھی تو کس ظالم پہ اپنا ہائے دل آیا
کرم اسکا ستم سے بڑھکے دشمن جان کا نکلا
چھپایا تو بہت تھا رعد نے رازِ محبت کو
جو باہر میان سے قاتل تری شمشیر ہو جاتی
کچھ ایسی چارہ گر سے بے تدبیر ہو جاتی
کیا کیا جائے لب تک آکے تو تھم تھم گیا ورنہ
تھمے رہنے مجھیں ہوتے تھیں کس سے جا آتی
اثر اتنا تو ہوتا آہ میں اے داورِ محشر
بھلے کو حضرتِ ناصح نہ آئے سامنے میرے
ہم اٹھتے بھی تو کیا اٹھتے ترے کوچے سے اے ظالم
ہمیں ہم تھے اگر تم دیکھ لیتے ناز سے ہمکو
تجھے کیا اس سے نامہ بر دہاں تک تو گیا ہوتا
وہ روٹھے آج کیوں ہیں کیوں نہیں منتے منالینے
پلٹنی تھی پلٹ جاتی جو پھرنی تھی تو پھر جاتی

سراپا محو ہو کر بن گیا تصویر حسرت کی
محبت بھی جو کی تو کس ستمگر سے محبت کی
مجھے رہ رہ کے تڑپاتی ہیں باتیں وہ محبت کی
نہیں چھپتی نہیں چھپتی نظر لیکن محبت کی
قضا دانتوں میں انگلی داب کر تصویر ہو جاتی
کسی کی خاک پا ملتے تو وہ اکسیر ہو جاتی
فلک تک دھوم تیری نالۂ شبگیر ہو جاتی
تھیں تو دیکھ کر سب انجمن تصویر ہو جاتی
لپٹ کر حشر میں اس بت کی دامنگیر ہو جاتی
ضرور انکی مری باہم دم تقریر ہو جاتی
ہماری ناتوانی پاؤں کی زنجیر ہو جاتی
گھڑی بھر میں ہماری کیا سے کیا توقیر ہو جاتی
اگر آ ئی گئی ہوتی مری تحریر ہو جاتی
مجھے معلوم بھی تو کچھ میری تقصیر ہو جاتی
طبیعت بھی کسی کی کیا مری تقدیر ہو جاتی

رعد مولوی محمد صدیق حسن خان جونپوری، رسالۂ العصر ۱۳ ۱۳ء سے کلام نقل ہوا قدیم وجدید دونوں طرزوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں طبیعت میں درد اور زبان پر خاصی قدرت ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

سنا ہے منتو رہے یہ ہو رہے ہیں باغبانوں میں
جناب شیخ فرمائینگے کچھ باتیں قیامت کی
چارۂ دردِ محبت نہیں درکار مجھے

لگا دو آگ اب کے بلبلوں کے آشیانوں میں
کہو رندوں سے بیٹھیں بگلیاں دیکھے کانوں میں
چھوڑ دیں حال پہ میرے مرے غمخوار مجھے

یاد آئے ہیں جو وہ ابروئے خمدار مجھے
آج ہر چیز نظر آتی ہے تلوار مجھے

میں دکھاتا ہوں جو اُنکو دلِ پُرداغ اپنا
وہ دکھاتے ہیں بہارِ گلِ رخسار مجھے

دِل تو کیا چیز ہے میں جان بھی دیدوں تمکو
تم بناؤ تو سہی اپنا خریدار مجھے

بُت پرستی میں ہوا مجکو یہ تمغہ حاصِل
برہمن بھیجتے ہیں تحفۂ زنّار مجھے

اُسنے پوچھا جو مرا نام تو میں نے یہ کہا
لوگ کہتے ہیں محبت کا گنہگار مجھے

وہ دن اچھے تھے وہ اچھا تھا زمانہ ای رعدؔ
جس زمانے میں نہ تھا عشق کا آزار مجھے

(بانتظارِ پیو) (گیت)

اے حسر تو خدارا مجکو نہ اب ستاؤ
لِلّٰہ لے اُمنگو دل میں مرے نہ آؤ

پھر خدا نہ چھیڑو بیوہ ہوں رحم کھاؤ
بس بس سنگار کی اب ترغیب مت دلاؤ

اُترا ہوا سا چہرہ کیا آرسی میں دیکھوں
مغموم شکل اپنی میں کس خوشی سے دیکھوں

ہمجولیوں میں جاتے آتی ہے شرم مجکو
ساتھ اُنکے گیت گاتے آتی ہے شرم مجکو

ہنسکر اُنھیں ہنساتے آتی ہے شرم مجکو
اب اُنکو گدگداتے آتی ہے شرم مجکو

کاشانۂ الم میں اِک گوشہ گیر ہوں میں
کنجِ قفس میں گویا مرغِ اسیر ہوں میں

رعدؔ ‒ حکیم میر نادر علی رعدؔ مقیم حیدر آباد دکن نبیرۂ حضرت شہید دہلوی مرحوم ۔ شاہ نصیر کا دیوان انھوں نے چھپوا دیا ہے اور فن تاریخ میں کتاب موسوم بہ گنجینۂ خیال خوب لکھی ہے

پیشِ نظر ہے چہرہ جو اُس بے نقاب کا
اے بخت جانتا ہوں کہ عالم ہے خواب کا

ایسا نہ ہو کہ دُور رہو یہ تشنۂ ازل
ساقی پلا دے پھر کوئی ساغر شراب کا

رعناؔ ‒ سید محمد حمید الدین باشندۂ رائے بریلی و سررشتہ دار نظامت حال صدر ریاست ٹونک ، بیس برس ہوئے جس زمانہ میں حضرت ظہیر دکن نہیں گئے تھے اور ابھی ٹونک میں ملازم تھے آپنے اُن سے اصلاح لینی شروع کی ۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ۔

دعویٰ ضبطِ محبت تھا تو کیوں فریاد کی
اے دلِ بیتاب سب محنت مری برباد کی

چارہ گر رگ رگ میں ہے یاں کاوشِ خارِ الم
کس کا درماں کیا ضرورت نشترِ فصاد کی

کونسا رشکِ چمن زیبِ چمن ہے ان دنوں
گل کی شاکی بلبلیں ہیں قمریاں شمشاد کی

رعنا منشی عاشق حسین صاحب لکھنوی، مشہور ناولسٹ اور ایک شوخ طبع سخنور تھے بہت سے ناولِ آپکی تصنیف سے شائع ہو چکے ہیں، عرصہ ہوا ایک رسالہ شعر و سخن موسوم بہ "گلدستہ رعنا" نکالا تھا جو دو برس بعد بند ہو گیا۔ کئی برس ہوئے انتقال کر گئے، اُن کا کلام یہ ہے۔

تھامے ہوئے کلیجے کو آئے ہو لیے طلب
کیوں پھر کہو گے آہ میں تیری اثر نہیں

پہلو میں آکے بیٹھے تھے اتنا تو ہوش ہے
دل کب وہ لے گئے مجھے مطلق خبر نہیں

رعنا منشی عبد الغفار دہلوی تلمیذ حضرت جبین

بیوفا، نا آشنا، بیباک، بدخو، خود غرض
اور بھی کہہ لو مجھے جو کچھ تمہارے دل میں ہے

عشق کی چوٹیں ہیں کھائے ہوئے برسوں ہوئے
گو نہیں ہے درد وہ لیکن کسک کچھ دل میں ہے

ٹالا نہ تو نے غیر کا ظالم کہا کبھی
منظور ہو ہماری بھی تو التجا کبھی

یہ جان لو کہ ہاتھ اُٹھانے کی دیر ہے
خالی گئی نہ جائیگی اپنی دعا کبھی

جیتے رہے ہیں ہجر میں ہم اس اُمید پر
ایسا بھی کیا ہے مان ہی لینگے کہا کبھی

پھر اس "نہیں" کا لطف دکھا دینگے آپکو
سُن لی اگر خدا نے ہماری دعا کبھی

رعنا سید محمد ہاشم رعنا دہلوی منصبدار حیدر آباد دکن جوان آدمی ہیں سنہ ۱۹۰ء میں آپنے آغا شاعر دہلوی سے تلمذ اختیار کیا، اُسی زمانے کا یہ کلام ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ اُستاد کی زبان اور رنگ کی تقلید میں اچھی دستگاہ حاصل کر لی تھی، غزل میں بعض بعض شعر تو نہایت اچھا اور بلند پایہ کا نکل آتا ہے۔ اب اشعار ملاحظہ ہوں۔

وہ ہو لیاں کھیلی ہیں تری تیغ زنی میں
جوبن پہ ہیں سب خون کے دھبّے کفنی میں

رہتا ہے سدا وصل میں بھی ہجر کا دھڑکا
کیا یار ہے جو ساتھ ہے بگڑی میں بنی میں

تیری دُہائیاں ہیں گئے ہم جہاں کہیں
ناقوس کی صدا کہیں بانگِ اذاں کہیں

قاصد سمجھیو اُس کا نہیں ہے مکاں کہیں
اُٹھکر زمین پاؤں پکڑ لے جہاں کہیں

اک چیز ہے کہ دل میں کھٹکتی ہے بار بار
سوفار کا پتہ نہ نشانِ سناں کہیں

محشر میں بھی تڑپتی ہیں نظروں کی بجلیاں
بجلی نہ بیٹھیں تھک کے تری شوخیاں کہیں

پس مردن انھیں مرقد پہ آہِ نارسا لائی
یہ آپ پہنچے تو کیا پہنچے یہ اب لائی تو کیا لائی

نوید وصل ہی لائی نہ پیغامِ قضا لائی
دعائے بے اثر کیا لے کے پلٹی اور کیا لائی

وہ سب بدمستیاں تھیں زر کی اب ہم ہی نہ پیتے ہیں
ہماری مفلسی خود راہ پر ہم کو لگا لائی

مہکتے ہیں در و دیوار کیا خوشبو ہے پھولوں کی
نسیمِ صبح گلدستے کے گلدستے اڑا لائی

اب اس سے بڑھ کے آخر کیا کشش ہوگی مضامیں کی
زمیں تا طبعِ موزوں آسمانوں کو جھکا لائی

قدم رکھتا کہیں ہوں اور پڑتا ہے کہیں رعنا
نگاہِ لطفِ ساقی وہ ہی ساغر میں چھلکا لائی

میں بگولا بن کے کوئے یار میں پھرتا رہا
لاکھ تو نے اے صبا مٹی مری برباد کی

دیکھ تو قمری ذرا سروِ لبِ جو کی بہار
موج کی ہیں بیڑیاں قسمت میں اس آزاد کی

بارِ عصیاں سر پہ، جانا دور ہیں نادیدہ راہ
منزلیں کھوٹی نہ ہوں رعنا عدم آباد کی

رعنا

رعنا منشی سید نور احمد لکھنوی، کلیم لکھنوی کے بھائی اور ۱۹۳۳ء میں بھوپال میں ملازم تھے۔ مدتوں وہیں رہے حضرت تسلیم سے کچھ دنوں اصلاح لینے کے بعد انکے استاد بھائی راز رامپوری کے شاگرد ہوگئے۔ چند غزلوں کا انتخاب حاضر ہے۔

حاصل ہے وصل میں بھی مزا انتظار کا
پہروں مزاج ہی نہیں ملتا ہے یار کا

اندھا بنا دیا مجھے شوقِ تلاش نے
دشمن سے پوچھتا ہوں پتہ کوئے یار کا

کیسی تڑپ کہاں کی چمک کس کی بجلیاں
یہ بھی ہے ایک رنگ دلِ بیقرار کا

حسرت کی شکل پھرتی ہے آنکھوں کے سامنے
پہلو جو سوچتا ہوں کوئی وصلِ یار کا

رکھا ہوا ہے سینہ پہ خط اُنکا دیر سے
تعویذ بن گیا ہے دلِ بے قرار کا

پکڑے گئے ہیں پیتے ہوئے مے جنابِ شیخ
میلا لگا ہے پیرِ مغاں کی دکان پر

کیا بانکپن کسی کا سمائے نگاہ میں
ہم تو مٹے ہوئے ہیں تری آن بان پر

کہتے ہیں وہ کہ جان تو ہم ہیں رقیب کی
خدا کی شان کہ جھوٹے بھی یہ کہیں ہم سے

کیوں یہ کہا کہ صبر پڑے اُس کی جان پر
تمھاری بات نہیں اعتبار کے قابل

تری رفتار کی شوخی جو دیکھی
غضب ہے دل جلے اور جسم ہو سرد

قیامت گر گئی میری نظر سے
کہ باہر برف اندر آگ برسے

ہنس ہنسکے کوئی آج مجھے کوس رہا ہے
ہمدردی کی اُمید ہے کیوں اہجر ہیں دل سے

پڑ جائے اثر اُس کا عدو پر تو مزا ہے
دشمن بھی کسی کا کہیں غمخوار ہوا ہے

نہ قہقہے نہ تبسم نہ یہ ہنسی ہوگی
دل آپ کا کہیں آیا تو دل لگی ہوگی

رغمی

رغمی۔ ناظم و ناثر کہن سال نکتہ رس بے نظیر مولوی عظیم اللہ رغمی سید پوری شاگرد رشید شیخ ناسخ لکھنوی غازیپور زمانیہ کے رؤسا میں سے تھے انکے والد شیخ امان اللہ طوفان ناسخ مرحوم کے دلی دوست و رفیق تھے یہ خود بڑے مشاق اور صاحب تصانیف کثیرہ تھے، اوائل سن تمیز میں الہ آباد اور لکھنو جا کر تحصیل علم کی، اسّی برس سے زیادہ عمر پاکر چار پانچ سال ہوئے انتقال کیا شیخ ناسخ کے حالات شمس العلماء آزاد کو آپ ہی کی وساطت سے دستیاب ہوئے تھے، ایام ضعیفی میں بھی برابر مشغلۂ سخن کو نباہے جاتے تھے۔ رغمی تخلص سے آپکی شاعری کا ابتدائی سال نکلتا ہے۔ بڑے جہاں دیدہ، قابل، طباع، خلیق بزرگ تھے، بڑی وقت سے چند غزلیں ہاتھ آئیں اُنکا انتخاب درج تذکرہ کیا جاتا ہے۔

نرگس کی طرح مجکو نہ صحت ہوئی نصیب
ساغر کی مے کی شیشہ کی حاجت نہیں رہی

میں عشق چشمِ یار میں بیمار ہی رہا
میں عشق چشمِ یار سے سرشار ہی رہا

ہاتھ مہندی سے ترا غیرتِ مرجاں ہوتا
ہاتھ میں تیرے اگر خنجرِ بُرّاں ہوتا

پاؤں میں خونِ حنا رنگِ شہیداں ہوتا
عید قرباں کا سماں آج مری جاں ہوتا

جب بنا کر زلفِ مشکیں اپنی وہ نکھرائیں گے
قتل وہ کرتے تو ہیں لیکن بہت پچھتائیں گے

سو بلا عاشق کے سر پر آسماں سے لائیں گے
عاشقِ جانباز ایسا پھر کہاں سے لائیں گے

لاکھ جانیں ہوں مری اُسکی کھٹک پر صدقے	خارِ مژگاں کو مرے دل میں چُھپا رہنے دے
خونِ عشاق نہ کر ہاتھ دکھا کر قاتل	شوخی اتنی نہ کر اے رنگِ حنا رہنے دے
وصل کی رات ہے ہنس بول ذرا گھونگٹ کھول	ابتو زعمی سے نہ کر شرم و حیا رہنے دے
جلوے دکھلا دو اپنے قامت کے	لوگ مشتاق ہیں قیامت کے
بزم میں بیٹھے مجھ سے وہ مِل کے	آج ارمان نکلے ہیں دل کے
نیچے آئے عروس تیغ اُن کی	خوب ارمان نکلیں گے دل کے
مشعلِ وادیٔ ایمن ہے فراست میری	طبع ہے طور تجلی ہے ہدایت میری
لطفِ معنی سے ہویدا ہے لطافت میری	بندشِ لفظ سے ظاہر ہے نزاکت میری
آئینہ دیکھ کر وہ کہتے ہیں	ہمتو عاشق ہیں ایسی صورت کے
عیش ہوویگا تلخ شیریں کا	کوہکن کا نہ وہ فسانہ سُنے
ہے یہی آرزوئے دل میری	ایک شب وہ مرا فسانہ سُنے
حُسن اور عشق و محبت کا تقاضا ہے یہی	ہم فراموش ہوں اور غیر ہمیں یاد رہے
دُنیا میں رہے ساتھ ولیکن پس مُردن	چھوڑ آئے ہمیں قبر میں سب اپنے پرائے
ناسخ کے تلمذ سے مجھے فخر ہے زعمی	پھر وہ ہر میں ویسے نہ سخنور نظر آئے
چلتی ہے مرک مرک کے گردن پر جو شرمائی ہوئی	چال ہے یہ تیغ کو قاتل کی سکھلائی ہوئی

رفاقت

رفاقت مرزا مکین دہلوی نام اور شیخ قلندر بخش جرأت کے تلامذہ خوش فکر میں انکا شمار تھا۔ ۲۰ برس کی عمر عین عالم شباب میں اپنے احباب اعزا کو داغ مفارقت دیکر عالم جاودانی کو سدھارے اُنکی خوش فکری کا نمونہ یہ چند شعر حاضر ہیں۔

وہاں کیونکہ رہیئے کہ منادی جہاں یہ ہو	زانو پہ سر کو دھر کے نہ بیٹھا کرے کوئی
برسوں کی ایک دن میں رفاقت کو چھوڑ دے	کیا ایسی زندگی کا بھروسا کرے کوئی
کہتے ہو تم نہ گھر مرے آیا کرے کوئی	گر دل نہ رہ سکے تو بھلا کیا کرے کوئی

لے فرش گل پہ غیر کو بیٹھاؤ اپنے پاس	منظور ہے کہ خاک پہ سویا کرے کوئی

رفاقت

رفاقت - شیخ بہادر حسین صاحب شاگرد میر آغا حسن امانت غدر کے بارہ سال بعد انتقال کیا۔ لکھنو وطن تھا، حالات کے لئے بہت تلاش کی دستیاب نہوئے نہ کچھ زیادہ کلام ملا

نہیں تم کو جب ہم صنم دیکھتے ہیں	تن اپنے میں دم دم کا دم دیکھتے ہیں
طاقت نہیں ہے پھر نیکی ہیہات پاؤں میں	پہلو سے اپنے یار مجھے تو اٹھا نہیں
تقدیر میں لکھا تھا سوا ئے جان من ہوا	قسمت سے ہے گلہ ہمیں تم سے گلا نہیں
ہرگز کسی سے دل نہ رفاقت لگائیو	بحر جہاں میں دیکھ چکے آشنا نہیں

رفعت

رفعت - لالہ رام دلدرا، آپ کو مرزا رحیم الدین حیا دہلوی سے تلمذ تھا۔ تذکرہ قاضی خلیل سے کلام نقل ہوا۔ غدر کے بعد انتقال کر گئے۔

زندگی خضر و مسیحا کی نہ کیونکر ہوتی	روگ م الفت کا نہ تھا عشق کا آزار نہ تھا
آفت ہے گو کہ فتنۂ روز جزا مگر	کیا سر اٹھائیگا تری ٹھوکر کے سامنے

رفعت

رفعت نواب مہدی حسن خان رفعت لکھنوی عرف میو صاحب نواب محمد سعید خان لکھنوی کے خلف متبنیٰ اور وارث ہیں حضرت جلال لکھنوی کے قدیم تلامذہ میں صاحب دیوان اور ہر طرح ممتاز ہیں ۱۸۵۸ء سال ولادت ہے، صاحب دیوان ہیں، کہیں کہیں استاد کے کلام کا پرتو انکے کلام میں نظر آجاتا ہے۔

بلبلیں ضیتی تھیں تنکے خاک اڑاتی تھی صبا	جسکو دیکھا باغ عالم میں ترا دیوانہ تھا
کیا چیز حسن بھی ہے عجب انقلاب ہے	محمود دل کو دیکھے غلام ایاز تھا

اچھا ہوگا یا نہ بچے گا مریض عشق مسیح	خدا کیواسطے کچھ تو جواب دیتا جا
سینے سے سینہ یار نے آکر لگا دیا	سوز جگر کو دل کی لگی کو بجھا دیا
یارب بھلا ہو اس مرے غفلت شعار کا	جو لے گیا قرار دل بے قرار کا
بیتاب جو ہیں حضرت دل جائینگے پھر کیا؟	روٹھے ہوئے کو اپنے منا لائینگے پھر کیا

ہوا بہتر نہ اُلٹا پردۂ محمل جو لیلیٰ نے
جو مجنوں دیکھ لیتا اور بھی دیوانہ ہو جاتا

پرواز ہوئی روح جو بلبل کے بدن سے
پھر قید تھی صیاد کی باقی نہ قفس تھا

میں جو کہتا ہوں کہ ظالم ہو بڑے تم بخدا
ہنس کے کہتے ہیں بھلا

کون معشوق زمانے میں دل آزار نہیں
ہم بھی کرتے ہیں جفا

تفرقہ تو نے جو اے چرخ نہ ڈالا ہوتا
کیوں خفا مجھ سے مرا روٹھنے والا ہوتا

زانو پہ اُسکے سر ہو نکل جائے اپنا دم
جو دیکھے وہ کہے کہ ہے اِس کا بھی کیا نصیب

قیامت چال، قد محشر، ستم عشوہ، نگہ خنجر
جوانی ظلم کرتی ہے شباب اُنکا ہے جوبن پر

دل میں یاں چٹکی خیالِ بوسہ لے
نیل پڑ جائے وہاں رخسار پر

نکلے ادھر تو جان اُدھر بخشدے وہ جرم
بس ہے یہی کسی کے گنہگار کی ہوس

جو نہ تڑپے ہجر میں بسمل نہیں
درد جس دل میں نہ ہو وہ دل نہیں

صراحی مے کی دستِ پارسا میں
بڑا اندھیر ہے کالی گھٹا میں

شرم کے پردے میں رہنے دو نگاہِ شوخ کو
یہ سمجھ لو جب کے آنکھوں سے حیا آتی نہیں

ہر ادا پہ مرنیوالوں سے اشارے کہہ گئے
دیکھتے ہیں آج کس کی قضا آتی نہیں

چشمِ تر دیتی ہے پانی اُسے میری لیکن
نخلِ اُمید کبھی پھولتا پھلتا ہی نہیں

مسیحا ایک قُم کہنے پہ اپنے ناز کرتے ہیں
یہاں ٹھوکر سے یہ بُت سینکڑوں اعجاز کرتے ہیں

اگر سُن لیں تری رفتار کی آہٹ قیامت ہو
تڑپ کر زندہ ہو جائیں ابھی مردے مزاروں میں

دل یہ کہتا ہے چلو پاس مسیحا کے چلو
ضبط کہتا ہے ابھی دردِ جگر ہونے دو

آئینگے میری لاش اُٹھانے کو وہ ضرور
کچھ وعدۂ وصال نہیں جو وفا نہ ہو

ناراض ہو وہ بُت تو منا لونگا پھر بھی میں
مجھ سے مگر خفا کہیں میرا خدا نہ ہو

جوشِ خوں کا ماجرا کہنا ہے اسکو اے جنوں
ڈھونڈتی ہے رگ زبانِ نشترِ فصاد کو

وہ شکل کونسی ہے جو دل کو قرار ہو
یا موت آئے یا مرے پہلو میں یار ہو

مرے پہلو سے اُٹھکر میرے جاں جاتے تو ہو لیکن
مر کے زندہ ہو گئے عاشق خدا کی شان ہے

بھلا یہ تو کہو کچھ دل کو بھی سمجھائے جاتے ہو
آ گئی صبح قیامت بھی شبِ ہجراں کے ساتھ

کوئی کشتۂ حسرت اُٹھ بھی گیا
جلے دل کا پھوٹا کوئی آبلہ
ترا کشتہ تڑپا کیا دیر تک

اب آئے ہو تم ہاتھ ملتے ہوئے
جو آنسو نکلتے ہیں جلتے ہوئے
ترا دل جو دیکھا بہلتے ہوئے

پیوستو اگھٹا چھائی ہے پانی خوب برسے گا
آنکھیں دکھا کے اے مرے عیسیٰ چلے گئے
جاں کنی ہے دیکھ جاؤ تم ہیں دم اٹکا ہے اب

گنہگاروں پر اُس کی آج رحمت ہونیوالی ہے
اچھے جو ہو چلے تھے وہ بیمار رہ گئے
پھیرتے ہو آنکھ نا حق اک نظر کیواسطے

بلبل نہ بجھا آنسوؤں سے آتشِ گل کو
جان تک کام جو آتی تو نہ ہوتا کچھ عذر

کیا پھونکنے کو خانۂ صیّاد نہیں ہے
دل ہے کیا چیز جو ہم آپسے پیار کرتے

پوچھے کیا ناتوانِ فرقت کا
قتل ہو جاؤ نگا میں خود صاحب
دل لگی جانیئے نہ عشق مرا

آپ لاشہ اُٹھائیے تو سہی
آپ بیڑا اُٹھائیے تو سہی
دل کسی سے لگائیے تو سہی

نہ وہ دل ہا نہ وہ آنکھ ہی وہ نگاہِ لطف کدھر گئی
دی صدا دل نے وہ پہلو سے مرے جب اُٹھے
نکلتے دیکھتے ہو دم تمھارا دل بہلتا ہے

یہ بتائیے تو مجھے ذرا کدھر آپکی وہ نظر گئی
میں بھی تیار ہوں ساتھ آپکے چلنے کے لیئے
بھلا ہو سخت جانی کا مرا ارمان نکلتا ہے

کس سے دوں حسن کو تیرے تشبیہ
روگ نرگس کا نہیں جانے کا

ایک یوسف ہے وہ بازاری ہے
اُلفتِ چشم کی بیماری ہے

رفعت

رفعت سخنورِ خوش فکر شاہزادہ مرزا پیارے رفعت گورگانی سنہ ۱۲۴۱ھ میں پیدا ہوئے اوائل عمر میں حافظ عبدالرحمن خان احسان سے اِصلاح لی تھی، بعد میں حضرت صہبائی سے تلمذ اختیار کیا، بڑے نامور اور خوش فکر شاعر تھے، اشعار انکے نہایت

شیریں اور عمدہ ہوتے ہیں، صاحبِ دیوان تھے، غدر کے بعد الور سے جو شاہزادے گرفتار ہو کر آئے اُن میں یہ بھی تھے نشانۂ تفنگِ اجل ہوئے، کلام ملاحظہ ہو:

ہم خوش تھے کہ محشر میں تو دیکھینگے وہ دیدار
لیکن یہ قیامت ہے کہ محشر نہیں ہوتا

کس منہ سے کروں دل کی شکایت کہ بُرا ہے
تجھ سے تو جدا وہ کبھی دم بھر نہیں ہوتا

ہو بُرا بیتابیٔ دل کا کہ اُسکے ہاتھ سے
رازِ پنہاں ایک عالم پر نمایاں ہو گیا

یا الٰہی درد کس پردہ نشیں کا تھا کہ شب
دل میں اُٹھ اُٹھ کے مرے دل ہی میں پنہاں ہو گیا

مژہ کو چھیڑے تو مدت ہوئی پہ یہ اب تک
چُبھے ہے خار سا سینہ کے درمیاں کیسا

خدا نہ کردہ کرے نالہ گر ترا عاشق
تو پھر زمیں یہ کیسی یہ آسمان کیسا

کچھ آنکھ کا گیا نہ گیا کچھ خیال کا
مارا گیا دل اور یہی بے قصور تھا

رحم اُس کا ہو کہ نالہ کا اثر ہو کچھ ہو
نزع میں بارے وہ لینے کو خبر آ ہی گیا

تھا ہدف غیر پر اپنا جو مقدّر تھا درست
غلط انداز سے وہ تیر ادھر آ ہی گیا

تری گلی میں ہوئے خاک بھی تو کیا حاصل
ترا ہے ڈھب وہی دامن اُٹھا کے آنیکا

ہیں ایک وہ بھی کہ اُن سے ہے تمکو ناز و نیاز
اور ایک ہم ہیں کہ منہ تکتے ہیں زمانے کا

شبِ وصال میں دیتا ہے لطف کیا کیا کچھ
ہر ایک بات پہ عالم یہ منہ بنانے کا

کم ہو گئی شاید بت و بتخانہ کی اُلفت
کچھ ان دنوں آتا ہے جو رہ رہ کے خدا یاد

بیٹھ اے تیرِ ستمگر تو دلِ زار کے پاس
بیٹھنے یار ہیں دنیا میں سدا یار کے پاس

ہائے پانی بھی چوانے کو نہ آیا دمِ مرگ
کوئی جز گریۂ حسرت ترے بیمار کے پاس

تجھکو لینی ہے تو لے ورنہ اجل لیتی ہے
جان جو کچھ کہ ہے باقی ترے بیمار کے پاس

آتشِ عشق سے جل جل کے بنا ہوں سُرمہ
کوئی دن کو تری آنکھوں میں آ جاتا ہوں

لب ہیں جاں بخش یہ کیسے کہ میں اُنکی خاطر
اپنے جینے سے ہی مایوس ہوا جاتا ہوں

پونچھے اشک اُسنے گمانِ غیر میں
مر گئے ہم اتنے ہی احسان میں

جان اجل کو دینگے اب جھگڑے کے ساتھ	تو ہے جو دید میں تجھے ایک آن ہیں
بدنامی مجکو تیری بدولت ہوئی تو ہو	عزت سمجھتا ہوں مجھے ذلت ہوئی تو ہو
اب اُن میں ظلم کرنے کی عادت نہیں رہی	جب ہم میں سانس لینے کی طاقت نہیں رہی
ناصح بھی کرنے چاک گریبان کو لگے	باقی جب اُن کو جائے نصیحت نہیں رہی
پہلے ہی وہ لکھے ہے کہ میں تو ہوں بیوفا	تحریر میں بھی جائے شکایت نہیں رہی

رفعت

رفعت تخلص محمد منیر الدین نام شہر گھاٹی ضلع گیا وطن خلف مولوی سید فضل حسن آزاد مرحوم و برادرزادہ سید غلام حسین فریاد شاگرد نسیم دہلوی، فارسی عربی کی خاص استعداد تھی عجز و انکسار آپ کا شیوہ تھا، شاعری کی ابتدا تھی اور خواجہ عبد الرؤف صاحب عشرت لکھنوی سے تلمذ تھا کہ بتیس سال کی عمر میں بعارضۂ طاعون ۱۳۱۹ھ میں انتقال کیا انکے ایک عزیز نے سو ڈیڑہ سو شعر بھیجے جن کا انتخاب درج ذیل ہے۔

فراقِ یار میں بے چین ہو کر	پہنچ جاتے ہیں نالے آسماں تک
مئے گلگوں چڑہانا خوب رندو!	یہی پہنچا ئے گی حورِ جناں تک
کسی پہلو نہیں ہے چین رفعت	اُٹھاؤں صدمۂ فرقت کہاں تک
یہ نہ پوچھو کہ غذا عاشق بسمل کی ہے کیا	لختِ دل کھاتے ہیں اور خون پیا کرتے ہیں
وعدۂ وصل انھیں یاد دلائیں کیونکر	ایسی باتوں کو ذرا کم وہ سُنا کرتے ہیں
ان بتوں کو نہیں محشر کی خبر اے رفعت	ظلم اللہ کے بندوں پہ کیا کرتے ہیں
یہ ترا حسن خداداد ہے مشہور جہاں	شور یوسف کا فقط مصر کے بازار میں ہے
ترا عاشق تجھے بھولا کہاں ہے	ترا ہی نام تو وردِ زباں ہے
مجھے امید جینے کی کہاں ہے	لبوں پر یار کی فرقت میں جاں ہے
فلک کا جبکہ عالم کو گماں ہے	ہمارے داغِ دل کا وہ دھواں ہے
اگر صورت دکھائی ہو تو آؤ!	کہ اب بسمل تمھارا نیمجاں ہے

ادھر آؤ تو دیکھیں لب تمھارے | کسی کا خون ہے یا رنگ پاں ہے
نہ پوچھو ماجرائے یار ہم سے | کبھی ناخوش کبھی وہ مہرباں ہے
بسر کیونکر کریں ہم اس چمن میں | جہاں دشمن ہمارا باغباں ہے

رہا کرتا ہے خالی ان دنوں پہلو مرا دل سے | نکل جاتی ہے اس ناقہ کی لیلی اپنے محمل سے
ملیں گے پھر نہ ایسے لوگ یہ صحبت غنیمت ہے | کہا مانو نہ جاؤ شیخ جی رندوں کی محفل سے
لگائی تیغ بھی منہ پھیر کر سفاک نے مجھ پر | نہ نکلی حیف وقت قتل بھی حسرت مرے دل سے
اثر ہے بعد مرنے کے یہ باقی چشم گریاں کا | ٹپک پڑتا ہے جو ساغر بنانے ہیں مری گل سے
بٹھایا بیٹھکر پہلو میں ہمکو یار نے رفعت | اٹھایا اٹھ کے اپنے سامنے غیروں کو محفل سے

رفعت

رفعت ۔ سید عنایت احمد رفعت خلف حضرت فطرت موہانی ۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ۔

کھیل سمجھے تھے دل لگی دل کی | قدر جانی نہ تھی ابھی دل کی
جلوۂ یار کیا قیامت تھا | روز افزوں ہے بیکلی دل کی
شوق دیدار تھا بہت لیکن | بیخودی سے نکل سکی دل کی
جوش حسرت نے کر دیا مجبور | کچھ نہ ہم کہہ سکے لگی دل کی
ہو کے مغلوب خرمی رفعت | کچھ عجب کیفیت ہوئی دل کی

رفعت

رفعت ۔ منشی محمد داؤد صاحب خوجہ متوطن بمبئی حضرت امیر مینائی مغفور کو کلام دکھلایا ہے اردو کا مادری زبان ہونیکے باوصف اچھا مذاق ہے اور شعر بھی خاصہ کہہ لیتے ہیں ۔

تذکرہ لکھے کوئی زلف کے دیوانوں کا | کاش شیرازہ بندھے یونہیں پریشانوں کا
عہد میں اس بت سفاک عدوئے دیں کے | خون ارزاں ہے حنا سے بھی مسلمانوں کا
مانا حسن کو بے مثل ترے اے کافر | ہندؤوں کا ہے دھرم دین مسلمانوں کا
شور بختی اسے کہتے ہیں کہ ہو کر زخمی | دیکھنے پائے نہ ہم منہ بھی نمکدانوں کا
آئینہ دیکھ کے منہ پھیر لیا کیوں صاحب | اس میں نقشہ تو نہیں آپکے حیرانوں کا

رنگِ وحدت جما تصور سے — میری صورت ہے ہو بہو تیری
ہوتے رہتے ہیں پہروں راز و نیاز — رکھ کے تصویر روبرو تیری
دل سے بھی داغِ دل ہیں مجکو عزیز — آتی ہے اِن گلوں سے بُو تیری
اشکِ خجلت کی قدر کرلے دل — کر رہے ہیں یہ شُست و شو تیری

قتل ہونے پر دوبارہ قتل کا ارمان ہے — ذبح اِس انداز سے تم نے کیا قاتل مجھے

رفعت

رفعت منشی سرفراز علیخان باشندۂ بریلی، پہلے جناب رحمت بنارسی سے اصلاح لیتے تھے جب کچھ استعداد حاصل ہوگئی تو حضرت داغ مرحوم کی خدمت میں آئے خوش فکر موزوں طبع، شوخ خیال ہیں، زبان سے خاصہ لگاؤ ہے اکثر رسالوں میں غزلیں چھپتی رہتی ہیں

نزع میں یار سے مہماں میرا — دم نکلتا ہے کہ ارماں میرا

شہیدِ ناز کی آنکھیں کھلیں ہیں قبر میں بھی — ہے انتظار یہاں بھی کسی کے آنے کا
رہ رہ کے کھٹک ہجر کی شب ہوتی ہے ظالم — دل میں تری حسرت ہے کہ کانٹا ہے جگر میں
اب دونوں کی بر آئیں مرادیں تو مزا ہو — دل انکی نظر میں ہے وہ ہیں میری نظر میں
اُس دستِ حنائی نے تو اور آگ لگا دی — سمجھا تھا کمی ہو گی مرے سوزِ جگر میں
بھلا راحت کہاں تقدیر میں ہم غم نصیبوں کی — اگر ہوں شادماں دم بھر رہیں اندوہگیں سو سال
زاہد نہ چھیڑ اسکو زیادہ یہ خوف ہے — کچھ اور روٹھ نہ جائے دلِ بادہ خوار میں
بلبل نے دیکھکر ترے رخسار یہ کہا — ایسے بھی پھول ہیں چمنِ روزگار میں

الٰہی ایک مٹ جائے تو اک داغ اور پیدا ہو — چراغِ خانۂ دل حشر تک میرا نہ ٹھنڈا ہو
نہیں اک بوسۂ رخ دینے میں انکار بس سو سو — سمجھکر سوچکر دل میں ذرا دلکا تقاضا ہو
تری محشر خرامی اک نہ اک دن قہر ڈھائیگی — عجب کیا ہے قیامت وقت سے پہلے ہی برپا ہو
تڑپنے کا مزا یہ برق اور سیماب کیا جانیں — یہ اُسکے دل سے پوچھا چاہیے جو تم پہ شیدا ہو
نظر سے قتل کرتے ہیں وہ ٹھوکر سے جلاتے ہیں — جو قاتل ہو تو ایسا ہو مسیحا ہو تو ایسا ہو

یہ کیا آغازِ الفت ہی میں تم گھبرا گئے رفعت
ابھی تو دن پڑے ہیں دیکھئے انجام میں کیا ہو

شان و شوکت سے غرض کیا کام بیہوشی سے ہے
جام جم مجکو مرا ٹوٹا ہوا پیمانہ ہے

بعد اُسکے میں ہوا ہوں مالکِ اقلیمِ عشق
اب مرے قبضہ میں رفعت قیس کا ویرانہ ہے

کیا جانے کہاں اب دلِ دیوانہ ہے اپنا
پہلو میں نہیں یار کی محفل میں نہیں ہے

اے قیس کہاں ڈھونڈنے جاتا ہے سوئے دشت
لیلیٰ ترے دل ہی میں ہے محمل میں نہیں ہے

جو داغ مرے دل کو ملا عشق میں رفعت
لالہ میں نہیں ہے مہ کامل میں نہیں ہے

دل پہ قابو نہ رہے ہوش ٹھکانے نہ رہیں
سامنے میرے اس انداز سے آئے کوئی

ہنستا ہے دیکھ کے بسمل کا تڑپنا قاتل
جان سے جائے کوئی لطف اُٹھائے کوئی

ہوئیں پوری مرادیں مدعی کی
نہ نکلی کوئی حسرت میرے جی کی

تری آنکھوں کے جادو کے مقابل
نہیں کچھ اصل سحرِ سامری کی

وہ دو ہی باتوں میں دل لیگئے ہائے
نہ جانے کونسی افسوں گری کی

یئے جاتی ہے دنیا سے عدم کو
تمنا شیخ جی کو حور ہی کی

وہ ملتے ہیں تو یوں ملتے ہیں مجھسے
شناسائی نہیں گویا کبھی کی

کروں میں بے وفائی یہ نہ ہوگا
برائی میرے حق میں تمنے کی کی

ہمارے حال کے پرساں وہ کیوں ہوں
انھیں ہے یاد ہر دم مدعی کی

کہا جب میں نے مرتا ہوں تو بولے
کہی یہ بات تو نے میرے جی کی

نگاہِ یار بھی ہے کیا زمانہ
کسیکی دوست ہے دشمن کسیکی

نہ آیا راہ پر وہ شوخ رفعت
کریں کیا ہمنے تو کوشش بڑی کی

اپنی تصویر ہی بھجوا دو تسلی کے لیئے
تمھیں انکار اگر ہے مرے گھر آنیسے

داستانِ غم و اندوہ کہانی ٹھیری
نیند آجاتی ہے اُنکو مرے افسانے سے

شہادت کے بہت خواہاں ہیں تیغ نازِ قاتل سے
عطا اب دیکھئے کسکو یہ دولت ہونیوالی ہے

رفعت

رفعت مولانا غلام جیلانی، گیلانی۔ بیاضِ قاضی خلیل سے کلام لیا گیا۔

جوں شمع اگرچہ بے زباں تھے
پرسوز تمام کہہ گئے ہم

کچھ نہیں ہم ہیں بغیر از دلِ سوزان رفعت
پیرہن صورتِ فانوس نظر آتا ہے

رفیع

رفیع مرزا محمد طاہر صاحب خلف و شاگرد حضرت اوج لکھنوی نبیرۂ مرزا دبیر اب ریاستِ رامپور میں ملازم ہیں۔ ۴۰ سال کے قریب عمر ہے مرثیہ بھی کہتے ہیں، شعر گوئی کی طرف میلان ہو جاتا ہے تو اس میں بھی قوتِ فکر سے دُرِ خوش آب نکال لاتے ہیں دو بار لکھنؤ میں آپ سے ملاقات ہوئی، کلام دینے کا وعدہ بھی کیا تھا مگر باوجود تقاضوں کے شاعرانہ تجاہل و تساہل مانع رہا۔

اُس وقت سے وہ جلوہ گہِ بزمِ طور تھا
کعبہ تھا نے خلیل نہ موسیٰ نہ طور تھا

سچ تو یہ ہے رقیب نے ڈالا ہے تفرقہ
ورنہ مری خطا نہ کچھ اُنکا قصور تھا

اب وہ تمام جسم میں ہے یادگارِ غم
جو دل کہ تن بدن میں بساطِ سرور تھا

راستہ کوچۂ قاتل کا اجل نے نہ دیا
ضعف نے پاؤں وہ پھیلائے کہ چلنے نہ دیا

مُنہ اندھیرے ایک بھی چُلّو پلا دے تو اگر
ساقیا دینگے دعائیں شام تک میخوارِ صبح

بام پر آیا ہے پھر سے وہ خورشید رُو
آج دُونی ہو گئی ہے گرمیِ بازارِ صبح

داغ بر دل ہے قمر خورشید تفتیدہ جگر
شام کا بیمار ہے کوئی کوئی بیمارِ صبح

جملہ زنگار زنگ عالم کا ہے مسکن پھول ہیں
چشمِ حق بیں کو نظر آتا ہے گلشن پھول ہیں

یہ زرِ گل باغباں غنچوں کی مٹھی میں نہیں
حسرت و ارمانِ بلبل کا ہی مخزن پھول ہیں

جلوہ افگن ہے یہ کس کا روئے روشن پھول ہیں
کیا چمکتا ہے چراغِ زیرِ دامن پھول ہیں

یہ ناز ہے کہ تیرے ستم آستان پر ہیں
جو پاؤں تھے زمین پر اب آسمان پر ہیں

آہوں سے میری نکلے اک دن تھے کچھ شرارے
بن بن کے وہ ستارے اب آسمان پر ہیں

شوقِ دیدار تو ہمراہ چلے گا تیرے
نامہ بر حسرتِ تقریر ہے تحریر کے ساتھ

واہ وا رے قدر انداز ترا کیا کہنا
طائرِ دل کو اڑایا ہے پرِ تیر کے ساتھ

اے خدنگ نگہِ ناز کوئی کیا جانے
دلِ مجروح سے پوچھے کوئی لذت تیری
دل یہ کہتا ہے کہ اظہار تمنا کیجے
عقل کہتی ہے کہیں آئی ہے شامت تیری

گئیں جوانی کے ساتھ امنگیں چراغ جسطرح رات کے ساتھ
نہ اب وہ شعلہ رہا ہے باقی نہ شعلہ ہیں وہ بھڑک رہی ہے

ہوائے گلشن سنک رہی ہے گلوں سے شبنم ٹپک رہی ہے
یہی سبب ہے کہ آتشِ گل دہک رہی ہے بھڑک رہی ہے

بہار آئی چمن ہیں نکھرے ہوا سحر کی سنک رہی ہے
روش پہ موتی بچھے ہوئے ہیں گلوں سے شبنم ٹپک رہی ہے

ابھی ہیں نام خدا وہ کمسن نیا ہے جوبن نئی جوانی
جو چاک کہنی تک آستیں ہے تو بیچ چولی مسک رہی ہے

شہید الفت ہے یہ مقرر لحد پہ جسکی بجائے چادر
قمر کی اجلی سی چاندنی ہے گلاب شبنم چھڑک رہی ہے

گرے ہیں خود طفل اشک ہر سو نہیں مژہ کی خطا سر مو
کہ دست شفقت سے دامن اپنا اٹھا اٹھا کر تھپک رہی ہے

جان دیدی اُسنے میرے آزمانیکے لیئے
غیر خود ہی مٹ گیا میرے مٹانے کے لیئے
ہائے میں لاؤں کہاں سے تجکو اے صبحِ وصال
شام ہجراں آئی کالا منہ دکھانے کے لیئے
میرے سر سے خنجر براں چھوا کہتے ہیں وہ
ہمنے چھوڑا اُسکو جھوٹی قسمیں کھانے کے لیئے

رفیع - مسٹر رفیع الدین صاحب، ضلع ہردوئی میں چھ سات برس ہوئے انسپکٹر محکمہ آبکاری تھے بعد کا حال اور تلمذ کی کیفیت معلوم نہیں۔ کلام ملاحظہ ہو۔

ہو نہ خاروں کی خلش جبتک نہیں ملتا ہے گل
گلشنِ عالم میں بے رنج و الم راحت نہیں
چار ہی دن میں حبا اسقدر بھولے کہ اب
شمع روشن کرنے بھی آتے سر تربت نہیں

ہائے کس دن جسم آیا عاشقِ ناشاد پر	جب اطبا کہہ چکے بچنے کی اب صورت نہیں
رنگِ دنیا دیکھ کر گھبرا گیا اپنا تو جی	بھائی سے بھائی کو بھی اِس دور میں الفت نہیں
لاکھ منعم جمع کر لے مال و زر لیکن رفیع	فکر و زحمت کے سوا کچھ حاصل دولت نہیں

رفیق

رفیق۔ مرزا اسد بیگ دہلوی مغل خواص ابو ظفر بہادر شاہ بادشاہ شاگرد شنا اللہ خان فراق صاحب ہنر اور سپاہی پیشہ تھے، غدر سے پیشتر اپنے مکان میں مشاعرہ بھی کیا کرتے تھے، طبیعت دار شخص تھے، فکر رسا اور زبان پاکیزہ تھی۔ یہ اُنکا کلام ہے۔

ہمدمو پوچھو ہو کیا اُلفت کے دیوانے کا شوق	ہے اُسے کوئے بتاں میں رات دن جانیکا شوق
چشم کے بنگلے کو جاروب مژہ سے جھاڑیئے	ہو اگر تم کو یہاں تشریف فرمانے کا شوق
آہِ آتشبار کے میرے شرارے دیکھئے	لامکاں سے بھی پرے رکھتا ہے یہ جانیکا شوق
ایک بوسہ اُس سے جو میں نے طلب شب کو کیا	نہ سکے بولے کچھ ہوا ہے گالیاں کھانیکا شوق
اُس کا سنگِ رہ گذر یہ دل بنا لیتا رفیق	ہے اُسے چلتے ہوئے پاؤں سے ٹھکرانیکا شوق
روشن رہے گا داغِ دلِ عاشقاں مدام	ہوگا نہ حشر تک یہ چراغِ مزار گُل
بہ رہی ہے ہجر میں تیرے سدا خونبار چشم	اور تُو ہمسے خفا ہے حیف ہو کر چار چشم
ہیہات گر کے ہم نہ اُٹھے پھر زمین سے	مانند نقشِ پا ترے کوچے میں مر مٹے

رفیق

رفیق شیخ الٰہی بخش رفیق مرحوم خلفِ سالار بخش متوطن میرٹھ مقیم لاہور پنجاب کے شعرا میں نامور گذرے ہیں اُنکا کلام مشاعرہ دار العلوم پنجاب کے رسالوں میں اکثر شائع ہوا کرتا تھا اور فی الواقع طباع اور نکتہ سنج بزرگ تھے میر مہدی حسن فراغ کو شروع میں غزل دکھاتے تھے، پھر مولانا آزاد دہلوی سے فیضیاب ہوئے ۱۲۴۸ھ سال پیدایش تھا ۱۲۸۸ھ کے قریب انتقال کیا، تارا چند تارا انکے شاگرد نے اُنکا دیوان طبع کرا دیا ہے، کلام منتخب ملاحظہ ہو

فریفتہ ہیں جو مرغانِ دل نگہ پہ تری	گرا دیے تیرِ نگہ سے شکار بیٹھے ہیں
مدتوں رہ چکے آوارۂ صحرائے فنا	اب وطن چلکے ہم اے اہلِ وطن دیکھتے ہیں

خودنمائی اُنھیں منظور نظر ہے ایسی — پھروں آئینے میں آپ اپنی پھبن دیکھتے ہیں
آنکل تو بھی کبھی جانب دشت اے لیلیٰ — آکے پھرتے ترے مجنوں کو ہرن دیکھتے ہیں

اُٹھی اُوپر نیچے وہ پھر نیچی نظر آہستہ آہستہ — جہاں ہونے لگا زیر و زبر آہستہ آہستہ
ہوا ہے مہرباں بیدادگر آہستہ آہستہ — کیا پیدا محبت نے اثر آہستہ آہستہ

رفیق

آرزو دل کی بر آتی ہے دعا سے پہلے — مینہ برستا ہے مرے گھر میں گھٹا سے پہلے
اب تو خنجر ترا اک کو ہے کرتا سیراب — تشنہ لب سینکڑوں مر جاتے تھے پیاسے پہلے
میں بھی گلشن میں کوئی نالہ کروں یا نہ کروں — پوچھ لوں بلبلِ بے برگ و نوا سے پہلے
پھر کوئی جان نگاہوں سے سلامت لیجائے — دِل بچا لیوے تری ناز و ادا سے پہلے
ہے دِلِ زار چراغِ سحری کا عالم — خود بخود گُل ہوا جاتا ہے ہوا سے پہلے
جب دعا کی کبھی اے تیغ نگاہِ قاتل — خیر مانگی ہے ترے دم کی خدا سے پہلے
اے گلوبند نظر ہے جو لباسِ رنگیں — رنگ دے لو اسے خونِ شہدا سے پہلے

رُوبرو تو جو اگر آئینہ صفت آ بیٹھے — کھینچکے تصویر ترا محوِ تماشا بیٹھے
شوخیٔ چشم سے کہتی ہے نگہ اُس بُت کی — کوئی آرام سے بندہ نہ خدا کا بیٹھے
دیکھ آئے ہم تجھے ہمیں دیکھا نہ غیر نے — کوچے میں تیرے جب گئے مثلِ صبا گئے

رفیق

رفیق منشی ابن علی صاحب رفیق خلف مولوی فرزند علی متوطن قصبہ ہاپوڑ ضلع میرٹھ آپکا سن ولادت ۱۸۸۵ء ہے، اوائل عمری کا زمانہ اپنے بھائی منشی نصیب علی مرحوم مجسٹریٹ ریاست رامپور کے پاس رامپور میں بسر کیا اور وہیں ہوش سنبھال کر ملازمت بھی اختیار کی، ابتدائے سن شعور ہی سے مذاق سخن کا ذوق تھا، رامپور میں شعر و سخن کی گرم بازاری نے اِنکے شوق کو اور بھی چمکا دیا، جب طبیعت اِس طرف مائل ہوئی تو حضرت امیر مینائی مرحوم و مغفور کے خرمن کمال کی خوشہ چینی کرنے لگے اُنکے انتقال کے بعد حضرت راز رامپوری کی طرف رجوع کیا۔ آپ بزمانۂ قیام رامپور ریاست کے مشاعروں میں اکثر دادِ سخن دیتے رہے اُسکے بعد اجین جا کر سرکار

گوالیار کی ملازمت کی، اب پھر ہاپوڑ میں مجسٹریٹ ضلع کے ہاں اہلمد ہیں، تھوڑا عرصہ ہوا کہ آپنے دلی میں آکر ایک اخبار جاری کیا تھا جو کچھ عرصہ چلکر بند ہو گیا، یہاں کے قیام میں بزم کمال کے ماہواری مشاعروں میں شریک ہوتے رہے، ہاپوڑ میں اپنے اہتمام سے سالانہ ایک بزم مشاعرہ کا انعقاد کر رکھا ہے، آپکے کلام میں سادگی کے پہلو بہ پہلو شوخی بھی نمایاں ہے زبان میں چوچلا ہے اور روزمرّہ صاف ہے، اکثر چھوٹی بحروں میں معنی خیز شعر نکال لیتے ہیں اشعار ذیل انکی رنگینیٔ طبع پر دال ہیں۔

تسلّی اُسنے جو دی اور دل فگار ہوا
ہر بات میں ذکر ہے عدو کا
رکھ چاکِ جگر میں دل کے ٹکڑے
ٹوٹا نہ عصائے محتسب سے
مُنہ موڑ کے کیوں چلی تری تیغ
ہلکی کر لے شراب واعظ
دِل کو بھی ہمارے ہم سے کھویا
رحم اُس بیرحم کا آخر بدا ہو گیا
کیا بگڑ نیکو ہے نقشہ وصل کی تدبیر کا
آگئے جب وہ رفیق مبتلا کے سامنے
دیکھتے ہیں داغ دِل خار تمنّا چھوڑ کر
اللہ اللہ کسقدر رہے آنکو پردہ کا خیال
آنکھیں ملیں لحد سے محبت کے جوش میں
دنیا کے گرم و سرد سے چھوٹے نہ بعد مرگ
اُٹھیں کھیل تھا اک حجاب اوّل اوّل

ہمارے زخم کی قسمت میں اندمال نہ تھا
یہ ڈھنگ نیا ہے گفتگو کا
تب لُطف ہے بخیہ گر رفو کا
کام آیا لیا دیا سبُو کا
چکھنا تھا مزا مرے لہُو کا
پانی اِس میں مِلا وضو کا
ہو خانہ خراب آرزو کا
دامن قاتل مرے زخموں کا پھاہا ہو گیا
نامرادی پُوچھتی ہے گھر مری تقدیر کا
آہ بھر کر گر پڑا آنسو بہا کر رہ گیا
پھول وہ آنکھوں سے چُن لیتے ہیں کانٹا چھوڑ کر
میری نظروں میں رہے آنکھوں کا پردہ چھوڑ کر
نرگس کے پھول اُسنے چڑھائے مزار پر
رہتی ہے دھوپ چھاؤں ہمارے مزار پر
پڑ ہی بھی اُٹھی بھی نقاب اوّل اوّل

رحم تجھکو مجھے موت آئے یہ ممکن ہی نہیں
مجھسا بسمل ہے زمانے میں نہ تمسا قاتل

دیکھنے والو شہادت تمھیں دینا ہوگی
قتل کے بعد مُکر جائے گا میرا قاتل

دل بھی تیرا ہے جگر بھی ترا ایں بھی تیرا
جو تجھے چاہیے وہ شوق سے لیجا قاتل

عمر ہوگی بسر مصیبت میں
یہی لکھا ہوا ہے قسمت میں

جب توجہ ذرا ادھر ہوگی
بات دل کی زبان پر ہوگی

مر مٹیں گے جو آنکھ ادھر ہوگی
چلتا جادو تری نظر ہوگی

دشمنی ہو کہ دوستی کچھ ہو
لطف دیگی جو وقت پر ہوگی

تیری تصویر بھی ہے ہرجائی
ایک گھر کیا ہزار گھر ہوگی

کیجئے صبر دل بھی دیدیں گے
آپ کی ضد بھی اگر ہوگی

حُسن کی لوٹ آئینہ سے پوچھ
ساری دولت اسی کے گھر ہوگی

یہ چلے سوزِ عشق سے آنسو
کیا دھرا ہے جو آنکھ تر ہوگی

نگہِ شوق بوسے شوق سے لے
سونے والے کو کیا خبر ہوگی

پھر لہو چشم تر سے جاری ہے
موجِ خون آستیں ہماری ہے

ملتی جلتی ہے ان کی شوخی سے
قابلِ قدر بے قراری ہے

آدمِ نزع ہے کسی کی | ہے عمر دراز زندگی کی
سینے میں بجائے دل ہے پیکان | دل لیکے یہ سنسنی لدی کی

گر پڑا ہاتھوں تک آکر میرے ساغر دیکھئے
بدنصیبی دیکھئے پھوٹا مقدر دیکھئے

بیٹھکر پہلو میں میرے وہ یہ کہکر اٹھ گئے
اس طرح بنتا بگڑتا ہے مقدر دیکھئے

غرض ہی کیا تھی جو کروٹ ادھر نظر لیتی
بلا میں ڈالکر اسکی بلا خبر لیتی

خوشی رقیب ہی کے پاس پاس رہتی ہے
کبھی تو آکے ادھر بھی مری خبر لیتی

اشک ہے مژگاں پہ روشن چشم تر کے سامنے
ہے ہماری آنکھ کا تارا نظر کے سامنے

خوشی بنکر مرے پھولوں میں آئے
گئے بو کی طرح بزمِ عزا سے

سب میں چل پھر کے جھلک اُسکی اُبھر آئی ہے	آج قبضہ میں مرے جلوۂ ہرجائی ہے
آج باتوں میں تری درد کی بُو آتی ہے	میں سمجھوں گا کبھی چوٹ کہیں کھائی ہے
قدرداں بعد مرے تُونے نہ پایا کوئی	میرے مرنے کی خوشی آپکے گھر آئی ہے
کیوں نہ آنکھوں میں جگہ دوں شب وصل آئے	مدتوں کی میری کھوئی ہوئی نیند آئی ہے
تابع حکم ہے چلتی ہے اشاروں پہ مرے	جب بُلایا ہے تو آنکھوں سے حیا آئی ہے

تصویر جاناں سے خطاب

بولتی کیوں نہیں بھلا تصویر	نہیں رکھتی زباں کیا تصویر
ہنس کے تُو بجلیاں گرا مجھ پر	ہاں رُلا مجکو آج ہنس ہنسکر
میرے قابُو میں اور یہ بیداد	نقش دیوار اور ستم ایجاد
ہاں خدا کے لیئے زباں تو کھول	میرے سر کی قسم تجھے کچھ بول
ہائے یہ خوشنما تری زلفیں	ہائے یہ دلربا تری زلفیں
نرگسیں چشم پر نثار غزال	ابرُوؤں پر فدا ہزار ہلال
میری باتوں کا کچھ جواب تو دے	اِس خموشی کا ماجرا تو کھُلے
بے زبانی میں ہیں تیری سو باتیں	خامشی میں ہزار ہا گھاتیں -

رفیق - ابو البرکات مولوی حبیب اللہ صاحب عرف آغا رفیق خلف حاجی مولوی احمد اللہ صاحب بلند شہر کے رہنے والے حضرت داغ دہلوی کے شاگرد، ابتدائی عربی فارسی کی تعلیم اپنے والد ماجد سے پائی عربی کا سارٹیفکیٹ مدرسۂ مسجد فتحپوری دہلی سے حاصل کیا، طب کی تعلیم بھی پائی ہے، عربی میں اچھی استعداد اور لیاقت رکھتے ہیں، فلسفۂ مشرق ومغرب سے کمال شوق ہے نثر کے مضمون خوب لکھتے ہیں جو مشہور رسائل میں شائع ہوتے ہیں شعرگوئی میں نیچرل رنگ زیادہ پسند ہے عشقیہ بھی کہتے ہیں اور خاصہ کہتے ہیں، اساتذہ دہلی کے بہت مداح ہیں اُستادِ مرحوم کو بہت یاد کرتے رہتے ہیں اب ہاپوڑ میں رہتے ہیں، یہ اُنکا کلام ہے

غیر پر اپنا اثر پیدا کیا	جان دے کر یہ ہنر پیدا کیا

خالی نہیں رفیق کی دیوانگی کا راز
بیساختہ وہ دیکھئے اُن سے لپٹ گیا

جو گذر جائے دم غنیمت ہے
کیا بھروسا ہے زندگانی کا

در پہ سائل کھڑے ہیں عرصہ سے
صدقہ للہ کچھ جوانی کا

کیوں آپ سے کہیں کہ جفا آشنا ہیں آپ
بس دل ہی جانتا ہے خدا جانے کیا ہیں آپ

واہ رے جذبِ محبت تری اُلٹی تاثیر
آج کس شوق سے وہ غیر کے گھر جاتے ہیں

غضب کی سادگی ہے بانکپن پہ جس پہ دلدادہ
خدایا خیر دل کی اُنکے ایامِ جوانی ہیں

نہ اتفاق کو چھوڑ ئیے ہاتھ سے ہرگز
خدا خدا نہ سہی رام رام کرلیں گے

متاعِ دل کا خریدار گر نہیں ملتا
ہم اُنکے پوئے بس اب سکے دام کرلیں گے

خدا کو مان بھی واعظ وہ چاند سی تصویر
ہمارے خانۂ دل سے بھلا نکلتی ہے

پاؤں پڑتا ہے جہاں مجنوں کا نوک خار پر
کہتی ہے لیلیٰ کہ یہ کانٹا بھی میرے دل میں ہے

میرا دل لیکر نگر نارنگ لائے گا ضرور
جھوٹ بو گے وہاں بھی کیا خدا کے سامنے

رفیق

رفیق۔ جناب شیخ ملک قادر بخش صاحب منشی دفتر انسپکٹر جنرل رجسٹریشن حیدرآباد دکن تلمیذ حضرت سلام۔ حالاتِ زندگی نہیں ملے، کچھ اشعار انتخاب ہوکر درج ہیں۔

میں آرزوئے خنجر قاتل میں رہ گیا
ارمان دل کا ہائے مرے دل میں رہ گیا

بعدِ فنا لحد نے دی آغوش میں جگہ
لیلیٰ کی طرح قیس بھی محمل میں رہ گیا

مدِ نظر نظارۂ عالم ہے رات دن
دیکھو سمٹ کے سارا جہاں تل میں رہ گیا

اب خونِ بے گناہ سے مکریگا کس طرح
دھبّہ لہو کا دامنِ قاتل میں رہ گیا

ہزاروں تیر ہیں پیوست دامنِ دل میں
غضب میں پڑ گئے آنکھیں لڑا کے یار سے ہم

رہیگی خاک میں بیتابیانِ دل کی کبھی
مثالِ برق نکل جائینگے مزار سے ہم

رفیق

رفیق صاحبزادۂ محمد رفیق خان برادر نواب صاحب بہادر والیٔ ٹونک نواب صاحب کے سب سے چھوٹے حقیقی بھائی ہیں، تعلیم و تربیت بنارس میں پائی تھی اپنے والد کے آخر عمر تک

اُنکے پاس رہے عرصہ سے عزلت گزیں ہیں چھ سات ہزار کی جاگیر بھی ہے۔

بہت دیکھے حسیں ہمنے نہ دیکھا آپ سا کوئی
ہمیشہ سے ہیں ہم بھی اچھی صورت دیکھنے والے
چھپائے لاکھ دل ہیں پر چھپائے سے نہیں چھپتی
ذرا میں تاڑ جاتے ہیں محبت دیکھنے والے

رفیق

رفیق - مولوی عبد المجید رامپوری نائب سررشتہ دار عدالت علیگڈھ شاگرد آغا غمی، فارسی آغا محمد یوسف علی ایرانی سے تحصیل کی تھی اور اس زبان میں ملکۂ راسخہ حاصل ہے، خوش فکر موزوں طبع شخص ہیں عمر ۵۰ سال سے متجاوز ہے۔

رخسار سے ہٹاؤگے زلفوں کے بال کب
دینگے اذان صبح کی حضرت بلال کب
ڈر ڈر کے پوچھتا ہوں میں قاتل سے اے رفیق
زخم جگر کو ہوگا میرے اندمال کب
شرم سے کرتے ہو کیوں نیچی نظر وصل کی رات
کون ہے میرے سوا کس کا ہے ڈر وصل کی رات
قتل ہو کر بھی کہاں جاتی ہے روح
خنجر قاتل سے دم پاتی ہے روح
کھلا گل انگلیوں سے اسکی شمع طور کا یہ تو
کہ شعلہ کی طرح دل ہو گیا فی النار ٹھپکی میں
جمائی لینے سے اُسکے چمن میں تازہ گل پھولے
بنادے پھول غنچے کو وہ گل رخسار چٹکی میں

رفیق

رفیق حافظ محمد رفیق صاحب باشندۂ صوبہ بہار شاگرد حضرت کوثر خیر آبادی جو مشاعرہ سید ظفر نواب صاحب کی کوٹھی نواب منزل گیا میں ہوا اُس میں جو غزل پڑھی اُس کے چند اشعار درج ہیں۔

تاثیر شوق طالب دیدار دیکھنا
خود دیکھنے کو آئیگا اے یار دیکھنا
زاہد خیال حور بھلادے تو کیا عجب
ہنسکر کسی حسین کا اے یار دیکھنا
چھپتی نہیں نگاہ محبت کسی طرح
رسوا کرے گا یہ مرا ہر بار دیکھنا

رقت

رقت مرزا قاسم علی رقت انکے بزرگ عراق اور مشہد کے رہنے والے تھے اور قوم کے مغل انکا جائے مولد شاہجہاں آباد تھا لیکن بہ فیض آباد میں سن تمیز کو پہنچے اور جوانی لکھنو میں گزاری صاحب دیوان تھے، پہلے حسرت دہلوی پھر جرأت کے تلمذ سے فیضیاب ہوئے، تذکرہ شوق

میں انکا اور کلام نظر سے گزرا، یہ چند شعر انکے ہیں - ایک دوسرے تذکرہ میں نہیں کا نام رستم علی درج ہے

لباسِ سُرخ جب سے تو نے ہی اے گلبدن پہنا
ہر اک عاشق نے قبل از مرگ ہی رنگین کفن پہنا

چھلکتی ہتی کلائی تو جو سے تعویذ کے پیارے
نزاکت کا یہ عالم ہے کہ تو نے نورتن پہنا

اُس طرف وہ ہاتھ سے دامن چھڑا جانے لگا
اِس طرف چاکِ گریباں پاؤں پھیلانے لگا

ہوش کی اپنے خبر لے تجکو رقت کیا ہوا
اُسکے جاتے ہی تجھے کیا غش پہ غش آنے لگا

ہاتھ اُس سینہ پہ میں از راہِ نسیاں رکھدیا
بدگماں لوگوں نے کچھ کچھ مجھپہ بہتاں رکھدیا

پڑ گیا تھا آنکھ میں کچھ میری ہیں رونا نہ تھا
مجھپہ یہ ناحق پیارے تم نے طوفاں رکھدیا

یار کی مژگاں نے منہ پھیرا جو میرے قتل سے
اُسکے آگے تیر کا اک میں نے پیکاں رکھدیا

کہتے ہیں جدول کلام اللہ کا خط کو ترے
نام اُس کافر کا یہ کس نے مسلماں رکھدیا

خط وہ بھیجے رقیب کا لکھا
یہ بھی اپنے نصیب کا لکھا

ہمارے سامنے مت ابر بار بار برس
جو ہم سے ہو سکے تجھ سے نہ ہو ہزار برس

پھنس گیا یہ آپ سے اُسنے تو لپٹایا نہیں
ہے گناہ دل عزیزو کچھ نہیں تقصیر زلف

اے پریشاں دل کی اپنے اب خبر رقت ذرا
بے طرح اب ہو گئی ہی اسکو کچھ تاثیر زلف

ہے دلِ بیتاب میرا خصم جان زیر بغل
وہ مثل مجھ پہ ہوئی دشمن کہاں زیر بغل

دیا اک بوسہ پنہاں اُسنے ہمسے رات لیکر دل
سو ہم بھی یہ سمجھتے ہیں حسابِ دوستانِ دل

تجھے پہلو میں پالا تھا اسی خاطر اسی خاطر
کیا اُسو اب مجھے تو نے ستمگر دل ستمگر دل

یہی کل بیٹھے بیٹھے آئی میرے دل میں اے رقت
کہاں آؤں نہیں مجھ سے گیا ہے آہ ملکر دل

قطعہ

گیا جو کوچۂ دلبر میں وہاں اور ہی تماشا تھا
پڑے تھے سینکڑوں اُس جا پہ خاک و خوں میں دل بر دل

لگا کرنے تجسس میں تو دیکھا ایک گوشے میں
پڑا ہیگا بصد غربت مرا بھی زار و مضطر دل

لگا حسرت سے مجکو دیکھنے وہ اور میں اُسکو
دل من گریہ بر من کرد و من ہم گریہ با بر دل

دوانے اُس پہ سب نادان و دانشمند ہوتے ہیں
یہ عالم اُس کا دیکھا ہے کہ رستے بند ہوتے ہیں

جس میں جو بات سمائے وہ بھلا جائے کہاں
حُسن آخر ہوا اُس کا پہ ادا جائے کہاں

یہ کس کا رقص دیکھ آیا دلا تو
کہ بیٹھا زندگی سے ہاتھ اُٹھا تو
نشانیِ غیر کو دی ہے تو پہلے
نشانِ زندگی میرا مٹا تو

تو نہیں دیتا لگانے سیمبر چھاتی پہ ہاتھ
اس لئے غم سے چلا جاؤنگا دھر چھاتی پہ ہاتھ

چھوٹ جائے کسی سے نہ ملاقات کسیکی
اللہ بگاڑے نہ بنی بات کسیکی
آنکھوں میں اپنی اُسنے سرمہ نہیں دیا ہے
کہتے ہو تم جو یارو ناحق کا طوطیا ہے
دیوار گلرخاں کا سایہ مگر پڑا ہے
زاہد بتا تو مجھکو طوبیٰ میں شاخ کیا ہے

رقت

رقت مولوی حافظ حبیب النبی تلمیذ رحمت۔ تذکرۂ قاضی خلیل سے کلام لیا گیا۔

مثلِ حباب کھولتے ہی آنکھ تھی فنا
ہمکو دمِ نخست دمِ واپسیں ہوا
آئے گر رُو برو شبِ ہجراں
صبح کرو نیگے داغِ روشن سے
اپنی آنکھوں سے بانگہ سے تری
سینے میں پڑ گئے ہیں روزن سے

رقّت

رقت مولوی حبیب الٰہی رقت مرحوم معاون مدرسۂ عالیہ کلکتہ باشندۂ رامپور سنہ ۱۲۶۱ھ میں ۵۳ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ یہ اُنکی طبع موزوں کا نتیجہ ہے ❖

دوسرے کا سوگ کیجے ایک کا غم ہو چکا
اب جگر کو روئیے دل کا تو ماتم ہو چکا
ہم تو گل کھا کے مُوئے اور وہاں غیروں کو
جاتے ہیں اتبلک اپنے اُسی معمول پہ پھول
اپنی تربت پہ نہیں مارتا پتھر کوئی
چڑھتے ہونگے کسی اللہ کے مقبول پہ پھول

زندگی گر عذاب ہے تجھ بن
مَوت بھی تو خراب ہے تجھ بن

رقّت

رقت سیّد علی محمد خلف سیّد غلام محمد شاگرد سیّد شبیر علی اسد باشندۂ جالندھر۔ اوائل عمر ہی سے مذاقِ سخن طبیعت میں ہے۔ بزرگوں اور قادر الکلاموں کی صحبت سے فیضیاب ہونیکے شوقین ہیں، نوعمر اور نومشق شاعر ہیں، تقریباً چوبیس پچیس برس کا سن ہے۔ آپ گورنمنٹ پریس شملہ میں کلرک ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے ۔

کیونکر نہ اشتیاق ہو ابرو کی دید کا
رمضاں کے بعد چاند یہ نکلا ہی عید کا

چھوئی جو میں نے خواب میں اسکے ناز کی
بے کل رہی صنم کی کلائی تمام رات

جذبہ شوق تو ہی کھینچ کے لادے انکو
ورنہ مر جائینگے ہم انکو خبر ہونے تک

قطرۂ آب تھا اللہ جو چاہے کردے
پہلے کیا تھا کوئی پوچھے یہ گہر ہونے تک

روتا ہوں یاد عارض گلرنگ یار میں
لالہ کے گل پروتا ہوں شکوں کے تار میں

نکلی ہماری روح جو فصل بہار میں
بوسو کے رنگئی ترے پھولوں کے ہار میں

اس شعلہ رو کے عکس کی تاثیر دیکھنا
چھالے سے پڑ گئے کف آئینہ دار میں

چھپکر کدھر کو جاؤگے میدان حشر میں
پہچان لونگا تمکو تو سو کیا ہزار میں

شرارت کے یہ معنی ہیں شرارت اسکو کہتے ہیں
ہمارے چھیڑنے کو وہ عدو کا نام لیتے ہیں

مژدۂ فصل بہاری ہے صبا لائی ہوئی
پھرتی ہی بلبل جو اک گل پہ اترائی ہوئی

رقم حکمت مآب فضائل اکتساب صاحب پایۂ ارجمند حکیم سکھانند رقم کالیتھ باشندۂ دہلی محلہ دھرم پورہ میں سراؤگیوں کے بڑے مندر کے قریب رہتے تھے، فضیلت علمی کے ساتھ شعر بھی عمدہ کہتے تھے طبابت میں وحید العصر اور فن شعر میں شاہ نصیر مرحوم کی شاگردی سے بہرہ ور تھے، مرض کی تشخیص کا یہ عالم تھا کہ صورت دیکھکر مرض کو دریافت کر لیتے تھے ایام ضعیفی تک اپنی اوقات فارغ البالی اور مرفعہ الحالی سے بسر کرتے رہے انکو علم نجوم اور رمل میں بھی عمدہ مہارت تھی، اور اس فن کو حکیم مومن خان مرحوم سے کسب کیا تھا کتب درسیہ فارسی و عربی مختلف استادوں سے پڑھیں، اور مدت تک طالبان کمال کو پڑھائیں حق پسند و حق شناس تھے، سراپا کمال وجاہت ظاہری و باطنی سے پیراستہ تھے، وضع ایسی رکھتے تھے کہ خاص و عام کی نظروں میں آداب احترام قائم کرتی تھی۔ ہمیشہ خوش پوشاک خوش لباس رہتے، اور اس میں سدا ایک ہی وضع کی پابندی کی۔ ان کمالات پر مزاج میں مسکینی و غربت بدرجۂ کمال تھی، اور حلیم الطبعی و سلیم المزاجی بردباری

ملنساری۔ خوش اخلاقی میں یگانۂ آفاق تھے، لوگوں سے سُنا ہے کہ عنفوان شباب میں انکا یہ حال تھا کہ بغیر اچھی صورت دیکھے رہ نہ سکتے تھے خود بھی شکیل تھے اور حسینوں کو چشم محبت سے دیکھتے متانت کے ساتھ مزاج میں ظرافت بھی تھی اور خوش طبعی سے یارانِ ہم جلیس کے دلوں میں گھر کر لیتے تھے، ہر فرد بشر کے ساتھ نہایت خلوص سے پیش آتے جو لوگ انکی صحبتوں کا لطف اُٹھائے ہوئے ہیں وہ ابتک اُن کو یاد کرتے ہیں، بعد ایام غدر بسبب دل شکنی و مایوسی اُمور دنیوی سے دست بردار ہو گئے، خانہ نشینی اختیار کی تھی البتہ مطب جاری تھا، المختصر تریسٹھ برس کئی مہینے زندگانی بسر کرکے ۱۲۸۵ھ میں انتقال کیا، فارسی اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، دیوان تو غدر میں تلف ہوا مگر صدہا متفرق کاغذات پر غزلیات و اقسام کلام سے شعر انکے بیٹے کے پاس موجود تھے، اِنکے پوتے حکیم امیر سنگھ جو مدرسہ طبیہ دہلی کے پہلے ہند وسند یافتہ اور حکیم حاذق الملک عبد المجید خاں کے رشید تلامذہ میں سے ہیں اب آبائی مطب کے جانشین ہیں۔ یہ چند اشعار انکے نتائج افکار سے ہیں۔

جہاں میں کونسا ہمکو ہنر نہیں آتا
لگا کے دِل کا چھڑانا مگر نہیں آتا

بُجھانا آتشِ دل کا بھی کچھ حقیقت ہے
ذرا سا کام تجھے چشم تر نہیں آتا

عدم سے کوچۂ قاتل کی راہ ملحق ہے
گیا ادھر جو گذر پھر اِدھر نہیں آتا

یہ لاغری نے سکھایا کہ جسمِ زار مرا
اجل کو بسترِ غم پر نظر نہیں آتا

ہو خاک چارہ گری اُس مریض کی تیرے
نظر میں تجھسا کوئی چارہ گر نہیں آتا

سرِ مزار شہیدانِ شوخ آہو چشم
رقم طواف کو کب شیر نر نہیں آتا

دھوکے میں ہی نظر تنِ لاغر کو دیکھکر
سو بار خالی پھر گئی بستر کو دیکھکر

رُخ پر تمھارے کان کے گوہر کو دیکھکر
حیراں ہے خلق ماہ پہ اختر کو دیکھکر

بے دیکھے دیکھتا ہوں نیا داغ دیکھنا
کیا جانے حال کیا ہو ستمگر کو دیکھکر

سیماب ہمسری کرے کیا بلکہ برق بھی
مانگے ہے الامان دل مضطر کو دیکھکر
کیونکر نہ سر بزانو ہوں غیرت سے رشکِ حور
زانو پہ تیرے غیر کے ہم سر کو دیکھکر
اِس تشنہ لب کو شوقِ شہادت ہے یا تلک
ترسے ہے آبداری خنجر کو دیکھکر

نہ تو زور ہے مجھ میں جو دیکھوں اُسے نہیں زر ہے جو پاس بُلاؤں اُسے
کہو کیونکہ میں راہ پہ لاؤں اُسے کوئی ملنے کی اُس سے تو راہ ہی نہیں

مرے درد کی تجکو ہو کیونکہ خبر مرے آہ کا دل پہ ہو کیونکہ اثر
تری عیش میں گذری ہے رشکِ قمر کبھی عشق سے کام پڑا ہی نہیں

کبھی گھر سے نکل مرے ماہ لقا ذرا عاشقِ زار کے پاس تو آ
مرے حال کو دیکھ ہوا ہے یہ کیا مرے مرنے میں کچھ تو رہا ہی نہیں

مری نبض کو دیکھ طبیب بہم لگے مل کے یوں کہنے بہ رنج و الم
نا حق کو دوائیں کرو ہو رقم میاں ایسا مریض سُنا ہی نہیں

مجھے لاکھ جلا مجھے لاکھ ستا ترے در سے ہٹوں گا نہ میں بخدا
رہوں ہٹ سے لپٹ کے میں تیرے کھڑا کبھی ہٹ سے میں اپنی ہٹا ہی نہیں

وفورِ شوق میں رُخ کے لئے وہاں کے لیئے
نہیں تمیز کہ بوسے کہاں کہاں کے لیئے

ہچکیوں نے بھی مری یاد دلائی نہ اُنھیں
نام سب سب کا لیا نام مرا بھول گئے
بیٹھے گنتے ہیں کو جو بوسے تو عجب لُطف اُٹھا
بھولنا یاد رہا یاد جو تھا بھول گئے
مدعا غیر کا چاہا تری چاہت کے سبب
مانگنی اپنے خدا سے بھی دُعا بھول گئے
اپنے غش آنیکے صدقے ہوں کہ اُنسے لپٹے
ایسے گھبرائے حواس ہوش رُبا بھول گئے
سچ ہے نسیان و خطا سے ہے مرکب انسان
باعثِ فکرِ بتاں ذکرِ خدا بھول گئے
دلکی جب یاد دلاتا ہوں تو کہتے ہیں رقم
گم ہوا، کھو گیا، یا جاتا رہا بھول گئے

رقیب منشی محمد ظہیر حسن مدرس بہیرا قصبہ ضلع فتحپور ۱۸۹۳ء کے نتائج افکار کا خلاصہ

درج ذیل ہے ؎

بنایا یہ سبح و زنار ہیں رشتہ ہوا کیوں ہے	مرے دلکو تمنائے بتانِ بیوفا کیوں ہے
تصور روئے جاناں کا ہی ہردم کعبۂ دل ہیں	پریشاں طائرِ دل صورتِ قبلہ نما کیوں ہے
مصلے پر تو بیٹھا ہے نظر ہے ماہرویوں پر	بتا اے زاہدِ مکار دل ہیں یہ ریا کیوں ہے
خدا کو ہمنے جب ڈھونڈا تو پایا خانۂ دلمیں	پریشاں جستجو ہیں اسکی پھر خلقِ خدا کیوں ہے

رکن — رکن منشی سید غلام نبی منشی عابد علی کوثر خیر آبادی سے تلمذ ہے اور یہ کلام کا خلاصہ ہے

ڈھلی مے آج ساقی کی دوکاں پر	گھٹائیں آگئی ہیں آسماں پر
امید و یاس ہیں جھگڑے پڑے ہیں	فقط انصاف ہے ابکی ہاں پر
حلب آئینہ رخ پر تصدق	عدن صدقے لب گوہر فشاں پر
اٹھے کس طرح بارِ زندگانی	گراں ہے جسم جانِ ناتواں پر
کوئی دیکھے یہ واعظ تو نہیں ہے	چھپائے منہ کھڑا ہے کی دوکاں پر

رمز — رمز دہلوی، مرشدزادۂ آفاق صاحبعالم و عالمیاں مرزا فخر الدین فتح الملک بہادر رمز معروف بہ میرزا فخرو ولیعہد دومی حضرت ظلِ سبحانی بہادر شاہ ثانی، صاحبعالم کی شادی اپنے حقیقی چچا میرزا جہانگیر کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ مرزا ابوبکر مرحوم جو غدر میں مارے گئے انھیں کے بطن سے تھے ۱۲۶۹ھ میں ولیعہد ہوئے "چراغ دنیا" مادۂ تاریخ نواب ضیاء الدین خان نیر رخشاں نے نکالا، حضرت رمز کی اوّل تو شاہی زبان اسپر خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق کی شاگردی کا طرہ خود ہی گویا ہے کہ انکا کلام کس درجہ فصیح و بلیغ ہوگا، انکے اشعار میں عجب لطف انگیز چوچلا ہے، میٹھی میٹھی باتوں سے چٹکیاں لینا اشاروں ہی اشاروں اور رمز کنایوں میں مطلب ادا کرنا انہی کا کام ہے، کیوں نہو پیدایش کہاں کی تھی، تربیت کہاں اور کن بزرگوں کے زیرِ نظر پائی تھی؟ اس شاہجہاں آباد کے قلعۂ معلی میں جو ہمیشہ سے زبانِ اردو کا مولد اور ملجا رہا تھا جہاں کی زبان ہر ایک شہرو

دیار میں مستند سمجھی جاتی تھی عجب طبیعت تھی اور غضب کی رسائی تھی، خاندان تیموریہ کے چشم و چراغ اور سپہر سلطنت کے درخشاں مہتاب تھے، سرکار انگلشیہ نے اُنکے واجبی حقوق کو تسلیم کرکے خاص عہدنامہ کرلیا تھا جس سے مشرح اور واضح طور پر یہ تعین ہوگیا تھا کہ بعد وفات بہادر شاہ یہی اُنکے جانشین قرار پائیں گے مگر مرضی پروردگار یوں نہ تھی۔ چالیس برس کی عمر پاکر ۱ جولائی ۱۸۵۲ء کو مرض وبائے ہیضہ میں مبتلا ہوکر راہی ملکِ بقا ہوگئے "کبتہ مرزا فتح الملک ولیعہد" تاریخ وفات ہے دیوان مرتب ہوگیا تھا، مگر غدر میں تباہ ہوگیا، ایک مثنوی خوب لکھی تھی جو میرے کتبخانے میں موجود تھی مگر اتفاق سے تلف ہوگئی۔ ایک واسوخت جو غدر سے پیشتر چھپا تھا میرے پاس ابتک موجود ہے بڑی تلاش سے چند غزلیں ملیں جو ہدیۂ ناظرین کیجاتی ہیں، مرزا خورشید عالم اور مرزا فرخندہ جمال آپکے بیٹے دہلی میں رہتے ہیں اور راقم تذکرہ کے عنایت فرما ہیں، مرزا خورشید عالم بہادر خود بھی فکر سخن فرماتے تھے افسوس کہ ستّر برس کی عمر پاکر دسمبر ۱۹۱۷ء میں بمقام رامپور انتقال فرماگئے، اُنکی وفات سے گویا خاندان تیموریہ کی رہی سہی وقعت جاتی رہی۔

دل مرے سینے میں یہ کوئی ستم پیدا ہوا
جب سے دِل پیدا ہوا ساتھ اُسکے غم پیدا ہوا

دل میں آتی ہے نظر اپنے مجھے تصویر یار
کیا تماشا ہے کہ کعبہ میں صنم پیدا ہوا

ہے مرا سینہ کہ یارب کوئی دارالضرب عشق
داغ جو پیدا ہوا شکل درم پیدا ہوا

اپنی صورت آئینہ میں دیکھکر کہتا ہے وہ
کوئی دنیا میں حسیں مجھسا بھی کم پیدا ہوا

مجھ سے کی پہلو تہی بیدرد نے جبر وزرے
درد پہلو میں ہمارے دمبدم پیدا ہوا

دیکھتے ہیں سارے عالم کا تماشا دل میں ہم
ساغرِ دل اپنا رشکِ جامِ جم پیدا ہوا

ہیں وہ مجنوں ہوں کہ جسکے باغِ جنت میں بھی رمز
خارِ صحرائے جنوں زیرِ قدم پیدا ہوا

کیا قتل ظالم نے کِس کِس ادا سے
رلا مجھکو قسمت سے جلّاد اچھا

آنکھیں تو اُسکو دیکھ کے ہوتی ہیں بیقرار
بن دیکھے دل تڑپنے لگا اسکو کیا ہوا

سب کچھ آساں ہے تجھے گردشِ دوراں کرنا
ایک مشکل مری مشکل کا ہے آسان کرنا

ہوا شوقِ تماشا جب سے تیرے روئے نیکو کا ۔۔۔ نہیں قابو میں ہوں رکھے نہ دل ہے صبر قابو کا
ڈھونڈو گے جان کو بھی محبت کی راہ میں ۔۔۔ پھرتے ہو رمز دل کی ابھی جستجو میں کیا

طرزِ رفتار نے تری ظالم ۔۔۔ رفتہ رفتہ مجھے تمام کیا
ہیں جو رُسوائے زمانہ ہو گیا ۔۔۔ اُسکی شُہرت کا بہانہ ہو گیا
جا پڑے ہم کوچۂ جاناں میں رمز ۔۔۔ بارے اپنا بھی ٹھکانا ہو گیا

دلِ بیتاب ہو گیا تجھ سے رفاقت کی اُمید ۔۔۔ کوئی ہوتا ہے بُرے وقت میں جو تُو ہو گا

بل کچھ ایسا کاکل خمدار میں پیدا ہُوا ۔۔۔ پیچ و تاب اپنے دلِ بیمار میں پیدا ہوا
کٹ گئے دن رنج و غم کے بلکہ ساری عمر کے ۔۔۔ کاٹ یہ اچھا تری تلوار میں پیدا ہوا
واہ وا کیا ترے ہر گام پر محشر خرام ۔۔۔ فتنۂ تازہ اک تری رفتار میں پیدا ہوا
بل بے جوشِ گریہ بعد رو فورِ اشک خوں ۔۔۔ ایک طوفاں دیدۂ خونبار میں پیدا ہوا
کشتگانِ ناز زندہ ہو گئے اک بات میں ۔۔۔ معجزہ اچھا لبِ دلدار میں پیدا ہوا
لکھ غزل لے رمز تبدیلِ قوافی میں کوئی ۔۔۔ اور عالم اب ترے اشعار میں پیدا ہوا
لیگئی دل جو تری کاکل پیچاں میرا ۔۔۔ تا دمِ مرگ رہا حال پریشاں میرا
چھوڑوں کسطرح سے میں دامنِ صحرا کو ببول ۔۔۔ خارِ صحرا ہی نہیں چھوڑتے داماں میرا
رمز اُس آئینہ رُو کی کوئی کیا جانے ہی رمز ۔۔۔ یا تو میں جانتا ہُوں یا دلِ حیراں میرا
غم وہ کیا ہے جو جاں گزا نہوا ۔۔۔ درد وہ کیا جو لا دوا نہ ہُوا
تیز کرتے ہیں وہ چھُری کو ابھی ۔۔۔ قتل پر میرے اکتفا نہ ہُوا
حال کھُل جائیں غیر کو سارے ۔۔۔ پر کروں کیا کہ تو میرا نہ ہُوا
درد کیا جس میں کچھ نہ ہو تاثیر ۔۔۔ بات کیا جس میں کچھ مزا نہوا
وہ تو ملتا مگر دلِ کم ظرف ۔۔۔ تجکو ملنے کا حوصلہ نہ ہُوا
مر گیا ہجر میں جو بن آئی ؎ ۔۔۔ شُکر منتِ کشِ قضا نہ ہُوا

شکوۂ یار اور زبانِ رقیب
کھیل ٹھیرا کوئی گِلا نہ ہُوا

یار آیا نہ موت ہی آئی
ایک بھی رمز مدّعا نہ ہُوا

تم رہو اور مجمعِ اغیار
میرا کیا ہے ہُوا ہُوا نہ ہُوا

پھر تمھارے ستم اُٹھانے کو
رمز اچھا ہُوا بُرا نہ ہُوا

دِل دیا تھا جسے دلدار سمجھ کر مَیں نے
رمز اب وہی دلِ آزار ہوا ہائے نصیب

اور صُورت سے کیا غرض ہے رمز
ہے پسند اپنے یار کی صورت

غم کے آثار خوشی میں بھی ہیں دیکھو موجود
جو کہ ہنستے ہیں بہت اشک بہاتے ہیں بہت

حال سُن سُن کے عشق میں تیرا
رمز کرتے ہیں خاص و عام افسوس

ذبح ہو ناحق میں میرے ہے حیاتِ جاوِدان
آبِ خنجر میں ترے ہے آبِ حیواں کا خواص

جل گیا پروانہ تو یہ بھی سحر تک ہے تمام
فاصلہ اک شب کی شب کا درمیاں رکھتی ہو شمع

کیسی زمیں کہ غرق ہو آسماں تلک
اے گریہ اب یہ جوششِ طوفاں کہاں تلک

جس میں نہ جذب ہو، نہ اثر ہو، نہ درد ہو
اُس دل کو رکھ کے سینے میں پھر کیا کرینگے ہم

بیتابیوں سے اِس دلِ خانہ خراب کی
کیا کیا کیا ہے، اور نہ کیا کیا کرینگے ہم

دردِ فراق، طعنِ عدو، فکرِ دشمنان
اِس ایک جان پر مری کیا کیا بلا نہیں

اے دلِ بیتاب اتنا اضطراب
صبر تجھ پر اور تو مَیں کیا کہوں

کیوں ندوں زخم کو جگہ دل میں
کیا یہ قاتل کا یادگار نہیں

ہمکو کیا غیر کے آنے کی خبر
چغلیاں نقشِ قدم کھاتے ہیں

خو کردۂ رفتار ترا لعبِ قیامت
یہ بھی تو نجانے کہ قیامت ہوئی کس دن

یاں یہ حالت کہ دم لبوں پر ہے
واں یہ غفلت کہ کچھ خیال نہیں

لب ہلے کیونکہ تیری مجلس میں
دیکھ کر تجکو جان ہے کس میں

نہ حرم میں جگہ نہ دیر میں جائے
ہم سے گنہے خدایٔں یا خدا کس میں

ذبح کر خواہ چھوڑ دے صیاد
آ پھنسے ہم تو اب ترے بس میں

چوسے لب میگوں دم خواب ایسے مزے ہیں
پی تھی نہ کبھی میں نے شراب ایسے مزے ہیں

ساقی مری توبہ کے ٹھہرنے کے نہیں پاؤں
گر جھوم کے آئیگا سحاب ایسے مزے ہیں

رمز وہ مست ناز ہے فتنہ
اسکو سونے دو کیوں جگاتے ہو

تم نہ بیٹھے غیر کے گھر میں شب کو
بس چلو یونہی سہی جانے دو

اسکے آنے کی اگر کوشش ہیں
جاں جائے جو چلی جانے دو

منہ دکھانا ہے خدا کو اک دن
اے بتو اتنی خودی جانے دو

ہر سخن میں یہ کجی جانے دو
ہو چکی بس خفگی جانے دو

شکر و شکوہ سے تعلق نہ رکھو
نبھ سکے جیسے نبھی جانے دو

رمز الفت میں جو چاہو آرام
تو یہ راحت طلبی جانے دو

تیر مارا ہے تو ظالم تو چھری بھی پھیر دے
یہ بھی حسرت رہ نجائے اس ترے نخچیر کو

پیٹوں جنوں میں سر کو کہ روکوں سرشک کو
تھاموں قلق میں دلکو کہ رکھوں جگر پہ ہاتھ

شوق کہتا ہے کہ چل اور ضعف سے
اٹھ نہیں سکتا قدم کیا کیجئے

کیا جانے آج دلکو مرے ہو گیا ہے کیا
پہلو میں یار اور لئے اضطراب ہے

ہاتھوں سے ترے بچا نہ وہ بھی
اک رمز تھا جاں نثار ہے ہے

رمز ہیں صورت پہ اسکی شیفتہ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

کیوں نہ لب حسرت سے کاٹوں ہیں کہ میرے سامنے
بوسہ اس لب کا لیا جام شراب ناب نے

الٰہی موت تو ہو گی مگر یوں ہو تو بہتر ہو
کہ سر ہو پاؤں پہ قاتل کے اور سجدے میں دم نکلے

بعد مردن بھی نہ چھوٹا ہے ذوق میکشی
خاک سے اپنی سبوئے مے بنے ساغر بنے

سہتے تو غم یار میں یوں عمر بسر کی
مر مر کے جو کی شام تو رو رو کے سحر کی

ایسا لگاؤ تیر نگہ تم کہ ہو بلند
ہر زخم دل سے میرے صدا واہ واہ کی

نہو جب ضعف سے طاقت کہ آئی جان ہو نکب
تو ہمسے ناتوانوں کا کہو کس طرح دم نکلے

دِل لے تو گئے ہیں وہ ہمارا
پر دیکھیئے اِسکو کیا کرینگے

یا دُبت میں عمر گزری یہاں تو رمز
کہیا کہوگے وہاں خدا کے سامنے

ہوئی صُورت نہ کچھ اپنی شفا کی
دوا کی مدتوں برسوں دُعا کی

ہمیں منظور آج اُنکو بُلانا ہے بلانا ہے
بُلا کر داغِ دل اپنا دکھانا ہے دکھانا ہے

ہجوم داغِ دل کیا پوچھتے ہو میرے سینے میں
خزانہ ہے خزانہ ہے خزانہ ہے خزانہ ہے

جگر مرا تری تیغ نگہ کا ایک مدت سے
نشانہ ہے نشانہ ہے نشانہ ہے نشانہ ہے

ہنسو کیونکر نہ غیروں سے کہ منظور آپ کو میرا
رُلانا ہے رولانا ہے رولانا ہے رولانا ہے

شہادت سے مری ابتک نہ بان تیغ قاتل پر
فسانہ ہے فسانہ ہے فسانہ ہے فسانہ ہے

نہ بھر بلکے بلیں آگا اور کیوں آنسو نہ جاری ہوں
کہ شیوہ وہاں رقیبوں کا لگانا اور بجھانا ہے

رمزؔ منشی محمد ابراہیم خان خلفِ مولوی محمد خان صاحب مرحوم داروغہ وڈائرکٹر محکمہ سائر ریاست ٹونک، نواب محمد اسد خان آسد لکھنوی کے شاگرد ہیں، چالیس پنتالیس برس کا سن ہے اور یہ کلام کا نمونہ ہے۔

وحشت میں ہم سمٹتے پھرتے ہیں جابجا
صحرا کے خار کوہ کے پتھر چمن کے پھول

بے قدر کی نگاہ میں اے رمز ایک ہیں
صحرا کے خار ہوں کہ ریاضِ سخن کے پھول

کیوں کرتے ہو برباد اسے مفت میں دیکھو
اے رمز کبھی جا کے جوانی نہیں آتی

یہ بزمِ عام ہے اچھی نہیں اس جا نظر بازی
بھلا ایسا بھی کیا کر کچھ تو غیرت دیکھنے والے

حسیں پیدا کیے اس عالمِ ایجاد میں کیا کیا
خدائی کا تماشا دیکھ قدرت دیکھنے والے

فقط ہم تم ہوں اور کوئی نہو جب لطف صحبت ہے
شب وصل اسکو جلاتے دیہ آنکھو نہیں جیا کیوں ہے

رمزؔ منشی برج بہاری لال رمز مراد آبادی علمی استعداد خاصی ہے بارہ پندرہ برس سے مشق سخن کرتے ہیں اور منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی کے بارادت تلامذہ میں ہیں۔

اپنی طباعی اور خوش فکری کی وجہ سے ہم مشق شعرا میں ممتاز ہیں۔ کلام ملاحظہ ہو۔

ہائے پتھرا گئیں آنکھیں مری تکتے تکتے — دمِ آخر بھی نہ وہ شوخ ستمگر آیا
مر گیا پاسِ وفا میں مجھے دیکھا تو نے — معجزہ اب تو دکھا کوئی مسیحائی کا
اے رمزؔ تیرِ یار نشانی سے کم نہیں — پہلوئے دل میں رکھیے لگا کر جگر سے آپ

کب روح کو فنا ہے بدن کی فنا کے ساتھ — پتنا کہاں ہے رنگ خنا کا خنا کے ساتھ
دل کی لگی بھڑکتی ہے آہِ رسا کے ساتھ — اُٹھتے ہیں جیسے آگ کے شعلے ہوا کے ساتھ
ہو لطفِ مے دو چند جو ساغر سے لب اُدھر — آنکھیں ادھر ملیں کسی نازک ادا کے ساتھ
پازیب کی صدا ہے تمہاری کہ شورِ حشر — فتنے ہزاروں اُٹھتے ہیں آوازِ پا کے ساتھ

رمزؔ اب روتے ہو کیا دل کو جگر کے سامنے — کیوں گئے سینہ سپر تیرِ نظر کے سامنے
ہے تصور میں بھی اُنکے کس قیامت کی حیا — سامنے ہیں اور نہیں آتے نظر کے سامنے

اک وار میں دو ٹکڑے کئے دل کے جگر کے — قائل ہیں ہم اِس جوہرِ شمشیرِ نظر کے
کمسن ہی کہیں سہم نہ جائے وہ دمِ قتل — اے زلف تو آ جا رخِ قاتل پہ بکھر کے
دیکھا نہ کبھی پیار کی آنکھوں سے ادھر حیف — مجکو نہ دیا آپنے ساغر کوئی بھر کے
نرکھوں کیوں کلیجے سے لگا کر — یہ داغِ دل مجھے اُسنے دیا ہے

رمز

رمزؔ۔ مرزا جلال الدین حیدر عرف حکیم ممتاز حسین دہلوی شاگرد مضطر بنارسی سنہ ۱۸۹۹ء میں مظفر پور بہار میں مطب کرتے تھے۔ اور حال معلوم نہ ہوا یہ چند شعر انکے ہیں۔

پسِ پردہ جو میرے شمع رو کا نورِ رخ پھیلا — مجھے عالم نظر آیا چراغِ زیرِ داماں کا
ذریعہ ہمکو بخشش کا بتاتا ہے کرم اُس کا — خدا سے منفعل ہو کر تو کر اقبال عصیاں کا
شکر ہے لب پہ ترے شکوۂ فریاد آیا — خیر میں تجکو کسی طرح سے تو یاد آیا
فاتحہ پڑھنے جو وہ بانیٔ بیداد آیا — قبر میں تجکو قرار او دلِ ناشاد آیا
انکار ہے جو بوسوں کے دینے میں آپکو — ہمسے بھی پھر حضور نہوں خواستگارِ دل

داغ جگر شگفتہ ہیں لالہ سے بھی سوا
او گلعذار دیکھ تو آکر بہارِ دل

رمز۔ منشی بلاس رائے رمز شاگرد شوکت باوجود دریافت کچھ حال معلوم نہ ہوا کلام مطبوعہ کا انتخاب حاضر ہے۔

کشتۂ تیغ محبت کو جلاتے جاتے
کیا بگڑتا جو ذرا لب کو ہلاتے جاتے

کیا مزا ہوتا جو در کا ترے پتھر ہوتا
ٹھوکروں ہی میں تری ہتا میں کے نئے جاتے

شربتِ وصل گر تھا نہ مری قسمت میں
شربتِ مرگ ہی وہ مجکو پلانئے جاتے

رمز بیچارہ ترے عشق میں مرتا ہی رہا
حال بھی تو نے نہ پوچھا کبھی آتے جاتے

قسمتِ جن و ملائک میں کہاں ہیں یہ مزے
ما ہوش کیا کیا بنائے حق نے آدم کے لئے

رمز۔ میر فاضل حسین صاحب لکھنوی شاگرد مشتاق لکھنوی، موجودہ شعرا میں ممتاز ہیں۔ افسوس کہ باوجود دریافت حالات میسر نہ ہوئے۔ کلام بہم رسیدہ کا انتخاب درج کیا جاتا ہے

بے خبر موسیٰ کو کب تھی شوق تھا دیدار کا
برق بن جائیگا ان آنکھوں میں جلوہ یار کا

ابر الطافِ خدا برسا جو ابراہیم پر
آتشِ نمرود تختہ بن گیا گلزار کا

ہے قضا قبضے میں میرے قاتلِ سفاک کے
ہے اجل کا اک طمانچہ وار اس تلوار کا

سجدے کرتے ہیں ہزاروں اشتیاقِ ذبح میں
ہے خمِ محراب کعبہ خم تری تلوار کا

ہے آئینہ میں وہ رخِ گلرنگ جلوہ گر
دنیا میں ہے عکس پڑا ہے گلاب کا

دی کیوں تڑپ کے جان عنادل نے باغ میں
کانٹا لگا زبان میں شاید گلاب کا

اٹھتے ہی آپکے سب اٹھ گئے اسبابِ طرب
بزمِ عشرت نہ رہی عیش کا ساماں نہ رہا

دلچسپ ہے اس درجہ ترا حسنِ مصفا
عارض سے نگاہوں کو پھسلتے نہیں دیکھا

تا آں سبحہ و زنار کا نہیں ہے جدا
کہ ایک ہی ہے خدا شیخ اور برہمن کا

نہ بنئے آنکے رندوں میں اسقدر اے شیخ
جھکائے آپ ہیں گردن کہ ڈھل گیا منکا

جو پوچھا گھر کا نشاں اس شریر دشمن سے
پتا بتا دیا ہنسکر مکانِ دشمن کا

وہ نہ آئیں گے شب وصل یقیں ہے مجکو	تو ہی اے سوت مرے پاس ذرا ہو جانا
کس کا دل بجھ گیا ہے شمع سحر کی صورت	سنتے سنتے جو ہوئی ہے تری محفل خاموش
خواب سے چونکی زلیخا جب تو کہتی تھی یہی	چھپ گیا نظروں سے وہ میری مہ کامل کہاں
طائر دل کو پھنسا کر دام گیسو میں وہ شوخ	بھولے پن سے کہہ رہا ہے تمہارا دل کہاں
ایکدم بھر کو اُٹھا دو رُوئے روشن سے نقاب	حسرت دیدار ہیں عاشق کو تڑپاتے ہو کیوں
ہے ابتدائے اُلفت ابرو میں انتہا	عاشق کی جان جانیکے ساماں ابھی سے ہیں
مسیحانے محبت کی نظر کی	شکایت اب نہیں درد جگر کی
ہمیں تو یاد ہر اک وقت آپ ہی کی رہی	مگر حضور ہیں دل سے ہمیں بھلائے ہوئے
آکر نہ کبھی عاشق مضطر کو جلایا	اعجاز دکھائے نہ مسیحا کے کسی نے
ہٹا سینہ سے گر زانو تو ہوگا حشر عالم میں	ترا بسمل جو تڑپے گا زمیں زیر و زبر ہوگی

رمز۔ سوامی سدانند سرسوتی عرف بہاری لال جی، آپ دکن کے باشندے اور منشی کہنو لال نائب کے ۹۷ء سے شاگرد ہیں، کچھ اشعار ملے اُنکا انتخاب درج ذیل ہے۔

رمز

تیرے میرے بندھ گیا رشتہ صنم تقدیر سے	کھل نہیں سکتی گرہ اب یہ کسی تدبیر سے
بھوک میری کھاتے کھاتے گالیاں جاتی رہی	پیاس بھی ظالم بجھا آب دم شمشیر سے
پھر گئی ساری خدائی ہو گیا دشمن جہاں	پھیر لیں آنکھیں جو تو نے وائے مجھ دلگیر سے
کچھ ایسی بھول بھلیاں ہیں اُسکے کوچے میں	تمام عمر جو گھومے نہ پھر بھی راہ ملے
حرم میں، دیر میں، مسجد میں، کوہ و صحرا میں	کہاں کہاں مرے نالے نہ مجھ سے تباہ ملے

رمز۔ منشی حافظ انوار الحق مدرس مدرسۂ غوثیہ رامپور حضرت داغ کے عقیدت مندوں میں ہیں پہلے کچھ عرصہ اُنکے شاگرد حضرت احسان رامپوری سے بھی اصلاح لی تھی۔ چند شعر ملے درج کیے گئے

رمز

جب وہ چہرے سے نقاب اپنے اُٹھا دیتے ہیں	شیفتہ اپنا زمانے کو بنا لیتے ہیں
فرق آنکھوں میں نہیں فرق ہے بینائی میں	عیب میں عیب ہنر مند ہنر دیکھتے ہیں

دل کبھی دیکھتے ہیں گاہ جگر دیکھتے ہیں	ہدفِ تیرِ نظر دیکھئے کرتے ہیں کسے
مرجاؤں ہیں جو چشم عنایت ادھر نہو	وابستہ تیرے لطف سے ہی میری زندگی

رمق

رمق نجیب اللہ خاں خورجہ کے رہنے والے اور حضرت فتح خاں عمر ڈپٹی عبدالعلیم نصراللہ خاں صاحب تذکرہ گلشن ہمیشہ بہار کے عزیز اور شاگرد تھے غدر سے پیشتر کامل ۲۳ برس اُن کے پاس اعظم گڈھ میں بسر اوقات کی ڈپٹی صاحب موصوف الصدر سے تعلقات قلبی تھے۔ عرصہ ہوا انتقال کر گئے، کلام بہم رسیدہ کا انتخاب حاضر ہے۔

رازِ پنہاں دل کا میرے آشکارا ہو گیا	جبکہ دردِ عشق سے رخ زرد سارا ہو گیا
دار پر منصور سا پھر دوبارہ ہو گیا	لختِ دل جب آکے ٹھیرا نوکِ مژگاں پر مرے
قتل کرنے کا رمق ساماں دوبارا ہو گیا	دیکھنا اُس کا نگاہِ قہر سے عشاق کو
وہ مجھے دیکھا کرے اور میں اُسے دیکھا کروں	دل میں ہے اب قرب میں آئینہ سا پیدا کروں
واللہ یہ سب تیری محبت کا اثر ہے	رخ زرد وم سرد یہ چشم اشک سے تر ہے
اے بیخبر اب تجکو بھی کچھ گھر کی خبر ہے	دلِ میرا تر اگھر تھا سو اب غم نے لیا چھین

رنج

رنج خواجہ محمد نصیر محمدی رنج خلف الصدق خواجہ ناصر عرف میر کلو اکبر آبادی مقیم دہلی، آپ خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کے نواسے اور بقول بعض نبیرہ تھے ولادت آپ کی ۱۱۸۹ھ میں ہوئی، چھٹ پن ہی میں حضرت خواجہ میر درد اپنے نانا صاحب سے دست بیع ہوئے جب اُنکی عمر دس بارہ برس کی ہوئی خواجہ میر درد نے وفات پائی اُسوقت سے ہمیشہ اپنے بزرگ پیر کے فراق میں دل شکستہ اور مغموم رہے آپ کو اکثر علوم خصوصًا ریاضیات میں خوب دخل تھا، علم موسیقی بھی خوب جانتے تھے اور تال اور لے سے ایسے واقف تھے کہ بڑے بڑے استاد انکے سامنے کان پکڑتے تھے، اور خاک چاٹ کر نام لیتے تھے، اپنے ماموں خواجہ صاحب میر تخلص الم خواجہ میر درد کے فرزند ارجمند کے انتقال کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ ہر مہینے دوسری اور چوبیسویں کو

مجلس ہین نوازی کی آپکے رُوبرُو ہُوا کرتی تھی، آخر کو دوسری شوال روز یکشنبہ ۱۲۶۱ھ میں آپنے وفات پائی۔ کبھی کبھی آپ شعر بھی کہا کرتے تھے، حکیم مومن خان مومن آپکے داماد تھے اُنھوں نے یہ تاریخ وفات آپکے غم مہاجرت میں موزوں کی تھی۔

نسخ زماں شد ز دہر وز پئے سالِ وفات	تاریخ	فکر بلندم رہ جنتِ ماوی گرفت
گفت بہ مومن ملک خواجہ محمد نصیر		در رقم ناصر و در دنکو جا گرفت
خط دیکھکر ادھر تو مرا دم اُلٹ گیا		قاصد اُدھر بدیدۂ پُرنم اُلٹ گیا
اپنا وہ تھا کہ جس سے بیگانہ رہے نادانی سے		بیگانہ وہ تھا کہ جسکو جانا اپنا۔ کیا پھر کیا
یقین ہو گیا دیکھ کر اُس کا قامت		کہ بیشک قیامت میں دیدار ہوگا
تیرے بِن جبتک کہ میرا دم رہا		آہ اور نالہ ہی بس ہمدم رہا
کھڑکی نکال جانبِ دشمن نہ بام پر		کوٹھے چڑھی جو بات کھُلی خاص و عام پر
دل یہ جسکے لیئے پہلو میں تپاں رہتا ہے		یُوں سُنا ہے کہ اُسے بھی خفقاں رہتا ہے
آنکھ سے آنکھ جب دوچار ہوئی		زندگی تلخ و ناگوار ہوئی

رنج

رنج حکیم فصیح الدین شاگرد میرزا غالب مرحوم، قاضی خلیل کی بیاض میں ایک شعر قابلِ انتخاب نظر آیا درج ہُوا، میرٹھ میں اُنکی شاعری کا اچھا چرچا تھا مگر کلام باوجود تلاش نہ ملا۔

اِک بار اور میری عیادت کو آیئے	اچھی طرح سے میں ابھی اچھا ہُوا نہیں

رنج

رنج میرزا جان علی نام ابن مرزا تقی بیگ مرحوم کوتوال آگرہ، اور خود بھی محکمۂ پولیس میں ۱۸۶۸ء میں ملازم تھے، فن سخن میں بانکے رائے فرحت سے تلمذ تھا۔ یہ اُنکے کلام کا نمونہ ہے۔

کہا میں نے کہ میں اکثر مسیحا تمکو سُنتا ہوں	ق	دوا کرتے نہیں تو کس مرض کی تم دوا ٹھیرے
گذارش اُسکی سُنئے دُور سے جو پوچھنے آئے		سماعت اُسکی کیجے جو کہ بہر التجا ٹھیرے

تو ہنسکر بولے نصیحت تمکو رب العالمین بخشے
مرض کیسا تبسّم تم تو مالیخولیا ٹھیرے

مروّت چیز کیا ہے؟ ہمتو اک بیدرد قاتل ہیں
ہماری قوم سے باہر ہے جو اہلِ وفا ٹھیرے

رنج

رنجؔ میر محمد علی صاحب تلمیذ حضرت داغؔ دہلوی مرحوم نبیرہ میر محمد حسین خان مرحوم قلعہ گولکنڈہ کے برگیڈ میں کیڈٹ تھے پھر درجہ بدرجہ ترقی پاکر لفٹنٹ ہوگئے، موزونیِ طبع کے اقتضا سے شاعری کا بھی شوق عرصہ سے ہے اور خاصہ کہہ لیتے ہیں کوئی خاص بات قابلِ ذکر اِنکے کلام میں نہیں۔ چند غزلیں ہم پہنچیں اُنکا انتخاب درج ہے۔

رکھدو مرے مزار میں شیشہ شراب کا
بھاگے گا اُسکی بُو سے فرشتہ عذاب کا

توبہ کہاں کی اور کہاں کا پھر اتقا
آیا جب اپنے سامنے ساغر شراب کا

پھیر دیجئے مجھے بیکار ہے لاحاصل ہے
آپکا یہ نہیں ہونے کا پرایا دل ہے

جب کہا غیر سے اب ترکِ محبت کیجے
ہنسکے فرمایا کہ یہ بات بہت مشکل ہے

اِن حسینوں کی جو باتوں میں نہ آیا اے رنجؔ
وہی ہشیار ہے دانا ہے وہی عاقل ہے

دربدر خاک بسر چاک گریباں مضطر
رنجؔ کا حال ذرا دیکھنے کے قابل ہے

سامنے میرے غیر سے شوخی
آنکھ میں تیرے کچھ حیا بھی ہے

وعدہ کرکے بتو نہ ہم سے پھرو
کچھ تو دل میں ڈرو خدا بھی ہے

قیامت میں ہے یہ کون آنیوالا
کہ جسکو دیکھنے خلقت کھڑی ہے

زمین پر گھس رہا ہے سر جو زاہد
یہاں کمبخت کیا دولت گڑی ہے

یہ بیچینی جو اے دل ہر گھڑی ہے
مصیبت تجھپہ کیا ایسی پڑی ہے

نہ جائینگے کبھی مرکر بھی یادرکھ ظالم
مزار ہوگا ہمارا تری گلی ہوگی

اگر درکار ہے تمکو تو لو حاضر مرا دل ہے
تم اپنے پاس رکھو چیز یہ رکھنے کے قابل ہے

وہ اک میں ہوں کہ میری عمر ساری رنج میں گزری
وگرنہ اک زمانہ یا خدا بشاش و خوشدل ہے

ترے وعدے پہ ظالم صبر کرنا سخت مشکل ہے
یہ میرا ہی کلیجہ ہے یہ مجھ کمبخت کا دل ہے

مرے پہلو میں تھا جبتک نہ تھی کچھ قدر مجکو بھی
گیا جس روز سے پہلو سے زباں پر اُڑا دل کی ہے

رنجور

رنجور۔ شمس العلماء مولوی محمد یوسف عظیم آبادی چیف مولوی بورڈ آف اکزامینرز کلکتہ، پٹینہ کے ایک موقر اور باعلم خاندان کے رکن ہونے کے علاوہ خود بھی صاحب جوہر اور باکمال ہیں، زبان پر حیرت انگیز قدرت حاصل ہے اور طبیعت میں شوخی اور بذلہ سنجی کا خاص مادہ ہے، پرگو بھی بہت ہیں اکثر رسالوں میں بطرح کلام چھپواتے رہتے ہیں، اخلاقی اور عشقیہ دونوں طرح کے مضامین نظم کرتے ہیں، فن سخن کی استعداد بھی عالمانہ ہے، متانت کے ساتھ جابجا شوخی کا اظہار بھی دل پسند پیرایہ میں کلام میں موجود ہے۔

دشمن نظر بچا کے دبے پاؤں ہٹ گیا
میں اپنے سر یہ کھیل کے مقتل میں ڈٹ گیا

کیا کروں ذکر نوجوانی کا
بھولنا بہتر اس کہانی کا

تابِ دیدارِ یار دیکھ سنبھل
اسکو دعوی ہے لنترانی کا

مجکو تحقیق سے ہوا ثابت
لفظ مہمل ہے شادمانی کا

جھیل لیں جب بلائیں فرقت کی
خوف کیا مرگِ ناگہانی کا

شرر عشق نے وہ آگ لگائی دل میں
گھر جلا سامنے اور ہم سے بجھایا نہ گیا

کہتے ہیں دیکھ کے مُلکِ دلِ ویراں میرا
آجتک کیوں کوئی شہر یہیں بسایا نہ گیا

زندگی میں تو رفاقت کا کبھی بھرتے تھے دم
قبر میں ساتھ کوئی اپنا پرایا نہ گیا

کسکے کام آیگی پھر تیری مسیحائی یار
کشتہ اپنا ہی اگر تجھ سے جلایا نہ گیا

شوق تھا چلمن اُٹھانے کا کہ روکا شرم نے
مجھپہ حسنِ یار آفت ڈھاتے ڈھاتے رہگیا

بولے وہ مجکو مرنے پہ تیار دیکھکر
خوش ہوگئے ابتو حور و کل و بہار دیکھکر

کرتے وہی ہیں راہ ترقی کی جلد طے
چلتے ہیں جو زمانے کی رفتار دیکھکر

کب سے دل میں مرے مہمان بنے بیٹھے ہیں
مجھ سے ابتک مگر انجان بنے بیٹھے ہیں

انتظار اُن کا عبث اے دلِ مشتاق نہ کر
وہ کسی اور کے مہمان بنے بیٹھے ہیں

ہر ادا اُنکی مری جان لئے لیتی ہے
گو وہ ظاہر میں مری جان بنے بیٹھے ہیں

دل میں تو حضرتِ رنجور کے ہے عشقِ بتاں
گو یہ ظاہر میں مُسلمان بنے بیٹھے ہیں

کیوں ہم تری تلاش کو دیر و حرم میں جائیں
وہ کونسا مکان ہے جہاں تُو کہیں نہیں

کیا حور کی تلاش میں آتا ہے روز ادھر؟
زاہد یہ کوئے یار ہے خلدِ بریں نہیں

اے دل سمجھ کے کوچۂ دلبر کا قصد کر
واقع میں ہے وہ چرخِ ستمگر زمیں نہیں

کچھ لامکاں میں گھر تو نہیں ہے رقیب کا
پُوچھا کہاں گئے تو وہ بولے کہیں نہیں

رنجور حالِ دل بُتِ کافر سے کیا کہوں
کہتا ہے تیری بات کا مجکو یقیں نہیں

آپ اِس وقت اگر غیر کے گھر جاتے ہیں
ہم بھی اب کرتے ہیں دنیا سے سفر جاتے ہیں

شیخ جی پُوچھتے کیوں ہیں کہ کدھر جاتے ہیں
ہم بھی جاتے ہیں اُدھر آپ جدھر جاتے ہیں

شیخ جی! حوروں کے مسکن کی تو یہ راہ نہیں
کوچۂ یار ہے یہ آپ کدھر جاتے ہیں

ایسے وعدوں سے ہو کیا خاک میرے دلکو خوشی
وعدہ کرتے تو ہیں پھر کرکے مُکر جاتے ہیں

شیخ دوزخ سے ڈرانے کی ضرورت کیا ہے
ہمتو صورت ہی تری دیکھ کے ڈر جاتے ہیں

کوئے دلدار میں کچھ ایسی کشش ہے ناصح
لاکھ چاہیں نہ وہاں جائیں مگر جاتے ہیں

باقی دنیا سے غم ارمان ہے تیغِ عشق سے آرام دل کی ارمان ہے تیغِ عشق

یُوں ایک دوسرے کا ہی ہمارا رہبر ہیں
دل میرا غمگسار تو میں دکھایا رہوں

گمرہانِ قوم کے کیا خاک ہو گے راہبر
خود چلو اے واعظو تم راہ پر اتنا تو ہو

سامنے تیرے اگر وہ پیاری صورت آئیگی
پھر نہ واعظ تجکو یادِ حورِ جنت آئیگی

اُس بلائے جاں کی اُلفت میں کہاں حسب النصیب
ایک آفت جائیگی تو ایک آفت آئیگی

میں وہ وحشی ہوں کہ آئے روبرو مجنوں اگر
میری صورت دیکھکر اُسکو بھی وحشت آئیگی

کھو کے اُمیدوں کو ای یاس تجھے پایا ہے
تُو بچا تا کہ غنیمت ہے تری ذات مجھے

بیاں کیا ہو سکے رُتبہ مرے دلکا کہاں تک ہے
یہ ہے عرشِ خدا اسکی بلندی لامکاں تک ہے

ستم اُس بانیٔ بیداد کا مجھپر یہاں تک ہے
کہ اُسکو دیکھ کر چُپکے ہیں ظالم آسماں تک ہے

تمھاری خانقاہ اے شیخ جی تمکو مبارک ہو
بہت تحقیق پر میں نے اگر پایا تو یہ پایا
تجھے کیا واسطہ شوقِ حصولِ قربتِ حق سے
کروں کس منہ سے یارب شکوہ تیری مہربانی کا
معطر ہے دماغ حضرتِ رنجور مرقد میں

رسائی ہے سے رندوں کی درِ پیرِ مغاں تک ہے
وجودِ دوستی گر ہے تو یاروں کی زباں تک ہے
تری پرواز اے واعظ فقط حورِ جناں تک ہے
کہ مجھ پر مہرباں اب وہ بتِ نامہرباں تک ہے
کہاں کھولے ہیں گیسو یار نے خوشبو کہاں تک ہے

مدح گوئی کا صلہ دشنام ہے
اب کہاں وہ نامۂ پیغام ہے
تھی خطا میری کہ میں نے دل دیا
اُنکے بھولے پن کے صدقے جایئے
پوچھتے ہیں آکے میری قبر پر
اُن سے اے رنجور امیدِ وفا

واہ کیا سرکار کیا انعام ہے
دوستی باقی برائے نام ہے
آپ کا بیشک بجا الزام ہے
کہتے ہیں مجھ سے تمھیں کیا کام ہے
انکو تم کو ہر طرح آرام ہے
کس طرف تیرا خیالِ خام ہے

ترجیع بند

پر یہ تمھارا اتفاق ہے اب کس شمار میں
کس کو غرض دھرم سے کسے کام دین سے
پڑھتے ہیں سب بجائے غزل کے بلینک ورس
ماں باپ کا ادب ہے نہ اُستاد کا لحاظ
کیوں بیخ و بن سے اُکھڑے نہ وضعِ قدیم شرق
مطرب نیا ہے یار نیا مے بھی ہو نئی

یورپ میں ہر طرف ہیں پرستاں نئے نئے
ہندو نئے نئے ہیں مسلماں نئے نئے
اب ہیں مشاعروں میں غزل خواں نئے نئے
پڑھتے سبق ہیں طفلِ دبستاں نئے نئے
آتے ہیں سمتِ غرب سے طوفاں نئے نئے
عیش و طرب کے ہیں سبھی ساماں نئے نئے

گناہ دھونے کو یہ التزام کرلیں گے
نمازِ شیخ ریائی کے پیچھے ہے مکروہ
بتوں کے عشق میں واعظ مضائقہ کیا ہے
کبھی یہ حضرتِ دل چین سے نہ بیٹھیں گے

وضو شراب سے ہم صبح و شام کرلینگے
ہم اپنے پیرِ مغاں کو امام کرلینگے
خدا خدا نہ سہی رام رام کرلیں گے
ہمارا کام نہ جبتک تمام کرلیں گے

میری تربت پہ وہ آتے ہی ہوا اشک فشاں
جبکہ نیت پہ ہے اے شیخ مدارِ اعمال
دیکھ کر خاک مری ہو گیا پتھر پانی
پی بھی لے مے کہیں کمبخت سمجھکر پانی

کیوں کہوں یہ مکان میرا ہے
چاندنی رات میں اندھیرا ہے
رات بھر کا فقط بسیرا ہے
کہ جدا مجھ سے ماہ میرا ہے

سوالِ وصل کا گر وہ نہیں جواب نہیں
سکوت سے بھی تو آدھی رضا نکلتی ہے

ادا، ناز، انداز، شوخی، کرشمہ
حسینوں کو آتے ہیں فن کیسے کیسے

وصف لکھتا ہوں اس پریرو کا
شعر میرا پری نہو جائے
غیر میری بدی کے درپے ہے
یہ مری بہتری نہو جائے
وہ عیادت کو آتے ہیں رنجور
دلدہی دلبری نہو جائے

سنا ہیں کیونکہ اسے رحلتِ عدو کی خبر
نہ جانیں سن کے وہ کیا اپنا حال کر بیٹھے

کچھ نہ پوچھو حال مستانِ شرابِ عشق کا
جھوم کر جس وقت آتی ہو گھٹا برسات کی
آسماں پر جابجا ہیں کالی کالی بدلیاں
یا یہ ہے بکھری ہوئی زلفِ رسا برسات کی
بدلیوں کا گھر کے آنا۔ بجلیوں کا کوندنا
کیا ہی دل آویز ہے ہر اک ادا برسات کی
شیخ! کیوں تیرے تقدس پہ ہم ایماں لائیں
وحی کیا آئی ہے یہ عرشِ بریں سے کوئی
آنے والا ہے عیادت کو وہ رشکِ عیسیٰ
مژدہ کہہ آئے یہ رنجورِ حزیں سے کوئی

ہجر میں اے قیس تو کھوتا ہے کیوں ہوش و حواس
وصل ہو کیا ہجر لیلیٰ کی رضا کے سامنے

رند

رند۔ لالہ گھیم نراین رند لکھنوی نبیرۂ راجہ لچھمی نراین امیر عہد عالمگیر ثانی۔ طب میں معقول دستگاہ رکھتے اور مہاراجہ ٹکیت رائے دیوان آصف الدولہ کی رفاقت میں بسر اوقات کرتے تھے، فارسی شعر بیشتر کہتے تھے، آخر عمر میں کلکتہ جا رہے تھے اور ہوگلی میں مکان بنالیا تھا، مولوی حفیظ الدین شہید انکے نامور شاگرد تھے۔

نالۂ طنبور و چنگ اے اہلِ غفلت تم سنو!
ہے ہنر اسکی کہ روز و شب وہ پائے گوشمال
ق
گوش زد ہوتی ہے ہر دم یہ نصیحت ساز سے
رازِ دل بے پردہ جو کہدے بلند آواز سے

رند

رند مہربان خان از ملازمان نواب احمد خان بنگش فرخ آبادی، شوق لکھتے ہیں کہ جوان قابل قدردان اہل دل، دوستدار انسان اور طبیعت انکی علم موسیقی کی طرف ازحد مائل تھی مرزا رفیع السودا اور سوز کے شاگردوں میں سے تھے طبیعت موزوں اور مناسب پائی تھی بقول شوق ایک دیوان ضخیم پچاس ہزار اشعار کا ترتیب دیا تھا، کچھ دنوں نواب افراسیاب خاں کی سرکار میں بھی متوسل رہے، مرزا رفیع السودا نے انکی تعریف میں قصیدے لکھے ہیں، شرف الدین احمد لکھتے ہیں کہ باوجود بے علمی شعر خوب کہتا تھا اور اکثر ٹپہ انکے بنائے ہوئے لوگ گاتے پھرتے تھے، یہ چند شعر انکے ملے ہیں۔ درج تذکرہ کیے جاتے ہیں *

رات کو امید ہے کچھ دن کو ہو جاتا ہے کچھ
بے وطن، بے رفیق، بے اسباب
ترستے ہی چلے دنیا سے ہم او بیوفا ظالم
کبھی جو روبرو جاتا ہوں تو کہتا ہے جھنجلا کر
غنیمت ہے جس ڈھب سے کٹے زندگانی
یارب کہیں سے گرمی بازار بھیجدے

کیا کروں شکوہ الٰہی گردش افلاک کا
کون ایسا غریب ہووے گا
نہ دیکھا مرتے مرتے آخری دیدار یا قسمت
پڑے ہو سامنے سے سُن لے و فریاد کی صورت
کہاں دن کہاں غم، کہاں یار جانی
دل بیچتے ہیں کوئی خریدار بھیجدے

ہمکو نہ کچھ سیم نہ زر چاہئے ۔ لطف کی اک تیری نظر چاہئے
مجکو صدقے تو یار ہو جیے ۔ آپ پر سے نثار ہو جیے

نوٹ چند شعر انکے دیوان میں دیکھے گئے جن کی نسبت میر سوز کہتے ہیں کہ یہ انکا کلام ہے اور بعض میرزا رفیع السودا سے منسوب کرتے ہیں واللہ اعلم وہ اشعار یہ ہیں۔

مبارکباد دو ہمکو کہ پیغام بہار آیا * جنھوں نے پھر ستایا پاؤں اب پڑنے کو خار آیا

جس کا تجھ سا رقیب ہووے گا ۔ اُس کا عالم رقیب ہووے گا
سبھی ہیں و لکے لیجانیکی باتیں ۔ سمجھتا ہوں یہ پھسلانے کی باتیں

گٹ پس کے پائے یار سے کیا لگ چلی حنا ۔ صد آفریں یہ کام جو یوں دست بستہ ہو
بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی ۔ بیچ کھاتے ہیں جو یوسف سا برادر ہووے

میرے سینہ کا داغ روشن ہے
تیرے گھر کا چراغ روشن ہے

دلکا گھبراتا کہوں یا کہ قفس کی تنگی
ہے یہی میری جان کا دشمن
دیکھئے کیا کرے صیاد قفس کی تنگی
رند اس دل کو خوار ہونے دے

رندؔ۔ پنڈت گنگا پرشاد کشمیری لکھنوی، خلف پنڈت بشن چند۔ جوان۔ خوشرو وخجستہ خو، مشرب رندانہ رکھتے تھے، سررشتہ دار عدالت آگرہ رہکر تحصیلدار و افسر پولیس مقرر ہوئے اور ایک عرصہ تک میرٹھ، بریلی، بجنور، فرخ آباد، آگرہ اور متھرا میں بہ سلسلۂ ملازمت اقامت پذیر رہے گلشن ہمیشہ بہار میں لکھا ہے کہ نظیر الدین حسین شائق سے اصلاح سخن لیتے تھے اور مصنف کے بلا تکلف دوست تھے، بقول شیفتہ جرأت کے شاگرد تھے مگر یہ بات غلط ہے، ڈپٹی عبد العلیم انکی عنائی جامہ زیبی، خوش خلقی، رنگین مزاجی، ہر دلعزیزی۔ رندانہ وضعی۔ شگفتہ طبعی کی بیحد تعریف کرتے ہیں۔ اور فی الحقیقت انکی طبیعت کا رنگ کلام سے اچھی طرح ظاہر ہے، زبان بہت صاف شیریں، روزمرہ پاکیزہ۔ محاورات کا استعمال بہت مناسب طریقہ سے کرتے ہیں، مضامین میں تازگی اور خیالات میں جدت اور نفاست انکا حصہ ہے۔

سیلِ خوں تھا جو بہا آنکھوں سے
دیکھ! پھر ہمکو نہ دیکھے گا تو
حسن پریوں کا سُنا کرتے ہیں
نہ تو کی نالۂ شب سے تاثیر

تم نے دلکو نہ جگر کو دیکھا
یار جو تو نے اُدھر کو دیکھا
عشق دیکھا تو بشر میں دیکھا
نہ اثر آہِ سحر میں دیکھا

ابتو چارہ کوئی باقی نہیں بیچاروں کا
آخری وقت ہے پیارے ترے بیماروں کا

دُنیا میں نہ ہو شیفتہ انسان کسی کا
عشاق تو جل جل کے ہوئے سرو چراغاں
دل ہاتھ سے جاوے نہ مری جان کسی کا
پروہ نہ ہوا شمع شبستان کسی کا

جلاتی ہے تپ عشق آہ جیتے جی بدن میرا
جل چکا میں خاک میں اور دل میں ہی تیرے غبار
موئے پر یا الٰہی کب یہ چھوڑیگی کفن میرا
جان! مجھ سے اس قدر کس نے مکدر کر دیا

یہ دل پھر ان دنوں وحشت میں آیا — نہیں تدبیر کچھ چلتی خدایا

سو بار میں اس کوچہ میں جا شور کر آیا — یہ بھی نہ کہا اس نے کہاں تھا کدھر آیا

وہ رشک قمر رات جو خود میرے گھر آیا — شاید مرے نالوں میں ہے اب کچھ اثر آیا

کیا خاک توقع ہو بھلا زیست کی یارو — جب اشک کے ساتھ آنکھوں سے لخت جگر آیا

سچ ہے کہ جو آ بنتی ہے جی پر تو عزیزو — سوجھے ہے پھر اس وقت نہ اپنا نہ پرایا

دم رکنے لگا نبضیں چھٹیں بیٹھ گئے دانت — پر پھر بھی وہ بے رحم نہ لینے خبر آیا

مارا مجھے ترسا کے جو بے ترس خدا یوں — کیا ہاتھ ترے او بت بیداد گر آیا

یہ حال ہے میرا کہ تڑپتا ہوں شب و روز — بے مہری پہ جب سے کہ وہ رشک قمر آیا

دل ہوا خوں اور جگر بھن کر کباب — ہت ترے عشق کا خانہ خراب

فصل گل ہے اور ہنگام شباب — ہاں مغنی نغمۂ چنگ و رباب

جرعۂ مے حضرت پیر مغاں — اب ثواب اس میں ہو صاحب یا عذاب

فصل گل میں منع مے کرتے ہو شیخ — ہے خطا پر آپ کی رائے صواب

دیکھ اس بحر فنا میں آنکھ کھول! — رند چشمک تجھ پہ کرتا ہے حباب

روتا ہوں چھپکے چھپکے آتا ہے یاد جس دم — وہ دیکھنا کسی کا آنکھیں چرا چرا کر

تجھے جس نے دیکھا نگارا زمیں پر — کہے ہے کہ اترا ہے تارا زمیں پر

کوئی پھول گلشن میں تجھ سا نہ پھولا — ہوا جب سے تو آشکارا زمیں پر

تری راہ میں فرش ہیں دیدہ و دل — نہ رکھ پاؤں پیارے خدارا زمیں پر

زمانہ میں تیرا یہ شہرہ ہے پیارے — کہ آیا دوبارہ مسیحا زمیں پر

جی میں آوے ترے مل خواہ تو مت مل آکر — پر وفاداروں کے ٹلتے ہیں کہیں دل آکر

مانتے ہو گر مرے معشوق کہنے سے برا — ہم تمہیں مشہور اپنا چاہنے والا کریں

آپ جب غیروں سے ہنس ہنس کے لپٹ جایا کریں — روتے روتے کیوں نہ پھر آنکھیں مری آیا کریں

آنکھ مجلس میں لڑا یا مت کرو ہر ایک سے
جاویں گر کوچے میں اُسکے تو ہی بدنامی کا ڈر
سخت مشکل ہے غرض کچھ بن نہیں آتی ہے بات
ق
تم ہمیں دیکھا کرو اور ہم تمھیں دیکھا کریں
اور نجاویں واں تو کبتک ہجر میں تڑپا کریں
یوں کریں تو کیا کریں اور وُوں کریں تو کیا کریں

ہم اُٹھ تو چلے تری گلی سے
پھر دیکھیے آہ اپنی تقدیر
قطعہ
لیکن دلِ زار ناتواں کو
لیجاتی ہے یہ کہاں کہاں کو

بزم خوباں کو جو ساتھ اُنکے لگا ہیں چلنے
خیر چلنے کو تو چل پر یہ ذرا رکھیو یاد
تو لگے کہنے طبیعت کہیں آئی ہوگی
گر کہیں آنکھ لڑائی تو لڑائی ہوگی

بدن ہے یا سمن یا نسترن ہے
خیالِ زلف میں رہنا پریشاں
جہاں وہ گلبدن ہو جلوہ فرما
دمبدم لب پہ آہ جاری ہے
جو وہ گلرو نہیں چمن میں تو اب
دل کسی قدرداں کو دیجیے رند
الٰہی قد ہے یا سروِ چمن ہے
ارے دل یہ ترا دیوانہ پن ہے
اگر بن ہے تو پھر وہ بھی چمن ہے
بیقراری سی بیقراری ہے
بوئے گل سے دماغ بھاری ہے
اب اگر زندگی ہماری ہے

دکھانا ہے تو صورت دکھا بہرِ خدا پیارے
کیا ہے اُسنے یاں آنیکا وعدہ شاید آجائے
ہمیں تو یار بھی وہاں تک نہو اور غیر ہم صحبت
عبث کیوں چھیڑتا ہے سامنے غیروں کے تو مجکو
کہ ہے مہماں کوئی دم کا اب عاشق ترا پیارے
دلا تب تک صبر کر بھائی نہ اتنا تلملا پیارے
تری تقصیر کیا یہ وقت کا ہے مقتضا پیارے
بُرے ہیں یا بھلے ہیں پر ترے ہیں مبتلا پیارے

وہی فغاں ہے وُہی آہ ہے وہی نالہ
نکلا کبھی نہ گھر سے وہ بیرحم دیرتلک
خدا کے فضل سے اپنا جو حال ہے سو ہے
چوکھٹ سے اُسکی مر گئے سر مار کے

کئے زخم جگر کے ہائے درماں کتنے ہی ہمنے
کا سش وہ ترکِ خطا کا کل پیچاں باندھے
گئے آخر کو مرہم پر نہ کی تاثیر مرہم نے
بے خطا جاتے ہیں رشتِ گبر و مسلماں باندھے

بھلا وحشت نہ کیونکر فصل گل میں ہو لگو ہوئے رند	لئے یار بہاری ہاتھ میں زنجیر پھرتی ہے
خدا کے واسطے تو دل کسی سے مت لگا پیارے	بگڑ جاویگی یہ صورت بھلی چنگی سُنا پیارے
تمھیں کیا عشق کرنا زیب دیتا تھا بھلا پیارے	نہیں سنتا ہے یہ تو سچ ہے قسمت کا لکھا پیارے
لگا کیا روگ تمکو سچ کہو بہر خدا پیارے	وگرنہ ان دنوں کیوں مضمحل ہو تم بھلا پیارے
رواں ہیں لخت دل آنکھوں سے اور چہرہ پہ زردی ہے	یہ ہے کیا زنگ ہے ہے اور یہ کیا گل کھلا پیارے
ہوئی کیا ہائے وہ گرمی وہ شوخی اور وہ چالاکی	یہ کس کے غم میں حال ایسا تمھارا ہو گیا پیارے
گریباں چاک سر پر خاک لب خشک اور آنکھیں تر	زباں پر آہ اور دل یوں رہا ہے مبتلا پیارے
خدا حافظ ابھی سے ہے اگر یہ عشق کی گرمی	تو جلدی حال ہوگا رند کا سا آپ کا پیارے
عشق تو وہ بد بلا ہے یہاں کہ غارت ہو گیا	قیس تیرے ہاتھ سے فرہاد تیرے ہاتھ سے
دیکھ کر تصویر ہی لاچار ہم بہلائیں جی	کھنچ سکے شکل اسکی گر بہزاد تیرے ہاتھ سے
اے جزاک اللہ مدت بعد سُنتے ہیں کہ رند	پھر ہوا ہے دشت قیس آباد تیرے ہاتھ سے

رند

رند - نواب احمد علی خاں بہادر رند والئی رامپور ۱۸۴۰ء میں پچپن برس زندہ رہکر اور سینتالیس سال حکومت کرنے کے بعد انتقال کیا، ریاست انکے عہد میں بالکل تباہ ہو گئی تھی، انتظام و کاروبار ریاست کی طرف سے بالکل بے خبر رہتے تھے، امیرانہ عیش و نشاط سے زندگی بسر کرنا ہی اپنا اصول سمجھتے تھے انکے چچا زاد بھائی نواب محمد سعید خاں جو اُس زمانے میں دہلی میں ڈپٹی تھے اور نواب کلب علیخاں کے دادا انکے جانشین ہوئے، یہ چند شعر انکے ہیں۔

قطعہ

سیر کو جب چمن کی جاتا ہے	باغ پھولا نہیں سماتا ہے
مہر ہو یا کہ بے وفائی ہو	رند اس در سے کوئی جاتا ہے
حشر کو جب حساب مانگیں گے	الاماں شیخ و شاب مانگیں گے
اپنے ساقئ لاابالی سے	رند واں بھی شراب مانگیں گے

رند

رند منشی اکرام الدین دہلوی رند برادر ماموں زاد مولوی عبدالکریم سوز خلف مولوی امام بخش

صہبائی۔ اپنے بھائی کے شاگرد اور علم طب میں بھی دخل رکھتے تھے ایام غدر میں جوان قضا کر گئے۔ منتخب کلام درج ذیل ہے۔

تری زلف بکھری بکھری جو نہ دیکھتے کبھی ہم
تو نہ ہوتے یوں پریشاں نہ یہ حال زار ہوتا
مرے نام سے ہے ظاہر مرا حال میکشی کا
مجھے رند کون کہتا جو نہ بادہ خوار ہوتا

تو نے جلا جلا کے ہمیں خاک کر دیا
اور خاک ہو گئے تو صبا نے اڑا دیا
تو نے ہماری یاد کو خاطر سے اپنی ہائے
حرفِ غلط کی طرح سے ظالم مٹا دیا
ہم پر تو التفات نہ تھی لیک بزم میں
ساقی نے رند جان کے ساغر پلا دیا
کارگر دل میں یوں ہوئے مژگاں
جس طرح ناوکِ قضا بیٹھے
دل میں آنا ترے نہیں مشکل
ہو گئے جب غبار آ بیٹھے

رند۔ نواب سید محمد خان خلف الرشید نواب سراج الدولہ غیاث محمد خان نیشا پوری جو نواب سعادت خاں برہان الملک صوبہ دار اودھ کے حقیقی بھانجے تھے بعہد آصف الدولہ بہادر ۱۱ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ کو جمعہ کے دن بمقام فیض آباد پیدا ہوئے۔ چونکہ انکی دادی نواب سعادتخان برہان الملک کی حقیقی بہن تھیں خاندان شاہی سے قریبی تعلق تھا۔ اور ۲۸ سال تک زیر نگرانی جناب امۃ الزہرا بیگم عرف بہو بیگم زوجۂ نواب شجاع الدولہ مرحوم محلات شاہی میں بناز و نعمت پرورش پائی۔ جب تک فیض آباد میں مقیم رہے میر مستحسن خلیق سے جنکی صفت صرف اسقدر کافی ہے کہ وہ میر انیس کے والد بزرگوار اور استاد تھے۔ اصلاح لیا کرتے تھے اور اس زمانہ میں وفا تخلص کرتے تھے ایک دیوان بھی مرتب کر لیا تھا جب بہو بیگم صاحبہ جنت نصیب ہوئیں اور استاد موصوف بھی فیض آباد سے فرخ آباد چلے گئے تو یہ رجب ۱۲۴۲ھ میں لکھنؤ آئے اسوقت یہ دار السلطنت بھی علم و فضل کا مخزن، شاعری و نثاری کا معدن زبان و محاورات و فصاحت و بلاغت کی ٹکسال تھا، اس باکمال عہد میں فن شاعری میں کامل ہو جانا ہر شخص کے لیئے ایک ادنی توجہ سے ممکن تھا، نہ کہ رند جیسے ذہین، طباع، نکتہ رس، عاشق مزاج کے لیئے جو اردو لکھنؤ

ہونے سے قبل ہی اپنے ہمچشموں سے کچھ بہت پیچھے نہ تھا، یہاں آکر آتش کے زمرۂ حلقہ بگوشان میں داخل ہو گئے۔ اور سابقہ کلام تمام و کمال تلف کر دیا۔

اِن کی شاگردی رند کے لیئے تو باعثِ شرف ضرور تھی لیکن آتش کے لیئے بھی یہ کچھ کم باعثِ فخر نہ تھا کہ رند کا سا طباع اور نادر الکلام استاد اُس کا شاگرد ہوا۔ آتش کے تلامذہ میں علاوہ رند کے خلیل۔ صبا اور نسیم نے بھی بہت شہرت پائی اور اُستاد کا نام خوب روشن کیا۔ لیکن باغ خلیل پر قبل از وقت خزاں آگئی۔ صبا کا کیا ٹھکانا۔ نکتہ چین کہتے ہیں کہ ہوا کا ایک جھونکا تھا جو ادھر آیا اُدھر گیا۔ نسیم نے البتہ بقائے دوام کا خلعت پایا۔ مگر وہ صرف گلزار کی بدولت لکھنؤ کے بعض سن رسیدہ بزرگوں سے سُنا کہ خلیل جناب صبا رند سے بہتر اور افضل تھے۔

محاورات روزمرّہ، شوخی وطراری، فصاحت وسادگی، تاثیر اور معنی آفرینی کے جوہر کو قسّامِ ازل نے رند میں خاص طور پر ودیعت رکھا تھا۔ معاملات راز ونیاز میں کوئی جگ بیتی کہتا ہوگا مگر رند آپ بیتی کہتا تھا، ان کا مجموعۂ غزلیات اُن تمام رندانہ، عاشقانہ مضامین کا گنجینہ ہے جو ایک مہذب زبان کے دلکش لفظوں میں ہونا چاہیئے۔ با ایں ہمہ درد وغم، تصوف ومعرفت، تربیت واخلاق حکیمانہ وفلسفیانہ رنگ کی چاشنی انکے کلام میں موجود ہے، علاوہ ازیں انکی غزلیات میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ وہ کبھی تو میر وسودا کے مقابل آتے ہیں کبھی باندازِ جرأت ومصحفی مترنّم ہوتے ہیں یا مومن وغالب کا طرز بیان اختیار کرتے ہیں اور کبھی نواب مرزا شوق کی زبان بولنے لگتے ہیں۔ کُلیّات رند جو اس وقت رائج ہے اُس میں ایک تو دیوان گلدستۂ عشق ہے جس کو سنہ ۱۲۵۰ ہجری میں شاعر نے خود مرتب کیا تھا اور دوسرا دیوان غیر مکمل ہے جو غالباً بعد کو ترتیب دیا گیا، رند نے اس منزل کو کامیابی کے ساتھ طے کر کے ثابت کر دیا کہ وہ اگرچہ اودھ کا ایک نواب زادہ ہے لیکن اُسکی نظر صرف معاملات دنیا اور معشوقان بازاری کے نازو انداز ہی کی طرف نہیں ہے بلکہ وہ نیچر کے ہر ایک حُسن اور دلکشی سے بہرہ اندوز ہوتا اور اُس سے ایک مفید سبق حاصل کرتا ہے اور دوسروں کو مستفیض کرتا ہے۔

رند کی پرائیوٹ زندگی کی بابت یہی لکھنا کافی ہے کہ لکھنؤ کا ایک نوجوان حسین، عاشق مزاج اور دولتمند رئیس زادہ بادشاہ نصیر الدین حیدر کے عہد میں جس چال ڈھال کا ہوسکتا تھا ویسے ہی حضرت رند بھی تھے مگر "محتسب را درونِ خانہ چہ کار" وہ آخر عمر میں تمام معاصی، ملاہی اور منہیات سے تائب ہوگئے بلکہ اُستاد کے مرنے کے بعد شاعری بھی رفتہ رفتہ بالکل ترک کردی، دربار اودھ کی سازشوں اور فتنہ پردازیوں سے برداشتہ خاطر ہوکر غدر سے کچھ دنوں قبل ہجرت کی نیت کی اور بغرضِ حج و زیارت کربلا و نجف اپنے عزیز وطن اور پیارے اختر نگر (لکھنؤ) کو ہمیشہ کے لیئے الوداع کی اور نظم اُردو نے بڑی حسرت و بیکسی سے اُنکو یہ کہکر رخصت کیا کہ (ع) "تم آپ چلے مجکو کیا کس کے حوالے" انسان کیا چاہتا ہے اور کیا ہوتا ہے۔ چونکہ حج و زیارت کی سعادت اُنکی قسمت میں نہ تھی اِس لیئے بمبئی میں پہنچتے ہی بیمار ہوگئے، اول تو پیرانہ سالی اُس پر شدتِ مرض تاب و طاقت نے جواب دیا اور چارپائی پر ایسا گرا کہ چار ہی کے کاندھے پر اُٹھے۔

تو گرفتاری میں چندے یادِ گلشن کی رہی — اب قفس سے چھوٹ کے گھر یاد آئیگا صیاد کا
ضبط کرتے کرتے مرغانِ قفس تنگ آگئے ہیں — اب رہائی اُنکی ہو یا حکم ہو فریاد کا

صیاد تیرے دام سے آساں تھا چھوٹنا — مشکل یہ ہے کہ تجھ سے مرا دل اٹک گیا

مطلب ہیں صفا ہو یہ تکلف ہے زباں کا — دقت ہوئی معنی میں تو کیا لطف بیاں کا
مے پیکے جواں دیتے ہیں ساقی کو دعائیں — تا دورِ فلک دور رہے پیرِ مغاں کا

ہو گیا آبِ دمِ تیغ سے بسمل ٹھنڈا — کیوں؟ ہوا ہے تو کلیجہ ترا قاتل ٹھنڈا

ہوا کیا چاہ سے حاصل نچا ہوگئے تو کیا ہوگا — کیا یہ کچھ محبت میں خفا ہوگئے تو کیا ہوگا
ٹوٹے بُت، مسجد بنی، مسمار بتخانہ ہوا — جب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ ہوا
زلفیں چھوڑی ہیں کہ چھوڑا اُسنے جوڑا سانپ کا — دیکھیے کس کس کو ڈستا ہے یہ جوڑا سانپ کا
دونوں زلفیں یار کی ہلتی ہیں نالوں پر مرے — وجد کرتا ہے صدائے نے سے یہ جوڑا سانپ کا

پائی خبر جو آمدِ فصلِ بہار کی
کیا پھڑپھڑا کے مُرغ گرفتار رہ گیا

پھینک دونگا میں ملا سے چیر کے پہلو اپنا
تجھپہ قابو نہیں دلپہ تو ہے قابو اپنا

کب مٹا عشق کا نشاں دل سے
زخم اچھا ہوا تو داغ رہا

ناز بیجا اُٹھایئے کس کے
اب نہ وہ دل نہ وہ دماغ رہا

مسافر تھے عدم کے سیر کرنے یاں بھی آئے تھے
رہے یاں جبتلک قسمت میں یاں کا آب و دانہ تھا

ہیں بھلا کیونکر کہوں منکو برا
آپنے جو کچھ کیا اچھا کیا

عشق میں حالِ جہاں نوع دگر ہونے لگا
لے پری دیوانہ تجھپر ہر بشر ہونے لگا

بتانِ سنگدل سے بے سبب کیوں دل لگا بیٹھے
یہ شیشہ دیدہ و دانستہ کیوں پتھر پہ دے پٹکا

خاک چھنوائی اُس کے کوچے کی
بیٹھے بٹھلائے دل اُٹھا لایا

تابِ نظارۂ دیدار نہ لاؤ گے کلیم
پڑے پڑ جائینگے آنکھوں پہ جو پردہ اُٹھا

ضعف ایسے کہتے ہیں سینے سے لبوں تک آتے
سو جگہ راہ میں نالہ مرا بیٹھا اُٹھا

بن پڑا کچھ نہ علاجِ تپِ فرقت اس سے
ہاتھ ملکر مری بالیں سے مسیحا اُٹھا

حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا
سب سے بیگانہ ہے لے دوست شناسا تیرا

کوہ فرہاد سے مجنوں سے بیاباں جیتا
وحشتِ دل ترے اقبال سے میدان جیتا

چلکے اب عرض کرو حضرتِ آتش سے رند
معرکہ آپکا یہ طفلِ دبستان جیتا

کھلی ہے کنجِ قفس میں مری زبان صیاد
میں ماجرائے چمن کیا کروں بیان صیاد

دکھایا کنجِ قفس مجھکو آب و دانے نے
وگرنہ دام کہاں میں کہاں، کہاں صیاد

اُداس دیکھ کے مجھکو چمن دکھاتا ہے
بہت دنوں میں ہوا ہے مزاجداں صیاد

پروں کو کھولدے ظالم جو بند کرتا ہے
قفس کو لیکے میں اُڑ جاؤنگا کہاں صیاد

الٰہی دیکھئے کیونکر نباہ ہوتا ہے
زباں دراز ہوں میں اور بدزبان صیاد

پھر لہو سُرخ ہوا جسم میں کالا ہوکر
رہگیا اسکے برس بھی مجھے سودا ہوکر

اگر مِی کا ہے گماں شک ہے بلا گیری کا
رنگ لایا ہے دوپٹہ ترا میلا ہو کر

جب پیا پانی دعا ساقی کو دی
ہچکی آئی تو کہا یادش بخیر

عاشق صادق ہے تیرا رند دل اسکا نہ توڑ
تو بھی چل اپنے ذرا طالب دیدار کے پاس

شیشہ بن سکتا ہے دل ٹوٹا نہیں پھر ٹوٹ کر
سب عیادت کے لئے جاتے ہیں بیمار کے پاس

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

بوئے گل کے تجھے پڑ جائینگے لالے بلبل
پڑ گئی گر کسی صیاد کے پالے بلبل

پھر وہی کنج قفس ہے وہی صیاد کا گھر
چار دن اور ہوا باغ کی کھالے بلبل

اسکو آزردہ کریں کس لئے فریاد سے ہم
ہمسے صیاد رضامند ہے صیاد سے ہم

تیلیاں ٹوٹیں قفس کی جو ابھی پر ماریں
رشتہ برپا ہیں فقط الفتِ صیاد سے ہم

دلکو پھر کاکل میں الجھاتے ہیں ہم
سر پہ پھر روزِ سیاہ لاتے ہیں ہم

اے اجل آ چک خدا کے واسطے
زندگی سے انتو گھبراتے ہیں ہم

کل کہہ آئے تھے نہ آوینگے کبھی
بن بلائے آج پھر جاتے ہیں ہم

ہمپہ بہتاں اور کی الفت کا ہے
لے ترے سر کی قسم کھاتے ہیں ہم

ق

رند جب ملتے ہیں وہ تنہا کبھی
دوڑ کر انسے لپٹ جاتے ہیں ہم

مسکرا کر کہتے ہیں وہ ناز سے
بس انھیں باتوں سے گھبراتے ہیں ہم

تمھارے ہاتھ سے تنگ آئے ہیں خون اپنا کرتے ہیں
بمجبوری گلے کو کاٹتے ہیں تم پہ مرتے ہیں

مہ و خور جائے قرصِ سیم و زر قربان ہوتے ہیں
نظر انکو ہوئی ہے رات دن صدقے اترتے ہیں

عاشق کی اور فقیر کی صورت سوال ہے
مطلب سمجھ لیں آپ تو روشن ضمیر ہیں

خوبرو جتنے زمانے میں ہیں سب عیار ہیں
آشنا اپنی غرض کے ہیں یہ کس کے یار ہیں

گلے لگائیں، بلائیں لیں، تم کو پیار کریں
جو بات مانو، تو منت ہزار بار کریں

ڈھونڈ لینگے تجھسے بہتر اے ستمگر سیکڑوں
دل سلامت ہے اگر اپنا تو دلبر سیکڑوں

کھودوں بتخانہ کو کیوں؟ کسلیئے مسجد ڈھاؤں
مجکو کیا ہے جو دلِ گبر و مسلماں توڑوں

رُخ کو پوشیدہ عبث ماہ لقا کرتے ہیں
اچھی صورت کو چھپاتے ہیں بُرا کرتے ہیں

ایکدن ہچکی بھی غربت میں نہ آئی افسوس
مجھکو بھولے ہوئے یارانِ وطن بیٹھے ہیں

برسے فلک سے آگ جو پانی کی ہو تلاش
دوزخ ملے بہشت کی گر آرزو کریں

نہ ستا در پہ پڑا رہنے دے کیا لیتے ہیں
اے شہِ حسن فقیروں کی دعا لیتے ہیں

عیب سے پاک و مبرا ہے کلام اے رند
جو غزل حضرت آتش کو دکھا لیتے ہیں

میں کیا جانوں چمن کہتے ہیں کسکو آشیاں کیسا
کھلیں آنکھیں تو میری آنکر صیاد کے گھر میں

یا صنم دل میں ہے لب پر یا صمد بہر ریا
کفر اس ایماں سے بہتر جیسے اب بیزار ہیں

فصلِ گل میں کیا آزاد قفس سے مجھکو
بھولنے کا کبھی احسان ترا صیاد نہیں

رو بدیوارِ چمن کر کے اڑاتا مجھکو
راستہ باغ کا صیاد مجھے یاد نہیں

عمر گذری ہے مجھے مشقِ خموشی کرکے
ہوں وہ بلبل جسے اندازِ فغاں یاد نہیں

کعبہ و بتخانہ میں شیخ و برہمن شاد ہیں
دونوں گھر یمنِ قدم سے عشق کے آباد ہیں

رہا شباب تلک تاک جھانک کا لپکا
وہی ہیں آنکھیں تو لیکن وہ دیکھ بھال نہیں

تنہا میں کس کے ساتھ کروں نغمہ سنجیاں
میں باغ میں قفس میں مرے ہمصفیر ہیں

ہوش میں آؤ پریزاد و تم
مجھکو دیوانہ بنایا نہ کرو

ق

آپ دیوانہ نے کیا بند قفس میں لاکر
ہو کے بیزار عبث گھر کو نہ جاؤ آؤ؟
دل نہیں دیتا میں اسبات پہ آزردہ ہو؟

چھوڑا و حسرتِ پروازِ گلستاں مجھکو
تھوڑے سے رنج کو افسانہ بڑھاؤ آؤ
روٹھے جلتے ہو اسی بات پہ آؤ آؤ

نگہ یاس سے دیکھوں تو یہ کہتا ہے وہ شوخ
پھر بُری آنکھ سے اِسنے مجھے دیکھا دیکھو

یار آیا ہے احوالِ دلِ زار دکھاؤ
عیسیٰ کو ذرا حالتِ بیمار دکھاؤ

فرد لیئے قیامت کا نہ اقرار کرا یجاں
لو حشر سہی آج ہی دیدار دکھاؤ

وہ دیوانہ تھا میں جس کا ہوا غم اہلِ عالم کو
اب شیفتہ کسی کا دلِ زار تو نہ ہو
کس طرح سے نہ فنِ شعر میں کامل ہو رند

پریزادوں نے اپنے بال کھولے میرے ماتم کو
پہلو میں رہ کے جان کا میری عدو نہ ہو
دس برس دیکھی ہو آتش سے جب اُستاد کی آنکھ

اچھا نہیں ہر وقت اسیروں کا ستانا
قدر میری تجھے نہ تھی صیاد
گُل کو بھڑکاتی ہے بلبل کو خفا کرتی ہے
باغباں دشمنِ جاں گھات میں ہر دم صیاد
سیر کی خوب پھرے پھول چنے شاد رہے
پُر آبلہ ہے سوزِ جدائی سے سراپا
دل سینے میں بیتاب ہے جاں آئی ہے لب پر
کیا کہتا ہے ہر بار تجھے قتل کروں گا
او دل ہدفِ تیرِ نگہ پھر کیا تو نے
کیا خستگیٔ حال پہ عاشق کی ہو خنداں
آنکھیں تری مدہوش ہیں تنہا ہی مرا دل
ڈرتا ہوں لہو دیکھ کے غش آئے نہ تجکو
بس اب آپ تشریف لیجائیے
طبیعت کو ہوگا قلق چند روز

پڑ جائے کہیں آہ نہ صیاد ہماری
ہاتھ ملتا ہے کیوں رہا کر کے
تو در اندازیاں لے بادِ صبا کرتی ہے
بلبل اس باغ میں کیوں رہتی ہے کیا کرتی ہے
باغباں جاتے ہیں گلشن ترا آباد رہے
دیکھے تو کلیجے کے دکھاؤں تجھے چھالے
اب جان کو روکے کوئی یا دل کو سنبھالے
اِک جان ہے میری اسے تو لے کہ خدا لے
اگلے ہی مرے زخمِ جگر تھے ابھی آلے
توبہ کرو اللہ مصیبت میں نہ ڈالے
دو مست نہ سنبھلیں گے اکیلے کے سنبھالے
تلوار لگا شوق سے پر مُنہ کو پھرا لے
جو گذرے گی مجھ پر گذر جائے گی
ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر جائے گی

سُنیو یہ ماجرا بھی ہے یار وشنیدنی
کہتا ہے کیا وہ شوخ کہ جیتے ہیں رند کیا
ق
نے لیکھے خط جو میرے کئی نامہ بر گئے
مدت ہوئی کہ میں نے سُنا تھا کہ مر گئے

ثبت کریں آرزو خدائی کی
موت آجائے قید میں صیاد

شان ہے تیری کبریائی کی
آرزو ہو اگر رہائی کی

سانس دیکھا تنِ بسمل میں جو آتے جاتے		اور چرکا دیا جلاد نے جاتے جاتے
خاک ہو کر ہی ہم اُٹھیں تو اُٹھیں		اب تو در پر تمھارے آ بیٹھے
داغِ فرقت دل پہ جانی دے گئے		چلتے چلتے یہ نشانی دے گئے
گھر بُلا کر خاطریں کیا خوب کی مہمان کی		لاکھ ٹکڑے دل سے دی ہو اک گلوری پان کی
آئینہ اُن کا ٹوٹ گیا میرے ہاتھ سے		اب کوئی منہ دکھانے کی صورت نہیں رہی
چُھری کس لطف سے پھیری گلے پر اپنے بسمل کے		جو بس ہوتا میرا تو چوم لیتا ہاتھ قاتل کے
ہوا آگاہ اپنے حسن سے تو دیکھیں کیا ہووے		دکھایا جسنے آئینہ سمجھے اُس کا بُرا ہووے
جلوۂ حُسنِ خداداد ذرا دکھلا دے		منکروں کو بھی صنم شانِ خدا دکھلا دے
جاری ہے نیا مملکتِ عشق میں آئین		مُجرم کو سزا ملتی ہے تقصیر سے آگے
شعلۂ رُخ دکھا دیا کس نے		سر سے پا تک جلا دیا کس نے
پاسِ دیں کفر میں رہا ملحوظ		بُت کو پوجا خدا کر کے
میں دل کو رو چکوں کہ یہ دل مجکو رو چکے		یارب جو کچھ نصیب میں ہونا ہے ہو چکے
دل لگی ہجر میں ہے آٹھ پہر نالوں سے		اب بسر ہوتی ہے لے رند بُرے حالوں سے
اب تک وہ ایک ایک سے کرتے ہیں تذکرہ	ق	ہر چند ترکِ عشق کو برسوں گذر گئے
واللہ رند سے یہ توقع نہ تھی مجھے		کیا کیا کہا نہ کرتے تھے پر کچھ نہ کر گئے
وعدے پہ تم نہ آئے تو کچھ ہم نہ مر گئے		کہنے کو بات رہ گئی اور دن گذر گئے
یہ قول تھا کہ تجھ سے جُدائی ہوئی اگر		ایجان مر ہی جائیں گے لو اب نہ مر گئے
برسوں میں مری یار کی لیکر خبر آئی		مدت میں تو او بادِ صبا راہ پر آئی
طبیعت کا میری کرو تم نہ دھیان		کسی اور سے اب بہل جائیگی
نہیں رہنے کا بعد چندے یہ حال		سنبھالتے سنبھلتے سنبھل جائیگی

رنگ سیٹھ لسپٹن جی فرام جی متخلص بہ رنگ وپروین، پارسی اور بخیل وکٹوریہ کمپنی۔　　رنگ

کے مالک تھے یہ ۱۸۶۸ء کا ذکر ہے منشی نواب علی نفیس سے اِس فن میں تلمذ تھا، یہ چند شعر اِنکے طبعزاد ہیں اور اس امر کی دلیل ہو سکتے ہیں کہ غیر زبان والے بھی اُردو کی حلاوت سے ناآشنا نہیں رہے۔

سنگدل سے بھی نکلتا ہے کسی کا مطلب	وصل کی آرزو تجھ سے بُت بے پیر عبث
سخت جانی مری کب مانے گی اُس کا لوہا	تم دکھاتے ہو مجھے کھینچ کے شمشیر عبث

رنگ

رنگ۔ لالہ کیشوداس رنگ خلف رائے بہادر لالہ میامل مرحوم۔ دہلی محلہ چھیپی واڑہ کے ساکن اور ۱۸۸۴ء میں بعالم شباب کلکتہ میں بسبب مشغلۂ تجارت بود و باش رکھتے تھے اُن ہی ایام میں گاہ گاہ شعر بھی کہہ لیتے تھے۔

ہے نصیبِ کار اپنا حبیب وحیدِ دوجہاں	لاکھ کوہِ غم اگر سر پر ہوں نازل کیا ہوا
ماہ رو تجھسا زمانے میں نہ دیکھا اے شوخ	چاندنی کو بھی کیا حُسن سے شیدا اے شوخ

رنگ

رنگ لالہ لکھپت رائے رنگت ساکن جسین پور کلاں ضلع مظفر نگر، علمی استعداد رسمی ہے پندرہ برس سے شعر کہتے ہیں اور کچھ حال باوجود دریافت معلوم نہ ہوا۔

قتل عشاق کا بیڑا تو اُٹھا بیٹھے وہ	دستِ نازک سے مگر تیغ اُٹھائیں کیونکر

بتوں کو حضرتِ شیخ آپ کیا سمجھتے ہیں	سمجھ ہے جنکو وہ انکو خدا سمجھتے ہیں
جلا کے چرخ کو یہ ایک دم میں خاک کرے	وہ نالۂ دلِ عاشق کو کیا سمجھتے ہیں
خدا نے جن کو سمجھ دی ہے حضرتِ زاہد	بتوں کے حسن کو نُورِ خدا سمجھتے ہیں
دلکی تڑپ کا بعدِ فنا بھی یہ حال ہے	تربت میں بھی ہمارا ٹھہرنا محال ہے
چوٹی کیا مانگتی ہے کچھ نہیں کُھلتا عقدہ	رات دن یہ ترے پیچھے جو پڑی رہتی ہے
پس مردن مری تربت پہ لالہ رنگ لایا ہی	دلِ پُر داغ کا جوہر ہے نکلا خاک میں ملکے
آپ بھی ہے دلِ بیتاب گرفتارِ بلا	مجکو بھی ایسی مصیبت میں پھنسا رکھا ہے

رنگ

رنگ۔ حاجی محمد وزیر خان صاحب حیدرآبادی تلمیذ حضرت ظہیر دہلوی۔ دکن کے

طبیعت دار اور خوش فکر کہنے والوں میں ہیں، شوخی، آمد، مضمون آفرینی کے جوہر کے ساتھ زبان کا لطف بھی کلام میں موجود ہے، اپنے استاد مرحوم سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ کربلا مشہد اور کعبہ ہو آئے ہیں۔

رنج و خوشی سے ہو گئی اک دن مجھے نجات
جس دن میں جا کے قبر کے گوشہ میں سو گیا

وہ آئے بھی گئے بھی خبر تک نہیں ہوئی
کچھ ایسا ہم انکو دیکھ کے میں محو ہو گیا

خدا ہی جانے کہ کیسی ہے سرزمینِ عدم
گیا ادھر کو جو وہ پھر ادھر نہیں آتا

پہروں تو قاتل محوِ نظارہ رہا
لطف ایسا رقصِ بسمل سے ملا

زندگانی حباب کی صورت
دم کی دم مہمان ہے گویا

کہنے کو یوں تو کہہ دیں سب ہے جہاں ہمارا
مانے بھی کوئی سالے دل آخر بیاں ہمارا

خلاقِ دو جہاں ہو جب مہرباں ہمارا
پھر کیا کرے گا ہو کر دشمن جہاں ہمارا

کیا پوچھتے ہو ہم سے نام و نشاں ہمارا
ہندوستاں کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا

جام و سبو بھی اپنے ہیں میکدہ بھی اپنا
جب مہرباں ہے ہم پر پیرِ مغاں ہمارا

رہنے دے یہ نشانی گلشن میں اب ہماری
برباد کر نہ گلچیں تو آشیاں ہمارا

ایک سے اک خوب تر پیدا کیا
تم سا کب رشکِ قمر پیدا کیا

وصل میں چھیڑا تو فرمانے لگے
دیکھئے پھر فتنۂ شر پیدا کیا

رنگ ہم کس کو کہیں اچھا برا
جب خدا نے خیر و شر پیدا کیا

بلا سے دو گھڑی کیواسطے تسکین ہو جاتی
تمہارا خواب ہی میں گر مجھے دیدار ہو جاتا

دکھا دیتا نکل کر اپنی صورت تو جو پردے سے
ترا نقصان کیا اس میں بتِ عیار ہو جاتا

اگر جاتا ہے تو اس بت کی بزمِ ناز میں اے دل
کسی سے پہلے مل جل کر وہاں پہچان پیدا کر

نازک ہو بل نہ آئے کلائی میں آپ کی
چھوٹی سی لینا ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

کوئی شریکِ حال بُرے وقت کا نہیں
آتی نہیں ہے موت بھی بیمار دیکھ کر

نفریں کرو جہاں کے سب کاروبار پر
اپنے شہیدِ ناز کو دفنا کے جائیے
دیئے جاتا ہی کیوں چرکے پہ چرکے مضمحل دل پر

قائم رہو ارادۂ پروردگار پر
احسان اتنا اور ہو اس خاکسار پر
خدا کیواسطے بیداد گر کر رحم بسمل پر

دو دن کی زندگی پہ نہ اتنا اُچھل کے چل
محفل میں مجکو دیکھتے ہی آگ ہو گئے
تمہارے عشق نے کچھ ایسا کر دیا بے خود
نہ ایرانی نہ تُورانی، نہ رومی، اصفہانی ہیں
ابھی دیکھا ہے کیا اے بوالہوس راہِ محبت میں
ہمارے جیب و دامن آستیں پر ہی نہیں موقوف
کہا میں نے کہو تم رنگ کو بھی پیار کرتے ہو
ایسا کیا فلکِ عدم میں ہے تماشا یارب
بہت کم ایسے ہوتے ہیں محبت والے دُنیا میں
جنھیں باور نہ ہو وہ جا کے امریکہ میں دیکھ آئیں
زہے نصیب زہے بخت اے خدا تیرے
فغاں سے آہ سے فریاد سے شیون سے نالوں سے
خدا کے واسطے بس بند کر منقار تو اپنی
حباب آسا کسی سیلاب میں بہتا نظر آئے
ملی جو لذتِ صحرا نوردی دشتِ غربت میں
کسیکی نکہتِ گیسو اُڑا کر کیا صبا لائی
سرِ مقتل کسی کا بھی کسی پر کچھ نہیں احسان

دنیا ہے چل چلاؤ کا رستہ سنبھل کے چل
کہنے لگے رقیب سے غصہ میں جل کے چل
کہاں ہوں، کون ہوں کس جا ہوں کچھ خیال نہیں
یہاں کے جتنے باشندے ہیں سب ہندوستانی ہیں
ہزاروں لاکھوں سر پر آفتیں تجکو اُٹھانی ہیں
ابھی تو دھجیاں دامانِ صحرا کی اُڑانی ہیں
تو ہنس کے بولے کسکو یاد یہ باتیں پُرانی ہیں
پھر پلٹ کر نہیں آتے جو اُدھر جاتے ہیں
جسے وہ چاہتے ہیں آپ بِک کر مول لیتے ہیں
بتانِ سیم تن کے بوسے اکثر مول لیتے ہیں
چمن جو چھوٹ گیا دستِ نازنیں میں رہی
فلک کو چھید ڈالوں گا الٰہی تیر و بھالوں سے
جگر ٹکڑے ہوا جاتا ہے بلبل تیرے نالوں سے
جو پڑ جائے کبھی پالا فلک کو رونیوالوں سے
مزا اسکا کوئی پوچھے مرے تلووں کے چھالوں سے
اسیرِ زلف کے سر پہ بلا پر ہے بلا لائی
مجھے میری قضا لائی اُسے اُسکی جفا لائی

نہ ملی اسکی خبر ہم کو ابھی تک افسوس ٭ ہم یہاں آئے کہاں سے کدھر جاتے ہیں ۔

بیٹھا کے سامنے بت کو سلام کرینگے
خدا خدا نہ سہی رام رام کرینگے

حسرت دُنیائے فانی اور ہے	آرزوئے خلد ہے کچھ اور شئے
دیکھتے ہی اُسے پھر ہوش سنبھالے نہ گئے	طالب دید بہت حضرت موسیٰ تھے مگر
بے ڈسے دلکو ترے زلف کے کالے نہ گئے	پیچ سے ہمنے بہت اُسکے بچایا لیکن
مہرباں آپکے یہ حیلہ حوالے نہ گئے	دردِ سر کا کبھی حیلہ ہے کبھی عذر حنا
تم بھلے تھے تو اُسے آکے منالے نہ گئے	گر بُرا رنگ تھا جو روٹھ کے بیٹھا گھر میں

رنگ

رنگ - حریف خاں صاحب عرف میرزا رنگیلے، استعداد علمی رسمی ہے، تفنن طبع کے طور پر شعر کہہ لیتے ہیں جس میں بیشتر مستخرانہ پہلو نظر رہتا ہے، چند شعر درج کیئے جاتے ہیں۔

سفوف عاشقی ہے نام خاکِ کوئے جاناں کا	سکونِ اختلاجِ دل ہوا جسنے اسے پھانکا
کیا خون کا دعویٰ ستم ایجاد نہ ہوگا	چالان ترا کیوں ستم ایجاد نہ ہوگا
حاضر جو عدالت میں تو جلاد نہ ہوگا	وارنٹ میں ہو جائیگا آخر کو گرفتار
یہ بتلاؤ کہ افیوں اسقدر کھاتے ہو کیوں	بند آنکھیں ہیں تمہاری اونگھتے ہو رات دن
قد بڑھ کے گھنٹہ گھر کی برابر جو یار ہو	گھر بیٹھے دید رُخ کی تری سب کو ہو نصیب
سُنا ہے یہ کہ تل رخسار کا لب کی شکر ہوگی	ہمارا یار ہمکو آج تل شکری چٹائے گا
کنوئیں کا اُنکے پانی ہوگا اور میری شکر ہوگی	نہ پوچھو مفلسی کے عقد کا ساماں قاضی جی

رنگین

رنگین میرزا سعادت یار خان نام رنگین تخلص، انکے والد مرزا طہماسپ بیگ خان ساٹھ برس کی عمر میں روم سے ہندوستان میں آئے تھے، لاہور میں نواب حسین الملک معروف بہ میر منّو خلف الصدق وزیر الممالک اعتماد الدولہ کے ہاں ملازم رہے اور اُنکے بعد نواب نجیب الدولہ ضابطہ خان اور ذوالفقار الدولہ کی ملازمت میں نوبت بہ نوبت آسودگی کے ساتھ زندگی بسر کی، انھیں ایام میں بارگاہ سلطانی سے خطاب محکم الدولہ خان بہادر اعتضاد جنگ حاصل کیا، رنگین کی پیدایش قصبہ سرہند میں ہوئی لیکن انہوں نے نشو و نما دہلی میں پائی اور بچپن سے دم واپسیں تک یہیں رہے، سپاہی کے بیٹے تھے

اسلیئے جملہ فنون سپہگری میں معقول دستگاہ رکھتے تھے، سیر و سیاحت کا بھی شوق رہا، اکثر امرا کے ہاں ملازم بھی رہے خصوصًا میرزا سلیمان شکوہ بہادر برادر اکبر شاہ ثانی کی مصاحبت کا فخر حاصل رہا کبھی تجارت کا مشغلہ بھی کر لیتے تھے چنانچہ اسی سلسلے میں نواب آصف الدولہ و سعادت علیخان کے عہد میں ایرانی گھوڑے لیکر لکھنؤ کے کئی سفر کیئے لیکن آخر عمر میں ترکِ تجارت و ملازمت کر کے گوشہ نشین ہو گئے تھے، فن شعر کا شوق عنفوان شباب ہی میں ہو گیا تھا اور شاہ حاتم کے ممتاز شاگردوں میں گنے جاتے تھے آپ وجاہت ذاتی و خاندانی کے باعث جس صحبت میں جا بیٹھتے تھے وہاں ہاتھوں ہاتھ لیئے جاتے تھے، رنگین میں بحیثیت ایک شاعر ہونیکے متضاد صفات کا مجموعہ پایا جاتا ہے، شوخی و بذلہ سنجی کے علاوہ ایجاد پسند طبیعت پائی تھی چنانچہ ریختی کا ایجاد انھوں نے ہی کیا جس کا سب سے اول تتبع سید انشا نے کیا، کہیں عاشقانہ در دمندی زبان میں پند و نصائح کی حکایات لکھتے ہیں اور ایسا لکھتے ہیں کہ خواص و عوام کو اپنا گرویدہ رنگین کلامی اور دلدادہ شگفتہ بیانی بنا لیتے ہیں۔ جو عام رائے انکے متعلق قائم ہے کہ وہ ریختی گو اور ظریف شاعر تھے یہ ناواقفیت پر مبنی ہے، قسامِ ازل نے رنگین کو عجیب پر لطف اور ہمہ گیر مذاق ودیعت کیا تھا، ریختی ہی پر کیا موقوف ہے وہ کونسا رنگ ہے جس میں رنگین نے اپنے نیرنگ فکر سے پھول نہیں کھلائے اور باغ سخن میں وہ کونسی روش ہے جس میں رنگین کی قلم نے گلکاریاں نہیں کیں، حقیقت میں انکا کلام عطر مجموعہ ہے جس میں ہر قسم اور ہر پایہ کا اعلیٰ سے ادنیٰ تک کلام موجود ہے غرضکہ رنگین نے ہمہ داں طبیعت اور ہمہ گیر مذاق پایا تھا، رنگین نے حقیقت میں یہ کمال کر دکھایا کہ ریختی کی ایجاد کے ساتھ ریختہ کو بھی ہاتھ سے ندیا اور نہ صرف ریختہ ہی پر حاکم رہا بلکہ عشق عاشقی کے افسانوں سے گذر کر پند و نصیحت کی دشوار گزار منازل سخن کو بھی بخوش اسلوبی تمام طے کیا، زبان کے معاملہ میں رنگین اپنا آپ ہی جواب ہے، اور چونکہ رنگین ریختی کا موجد ہے اس لیئے سخن سنجی کے قاعدۂ کلیہ کے مطابق اسکی ریختی کی ابتدائی حالت میں کچھ سادگی کے جوہر باقی ہیں اور وہ جان صاحب کی ریختی کی طرح سر تا سر فحش نہیں ہے۔ نورتن یعنی کلیات رنگین میں چار اردو دیوان موسوم بہ ریختہ، بیختہ، آمیختہ، انگیختہ کے علاوہ پانچ اور بھی کتابیں ہیں۔ مثنوی ایجاد رنگین، فرسنامہ، رنگین نامہ (محمود نامہ کے جواب میں)

مجالس رنگین، ایک نسخہ نثر ہے جس میں تمام شعرار کی خبر لی ہے اور سب سے آخر میں ان کی بہترین تصنیف مثنوی دلپذیر ہے اور ان سب کا مجموعہ نو رتن کے نام سے موسوم ہے رنگین کے ثبوتِ کمال کے دلائل میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انکی مثنوی دلپذیر اپنے زمانہ کی تمام اردو مثنویوں سے بہتر ہے، زبان اسکی نہایت صاف اور ستھری ہے اور حکایت بھی دلچسپ ہے، اور ترکیب و بندش ایسی بے تکلف کہ اس زمانے کے بڑے بڑے شعرا نے متفق ہو کر اسکی تعریف کی ہے، چنانچہ نامور معاصر شعرا مثل ثنار اللہ خان فراق بھورے خان آشفتہ شاگرد میر محمدی مائل، بسنت سنگھ نشاط، مرزا قتیل، مصحفی، انشار، سجاد علی بیگ راغب شاگرد رنگین اور جرأت سب کے تعریفی قطعات تاریخ آخر میں درج ہیں۔ چنانچہ جرأت کا مصرعہ تاریخ ہے "ہے یہ بدر منیر سے بہتر" ہر صنف شعر میں کم و بیش طبع آزمائی کی ہے اور مختلف قسم کے اخلاقی اور اور رنجیل نظمیں بھی انکے ہاں ملتی ہیں اور شاید یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ انکی رنگین مزاجی اور شگفتہ بیانی کے خاص و عام اس عہد میں گرویدہ تھے، تیسرا دیوان ہزلیات سے پُر ہے جس میں ایک قصیدہ شیطان کی مدح میں بھی لکھا ہے، چوتھا دیوان ریختی کا ہے، شاعری کے علاوہ رنگین اپنے عہد میں ایک لاجواب شہسوار اور گھوڑے کے ماہر اور اسکے خواص اور معالجات کی تدبیروں میں بے نظیر سمجھے جاتے تھے بالآخر رنگین نے جمادی الثانی ۱۲۵۱ھ میں کامل اسّی برس تک مشاہدہ نیرنگ عالم کر کے انتقال کیا، انکے چاروں دیوان نہایت خوشخط اور مُطلّا میرے کتب خانہ میں موجود ہیں اور مثنویات وغیرہ کا بھی مکمل مجموعہ موجود ہے، رنگین کے کلام میں اگر نقص ہے تو یہی کہ انکے کلام کی سادگی اکثر اوقات حد سے گذر جاتی ہے اور لطفِ سخن کو نقصان پہنچاتی ہے، پھر بھی اس ابتدائی زبان اردو کے زمانے میں آپ کی یہ سادہ بیانی ہزاروں قدر دانیوں کی مستحق ہے۔ کلکتہ کی بھی سیر کی تھی۔ آپکے کلام کا انتخاب ہدیہ ناظرین ہے۔

کیا کرتے ہو ناصح تم نصیحت رات دن مجھکو	کبھی ایک دن تم جا کے سمجھاتے تو کیا ہوتا

بوسہ تو ہمکو دیجئے ثابت گناہ کرے
گر قتل تجھکو قاتل منظور ہے ہمارا

کر اپنے دل میں تو انصاف میں رٹھا ہوں کیونکر
گلے میں ڈالکر باہیں منانا تیرا یاد آیا

تھی شعلہ بادہ برق کہ جی میرا جل گیا
ایسی کی اک نگاہ کہ بس دم نکل گیا

تا حشر رہے یہ داغ دل کا
یا رب نہ بجھے چراغ دل کا

رباعی

اے موجبِ عیش و شادمانی پھر آ
اے باعثِ لطفِ زندگانی پھر آ

میں ہوں بن تیرے چشمِ خوباں میں ذلیل
پھر آ تو اب اے میری جوانی پھر آ

رہروانِ عدم ذرا ٹھہرو
ہم بھی چلتے ہیں ساتھ دم لیکر

اُن سے کہ خوف تیری محفل سے
اُٹھ گئے جو کہ چشمِ نم لیکر

عاشق اُس مست کے ہیں جو نرگس
کیا کرینگے وہ جامِ جم لیکر

بازگشتی تیرے ہے پھر کر یہ تیرا دیکھنا
صدقے تیرے اس ادا پر سے مجھے قربان کر

زاہد بتا کہ کعبہ میں کیا دیکھتا ہے تو
جاتے ہیں دیر میں تو صنم دیکھتے ہیں ہم

تو نہ گذرے گا جفا سے تو یار
جان سے اپنی گذر جائیں گے ہم

دیکھتے ہی ہم اُنکو ہو جاتے ہیں شادی مرگ ہم
اُنکو پاتے ہیں تو پھر ہم آپ کو پاتے نہیں

دستِ قدرت نے عجب تیری بنائیں آنکھیں
مر گیا جن کو ذرا تو نے دکھائیں آنکھیں

ہاتھ میں ہاتھ ہے پر بوسہ نہیں لے سکتے
دسترس اتنی بھی ہرگز ہمیں ہیہات نہیں

اب ظلم کی ہم اُنکے جا کس سے داد چاہیں
اقلیم دل میں پھرتی جن کی دہائیاں ہوں

شب ہونے آئی لیکن اب تک نہیں وہ آیا
ایسا نہ ہو کہ قسمیں جھوٹی ہی کھائیاں ہوں

کچھ جھوٹ سچ کسی نے باتیں لگائیاں ہیں
جو آج تم نے پیارے آنکھیں چڑھائیاں ہیں

کس مست کی نگہ کی یہ بد شرابیاں ہیں
اوندھے پڑے ہیں ساغر ٹوٹی گلابیاں ہیں

رنگیں سرشکِ چشم اب کیونکر نہ سرخ نکلے
ہمکو وہ فندقِ پا اب یاد آئیاں ہیں

دِل تھا جو لباطا اپنی سو گذران چکے ہیں
جی نذر کریں جی میں یہ اب ٹھان چکے ہیں

[illegible]

میں نے پوچھا کہ چاہتے ہو مجھے — سن کے وہ بولے یوں ادھر دیکھو (ق)
مجھ کو تم چاہتے ہو کتنا کچھ — اپنی چھاتی پہ ہاتھ دھر دیکھو

نشۂ حسن سے جس وقت وہ مخمور ہوئے — ہاتھ سے انکے کئی شیشۂ دل چور ہوئے

قطعہ

حوروں کے عوض مجھے الٰہی! — دنیا میں تو ایک نازنیں دے
کب مجکو بہشت کی ہے خواہش — جو کچھ دینا ہے سو یہیں دے
دل کو کوئی کس طرح سنبھالے — یاں جان کے پڑ رہے ہیں لالے
روح نے جسم پر گرانی کی — اب یہ حالت ہے ناتوانی کی

مت اچھالو پھول کو کچھ دشمنوں کو ہو نجائے — میرا جی ڈرتا ہے نازک ہے کلائی آپکی
دم آیا ناک میں اس آہ اور زاری کے جینے سے — طبیبو موت ہی بہتر ہے اس بیماری کے جینے سے

یہی رونا جو ہے تو تم رنگین — اسکے کوچے سے آجکل نکلے

وہ نہ آئے تو تو ہی چل رنگیں — اس میں کیا تیری شان جاتی ہے
قیامت پر رہا موقوف پھر تو دیکھنا اسکا — اگر اک دم کے دم آنے میں وہ تاخیر کرتا ہے
لپٹنے کی بات دل میں کھٹکتی ہے رات دن — کب وہ دل پہ بار ہووے ہی بیگانہ کچھ کہے

جب اپنی والیوں پر عشق آتا ہے تب اے رنگیں — اگر پتھر کا دل ہو اس میں بھی تاثیر کرتا ہے

رنگین - لالہ بلاس رائے برادر خورد مہاراجہ بینی بہادر قدرت اللہ شوق لکھتے ہیں جوان خوبصورت خوش سیرت صاحب اقتدار بریلی کے رئیس اعظم تھے، اگرچہ دیوان مرتب کیا تھا لیکن انکے اشعار میں مزا نہیں۔ چند شعر درج ہیں۔

میں تیرے ظلم کو دیکھے ہوئے کہتا ہوں الظالم — جو بر تقدیر تو میرا خدا ہوتا تو کیا ہوتا
پہچان لیجو مشہدِ رنگیں کو اے صبا — اٹھتا ہے اسکی خاک سے اب تک غبار سرخ

غیروں کے پاس جانا ہمسے کبھی نہ ملنا — افسوس ہے توبہ ہے ارمان ہے توبہ ہے

رنگین منشی موہن لال کایستھ ساکن دہلی، افسوس کہ بجز اس شعر کے نہ کلام ملا

نہ حال معلوم ہوا۔

رنگین نہیں ہے قطرۂ شبنم یہ باغ میں	بادِ صبا نے مے سے بھرا ہے ایاغ گل

رنگین

رنگین - میر اکبر علی مرحوم عرف میر سنگی، لکھنؤ کے باشندے تھے چنانچہ انکے نام کا ایک محلّہ اس وقت تک لکھنؤ میں موجود ہے، جس زمانے میں کہ مرزا سودا نے اپنی عمر کے آخری دس سال نوابانِ اودھ کے دامنِ دولت سے وابستہ ہوکر بسر کیئے، میر رنگین نے بھی انہی ایام میں مرزا صاحب موصوف کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ انکے کلام میں لکھنؤ کا رنگ غالب معلوم ہوتا ہے، یہ چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں۔

نئی ہے مردمک کی جلوہ گر تصویر آنکھوں میں	رہا کرتا ہے ہردم وہ بُتِ بے پیر آنکھوں میں
بہ رنگِ طائرِ بسمل نہ کیونکر ہر گھڑی تڑپے	ہو جب تیرِ مژہ سے مرغِ دل نخچیر آنکھوں میں
تری آنکھوں کے یہ ڈورے نہیں ہیں شرح الیقاتل	مگر لکھی ہے میرے قتل کی تحریر آنکھوں میں
دکھا جا آنکے صورت خدا کیواسطے اپنی	ترے عاشق کا دم آیا ہے بے پیر آنکھوں میں
تصور میں زیارت جب ہوئی حاصل ہمیں رنگیں	لگائی ہے نے خاکِ مرقدِ شبیر آنکھوں میں

رنگین

رنگین - منشی انور علی باشندہ فتحپور ملازم محکمۂ تعمیرات ریاست بھوپال، حضرت صفا رئیس بھوپال کے تلامذہ میں سے ہیں زیادہ حال معلوم نہ ہوا یہ کلام کا انتخاب ہے۔

اس بھولی بھولی شکل پہ دل لوٹ کیوں نجائے	کہتا ہے بچپنا کہ زمانہ ہے پیار کا
اللہ رے نازکی جو تصور میں بھی چھوا	مُژ مردہ ہو گیا گلِ رخسارِ یار کا
جوشِ شباب کہتا ہے ارمان نکال لو	دیکھو رہے گا پھر نہ زمانہ بہار کا

میرا فسانہ اور عدو کی زبان پر	اللہ صدقے تیری کریمی کی شان پر
آئی بہار چھائی گھٹا آسمان پر	پی آئیں چلکے پیر مغاں کی دکان پر
کہتے ہیں ہم نشیں سے مجھے غش ہی تھکر	آسیب کا خلل تو نہیں اس جوان پر
کہنے کو تو فسانۂ غم اُن سے کہدیا	مطلب کا کوئی حرف نہ آیا زبان پر

رنگین

رنگین منشی ناصر حسین خان بھوپالی شاگرد حضرت افسوں، بھوپال میں ملازم اور یہ کلام ہے

پھولا پھلا ہے باغ دلِ داغدار کا
زخم جگر دکھاتے ہیں عالم بہار کا

خود ہی جنابِ عشق نے رتبہ کیا بلند
خواہاں ہوا تھا کب سر منصور دار کا

کس شوخ کے خیال نے بیتاب کر دیا
طاقت نہ ضبط کی ہے نہ یارا قرار کا

مژگاں سے کیا مقابلہ رنگیں بقولِ داغ
دل ایک ہاتھ کا ہے جگر ایک وار کا

رنگین

رنگین منشی محمد ایوب خاں مقیم حیدرآباد دکن سے کلام منتخب ہو کر درج ہوا۔

شوخی کہیں عیاں ہے ستم ہی نہاں کہیں
محمل کا اُسکے پردہ ہو آسماں کہیں

اسجا نہیں ہے شیخ و برہمن کا کوئی فرق
کعبہ سے بڑھ نجائے ترا آستاں کہیں

مقتل میں تم بھی آؤ تماشے کیواسطے
بسمل تڑپ رہے ہیں کہیں نیمجاں کہیں

رنگین

رنگین۔ عالیجناب سری راجہ ہری دت صاحب دوبے بہادر رنگین راجہ جونپور اودھ کے تعلقہ دار ہیں اِنکے بزرگ بڑے صاحب اقتدار امیر گذرے ہیں پچیس برس سے فن شعر کا شوق ہے، حضرت وسیم برادر حضرت ریاض خیر آبادی اِنکے اُستاد ہیں۔ کلام بہم رشید کا انتخاب ہے

دم نزع دیدار آکر دکھاؤ
دم آنکھوں میں اٹکا ہوا ہے کسیکا

ادائیں غضب شوخیاں ہیں قیامت
شبِ وصل کیا پوچھنا ہے کسیکا

تڑپتا ہے دل کی طرح اپنے کوئی
کسی پر جو دل آگیا ہے کسیکا

اثر تو فلک سے اُتر آخدارا
بلند آج دستِ دعا ہے کسیکا

گھبرائی ہوئی پھرتی ہے گردوں پہ پریشان
فریاد ہماری، دلِ مضطر سے نکلکر

کیا گت بنی ہے شیخ فضیلت مآب کی
رندوں نے مے سے ریش رنگی ہے جناب کی

تیری نگاہِ شوخ کی شوخی نے بزم میں
تصویر کھینچدی ہے مرے اضطراب کی

دستِ نازک سے ہے اِس کا پھیرنا مشکل اگر
آپ یوں ہی حلق پر تلوار رہنے دیجئے

اِس ظلم کا تجھ پر فلکِ پیر پڑے صبر
کیا مفت جوانی ہوئی برباد کسی کی

سینے سے میں کیا داغِ محبت کو مٹاؤں
یہ تو ہے نشانی دلِ ناشاد کسیکی

زاہد کی حب سے دخترِ رز آشنا ہوئی
حوروں سے چاہ آپ کو اسکی سوا ہوئی

رندوں کو دخترِ رز جو لگاتی نہیں ہے مُنہ
صحبت میں رہکے شیخ کی یہ پارسا ہوئی

کہتا ہے لیکے دلکو مرے چھیڑ سے وہ شوخ
پھر مجکو دیجئے وہ مری چیز کیا ہوئی

مرنیوالوں سے تمھارا یہ سوال اچّھا ہے
وصلِ حور اچھا ہے یا میرا وصال اچّھا ہے

کہتے ہیں مجکو سُنا کر کہ یہ مال اچّھا ہے
دل کے لینے کو یہ اندازِ سوال اچّھا ہے

بعدِ مُردن بھی وہی چھیڑ چلی جاتی ہے
قبر پر پُوچھتے ہیں آکے یہ حال اچّھا ہے

کبھی آنا تو ہے تو اُسکی عیادت کے لیئے
یہ بُرا بھی ترے بیمار کا حال اچّھا ہے

پیتے ہی ایک جام کے بیہوش ہو گئے
دُنیا کے رنج ہم کو فراموش ہو گئے

قفس لیچل مرا گلشن میں صیاد
دکھادے سیر مجکو بوستاں کی

رواں - بلبلِ شاخسارِ معانی، گلِ نو دمیدۂ چمنستانِ سخندانی، سخنورِ رنگین بیان منشی جگت موہن لال رواں تخلص، وطن قصبہ موراوان ضلع اناؤ، مولد اناؤ خاص تاریخ ولادت ۱۴ جنوری ۱۸۸۹ء فارسی و عربی کی تعلیم اناؤ کے مکتب میں مولوی سبحان خاں سے پائی مُستقل تعلیم شروع ہوئی تھی کہ ۱۹۰۳ء میں آپکے والد منشی گنگا پرشاد صاحب وکیل کا انتقال ہو گیا اور اسکے بعد ایک عرصہ تک اوقات پریشانی میں کٹی، انٹرنس تک کی کتب مکان ہی پر خارجی طور سے پڑھیں ۱۹۰۵ء میں موراوان ہائی اسکول ضلع اناؤ میں داخل ہو کر انٹرنس درجۂ اول میں پاس کیا ۱۹۰۹ء میں ایف اے کیننگ کالج لکھنؤ سے پاس کیا اور اپنے کالج میں اول نمبر ملا جسکے صلہ میں کالج کا نقرئی تمغہ عطا ہوا ۱۹۱۱ء میں بی اے اُسی کالج سے پاس کیا اور اس امتحان میں بھی کالج میں اول نمبر رہا جسکے صلہ میں تمغہ طلائی عطا ہوا ۱۹۱۳ء میں ایم اے اور ۱۹۱۴ء میں اول سال یل یل بی پاس کیا۔

شاعری کا شوق بچپن سے ہے، الف بے شروع کرنے سے پہلے شعر کہنے لگے لکھنؤ

پہنچکر شعرا کے حال سے نیاز حاصل کیا اور جناب فضل خلف جناب اسیر مرحوم و جناب مرزا محمد ہادی صاحب عزیز سے تلمذ حاصل کیا، اُردو میں غالب اور فارسی میں حافظ کے کلام سے دلی اُنس ہے - قریب قریب تمام ہندوستان کی سیر کرچکے ہیں، تاریخی واقعات اور قدیم عمارتوں کے دیکھنے کا خاص شوق ہے اور فرصت کا بیشتر وقت اِسی سیر میں کٹتا ہے گویا یہی زندگی کا اُصول ہے، سیر کرو، خواہ سیر کتب، خواہ سیر دنیا، آپ نوجوان، نومشق مگر بڑے طبّاع اور ذہین کہنے والے ہیں، تین چار سال اُدھر کیننگ کالج کے مشاعروں میں انھیں کا نمبر اول رہتا تھا، نیچرل نظمیں بھی خوب لکھتے ہیں، غزل گوئی کیطرف البتہ میلان کم ہے، مشاہدات نیچر خوب نظم کرتے ہیں، دل میں درد اور زبان میں تاثیر پائی جاتی ہے - تلاش مضامین کے ساتھ ساتھ ترکیبیں ستھری و دلنشین اور الفاظ موزوں اچھی بندش میں سلک نظم میں پروتے ہیں - آپکے کلام کا بیشتر حصہ تاریخی معلومات علمی قابلیت اور قدرتی مناظر کی دلکش تصاویر سے مملو ہے، نشستِ الفاظ قابلِ تعریف ہے اور تخیل کی بلند پروازی قابلِ داد الغرض آپ ایک ہونہار سخنور ہیں اور اُمید ہے کہ استدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ آپکا کمال روز بروز ترقی حاصل کریگا

وحشتِ دل عشقِ گیسو میں یونہی کچھ کم نہ تھی
اور سودا بڑھ گیا سیرِ بیاباں دیکھکر

ہونیوالا ہے کسی بیکس کا ان ہاتھوں سے خون
یہ بتاتا ہے برہمن دستِ جاناں دیکھکر

ہوگیا اُن پر اثر اندازِ میرا ضبطِ عشق
آپ حیراں ہوگئے وہ مجکو حیراں دیکھکر

یہ نہ پوچھو کاٹتا ہوں قید میں دن کسطرح
سقفِ زنداں دیکھکر دیوارِ زنداں دیکھکر

یونہی تو اپنی ہستی موہوم یاد آتی نہیں
دِل بھر آتا ہے مگر گورِ غریباں دیکھکر

دست بستہ سر سے جب باندھے کفن پہنچا اُدھر
قتل ہی کرنا پڑا اُن کو یہ ساماں دیکھکر

بتوں کا ذکر کرتے ہیں خدا کی یاد کرتے ہیں
فرشتے بھی نہیں کرتے جو آدم زاد کرتے ہیں

ہماری آخری ہچکی پہ وہ ارشاد کرتے ہیں
انھیں کو ضبط کا دعوی تھا جو فریاد کرتے ہیں

ترے بیمارِ غم کا آج شاید وقت نازک ہے
کہ سارے چارہ جُو بیٹھے خدا کو یاد کرتے ہیں

یہ حالت دیدنی ہے تیرے بیمارانِ الفت کی
کہ اہلِ درد چپ ہیں چارہ گر فریاد کرتے ہیں

تلون کا اثر تیرے ترے عشاق تک پہنچا
کبھی آہیں، کبھی نالے کبھی فریاد کرتے ہیں

رواں کے نزع کا عالم کسی نے انکو لکھا تھا
جواب آیا، کہ بسم اللہ ہم بھی صاد کرتے ہیں

دیکھنا اے ناخدائے بحرِ الفت دیکھنا
دل کی کشتی سنگِ عصیاں سے کہیں ٹکرا نجائے

کیا غضب ہے ہوں تو آنکھیں دیکھنے کیواسطے
اور ہم چاہیں کہ کچھ دیکھیں مگر دیکھا نجائے

اُف رے کمزوریٔ دل، اللہ رے کارِ زبردست
اپنا ہی چاکِ جگر دیکھیں ہم اور دیکھا نہ جائے

پھونک ڈالا سوزِ غم نے جسم و جاں کیسے سرشک
یہ قیامت ہے کہ ہم روئیں مگر رویا نہ جائے

کھینچتی ہے انکو ہر دل کی کشش اپنی طرف
اپنے گھر سے وہ جو نکلیں بھی تو اب نکلا نہ جائے

کر دیا ہے کام میرا ختم جب فریاد نے
آسماں تک اب نہیں جاتی تو خیر اچھا نجائے

پھونک دے جسم و جگر کیا یہ بھی امکان میں نہیں
آسماں تک آہِ سوزاں ہمنے یہ مانا نجائے

اپنی قسمت ہے وگرنہ اے دلِ وحشت سرشت
اپنے گھر میں وہ بلائیں ہمکو اور جایا نجائے

ایک ہی دریائے بے پایاں کے قطرہ ہم ہیں سب
حیف ہے گر ہم میں کوئی جانبِ دریا نجائے

آنکھیں کھل جائینگی اس بے مایگی کو دیکھ کر
خیر اسی میں ہے کہ قطرہ جانبِ دریا نجائے

ضعف کا تو جب مزہ ہے اے خیالِ روئے دوست
دل سے ہم چاہیں کہ کچھ بولیں مگر بولا نجائے

منزلِ راہِ عدم میں جا بجا لکھا ہے یہ
لوٹنا ہو جس کو وہ اِس راہ سے اصلا نجائے

اب نفس کے ساتھ ساتھ آنے لگے ہیں لختِ دل
حال بہتر ہے مریضِ غم کا کچھ پوچھا نجائے

غرض رہبر سے کیا مجکو گلہ ہے جذبِ کامل سے
کہ جتنا بڑھ رہا ہوں ہٹ رہا ہوں دور منزل سے

حصولِ آرزو کی کیا توقع ایسے غافل سے
جو دل میں رہکے بھی واقف نہیں بیتابیٔ دل سے

سکوتِ بیجل تقریرِ بے موقع کی تہمت کیوں
اُٹھانا ہو تو یوں ہمکو اُٹھا دو اپنی محفل سے

یہ ارمانِ ترقی آج ہے دعویٔ خدائی کا
اُسی دل کو جو کل تک تھا لہو کی بوند مشکل سے

گل و لالہ پہ آخر کر رہا ہے غور کیا گلچیں
یہ وہ خوں ہے جو ٹپکا تھا کبھی چشمِ عنادل سے

شب مہتاب دریا کا کنارا اور یہ سناٹا
غضب یہ ہٹ کہ پہلو میں تمہارے ہم نہ آئیں گے
غضب ہے جلتے پروانوں کا اُنکی بزم میں کہنا

نہیں اس ساز پر ہم خوش کرینگے نغمۂ دل سے
ہمیں یہ ضد کہ تمکو کھینچ لینگے جذبِ کامل سے
رواں یا یوں فدا ہو جاؤ یا اُٹھ جاؤ محفل سے

شاعری .....

مرحبا مشاطۂ زلفِ مضامینِ بلند
رازدارِ ضبطِ دل اے پردہ دارِ رازِ نفس
اے بہارِ بیخزاں اے آفتابِ لازوال
اے نشانِ زندگاں - اے رنگِ خونابِ جگر
جسپہ سو جاں سے ہو دل صدقے ترا وہ ناز ہے
خونِ دل کھا کر بھی جسکو تیری نعمت ملگئی
عاشقِ شیدا ہے ہر بلبل ترا وہ گل ہے تو
اے انیس گوشۂ عزلت گزینانِ الم
اے زبانِ غیب اے نیچر کی سچی ترجمان
جی لبھاتی ہے تپش جسکی وہ دردِ جاں ہے تو
تو وہ سودا ہے کہ لیں ہم راحتِ جاں کے عوض
کب تری معراج کی ہمسر ہے معراجِ شہی

رہبرِ راہِ خدا، ہادیٔ جانِ دردمند
کاشفِ اسرارِ باطن عکسِ سوز و سازِ نفس
کر نہیں سکتا تجھے جورِ زمانہ پائمال
نورِ قلبِ باصفا - تعبیرِ جذبِ پُراثر
جسنے عالم کو کیا بسمل ترا انداز ہے
صدمۂ جانکاہ تنہائی سے فرصت ملگئی
شاہدِ رعنا ترا ہر گل ہے وہ بلبل ہے تو
اے شریکِ حالِ زار صاحبانِ درد و غم
نیّرِ افلاکِ شہرت یادگارِ جاوداں
دل کو بھاتی ہے خلش جسکی وہ پیکاں ہے تو
تو وہ سودا ہے نہ دیں ہم جنسِ دوراں کے عوض
تیرے قدموں پر نچھاور سینکڑوں تاجِ شہی

پپیہہ

وہی تان پھر سنا دے مرے خوشنوا پپیہے
اُسی دردمند دل سے اُسی صوتِ مضمحل سے
مری نیند اُچٹ گئی ہے تری صوتِ جانفزا سے
یہ گھٹائیں کالی کالی یہ ہوا کے سرد جھونکے
مجھے جس طرح سے حاصل یہ کمالِ عشقِ نسیاں
یہ دھرا ہے نسخۂ دل یہ کھلا ہے بابِ حسرت

مرے دلربا پپیہے مرے خوش ادا پپیہے
ترے عشق کے تصدق وہی راگ گا پپیہے
دلِ مضطرب ہے بیکل اسے تو سُلا پپیہے
کوئی تان اونچے سُر میں وہی پھر لگا پپیہے
وہی راہ و رسمِ اُلفت مجھے بھی سکھا پپیہے
جسے پھر کبھی نہ بھولوں وہ سبق پڑھا پپیہے

تجھے روئے گل دکھادوں تجھے سرو سے ملادوں	تری بیکلی کا آخر ہے علاج کیا پپیہے؟
ترا صبر اور توکل، ترا ضبط اور قناعت	تجھے آفریں پپیہے تجھے مرحبا پپیہے
یہ غضب کی آہ و زاری یہ بلا کی بے قراری	تجھے کس کا ہے تصور رہیں کچھ بتا پپیہے

[illegible]

آہ اے نووارد بزمِ رباطِ روزگار — آہ اے تازہ اسیرِ گردشِ لیل و نہار

آہ اے دیباچۂ شرحِ کتابِ دردِ دل — آہ اے عنوانِ بابِ اضطرابِ جانگسل

آہ اے سرنامۂ افسانہائے جانگداز — آہ اے سرخیِ مضمونِ نوائے سوز و ساز

آہ اے نوبت نوازِ ماجرائے حسن و عشق — آہ اے افشائے رازِ نہانہائے حسن و عشق

آہ اے تازہ بیانِ داستانِ وصل و ہجر — آہ اے زندہ نشانِ ترجمانِ وصل و ہجر

آہ اے پُرفن سراغِ ناصحائے اشتیاق — آہ اے روشن چراغِ کالبۂ تارِ فراق

آہ اے تعبیرِ خوابِ مستِ ایامِ شباب — آہ اے تفسیرِ کیفِ بادۂ جامِ شباب

آہ اے زنجیرِ پائے نازکِ وہم و گمان — آہ اے تصویرِ احساساتِ جذباتِ نہاں

آہ اے خمیازۂ سرمستیِ اندازِ حسن — آہ اے آوازۂ جاں بخشیِ اعجازِ حسن

آہ اے آوازۂ خاموشیِ شبہائے تار — آہ اے نقارۂ روپوشیِ دور از دیار

۲

سچ بتا بچے ترا وارث ترا والی ہے کون — پھول ہے تو کس چمن کا اور ترا مالی ہے کون

سچ بتا وہ دل کہاں ہے جس کا اک ٹکڑا ہے تو — آہ وہ آنکھیں کہاں ہیں جن کا اک تارا ہے تو

زینتِ آغوش ہے تو جس کی وہ مادر ہے کون — نور ہے جس گھر کا تو بچے بتا وہ گھر ہے کون

اختصارِ طولِ آزارِ نہانی سچ بتا — اے خمارِ بادۂ جوشِ جوانی سچ بتا

سچ بتا بچے تجھے اپنے وطن کا واسطہ — پھول ہے تو جس چمن کا اس چمن کا واسطہ

سچ بتا بچے مجھے کس باپ کا پیارا ہے تو — سچ بتا کس حسن کا ٹوٹا ہوا تارا ہے تو

کیا اٹھا لائی کسی گلزار سے تجھ کو ہوا — پھول ہوتے ہیں جہاں ایسے ہی پیدا خوشنما

یا عناصر میں ہوئی ترتیب پیدا اس قدر — خود مرکب ہو گئے اور بن گئے شکلِ بشر

تو کوئی مجموعۂ انوارِ اعلیٰ تو نہیں؟
پھول خود رو تو کسی خود رو شجر کا تو نہیں؟

تو کوئی اسرارِ پنہانی کا دفتر تو نہیں؟
تو کسی میخانۂ معنی کا ساغر تو نہیں؟

تو کوئی آئینۂ رمزِ حقیقت تو نہیں؟
تو کوئی گنجینۂ اسرارِ قدرت تو نہیں؟

یہ تو ہاں ہم جانتے ہیں عالمِ صغریٰ ہے تو
یہ بھی کچھ سمجھیں کہاں سے کس لیے آیا ہے تو

گر نہیں لائی صبا تزئینِ گلشن کے لیے
لائے ہونگے دیوتا ہم سب کے درشن کے لیے

(۳)

آہ کیا ہیں مان لوں دنیا کے لوگوں کی دلیل
تجھ کو سمجھوں ثمرۂ کمزوریِ نفسِ ذلیل

آہ یہ تیری ادا حسنِ تحیّر زا ترا
روکشِ لطفِ تبسّم آہ یہ رونا ترا

یہ ترا ننھا سا قد اور ننھے ننھے ہاتھ پاؤں
یہ ترا بھولا سا مکھڑا، گورے گورے ہاتھ پاؤں

دل نہیں کہتا کہ بدکاری کا ہے انجام تو
ہو رہا ہے گرچہ دنیا میں یونہی بدنام تو

(۴)

حیف ہے لیکن اگر لوگوں کا کہنا ٹھیک ہو
حیف ہے گر آدمی کی عقل یوں تاریک ہو

آہ کیا انسان کا ہو سکتا ہے یوں بھی خوں سفید
ڈال دے گھورے پہ اپنا مرکزِ جذبِ امید

توبہ توبہ حضرتِ انساں کی یہ کمزوریاں
اشرف المخلوق ہونے کا ہے دعویٰ پھر بھی ہاں

(۵)

پال لینا کچھ ترا ماں کو تو ہی مشکل نہ تھا
سنگریزہ تھا مگر پہلو میں اسکے دل نہ تھا

یوں نکرتی ورنہ ماں اپنا فشارِ آرزو
یوں بناتی خود نہ ماں اپنا مزارِ آرزو

حسن کا برباد ہو جانا ہمیں بھاتا نہیں
میرے مولا یہ سمجھ میں راز کچھ آتا نہیں

باپ ماں کے نفسِ سرکش کی کہانی ہائے ہائے
اے معاذ اللہ بچے کی زبانی ہائے ہائے

خود غرض انسان تیری خود پرستی الاماں
یہ تری ناعاقبت اندیش مستی الاماں

(۶)

جبر جو کچھ بھی تھا، ماں باپ ہی کا فعل تھا
اہلِ دنیا کو خلش معصوم بچے سے ہی کیا

آہ اے معصوم اے رمزِ حقیقت کی شبیہ
آہ اے مظلوم اے اسرارِ قدرت کی شبیہ

دارِ فانی کی ابھی تو نے ہوا کھائی نہیں
تجھ میں تا معصومیت بد باطنی آئی نہیں

رفتہ رفتہ ہوگا جب عالم میں ترا سن دراز
پیش آئیں گے تجھے دنیا کے پستی و فراز

یا خوشی ہو جائیگی تیری مدارِ آرزو
یا کرے گا آسماں تیرا فشارِ آرزو

ہمکو لیکن یہ نہیں اُمید پڑتی زینہار
دیکھے زندہ رہکے تو اپنی جوانی کی بہار

چند روزہ عالمِ فانی کا ہے مہمان تو
جائیگا دنیا سے لیکر حسرت و ارمان تو

منظرِ عالم سے تو کر لے گا جبدم آنکھ بند
یوں کھینچیگے سانس ٹھنڈی بھر کے تیرے دردمند

پھول تو کھلکر بہارِ جانفزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

لطف تو جب ہے کہ ہمکو کچھ بھی تیرا غم نہ ہو
اور تو سب روئیں لیکن آنکھ اپنی نم نہ ہو

ہمسے گر کوئی رواںؔ پوچھے کہ یہ کیا ہو گیا
ہم کہیں دریا سے قطرہ ملکے دریا ہو گیا

یوں تو ہو جاتا ہے مایوسی میں ہر دل بیقرار
ہے مریضِ غم کا لیکن سخت ابتر حالِ زار

ضعف سے بیکار سب اعضا سراسر ہو گئے
لاغری سے ہے تنِ محزوں کی رگ رگ آشکار

جسم میں اب فرطِ غم سے خون اتنا بھی نہیں
جسکو کر دے قلبِ مضطر نذرِ چشمِ اشکبار

منظرِ عالم سے ساری خوبیاں جاتی رہیں
اب کہاں لطف ہوائے باغ و سیرِ کوہسار

بار ہے آنکھوں کو پلکوں کا اُٹھانا اُف رے ضعف
ایک دفتر ہے نگاہِ لاغرِ بیمار زار

اب کہاں ہیں آرزوئے دل کی وہ بیباکیاں
اب کہاں ہے شوق کا وہ جذبۂ بے اختیار

ایک محشر ہے بپا اُسکے تخیل میں مگر
کشمکش میں ہے مریضِ مضطرب کی جانِ زار

اک طرف مستمنّیٔ عالم ہے جانِ دردمند
اک طرف دامن کشاں بچوں کا اخلاصِ پیار

اک طرف مایوسیٔ دل مقتضائے ترکِ حرص
اک طرف ہے خوفِ بربادیٔ جملہ کاروبار

اک طرف ہے بندِ غم سے رستگاری کی اُمید
اک طرف دل میں خیالِ صحبتِ غمگسار

جانِ بیمارِ حزیں کو چین آئے کسطرح
مبتلا ہے سخت حیرانی میں عقلِ سادہ کار

رفتہ رفتہ پھر تخیل اس سے جاتا ہے گذر
دل پہ چھا جاتا ہے یادِ عمرِ رفتہ کا غبار

پھرتا ہے نظروں میں اُسکی پھر لڑکپن کا سماں
پھرتی ہے آنکھوں میں اُسکی پھر جوانی کی بہار

دیکھتا ہے ہر طرف حسرت بھرے انداز سے
یاد آتے ہیں اُسے سب ہمنشین و غمگسار

یاد آتے ہیں اُسے پھر اپنے اعمالِ قبیح
غور کرتا ہے کرے اُنکی تلافی کچھ مگر
دل ہی دل میں ہوتا ہے اپنے پشیماں وہ مریض
پھر اسی حالت میں جاتا ہے غالب ضعفِ قلب

دل ہی دل میں اپنے ہوتا ہے نہایت شرمسار
یہ خیال آتا ہے آخر ہے حیاتِ مستعار
بازگشتِ عمر کی کرتا ہے خواہش بار بار
اور ہو جاتا ہے آنکھوں میں جہاں تاریک و تار

روح

روح محمد غیاث الدین تلمیذ حضرت وطن حیدر آبادی، رسالہ محبوب الکلام میں اِنکی بہت سی غزلیں نظر سے گذریں اُن میں سے چند شعر انتخاب کر کے درج ذیل کیے جاتے ہیں۔
دورِ موجودہ کے نومشق کہنے والوں میں ہیں

روزِ محشر نہ ہوگا اتنا دراز
جتنا ہوتا ہے دن جُدائی کا

ایک مدت سے ہیں اسیرِ قفس
مٹ گیا دھیان بھی رہائی کا

کھلے کیونکر دہن کا بھید اُسکے
نکتہ ہے سرِّ کبریائی کا

چھپکے پیتا ہے شیخ شب کو مے
کھل گیا حال پارسائی کا

اگر زنگِ خودی سے ہو صفا دل
تو ہے حسنِ ازل کا آئینہ دل

بے وصل ہی مر جانا تھا تقدیر میں اپنی
تدبیر کا کیا دخل ہے امرِ شدنی میں

لے منعمو کبتک طلبِ جاہ میں کوشش
مر جاؤ گے اکدن غمِ دنیائے دنی میں

نہ دل سیر ہوتا ہے ہوگا نہ ہرگز
تمھارے سخن میں کچھ ایسا مزا ہے

طاعتِ حق تم نہیں کرتے ہو حق کے واسطے
شیخ صاحب حور کی خواہش تمھارے دل میں ہے

تعجب کیا جو وقتِ دید آنکھ اپنی جھپک جاتی
تمھارے رخ میں کیا خورشید انور سے ضیا کم تھی

ضرورت کیا تھی ہمکو ہم جو کرتے سیر گلشن کی
چمن سے کیا دلِ پُر داغ میں اپنے فضا کم تھی

روحی

روحی۔ حافظ غلام یٰسین صاحب حیدر آبادی عرف یٰسین بادشاہ تلمیذ حضرت مسکین تھانوی، دو تین غزلیں ایک دوست نے دکن سے ارسال کی تھیں مگر حالات باوجود دریافت معلوم نہ ہو سکے، نمونہ کلام یہ ہے:-

بنا کے سہرا گریبان تار تار سے ہم
تم اپنے ناز سے جنون سے پوچھ لو باعث
شب وصال وہ شرما کے ناز سے بولے
عجب طرح کی ہے یہ بیخودی شوق وصال
وہ دن بھی یاد ہیں جھک کر کبھی نہ ملتے تھے

مراد لینے کو جاتے ہیں نوک خار سے ہم
کہ مضطرب ہے ہیں کیوں، کیوں ہیں بیقرار سے ہم
معاف کیجئے باز آئے ایسے پیار سے ہم
کہ یار ہی کا پتہ پوچھتے ہیں یار سے ہم
غرور حسن سے تم غیرت وقار سے ہم

روشن

روشن میر حسین علی خلف میر خلیل باشندہ فیض آباد نواب نظام الدولہ رئیس لکھنؤ (عہد نواب غازی الدین حیدر) کی سرکار میں داروغہ تھے اور مولوی محمد بخش شہید کے شاگردوں میں ممتاز

نہ کیوں ہو داغ جگر کی بہار پہلو میں
نہیں انیس کوئی ہجر یار میں اپنا
فقط اثر ہے یہ اس گل کے خار مژگاں کا
جو شب کو رہتا ہے گھر میں ہمارے یار روشن

کھلا ہوا ہے عجب لالہ زار پہلو میں
دل حزیں ہے فقط غمگسار پہلو میں
کھٹک رہا ہے جو دل مثل خار پہلو میں
تو ساتھ سوتا ہے رکھکر کٹار پہلو میں

جب وہ دکھلاتے ہیں آکر سر بازار آنکھیں
اسکی آنکھوں سے بھلا کرتی ہیں کیا ہمچشمی
باغ میں جبکہ چلے ناز سے وہ سرو رواں
تو وہ بت ہے کہ اگر دیر و حرم میں جائے
پھرتی ہے نظروں میں کسکے ورد زنداں کی شبیہ
اور کچھ جرم نہیں اسکے سوا آن سے ہوا
صورت قبلہ نما ہیں تری جانب او بت

مانگنے پھرتے ہیں یوسف کے خریدار آنکھیں
جا کے بنوائیں کہیں نرگس بیمار آنکھیں
کبک و طاؤس بچھاویں دم رفتار آنکھیں
تیرے تلووں سے ملیں کافر و دیندار آنکھیں
مثل بنیاں ہیں ہماری جو گھر بار آنکھیں
ہاں فقط ایک نظر کی ہیں گنہگار آنکھیں
نہیں پھرنے کی روشن کی کبھی زنہار آنکھیں

روشن

روشن ۔ روشن شاہ باشندہ بریلی غدر سے چند سال پیشتر میرٹھ میں آرہے تھے بڑے خوش فکر موزوں طبع، حاضر جواب بزرگ تھے ۱۸۷۵ء تک زندہ تھے، درویشانہ زیست کرتے تھے، میرٹھ میں قیام کے زمانہ میں شیخ غلام محی الدین عشق سے بہت ارتباط تھا۔ اردو

فارسی دونوں زبانوں میں شعر اچھا کہتے تھے۔

دیکھ کے مجکو منہ کو چھپایا اور حیا کا نام کیا
واہ رے تیری دانشمندی آہیں بھی اک کام کیا

نہ دنیا کا رہا میں اور نہ دیں کا
بچھوڑا عشق نے مجکو کہیں کا
پھپھولے پڑ گئے سینے پہ میرے
جو تو نے ہار پہنایا یاسمیں کا

نہ کھینچ اے ماہرو شانہ سے اپنے بال جوڑے کا
وبال جان عاشق ہو ترا ہر بال جوڑے کا
پھرا رکھتا ہے منہ اسکی طرف سے رشک مہ اپنا
سہارا رہتا ہے اس باعث پریشاں حال جوڑے کا

قاصد جو اسکے آنے کا لایا پیام رات
آنکھوں میں میری نیند نہ آئی تمام رات
جانے کو اسکے پاس کے بے اختیار تھا
میں نے رکھا ہے دلکو بہت تھام تھام رات

یہ بات خوب نہیں ہم تو رات دن تم کو
دعا کیا کریں اور گالیاں سنا دیں آپ

رکھ لیے سر پہ جو اس بت نے کہیں چھوکے پھول
پیرہن میں نہ سمائے بخدا پھول کے پھول

آپ کرتے ہیں پیار بار نہیں
ہم کو ہاں کا بھی اعتبار نہیں
غیر سے ہوتی ہیں پیار کی باتیں
ہیں یہ پروردگار کی باتیں

کوچہ میں ترے بیٹھ گئے جبکہ ہم اے یار
جوں نقش قدم پھر نہیں اٹھنے کے زمیں سے
آنکھوں میں ذرا ٹھیر تو تا دیکھ لیں اسکو
اقرار یہ ٹھیرا ہے دم باز پسیں سے
پردہ وہیں دل پر سے اٹھا اپنے دوئی کا
در پردہ جو باتیں ہوئیں اس پردہ نشیں سے

سامنے تیرے اے کماں ابرو
ترک عالم کے بانکپن سے گئے
تیرے کوچے کے اشتیاق میں یار
گھر سے ویراں ہوئے وطن سے گئے

ہم اپنے جی سے تری جستجو میں جانے لگے
نہ پایا تیرا ٹھکانا وہ ہم ٹھکانے لگے
ہم اپنے دل کی جو کلفت انھیں سنانے لگے
تو آپ ہنسنے لگے اور ہمیں رلانے لگے
جہاں کے باغ میں جو گلبدن کہاتے تھے
وہ خود تمھارے لیے گل مین پہ کھانے لگے
اثر کیا مرے نالے نے بارے کچھ دوش
جو آہیں طرف سے سلام و پیام آنے لگے

نظر سے شفقت کی دیکھو پیارے کہ دل سے تیرے ہیں ہم تمھارے
خدا پہ روشن ہے بندہ پرور ہیں جیسے ہم تمھارے

روشن یہ خراب ہمنے ہستی دیکھی جب جیتے تھے ہستی نظر آتی تھی	رباعی جو کچھ تھا بلند اُسکو پستی دیکھی اب نیست ہوئے تو ہمنے ہستی دیکھی
گر آنکھ ہے سے اپنی وہ لاکھ بار بدلے دل کی طپش سے گرمیٔ خورشید سرد ہے کونسی جا ہے کہ جس جا نہ گزر اُس کا ہے	دل ایک ہو رہا ہے آنکھیں ہزار بدلے سینہ اگر یہی ہے تو دوزخ بھی گرد ہے مثلِ خورشید جہاں دیکھئے گھر اُس کا ہے
منحصر ہے قاصد و پیغام خط پر دوستی بھولنا آتا ہی یاد اب اُس فراشکار کا	سو نہیں منظور اُسکو اس خط پر دوستی کی غلط بد عہد کے عہد غلط پر دوستی

روشن

روشن ۔ مرزا جہان شرف روشن ولد جہانگیر شرف گورگانی ساکن دہلی آپ کو تلمذ مولانا سید وحید الدین صاحب بیخود سے تھا ہیں برس کی عمر سے شعر و سخن کا شوق رہا اور سب سے زیادہ تعجب خیز یہ بات ہی کہ بالکل ناخواندہ تھے بلکہ جو کچھ کہتے تھے دوسروں سے لکھوا لیتے تھے اپنی عقل و طبع کی جدت سے شعر و سخن کا چرچا مدام ہمدم رہا۔ دہلی میں کم اور لاہور وغیرہ مقامات میں زیادہ قیام رہا تقریباً دو تین برس کا عرصہ ہوا کہ راہیٔ ملک بقا ہوئے بتیس برس کی عمر پائی۔ یہ اُن کا کلام ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

اُسکی قدرت یہ اُسی کی شان ہے خاک کے پتلے میں بھردیں شوخیاں قدِ آدم ڈھل گئی تصویرِ یار کیوں نہیں ملتا ہے مجھ سے تو بتا اُسکے لب ہلتے ہی روشن جی اُٹھے	خاک میں گویائی پیدا ہوگئی شان خالق کی تماشا ہوگئی آنکھ کی پتلی بھی سانچا ہوگئی بیوفا ایسی خطا کیا ہوگئی بات کافر کی مسیحا ہوگئی
تڑپ تڑپ کے گزاری ہو رات بھر ہمنے دکھائے جلوہ جو داغِ جگر پس مردن سنائیں سوزش فرقت کا حال کیا روشن	وہ کہہ گئے تھے کہ آئینگے ہم چراغ جلے ہماری قبر پہ آٹھوں پہر چراغ جلے وہ آگ بھڑکی کہ سارے جگر کے داغ جلے

تیری چشمک بھی خوشی کے ساتھ ہے	دل لگی دل کی لگی کے ساتھ ہے
درد دل جاتا ہے کوئی چارہ گر	یہ ہماری زندگی کے ساتھ ہے
لڑکے جاتے ہو کہاں روشن سے تم	لطف جانیکا خوشی کے ساتھ ہے

روشن

روشن بابو منی لال روشن شاہجہانپور کے متوطن پہلے حضرت جوہر سے اصلاح لیتے رہے پھر حضرت احسان سے تلمذ اختیار کیا قاضی محمد خلیل کے مشاعرہ میں بریلی میں انکو دیکھا ہے، ذہین اور طبیعت دار شخص ہیں، شوخئ طبعی کا اثر کلام میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو۔

کوہ کن کو کوہ اور مجنوں کو صحرا دیدیا	خاک ہم اڑلنے کو مجھے اس بت کا کوچہ دیدیا
عاشقوں میں آپنے اچھی مری توقیر کی	داغ دل کیسا مجھے الفت کا تمغا دیدیا
تیرا غم مہماں ہوا تو یہ تواضع میں نے کی	خون دل پینے کو کھانے کو کلیجا دیدیا
کھیلتے پھرتے ہیں ہاتھوں میں لئے شوخی کیا	میں نے انکو دل دیا، گویا کھلونا دیدیا
آج وہ سہم گیا دیکھ کے حسرت کا ہجوم	وسعت دل کو مرے حشر کا داماں سمجھا
کس ناز سے کہتا ہے قیامت میں وہ قاتل	کیوں آج یہاں خون کا دعویٰ نہیں ہوتا
تمہارا ہیں نہیں عاشق تو تم عاشق سہی میرے	یہ کوئی بات بھی ہے کس لیئے جامہ سے باہر ہو
حسین خلق ہوئے ہیں ہنسی خوشی کے لئے	بنے ہیں عاشق ناشاد بیکلی کے لیئے
نہ دم لیا کہیں اک دم نہ چین سے بیٹھے	تمام عمر بھٹکتے پھرے کسی کے لیئے
او وعدہ فراموش کدھر بھول پڑا آج	لفقد یہ ہماری جو یہ صورت نظر آئی
مجبور ہوں معذور ہوں اے ناصح مشفق	انتو یہ طبیعت جدھر آئی ادھر آئی
آنکھوں میں پھرا کرتی تھی پہلے مگر انتو	تصویر کسی شوخ کی دل میں اتر آئی
حسینوں کا بھی یہ انداز عالم سے نرالا ہے	جفا کاری کا شیوا ہے وفاداری کا دعویٰ ہے
خدا جانے کہ کیا اسم ہجو دی میں کہہ گئے اُن سے	نہ اب کچھ بات بنتی ہے نہ اب کچھ عذر چلتا ہے
محبت اٹھ گئی دنیا سے ایسی وائے بیدردی	کسی کی جان جاتی ہے کوئی محو تماشا ہے

جو مجھے بدنام کرتے تھے وہ رسوا ہو گئے	تو وہ جھوٹا لیکے مجکو آپ ہی جھوٹے ہوئے

روشن

روشن منشی اکرام اللہ خان روشن ہیڈ محرر تھانہ نصیر آباد ضلع بارہ بنکی معیار سے کلام منتخب ہوا

کیا اثر والے مری تقدیر دیکھا چاہیے	اے دعا تجھ میں ہے کیا تاثیر دیکھا چاہیے
سامنے آئینہ رکھنے سے جسے آئے حیا	کس طرح کھچوائے وہ تصویر دیکھا چاہیے
گھس گئے سب ناخن تدبیر ہے کوشش کی حد	حل ہو کیونکر عقدۂ تقدیر دیکھا چاہیے
بل دیئے جاتے ہیں زلفوں میں الٰہی خیر ہو	پاؤں پڑنے کو ہے کیا زنجیر دیکھا چاہیے

روشن

روشن منشی دیوان روشن لال صاحب متخلص بہ غالب و روشن ابن منشی دیوان مناں لال صاحب کایستھ دہلوی حضرت غالب مرحوم سے تلمذ کا دعویٰ ہے مگر ظاہراً اسکی کوئی اصلیت معلوم نہیں ہوتی، انکے بعض احباب انھیں مرزا دولھا اور بعض صرف استاد کہتے ہیں اور فی الحقیقت انھیں دعویٰ کمال ہے، باسٹھ[62] ترسٹھ[63] برس کی عمر ہے انکے بیٹے نے کچھ کلام انتخاب کرکے بھیجا تھا اُس میں سے چند شعر درج ہیں

کاوش نوک مژگان جاناں کی دلا دیتا ہے یاد	پاؤں میں چبھ چبھ کے ہر دم ٹوٹ جانا خار کا
کرم ہو یا ستم اُلفت میں ہمکو سب برابر ہے	خوشی ہے وصل کی اچھی نہ فرقت کا ہی غم اچھا
روشن میں لبھاتا ہوں اُنھیں شعر سناکر	وہ منہ بھی لگاتے نہیں مجھ ہرزہ سرا کو
الٰہی کیا فسوں دل پر کیا ہے چشم میگوں نے	کہ ہم کعبہ سے پھر کر ہو گئے رہ گیر میخانہ
یہی گردش رہی دورہ میکشی کا ہے زمانہ میں	تو کعبہ سے کہیں بڑھ جائیگی توقیر میخانہ

رونق

رونق شاعر نازک خیال ظہوری ظہور نظیری نظیر نواب احمد علیخاں بہادر رونق رئیس ٹونک شاگرد رشید نواب مرزا ظہیر دہلوی و سید امراؤ مرزا انور مرحوم آپ بانیٔ ریاست ٹونک کے ساتویں صاحبزادے اور رموز فن سخن سے خوب واقف تھے، جب ۱۲۵۰ھ میں نواب امیر خاں نے انتقال کیا اور نواب وزیر الدولہ مسند نشین ہوئے بیس ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ انکا مقرر رہا، رونق مرحوم وسیع المشرب، خندہ پیشانی، خوش اخلاق، مہمان نواز سیر چشم رئیس تھے اوائل مشق میں نوازش حسین خاں تنویر دہلوی سے اصلاح لیتے رہے

لیکن ۵۶ برس کی عمر میں سید امراؤ مرزا انور سے تلمذ اختیار کیا اور سابقہ کلام ضائع کر دیا،
اُنکی توجہ سے بہت جلد خود اچھا کہنے لگے، مہاراجہ رام سنگھ بہادر والی جیپور سے دوستانہ
مراسم تھے اور اسی تقریب سے سالہا سال جیپور میں بطور اُنکے مہمان کے قیام پذیر رہے
اجمیر میں بھی کئی برس بسر کیئے، چند سال بعد جب حضرت انور کا انتقال ہو گیا اور حضرت ظہیر بھی
مہاراجہ رام سنگھ کے سرگباش ہونیکے بعد خانہ نشین ہو گئے تو انھوں نے اُنھیں اپنے
پاس بُلا لیا اور کلام میں اُن سے مشورہ لیتے رہے بعض بعض غزلیں انکے دیوان میں ایسی
ہیں کہ اچھے اُستادوں کے کلام سے ٹکر کھاتی ہیں مشکل زمینوں میں بالخصوص بہت خوب کہتے
تھے اور روزمرہ اہل زبان پر اچھا عبور تھا۔ ایک دیوان مطبوعہ دوسرا غیر مطبوعہ ان سے یادگار ہے
آخر سنہ ۹۱ میں بعالم ضعیفی انتقال کیا، حضرت ظہیر انکے بڑے ثناخوان اور رئیسانہ دلنوازی اور
حسنِ سلوک کے بڑے مداح تھے اور بڑی محبت اور احترام سے انکا ذکر راقم تذکرہ سے کیا کرتے تھے
انکے شاگردوں میں علی محمد خاں ضیا عبدالقادر خاں ضمیر انکے صاحبزادے چھیتر مل مجبور ملا شمس الدین
خان شمس مشہور ہوئے

ہے یہی فکر یوں نہو یوں ہو آبِ خنجر سے تر ہوا نہ گلو دل زمانے سے ہٹ گیا اپنا	ان ہوسہائے خام نے مارا سر بہت تشنہ کام نے مارا ہم بھلے اور گھر بھلا اپنا
دل ہی کہاں جو مانگتے ہیں آپ بار بار خیالِ وصل کجا اور کجا وہ خلوتِ ناز میرا سوال کیا ہے تمہارا جواب کیا بچ گئے ہم صدمہائے ہجر سے تجھ سے نہ یہ گماں تھا اے بانیٔ تغافل اک وار میں شمشیر کے ہوتے ہیں سبکدوش	سو بار سینہ چیر کے تمکو دکھا دیا کہ جس میں وہم و گماں کا گذر نہیں ہوتا آئے ہو پی کے گھر سے عدو کے شراب کیا موت کا اچھا بہانا مل گیا غیروں کے واسطے ہو ہم پر عتاب اتنا سن لیجئے قصہ ہے بہت مختصر اپنا

سر جائے محبت میں کہ ایمان پہ بن جائے
ہو جائے کسی طرح وہ کافر مگر اپنا

سمجھتے تھے اسے ناداں مگر وہ تو بلا نکلا
کہ دشمن بن گیا نام محبت منہ سے کیا نکلا

یوں گراں ہے نفس نفس شب ہجر
جیسے بیمار پر ہے بھاری رات

مر گئے تجھے کس لیئے چلے اب کیوں
حیف اِس کا نہ کچھ کھلا باعث

عیسیٰ سے ہو سکا نہ ترے زار کا علاج
مشکل بہت ہے عشق کے بیمار کا علاج

پھر بڑھے ہیں ناخنِ دستِ جنوں
پھر ہمارے داغ پر آیا کھرنڈ

حضرتِ دل ہے اگر لطف اُٹھانا منظور
کیجئے زہرِ غمِ عشق کا کھانا منظور

دلِ بیتاب تو سو بار ہدف ہو جائے
ناوکِ یار کو ہو بھی مگر آنا منظور

اِس طرح واعظ بیاں کرتا ہے واں کا حال کچھ
آسماں سے جیسے آیا ہے خدا کو دیکھ کر

خدنگِ نیمکش اُسکے کہیں روکے سے رکتے ہیں
نگاہیں پار ہوتی ہیں جگر میں تیر بن بنکر

یکساں ہیں اہلِ دل کے لیئے دونوں صورتیں
جو شکلِ بیخودی ہے وہی ماجرائے ہوش

قتل خنجر سے نکرے یہاں سلے یاروں کی ایک
ہے نگاہِ ناز تیری لاکھ تلواروں کی ایک

وہاں ہے انتظامِ غیر یاں تک
کہ ہم کیا جا نہیں سکتا گماں تک

تغافل سے ترے غفلت یہ چھائی
کہ غافل سو رہے ہیں پاسباں تک

دوئی جب مٹ گئی پھر بحث کس سے
یہ سب جھگڑے ہیں رونق این و آں تک

کہتے ہیں مرے اشکِ مژہ سے کہ چلے ہم
پیدا ہوئے جب سے ترے سایہ میں پلے ہم

گھر آئے مرے شکوہ اِس شرط سے رونق
واں چلنے کو چلتے ہیں نہ ٹھیرینگے وسلے ہم

لیجائے وہ ناوک جگر و دل کو تو اچھا
یونہی میرے سینے میں یہ بیکار پڑے ہیں

تشہیر کا یا حکم ہو یا دفن کا ان سے
قاتل ترے کشتے سرِ بازار پڑے ہیں

ہے سبکو گماں دامنِ قاتل ہیں کہ گل ہیں
چھینٹے جو مرے خوں کے دو چار پڑے ہیں

رونق ہے غضب جوش ہیں دریائے محبت
گرداب میں لاکھوں ہی ہوسکار پڑے ہیں

بترے چمن حسن سے ہر گز نہیں بہتر
ہم خواب میں گلزارِ ارم دیکھ چکے ہیں

ہم بھی کوئی آفت ہیں کہ پھر ہے طلبِ دل
فرقت کے ابھی رنج و الم دیکھ چکے ہیں

دیکھنے سے ترے زاہد کی یہ حالت بگڑی
خود کہیں سبحہ کہیں جبہ و دستار کہیں

کس طرح ہم انھیں دزدیدہ نظر سے دیکھیں
خوف ہے یہ کہ نہ ہو جائیں گنہگار کہیں

پھر دوبارہ اُسنے حالِ زار ہم کیونکر کہیں
کہدیا اک بار سو سو بار ہم کیونکر کہیں

دل تو کیا اُمیدِ دل شل رگِ جاں قطع کی
وہ نگہ کچھ اور ہے تلوار ہم کیونکر کہیں

سایۂ لطفِ خدا ہے سایۂ دیوارِ یار
رونق اس کو سایۂ دیوار ہم کیونکر کہیں

کیا دخل مہرباں جو کسیکو خبر بھی ہو
پر ہے یہ دوستی تمھیں بد نظر بھی ہو

دیوار و در سے سر کو نہ پھوڑیں تو کیا کریں
کافر کسی طرح سے شبِ غم بسر بھی ہو

کچھ زخم الم دل میں ہیں کچھ داغ جگر میں
یہ پھول ملے ہیں چمنِ دہر سے مجھ کو

شرمِ عصیاں میں ہم ایک ایک سے ہیں چھپتے پھرتے
ڈھونڈتی پھرتی ہے اللہ کی رحمت مجھ کو

تصدق اس زباں کے اس پیامِ ناز کے قرباں
کہ اپنا حالِ دل کاغذ پہ لکھکر بھیجدو ہمکو

دل سے اپنی یاد پر قربان ہوں
بیخودی میں بھی مجھے ہے یاد تو

دل تک ہو چاک تیغ جو سر پر لگائیے
عاشق ہوں ہاتھ سوچ سمجھ کر لگائیے

نسخہ میں طبیبوں نے لکھا اور ہی کچھ ہے
بیمارِ محبت کی دوا اور ہی کچھ ہے

اعدا کی ملاقات سے انکار مسلم
کیا کہتے مگر ہمنے سنا اور ہی کچھ ہے

اب اس مقام پہ ہیں بیخودانِ جلوۂ دوست
کہ آزمایش دار و رسن لگے کرنے

نشاطِ پرسشِ احوال میں جھلک اٹھی
ہم اُن سے شکوۂ رنج و محن لگے کرنے

جو ربطِ خسرو و شیریں کا ذکر میں نے کیا
وہ شرح جانکنیٔ کوہکن لگے کرنے

کہا جو میں نے کہ رونق سے رم ہے کیوں تم کو
یہ خوف ہے کہ نہ دیوانہ پن لگے کرنے

ایک جلوہ میں مٹا دی وہ پریشان نظری
خوب بگڑے ہوئے عاشق کو سنوارا تو نے

دیکھ کر مجکو جو دامن سے کیا تمنے حجاب
لب پہ ایک ایک کے کیا کیا سخنِ دامن ہے

نہ باتیں کیں نہ تسکیں دی نہ پہلو میں ذرا ٹھیرے
جو تم آئے تو کیا آئے جو تم ٹھیرے تو کیا ٹھیرے

سر اٹھا کر تیغ براں سے وہ یوں کہنے لگے
کیوں ہمارے ہاتھ کی دیکھی صفائی آپنے

جلوہ اپنے حسن کا دکھلا کے ہر ہر رنگ میں
کافر و مومن میں ڈالی ہے لڑائی آپنے

جوہر تیغ نگاہ ہے رونق
پھر گئی جس طرف صفائی ہے

عشق کے فیض و لطف سے ہم بھی لشکر شاہی رکھتے ہیں
دستہ دستہ یاس و الم ہے حسرت لشکر ہے

ایسا کچھ آیا ہے زمانہ جسکو دیکھو وہ ہے حزیں
کوچہ بکوچہ رنج کی فوجیں غم کا گھر گھر لشکر ہے

تری تکرار بیجا سے ہمارا دل اُلجھتا ہے
تو اپنا وار کر کس واسطے قاتل اُلجھتا ہے

صباحت روئے دلربا سے نزاکتیں مٹ گئیں سمن کی
شمیم گیسوئے جانفزا سے اڑی ہے بو نافۂ ختن کی

نہ باز آنا کبھی کجی سے اگرچہ دشمن بھی جائے جی سے
نظر جو سیدھی ہوئی کسی سے تو مٹ گئی بات بانکپن کی

مرتا ہوں کہا میں نے تو جھنجلا کے یہ بولے
مرنے پہ جو مرتے ہو تو مرکیوں نہیں جاتے

خبر لیجے کہ اک عالم ہے بیخود
شمیم گیسوئے عنبر فشاں سے

غلط ہے کہ دل کا لگانا برا ہے
محبت کا لیکن جتانا برا ہے

کہاں رہ گئی لب پہ جاں آتے آتے
کہ رک رک گئیں ہچکیاں آتے آتے

گل و لالہ سے میکدہ بھر گیا ہے
مغاں کے لیئے ارمغاں آتے آتے

نہ آساں سمجھ قصۂ غم کو رونق
کہ آئیگی یہ داستاں آتے آتے

غیر کا نام لیا ہو تو زباں ہی جل جائے
بیٹھا آپکی مجھپر خفگی ہوتی ہے

آپ کیا بزم میں خوش ہیں مری رسوائی سے
دلمیں سمجھو تو ذرا آپکی ہنسی ہوتی ہے

رونق

رونق۔ لالہ رام سہائے کایستھ ولد حکیم منّالال راجہ جھاؤ لال لکھنوی کے عزیزوں میں تھے اور شیخ ناسخ کے شاگرد، فارسی شعر کہنے کا شوق بہت تھا، گاہ گاہ اردو بھی کہہ لیتے تھے امجد علیشاہ اور واجد علیشاہ کا زمانہ پایا تھا، یہ کلام کا خلاصہ ہے ؎

غصہ میں ترے موت ہے آئی مرے دل کی — ہے چین جبیں دشمنِ جانی مرے دل کی
پانی عرقِ شرم سے ہو کر نہ بہے کیوں — دیکھے جو سحاب اشک فشانی مرے دل کی
صد چاک ہوں شانہ کی طرح زلف کے غم میں — قاصد یہ اُسے کہیو زبانی مرے دل کی
اب کوئی نہیں کہتا ہے فرہاد کا قصہ — رونق ہے وہ مشہور کہانی مرے دل کی

رونق

رونق ۔ منشی حافظ محمد جان صاحب رونق باشندۂ رامپور تلمیذ مولانا احمد حسن شوکت میرٹھی، علمی استعداد اور اس فن کی مشق خاصی ہے، پندرہ بیس برس سے مشقِ سخن کرتے ہیں اور طبیعت کے رنگ کا یہ نمونہ ہے ۔

ہمیں کچھ پوچھنا تھا میکدہ کا حال رونق سے — مگر جب اُس سے ملتے ہیں نشہ میں چور پاتے ہیں

خاک میں ملکے اُنھیں خاک ملیگا آرام — فکرِ آرام میں اکدم جنھیں آرام نہیں
کمر سے نازنینوں کی کہاں نسبت ہے اے بلبل — یہ مانا مانتے ہیں ہم رگِ گل کو نزاکت میں
دلِ مضطر کا اپنے چارہ گر اللہ حافظ ہے — وہی ہے وصل میں حالت کہ جو حالت تھی فرقت میں
زیاں ہے غیرت و ناموس و عقل و ہوش کا جس میں — فقط اک سود سودا کا ہے بازارِ محبت میں
دنیا عجب مکان ہے کہ جس کا ہر اک مکیں — راہِ فنا میں چلنے کو پا در رکاب ہے
اگر منظور ہے سیرِ فضائے لامکاں پہلے — مٹا دے چار ارکانِ عناصر کا نشاں پہلے
رسائی درسگاہِ معرفت تک کالے کوسوں ہے — مٹے جبتک نہ لوحِ دل سے نقشِ این و آن پہلے
کیا رسوا حرم میں خرقہ و دستار نے مجھکو — نہ چھوٹا داغ مے ہر چند دھویا آبِ زمزم سے

رونق

رونق ۔ لالہ لچھمی نراین صاحب رونق خلف لالہ بالکشن صاحب دھون کھتری، بزرگوں کا اصل وطن آگرہ تھا لیکن ابتدائی تسلط سرکار انگلشیہ میں ملازمت کی وجہ سے آپکے بزرگوں نے لکھنؤ میں بود و باش اختیار کی، آپکے حقیقی چچا لالہ رام نراین چیف کمشنر اودھ کے میر منشی تھے، رونق صاحب نے انگریزی میں یونیورسٹی الہ آباد کا امتحان ایف اے ۱۸۹۳ء میں پاس کیا، اب گورنمنٹ جوبلی ہائی سکول لکھنؤ میں مدرس ہیں، فارغ البالی کے زمانے میں

شاعری کا اکثر شغل رہتا تھا، افکارِ خانگی کی وجہ سے آجکل تائب ہیں، چالیس پچاس غزلیں انکے ایک دوست لالہ ہرویال لکھنوی نے ارسال کی تھیں اُن میں سے یہ چند شعر منتخب ہوئے

کچھ نہ پوچھو حال کیا میرا شبِ دیجور تھا
بے طرح بے چین پہلو میں دلِ رنجور تھا

کوئی لاکھ دھر لئے سینہ پہ آنچل
چھپائے سے جوبن چھپا ہے کسیکا

ہر آئینہ سے نہ دعوے کرو صفائی کا
پھسل نہ جائے کہیں پاؤں خود نمائی کا

بنا کر تو نے آئینہ حسینوں کو کیا خود بیں
تجھے پہلے ہی منہ اپنا سکندر دیکھ لینا تھا

بکھرنے کو ہے عنبریں زلفِ رخ پر
گھٹا میں چھپے گا قمر دیکھ لینا

جلوۂ طور سے روشن ہوں ہماری آنکھیں
بام پر آپ کا دیدار جو ہو آجکی رات

پھیر دو خنجر گلے پر تم اگر ملتے نہیں
گر وفا آتی نہیں تو کیا جفا آتی نہیں

عدو کو پان بنا کر کھلائے جاتے ہیں
کہ میرے قتل کے بیڑے اُٹھائے جاتے ہیں

کچھ نہیں دیکھتے جز جلوۂ جاناں رونق
جس طرف عاشقِ جانباز نظر کرتے ہیں

جن کو دل اور جگر شوق سے ہم دیتے ہیں
وہ ہمیں ساری خدائی کا الم دیتے ہیں

فدائے حسن ازل سے ہے عشق سوختہ جان
پتنگ شمع کے شعلہ پہ کیوں نثار نہو

مثل سرمہ کے ہیں چھپا لوں گا
میری آنکھوں میں تو سما دیکھو

کانوں باتوں میں اس پریرو نے
دل ہمارا اُڑا لیا دیکھو

تقدیر کا گلہ نہ شکایت فلک کی ہے
راضی ہیں ہم اسی میں جو تیری رضا ہوئی

مانگتا ہوں یہ دعا میں شبِ تنہائی میں
موت آئے پہ کسی پر نہ طبیعت آئے

عبث ہے بختِ واژوں کی شکایت
زمانے کی خوشی میں غم ملا ہے

اُسنے پیدا ہیں کہاں دلکے ستانیوالے
ہمسے دنیا میں کہاں ناز اُٹھانیوالے

جامِ مئے طہور پلا ساقیا انھیں
آتے ہیں شیخ ساغر و مینا لیئے ہوئے

چادرِ گل کی نہیں کچھ احتیاج
بیکسی تربت پہ ہے سایہ کیئے

رشکِ پری و حور ہوں آئینہ رو ہزار	ہمکو جہاں میں آپکی صورت پسند ہے

رونق

رونق۔ لالہ شیوناتھ سہائے ولد منشی کشندیال صاحب مرحوم، بکھری برانوان صوبۂ بہار کے باشندے اور حضرت اکبر داناپوری کے شاگرد ہیں، فارسی میں کافی دستگاہ ہے، لکھنؤ وبریلی کے رسالوں میں آپ کا کلام شائع ہوتا رہا ہے۔ یہ چند شعر اسکے ہیں۔

خوشخرامی میں بھی صاحب کی توجہ چاہیئے	دیکھئے دل خاکساروں کے ہیں غلطاں زیرِ پا
وُہ دِل سے ایسا ہی سمجھیں تو لطف ہے ورنہ	لِکھا جو عاشقِ شیدا خطاب کیا ہوگا
پانوں میں چھالے جگر شق دِل میں درد	میں سراپا غم کا پُتلا ہوگیا
کسقدر پُر درد ہے رونق بیانِ عندلیب	ہوش اُڑجاتے ہیں سُن سُنکر بیانِ عندلیب
بُود و نابود ہے انساں کے لیئے مثلِ حباب	ہستی دشتی ہے اپنی خبر کی مانند

رونق

رونق۔ حافظ شیخ محمد عبدالباری خلف مولوی محمد عبدالرحمٰن صاحب مرحوم و نواسہ حکیم محمد حسنخاں تاثیر مولد و مسکن بنارس ہے بتیس اکتیس برس کی عمر ہے، آپکے والد بھی شاعر تھے اور جاناں تخلص کرتے تھے، حضرت رونق کو عرصہ دس گیارہ سال سے شعر گوئی کا شوق ہے اور اس فن میں حضرت فریاد ندروی شاگرد حضرتِ تسلیم لکھنوی سے اصلاح لیتے ہیں نومشق شاعر ہیں کلام میں کوئی بات قابلِ ذکر نہیں۔ انتخاب یہ ہے۔

الفتِ چشم میں اِس طرح ہے مجھ زار کا رنگ	زرد جس طرح سے ہو نرگسِ بیمار کا رنگ
سُنئے آواز مری کہتے ہیں	کون اللہ سے فریادی ہے
یُوں فرقتِ حبیب میں حالت تباہ کی	اُٹھے اگر تو روئیے بیٹھے تو آہ کی
داغوں میں ضو ہے آہِ دلِ بیقرار سے	گھر میں جلے چراغ نسیمِ بہار سے
کیوں چشمِ تر سے داغ جگر کے نہوں ہرے	سر سبز کھیت ہوتے ہیں ابرِ بہار سے
ہر قدم پر جو ناتواں دل ہے	ایک منزل ہزار منزل ہے

رونق

رونق۔ محمود میاں رونق، کئی تھیٹریکل کمپنیوں میں ڈراما نویس رہے اور متعدد ناٹک

انگریزی سے ترجمہ کئے اور چند خود بھی بنائے ۱۸۹۲ء کے قریب حیات تھے اور بمبئی میں رہتے تھے اب عرصہ سے کچھ حال معلوم نہیں یہ چند شعر انکے ہیں

گردش تقدیر سے اپنے ہی ہو جاتے ہیں غیر
تیشۂ فرہاد دشمن ہو گیا فرہاد کا

کس قدر رکھتا تشنہ کام آب خنجر الحفیظ
ہر لب زخم جگر پر شکر ہے جلاد کا

ٹھیرائے شوق شہادت دم نے اے ذوق طپش
ہاتھ قبضے پر ذرا جنبے تو ہے جلاد کا

تو اسیر زلف ہوں کیا جانوں سہم و راہ عشق
رفتہ رفتہ آئیگا ڈھب نالہ و فریاد کا

کعبہ کے ساقی نے شب مہ ہیچ ساغر رکھدیا
زاہدوں نے طاق پر سب حور و کوثر رکھدیا

عاشقوں کو امتیاز دیر و کعبہ کچھ نہیں
اسکا نقش پا جہاں دیکھا وہاں سر رکھدیا

جنوں میں ہوش ہی ان کا نہ غم ہے کچھ گریباں کا
نہ یہ معلوم کیوں ادھڑا نہ یہ مفہوم کیوں ٹانکا

سر جائے تو کچھ غم نہیں مطلب تو بر آئے
وہ قتل ہی کو آئے بلا سے مگر آئے

عاشق کو حور و خلد سے کیا کام واعظا
اجرت ہے یہ تو آپ سے مزدور کے لیے

رونق منشی رادہا موہن لال اہلمد راج ریاست ترواضلع فرخ آباد ۱۸۹۳ء کے پیام عاشق سے چند شعر درج ہوئے ۔

ملبوس بظاہر ہے فقیرانہ ہمارا
پر حوصلۂ دل تو ہے شاہانہ ہمارا

الجھاتے ہو دل گیسوئے پر پیچ میں لیکن
اے آئینہ رو ٹوٹے نہ یہ شانہ ہمارا

ہر اک کو فراموش ہوا قصۂ مجنوں
اب ورد زباں سب کے ہے افسانہ ہمارا

مے پیکے نظر آئے ہیں اسرار نہانی
کم ساغر جم سے نہیں پیمانہ ہمارا

دیکھا جو مئے عشق سے معمور تو بولے
کیا جھومتا آتا ہے وہ مستانہ ہمارا

قیس ہر دم یہی کہتا ہے بیابانوں میں
ہم بھی ہوتے کہیں لیلی کے شتربانوں میں

کچھ بھی اے غیرت یوسف نہیں انکار مجھے
بیچ لے شوق سے چلکر سر بازار مجھے

رونق منشی پیارے لال صاحب دہلوی تلمیذ رشید حضرت رنج مرحوم خلف منشی جے نراین

مرحوم کا بیٹا ماتھر ساکن روشنپورہ دہلی، بیالیس چالیس برس کی عمر، ذہین، زود گو اور خوش کلام کہنے والے ہیں، دو دیوان مرتب کر لیے ہیں جس میں سے پہلا موسوم بہ "رونقِ سخن" کئی برس ہوئے چھپکر شائع ہو گیا، دوسرا جس میں زیادہ تر تصوف و معرفت کا رنگ ہے مکمل موجود ہے اور دونوں کا انتخاب یہاں درج ہے، سب سے پہلے جب آپنے غزل کہی تو حضرت داغ کے پاس اصلاح کے لیئے دکن بھیجی، جسپر اُنھوں نے اصلاح دیکر ہدایت کی کہ مولانا راسخ کو دہلی میں دکھالیا کرو چنانچہ آپ اُنکے شاگرد ہو گئے، اُنہیں ایّام میں مولانا راسخ نے "زبانِ دہلی" نامی رسالہ جاری کیا اُسکے مشاعروں کا اہتمام انہیں کے متعلق رہا چنانچہ اُستاد کے قابل ترین تلامذہ میں سمجھے جاتے ہیں، زبان، بندش، مضمون، سب باتوں کا خیال رکھتے ہیں، رسالہ "کمال" جو تین برس تک دہلی سے شائع ہوتا رہا اُس رسالہ کے آپ ہی اڈیٹر تھے کنور بہاری کرشن صاحب فروغ کے مکان پر برسوں مشاعرہ انکے اہتمام سے ہوتا رہا، بڑے محنتی، جفاکش، خلیق، بامروت انسان ہیں، بیرونجات کے شعرا جو دہلی آتے ہیں وہ انکے خلق کے اکثر مداح پائے گئے، اب کچھ عرصہ سے ظروف کی تجارت کا مشغلہ ہے، اور کارخانہ نیلام بھی جاری کر دیا ہے، دس بارہ شاگرد بھی کر لیئے ہیں، منشی قصیر، شیدا، فروغ کے ہم مشق و ہم صحبت ہیں

کچھ نہیں اور یہاں جلوۂ وحدت کے سوا
کیا نظر آئے نگاہوں کو حقیقت کے سوا

نور آنکھوں میں رہا تیرا تصور دل میں
ہمنے جلوت میں بھی دیکھا تجھے خلوت کے سوا

ہم حسیں چاہیں جہاں میں تو بہت ای زاہد
تجکو حوریں نہ ملینگی کہیں جنت کے سوا

درد و غم، رنج و الم، حسرت و یاس و حرمان
اور الفت میں دھرا کیا ہی مصیبت کے سوا

کچھ عجب نیند کے ماتے ہیں یہ سونیوالے
ایسے سوئے ہیں نہ اُٹھینگے قیامت کے سوا

پی کے کھل جاتے ہیں اسرارِ نہانی رونق
اور کیا شغل ہو جامِ مئے وحدت کے سوا

بند نقاب توڑ گئی شوخیٔ نظر
جو پردۂ حجاب تھا حائل نہیں رہا

مری تردامنی کا حشر میں ڈھک جائیگا پردہ
جو آیا جوش پر دریا کہیں اشکِ ندامت کا

جبینِ نازِ قاتل میں نشاں ہیں میری ہستی کے
بنی ہے چینِ پیشانی نوشتۂ خطِ قسمت کا

بوسہ لیکر جب کہا میں نے کہ یہ کیا ہو گیا
ہنس کے فرمانے لگے تیرا کلیجا ہو گیا

دل چاہتا نہ تھا کہ محبت کسی سے ہو
میں کیا کروں مجھے ترا انداز بھا گیا

دیوانے تیری زلف کے پھرتے ہیں کو بکو
وحشت اگر یہی ہے تو اب شہر بن ہوا

تم نے گھونگٹ منہ سے جب سرکا دیا
آفتابِ حشر کو شرما دیا

جام کے بدلے دکھائی مجھکو آنکھ
واہ اچھا یار نے چھینٹا دیا

آپ کیوں رونق سے برہم ہو گئے
کچھ خطا تقصیر! اُسنے کیا کیا؟

جہاں میں بت نہیں ملتے خدا نہیں ملتا
نگاہ ڈھونڈنے والی ہو کیا نہیں ملتا

اُسکے غم میں ہو گئیں آنکھیں سفید
جسنے ان آنکھوں میں گھر پیدا کیا

ٹھوکروں سے یار کی یہ خاک نے پایا عروج
تھا زمیں پر پہلے گھر آسماں پر ہو گیا

سرور رنگ مے بنکر لہو آنکھوں میں چھایا ہے
تماشا ہو گیا ساغر میں بھرنا چار چلو کا

شوقِ نظارہ نے چھپنے نہ دیا پردہ میں
دل میں رہ کر بھی نگاہوں سے وہ پنہاں نہ ہوا

کسی کا نقشِ قدم بن گئی مری ہستی
مٹا مٹا سا نشانِ سرِ مزار رہا

کسی کے دیدۂ میگوں نے وہ پلائی مجھے
کہ حشر تک مری آنکھوں میں اک خمار رہا

جل گیا آہِ شرربار سے بلبل کی چمن
ہر طرف گل کی جگہ ڈھیر ہے انگاروں کا

روز پیتے ہیں روز توبہ ہے
کوئی رونق سا پارسا نہ ملا

اُکھڑے نہ راہِ شوق میں پائے طلب کبھی
ثابت قدم میں کب سرِ منزل نہیں رہا

فانوسِ دل میں جب سے نہاں ہے وہ شمع حسن
پروانۂ نظر سرِ محفل نہیں رہا

جسنے مٹا دیا ہے وہ تھی آرزوئے یار
رونق مجھے کچھ اب گلۂ دل نہیں رہا

رکھنا ذرا تصورِ مژگاں سنبھل کے پاؤں
ٹوٹے کہیں نہ آبلہ پائے خیال کا

یوں وہ ٹھکرا رہے ہیں نعش مری
مرنیوالے میں جان ہے گویا

وصال میں بھی رہی شکلِ یاس پیشِ نظر
ہماری صبحِ تمنا میں رنگِ شام رہا

مزہ ہے جب کہ نشانہ پہ اک نیا دل ہو
نگاہِ ناز کا ہر وقت یہ پیام رہا

پڑھائی شیخ نے ممبر پہ بیٹھکر واعظ
امام محفلِ رنداں میں بھی امام رہا

غریقِ اشکِ ندامت ہوں اسقدر رونق
کہ ڈوبی رہتی ہے فردِ حساب در تۂ آب

تیغِ قاتل نے کھلا رکھا ہے دلمیں اک چمن
خندۂ زخمِ جگر ہے خندۂ گل کا جواب

یوں نہ باہر جائیے بگڑے ہوئے تیور سے آپ
لوگ طعنے دینگے آئے ہیں کسی کے گھر سے آپ

اُف رے آسودگیٔ دشت کہ بھولا ہوں چمن
ایک مدت ہوئی دیکھی نہیں گھر کی صورت

سیکھے تم سے کوئی آنکھ چرانے کی ادا
ٹھیکری رکھتے ہیں اس طرح بشر آنکھوں پہ

وہ تو رونق سے بگڑتے رہے ناحق ناحق
اور وہ ناز اٹھاتا رہا سر آنکھوں پہ

ایمان آپ کا جو مکر جائیں لیکے آپ
ہمنے تو دل دیا ہے فقط اعتبار پر

مرتے ہیں تابشِ دُرِ دندانِ یار پر
چادر ہو موتیوں کی ہمارے مزار پر

نرالی آن نکلے جس میں تُو وہ شان پیدا کر
ادائیں شوخیاں ہوں، شوخیوں میں جان پیدا کر

ہیں گلشنِ جہاں میں کہیں ہوں کہیں نہیں
دھوکا سا بوئے گل کا ہے مجھ ناتواں پہ

دل لگائے کوئی کیا گل سے چمن میں رہکر
بیوطن ہونا ہے اک روز وطن میں رہکر

صورتِ نکہتِ گل ہے یہ جہاں کی ہستی
رنگ سب دیکھ لیئے ہمنے چمن میں رہکر

چشمِ بلبل میں کھٹکنے کو ملا پہلوئے گل
آبرو پائی یہ کانٹوں نے چمن میں رہکر

بادِ صرصر کا ہوا ڈر نہ کبھی خوفِ خزاں
اپنی اک حال سے گذری ہی چمن میں رہکر

تھا وہ اک رنگِ طلسماتِ جہانِ فانی
جو کرشمہ نظر آیا ہے چمن میں رہکر

کبھی مژگاں پہ نظر ہے کبھی رخساروں پر
کبھی کانٹوں پہ رہے ہم کبھی انگاروں پر

مٹا ہی جاتا ہے دل ابروئے ستمگر پر
دیئے ہی دیتا ہے کمبخت جان خنجر پر

ہیں صورتِ عنقا جو دلِ زار کے انداز
پھرتے ہیں نظر میں کمرِ یار کے انداز

کس شوق سے لیتی ہیں تعیں موں نگاہیں
دیکھے تو کوئی چشم خریدار کے انداز

اُنکی نگاہ پھرتے ہی ہم ذبح ہو گئے
لو آج ذبح ہو گئے اُلٹی چھری سے ہم

چُپ ہیں سوالِ وصل پہ گویا زباں نہیں
بُت بن گئے عجب آپ تو پتھر سے کیا ہیں

کہیں کیا کس مصیبت سے بسر اوقات کرتے ہیں
کہ روتے رات کٹتی ہے تڑپتے دن گذرتے ہیں

رونقِ بہارِ باغ جوانی گذر گئی
تم جس ہوا کو ڈھونڈتے ہو وہ ہوا نہیں

ہر نہیں کے ساتھ ہاں ہے اور ہر ہاں میں نہیں
تم کو بھی اُسنواری تیرے پیماں میں نہیں

محبت کا طوق اسکو کہتے ہیں رونق
کہ باہیں گلے میں وہ ڈالے ہوئے ہیں

شوخی سے اُڑے پھرتے ہیں اللہ رے چھل بل
دم بھر میں یہاں ہیں ابھی دم بھر میں نہیں ہیں

دلِ نگہ کو جان دیدی آپ کو
دو ہی باتیں تھیں مرے امکان میں

قیامت کی بھری ہے کج ادائی چشمِ پُرفن میں
مری تقدیر کا بل آ گیا ہے اُنکی چتون میں

مزہ ہے موت آئی ہے خیالِ روئے روشن میں
عجب کیا تا قیامت نور برسے میرے مدفن میں

سمٹ کر رنگ لائیگی مری کاہیدگی اکدن
سما جاؤں نگاہ تِل بنکر نگاہِ سامری فن میں

ذرا اے شورِ محشر کچھ تو ہاں پاسِ مروت بھی
تھکے ہارے مسافر چین سے سوتے ہیں مدفن میں

دیکھکر ناز و ادا جی سے گذر جاتے ہیں
مرنیوالے تری ہر آن پہ مر جاتے ہیں

اِس تلوّن کا بھی کیا ٹھیک ہے اللہ اللہ
منہ سے اقرار نگاہوں سے مکر جاتے ہیں

فلک کے پاس بھی رخ کا ترے جواب نہیں
اِس آفتاب کا ثانی وہ آفتاب نہیں

کہا تھا خواب میں کس بیوفا نے آنیکو
کہ چشمِ خواب میں بھی دیکھنے کو خواب نہیں

اُٹھ گئیں آنکھیں جدھر لاکھوں کلیجے چھد گئے
سیدھی نظریں بھی تمھاری نوکِ پیکاں ہو گئیں

بھویں تنتی ہیں جب وہ چین جبیں ہو کر نکلتے ہیں
ادھر کھنچتی ہیں تلواریں اُدھر خنجر نکلتے ہیں

کسکو دل بیخودی ہیں دے بیٹھے
ہائے یہ بھی نہیں خیال ہمیں

دیکھ کر اُنکو پھر غشی چھائی
بیخودی لے چلے سنبھال ہمیں

کسی کی صورت جما گئی نقشہ
خواب بھی ہو گیا خیال ہمیں

ایسا بھی کیا ہے ابھی کئے ہو جانا ٹھہرو
اور دو چار گھڑی دل کو بہل جانے دو

بنا دیتے ہیں خورشید قیامت ذرہ ذرہ کو
اٹھا دیتے ہیں جسدم وہ نقاب روئے روشن کو

چھری، برچھی، کٹاری، تیغ و خنجر، جانتا ہوں میں
نگہ کو، ناز کو، انداز کو، شوخی کو، چتون کو

مجھے بھی کیا کوئی وہ فتنۂ خوابیدہ سمجھے ہیں
لگا جاتے ہیں ٹھوکر چلتے چلتے میرے مدفن کو

مزا پینے پلانے کا جب آئے ہمکو گلشن میں
ہوا ہو، ابر ہو، برسات ہو، ساقی ہو، صہبا ہو

رونق کے نام سے تو نہ سمجھا مجھے وہ شوخ
شرما کے پھر کہا اجی تم پیارے لال ہو

یہ اتصال حسن تقاضائے شوق ہے
ڈھونڈھے جسے نگاہ وہ دل میں ضرور ہو

مزہ فریاد کا جب ہے خدا ہی سننے والا ہو
نہ ہو محشر میں اپنا کوئی تیری ساری دنیا ہو

جو بحر غم میں آجائے تصور اسکی مژگاں کا
غنیمت ڈوبنے والیکو تنکے کا سہارا ہو

کٹیں ہر ہر قدم غیرت سے عاشق کوئے دشمن میں
جواب خنجر براں ترا نقش کف پا ہو

وہاں غش ایک موسیٰ تھے یہاں بیہوش لاکھوں ہیں
وہ برق طور سینا تھی، یہ ہے تنویر میخانہ

گلے سے جب اترتی ہے جگر تک کاٹ کرتی ہے
یہ ہے موج مئے سرجوش یا شمشیر میخانہ

جو گھر سے بن سنور کر وہ بت کافر ادا نکلے
اڑا دے ہوش عالم کے پری بنکر قضا نکلے

ملکر لبوں سے نکلے جو دو حرف پیار کے
بوسے مری زباں نے لئے نطق یار کے

لایا شباب رنگ وہ آئے نکھار کے
گل باغ آرزو میں کھلے ہیں بہار کے

شعلے زمین پر ہیں تڑپ آسمان پر
نالوں میں میرے رنگ ہیں برق و شرار کے

ٹھکرا کے تم نے خاک کا رتبہ بڑھا دیا
گردوں پہ اب دماغ ہیں مشت غبار کے

جب اٹھے وہ صورت محشر اٹھے
جب چلے تیغ قضا بن کر چلے

چھوتے ہو زلف یار کو رونق
کام کرتے ہو مار کھانے کے

لگئے ہیں واہ وا کس لطف سے ٹکڑے مرے دل کے
دہان زخم سے ہیں چوم لونگا ہاتھ قاتل کے

جس قیامت کا زمانہ میں ہے شہرہ ہر سو
آگ سی شوق شہادت نے لگا رکھی ہے
غمزہ و ناز و ادا، عشوہ، کرشمہ، شوخی
دم ہے یہاں لبوں پہ یاں وا ہے چشم شوق
ہم جن کو جان دے چکے ہم جن پہ مٹ گئے

ٹھوکروں میں تری ہر وقت پڑی رہتی ہے
آب خنجر سے مری پیاس بجھا دے کوئی
سب نے وہ چھکے چھڑائے ہیں کہ جی جانتا ہے
تیر ادھر، قضا کا ادھر انتظار ہے
اللہ رے نصیب انھیں ہم سے عار ہے

وہ اٹھا ابر چلو بادہ کشو مینا لے
وہ برستی ہوئی اللہ کی رحمت آئی

امید وفا جن سے تھی رونق وہ ہیں مگر
وہ آنسو بھی آئے نہ جنازے پہ بہانے

جذبۂ شوق شہادت کے الٰہی قربان
تیغ قاتل سے رگ جاں کو ملا رکھا ہے

کیا تلوّن ہے خوشامد سے بگڑ جاتا ہے
غدر کا نام بھی ظالم نے خطا رکھا ہے

ساغر میں کس کے عکس رخ بے حجاب ہے
پیدا اک آفتاب میں اور آفتاب ہے

شوخی میں ناز، ناز میں کچھ کچھ حجاب ہے
واللہ یہ ادا بھی تری انتخاب ہے

پامال کر کے کہتے ہیں رونق وہ نعش کو
یوں دل لگانیوالوں کی مٹی خراب ہے

نہ دل ہی عشق میں بس کا نہ قابو کا جگر میرے
کیسے نالوں سے رکوں الٰہی سخت مشکل ہے

تیرہ بختی کو مری اور بڑھانے آئے
بال کھولے ہوئے تربت کے سرہانے آئے

وہ جتنا مجھ سے کھنچتے ہیں میں اتنا انسے ملتا ہوں
بلا کی ہے کشش ان میں غضب کی مجھ میں الفت ہے

ساقی کی چشم مست کہیں کام کر گئی
اس نازکی پہ قتل کی دھمکی خدا کی شان
جو آج نجم کی ہے کل وہ گھڑی نہیں رہتی

بوئے شراب ناب جو خون جگر میں ہے
دیکھے ہوئے ہیں ہم جو تمھاری کمر میں ہے
ہمیشہ یار کسی کی اڑی نہیں رہتی

کسی کے حسن میں ہے راز الفت اپنا پوشیدہ
دکھاتا ہے ہمیشہ سرکشوں کو آسماں نیچا
رہے جو حشر تک دل میں وہ حسرت ہے مری حسرت

حجاب روئے روشن پردۂ چشم تمنا ہے
حبابوں کے لیئے زنجیر پا ہر موج دریا ہے
نہ نکلے جو کبھی مر کر تمنا وہ تمنا ہے

نکہ بربادیوں ظالم مرے نخل تمنا کو
کہ میں نے تو تو زخم جگر سے اسکو سینچا ہے

تقدیر کا گلہ نہ شکایت قضا کی ہے
مارا ہمیں بتوں نے دوہائی خدا کی ہے

بن گئی کیا غازۂ رخسار حیرانی مری
اُنکی صورت سے برستی ہے پریشانی مری

خاک ڈالی نہ گئی، نعش اُٹھائی نہ گئی
میری مٹی بھی ٹھکانے سے لگائی نہ گئی

کیا کدورت تھی پس مرگ نکالی نہ گئی
خاک بھی اُسنے مری قبر پہ ڈالی نہ گئی

دیکھ لی محشر خرامی آپ کی
آ گئی صاحب قیامت آ گئی

رؤف بابو رؤف الدین باشندۂ ناگپور صوبۂ متوسط وکیل درجۂ اول ریاست بھوپال تھے۔ کبھی کبھی فکر سخن کا بھی اتفاق ہوجاتا ہے، یہ چند شعر آپکے طبعزاد ہیں۔

رؤف

جورات کو کوئی رشک قمر نظر آیا
گماں ہوا کہ زمیں پر قمر اُتر آیا

رؤف ہوگئے ابکے تو آپ سے باہر
جنوں کا زور انھیں اتنا پار سال نہ تھا

رہنے کو مل گئی ہے جگہ کوئے یار میں
پھر کیوں نہ ہو دماغ مرا آسمان پر

کچھ دن تو یہیں رہیں جو تمھاری رکھائیاں
اک روز کھیل جائینگے ہم اپنی جان پر

سرمہ نہیں لگایا ہے آنکھوں میں وقت قتل
تلوار کو چڑھایا ہے قاتل نے سان پر

رئیس - نواب محمد عمر علیخاں بہادر رئیس مخاطب بہ فیروز جنگ والئ ریاست باسودہ صوبۂ مالوہ کے قریب بطریق سیر شمالی ہندوستان کے اکثر شہروں کی سیر کی اور ہر مقام کے نامور اور باکمال لوگوں سے ملاقی ہوئے، سفر نامہ بھی لکھکر شائع کیا تھا۔ اپنے وقت کے روشن خیال، تجربہ کار، ذی استعداد اور باکمال رئیس سمجھے جاتے تھے۔ ۵۲-۵۰ برس کی عمر پائی، موزونی طبع کبھی شعر و سخن کی بھی محرک ہوجاتی تھی، چھ سات غزلیں نظر سے گذریں اُنکا انتخاب درج ذیل ہے

رئیس

کثرت گل یہ ہوئی اللہ رے شان بہار
بن گئی ساری زمیں گویا گلستان بہار

لگ رہے ہیں جسطرف دیکھو اُدھر پھولوں کے ڈھیر
گلفشاں ہے اندنوں شاید کہ دامان بہار

باغ ہو، مینا ہو، مے ہو، ساقی گلفام ہو
اور کیا ہیں بس یہی دو چار سامان بہار

دیر کیا ہے کشتئ بادہ ہو ساقی ناخدا — موج زن ہے ہر طرف سے آج طوفانِ بہار
غنچۂ دل کو کیا فصلِ خزاں نے پائمال — رہگیا بس ڈل ہی دلمیں آج ارمانِ بہار
جو دکھاتا ہے وہ سب کچھ دیکھتے ہیں نیک و بد — اب خزاں کا رنج ہے دل میں نہ ارمانِ بہار
نہ جب بس چل سکا تو مر مٹے ہم — رسائی تھی رئیس اپنی یہیں تک
سوزش ہی ہے لیکن شرارے نہیں عیاں — جلتا ہوں سوزِ عشق سے لیکن دھواں نہیں
عمر آخر ہوئی افسوس نہ پھولا پھلا — نخلِ اُمید کا لائیگا ثمر کون سے دن
اُٹھکے دل ہی میں سے دھودو میرے جانب سے غبار — کام آؤ گے تم اے دیدۂ تر کون سے دن
خاک کب میری کو بہ کو نہ گئی — مٹ گئے اُسکی جستجو نہ گئی
چھٹ گئے سارے مونس و ہمدم — آفریں بیکسی کہ تو نہ گئی

رئیس

رئیس مرزا خادم حسین صاحب رئیس اکبر آبادی کے شاگرد رشید سید سخاوت علی شوخ اکبر آبادی نے جو حالات ارسال کیئے اُنکا خلاصہ یہ ہے کہ آپکے آبا و اجداد صاحب جاگیر و مناصب تھے آپ کو بھی خاصی جائداد ترکہ میں ملی تھی لیکن اُس کا کثیر حصّہ تلف ہوگیا تاہم سرکار انگلشیہ کے دربار میں کرسی عطا ہوتی ہے، مرزا صاحب موصوف کو فنِ شعر میں کماحقہ دخل ہے۔ باوجود اسقدر باکمال ہونے کے مرزا صاحب نے زانوے تلمذ کسی اُستاد کے سامنے نہیں جھکایا جو کچھ استعداد ہے خداداد ہے، ہرچند زبانِ عربی و فارسی میں کامل مہارت حاصل ہے لیکن اشعارِ اُردو نہایت صاف اور عام فہم کہتے ہیں، اِس وقت تک مرزا صاحب کے شاگردوں کا نمبر دو سو تک پہنچ چکا ہے جس میں اکثر اچھا کہنے والوں میں ہیں، شوخی اور بذلہ سنجی کے ساتھ ساتھ پختہ کلامی آپکے کلام سے ظاہر ہے، موجودہ مذاق کی اچھی تقلید کرتے ہیں۔ اُنکی اکثر غزلیں آگرہ میں زبان زدِ خاص و عام ہیں عمر اب ساٹھ سال کے قریب ہے، نازک خیالی اور مضمون پیدا کرنے کی بہ نسبت زبان کی صفائی محاورہ کی پابندی اور مضمون کی شوخی کی طرف توجہ زیادہ ہے، دو تین دیوان آپکے مرتب ہو چکے ہیں مگر چھپنے کی نوبت نہیں آئی —

کلام کا انتخاب ہدیۂ ناظرین ہے ؎

سمجھے ہوئے تھے ہم جسے مسکن حضور کا
دل سے بہت قریب تھا آنکھوں سے دور تھا

لکھے تھے ہم نے وصفِ رخِ یار یک قلم
روشن تمام کوچۂ بین السطور تھا

رحم تجھ کو نہ کبھی او ستم ایجاد آیا
اور آیا بھی تو اک ظلم نیا یاد آیا

کیا مزا حشر میں ہو داورِ محشر کے حضور
میں ہوں اور تو ہو مرا ہاتھ گریباں تیرا

بیمارِ محبت کو سنبھلتے نہیں دیکھا
آئی کو کسی کی کبھی ٹلتے نہیں دیکھا

تصویر میں اترا نہ فروغِ رخِ روشن
سانچے میں کبھی دھوپ کو ڈھلتے نہیں دیکھا

ہم خاک نشینوں سے ہے اس درجہ کدورت
مٹی کا انھیں عطر بھی ملتے نہیں دیکھا

جس طرح نکل جاتی ہیں آہیں شبِ فرقت
یوں وصل میں ارماں کو نکلتے نہیں دیکھا

ظالم کو بھی ہوتا ہے کسی شے کا سہارا
ہتیار کو بے ہاتھ کے چلتے نہیں دیکھا

ہم کہتے ہیں روکو نگہِ شوخ کو روکو!
تم نے دلِ مضطر کو مچلتے نہیں دیکھا

مے پینے سے شوخ اور ہوا رنگ سنہرا
اس سونے کو تیزاب میں گلتے نہیں دیکھا

نہیں شریک خدا کا جو کبریائی میں
ترا جواب بھی اے بت نہیں خدائی میں

وہ گل جو اوڑھ کے سویا تھا وصل میں اک دن
وہ بھینی بو رہی برسوں بسی دولائی میں

برنگِ آئینہ منہ پر کچھ اور پشت پہ اور
تمھیں بتاؤ صفائی ہے یہ صفائی میں

شراب وصل میں کافی ہے رات بھر کے لیے
پیالہ زہر کا رکھا ہے اک سحر کے لیے

اٹھا کسی کا نہ احساں دماغِ نازک سے
زباں پہ بھی نہ آئی دعا اثر کے لیے

اس نے باندھی جو کمر میرے ستانے کے لیے
آسماں ساتھ ہوا ہاتھ بٹانے کے لیے

چشمِ پرنم میں نظر آتی ہے تیری تصویر
یا پری اتری ہے دریا میں نہانے کے لیے

لطف ہے بادہ کشی کا رمضاں میں زاہد
اک مہینہ ہے یہی پینے پلانے کے لیے

وہ ستم کرتے ہیں دل دادِ ستم دیتا ہے
ہاں میں ہاں اور یہ آیا ہے ملانے کے لیے

خاکساری نکی رہی دیدۂ مردم میں جگہ
پسکے سرمہ ہوئے آنکھوں میں سمانیکے لیئے

ہو پڑا لو ملک الموت سے جھگڑا آخر
نزع میں کسنے کہا تھا ہمیں آنیکے لیئے

کوسنے کھائے، دو ہتڑ پٹے، لاتیں کھائیں
ہاتھ رکھا تھا کہیں پاؤں دبانیکے لیئے

کبھی پی لیتے ہیں منت سے کسی کی زاہد
مینہ برستے میں لگی دل کی بجھانیکے لیئے

رد نہ کر دعوتِ مے پیرِ مغاں کی زاہد
اب خدا آئیگا کیا تجکو پلانیکے لیئے

غمزۂ بیجا نہ اٹھائینگے کہ ہم بھی ہیں رئیس
ڈھونڈ لو اور کوئی ناز اٹھانیکے لیئے

ظلم پر ظلم حضور آپ تو کرتے ہی رہے
جاں نثار آپکے دم آپکا بھرتے ہی رہے

آرزو آئی، کبھی دل میں تمنا آئی
روز مہماں نئے اِس گھر میں اترتے ہی رہے

آج یہ دکھ ہوا، کل دوسرا آزار ہوا
جب سے ہم آپ پہ مرنے لگے مرتے ہی رہے

ناتوانی نے نگاہوں پہ بھی چڑھنے نہ دیا
ہم سے لاغر تری نظروں سے اترتے ہی رہے

بحرِ عالم میں ہے ہستی بشر شکلِ حباب
ہم فنا ہونیکو دنیا میں ابھرتے ہی رہے

وہ بھی لاکر مری تربت پہ چڑھائے نہ کبھی
ہار باسی تری چوٹی کے اترتے ہی رہے

حسرتِ دید میں یہاں مر گئے آخر مشتاق
آپ بیٹھے ہوئے واں گھر میں نکھرتے ہی رہے

مجلسِ وعظ میں میں پی گیا بوتل غٹ غٹ
لوگ ہاں ہاں بہت ہر سمت سے کرتے ہی رہے

سبزہ رنگوں کی نگاہونکا جو کشتہ ہوں رئیس
سبزۂ تربت کا ہرن دشت کے چرتے ہی رہے

رہا

رہا۔ غلام محمد خاں رہا اکبر آبادی شاگرد اسیر پسر نظیر، بزرگ اِنکے ریاست بھرتپور میں فوجی عہدوں پر مامور تھے اور یہ خود بھی اسی ریاست میں ملازم تھے، غدر کے قریب قریب زمانہ میں انتقال کیا، یہ فکر سخن کا نمونہ ہے۔

کہنا ترا ہماری سر آنکھوں پہ ناصحا
پر کیا کریں جو دل ہی نہو اختیار میں

کی آخر کو رو رو جگہ اُسکے دل میں
رہا ہم تری چشم تر پر فدا ہیں

اُسے غیر کی بزم سے کھینچ لایا
ہم آہِ جگر کے اثر پر فدا ہیں

بو آج کسکی زلفِ معنبر کی لے اڑی پیچاں جو ٹوٹ کر مرے سینے میں رہ گیا	یہ بوئے عطر بیز جو باد سحر میں ہے کہنے لگے کہ مفت گیا تیر ہاتھ سے

رہا

رہا میر رضی رہا۔ ولد میر عباس عرف میر مغل فیض آباد کے اصلی باشندے اور کانپور میں ۱۸۶۶ء کے قریب رہتے تھے۔ حضرت ناسخ کے شاگرد رشید جناب رشک کے تلامذہ میں سے تھے، ناز بخیال اور مشاق کہنے والے تھے۔

آشنا خواب سے ہوتی نہیں اصلا آنکھیں	دیدۂ روزنِ دیوار ہیں گو یا آنکھیں
دیدۂ آبلہ و دیدۂ داغ سودا	میرے اللہ نے دی ہیں مجھے کیا کیا آنکھیں
بولتی مجھسے نہیں باتیں اشارو میں ہیں	لب جو خاموش ہوئے ہوگئیں گویا آنکھیں
فرقتِ گل میں غم کھائے کہیں افیون مُلبل	چار سو رکھتا ہے اسواسطے لالا آنکھیں
شکل طاؤس مرے تن پہ ہیں داغ حسرت	دید کو تیری بنا ہوں میں سراپا آنکھیں
ہے تصور میں جو اک پردہ نشیں کی آمد	روشنی دور ہوئی کرتی ہیں پرنا آنکھیں
آنکھیں موسیٰ کی کہاں پاؤں جو دیکھوں اسکو	شجرِ طور ہے قامت ید بیضا آنکھیں
آرزو ہے کہ رہا وادیٔ ایمن دیکھے	عاریت اسکو عنایت کرو موسیٰ آنکھیں

رہائی

رہائی۔ ڈاکٹر شیخ عبداللہ خلف شیخ فقیر محمد متوطن رانگو پور پرگنہ عظیم آباد پٹنہ، انگریزی تعلیم پاکر غدر سے پیشتر ڈاکٹری کا امتحان پاس کرکے سرکاری ملازمت اختیار کی تھی۔ شاعری کا بھی شوق تھا۔ چند شعر نتایج طبع سے درج ہوئے۔ عبداللہ خاں مہر لکھنوی سے اس فن میں استفادہ کیا تھا۔

تیری گلی پکڑتی ہے مجھ خستہ تن کے پاؤں	جنبش ہی جانتے نہیں دیوار بن کے پاؤں
باہر ہے چشم شوخ سے دنبالۂ دراز	کچھ حد سے بڑھ چلے ہیں غزالِ ختن کے پاؤں
مجھ پا شکستہ کے لیئے کیا احتیاج قید	قابل نہ بیڑیوں کے نہ لائق رسن کے پاؤں
باغ جہاں میں کاش میں ہوتا حنا کا رنگ	لیتا کنارِ شوق میں اُس گلبدن کے پاؤں

رکھتے نہیں مزار پہ مارے جلن کے پاؤں	باقی ہیں آج تک وہی شعلہ مزاجیاں

رہبر

رہبر۔ نواب مصطفیٰ علی خان رہبر خلف و شاگرد نواب ہادی حسن خان بریلوی از خاندان حافظ الملک بہادر خاندانی وظیفہ سرکار انگلشیہ سے پاتے ہیں ۵۸ سال کی عمر ہے، عنفوان شباب میں اکثر شعر گوئی کا چرچا رہتا تھا اب بہت کم کہتے ہیں۔

زور آیا نہ کبھی کام نہ کچھ زر آیا	خاکساری نے مری رام کیا اس بت کو

گھر ہمارے بھی کسی روز کرم فرماؤ	منتیں تیری ہم اے رشک قمر کرتے ہیں
دیر ہو جاتی ہے آنے میں جو عذر سے کہیں	وہم کیا کیا دل رہبر میں گذر کرتے ہیں
وہ پریشاں خواب ہے وابستگان زلف کا	جسکی مشکل سے بیاں یوسف سے کچھ تعبیر ہو
زور کا بل ہے نہ زر کا زور مجھ نا کام کو	پھر ترے ملنے کی اے خود کام کیا تدبیر ہو
کام جادو سے نکلتا ہے نہ کچھ تعویذ سے	کس عمل سے یا الٰہی وہ پری تسخیر ہو
وہ تو اے رہبر خوش و خرم ہے بزم غیر میں	تم عبث مغموم ہو بے فائدہ دلگیر ہو

رہبر

رہبر۔ منشی محمد مہدی رہبر۔ آپ کو حضرت داغ سے تلمذ رہا ہے، کئی برس ہوئے آپ بھوپال میں تھے اسکے بعد کچھ حال معلوم نہ ہوا۔

یارب یہ برق ہے کہ دل بیقرار ہے	یہ مہر جلوہ گر ہے کہ چہرہ ہے یار کا
پھر کسپہ مشق جور و جفا کی کروگے تم	دیکھو نشاں مٹاؤ نہ مرے مزار کا
میں تو کبھی نہ بوسۂ رخسار مانگتا	سارا قصور تھا یہ دل بے قرار کا

ریاست

ریاست شیخ ریاست علی صاحب ریاست لکھنوی شاگرد جناب مرحمت الدولہ بہادر الملک سید غضنفر علیخان بہادر صولت جنگ المتخلص بہ حکیم، انکے والد میر ہادی علی بیخود خواجہ وزیر کے نامی شاگردوں میں تھے، یہ خود انقلاب سلطنت اودھ کے زمانہ کی پیدایش ہیں، چند شعر نتائج افکار سے درج کیے جاتے ہیں۔

توقع تو ہو غیروں ہی کو دیکھے مہرباں ہوکر	نہیں کہتا نظر مجھ پر کرے وہ شادماں ہوکر

عدم سے جانب ہستی بڑی سختی سے آیا ہوں — شرار سنگ ہوں مٹجاؤں گا دم میں عیاں ہوکر
دمِ محشر چھپینگے اپنے عصیاں کیا چھپانے سے — کہینگے موئے تن سب حال اپنا اک زباں ہوکر
نہیں چھُریوں سے کچھ کم تیر باتیں اس ستمگر کی — نہ اچھے ہونگے اپنے زخم دل زخم لساں ہوکر
بوقت سجدہ زینت دینگے محبوبوں کے چہروں کو — بنینگے ہم عبیر اُس بت کی خاکِ آستاں ہوکر
چلیگا اک قدم جس روز وہ مہر و نعلی سے — زمیں بھی دُون کی لینے لگے گی آسماں ہوکر

ریاض

ریاض۔ شاعرِ معجز نگار سخنور جادو طراز استاد مسلّم الثبوت منشی سید ریاض احمد صاحب ریاض خیر آبادی فخر تلامذہ و سرمایۂ نازش حضرت منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی، آپکے والد منشی سید طفیل احمد صاحب بڑے عالم اور خیر آباد کے مؤقر لوگوں میں تھے منشی ریاض کی ابتدائی تعلیم خیر آباد کے مدرسۂ عربیہ میں ہوئی، مگر ابھی فارغ التحصیل نہیں ہوئے تھے کہ شاعری کا چسکا پڑ گیا۔ اُس زمانہ میں منشی تدبیر الدولہ اسیر کا بڑا شہرہ تھا، آپنے اُن سے تلمذ اختیار کیا اور اُنکی خدمت میں حاضر ہونے کو لکھنؤ گئے، اسکے چند ہی روز بعد خیر آباد سے اُردو شعر و سخن کا ایک رسالہ "گلکدۂ ریاض" نامی جاری کیا۔ جسنے حضرت اسیر و امیر کی قدر افزائی کی بدولت بہت شہرت حاصل کی تھوڑے عرصہ بعد ۱۲۹۶؁ھ میں خیر آباد سے ریاض الاخبار نکالا۔ لیکن چونکہ ہمیشہ سے لکھنو کی صحبت پسند تھی دفتر یہاں اُٹھا لائے، مگر کئی برس بعد اخراجات نہ چلنے کے باعث اخبار گورکھپور منتقل کرنا پڑا، گورکھپور میں حکّام اور رؤسا نے انکی اچھی مدارات کی اور ریاض الاخبار پندرہ سولہ برس تک نہایت کامیابی سے جاری رہا اور حضرت ریاض کو اُنکی شوخیٔ طبع اور خداداد ذہانت کی خوب داد ملی، اِس عرصہ میں حضرت ریاض نے سرکاری ملازمت کرلی، سپرنٹنڈنٹ پولیس گورکھپور کے سر رشتہ دار ہو گئے انھیں ایام میں نواب کلب علیخاں مرحوم نے انکی تیزی طبع اور خوش فکری کی شہرت سنکر انھیں رامپور طلب کیا اور خلعتِ خاص اور انعام سے سرفراز فرمایا، مگر ریاض نے کچھ زیادہ عرصہ وہاں قیام نہ کیا۔ اخبار کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹا سا ضمیمہ "فتنہ" و "عطرِ فتنہ" کے نام سے

انھیں ایام میں نکلنے لگا جس میں چلبلے مضامین اور چوٹی کے اشعار درج کیئے جاتے تھے۔ منشی ریاض خلیق ملنسار، زندہ دل شخص ہیں، گورکھپور میں پندرہ برس فارغ البالی سے گذار لینے کے بعد ریاض کو پھر لکھنؤ کی یاد نے گدگدایا، اور اگرچہ رہایش تبدیل کرنے اور اخبار کے دفتر اُٹھانے میں سخت خسارہ ہوا تاہم اپنے شوق کی خاطر اسے گوارا کیا۔ اور لکھنؤ چلے آئے، چنانچہ کہتے ہیں ؎

جوان ہونے کو پیری میں لکھنؤ آئے	ریاض تھی جو مقدر میں بازگشتِ شباب

اب ریاض کی عمر چھپن برس کی ہے اور دس سال سے راجہ صاحب محمود آباد کی سرکار کے دعاگو ہیں ریاض کی زباندانی مسلّم ہے، اغلاط سے کلام پاک ہوتا ہے اور ایک طرز خاص کے موجد سمجھے جاتے ہیں، آپکا ہر ایک شعر قبولِ عام کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے اور شوخی و بے چینی اسکے خاص جوہر ہیں، اِنکے اکثر اشعار ضرب الامثال کے طور پر لوگوں کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں اور انکے سننے کے وقت یہ خیال بھی نہیں گذرتا کہ انکا مصنف زندہ و سلامت موجود ہے پہلے ریاض کو مشاعروں میں شریک ہونیکا بڑا شوق تھا اب وہ جوش باقی نہیں رہا، مزاج میں لااُبالی پن اور وارفتگی جو رندانہ مزاجی کا لازمہ ہے زیادہ ہے، اِنکے اندازِ بیان کی چُستی، مضمون کی شوخی، اور بے چینی، زبان کی صفائی اور فصاحتِ روزمرّہ اس امر کو ثابت کرتی ہیں کہ مبدءٔ فیاض سے انھیں شاعری کی نعمت عطا ہوئی ہے، یہ ضرور ہے کہ سچے عشق کی تصویریں انکے ہاں کم ملتی ہیں، بلکہ اسکے برخلاف بعض بعض شعر غزل میں ایسے ہوتے ہیں کہ جنکو بداخلاقی کا محرک کہنا نازیبا نہیں اور یہ بات اصولِ شاعری کے خلاف ہے شاعر کے دماغ سے اگر ایسے مضامین اُتریں کہ جن سے روحانی جذبات کو ترقی ہو تو وہ نہایت قابلِ تحسین امر ہے، معاملہ بندی، ہنسی ٹھٹھول، جلی کٹی، واغلوں پر پھبتی، رندانہ بے تکلفی کے مضامین، جابجا انکے کلام میں بڑے دلکش پیرایہ میں ملتے ہیں، ساتھ ہی یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ تصوّف اور اخلاق کے رنگ کی بھی جھلک کہیں کہیں نظر آجاتی ہے اور اِسکے

کلام کو عامیانہ مذاق کے تتبع ہونے کے ابتذال سے کسی قدر بچا لیتی ہے، نازکخیالی کی بھی کمی نہیں، فکر رسا کی امداد سے بعض بعض شعر فی الحقیقت بڑے پایہ کے نکل جاتے ہیں۔ گو انکے تخیل کا میلان قدرتی طور پر رندانہ حسن پرستی، معاملہ اور رندانہ مذاق کا پہلو لیئے ہوئے ہے، مگر اور شعبوں میں بھی طبیعت بند نہیں اور یہ انکی قادر الکلامی اور مشاقی فن کا اعلیٰ ثبوت ہے۔ حضرت ریاض نے چند ناولوں کے اردو میں ترجمے بھی کیے ہیں، مگر وہ چیز جس سے ہمیشہ اردو کی تاریخ میں انکا نام زندہ رہیگا وہ ناول نہیں ہیں بلکہ صدہا مضامین جو ریاض الاخبار اور اودھ پنچ کی پرانی جلدوں میں بکثرت ملتے ہیں اور وہ غزلیں جنکو پسند عام کے اعتبار سے حضرت داغ کے کلام کے قریب قریب ہمپایہ ہونیکی عزت حاصل ہے۔ حضرت دلگیر کی تحریر سے یہ معلوم کرکے کہ حضرت ریاض چند سال سے مختلف مصائب اور پریشانیوں کے آماجگاہ بنے ہوئے ہیں سخت افسوس ہوا منجملہ دیگر حوادث کے انکی عمر بھر کی کمائی یعنی دیوان غیر مطبوعہ بھی جاتا رہا ہمیں افسوس ہے کہ انکے سوانح زندگی بالتفصیل باوجود کوشش بلیغ ہمیں نہ مل سکے ۔

نذر اس بت کی ہوا ایمان یہ کچھ دور نہ تھا	اپنے اللہ کے صدقے اسے منظور نہ تھا
میں پڑا تا ہوں ترا چاہنے والا اید وست	وہ بھی جلوے مری آنکھوں میں ہیں جب طور نہ تھا
شوق سے میں نے رہ عشق کے کاٹے ہیں پہاڑ	کوہکن ہو تو ہو میں تو کوئی مزدور نہ تھا
بیٹھکر کیا دل مرحوم کو روئے ہو ریاض	بگڑی بن جائے یہ اللہ کو منظور نہ تھا

نہ آیا ہمیں عشق کرنا نہ آیا	مرے عمر بھر اور مرنا نہ آیا
کئے ہونگے تنے نمکدان خالی	نمک تمکو زخموں میں بھرنا نہ آیا
سنا کر وہ کہتے ہیں کس بھولے پن سے	ہمیں وعدہ کرکے مکرنا نہ آیا
ریاض ایسی دیوانگی روز محشر	ارے چھوڑ کمبخت دامن کسیکا
سے چڑانے میں ہمیں ہے بدظنی کیسا	ہم اترا لائے سبو آج اچھوتا کیسا

جائیے جائیے ہم حشر میں سُنتے کے نہیں　　آئیے آئیے اب وعدۂ فردا کیسا

حشر کے روز اُمنڈ آئی ہے دُنیا ساری　　دیکھنا یہ ہے کہ ہوتا ہے تماشا کیسا ؟

چلمن اُٹھی کسی کمرے کی قیامت نکلی　　ہو رہا ہے سرِ بازار تماشا کیسا ؟

قرض لایا ہے کوئی بھیس بدل کر شاید　　مئے فروشوں کا ہے واعظ سے تقاضا کیسا

جب یہ ملجائیں کلیجے سے لگائے اُنکو　　اِن حسینوں سے کسی بات کا شکوا کیسا

پردے والوں سے یہ خواہش کہ اُٹھائیں پردہ　　اُٹھ گیا آنکھ سے اب لوگوں کی پردہ کیسا

تو نے چٹکی سے جو توڑے گلِ رنگیں الشوخ　　ہِل گیا دیکھ کے بلبل کا کلیجا کیسا

کعبہ سُنتے ہیں کہ گھر ہے بڑے داتا کا ریاض　　زندگی ہے تو فقیروں کا بھی پھیرا ہوگا

ناز سے اِترا کے چلنا قہر تھا　　ٹکڑے ہو کر دامنِ محشر گرا

روگ تھا، آزار تھا، اچھا ہوا جاتا رہا　　ایسے دل کا رنج کیا جاتا رہا جاتا رہا

صدقے صبحِ وصل کے شکوا مرا جاتا رہا　　اُنکا شکوہ رہ گیا میرا گلہ جاتا رہا

صبح ہوتے جب کہا میں نے کہ کچھ ہے التماس　　ہنس کے بولے وقتِ عرضِ مدعا جاتا رہا

اِس طرح بیچین دلکو ڈھونڈنے نکلے ہیں ہم　　پوچھتا ہے ہر حسیں گھبرا کے کیا جاتا رہا

شرم ہے صبحِ شبِ وصل اور بھی دُونی مگر　　شام کو جو تھا وہ اندازِ حیا جاتا رہا

میری صورت پر ترس کیوں دشمنوں کو آ گیا　　تیرے صدقے کیوں وہ اندازِ حیا جاتا رہا

دستِ شفقت اسطرح اک رند نے پھیرا ریاض　　بیٹھکر یادِ خدا میں جھومنا جاتا رہا

یہ حسن کے لیں بلائیں جو سو بار کیا ہوا　　ہے ہے بلائے جاں یہ ہوا پیار کیا ہوا

میں دستِ شوق پیار سے گردن میں ڈالدوں　　کہتے ہیں وہ گلے کا مرے ہار کیا ہوا

مجکو ادب حجاب ہمیں پھر یہ کون تھا　　آنکھوں سے جسنے شرم کا پردہ اٹھا دیا

ساغر دیا کسی نے مگر کس ادا کے ساتھ　　یہ کہکے ہمنے زہر ہی اس میں ملا دیا

شوخی سے ہر شگوفے کے ٹکڑے اڑا دیئے　　جس غنچہ پر نگاہ پڑی دل بنا دیا

کہتے ہیں کوس کوس کے وہ عندلیب کو
بدلی ہوئی رُت وقتِ سحر پی بھی لے زاہد
یہاں وہ لے دے ہوئی آکر کہ الٰہی توبہ

کمبخت کی فغاں نے مرا دل دکھا دیا
یہ وقت سہانا یہ سماں ہو نہیں سکتا
ہم سمجھتے تھے کہ محشر میں تماشا ہوگا

بھرا بیساختہ پن سے ہے عالم اُنکے جوبن کا
یہ دن ہے حشر کا ہو کر رہے گا وہ جو ہونا ہے
نہ بچ جائے جو دنیا میں جوانی کی ہوا سے

جوانی میں ابھی کچھ طور باقی ہے لڑکپن کا
ارے جھوٹے کچھ اب قول و قسم سے ہو نہیں سکتا
ہوتا ہے فرشتہ کوئی انسان نہیں ہوتا

عالمِ وحشت میں میرا گھر کوئی گھر رہ گیا
ایسی ضد ہے تو انہیں کون منائے یارب
صدقے ہونٹوں کے جنھیں نازِ مسیحائی ہو
کیا کہا پھر تو کہو بھول گئے ہم کسکو

سر جدھر ٹکرا دیا دیوار کا در رہ گیا
اِس پہ مچلے ہیں کہ کوئی مجھے کیوں یاد آیا
صدقے باتوں کے جنھیں شیوہ جلانا آیا
صدقے اُسکے جو جنھیں جھوٹے یوں یاد آیا

چھپ کے راتوں کو کہیں آپ نہ آئے نہ گئے
اب خدا جانے بہار آتی ہے اس میں کہ نہیں
ہمنے دیکھے ہیں مقاماتِ تجلی اُسکے
گئے ہیں داغ نیا دینے وہ مجکو پس مرگ
باغباں کام ہمیں کیا ہے وہ اُجڑے کہ رہے

بے سبب نام ہوا آپ کا روشن کیسا
میرے دم سے کبھی آباد تھا گلشن کیسا
طور کہتے ہیں کسے وادیٔ ایمن کیسا
آج پھیلا ہے اُجالا سرِ مدفن کیسا
جب ہمیں باغ سے نکلے تو نشیمن کیسا

[illegible] پائی اس گھر سے جو [illegible] کی بات ❀ [illegible] روزن کیسا

ہنگامِ نزع گریہ یہاں بے کسی کا تھا
مُردے کو میرے دفن اُسی خاک میں کیا
اُٹھے نہ میری گور سے پھر وہ بھی بیٹھکر
دل نے مجھے خراب کیا کوئے یار میں
مے چھین کر کسی سے جو پیتے تو تھی خطا
صحرا میں پھر رہے تھے سلیماں بنے ہوئے

تم ہنس پڑے یہ وقت بھلا کیا ہنسی کا تھا
دل میں بھرا غبار جو اُنکے کبھی کا تھا
کیا عالم آج ہائے میری بیکسی کا تھا
دشمن پہ اعتبار مجھے دوستی کا تھا
جب دام دیکے پی تو گنہ کیا کسی کا تھا
یعنی جنوں میں بھی ہمیں سایہ پری کا تھا

یہ اپنی وضع اور یہ دشنام مے فروش
سنکر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا

دنیا کی کاہشوں سے ہمیشہ رہا اداس
پر آدمی ریاضؔ عجب دل لگی کا تھا

ہوش کس کو کون روکے جام مے
ساقیا لے ہم چلے ساغر گرا

پھیرتے ہیں بہت آہستہ گلے پر خنجر
ڈر یہ ہے ٹوٹ نہ جائے کہیں خنجر میرا

دے خدا عقل تو دیوانہ بنے
کہ جنوں کام ہے دانائی کا

خم قد ہے خم مینا سوئے جام
موج مے ہاتھ ہے انگڑائی کا

جائے بھی میرے سیہ خانے سے
منہ ہو کالا شب تنہائی کا

مست مینا ہوں پیا ہے میں نے
جام امیر احمد مینائی کا

ساتھ ہے قیس سے صحرائی کا
کیا ٹھکانا ترے سودائی کا

دل پر داغ ہیں گلدستوں میں
شوق ہے انجمن آرائی کا

پہلو سے یوں کوئی سر محفل نکل گیا
معلوم یہ ہوا کہ مرا دل نکل گیا

سینے میں دیکھئے تو کوئی زخم بھی نہیں
تیر نگاہ لیکے مرا دل نکل گیا

چھن چھن کے آج شیخ نے انگور کھا لئے
اب کیا کھچیگی تاک کا حاصل نکل گیا

لائیگا رنگ حشر میں کل خون بیگناہ
دامن بچا کے آج تو قاتل نکل گیا

وہ بھی تھا بیقرار بہت اے نگاہ شوخ
تو لیگئی نکال کے یا دل نکل گیا

شاید گلوں کے دامن رنگیں میں ہو تو ہو
بن نکلے اشک خون عنادل نکل گیا

وحشت زدہ ریاضؔ نہ زنداں میں رہ سکا
لیکر وہ سب کے طوق و سلاسل نکل گیا

کچھ عجب لطف سے مل جل کے رہا ایک سے ایک
غم ترا جان مری رنج ترا دل میرا

جو کھلا پھول بنا زخم مرے دل کا ریاضؔ
جو کلی رہ گئی کھلنے سے بنی دل میرا

میرے گھر میں تبرک کے یہ ساماں نکلا
آستیں قیس کی فرہاد کا داماں نکلا

شفق شام بنی لالۂ رنگیں کا دامن
منہ تو دن کے حسینوں کا گریباں نکلا

وہ مزے وصل کے وہ مینہ کا برسنا رم جھم
اُف رے برسات کی رُت ہائے رے برسات کی رات

میں نے چھیڑا تو کس ادا سے کہا
کچھ سُنو گے مری زبان سے آج

نیچی ڈاڑھی نے آبرو رکھ لی
قرض پی آئے اک دکان سے آج

ہٹے نہ در سے ترے ٹھوکریں بھی کھا کھا کر
وہیں جمے رہے ہم سنگِ آستاں کی طرح

ہمیں ہے گھر سے تعلق اب اسقدر باقی
کبھی جو گئے تو دو دن کو میہماں کی طرح

شریکِ درد تو کیا باعثِ اذیت ہیں
وہ لوگ جن سے روابط تھے جسم و جاں کی طرح

ترا اٹھان ترقی کرے قیامت کی
ترا شباب بڑھے عمرِ جاوداں کی طرح

ریاض موت ہے اس شرط پر ہمیں منظور
زمیں ستائے نہ مرنے پر آسماں کی طرح

رہے ہم آشیاں میں بھی تو برقِ آشیاں ہو کر
لگا دی آگ اپنے گھر میں سرگرمِ فغاں ہو کر

نہ اپنے غمزدوں کو خوش کرو اب مہرباں ہو کر
بتو تم خوش رہو ہم کیا کرینگے شادماں ہو کر

چلے ہو گل بداماں کچھ تو کہتے جاؤ ان سے بھی
کہ ہنستے کہہ رہی ہیں کچھ عنادل ہمزباں ہو کر

جواں ہونے نہ پائے تھے کہ دل آیا حسینوں پر
اجل یہ کہتی آئی کیا کرو گے تم جواں ہو کر

ملایا خاک ہو کر حسرتوں کو ہم نے مٹی میں
چُھپایا کارواں کو ہم نے گردِ کارواں ہو کر

ترے کوچے میں پیسا ہے اسی نے ہم ضعیفوں کو
گرا ہے سایۂ دیوار ہم پر آسماں ہو کر

کوئی مُنہ چوم لے گا اِس نہیں پر
شکن رہ جائیگی یونہیں جبیں پر

لہو بیکس کا مقتل کی زمیں پر
نہ دامن پر نہ اُن کی آستیں پر

اُڑا لے خاک دورِ آسماں تک
پھر آخر گردشِ قسمت کہاں تک

گلہ بھی کیا کسی کا تھا کوئی راز
کہ آ کر رہ گیا میری زباں تک

وہ خوگر نالۂ دشمن کا ہو جائے
نہ سنتا ہو جو میری داستاں تک

یہ تیرہ تھی شبِ تنہائی ہجر
نہ نکلے گھر سے اپنے پاسباں تک

آ گیا ایسا ہی اب کافر زمانہ کیا کہیں
دابے پھرتے ہیں بغل میں لوگ ایماں آجکل

دن کو روزہ، عید شب کو ہے عجب شغلِ ریاضؔ
رات بھر پینا ہے یہ مردِ مسلمان آجکل

محشر میں حوریں جام بکف پائیں زاہدؔ
اچھے رہے یہاں بھی تمھاری دعا سے ہم

صد آپ کو دعا سے اثر کو دعا سے لاگ
فرمایئے تو ہاتھ اُٹھا لیں دعا سے ہم

جو آج وصل میں اس طرح چُو سے جاتے ہیں
انھیں لبوں سے سُنی ہے ہزار بار نہیں

رہے گی یاد اُنھیں بھی مجھے بھی وصل کی رات
کہ اُن سا شوخ نہیں مجھ سا بیقرار نہیں

جناب شیخ نے جب پی تو منہ بنا کے کہا
مزا بھی تلخ ہے کچھ تُو بھی خوشگوار نہیں

سحر بھی ہوتی ہے چلتے ہیں ای اجل ہم بھی
اب اُنکے آنے کا ہمکو بھی انتظار نہیں

خدا لگا کے پہنچتے ہیں گل رخوں میں ریاضؔ
کچھ انکی ریشِ مبارک کا اعتبار نہیں

ادھر ہے بیخودیِ شوق اُدھر ہے نشۂ حسن
شبِ وصال ہے اور کوئی ہوشیار نہیں

یہ حشر ہے کہ الٰہی کوئی عدالتِ ناز
کھڑے ہیں دیر سے اب تک ہوئی پکار نہیں

یہ اُلجھے ہیں رندوں سے کیوں شیخ صاحب
بڑھاپے میں کیوں ڈاڑھی رنگوا رہے ہیں

جب میں کہتا ہوں کہ تھوڑا زہر ہی دیجے مجھے
ہنسکے کہتے ہیں کہ منہ مانگی قضا آتی نہیں

اُلٹے پیام وصل خود اُنکی زباں کے ہیں
حیراں ہوں ایسے دوست وہ میرے کہاں کے ہیں

راتیں خدا جو دے تو کسی کے وصال کی
پھر صبح ہو تو لطف بھی خوابِ گراں کے ہیں

تیور میں تیغِ یار کی سب ہیں کھچاوٹیں
کس بل شباب میں اجلِ ناگہاں کے ہیں

سر پر زمینِ حشر اُٹھائیں گے ڈر نہیں
جس کا جنوں میں پاس تھا وہ رہگذر نہیں

میں بھی مرا رقیب بھی دونوں ہیں خلد میں
جنت اگر یہی ہے تو اپنا گذر نہیں

لطف جی بھر کے اُٹھا لینے ہیں بیباکی کا
ہم تصور میں ترے اور مزا پاتے ہیں

کسقدر گورِ غریباں کے ہیں افسردہ چراغ
جسقدر تیز کرو اور بجھے جاتے ہیں

وہ خوش کہ فریب اسکو دیا ہمکو تسلی
دونوں کو مزے آتے ہیں پیمانِ وفا میں

اُٹھتے کبھی گھبرا کے تو مینخانے کو ہو آئے
پی آئے تو پھر بیٹھ رہے یادِ خدا میں

داماں کفن ڈال کے ہم منہ پہ چلے ہیں
اُڑتی ہے بہت خاک سُنا راہِ فنا میں

آنکھوں میں شرارت ہے کہ رُک کے نہیں رُکتی
شوخی ہے کہ بچپن ہے آغوشِ حیا میں

اے بیکسیٔ گور خدا تجھ میں اثر دے
ہیں پھول بھرے سر آج تو دامانِ صبا میں

ہماری قبر پہ اب خاک اڑانے جاتے ہیں
مٹے ہوؤں کا وہ شکوہ مٹانے جاتے ہیں

کلیم جا کے جہاں اپنے ہوش کھو آئے
وہاں تو روز ہم آنکھیں لڑانے جاتے ہیں

ستم ستم ہے نہ کچھ لطف لطف نزع کے وقت
ہماری یاد سے سارے فسانے جاتے ہیں

اب اضطراب ہے ہم میں نہ صبر ہے نہ سکون
نئے رفیق ملے ہیں پرانے جاتے ہیں

چلے یہ کہہ کے بجھانے وہ شمع تربت کو
کسی کی دل کی لگی کو بجھانے جاتے ہیں

نظر بچائے بغل میں دبائے شیشہ مے
کہیں ریاض کبھی پینے پلانے جاتے ہیں

ہم سے دعا کریں کہ وہ ہم پر جفا کریں
پائیں خدا سے ہم جو بتوں سے دعا کریں

صیاد اڑا دیا مجھے سر سے اتار کر
صدقے ترے ہما ترے سر پر اڑا کریں

سمجھائے تو ہی جا کے انھیں اے نگاہِ یاس
اب کوسنے کا وقت نہیں ہے دعا کریں

رکھ لیں ہم آپ لاؤ دلِ بیقرار میں
ایسا نہ ہو کہ تیر تمھارے خطا کریں

وہ دن کہاں ریاض وہ راتیں کہاں ریاض
بیٹھے ہوئے کسی کی بلائیں لیا کریں

اک ٹیپ ماری زور سے زاہد کے اے ریاض
اب ہاتھ مل رہے ہیں کہ اچھی پڑی نہیں

ریاض اک چلبلا سا دل ہو ہم ہوں
حسینوں کی بھری محفل ہو ہم ہوں

کھٹکتے ہیں نگاہِ باغباں میں
جو ہیں دو چار تنکے آشیاں میں

بوتل کا کاگ زور میں تو پہ کو سے اڑا
ہم گلچلوں کے ہاتھ کی گولی رکی نہیں

ہم جانتے ہیں لطف تقاضائے میفروش
وہ نقد میں کہاں جو مزا ہے ادھار میں

دل تجھے کیوں نہ کرے پیار مری جان ہے تو
دل کو میں کیوں نہ کروں پیار کہ تو ہے دل میں

تمھارے کوچے میں آئیں یہیں قیامت ہے
کہاں یہ لوگ نکل کر کدھر سے جاتے ہیں

کریں گے کیا نہ کریں گے جو مے سے ہم توبہ
کہ اب دوکان سے ملتی اُدھار بھی تو نہیں

شبِ وصل اٹھے یہ باہم مزے
نزع میں ہیں پیمانِ وفا کرتے ہیں

نہ وہ ہوش ہیں نہ ہیں وہ تمکینیں
اُس دغا باز سے ہم آج دغا کرتے ہیں

یہ مجھ پر کیسے آج پیار آ گیا
سجدے کرتے تھے بتوں کو کبھی زنہار ریاض

یہ کون آ گیا میری آغوش میں
اب تو ہم خدمتِ خاصانِ خدا کرتے ہیں

یہ بھی اک موج تھی وحشت کی ہیں سب نے زنجیر
ایسے جکڑے ہوئے کچھ طوق و سلاسل میں نہیں

آنکھ کی سوئی نکالی ارے قاتل تو نے
جان اٹکی ہوئی اب دیدۂ بسمل میں نہیں

بت اپنے آپ کو کیا جانے کیا سمجھتے ہیں
خدا کی مار سمجھ پر خدا سمجھتے ہیں

دل جلوں سے دل لگی اچھی نہیں
رونے والوں سے ہنسی اچھی نہیں

کبھی پی لی تو پی لی اب نہیں آ کبھی کچھ پڑا
الگ گوشے میں ہم بیٹھے خدا کی یاد کرتے ہیں

کیا قیامت ہے مری قبر پہ وہ آتے ہیں
اپنے سایہ کو جو چلتے ہوئے ٹھکراتے ہیں

شرم سے کچھ سحرِ وصل کو کہتے تو نہیں
کروٹیں لیتے ہیں بیتاب ہیں جھنجھلاتے ہیں

ہائے سبزی ہیں وہ سبزہ بو تل
کبھی ایسی گھٹا اٹھی ہی نہیں

شیخ صاحب کیا چھپا کر لے چلے رومال میں
کچھ نہ کچھ حصہ رہے یاروں کا بھی اس مال میں

ساتھ ہی سرکار کے جانا تھا مجھ کو بھی ریاض
ماہیِ بے آب کو رہنا تھا غنی تال میں

دل کی ہے قدر تو کچھ حسن کی سرکاروں میں
یہ وہ سودا نہیں بکجائے جو بازاروں میں

تیشہ بردوش نظر آتی ہے شب کو اک شکل
روحِ فرہاد پھرا کرتی ہے کوہساروں میں

اس لئے میں نے ترے جرم کئے دانستہ
میری گنتی بھی رہے تیرے گنہگاروں میں

مے ریاض آپ بھی پیتے ہیں ہاں ریشِ سفید
ہائے یہ نور کی شکل اور سیہ کاروں میں

دلکو ہونے دے ہدف ممکن نہیں دل کی تڑپ
یہ اڑاتی ہے ہمیشہ چٹکیوں میں تیر کو

کیوں ہوا ناوک خطا ہے شرم سے نیچی نگاہ
لاؤ ہم رکھ لیں کلیجے میں تمہارے تیر کو

ناوک افگن دیکھ لے آ کر ذرا تو دل کی پھانس
یہ ذرا سی پھانس تو شرما رہی ہے تیر کو

ہم بند کئے آنکھ تصور میں پڑے ہیں
ایسے میں کوئی چھم سے جو آ جائے تو کیا ہو

ہم گذری ہوئی یاد دلاتے ہیں کسیکو
منہ پھیرے ہوئے کوئی ہمیں کوس رہا ہو

کیا جام دیا ہے مجھے کیا جام دیا ہے
ساقی کا بھلا ہو مرے ساقی کا بھلا ہو

ڈر ہے کہ اسنے خوں کسی کا کیا نہ ہو
اتنا بھی شوخ ہاتھ میں کا رنگ حنا نہ ہو

بھی باغباں کو لاگ نشیمن کی شاخ سے
صیاد کوئی اور نیا گل کھلا نہ ہو

وہ بھی یہ چاہتے ہیں ٹھہر جائے دل ذرا
ہم بھی یہ چاہتے ہیں کہ ناوک خطا نہ ہو

چلتی ہوئی ہے تیغ رواں اُنکی کسقدر
اُسکی بھی جان جاتی ہے جسکی قضا نہ ہو

تمکو جو نیند آئے تو دشمن کو موت آئے
افسانہ وہ سناؤں جو تمنے سنا نہ ہو

ہمنے بھی اِن حسینوں کو چھیڑا ہے اسقدر
ایسا بھی کوئی ہے جو ہمیں کوستا نہ ہو

اللہ حسن دے تو حیا بھی ضرور دے
کس کام کی وہ آنکھ کہ جس میں حیا نہ ہو

کافر حسیں بلا سے خفا ہیں ہوا کریں
ہمسے خفا ریاض ہمارا خدا نہ ہو

رکھا ترے دامن میں ہے کیسے گلِ تر کو
رکھ آنکھ میں لے قبر مرے نورِ نظر کو

ہے آگ لگی آگ لگے اسکے اثر کو
جاتا ہے کہاں نالۂ دل چھوڑ کے گھر کو

پہلو میں ہمارے غضب اک پھانس چبھی ہے
رہ رہ کے پڑا رہتی ہے وہی درد جگر کو

یکساں ہے مرے گھر میں شب روز کا عالم
پھرتے ہیں مہ و مہر لیئے شام و سحر کو

جب خاک سے بچتے نہیں پروردۂ دامن
کیا لیکے کریں لالہ و گل لعل و گہر کو

شب گورِ غریباں میں بسر کرتے ہیں اے موت
ہم شام کو جا رہتے ہیں آتے ہیں سحر کو

مقبول دعائیں نہیں ہوتیں نہیں ہوتیں
قسمت میں ترسنا ہے ترستے ہیں اثر کو

تنکوں میں نشیمن میں کبھی چھپتے تھے ڈر سے
خوش ہوتے ہیں اب دیکھ کے ہم برق و شرر کو

گریاں ہیں ریاض آپ غمِ مرگ میں کسکے
درپیش بھی راہ ہے ہر فرد بشر کو

واد خواہوں میں دمِ حشر جو دیکھا ہے ریاض
پیار سے پوچھتے ہیں بھول گئے تم مجکو

پچھلے گناہ کیسے انھیں سے ملے نجات
محشر میں جو کیئے ہیں انھیں کا حساب ہو

اے شیخ تو چرا کے پیئے جب کبھی پیئے
تیری طرح کسی کی نہ نیت خراب ہو

لاکھوں حسیں ہیں حشر میں جی چاہتا ہے یہ
اس میں سے کوئی اپنے لیئے انتخاب ہو

چلتے ہیں جب ریاضؔ تو کچھ جھومتے ہوئے
جیسے پیئے ہوئے کوئی مست شراب ہو

خداوند اپہی ہے اسکو شہد و شیر جنت ہو
جو رندِ صاف باطن ہو جو رندِ پاک طینت ہو

قیامت کو کہیں کیا لے کے چلتے لینے جاتا ہے
تم اِس فتنہ کو ٹھکراؤ یہی فتنہ قیامت ہو

ہمیں کیا بھر دیئے ہوں کوٹ کر موتی جو قدرت نے
ہمارے کام کی وہ آنکھ ہے جس میں مروّت ہو

نہ اس میں دھوپ رکتی ہے نہ شب کی اوس رکتی ہے
مرے گھر کا وہ عالم بیکسوں کی جیسے تربت ہو

مے میں ڈوبا نامۂ اعمال کا ہر حرف ہو
رنگ وہ کر لائے کہ صدقے سرخیِ شنجرف ہو

پاک طینت رند پیکر مجھکو پہنچائیں ثواب
میری پونجی نیک کاموں میں الٰہی صرف ہو

[illegible]

کر گئے آباد چاند سی صورت لیے ہر آئینہ
چوٹ پڑتی چوٹ لوٹتا آئینہ پر آئینہ

شکلِ عبرت بن کے بیٹھا ہے سرِ منبر پہ آج
پھر واعظ چاہیئے ہے پیشِ منبر آئینہ

کیوں بلائیں لیکے منہ چوما دمِ تزئینِ یار
اُٹھ گئے وہ پھینک کر شانہ پٹک کر آئینہ

ہے لباسِ پارسائی پردہ پوش * زیرِ دامن جامِ صہبا چاہیئے

دل میں چھپ جائے وہ کانٹا چاہیئے
دل میں بس جائے وہ صحرا چاہیئے

حشر کے دن ہمیں سوجھی یہ شرارت اچھی
لیگئے دیکھ کے ہم حشر میں صورت اچھی

نہ بنے کام تو کس کام کی نازک شکلیں
نازک اچھے نہ حسینوں کی نزاکت اچھی

وہ بُری لاکھ میں اُٹھے جو لبِ واعظ سے
تیری ٹھوکر سے جو اُٹھے وہ قیامت اچھی

مرا دل نازپرور وہ تھا کیسا کیا ہوا اس کو؟
بہت غمگیں بہت محزوں، بہت مجبور رہتا ہے

زمانے میں بہت اللہ کے بندے ہیں ایسے بھی
کہ جنکے پاؤں پر تاجِ سرِ فغفور رہتا ہے

نہ اُس کافر کے گیسو میں نہ مجھ بیکس کے پہلو میں
خدا جانے کہاں میرا دلِ رنجور رہتا ہے

ادب ہے واعظ کی صحبت میں ہم وہ شے نہیں پیتے
ہمارے جام میں افشردۂ انگور رہتا ہے

خمار آلودہ آنکھوں پر ہزاروں میکدے قرباں
وہ کافر بے پیئے بھی رات دن مخمور رہتا ہے

لحد پر شمع سے بڑھکر ہے دودِ شمع کا جوبن
ریاض احباب گورکھپتوں اکثر یاد آتے ہیں

وہ بنکر حور تو یہ بن کے زلف حور رہتا ہے
زباں پہ میری اکثر ذکرِ گورکھپو رہتا ہے

جاتا ہوں تو آتی ہے یہی طوس سے آواز
ہم دیکھنے والوں کو سنبھلنے نہیں دیتے

یہ ایک لطف لاکھ ستم کا جواب ہے
محشر میں بنکے کہہ گئے کچھ دادخواہ سے

سیری ہوئی نہ لذتِ عصیاں سے عمر بھر
کیا کچھ کیا مگر نہ بھرا جی گناہ سے

جاتے ہیں اب ریاض کہاں سوئے میکدہ
مسجد میں آرہے جو اُٹھے خانقاہ سے

بالوں میں اپنے بیٹھ کے موتی پرویئے
آنسو نہ پونچھئے کسی آشفتہ حال کے

شبِ غم کی سحر نہیں ہوتی
ہو بھی تو میرے گھر نہیں ہوتی

یاد پیری میں ادھر آئی اُدھر بھول گئے
اے جوانی تیری ہم شام و سحر بھول گئے

روؤں کیا بیٹھ کے میں اپنے مصائب کو ریاض
ابتو رونا بھی مرے دیدۂ تر بھول گئے

مر گئے تھے جس میں نخلِ اُمیدِ وصال کے
کیا ہوگئے وہ باغ طلسمِ خیال کے

اُٹھواؤ میز سے مے و ساغر ریاض جلد
آتے ہیں اک بزرگ پُرانے خیال کے

اُنھیں کے کام الٰہی مرا لہو آئے
رنگیں جو ہاتھ لہو میں حنا کی بو آئے

دبی زبان سے میرا بھی ذکر کر دینا
کلیم طور پہ اُن سے جو گفتگو آئے

نہ جھوٹ بول کہ ہم شام سے کل آئینگے
دکھا قسم ارے جھوٹے کبھی جو تو آئے

کھلے جو کوئی تو کھل کر کسی سے باتیں ہوں
اُٹھے حجاب تو کچھ لطفِ گفتگو آئے

دلائے یاد جو وعدے تو بوسے جھنجھلا کر
یہ اور حشر میں پینے کو آبرو آئے

لگانے باغ کہاں داغ آرزو آئے
جہاں نہ پھول نہ پھولوں میں رنگ و بو آئے

چمن سے شیخ بھی اُٹھ کر کنارِ جو آئے
ہم آئے پینے کو مے وہ پیئے وضو کئے

کھلیں نہ قبر میں جنت کی کھڑکیاں زندہ
دماغ میں جو بسی ہے اُسی کی بو آئے

مری نگاہ میں بھی کوئی بجلیاں بھر دے
کوئی چمک کے ذرا میرے روبرو آئے

لگائی ہمنے لبِ جو قطارِ مینا کی
لگانے سرو نئے ہم کنارِ جو آئے

نہ ہو یہ کہنے کو ہم بے کہے سگئے واعظ
حرم کو جاتے ہوئے منہ بتوں کا چھو آئے

ریاض آئے تو لوگوں نے میکدہ میں کہا
کہاں یہ آج بزرگ فرشتہ خو آئے

مرے دل کے ارمان مر کر نہ نکلے
جو دل میں چبھے تھے وہ نشتر نہ نکلے

کلیم آئے تو کھل کے جلوہ دکھایا
ہم آئے تو پردے سے باہر نہ نکلے

ہماری نظر حشر میں شیخ پر تھی
وہ سر پر لئے حوضِ کوثر نہ نکلے

رہا ہے جو اس دل میں ہنگامہ آرا
وہی بزم آرائے محشر نہ نکلے

لرز گئے فتنۂ محشر سے ترے نقشِ قدم
اک قیامت ترے کوچہ میں بپا ہو رہی

چلی ہے آج ستانے انھیں فغاں میری
ارے ضرور یہ کٹوائے گی زباں میری

تم اپنے بام سے فریاد کی اجازت دو
یہاں سے تو نہیں سنتا ہے آسماں میری

کہے کہے نہ کہے کوئی مجکو کیا اِس سے
سنیں سنیں نہ سنیں آپ داستاں میری

وہ بولے ابرو و مژگاں کو کیا ہوا شبِ وصل
دھرے رہے یونہی ناوک مرے کماں میری

اُٹھاؤں عفو کی لذت بھی لطفِ عصیاں بھی
مرے کریم یہ تقدیر ہے کہاں میری

ستانیوالوں کو کچھ قدر ہو ستانے کی
انھیں ستائے یہ نالے جو آسماں میری

وہ میں ہوں آج زمانے کو ناز ہے جسپر
ریاض دھوم ہے جسکی وہ ہے زبان میری

ابھی چپ ہوں محشر میں افشا کروں گا
حسینوں کے رازِ نہاں کیسے کیسے

بڑی کوئی نٹ کھٹ ہے یا رب قضا بھی
چھٹے بانکے ترچھے جواں کیسے کیسے

ہمیں چاٹ کوثر کی دی واعظوں نے
ملے ہمکو پیرِ مغاں کیسے کیسے

جھلکا ہوا خیال ہے عقبیٰ کہیں جسے
بھولا ہوا سا خواب ہے دنیا کہیں جسے

دیکھے شبِ فراق میں کوئی تو ہم دکھائیں
دلکا وہ داغ چاند کا ٹکڑا کہیں جسے

ظالم کی آرزو نے جگہ لی ہے اس طرح
دل میں چبھا ہوا کوئی کانٹا کہیں جسے

ان آرسی کے دیکھنے والوں کو کیا پرکھ　　اچھا ہے وہ حسین ہم اچھا کہیں جسے

گلزار میں وہ پھول ہے جس کا ہے نام مے　　زاہد وہ سرو باغ ہے مینا کہیں جسے

واقف نہیں وہ روز قیامت کے طول سے　　وعدہ کیا ہے وعدۂ فردا کہیں جسے

حاصل اگر ہوئی بھی تو حاصل نہیں ہے کچھ　　بے اعتبار چیز ہے دنیا کہیں جسے

زنجیر تو ہو بیان میں واعظ شگفتگی　　ہم رند حسن کے قلقل مینا کہیں جسے

اہل حرم میں جاکے بنا آج شیخ وقت　　کافر ریاض پیر کلیسا کہیں جسے

اُٹھتے ہوئے میخانے چلے آتے ہیں لاکھوں　　اُٹھتی ہوئی ساون کی گھٹا اور ہی کچھ ہے

کیا ہاتھ اُٹھے ہاتھ اُٹھا بیٹھے دعا سے　　اُٹھ جائے تو ہاں دست دعا اور ہی کچھ ہے

نشتر سے چلے کام تو سو بار چبھو لوں　　اے درد جگر تیری دوا اور ہی کچھ ہے

درد فرقت کی اذیت کا نہ پوچھو کچھ حال　　آج گھبرا کے کئی بار قضا بھی آئی

حشر کے دن بھی رہی بات وہی آنکھ وہی　　جھوٹے وعدوں سے تجھے شرم ذرا بھی آئی

کئے میخانے میں جب مسجد جامع سے ریاض　　ساتھ ہی آپ کے قبلہ سے گھٹا بھی آئی

عمر کیا ہے ابھی کمسن ہیں نہ تنہا لیٹیں　　سو رہیں پاس مرے خواب میں ڈرنے والے

خم مسجد میں مے ناب بھریں جاڑوں میں　　ٹھنڈے پانی سے وضو کرکے ٹھٹھرنے والے

پھرتے ہیں کیسے حشر ہو وہ ہنستے کھیلتے　　کچھ دادگر سے کام نہ کچھ دادخواہ سے

مرنے والے اسی قابل تھے کہ بے موت مریں　　بات کیا ہے جو پشیمان قضا ہوتی ہے

واعظ انگور میں ہے دختر رز روبہ نقاب　　آنکھیں پھوٹیں جو ادھر تاک لگائے کوئی

بیکسی کہتی ہے یہ دیکھ کے تربت کا چراغ　　آپ بجھ جائیگا اسکو نہ بجھائے کوئی

بھرے خم ہم کیا کرتے تھے خالی اب وہی ہم ہیں　　بھری محفل میں خالی ہو کے ہم تک جام آتا ہے

ہمارا عیب کھلتا ہے نہ کھلتی ہے چھپی تو تل　　ہمارے کام کیا کیا جامۂ احرام آتا ہے

پائیں تو لے حسینوں تمکو رلا کے چھوڑیں　　ہیں یہ ریاض ایسے انکو ترس نہ آئے

بنائیں آشیاں کیونکر لدی پھولوں سے ڈالی ہے
یہ مشکل پاؤں رکھنے کی جگہ ہمنے نکالی ہے

ریاض اک چیز تھے انساں اگر ہوتے قرینے کے
مزے کے شخص ہیں لیکن طبیعت لاابالی ہے

ضعف یہ ہے کہ آنکھ اوپر کو
کم سے کم دوپہر میں اٹھتی ہے

اِس طرح کہ گھنگرو کوئی چھاگل کا نہ بولے
جب چھم سے چلیں گود میں چپکے سے اٹھالے

عادت وہ بری شے ہے جو کھانے کو بلا بھی
بے مے کے مرے حلق سے اترے نہ نوالے

برسات کی رت اور یہ گھنگھور گھٹائیں
اب ہم ہیں ریاض اور حسیں گیسوؤں والے

بے موت مری موت کہاں مر رہی جا کر
ہم سے آئے تو وہ کوچۂ قاتل میں نہیں ہے

دِل نہ مانا حضرتِ واعظ کو آتے دیکھ کر
کچھ یونہیں تھوڑی سی پی لی دل لگی کیواسطے

گود میں جھٹ سے بس اٹھا لیجے
چھم سے گھر میں جو کوئی آجائے

جان لو کچھ گذر گئی اسپر
منہ چھپائے جو کوستا جائے

مجھے تو ہائے حسینوں پہ رحم آتا ہے
کبھی نہ چین سے راتوں کو اپنے گھر میں رہا ہے

سب بھول گئے اسکو ترے عہدِ ستم میں
اب شکوۂ گردوں کوئی کرتا ہی نہیں ہے

دیوانہ ریاض اوروں سے کیا بات کریگا
معشوقوں سے تو بات وہ کرتا ہی نہیں ہے

اے دلِ ناداں بہت ناداں نہ بن
جان دیتا ہے ارے کن کے لیئے

دل کسی طرح چین پا جائے
غیر کی آئی ہمکو آ جائے

دیدۂ و دل ہیں کام کے دونوں
وقت پر جو مزا دکھا جائے

شیخ صاحب برائیاں مے کی
اور جو کوئی چپت کی آجائے

ہے ریاض اک جوانِ مست خرام
نہ پئے اور جھومتا جائے

جو اپنے گھر سے آیا ہے تو یہ رنگِ حیا کیوں ہے
ترے صدقے یہ شرمائی ہوئی تیری ادا کیوں ہے

عدو کی خیر کسکے غم میں یہ حالت بنائی ہے
پریشاں کیوں ہیں گیسو چاک داماں قبا کیوں ہے

حسینوں کا عالم نیا ہو رہا ہے
کہ جس بت کو دیکھو خدا ہو رہا ہے

یہ زاہد بتوں کے ستائے ہوئے ہیں
کہ جب دیکھو ذکرِ خدا ہو رہا ہے

آنچل ڈھلا رہا مرے مستِ شباب کا
اوڑھا گیا کبھی نہ دوپٹہ سنبھال کے

چلے آتے ہیں خوش خوش کسکے گھر سے
وہ ہنستے کھیلتے بادِ سحر سے

مزے کی چیز ہے یہ مجمعِ حشر
حسیں کیا کیا گذرتے ہیں نظر سے

ہمیں تو جیتے جی کوثر کی پلوا
خدایا چھوڑ دی ہے تیرے ڈر سے

ذرا چلکر تمہیں اسکو چھڑا دو
کسی کی آہیں الجھی ہیں اثر سے

کاتبِ اعمال نکلے کام کے
ملگئے دو دو شریکِ الزام کے

ایک آفت تھا تمہارا کوسنا
مرگئے لو سب ہمارے نام کے

پڑھ ڈالا مجھ سراپا جرم پر
صدقے اپنے جامۂ احرام کے

قیامت ہے کسکی اٹھائی ہوئی
یہ آفت ہے سب انکی لائی ہوئی

نہیں آتشِ طور دلکی لگی
بجھیگی نہ انکی لگائی ہوئی

خم پہ خم آف رے تری زلفِ دراز
چھوٹتے ہیں کب اسیر اس دام کے

آ بتا دیں ہم تجھے منہ چوم کر
کس طرح ٹوٹے مزے دشنام کے

وہاں سیکشی می پرستی رہی
یہاں عمر بھر فاقہ مستی رہی

دکھاؤ نگہ کی جو تم شوخیاں
پھرے برق بھی تلملائی ہوئی

انھوں نے تو دیوانہ ہمکو بنایا
وہی اب کریں پاسبانی ہماری

یہ ساقی نے ساغر میں کیا چیز دیدی
کہ توبہ ہوئی پانی پانی ہماری

پاک صاف ایسی ہے جسنے پی فرشتہ بن گیا
زاہدو یہ حور کے دامن میں ہے چھانی ہوئی

قحط تھا کیسے مزے کا حسن ارزاں بک گیا
اس گرانی میں مزے آئے یہ ارزانی ہوئی

غم مجھے دیتے ہو غیروں کی خوشی کیواسطے
کیوں برے بنتے ہو ناحق تم کسی کیواسطے

حشر میں او کاتبِ اعمال کچھ تو ہو شریک
ساتھ رکھا تھا تمھیں نیکی بدی کیواسطے

ہجر سے بڑھکر مصیبت کوئی آنیکی نہیں
موت کو رکھ چھوڑیئے کس زندگی کیواسطے

پاسِ آدابِ بزرگی ہے بایں وضعِ جنوں
جب چلے ناصح جھجکے ہم بندگی کیواسطے

یہ سمجھ کر کم نہیں یہ دل دکھانے کے لیئے
دل مجھے دیتے گئے میرے ستانیکے لیئے

ساتھ انکے ہے ہزاروں عندلیبوں کا ہجوم
آئے ہیں دو پھول تربت پر چڑھانیکے لیئے

حشر کے دن وعدہ کس کا کون کرتا ہے نباہ
ہیں یہ باتیں ہمکو دیوانہ بنانے کے لیئے

نبع کیسی موت کسکی اب مرے دشمن مریں
پاس آ بیٹھے ہیں وہ باتیں بنانیکے لیئے

کوثر و تسنیم، حور و خلد کے ہوتے ہوئے
آستانِ یار سے کوئی اٹھائے کیوں ہمیں

چھیڑ کیسی بات کہتے روٹھے جاتے ہیں ریاضؔ

بیمار کی بالیں سے یہ کہتے ہوئے گذرے

دیدے دیدے مرے ساقی ترے صدقے دیدے

جہاں ہم خشتِ خم رکھدیں بنا کعبہ کی پڑتی ہے
تمھیں کیونکر بتائیں دلبر اپنے کیا گذرتی ہے

اتنی تو سنے کی ہے کہ بہکے ہوئے ہم تھے

چوسکر کسنے چھڑائی ہے مسی ہونٹوں کی

ہے زمانے میں محبت کی نظر کی تعریف

جائیں گے ہم آگ دوزخ میں لگانے کے لیے
ہم بھی آبیٹھے ہیں قسمت آزمانے کے لیے

اک حسیں ہر وقت ہو انکے منانے کے لیے

دیکھی نہیں جاتی ہے مصیبت ہو کسی کی

دستِ رنگیں سے چھلکتے ہوئے پیمانے سے

جہاں ساغر ٹپک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے
تمھیں کیونکر دکھائیں تم میں کیا عالم نکلتا ہے

مجرم ہیں جو واعظ کی کہیں سے خبر آئے

سامنے منہ تو کریں بات نہ کرنے والے

صدقے ان آنکھوں کے یہ تیز نگاہی کیسی

ہنسے جو محفلِ ماتم میں تم ہنسی ہوگی
غلط ہے آپ نہ تھے ہمکلام خلوت میں
نہ شیشہ پنبہ دہن ہے نہ خم ہے بے منہ کا
جھجک جھجک کے لیا ہوگا ہاتھ میں ساغر
اتر گئی سر بازار شیخ کی پگڑی
ہجوم دیکھ کے سمجھے یہ صبحِ محشر ہم
شریک مے میں کیا ہوگا آب زمزم بھی

پکارتا ہے تبسم مری ہنسی ہوگی
عدو سے آپکی تصویر بولتی ہوگی
کھلے جو حضرتِ واعظ تو دل لگی ہوگی
جو پی بھی ہوگی تو ڈر ڈر کے ہمنے پی ہوگی
گرہ میں دام نہ ہونگے ادھار پی ہوگی
کھلی دکان کسی مے فروش کی ہوگی
ریاض نے پس توبہ جو پی کبھی ہوگی

اذاں کا کام چلجائے جو ناقوسِ برہمن سے
مسل دو دلکو چٹکی سے اگر چھیڑے کبھی تم کو
جگایا ہے بہت جادو جگا کر ان حسینوں کو
پھرا ہو خانقہ میں چار دن تک کیا ہوئی صورت

بڑا یہ بوجھ اترے ای مؤذن تیری گردن سے
یہ جب ابھرے ذرا اسکو دبا دو اٹھتے جوبن سے
بہت کچھ سحر سیکھا ہے انھیں کی چشم پرفن سے
یہ عالم ہے کہ گویا اٹھ کے ہم آئے ہیں مدفن سے

شبِ غم کا یہ عالم ہے چراغ اِس طرح جلتا ہے
گلے ملنے کے اِن کافر حسینوں سے یہی فن ہیں

اُٹھا لائے ہیں گویا ہم کسی بیکس کے مدفن سے
جوانی جب گلے ملتی ہو آ آ کر لڑکپن سے

داورِ حشر طرفدار ہمارا ہو تو ہو
اہلِ محشر تو طرفدار تمھارے نکلے

میکدہ بھی ہے مقاماتِ ادب سے شاید
جو اِدھر نکلے وہ دستار اُتارے نکلے

شیخ جی گر گئے تھے حوض میں میخانے کے
ڈوب کر چشمۂ کوثر کے کنارے نکلے

بالس پر میکدہ ہیں تجکو چڑھایا ای شیخ
پھر بھی اُونچے تری مسجد کے منارے نکلے

نہ جفا سے ہے میرے دل کو قرار
نہ تسلی وفا سے ہوتی ہے

شمع کھل کھیلے گی پروانے سے آج
کچھ سینگی یہ لبِ گلگیر سے

ملنی جلتی ہے مری فردِ عمل
کاتبِ تقدیر کی تحریر سے

آگرے آنے کا حاصل تھا یہی
دل گرفتہ رہل لیئے دلگیر سے

[illegible]

بھولی بھولی شکل دیکھی کس کی گھبرائی ہوئی
پھر گئی گھر سے مرے کیوں شامِ وصل آئی ہوئی

جوشِ مے اور سبزہ زاروں میں گھٹا چھائی ہوئی
بات ایسی ہے کہ توبہ بھی ہے للچائی ہوئی

ہائے وہ دن ہمسے یوں زاہد لبِ کوثر کہے
پیجیئے تو کس تکلف کی ہے کھچوائی ہوئی

ہائے کیا جھٹ پٹ قفس ہیں بال و پر پیدا کیئے
جب سُنا ہمنے کہ جاتی ہے بہار آئی ہوئی

کیا پڑے ہو گوشۂ مسجد میں اُٹھو زاہدو!
پھوٹی آنکھوں سے ذرا دیکھو گھٹا چھائی ہوئی

ساتھ شوخی کے کچھ آنکھوں میں حیا رہنے دے
یہ بھی اک چیز ہے او فتنہ ادا رہنے دے

اِن جفاؤں پہ یہی حشر میں کام آئے گی
اپنی آنکھوں میں مروّت بھی ذرا رہنے دے

مجکو ارمان منانے کوئی میرے دل کو
آنکو یہ ہٹ کہ خفا ہے تو خفا رہنے دے

درِ میخانہ نہیں ہے یہ درِ کعبہ ہے
ہر جگہ چھیڑ یہ اے لغزشِ پا رہنے دے

رحم آتا ہے مجھے اپنی غریبی پہ ریاض
اپنے در پر کوئی مجکو بھی پڑا رہنے دے

وہیں آ بیٹھنا اُٹھ کر اِدھر سے
ملا ہے گھر مرا دشمن کے گھر سے

[illegible]

ہمارے پاس دل سی چیز رہتی؟
بچائے رکھتے ہیں اُنکی نظر سے

ہوا پر ہے مزاج ابرِ کرم کا
پیو رندو! وہ برسے یا نہ برسے

رات دن بزم میں دور رہے گلفام چلے
زور تجھ سے جو مرا گردشِ ایام چلے

سنگ بتخانوں سے میخانوں سے شیشے آئے
طرفِ کعبہ جو ہم پیروِ اسلام چلے

کوئی دیکھے تو خوشی غیر کے گھر جانے کی
شام سے پہلے وہ بنکر شفقِ شام چلے

یہی کثرت ہے اسیروں کی تو صیاد اللہ
اے صیاد جو دو دن بھی ترا دام چلے

کاٹے کٹتی نہیں مجھ مست سے برسات کی رُت
میکدے والی چلے آج تو کچھ کام چلے

دام اس انداز سے پھیلائے چمن میں صیاد
ہیں سرِ شاخ چلوں سایہ تہِ دام چلے

طلب کئے کبھی ہم نے اگر پسِ توبہ
بہت بھرے ہوئے ہم سے خم و سبو آئے

اترنے والے ابھی تک نہ بام سے اترے
تڑپنے والے تڑپ کر فلک کو چھو آئے

نثار وصل کی راتیں ہیں ایک ساعت پر
ہم انتظار میں تیرے ہوں اور تُو آئے

حنا یہ کہتی ہے لبِ بے زبان پاکے مجھے
جب آپ آئے گئے چوریاں لگا کے مجھے

حنا یہ کہتی ہے اُن سے سنا سنا کے مجھے
نہیں شہیدوں میں ملنا لہو لگا کے مجھے

ذرا سے درد نے ڈھائی ہیں آفتیں کیا کیا
پٹک دیا ہے زمیں پر اُٹھا اُٹھا کے مجھے

میں اپنے خون کا بیڑا اُٹھاؤں خود کیونکر
وہ پان دیتے ہیں شوخی سے مسکرا کے مجھے

یہ کیا مذاق فرشتوں کو آج سوجھا ہے
جحیم حشر میں لے آئے ہیں پلا کے مجھے

ستانے والو قیامت بھی آئے جاتی ہے
بٹھا کے لطف تمہیں آئینگے وفا کے مجھے

کہاں وہ نور کی صورت وہ نور کی آواز
ریاض کون سنائے غزل یہ گا کے مجھے

مری آہِ رسا چنچل بڑی ہے
یہ بجلی بن کے کانوں میں پڑی ہے

مزے لوٹو کلیم اب بن پڑی ہے
بڑی اونچی جگہ قسمت لڑی ہے

توبہ کرنے سے شرم آئی
اعمال پہ اپنے جب نظر کی

آہ کیا بے اثر ہی جائیگی
حال ہے گر یہی تو اپنی جاں
میرے گھر میں اگر بلا آئی
شمع تربت صبا کو آنے نہ دے
تیری رحمت ہے تو گنہ کیا ہیں؟
ہمنو کیا جائیں گے وطن کو ریاض
چھیڑ کر مجمع زہاد کو ڈرتا ہوں ریاض
کیا ٹھکانا ہے بات کا اُنکی

کچھ نہ کچھ کام کر ہی جائیگی
وقت سے پیشتر ہی جائیگی
ڈر ہی جائے گی مر ہی جائیگی
کچھ نہ کچھ گل کتر ہی جائیگی
سر سے گٹھڑی اُتر ہی جائیگی
اب ہماری خبر ہی جائیگی
کہنہ مسجد کے عوض ہو نہ مرمت میری
دل میں کچھ ہے زبان پر کچھ ہے

چشم تر کی اشک باری آپنے دیکھی نہیں
بارش ابر کرم نے اور لت پت کر دیا
بزم محشر میں نہ رکھتی اُسکی رحمت امتیاز
میکدے میں جائے ہم برہم تو تھامے میکشو

یہ اگر طوفاں اُٹھاتی سینکڑوں گھر بیٹھتے
حشر میں ہم کیا سکھاتے دامن تر بیٹھتے
لطف ہوتا رند و زاہد سب برابر بیٹھتے
میرے گھر واعظ جو آتے میرے سر پر بیٹھتے

ہو گی وہ دل میں جو ٹھانی جائیگی
آگ سنکر آئی کیا تیغ پر آب
تیغ ہی کیا ہاتھ میں قاتل کے تھی
خدمت میخانہ کر لے ورنہ شیخ
آگ بنکر جام میں آئیگی مے
موت سے بد تر بڑھاپا آئے گا
شیخ نے مانگی ہے اپنی عمر کی
عرش پر ہے خوش جمالوں کا مزاج
جل چکے ہیں آپ کل دشمن کے گھر

کیا کسی کی بات مانی جائیگی
آئی ہے تو ہو کے پانی جائیگی
اے حنا تو بھی تو سانی جائیگی
رائگاں یہ زندگانی جائیگی
زمزمی میں ہو کے پانی جائیگی
جان سے اچھی جوانی جائیگی
میکدے سے اب پرانی جائیگی
کیونکر ان کی لنترانی جائیگی
آج مرگ ناگہانی جائیگی

ساتھ لائے ہیں قفس سے ناتواں — جاتے جاتے ناتوانی جائیگی
پینے آتے ہیں فرشتہ خور ریاضؔ — حور کے دامن میں چھانی جائیگی

ناپائدار زندگی مستعار ہے — آئے نہ آئے سانس کا کیا اعتبار ہے
ساقی ہمیں چھکا دے کہ رخصت ہے فصلِ گل — برسا دے آج پھول کہ جاتی بہار ہے
قربان اپنی کثرتِ عصیاں کے لاکھ بار — محشر میں سب سے پہلے ہماری پکار ہے
پی لی تھی کچھ کہ چین سے گذری شبِ لحد — دن ڈھل چکا ہے حشر کا اب تک خمار ہے

پہنچ جائے کسی کے بام تک یارب فغاں میری — لگی لپٹی گئی ہے ساتھ جانِ ناتواں میری
بتوں کے بام سے مجھ پر یہ کیوں پتھر برستے ہیں — گرے اس طور پر بجلی لڑی ہی قسمت کہاں میری
وہ کیا دن تھے کہ راتیں اس طرح باہم گذرتی تھیں — دہن میرا زباں انکی دہن انکا زباں میری
کیا یہ رنگ پیدا مدتوں رہکر کلیسا میں — حرم میں نغمۂ ناقوس بنتی ہے اذاں میری
کہیں ایسا نہ ہو پھینکیں فلک سے بام پر انکے — کہاں لیجا کے پھینکیں گی مجھے بیتابیاں میری
دمِ آخر جو آئیں بھی تو یارب اس طرح آئیں — مزا دیں قلقلِ مینا کا مجکو ہچکیاں میری
ریاضؔ اک عمر گذری دیر میں آئے مگر اب تک — حرم میں گونجتی پھرتی ہے راتوں کو اذاں میری

ریاض

ریاض۔ سردار مرزا ریاضؔ لکھنوی مقیم مٹیا برج کلکتہ شاگرد تعیشؔ الدولہ عیشؔ بعد وفات سلطان عالم واجد علیشاہ وطن چلے گئے اسکے بعد کا حال معلوم نہوا یہ چند شعر انکے منتخب ہوکر درج ہوئے

سبزہ رنگوں میں چلے گر جھوم کر جامِ شراب — رقصِ طاؤسی دکھائے سر بسر جامِ شراب
جھمگھٹا حوروں کا ہے مجھ بادہ کش کی بزم میں — جامِ کوثر کا دکھاتا ہے اثر جامِ شراب
ہائے کہہ کر دل پکڑ لیں بادہ کش میخانہ میں — طرزِ رفتارِ صنم سیکھے اگر جامِ شراب
نشۂ دولت میں غافل ہے تو رکھ فکرِ خمار — پیتے ہیں مثلِ دوا اہلِ ہنر جامِ شراب

ریاض

ریاض۔ سیّد رضا حسین عرف منے صاحب لکھنوی شاگرد جناب آغا مظہر لکھنوی آپ لکھنؤ کے دورِ موجودہ کے خوش فکر کہنے والوں میں ہیں کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو ❊

فصد اُٹھنے کا وہ کرتے ہیں مرے پہلو سے	ہاں ذرا درد جگر اور سوا ہو جانا
اُٹھا شور قیامت ہم جو اُٹھے	زمیں بیٹھی اگر بیٹھے زمیں پر
آنکھیں تلووں سے ملونگا بام سے کہنے ہیں ع	آنکھ بھر کر تم اگر دیکھوگے درباں کی طرف
ہر دم تڑپ تڑپ کے گذرتی ہے ہجر میں دل اب کہاں کہ ہو گئی مدت مٹے ہوئے	یہ کون آکے لے گیا صبر و قرار دل اک داغ میرے سینے میں ہے یادگار دل
دوشِ صبا پہ گل جو روانہ چمن کے ہیں عبرت کی ہے جگہ جنھیں کل تک عروج تھا جب میں کہتا ہوں کہ تھوڑا زہر ہی دیجے مجھے	جنگل میں آج پھول کسی بیوطن کے ہیں محتاج آج حیف وہ گور و کفن کے ہیں ہنسکے کہتے ہیں کہ منہ مانگی قضا آتی نہیں
جگر میں آگئی دل سے گذر کے مرا سینہ ہے اے گل لائق دید گھٹا چھائی ہوئی ہے آسماں پر یہ کہنا ناز سے اُس کا شبِ وصل	تصدق آپ کی ترچھی نظر کے کھلے ہیں پھول کیا داغ جگر کے ارے ساقی ادھر لا جام بھر کے ترے مہماں ہیں ہم رات بھر کے
یہ انتہا ہے کہ سر رکھدیا ہے قدموں پر	کسی طرح نہیں سنتا ہے پاسباں میری

ریاض

ریاض - نواب سید جعفر مرزا خان عرف منّے صاحب لکھنوی سنہ ۱۹۱۰ء تک زندہ تھے اس سے زیادہ حال معلوم نہ ہو سکا، محشر لکھتے ہیں کہ اچھا کہنے والوں میں تھے باوجود تلاش زیادہ کلام دستیاب نہو سکا ؏

بولی بنیائی دل وہ جو اُٹھے پہلو سے اپنے وحشی کو مری جان دکھا دو گیسو وقت رخصت کے ستمگر نے یہ ٹھانی جی میں	کیا کروں ہجر میں اتنا تو بتاتے جاؤ اور دیوانہ کو دیوانہ بناتے جاؤ دلِ بیتاب کو کچھ اور جتاتے جاؤ
خوب آئے میکشوں کی صحبت میں شیخ صاحب اظہار کر رہا ہے اُڑ اُڑ کے رنگ رخ کا	بیشک یہ باتیں زیبا حضرت کی شان پر ہیں دردِ جگر کے صدمے جو جو کہ جان پر ہیں

تربت مٹی ہوئی کیوں ڈھنڈوائی جا رہی ہو	وہ مہربان یارب کس بے نشاں پہ ہیں

ریاض — منشی محمد یعقوب صاحب ریاضؔ سب جسٹرار ویراؤتی مدراس شاگرد شوکت میرٹھی ۹؁ کے قریب رسالہ ”پروانہ“ میں انکا کلام شائع ہوا کرتا تھا، تعجب ہے کہ صوبہ مدراس جیسے دور اُفتادہ مقام میں انھیں اردو میں شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا، اکثر اخلاقی مضامین نظم کرتے ہیں، زبان اور بندش بھی بُری نہیں۔

شاخِ گل پر کرتی ہے بلبل بیاں توحید کا	شیخ ممبر پر پڑھے جس طرح خطبہ عید کا
گوشۂ دل میں نہاں ہے جلوہ تیرا جانِ جاں	بوالہوس دل منتظر پھرتا ہی پھر بھی دید کا
پھرتے ہیں جسکو ڈھونڈتے دیر و حرم میں ہم	کیا وہ ہمارے کعبۂ دل میں مکیں نہیں
بہار آئی چمن میں پھر ہوا جوشِ جنوں سر میں	مزا ہے نشترِ فصاد کا خارِ گلِ تر میں
لکھے جو کاتبِ تقدیر انسان کے مقدر میں	وہی پیش آئے سر پھر کر اُسے دنیا کے فکر میں
نیچر کے سارے کام تصور سے دور ہیں	فہم و خرد کو اس میں چناں و چنیں نہ ہو
حق کے کوچے میں غنی کا ہو بھلا کیونکر گذر	اِس سفر میں بے سرو ساماں گدا ہی چاہیے
قضا جب آئی لیکر ہاتھ میں فرمان رحلت کا	تو جامِ آبِ حیواں ساغرِ زہر ہلاہل ہے

ریاض — منشی ریاض الدین احمد صاحب ریاضؔ دہلوی، کلام رسالہ ”زبان“ جلد ۱؁ سے نقل ہوا، نو مشق کہنے والوں میں ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

بہاتے ہیں جو آنسو نعش پر وہ دیدۂ تر سے	ہمارا غسلِ میت ہو رہا ہے آبِ گوہر سے
مزہ ہو گر وہ بگڑیں آسمانِ فتنہ پرور سے	تماشا ہو چلیں چوٹیں ستمگر کی ستمگر سے
جوانی میں غضب کے ہو گئے ہو چلبلے چنچل	بپا ہوتا ہے محشر اتنا کافر تیری ٹھوکر سے
ہنسی بھی دل لگی تھی کھیل تھا کیا اے دلِ ناداں	ہدف ہو ہو کے بچ جاتا نگاہِ شوخ دلبر سے
اگر دشمن سے ملنا ہے تو پھر مجھ سے بھی مل ظالم	یہ کون انصاف ہے قاتل کوئی خوش ہو کوئی ترسے
ریاضؔ اس چرخ نے عشاق کو کب چین سے رکھا	نہ بر آئی کسی کی آرزو اس کینہ پرور سے

ریاض

ریاض۔ مولوی ریاض الدین احمد ریاض عدالتِ منصفی متھرا میں وکالت کرتے ہیں شعر میں مضمون پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ معلوم نہ ہوا کہ تلمذ کس سے ہے کلام درج ذیل ہے۔

وجہ کیا کیوں نہ تحیر ہو ہمیں دنیا میں	آئینہ خانے میں جو آئے وہ حیراں بھی نہ ہو
کیا کروں حضرتِ عیسیٰ تپِ فرقت کا بیاں	وہ مرض ہے کہ حضور آپ سے درماں بھی نہ ہو
ایک آفت ہو تو کہیے ای ریاض	دل ہمارا موردِ آفات ہے
بیدہا فی حق نے جو دی ہے بتیں	اے بتو اس میں بھی کوئی بات ہے
دیر و حرم میں ایک سا جلوہ ہے زاہدو	حق ہیں اگر ہو آنکھ تو پہچان چاہیئے
میں سمجھوں شہسوار اُسکو جو روکے	عناں اس توسنِ عمرِ رواں کی
جو برسات میں اُنکی یاد آگئی	تو گھنگھور غم کی گھٹا چھا گئی
غیروں کے گھر نہ راتوں کو ریحان جائیے	کہنا مرا خدا کے لیئے مان جائیے

ریحان

ریحان۔ ماہر رموز سخن شاعر شیریں زبان دیوان دیا کرشن ریحان لکھنوی، خلف منشی گنگا کشن عزیز راجہ صاحب رام، قوم کے سری باستب کا یستھ اور شاہ آباد کے متوطن تھے مگر عرصے سے لکھنؤ میں اقامت گزیں تھے، منشی موجی رام موجی سے جو حضرت مصحفی کے نامور تلامذہ میں تھے اِس فن میں استفادہ کیا تھا اور پھر منشی جواہر سنگھ جوہر سے بھی مشورہ رہا، عاشقانہ شعر خوب کہتے تھے، بڑے شیریں کلام، نازکخیال معنی آفریں سخنور تھے انکا دیوان مسمّیٰ بہ "باغ ریحان" چھپ گیا ہے، سلطان عالم واجد علیشاہ کے عہد میں بخشی الممالک راجہ الفت رائے کے رشتہ دار رہے، بعد انتزاع سلطنت پنڈت شہودین وکیل کے ملازم رہے، بڑے نازک مزاج، وضعدار، خوش تقریر شخص تھے، استعدادِ علمی بہت معقول تھی، خاندانی شخص تھے، مگر تباہیِ سلطنت کے بعد آسودگی اور فراغبالی نصیب نہ ہوئی، ہمیشہ بادشاہ کی استرداد سلطنت کے لیئے دست بدعا رہے، اسرد و گرم زمانے سے بخوبی آگاہ تھے، بڑے بڑے باکمالوں اور مشہور استادوں کی صحبت پائی تھی، اور فن شعر کے رموز

وہ وقائع پر پوری طرح عبور رکھتا، طبیعت عاشقانہ پائی تھی معاملہ بندی کا مذاق بہت اچھا تھا، کلام بہت پاکیزہ صاف اور اکثر اشعار اخلاقی مضامین سے مملو ہیں، تعجب ہے کہ شیخ ناسخ کی خشک بیانی اور بے تاثیر رنگ سے جو لکھنؤ کی آب و گل میں اس زمانہ میں سرایت کر چکا تھا، کس طرح انھوں نے اپنے آپ کو بچایا، کلام میں آورد بہت کم اور بول چال صاف و شستہ ہے، اکثر غزلیں انکی زندگی ہی میں رائج ہو گئی تھیں اور عام و خاص میں اچھی شہرت حاصل کر لی تھی، انکا دیوان قابل دید ہے اور اس میں ہر مذاق کے شائق کی تفریح اور دلبستگی کا کافی مصالحہ موجود ہے، اکثر غزلوں سے انکی قادر الکلامی اور مشاقی فن کا ثبوت ملتا ہے، اپنے وقت کے مشاہیر شعرا میں انکا شمار تھا اور فی الواقع یہ اسکے اہل تھے ۱۸۵۵ء کے قریب پیرانہ سالی میں انتقال کیا۔

پہلے خیالِ زلف ہو پھر شغل آہ کا　　لام و الف ہے تاج سرِ لا آلہ کا

تہمت ہے تیغ تیز پہ خنجر پہ اتہام　　قاتل میں کشتہ ہوں تری ترچھی نگاہ کا

کسقدر فضل اے خداوند جہاں پرور کیا　　تو نے مجھ گمنام کو دنیا میں نام آور کیا

روزِ پیدایش سے مجکو رزق بے منت دیا　　اپنی خواہش سے زیادہ میں نے صرف زر کیا

بے خیالِ بندگی بابِ عنایت کھل گیا　　رنج میں میں نے رجوعِ قلب جب دم بھر کیا

دمِ آخر بھی جہاں سے خدا نے سیر خور رکھا　　مرے خوں سے ہوا پان خوردہ لب قاتل کے خنجر کا

ملے ملکِ اودھ واجد علی سلطان کو ای ریحان　　خدا چمکائے پھر اک دن ستارہ میرے اختر کا

قناعت نے ہمیں گنجِ فراغت جب سے دکھلایا　　نہ شادی کی رہی شادی نہ غم دل میں رہا غم کا

خدا کے ہاتھ ہے انصاف ای بتِ بیرحم　　ہمارے صبر کا اور تیرے دل کے کھانے کا

ہمیشہ رہتے ہیں چالاک آفتوں سے بری　　سمندِ چرخ کو کب ڈر ہے تازیانے کا

عقدہ کھلتا ہی نہیں تقدیر کا　　گھس گیا ناخن مری تدبیر کا

نوکِ مژگاں کی خطا اس میں نہیں　　خود بنا عاشق نشانہ تیر کا

جب دیا حور نے مجھ رند کو جام کوثر
رشک زاہد کو ہوا میری گنہگاری کا

کچھ دام کا قصور نہ دانے کی ہے خطا
صیاد تیرے گھر میں میرا آب و دانہ تھا

نگاہِ غور سے ہمنے تماشائے جہاں دیکھا
کسیکو بھی نہ اپنا یار وقتِ امتحاں دیکھا

نہیں معلوم کیسے وقتِ بد میں باغ سے نکلے
کہ جیتے جی نہ پھر بلبل نے رُخِ آشیاں دیکھا

قسمت سے زیادہ کبھی حاصل نہیں ہوتا
جو صابر و شاکر ہے وہ سائل نہیں ہوتا

اے سرو کر نہ یار کے قامت کا سامنا
قامت کا سامنا ہے قیامت کا سامنا

نہ کچھ جینے کی راحت ہے نہ کچھ مرنیکا ہے کھٹکا
علاقہ اُٹھ گیا دونوں سے جب سے دل کہیں اٹکا

بے صنم جی سے گذرنا ہی بھلا
ایسے جینے سے تو مرنا ہی بھلا

ظلم عاشق پہ بے سبب دیکھا
نہ سنا تھا کبھی جو اب دیکھا

ناحق سوال ہے کس دنیا کس کے سامنے
روزی بھی دیگا جسنے دہن ہے دیا

شیخ جی نکلے ہیں ہیں تبخیر
کہو کعبہ میں تمنے کیا دیکھا

فرہاد تیری ہمتِ عالی کو آفریں
جی کھو کے عاشقی کا تماشا دکھا دیا

کھلجائیگا کبھی مری تردامنی کا لطف
حسن لیجیو چراغِ جہنم بجھا دیا

اُلفت پہ جسکی ناز تھا وہ بیوفا ہوا
کیا اپنے دلمیں سمجھے تھے ہم ہائے کیا ہوا

مو جی سے مجھکو کیوں نہ ہو ریحاں خصوصیت
ہیں اُسکی روح ہوں جو وہ ہے مصحفی کی روح

جائے جو چاہے سوئے دیر و حرم
ہم تو بیٹھے ہیں درِ دلدار پر

رشکِ جم ہیں وہ ہیں روشن ضمیر
ناز دل پر انکو اُسکو جام پر

مریضِ عشق مرجائے کہیں ہو زندگی اسکی
شفا کو مانگتا ہے کون خواہانِ شفا ہو کر

کعبۂ روئے صنم کی دید سے کافر ہوئے
رکھدیا ایمان طاقِ ابروئے خمدار پر

ملجائیگا منفعل کیا کھیلا جو کوئی جی پر
واجب ہے رحم کرنا عاشق کی بیکسی پر

کب رشک چاہتا تھا ہو نامہ بر کبوتر
عاشق ہی اُڑ کے جاتا رکھتا جو پر زمیں کی

کھل پڑی زلفِ مسلسل جو تری شانوں پر
کیا بلا آئی خدا جانے پریشانوں پر

کیا عجب جبہ و دستار جو ہوں رہنِ شراب
شیخ جی چڑھ گئے رندوں کے اگر قابو پر

دیکھکر اسکو کسیکا نہیں رہتا ایماں
ہے مسلمان پہ موقوف نہ کچھ ہندو پر

خوش آئی کسے سیر چمن ہے رخِ رنگیں	ہے گرم نسیم سحری لو کی برابر
دیکھیں تو وہ موزوں ہے کہ بوٹا سا قیامت	ہوجاؤ کھڑے سروِ گلستاں کی برابر
نہیں پوشیدہ ریحاں بات جو منصور پر گذری	نکالے حرف منہ سے کوئی کیونکر رازدانِ عشق کر
خواب میں بھی نہ کبھی ہجر کی شب دیکھی تھی	یہ بلا سر پہ مرے ہو گئی نازل کیونکر
چاہیئے اسکے لیئے ذہن رسالے ریحاں	گفتگو عشق کی سمجھے کوئی جاہل کیونکر
محبت میں نہیں ہے اختلافِ دیں بھی باقی	مسلماں دیتے ہیں ہندو پہ جاں ہندو مسلماں پر
حسیں پر دل نہ ہو مائل کسیکا ہم نہ جانینگے	کوئی گنگا اٹھائے خواہ رکھے ہاتھ قرآں پر
زباں اردو کی غالب آگئی ہے یہ فارسی کے	چڑھائی کرتے ہیں ہندوستانی ملکِ ایراں پر
دشمن کسیکا ہو کے کوئی کیا بنا ہیگا	انساں کا اختیار نہیں اپنی جان پر
پھر رخِ الفت کی طرف آہے دلِ ناشاد نکر	آبرو جتنی ہے باقی اسے برباد نکر
کیا کہوں بھول گیا ورنہ خدا ہے کہتا	مجھکو دیوانہ نکر اسکو پری زاد نکر
کہیگا کیا زمانہ سنکے شکوہ ظلم کا ریحاں	بھلا کہتے تھے جنکو اب کہیں ہم انکو برا کیونکر
خاک میں تمنے ملایا دل جلا عمر بھر	شمع کو تربت پہ میری اب جلانا کیا ضرور
دی ہے اپنی جان خطِ سبز یار پر	اُگتا ہے بعد مرگ کے سبزہ مزار پر
رند و زاہد کی لڑائی کو نجانے کم کوئی	خون کی ندی بہے گی خلد میں کوثر کے پاس
رکھتا نہیں دنیا میں وہ آرام کی خواہش	جس شخص کو ہوتی ہے فقط نام کی خواہش
سخت مشکل ہوئی جسدم قفسِ تن چھوٹا	طائرِ جاں کو ہوئی وقت رہائی تکلیف
زلفوں میں دل رہیگا گرفتار کب تلک	چھوٹے گا قید سے یہ گنہگار کب تلک
مصروفِ عیش یار ہے گھر میں سنیگا کون	نالے کریگا دل پسِ دیوار کب تلک
رندوں کی بزم میں وہ اگر روز آئے گا	ریحاں بچے گی شیخ کی دستار کب تلک
نہ آج کھولا تو کل کھلیگا رہیگا منہ پر نقاب کب تک	جو پاس رہنا ہے ہر گھڑی کا تو اٹھ سکیگا حجاب کب تک

قسم نہیں عمر بھر کی کھائی کہ ہو نہ آپس میں پھر صفائی
نگاہ ترچھی رہیگی کبتک لڑائی کبتک عتاب کبتک

اور جینے کی آرزو کیا ہو؟
کیا بنا پایا اگر جیئے اب تک

کیا پاس دوستی جو رہا جانِ راز تک
تم فاتحہ بھی پڑھنے نہ آئے مزار تک

اتنا غبار سا وہ دلوں سے نکالیئے
کیوں اے نسیم آئی نہ مجھ خاکسار تک

صبحِ فراق کیوں نکروں انتظارِ مرگ
تھا زندگی کا لطف شبِ وصلِ یار تک

بشر کی صورت و سیرت کا دیکھنے والا
نظر پڑا ہمیں لاکھوں میں کوئی انسان ایک

گراں تھا چترِ ہما بھی جن کو سایہ
ہے اُنکے سر پہ اب بے انتہا خاک

نچھوٹے مر کے بھی آوارگی سے
پریشاں پھرتی ہے اب جا بجا خاک

اگر ہے ایک خوش قسمت سے اپنی
حسد سے جلکے ہو کیوں دوسرا خاک

اہلِ دنیا کی مروت کا بھروسا تا کے
جُز خدا کوئی بھی ہوتا نہیں ہر بار شریک

ذرق ایمان میں ہی صورتِ انساں میں نہیں
بات سچ کہیئے تو ہوتے ہیں ابھی برہم لوگ

خنجر کا نہ پیکان کا نہ تلوار کا گھائل
ہے عاشقِ شیدا نگہ یار کا گھائل

مرے بس میں کبھی اے دلربا اپنا نہ آیا دل
وہ کیسے ہیں جو کر لیتے ہیں قابو میں پرایا دل

خضر پیتا کبھی نہ آبِ بقا
ہوتی گر لذتِ فنا معلوم

دل کے آئینہ کی جلا مشکل
جب غبار آگیا صفا معلوم

سچ ہے کہ نردبانِ حقیقت مجاز ہے
ملتا نہیں خدا جو نہوں راہ پر صنم

بتخانے میں کبھی کبھی بیت الحرام میں
پھرتے ہیں ڈھونڈتے تجھے ہم دربدر صنم

زندگی کس طرح اے ریحان سکے
عاشقی سے جی کو بہلاتے ہیں ہم

سر آتشیں رو کا تصور ہے دلِ بیتاب میں
ہے چمک برقِ تجلی کی چہ سیماب میں

یوسف کو دیکھا دیدۂ بیدار نے تو کیا
ہے جسکی چاہ وہ نظر آیا نہ خواب میں

عاشقی کا تری کچھ لطف دلِ زار نہیں
یار اغیار کا ہے یار ترا یار نہیں

صدائے صور سے کمتر نہیں کچھ ٹکنے نالے ہیں
تب ہی تک خیر ہے جبتک طبیعت کو سنبھالے ہیں

عاشق شب وصال میں گھبرائے جاتے ہیں
پچھلے سے جان مرغ سحر کھائے جاتے ہیں

لائینگے آفتاب کو وہ اپنے جال میں
زلفوں کے بال خوب پیچ سکھلائے جاتے ہیں

تمکو قسم خدا کی خدا کے رسول کی
ہمسے چھپا کے خط کسے بھجوائے جاتے ہیں

آنکھوں پہ اختیار ہے اچھا نہ روؤں گا
کچھ آپ میرے دلکو بھی سمجھائے جاتے ہیں

ریحاں تمھیں خدا کی قسم سچ بیاں کرو
کس گلبدن کیواسطے گل کھائے جاتے ہیں

عاشقی کا تری کچھ لطف دل زار نہیں
یار اغیار کا ہے یار ترا یار نہیں

جو ہوا اُس سے ستم اپنے مقدر سے ہوا
شکوہ تقدیر سے ہے یار سے زنہار نہیں

تیرے لب کو نبات کہتے ہیں
ہم بھی کیا میٹھی بات کہتے ہیں

خواہ ثابت ہوں خواہ سیّارے
سبکو ہم بے ثبات کہتے ہیں

یہی اُسکی سزا ہے جو ہوا آوارہ اُلفت کا
صدائے روح مجنوں آجتک ہے یہ بیاباں میں

خبر دی آہ نے کیا یوسف گم گشتۂ دل کی
نسیم مصر بوئے پیرہن لے آئی کنعاں میں

میسّر وصل رشک گل نہ آیا جیتے جی ہمکو
گل حرماں لئے جاتے ہیں اس گلشن سے داماں میں

خوش ہوں بلبل کہ بہار آئی ہے پھر گلشن میں
پھول چن چن کے حسینوں نے بھرے دامن میں

جن میں فن دلبری کے ہوتے ہیں
آشنا کب کسی کے ہوتے ہیں

بد بھی کرتا ہے نیکی اپنے ساتھ
جبکہ دن بہتری کے ہوتے ہیں

مُنہ کفن میں جو چھپائے ہوئے ہم جاتے ہیں
ملک ہستی سے خجل سوئے عدم جاتے ہیں

کوچۂ یار سے کب اُٹھتا ہوں
توڑ کے اپنا پاؤں بیٹھا ہوں

بیمار عشق دونوں ہیں تدبیر کیا کریں
میں چشم کا علاج کہ دلکی دوا کروں

اے چشم پُرنم اے دل پُرزخم کیا کروں
رویا کروں کہ حال پہ اپنے ہنسا کروں

یہ بھی اُسی کی اے بت بے رحم شان ہے
بندہ خدا کا ہو کے میں سجدہ ترا کروں

حق دوستی کا کس پہ ہے اور دوست کون ہے
کہہ منصفی سے تو ہی ہیں کس کا گلا کروں

سوال کرتے نہیں گو زبان رکھتے ہیں
گدائے عشق بھی کیا آن و بان رکھتے ہیں

کسی کے حسد سے نہیں اپنا نقصان
بھلا اُنکا ہو جو بُرا چاہتے ہیں

زباں سے مشق کرتے ہیں سخن ہنر نکلتے ہیں
جو ہو صیقل زیادہ تیغ کے جوہر نکلتے ہیں

مصر سے کنعاں ہیں بوئے پیرہن آئی نہیں
مدتوں سے اپنے یوسف کی خبر آئی نہیں

مجکو کہتے ہو بُرا کوئی بھلا کہتا نہیں
تم ہی رسوا ہوتے ہو میری ہی رسوائی نہیں

بچ گئی جانِ حزیں اب کے خدا نے خیر کی
دل پھرا اپنا دوں تمھیں ایسا میں سودائی نہیں

نہیں کوئی احسان کو مانتا
مروّت کے قابل زمانا نہیں

سُنا ہے ہمنے کانوں سے عنقا کا نام
وفادار آنکھوں سے دیکھا نہیں

دوستی اُسنے نبھے یا نہ نبھے
دب کے رہنا ہمیں منظور نہیں

کیا مرض ہے دردِ دل جسکی دوا ہوتی نہیں
جب تلک مرتا نہیں کوئی شفا ہوتی نہیں

تو نے اے عشق جان کو ڈالا
کس اذیت میں کس مصیبت میں

یار سے جب فریب یار کریں
کہیے پھر کس کا اعتبار کریں

کسنے وعدہ کیا ہے سچ بولو
کرتے ہو اضطراب کی باتیں

دوستی میں نفاق کی باتیں
یہ بھی ہیں اتفاق کی باتیں

صحبت کا لطف اے دل آپس ہی میں تب عیاں ہو
معشوق قدرداں ہو عاشق فداجاں ہو

دیکھیں رقیب سے ہو یا ہمسے جاں نثاری
تیغِ ستم کا تیری دونوں پہ امتحاں ہو

اب بھی ہمسے غبار باقی ہے
قبر کو پائمال کرتے ہو

کہیے کس طرح سے بہلے گی طبیعت میری
آپ بھی جاتے ہو دل کو بھی لیے جاتے ہو

کدورت ناروا ہے دوستی جبتک رہے قائم
غبار کیے تو جیتے جی صفائی کا نہ ساماں ہو

دلِ پُر درد کیا سمجھے ہجوم صدمۂ غم کو
ضرر کچھ سنگِ باراں سے نہیں ہے نخلِ ماتم کو

نہیں قابل سماعت کے ہے ہجر کا نا رقیبوں کو
یہ ناحق گرم کرتے ہیں ادھر ہم کو اُدھر انکو

نہیں اک بوسۂ لب دین و دنیا سے زیادہ ہے
اگر تم مول لو ہم بیچتے ہیں دونوں عالم کو

بنایا دل کو محرابیں بنا کر کعبہ اے زاہد
خدا رکھے سلامت عاشقوں کے ناخنِ غم کو

حال میں تو بچا سننے آیا ہے مجھ دلگیر کو
کیا سُنوں ناصح تری اُلجھی ہوئی تقریر کو

ہے نگاہِ ناز بے پروا اداؤ ناز سے
کیا پر و پیکاں کی حاجت ہے قضا کے تیر کو

ہر طرح کے کام میں تائیدِ خالق چاہیے
ہم مقدم سمجھے ہیں تدبیر پر تقدیر کو

نہ لکھا کاتبِ قدرت نے تیرے صفحۂ دل پر
محبت کو، وفا کو، مہر کو، اُلفت کو، احساں کو

بھلایا اُس بتِ بد عہد نے کیا دفعتاً دل سے
قسم کو، قول کو، اقرار کو، وعدے کو، پیماں کو

محبت کا نتیجہ لے دل و جاں دیکھتے جاؤ
زیاں پر اک زیاں نقصاں پہ نقصاں دیکھتے جاؤ

ہجوم درد و رنج و یاس و حرماں دیکھتے جاؤ
ہماری لاش کے اُٹھنے کا ساماں دیکھتے جاؤ

بغل میں ہے بتِ پندار نفرت بت پرستی سے
بڑا دیندار ہے زاہد کا ایماں دیکھتے جاؤ

شہرۂ آفاق ہیں رنگیں بیاں اِس شہر کے
بلبلِ شیراز کرتا ہے ثنائے لکھنؤ

مجنوں کے آبِ اشک سے تر ہے تمام دشت
پھسلے نہ پاؤں ناقہ کا اے سارباں دیکھ

بوسے اِسی طرح سے دیئے جائیے اگر
واللہ ناگوار نہ ہوں گالیاں مجھے

جو بات آدمی نہ سُنے کیوں سُنائیے
ناصح نہیں پسند تیری داستاں مجھے

اب کہتے ہیں جواں مجھے طفلانِ خوردسال
تھوڑے دنوں میں پیر کہینگے جوان مجھے

اتنی کڑی تو ضعف میں جھیلی نہ جائیگی
ہوں ناتواں پہناتے ہو کیوں بیڑیاں مجھے

کہتا ہے یار میری طرف دیکھ دیکھ کے
اوروں کو ہے معاف نہ دیکھے فلاں مجھے

دلِ رنجیدہ کہتا ہے نہ بولوں یار سے لیکن
جب آنکھیں چار ہوتی ہیں مروت آ ہی جاتی ہے

چھپائے سے نہیں چھپتا ہے ریحاں نشۂ اُلفت
ضرور آنکھوں میں کچھ اس مے کی رنگت آ ہی جاتی ہے

اب کہاں ساقی کہاں شیشہ کہاں پیمانہ ہے
ہجر میں کیفیتِ وصلِ صنم افسانہ ہے

بڑی تکلیف تیرے ہجر میں او بے وفا پائی
ہم آزادوں کے دلکو شوقِ آسایش پسند ہی ہے
بے وصالِ جانِ جاں آرام دل دشوار ہے

خدا شاہد ہے ہمنے دل لگا کر کی سزا پائی
وہیں کچھ دیر ٹھیرے جس جگہ ٹھنڈی ہوا پائی
جان کو راحت نہیں تو زندگی بیکار ہے

زیادہ اِس سے بھی کیا شر کرے خدا جانے
جو میرے دل پہ گذرتی ہے غیر کیا جانے
ہیں کس خیال میں کس دھن میں ہیں خدا جانے
جان آگئی ہے آمدِ فصلِ بہار سے

اگر بشر کہیں جینے کی انتہا جانے
خبر ہے یار کو نہیں یار کو خدا جانے
کوئی کسی کی طبیعت کا حال کیا جانے
سوکھے ہوئے درخت دوبارہ ہرے ہوئے

کوئی دل اپنا دیتا ہے، کوئی ایمان دیتا ہے
اے بے خبر حیات کا کیا اعتبار ہے
کی وفا ہر چند ترک اُسنے جفا کاری نہ کی
اے صنم جو کچھ گذرتی ہے خدا آگاہ ہے
واہ رے شرطِ محبت واہ رے رسم کرم
دل کسیکو دیجئے کیا عشق سے دل پھر گیا
گھبرائیے نہ حضرتِ دل طعن خلق سے
محمود اُسکے پھندے سے نکلا نہ عمر بھر
پیامِ وصلِ دلبر لیکے جب قاصد پھرا میرا
دونوں عالم کو نہ لوں ایسا غنی دل ہو جائے

تمھارے واسطے ہر ایک اپنی جان دیتا ہے
ہر وقت موت سر پہ بشر کے سوار ہے
دشمنی کی جسقدر خونریز نے یاری نہ کی
یہ نہ کہیے لیجئے دل ہمنے دل آزاری نہ کی
ہمنے دل تمکو دیا اور تم نے دلداری نہ کی
جس سے کی ہمنے وفا اُسنے وفاداری نہ کی
وہ کیجئے جو جی میں ہو سینے ہزار کی
دامِ بلا تھی زلف نہیں تھی ایاز کی
پلٹ کر لیکے پھر سینہ میں جانِ بیقرار آئی
بے نیازی تری رحمت سے جو حاصل ہو جائے

جو مہلت قضائے الٰہی کرے گی
دعا ہے محبت کا انجام اے دل
علاجِ تپِ عشق کیا جانے عیسیٰ
محبت مجھے سبز فاموں کی ریحاں

تمام آپ کی کم نگاہی کرے گی
بھلائی میں بھی یہ بُرائی کرے گی
دوا اِس مرض کی قضا ہی کرے گی
نہ معلوم تھا زنگ کاہی کرے گی

خرد کہتی ہے کیا نا قدرداں سے ملکے پاؤ گے | محبت کہتی ہے دیکھوں ہیں تم کیونکر بچاؤ گے
برب کعبہ دل عشق سے نہ ہوگا صاف بندے کا | قسم اللہ کی مسجد میں بھی چلکے جو کھاؤ گے
اک جان پر ہزار طرح کی کڑی سہی | تھوڑی سی زندگی میں مصیبت بڑی سہی

عشق جی کا وبال رہتا ہے | زندگی بھر ملال رہتا ہے
مال کے دستیاب ہونے پر | کسکو خوفِ مآل رہتا ہے

ریحانی

ریحانی منشی محمد سجاد حسین مرحوم خلف منشی سید احمد حسن فرقانی متخلص بہ شاکی و باکی مرحوم رئیس میرٹھ مالک و مہتمم اخبار طوطی ہند اپنے والد مرحوم کے جو بڑے ذی لیاقت شاعر تھے شاگرد تھے سنہ ۱۲۶۸ھ سال پیدایش تھا سنہ ۱۳۱۰ھ میں انتقال کیا، بڑے جید فاضل و ذی استعداد سخنور تھے، انکے بھائی منشی کرار حسین روحانی سے بارہا کلام طلب کیا مگر باوجود اقرار وقت کے ہنگام طبع تک ترسیل کی فرصت نہوئی مجبوراً ایک غزل جو مسودہ میں پہلے سے موجود تھی درج کی گئی

انکی زلفیں میرے ماتم میں پریشاں ہوگئیں | مشکلیں جو جو پڑی تھیں مجھپہ آساں ہوگئیں
سب امیدیں جو رسائی کی تھیں زائل ہوگئیں | میری آہیں جب سے زیبِ طاقِ نسیاں ہوگئیں
زور پر تھا بحرِ گریہ پر بہ اچھا ہوگیا | دونوں آنکھیں میری کشتی ہائے طوفاں ہوگئیں
دعوی حسن خود آرائی زلیخا مٹ گیا | کیوں زنانِ مصر محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں
آرزوئیں کچھ نہیں جن کا لقب ہے کامیاب | مشکلیں کیا خاک ہونگی وہ کہ آساں ہوگئیں

ردیف زائے منقوطہ

زار

زار منشی برہان الدین خان زار شاہجہاں آبادی شاعر دربار اکبر شاہ ثانی فارسی اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، خط شکستہ لکھنے میں کمال حاصل تھا پہلے اکبر شاہ کے خواصوں کے زمرہ میں منسلک تھے پھر شعرا میں داخل ہوگئے۔

کیونکہ اُس بُت کو یہ حالِ دلِ بدنام لکھوں	کب وہ دیکھے ہے خدا کا بھی اگر نام لکھوں
چشم طوفاں خیز بھی اب گریہ پر تیار ہے	جسکے آگے اسے سیہ رُو ابر تو بیکار ہے
چرخ کے کیسے انقلاب ہوئے	پر کبھی ہم نہ کامیاب ہوئے

زار

زار لالہ بینڈولال زار بلگرامی خلف لالہ چندی لال شاگرد منشی طوطا رام عاصی، شاعر نامور ہندی فارسی میں صاحب دیوان تھے اور اُنکے شاگرد بھی بہت تھے، اُنکی انشا موسوم بہ گلزار فصاحت درسی کتب میں تھی، غازی الدین حیدر کے زمانے میں زندہ موجود تھے۔

گھر سے اُسے نکالا خدا کا بھی ڈر نہ تھا	دل قصہ خوان عشق تھا قضیہ کا گھر نہ تھا
باندھے وہ آج ہی نہیں پھرتا ہی خنجر	کس دن ہمارے قتل پہ باندھے کمر نہ تھا
تھا شو دنذر کرتا تمھاری وہ نقد جاں	گر تم بُلاتے زار کو گھر میں ضرر نہ تھا
جسدم دھواں اُٹھا دلِ پر اضطراب کا	گُل ہوگیا فلک پہ چراغ آفتاب کا

کون کرتا میکشوں کی گور پر روشن چراغ	ہمکو چشمِ غول ہے گویا سرِ مدفن چراغ
کام کیا ہے شمع کافوری سے اور فانوس سے	گور ہے فانوس داغ دل ہے یاں روشن چراغ
یار کے آنے میں کیا ہے شمع کافوری ضرور	ہونگے اُسکے نور سے دیوار و کلے روشن چراغ
اشک گر جاری نہوں ہو کیا سینہ کا داغ	عمر بھر جلتے نہیں دیکھا ہے بے روغن چراغ
جان سے گذرے جو عاشق غم نہو معشوق کو	موت پر پروانے کی کرتا نہیں شیون چراغ
اُسنے زلفیں کھولدیں یاں داغ غم کم ہوگیا	زار سچ ہے سانپ کے آگے نہ ہو روشن چراغ

یہ آتشِ غم یار کی محفل سے لگی ہے ۔۔۔ اے شمع ترے سر سے نہیں دل سے لگی ہے

آنکھ اپنی بہت حور شمائل سے لگی ہے ۔۔۔ تربت بن گئے جنت کی ہوا دل سے لگی ہے

لیلیٰ رگِ جاں قیس کی کھنچ آئی ہے شاید ۔۔۔ ڈوری یہ نہیں پردۂ محمل سے لگی ہے

تلوار یہاں پہنچا ہے مری خاک کے بارے ۔۔۔ مٹی تو یہ کہتا ہے کفِ قاتل سے لگی ہے

آوینگے مرے پاس پئے قتل وہ کیونکر ۔۔۔ مہندی کفِ پائے بتِ قاتل سے لگی ہے

زار

زار۔ لالہ دھنپت رائے زار خلفِ لالہ شنکر لال بہادر ماہدن زاد و راجہ کندن لال رئیس بریلی مقیم لکھنؤ، خواجہ وزیر لکھنوی کے تلامذہ میں بڑے استعداد اور جوہر کامل تھے، فارسی زبان کے زبردست ماہر تھے، اردو کی طرف بہت کم توجہ تھی، فارسی میں صاحب تصانیف بھی تھے الغرض ذی لیاقت، ذی مروت شخص تھے، غدر کے بعد انتقال کیا۔

میری طرح کسی پہ تمھارا جو آئے دل ۔۔۔ سینہ پہ ہاتھ رکھ کے کہو ہائے ہائے دل

کیونکر تمھارے روئے صفا تک آئے دل ۔۔۔ اس درجہ ہے صفا کہ پھسلتا ہی جائے دل

داغوں پہ داغ صدموں پہ صدمے اٹھا چکے ۔۔۔ دیکھیں ابھی یہ اور نہ کیا کیا دکھائے دل

میں گر بیاں کروں جو بھریں آپ آہ سرد ۔۔۔ کیا خوش ہوں گر کسی پہ تمھارا بھی آئے دل

صبحِ عذار و گیسوئے شبگوں دکھائیے ۔۔۔ صدمے یہ رات دن کے کہاں تک اٹھائے دل

زار

زار۔ حافظ امام بخش لکھنوی بیاض عزیزیہ قاضی محمد خلیل سے ایک شعر نقل کیا جاتا ہے۔

آشنا ہوتی ہے اس لب سے جو دشنام تو ہم ۔۔۔ دل میں کہتے ہیں کہ دشنام ہمیں کیوں نہ ہوئے

زار

زار۔ مرزا مظفر علی سرکار محمد علیخان شوکت جنگ میں ملازم تھے، غدر سے کم و بیش پچیس ۲۵ سال پیشتر انتقال کیا، کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتے تھے یہ انکا کلام ہے، شرف الدین حمار نے انکا نام مظہر علی لکھا ہے

فصلِ گل کی کچھ ہوئی آمد کہ اس دل کے تئیں ۔۔۔ شور و غل طفلوں کا اور دہشتِ جنوں چھانے لگا

ایک تجھکو زار کے احوال پر آیا نہ رحم ۔۔۔ ورنہ ہر اک حال اس کا دیکھ غم کھانے لگا

چھوٹ جاویں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں ۔۔۔ خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں

ایک دن گے ہی دنیا سے اُٹھانا ہمکو
یا الٰہی شب فرقت نہ دکھانا ہمکو

اب رہائی کے لئے کیا او پریشاں مجکو
خوب تھا اِس سے وہی گوشۂ زندان مجکو

اگر کچھ بس بھی ہوا پنا تو کا ہیکو یہ خواری ہو
نچا ہیں اُسکو لے ناصح جو الفت اختیاری ہو

زار — منشی احمد حسین زار غدر سے پیشتر دہلی میں موجود تھے۔ اور کچھ حال معلوم نہ ہوا۔

تو کرے امتحاں میری وفا کو
خوشی سے آزما تیغ جفا کو

تجھے کیونکر کوئی ڈھونڈے کہ جس جا
نہ ہو یارا پر مرغ صبا کو

لب جاں بخش کے تیرے مقابل
نہیں کچھ آبرو آب بقا کو

تڑپتا مجکو چھوڑا نیم بسمل
نہ آیا رحم کچھ اُس بیوفا کو

مجھے رکھ قبر میں ای زار وہ شوخ
چلا کہکر تجھے سونپا خدا کو

زار — میر امداد علی زار حیدرآبادی نبیرہ نواب مکرم جنگ بہادر شاگرد میر بادشاہ علی صاحب ضیا لکھنوی

وصل کی رات تھا عیش کا ساماں ہوتا
دل پُر داغ مرا سرو چراغاں ہوتا

کیا غرض تھی جو چڑھا جاتا لحد پر دو پھول
کیوں گذر تیرا سوئے گور غریباں ہوتا

نہ دخت رز کا ہوتا محرموں میں زاہد ذکر
تو اس کا نام بھی جب لے تو باوضو ہوکر

غم جدائی دلدار ایک مدت سے
مقیم خانۂ دل میں ہے آرزو ہوکر

کب نہ بلبل کا دل خزاں سے جلا
کب نہ چٹکے گل وہ نوحہ گر نہ ہوئی

زار — میر محمد ہادی زار لکھنوی شاگرد عشق مرحوم داماد میر واجد علی داروغہ تعلقدار انکے والد میر عابد علی فوج شاہی میں کمیدان تھے ۱۸۶۵ء سال پیدایش ہے +

بھیڑ اسدر پہ تھی ارمان غم و حسرت کی
پاس میرے ملک الموت کو آنے نہ دیا

لطف ملتا تھا جو آفاق میں غم کھانے سے
وہ مزا گلشن جنت کی غذا نے نہ دیا

مثل شمع سحری کچھ بھی نہ تھا دم بھر میں
اختر بخت جو چمکا بھی تو جگنو ہوکر

[1] گلشن ہمیشہ بہار میں یہ شعر میر حیون کشمیری دہلوی شوریدہ کے نام سے درج ہے۔

دلکی فریاد و فغاں سے ہے قیامت برپا	کب پتہ چلتا ہی پہلو میں جگر ہے کہ نہیں
دمِ رخصت جو کہا ہیں نے نشانی کچھ دو	ہنسکے فرمانے لگے وردِ جگر ہے کہ نہیں
رکھکے تربت ہیں چلے جاتے ہیں سارے احباب	بیکسی تو ہی ٹھہر پاس کہ تنہا ہوں ہیں
اُفتادہ تیرے پہنچیں گے کیا قتل گاہ ہیں	ہر گام پر ہے ضعف قدمبوس راہ ہیں
سُرمے کے پھیلجانے کی کیا وجہ کیا سبب	برچھائیں بھی کیا تیرے تیز نگاہ ہیں
باغوں ہیں تیرے عارض و خط کی بہار ہے	سُرخی جو پھول ہیں ہے تو سبزی گیاہ ہیں
دُنیا اُلٹ گئی جو ذرا آنکھ پھیر لی	عالم کے انقلاب ہیں اُنکی نگاہ ہیں
تہ و بالا زمانے کو کرے گا بیقراری سے	کہاں ہے عرش کے حامل ذرا روکیں مرے دلکو
برپا کیا وہ حشر کہ دُنیا تباہ کی	دِل تھام کر جو عاشقِ مضطر نے آہ کی
قاتل کی ترچھی نظروں سے دِل زیرِ تیغ تھا	برچھی چلی جگر پہ جو سیدھی نگاہ کی
اچھا کیا جو قبر کو روندا پسِ فنا	یہ بھی تو آرزو تھی ترے بے گناہ کی

زار۔ **زار** ۔ منشی رحم الہیٰ خلف مولوی غلام دستگیر ساکن مارہرہ ضلع ایٹہ ۱۲۶۷ ہجری ہیں پیدا ہوئے معمولی فارسی تعلیم کے بعد الہ آباد وغیرہ ہیں بسلسلۂ ملازمت گورنمنٹ مقیم رہے، ذہین اور خوش مزاج آدمی ہیں، اور نہایت نحیف و زار ہیں، شوق سخن ابتدائے عمر سے رہا، اپنا کلام احسن مارہروی کو دکھا لیتے ہیں ؎

وہ باتوں ہیں ہرگز نہیں آنے والے	اُنھیں کیا سمجھتے ہیں سمجھانیوالے
بھلا ہم کہیں ترکِ اُلفت کریں گے	نہ بہکائیں اب ہمکو بہکانیوالے
یہی جھوٹی سچی لگاتے ہیں باتیں	اِدھر آنیوالے اُدھر جانیوالے

زار۔ **زار** ۔ سید حسن عسکری صاحب خلفِ جناب منشی علی حسن صاحب مرحوم شاگرد جناب شہیر رئیس مچھلی شہر نواح جونپور ۱۸۸۸ء ہیں جوان تھے اور زیادہ حال معلوم نہوا ؎

رہنے کو سر تھا پائے صنم پر وہ رہگیا	جانے کو دم تھا چشم زدن ہیں نکل گیا

باغ میں آئی ہے بہار افسوس	قید ہے عندلیب زار افسوس
توڑتے ہم کبھی نہ توبہ کو	کیا کریں آگئی بہار افسوس
خود ہی کرتے ہو ظلم عاشق پر	خود ہی کرتے ہو بار بار افسوس
کیوں دیا بے وفا کو دل صد حیف	کیوں کیا ہمنے اسکو پیار افسوس
ہم رہا بھی ہوئے نہ تھے صیاد	چل بسی باغ سے بہار افسوس
دل ہی جب ہو نہ اپنے قابو میں	کیا کسی پر ہو اختیار افسوس

میرے مرنیسے مسرت دشمنوں کو بھی تو تھی	دوست تھے تم تمکو اس درجہ خوشی کا ہیکو تھی
سر جھکا کر چلتی تھی مقتل میں تیری تیغ کیوں	بسملوں سے اسقدر شرمندگی کا ہیکو تھی
ہر گھڑی زندگیٔ رفتہ کے ماتم میں رہے	جب سے ہوش آیا ہمیں تب سے اسی غم میں رہے
عمر بھر ان کی پریشانیٔ خاطر نہ گئی	قید ہو کر جو ترے گیسوئے پر خم میں رہے
داغ کا نام جو سنتا ہوں تو یہ کہتا ہوں	یا تو لالے میں رہے یا دل پر غم میں رہے

زار — محمد عبد القادر صاحب خلف اکبر مولٰنا حکیم فیاض علی صاحب مرحوم متوطن عظیم آباد پٹنہ تحصیل علم فارسی و عربی اپنے نانا سید شاہ ابو تراب کے چھوٹے بھائی مولانا حکیم سید شاہ محمد واعظ عظیم آبادی سے کی تھی اکیس سال کی عمر میں تحصیل علم سے فارغ ہو کر کسب معاش کی طرف متوجہ ہوئے، وکالت کا امتحان پاس کیا، بارہ برس وکالت کرنے کے بعد ہزار ہا روپیہ کی املاک پیدا کر کے دفعتًہ آپ کو خیال آخرت پیدا ہوا اور وکالت ترک کر دی کر جناب حضرت سید شاہ میاں جان رحمتہ اللہ علیہ سے بمقام دہلی بیعت حاصل کی اور وہیں سے حج کعبہ کو چلے گئے، آپ نہایت منکسر سبز چشم، خوش وضع، خوش تقریر، عالی خاندان شخص تھے، پندرہ جمادی الاول ۱۳۲۵ھ بمقام پٹنہ عالم جاودانی کی طرف راہی ہوئے کلام کا انتخاب درج ذیل ہے

ہے نہ کچھ شیریں کلامی اور نہ ایسا با نمک	ہاں کلام زار محزوں ہے مگر پھیکا نمک
حسن پر پس پس گیا ہے اسکے سنرا پا نمک	دست قدرت نے اسے کیا کیا ہے بخشا نمک

حُسنِ انسانی نہیں انسان کا جز حُسنِ خُلق	ہے غرور اُس کا تواضع حسنِ ظن اُسکا نمک
ہے کمالِ ظہور سے مخفی ذکر اللہ کا ہو جس دِل میں میرے کہنے پہ کیوں بگڑتے ہو اور کچھ ہم تمھیں کہیں نہ کہیں	اِس خفا کو ظہور کہتے ہیں اُسکو دارالسرور کہتے ہیں کیا غلط ہے جو حور کہتے ہیں بے وفا تو ضرور کہتے ہیں
شوقِ نظارہ میں ٹھیری ہے لبوں تک آکر ہے اُسکے تصور سے مرے دل میں جو تصویر بلبل یہ کہہ رہی ہے گلوں سے پکار کے کس رشکِ آفتاب کا اُس پر قدم پڑا	جان جاتی بھی نہیں اور وہ آتے بھی نہیں دل اپنا کہیں اس سے بہلجائے تو جانیں کچھ اب کے سال رنگ نئے ہیں بہار کے ذرّے چمک رہے ہیں ہمارے غبار کے
اِن دنوں زور ناتوانی ہے	میری پیری کی اب جوانی ہے

زار

زار ـ مولوی احسان الحق زار لکھنوی وظیفہ خوار دولتِ آصفیہ حیدرآباد حکیم نیاز احمد خان ہوش بریلوی کے تلامذہ میں سے تھے اس سے زیادہ حال معلوم نہیں ؁

بلبلوں سایہ پڑا عکسِ گلِ رخسار کا	رنگ آتا ہے نظر بدلا ہوا گلزار کا
کیا اطبا دم بخود کیوں ہوں نہ عیسیٰ بھی یہاں گرمی بازار یوسف کی کہاں تھی اِس قدر ڈالے چادر کی جگہ یار جو دامن اپنا جان دی یادِ رخِ یار میں کیا دور ہے یہ	ہو نہ جب ممکن علاج اِس عشق کے بیمار کا اک جہاں دل دیکے طالب ہے ترے دیدار کا پھیلے یہ چاندنی پُر نور ہو مدفن اپنا دے کفن کے لئے خورشید جو دامن اپنا

زار

زار ـ پنڈت تربھون ناتھ صاحب زار کشمیری دہلوی خلف الرشید پنڈت پرتھی ناتھ صاحب زتشی مرحوم ناظم محکمہ حفظانِ صحت ریاست پٹیالہ، پرورش تعلیم و تربیت لاہور میں پائی اور ایام طالب علمی ہی میں حضرت داغ دہلوی کے تلمذ سے بہرہ ور ہوگئے، طرزِ گفتار پر لطف ہے، مضامین خوب الفاظ مرغوب، بندش چست، خوش بیانی میں فرد ہیں ۱۸۷۸ء

سال پیدائش ہے، انگریزی فارسی، اردو ہرسہ زبانوں میں استعداد علمی معقول ہے، پہلے کئی برس دفتر اگزیمینر آف اکونٹس لاہور میں کلارک رہے اب اکوسٹنٹ ہیں، اوائل میں شمیم تخلص کرتے تھے، پھر زار تخلص اختیار کیا۔ شعر گوئی کا اب آٹھ دس برس سے کم اتفاق ہوتا ہے، راقم تذکرہ کے کالج کے ہمدرس تھے، اسی زمانے کی فکر کے کچھ مسودے ان کے دیئے ہوئے عرصہ سے تذکرے کے فائلوں میں پڑے تھے، ہنگام نظرثانی انکا انتخاب درج کیا

سر کو سودائے لب جاں بخش جاناں ہی رہا
دل ہمارا قیدِ دامِ زلفِ پیچاں ہی رہا
پہلے تھا ہندوئے گیسو کا اور اب تل کا خیال

دل ہمارا آشنائے آبِ حیواں ہی رہا
عشق میں بھی قائل توحید یزداں ہی رہا
کعبۂ دل اپنا دائم کافرستاں ہی رہا

اُٹھا جو روئے صنم سے نقاب محمل کا
خلش جگر میں وہ پیکاں کی درد وہ دل کا
جگر پہ، سینہ پہ، پہلو پہ، دل پہ، وار کرو
ہے دل میں جلوہ فگن اپنے وہ شۂ خوباں
الٰہی قدر یہ کہوں ایک دل کو کس کس جا
ملے تھے زار سے ہم، اب تو مر گیا ہوگا
جناں سے بورشِ اعلیٰ تمھاری بزم سے ہم
مے سے لبریز ہے ایاغ اپنا
گر کان جواہر لکھوں اے زار تو ہے ٹھیک
میناے مے جو پھینک دی بیوجہ تو نے شیخ

فلک پہ پھیکا پڑا رنگ ماہ کامل کا
وہ لب پہ آہ و فغاں وہ تڑپنا بسمل کا
نکالو خوب مری جان حوصلہ دل کا
بہت بلند ہی رتبہ اس اُجڑی منزل کا
نگہ کا، دید کا، مژگاں کا، زلف کا، تل کا
تڑپ رہا تھا یہ تھا نام لب پہ قاتل کا
کچھ ایسے نکلے کہ کوئی کبھی نہیں نکلا
ساقیا دل ہے باغ باغ اپنا
بیجا نہیں دعوی ہے اسے سیمبری کا
کم ظرف یہ بنا تو سہی تجھکو کیا ملا

جی بھر کے سنا لے مجھے اے راحتِ جاں اور
ظاہر ہوئے صاحب میں قیامت کے نشاں اور
یوں چاہنے والے تو بہت تم کو ملیں گے

مجھ جیسا ترے ظلم کو دنیا میں کہاں اور
سینے پہ دم ابھرنے لگے دو دشمن جان اور
دنیا میں مگر زار سا شیدائی کہاں اور

ایک بوسہ کے طلب گار ہیں ہم
اور مانگیں تو گنہگار ہیں ہم

بادۂ عشق سے سرشار ہیں ہم
دامِ گیسو کے گرفتار ہیں ہم

بے وفا طرزِ وفا بھول گیا
با وفا جیسے کبھی تھا ہی نہیں
دل ہمیں چھوڑ کے اس طرح گیا
جیسے پہلو میں کبھی تھا ہی نہیں

خدا جانے سوالِ وصل پر کیا رنگ لا بیٹھے
بگڑے جاتے ہیں ٹیڑھے ہیں میں تو اک بوسہ کا سائل ہوں
گیا جب بیٹھ کے کچھ طرز آ مجھے کہنا ہے کیوں آئے
وہی جلاد ہوں خونخوار ہوں، ظالم ہوں قاتل ہوں
نہ پوچھو ہمنشینو حالِ دورِ عیشِ ہجراں میں
خزاں ہوں ہیجانِ عالم ہوں زار ہوں بسمل ہوں گھائل ہوں

پہلو میں میرے دیکھ کے اس گلعذار کو
گل کھا گئے ہیں سینکڑوں نے حسد سے ہزار کو
میں جانتا ہوں آپ کے قول و قرار کو
سمجھاؤں کہہ کے کیا میں دلِ بیقرار کو

بے پردہ اگر حشر میں وہ فتنہ گر آئے
خورشیدِ قیامت کو حقیقت نظر آئے
بل کھا کے اگر زلف تری تا کمر آئے
ظلمات کا رستہ ہمیں سیدھا نظر آئے
یادِ رخِ محبوب میں پھر اشک بھر آئے
پھر نوکِ مژہ پر مرے لختِ جگر آئے
سینہ ترا جب دیدۂ مشتاق سے دیکھا
اٹھے ہوئے دو فتنے برابر نظر آئے

دم لیتا ہے رک رک کے مرے ذبح میں قاتل
اس وقت بھی ظالم کی نزاکت نہیں جاتی
کچھ ایسا مزہ ملتا ہے اس ہٹ کے ستم میں
مر مر گئے پر جینے کی حسرت نہیں جاتی
شوخی میں تغافل ہے رکاوٹ میں لگاوٹ
تیری نگہِ یار شرارت نہیں جاتی

باہر وہ نظر آئے ہیں کہ جی جانتا ہے
داغ بھی ایسے اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے
فتنہ پرداز، ستمگار، جفاجو، قاتل
تو نے وہ فتنے اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے
چھیڑ کر زخمِ جگر ناوکِ مژگاں میرا
تو نے وہ تیر لگائے ہیں کہ جی جانتا ہے

جاں بلب ہوں مر رہا ہوں عشق کا آزار ہے
رنج مونس، یاس ہمدم، غم گلے کا ہار ہے
کیا کہوں نوکِ مژہ جب سے جگر کے پار ہے
درد بھی اٹھتا ہے تو میٹھا عجب آزار ہے
ہے نسیمِ صبح، یا بادِ صبا، یا بوئے گل
برقِ خرمن سوز یا ظالم تری رفتار ہے
شعلہ ہے مشعل ہے، یا ہے شمع یا ہے آفتاب
ہے تجلی طور کی یا جلوۂ رخسار ہے

روزِ وعدہ، دیکھنا ذوقِ وصال
صبح سے ہم منتظر ہیں شام کے

ہائے کب لے آسمانِ فتنہ ساز
دن پھرینگے عاشقِ ناکام کے

مرگیا گھل گھل کے زارِ نیمجان
عشق میں افسوس اِک خود کام کے

زار

زار منشی بانکے لال باشندہ بدایوں سنہ ۱۸۸۳ء میں چھاتہ میں مقیم تھے اور نیاز خیرآبادی سے اِصلاح لیتے تھے سنہ ۱۸۸۶ء میں امیر مینائی سے اصلاح لینے لگے پھر سنہ ۱۸۸۹ء میں گورکھپور گئے

وعدہ جو کچھ کیا بھی تو تیور بدل لیے
اقرار سے عیاں ترے انکار ہی رہا

عیسیٰ بھی سر پٹک کے فلک پر چلے گئے
بیمار تیرے عشق کا بیمار ہی رہا

زاہد تجھے قسم ہے ذرا چکھ کے دیکھ لے
کیسی کھنچی ہوئی یہ مئے خوشگوار ہے

کیا خاک آئے مجمعِ محشر نگاہ میں
دیکھے ہیں ہمنے رنگ تری جلوہ گاہ کے

کہتے ہیں آج موت سے میری جھڑک کے وہ
ہٹ، آ نہ پاس بسملِ تیغِ نگاہ کے

جھرمٹ میں زار ہیں وہ حسینوں کے اس طرح
گویا ستارے گرد چمکتے ہیں ماہ کے

دفترِ عشق کے برہم ہوئے سارے اوراق
ہاتھ جب دیکھے میرے یار نے بچپن کیا
ہیں کجا غیر کجا اس سے الجھنا کیسا؟
کسکو ہر بار جلائیں گے کرشمے تیرے

اٹھ گئی پردہ دنیا سے وفا میرے بعد
رنگ لایا ہے نیا رنگِ حنا میرے بعد
منہ کی کھائے نہ کہیں تیغِ ادا میرے بعد
ہر ادا پر کسے آئیگی قضا میرے بعد

جو دیکھ لیتا نگاہ بھر کر تو اپنے بسمل کو اے ستمگر
نہ کرتی بچپن نوکِ نشتر کھٹک کھٹکر کھٹک کھٹکر

کہا داستانِ غمِ ہجر سنکر
بیخبر سے ہے سازگاری آج کل
بادل آرائے و مینائے بدست
مدتیں گذریں ہیں سنتے ہوئے

یہ قصہ ہے سننے سنانے کے قابل
کون سنتا ہے ہماری آج کل
خوب کٹتی ہے ہماری آج کل
ختم بھی ہوگی تمھاری آج کل

موہوم ہے خود اپنے گماں میں مری ہستی
میں زیر بارِ منتِ ساقی نہیں ہوا

عنقا تری تصویر کا خاکہ تو نہیں ہیں
وہ رند ہوں کہ مست ہوں بوئے شراب میں

تم آئے نہ موت آئی لاچار اسے کہتے ہیں
جیتے ہیں نہ مرتے ہیں آزار اسے کہتے ہیں

ہوتا ہی نہیں فیصل جھگڑا ہے قیامت کا
ہے حشر ہی ایک محشر تکرار اسے کہتے ہیں

تم خاک مسیحا ہو جب کر نہ سکے اچھا
موت آئی عیادت کو بیمار اسے کہتے ہیں

تم ابھی آئے ابھی جاتے ہو
ایسا کیا نام گنا تا تھا مقیں

گو عیادت کو نہ آئے نہ سہی
مہری ہیبت پہ لو آتا تھا مقیں

حیرت ہے مری چشم تصور کو کچھ ایسی
کچھ ہو کہ نہ ہو سامنے تم پیش نظر ہو

زاہد کو عبادت پہ گھمنڈ ہم کو خدا پر
تم اپنی کہو حضرت ناصح کہ کدھر ہو

ابر رحمت گھرا ہے چو طرفہ
ساقیا آج تو نکر صرفہ

آئینہ کو بھی چھیڑ ہے اُن سے
منہ پہ کہہ کہہ کے منہ کی کھاتا ہے

میں تجھے بھول کر نہیں بھولا
تو مجھے جان کر بھلاتا ہے

کوئی پہلو سے لے گیا دل کو
آپ پر بھی گمان جاتا ہے

وہ آجاتے تو کسر تھی کوئی دم کی
قضا جانے کہاں سے آن دھمکی

نوید وصل پر غش کیوں نہ آتا
یہ برق طور تھی جو دل میں چمکی

ہوئے آباد ویرانے تھے جتنے
یہ برکت ہے ہمارے دم قدم کی

حال دل سنکر وہ فرمانے لگے
جھوٹا قصہ ہے مگر پُر درد ہے

دم نزع نہ جا منہ پھیر کر پہلو سے بسمل کے
نکلنے دے ذرا تو حوصلے حسرت بھرے دل کے

بہار ہجراں حاصل ہے یاد چشم میگوں میں
تڑپنے سے ہرے ہو جاتے ہیں ناسور چھل چھل کے

کر سکے اظہار بے کلی دل کی
بات کھو دی رہی سہی دل کی

ہے تصور میں کوئی غنچہ دہن
جا نہیں سکتی بے کلی دل کی

وقت رخصت نہ کہہ سکا کچھ بھی
دل ہی میں ہائے رہ گئی دل کی

سانس کے ساتھ ٹیس ہے لے زار
حالت ایسی کبھی نہ تھی دل کی

بازگشتی تیر ہی بن کر مجھے گھائل کیا
نالہائے نارسا اُلٹا ستم ڈھانے لگے

زائر

زائر - منشی سید علی حسین زائر کلرک دفتر کمسریٹ لاہور (۱۸۹۶ء) اس زمانے میں جو لاہور میں مشاعرے ہوا کرتے تھے اُن میں شریک ہو کر غزلخوانی کیا کرتے تھے، یہ چند شعر اُنکے نتائج افکار سے ہیں۔

جمع کس طرح سے اِس خستہ کا دیوان ہوگا	جس کا مجموعۂ خاطر بھی پریشان ہوگا
کھائیگا دانتوں پہ ہیرے کی کنی دُرِ عدن	لب سے شرمندہ ترے لعلِ بدخشان ہوگا
پنجۂ دستِ جنوں بڑھنے نودے اے وحشی	جیب ہوگی تری دامن نہ گریبان ہوگا
لے اجل تو تو مجھے آنا ہے اک روز ضرور	ہجرِ جاناں میں جو آجائیگی احسان ہوگا
فرقتِ گلزارِ خوبی نے کھلائے خوب گُل	سینہ داغوں سے مرا رشکِ گلستان ہوگیا
کیفیت ہے آج بیہوشی کی بزمِ حور میں	دے مے گلرنگ ساقی ساغرِ بلور میں
ہیں تو ام البتہ نیش و نوش عالم میں لا	قت ہوتا ہے ہمیشہ خانۂ زنبور میں

زاہد

زاہد - شاہزادہ میرزا زاہد الدین زاہد ابن میرزا کام بخش خلفِ میرزا سلیمان شکوہ شاگرد خواجہ آتش، لکھنؤ میں جو دہلی کے شاہزادوں کا خاندان رہتا تھا اُسکے ایک رُکن تھے وہیں عرصہ ہوا انتقال کیا۔ کلام ملاحظہ ہو

چھُٹ جائے جان زلفِ شبِ غم کے دام سے	اپنی کشش سے اُسکو اگر کھینچ لائے دل
اُس برق وش کے ہجر میں کیا جان کھویئے	ہر دم جو بات بات میں اپنا جلائے دل
بے وجہ تیرے دام محبت میں اے پری	دیوانہ ہے جو بیٹھے بٹھائے پھنسائے دل

زاہد

زاہد - برہمچاری پرم آنند جی دہلوی منشی دیبی پرشاد بشاش ملازم ریاست جودھپور مؤلف تذکرۂ شعرائے ہنود کے گرو تھے، علم تصوّف و باطن سے خوب ماہر تھے، سنسکرت کے علاوہ اُردو فارسی میں بہت اچھا دخل حاصل تھا، فارسی اُردو زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ کلکتہ بنارس۔ راجپوتانہ کی اچھی طرح سیر کی تھی۔

تلاشی کیوں نہ لی باد صبا اے باغبان گل کی	گیا ہے دل ترے گلزار سے چوری عنادل کا

چشم بلبل سے یوں بہے آنسو	گل پکارے کہ آب جو آیا

زاہد

زاہد - میرزا مصطفےٰ حسین۔ منشی عباس حسن فصاحت کے تلامذہ میں ہیں اور منشی نولکشور کے مطبع میں مصوری کرتے ہیں۔ چند شعر درج کیے جاتے ہیں۔

ایک جلوہ میں تو آیا طور پر موسیٰ کو غش	دیکھیں گے وہ کیا رخ پر نور جاناں کی طرف
شیخ جی کا آج عمامہ اُچھالا جائے گا	شامت آئی ہے چلے ہیں بزم رنداں کی طرف
کیوں ہنس کے دیکھتے ہو مرے داغہائے دل	کیا اپنے اچھے پھول تمہارے چمن کے ہیں
کپڑے بدلکے غیر کے گھر وہ سدھارے اُدھر	ساماں اس طرف مرے گور و کفن کے ہیں
بھلا کیونکر وہ پہنے پھولوں کے ہار	کہ خود جنکی رگ گل سی کمر ہو
تڑپ کر جان بھی دیدوں جو زاہد	نہ میری بے خبر کو کچھ خبر ہو

زاہد

زاہد منشی ولایت حسین اکبرآبادی شاگرد اعظم مرحوم، بیاض قاضی خلیل سے کلام نقل ہوا۔

خدا کے واسطے فرقت زدوں کو مت چھیڑو	نہ پوچھو یہ کہ کٹی کس طرح تمہاری رات
قضا پکار رہی ہے یہ لاشِ زاہد پر	وہ لب ہلائیں تو آجائے جسم زار میں روح

زاہد

زاہد - جناب سید عابد حسین صاحب تحصیلدار علاقہ نواب حامد علیخان ضلع نیپال گنج ہمشیرزادہ وشاگرد جناب عزیز لکھنوی ۱۸۸۶ء کے مشاعروں کا کلام ہے۔

اب کیا کہوں جو ہجر میں حال ای حضور تھا	بیتاب مجھ سے بڑھکے دلِ ناصبور تھا
نازاں تھے اپنی شوخ نگاہی پہ وہ اگر	بیتاب ہوں یہ دلکی مجھے بھی غرور تھا

زاہد

زاہد - سخنور شوخ طبع سید زاہد حسین زاہد ابن سید علی حسین مرحوم سادات موسوی اثناعشری اور عمائد سہارنپور سے ہیں آپنے جو حالات لکھکر بھیجے اُنکا یہ خلاصہ ہے کہ انکے جدِّ اعلیٰ سید عبدالہادی عرف شاہ چراغ سلطان محمود غزنوی کے ہمراہ ہندوستان آئے حضرت زاہد کے دادا حاجی سید اکبر علی مرحوم پہلے مالیر کوٹلہ کی ریاست میں ملازم رہے، پھر بہادر شاہ بادشاہ کی سرکار میں معتمدی و وکالت کے عہدہ پر ممتاز ہوئے اور اُسی زمانہ میں لارڈ کمبر میر کمانڈر انچیف ہند کے میر منشی کے عہدۂ جلیلہ پر بھی فائز رہے، حضرت زاہد کے والد ڈیرہ دون میں وکالت

کرتے تھے لیکن اُنکا انتقال اُنکی صغر سنی میں ہوگیا اس لیے جو کچھ قابلیت انھوں نے بہم پہنچائی اُسے اپنے دلی شوق اور رغبت کا نتیجہ کہنا چاہیے۔ فارسی کی درسی اور عربی کی ابتدائی کتب قاضی محمد غلام عباس منیر شاگرد خواجہ آتش و حضرت دبیر سے اور بعض کتب مولوی غلام حسین شاگرد مولانا صہبائی سے پڑھیں اور انٹرنس کے درجے تک انگریزی مدرسہ میں بھی پڑھا۔ خداداد ذہانت اور ذوقِ سلیم کی امداد سے اچھی استعداد اور قابلیت حاصل کر لی اور کتب بینی کے شوق سے اُسے درجہ بدرجہ ترقی ہوتی چلی گئی۔ فنِ شعر کا مذاق فطرتاً طبیعت میں موجود تھا اور شفیق استاد کی فیضِ صحبت اور توجہ سے اُس میں فی الجملہ اچھی استعداد بہم پہنچا لی ۱۸۸۶ سے حضرت امیر کے دمِ آخر تک تخمیناً سترہ اٹھارہ برس اُنسے اصلاح کا سلسلہ جاری رہا محاورۂ زبان کی تحقیق و چھان بین کا بےحد شوق رہا۔ اپنے استاد کے عقیدت مند تلامذہ میں رہے اور اُنکی خدمت بھی کرتے رہے، چنانچہ امیر اللغات کی ترتیب میں بھی حصّہ لیا شعر گوئی بطور تفنن طبع کے ہے ورنہ اس سے صلہ و شہرت کے طالب نہیں ہوئے، کلام میں کثرتِ مشق سے روانی اور پختگی اور بندش میں چستی اور زبان میں شیرینی اور گھلاوٹ پیدا ہوگئی ہے تخلص کے برعکس انکے اکثر اشعار میں معاملہ بندی، رنگینیِ خیال، اور شوخی کے مضامین پائے جاتے ہیں، زبان میں صفائی اور مضمون میں جدت کا زیادہ لحاظ رکھتے ہیں خوشنویس بھی ہیں۔ خلیق۔ متواضع، پُرگو اور آزاد منش شخص ہیں۔ اب تینتالیس چوالیس برس کا سن ہوگا، مکتوبات امیر مینائی میں اکثر خطوط آپکے نام کے چھپے ہیں۔ دیوان مرتب ہوگیا ہے مگر شائع نہیں کیا۔ حالات اور کلام مرسلہ کا انتخاب درجِ تذکرہ کیا گیا۔

حشر کے دن قدِ آدم آفتاب آہی گیا
وعظ کی محفل سے ہم چھپکر کھسکنے ہی کو تھے
ہم رہے سرستِ غفلت صبحِ پیری آگئی
ہے پیامِ مرگ پیری ابتو کر فکرِ سفر
دیر تک محفل میں وہ آنکھیں لڑاتے تو رہے

تو بھری محفل کے اندر بے نقاب آہی گیا
جھٹ سے واعظ لیکے اپنے ہیں کتاب آہی گیا
پڑ کے ایسے سوئے سر پر آفتاب آہی گیا
زندگانی کی طرف سے تو جواب آہی گیا
پھر بھی وہ معشوق تھے آخر حجاب آہی گیا

ہو چُرا اس دل کا رکھا عمر بھر خانہ خراب
جسکو دیکھا اُسپہ یہ خانہ خراب آ ہی گیا

شوقِ پابوسی میں جوشِ صید دیکھا او شہسوار
لاکھ زخمی تھا تڑپ کر تا رکاب آ ہی گیا

کچھ یہ مستوں پر کرم ہے جب لگایا منہ سے جام
جھومتا منہ پر سے مستانہ سحاب آ ہی گیا

صحبتِ رنداں سے زاہد مدتوں بچتا پھرا
میکدے میں ہو کے آخر کو خراب آ ہی گیا

کرتے کرتے انتظار آخر کو میں مر ہی گیا
لے اب آ، چاہے نہ آ تو، میں تو اے ساقی گیا

میرا مرنا سن کے بولے لے چلو اچھا ہوا
مر گیا، اُسکو نہ کہیے وہ تو صاحب جی گیا

لوگ جب لانے لگے اُنکو مری میت کے پاس
ہٹ کے بولے "واہ صاحب اور اگر یہ جی گیا"

اِس دھج سے وہ آیا کہ خدا ہی نظر آیا
کافر نے مرا آج تو ایمان لیا تھا

ہر بار نئی آن نئی شان تھی لیکن
ہمنے تجھے ہر رنگ میں پہچان لیا تھا

پہلو میں عبث ڈھونڈتی ہیں دل کو نگاہیں
تیروں نے تو پہلے ہی یہ گھر چھان لیا تھا

کچھ کھل ہی گئی اُنپہ بدی غیر کی ورنہ
کمبخت نے ساتھ اپنے مجھے سان لیا تھا

اظہارِ عبودیت اُدھر سے جو نہ ہوتا
بندوں نے یداللہ کو خدا مان لیا تھا

جب یہ کہتا ہوں بھلا دل دوں تمہیں کیا دیکھکر
ناز سے کہتے ہیں وہ "اپنا کلیجا دیکھکر"

بے خبر سوتے تھے تم تو اب میں تمسے کیا کہوں
لطف اُٹھائے رات اِن آنکھوں نے کیا کیا دیکھکر

ظاہرا آنکھیں تو بیماری میں ڈھیتے ہیں۔ مگر
یار گھبرائے ہوئے ہیں حال میرا دیکھکر

تیغ ناحق تولتے ہو دم ہی بسمل میں نہیں
ہاتھ روکو، کیا ستم کرتے ہو۔ ہاہا دیکھکر

نہ رنجِ رفتگاں کر رفتہ رفتہ
پہنچ جائے گا تو بھی کارواں تک

احباب کا دنیا سے سفر دیکھ رہے ہیں
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہے ہیں

دیا ہے دل تمھیں یہ بات رنج کی تو نہیں
ہمیں نے دی ہے کوئی چیز تمسے لی تو نہیں

وصال میں جو ذرا حد سے بڑھ چلی شوخی
کہا حیا نے یہ کیا؟ میں کہیں گئی تو نہیں

ازل میں دیکھ کے دل دے چکے تھے ہم جسکو
تجھے قسم ہے بتا دے کہ تو وہی تو نہیں

یہ کون چھپکے ابھی میکدے سے نکلا ہے
یہ کون چور سا جاتا ہے؟ "شیخ جی تو نہیں"

جان دیں ہم وہ ہوں دشمن جان کے　　کیا کریں قسمت ہی سے لہنا نہیں

چلے جاتا ٹھہرے "دو میرے اشکوں کے طوفاں کو　　معاذ اللہ یہ جلدی ہے برس لینے دو باراں کو
چبھے ہیں اسقدر کانٹے کہ تلوے ہوگئے چھلنی　　بہت اچھی طرح چھانیں گے اب ریگِ بیاباں کو
پھپکتا ہے تپ غم سے پڑا دل بھی جگر بھی　　بھڑکی ہوئی اک آگ ادھر بھی ہے اُدھر بھی
کچھ آبلہ دل ہی نہیں پھوڑا ہے جگر بھی　　ناسور سے بہتے ہیں پڑے دیدۂ تر بھی
او بانکے سپاہی تری تلوار کے صدقے　　مشتاق ہیں ہم بڑھ کے کوئی وار ادہر بھی
ساماں ہیں نئے دیکھئے کیا ہو کے رہیگا　　وہ بھی ہیں اُمنگوں پہ جوانی ہے ادھر بھی
دھڑکا شبِ تاریک لحد ہی کا نہیں ہے　　سنتے ہیں کہ اس شب کی قیامت ہے سحر بھی
گو خوش ہیں یہ سنکر وہ ہیں ہنسنے بھی ہو الفت"　　نشتر سے سوا کر گئی ہے کام "مگر بھی"
کیوں بھری محفل میں بیاں کئے کہ رسوائی ہوئی　　بال بکھرے، مستی چھوٹی آنکھ شرمائی ہوئی
ہیں نے جھک جھک کر پھرا دی جب نگاہوں سے نگاہ　　پشتِ پا سے تب ہٹی وہ آنکھ شرمائی ہوئی
ہائے وہ غش کھا کے گر پڑنا مرا رخصت کیوقت　　اُسکا وہ کہنا کہ "لو یہ اور رسوائی ہوئی"
حشر میں فریاد کیسی خود ہی ہیں گھبرا گیا　　اُسکی صورت دیکھکر گھبرائی گھبرائی ہوئی
کیا کہا کیا گھر سے آنیکی یہی ہوتی ہے شکل　　ہونٹ سوکھے، سانس پھولی بات گھبرائی ہوئی
دل نہ مانے گا مرا کہنا کہ اُسکا ہو چکا　　بس چلے پھر اُسپہ کیا جو چیز بیگانی ہوئی

[illegible]

زبیر

زبیر - صاحب عالم میرزا محمد رئیس بخت عرف مرزا محمد زبیر الدین گورگانی - صاحبعالم مرزا محمد دارا بخت میراں شاہ بہادر ولیعہد اول حضرت ابوظفر بہادر شاہ غازی خاتم خانوادۂ تیمور کے بیٹے تھے غدر کے بعد کچھ عرصہ جودھپور میں رہے پھر بیس پچیس برس تک ریاست دربھنگہ میں ایکسو پچاس روپیہ ماہوار کے وظیفہ خوار رہے - مہاراجہ صاحب مرحوم اور اُنکے جانشین والیٔ حال اسنے بہت مانوس تھے - علمی استعداد بہت معمولی تھی مگر تصنیف و تالیف کا شوق تھا چنانچہ مہاراجہ دربھنگہ کی فرمایش سے تاریخ موج سلطانی لکھی دیوان و تاریخ چھپ چکے ہیں، چند رسالے بھی شایع کئے تھے - کلام کچھ اعلیٰ درجہ کا نہیں ہے مگر طرز بیان

صاف ہے اور کہیں کہیں اشعار میں شوخی کے ساتھ بلند پروازی بھی پائی جاتی ہے دیوان میں سے کچھ اشعار منتخب ہو کر درج ہوئے۔ شوق نیموی سے تلمذ تھا۔ کبھی کبھی دہلی بھی آتے رہتے تھے۔ چھ سات برس ہوئے ساٹھ سال سے زائد عمر پا کر دربھنگہ میں انتقال کیا ؂

اشکوں کو ہمنے روکا تو چہرے کے رنگ نے
اُڑ اُڑ کے ہائے رازِ دلِ زار کہدیا

کچھ ایسا ہیں طریقِ عشق میں مدہوش و غافل تھا
اُسے بھی کھو دیا ہاتھوں سے پہلو میں جو اک دل تھا

جھکی جاتی تھی گردن آپ ہی شوقِ شہادت میں
کچھ ایسا دلفریب اے ہمدمو اندازِ قاتل تھا

کعبہ ہو کہ بتخانہ زبیر آنکھ اگر ہو
اُس شوخ کا نظارہ کہاں ہو نہیں سکتا

ارض و سما کو چشمِ بصیرت سے دیکھئے
جلوہ ہے ذرہ ذرہ میں اُس خوشجمال کا

کچھ تو باعث زبیر ہے اِس کا
دشمنِ جان ہر اک بشر جو بنا

عشق کی ہمپر جو روز افزوں عنایت ہے تو پھر
دردِ دل چھوٹا اگر دردِ جگر ہو جائیگا

عشقِ خوبانِ ماہرو نہ گیا
ہائے اے داغِ دل سے تو نہ گیا

خود لپٹ جائیگا خنجر سے گلا اے قاتل
جب ترے دستِ حنائی میں یہ عریاں ہوگا

وصل کا سُن کے وہ پیغام یہی کہتے ہیں
کھا گئے جان ہماری اجی ہاں ہاں ہوگا

سامنے رُخ کے ترے زلفوں نے میرا دل لیا
کیا غضب ہے دن دہاڑے مجھپہ یہ شبخوں ہوا

زباں پہ ذکرِ خدا دل میں حور کی خواہش
بتاؤ وہ حضرتِ واعظ کی پارسائی کیا

کھٹک جو آج میرے دلمیں ہوتی ہے بڈھب
نگاہِ یار نے برچھی سی پھر لگائی کیا؟

جبہہ سائی بتوں کے در پہ کی
پھر بھی لکھا مٹا نہ قسمت کا

کیسا رسوا ئے خلق مجکو کیا
یا خدا ہو بُرا محبت کا

لڑتے ہیں وہ ہوا سے یہ حیلہ نکال کے
کمبخت تجھ سے پھولوں کا زیور بکھر گیا

مَیں نے پہنا کے ہار جو بوسہ طلب کیا
وہ گلبدن گلے کا مرے ہار ہو گیا

اور ہونگے جن کو ہوگا اپنی طاعت پر گھمنڈ
ہم گنہگاروں کو ہے اک اُسکی رحمت پر گھمنڈ

بعدِ مُردن جز کفن کیا خاک لیجاؤ گے ساتھ
منعمو اتنکو عبث ہے مال و دولت پر گھمنڈ

وائے قسمت میں نے قاصد کی زبانی یہ سنا — پڑھ کے خط کچھ چپ ہوئے اور پھر کہا سنکر چہ خوش

تفرقہ باہم پڑے گا بعد مُردن زیرِ خاک — روح کوئے یار میں رہجائیگی تن زیرِ خاک
رنگ و بوئے باغِ عالم پر کروں کیا اعتماد — ملگئے آنکھوں کے آگے کتنے گلشن زیرِ خاک
تیرے عارض ہیں یا گلاب کے پھول — کسنے دیکھے اس آب و تاب کے پھول
تجھ سا نازک بدن جو تولا جائے — کلیاں گنتی کی ہوں حساب کے پھول
نہ کیوں روئے روشن پہ پروانہ دل ہو — کہ یہ شمع ہے لو لگانے کے قابل
یہ جھکر کے کہتا ہے قدموں سے قاتل — نہیں سر یہ اس آستانے کے قابل
تا عمر رہے ہم شجرِ خشک کی صورت — اس باغِ جہاں میں کبھی پھولے نہ پھلے ہم
اشکوں سے بھی ٹھنڈی نہ ہوئی آتشِ پنہاں — سوزِ غمِ دلدار میں رہ رہ کے جلے ہم

قتل سے پہلے ہو چکے ہیں قتل — کشتۂ غمزہ و ادا ہیں ہم
اچھا یونہی سہی سب چکے جھگڑا — بیوفا ہم ہیں یا وفا ہو تم

بھلائیں دل سے اُسے کسطرح ہم اے ناصح — رہی جو شکل تصور میں روبرو برسوں

باوفا ہم سا پُرجفا تم سا — ڈھونڈ لاؤ تو ہم سلام کریں

رکھنے دیتی قدم زمیں بھی نہیں — اب ٹھکانا مرا کہیں بھی نہیں

اُس فسونگر کے تلوّن کا ٹھکانا کچھ ہے — ہاں جو کہتا ہے کسی وقت تو دم بھر میں نہیں

کر لیا ایک زمانے کو دکھا کر انداز — بخدا آپنے اے ماہ لقا مٹھی میں
کوچۂ زلف کی دل سیر کریگا کیونکر — خضر سے راہبر اس راہ میں بھٹکے لاکھوں

میرے اشکوں سے لگی دل کی نہیں بجھنے کی — آبِ خنجر سے وہی آگ بجھا کر دیکھیں
قتل کرنے کو تو ہیں خنجرِ ابرو کافی — آپ کیوں ہاتھ میں شمشیر لیئے پھرتے ہیں
یہ ضد یہ ہٹ کوئی اس قاتلِ بیرحم کی دیکھے — کہ شوخی سے وہ کہتا ہے گلا تلوار پر رکھو
تھی پہلے رہزنِ دل شوخیٔ نگاہِ ادا — ہوئی ہے دشمنِ جان آجکل حیا دیکھو

اُسکے مرنے کی خبر میری کہا یوں ہنسکر
کیا کریں حسن تو لیا مر گئے مرجا نیدو

تڑپسے جاتے ہیں لاکھوں دل دم رفتار اے ظالم
خدا کے واسطے رکھ تو قدم آہستہ آہستہ

اشکوں سے بجھی نہ آتش عشق
سینہ میں رہی جلن ہمیشہ

چھوٹے ہے کوئی سفر میں دل سے
ہے پیشِ نظر وطن ہمیشہ

زخم دل بے سبب ہیں کیوں خنداں
کیا کوئی اور گل کھلائیں گے

اُسکے وعدے کا ہے یقیں کسکو
دیر لگتی ہے کیا مکر جاتے

نہ چھری میں ہے نہ خنجر میں نہ تلوار میں ہے
کاٹ کچھ اور تری ابروئے خمدار میں ہے

صد شکر اُن کو یاد رہا بعدِ مرگ میں
ٹھوکر سے آکے وہ مری تربت مٹا گئے

کیا اک جنبشِ ابرو میں تو نے قتل عالم کو
غضب کی باڑ رکھتی ہے تری شمشیر چھوٹی سی

رقیبوں سے وہ کہتے ہیں ہلاکر شانہ بسمل
جو ہیں جانبازِ الفت اُنکی حالت ایسی ہوتی ہے

لذت فزا ہیں تیرے ستم ورنہ اے صنم
دلدار اور بھی ہیں، دل آزار اور بھی

چھوڑو بھی اے زبیر کہیں ذکرِ غیر تم
ورنہ بڑھے گی دیکھنا تکرار اور بھی

شب وصال ہے اور رنگ فق ابھی سے ہے
سحر کے ہونے کا دل کو قلق ابھی سے ہے

کچھ حیا کے ساتھ شوخی کا اثر آنکھوں میں ہے
کیا ہی اندازِ جفا و فتنہ گر آنکھوں میں ہے

کس طرح دیکھے تجھے گو نیر اگھر آنکھوں میں ہے
رات دن تو اے پری شکل نظر آنکھوں میں ہے

ان بتوں سے دل بچائے کوئی یہ ممکن نہیں
موہنی باتوں میں جادو کا اثر آنکھوں میں ہے

جب سے کہ بسا دل میں تصور ہے کسی کا
ہر وقت ہے اک صورت زیبا مرے آگے

رخ پہ گیسو ہیں پڑے اور چڑھی ہے چتون
نہیں معلوم کہ آج آئیگی شامت کسکی

بوسۂ رخ جو لیا بولے وہ ہنسکر یہ زبیر
دیکھئے اب ہوئی آغاز شرارت کسکی

زبیر ــ شیخ بلاقی نژاد ــ لاہوری سادہ کار ابن شیخ سعد اللہ مقیم اکبر آباد شاگرد حاتم علی مہر
استعداد علمی بہت کم تھی ۱۸۴۲ء میں پیدا ہوئے ساٹھ سال سے زیادہ عمر پائی ــ

دل ہیں جگر ہیں سینے ہیں یکساں ہیں درد آج
اے چارہ گر بتاؤں کدھر کم کدھر بہت

کبک وطوطی میں کچھ کمال نہیں
ان میں تیری سی بول چال نہیں

سنگدل بیرحم بھی اتنا نہ ہو
کوئی مرجائے تجھے پروا نہ ہو

پھنسی ہے مو بمو جانِ حزیں زلفوں کے پھندے میں
اسیرانِ خم وکاکل گرفتارِ بلا ٹھیرے

کون سی صورت ہے ملنے کی بتوں سے یہ بتا
وہ تو طالب زر کے ہیں اور یاں خدا کا نام ہے

زخم

زخم ۔ حکیم ابو الفیض فتح محمد خان لبسوی مقیم کانپور۔ جناب اثر کانپوری سے مشورۂ سخن کرتے ہیں

عالم اک حسرت وعبرت کا نظر آتا ہے
جب نظر بھر کے سوئے گورِ غریباں دیکھا

بہت دیدیئے صدمے خوش نہو تو
فلک اک روز تو ہے اور میں ہوں

شبِ غم میں کوئی ہمدم نہیں اور
اک انکی آرزو ہے اور میں ہوں

زخمی

زخمی ۔ منشی راج بہادر زخمی کا لیتھ سری باستب ساکن کاکوری۔ آپ کو جناب طالب ہرموہانی سے تلمذ رہا ہے۔ ایک رسالہ موسوم بہ "نالۂ زخمی" ۱۸۸۶ء میں نکالنا شروع کیا تھا جو چند سال بعد بند ہو گیا۔ ۱۸۸۴ء میں کانپور میں رہتے تھے بزرگ انکے کاکوری کے قانون گو تھے نعتیہ کلام بھی اکثر کہتے تھے۔

کیا ہوائے نفس پر غالب ہو انسانِ ضعیف
کچھ ہوا سے زور چل سکتا نہیں ہے کاہ کا

دوستو دفن میں کسواسطے یہ عجلت ہے
میرے مرنے کی انھیں بھی تو خبر ہو نیدو

کہدو یہ طبیبوں سے عبث لکھتے ہیں نسخے
بیماریٔ الفت کی دوا اور ہی کچھ ہے

جگر نوحہ کناں ہے دل کفِ افسوس ملتا ہے
ہزاروں حسرتوں کے ساتھ میرا دم نکلتا ہے

زخمی

زخمی ۔ منشی محمد شرف الدین زخمی اہلمد عدالتِ سلطانپور ابن منشی یقین اللہ ساکن قصبہ جالیس ضلع رائے بریلی، سرکاری ملازمت اختیار کرنے کے پیشتر ضلع پرتاب گڈھ کے رئیس بابو مہیش بخش تعلقہ دار کے ہاں مختار رہے، جبتک پرتاب گڈھ رہے حیدر علیشاہ صغیر سے اصلاح لیتے رہے، لکھنؤ آئے تو سید غلام حسین قدر بلگرامی سے تلمذ اختیار کیا۔ پہلے بسمل تخلص کرتے تھے۔ حضرت قدر نے زخمی تخلص عنایت کیا۔ ۱۸۹۰ء میں کم بیش پچاس

برس کا سن تھا۔ بعد کا حال باوجودِ تلاش دستیاب نہ ہو سکا۔

دل کسی روز نہ ٹھنڈا ہوا اصلا میرا
خبرِ آمدِ دلدار سُنی ہے جب سے
اُٹھ گئے روٹھ کے پہلو سے مرے وہ زخمی
دیکھ کر شوخ نے دیوانہ گیسو کو کہا

پھک رہا ہے تپِ فرقت سے کلیجا میرا
دل پھڑکتا ہے اُچھلتا ہے کلیجا میرا
کر گئے اور بھی مجروح کلیجا میرا
سر سے ٹلتی یہ بلا میرے تو اچھا ہوتا

نئے انداز سے حلقے وہ زلفوں کے بناتے ہیں
کسی کے طائرِ دل دام کے پھندے میں لاتے ہیں
بجائے اشک آنکھوں سے نہ کیونکر خونِ دل ٹپکے
غضب ہے غیر اُنکے پاؤں میں مہندی لگاتے ہیں

ہو چکے عمر سے بس اب آؤ گلے سے لپٹو
مانعِ وصل نہیں شرم و حیا ہوتی ہے

ناتوانی ہجر میں ایسی بڑھی
لب تک آنا آہ کا دشوار ہے
قدِ بالا ہے نمونہ حشر کا
فتنۂ محشر تری رفتار ہے

زعیم۔ سید غلام محمد زعیم عرف احمد الدین کنیت ابوالفخر۔ حیدرآباد دکن کے باشندے ہیں اور حضرت فصیح الملک داغ کے خرمن کے خوشہ چین ہیں، بیس برس سے مشقِ سخن کرتے ہیں طبیعت موزوں پائی ہے اور مشق بھی خاصی ہے۔

بوسہ لب و رخسار کا مانگا تو وہ بولے
میں ایک ہوں اور آپکے ارمان بہت ہیں
ہمسا نہ ملے گا کوئی جانبازِ محبت
گو چاہنے والے ترے ایجان بہت ہیں
اس دل کے عوض اور کوئی دل مجھے دیدے
بندوں پہ الٰہی ترے احسان بہت ہیں

ہوتا نہیں نوشتۂ قسمت کو انقلاب
ٹلتا نہیں لکھا ہوا تقدیر کا کبھی
یا میرے گھر میں وعدہ فراموش آ کبھی
یا اپنی بزمِ ناز میں مجکو بلا کبھی
کیا واقعی وہ آئیں گے یا طنز سے کہا
قاصد نے ایسا مژدہ سنایا نہ تھا کبھی

فتنہ پردازی تو معشوقوں کی آب و گل میں ہے
اِسکو ناکا اُسکو مارا رات دن یہ دل میں ہے
قیس نے نالہ اگر منہ سے نکالا ہی نہیں
اِتنی پھر بے چین لیلیٰ کس لئے محمل میں ہے
کیا بتائیں ہم کہاں ہیں آپکی مژگاں کے تیر
ایک پہلو میں ہے اک سینہ میں ہے اک دل میں ہے

چاند سی صورت پہ تیری غیر کیوں دیتا ہے جان	یہ تو میری آنکھ میں ہے یہ میرے دل میں ہے

یا مرے پاس جفا کار کو لائے کوئی
یا مرا قصۂ غم انکو سنائے کوئی
زعم کس ناز سے وہ رات کو فرماتے ہیں
نیند آتی ہے ہمیں اب نہ ستائے کوئی

زکی

زکی۔ مرزا محمد خان زکی لکھنوی نبیرۂ نواب تفضل حسین خان بہادر مغفور مصاحب و مشیر نواب سعادت علیخان والئی اودھ شاگرد مولوی محمد محسن صاحب شہید و حضرت انیس سلطان عالم واجد علیشاہ کے زمانہ سلطنت کے شاعروں میں تھے، عرصہ ہوا انتقال کیا۔ خمسہ اچھا کہتے تھے جو بخوف طوالت نظر انداز کئے گئے۔ کلام کا انتخاب حاضر ہے

ہم غم سے جاں بلب تھے اور درد تھا جگر میں	منہ پھیر کر سدھارے ہنستے ہوئے وہ گھر میں
لب پہ ہے نام تیرا ہے تو ہی تو نظر میں	سینے میں تو کبھی ہے اور ہے کبھی جگر میں
دیوانہ جانکر وہ کرتے ہیں ہوشیاری	دل چھین کر بھی میرا کہتے ہیں جاؤ گھر میں
ایسی کچھ اسکو سوجھی لگ جائے خود گلے سے	تاثیر دے الٰہی اس آہ بے اثر میں
دھیان اسکی ابرؤوں کا ہے کعبہ کی زیارت	معبود کا ہے جلوہ ہر دم مری نظر میں
ہم تیرے قد کے شیدا قمری کو سرو کا غم	ہوتا ہے فرق اتنا انساں میں جانور میں
نا سازئی مسیحا جانباز کی قضا ہے	تاریک ہے زمانہ اندھیر ہے نظر میں
قاتل سے بل نہ نکلا گشتۂ جنوں کا	سر کٹ گیا ہے لیکن باقی ہے درد سر میں
ملکِ عدم کا جانا بارِ گناہ سر پر	گذرے گی اے زکی کیا اس راہ پر خطر میں

زکی

زکی۔ سید محمد زکی خلف غلام رضا بلگرامی شاگرد جناب دبیر لکھنوی، انکے نسب کا سلسلہ زید شہید سے ملتا ہے بڑے طباع اور قابل بزرگ تھے۔ ریاست رامپور میں ملازم تھے مرثیہ اور قصیدہ کہنے میں اچھی مشق تھی اور مرثیہ خوانی میں بھی کمال حاصل تھا۔ ۱۲۸۸ھ میں پچاس سال کی عمر میں وفات پائی۔ منشی افضل حسین ثابت لکھنوی سال وفات کے بارہ میں ۱۸۸۰ء تحریر کرتے ہیں۔ انکے شاگردوں میں نواب بنّے صاحب مشتاق لکھنوی بڑے طبیعت دار خوش مذاق مشاق شاعر تھے انکا بھی ۷-۸ برس ہوئے انتقال

ہوگیا۔ یہ اُنکے کلام کا نمونہ ہے۔

تصور بندھ گیا سودے میں کس قاتلِ دوراں کا
رگیں گردن کی دم بھرنے لگیں شمشیر بُراں کا

وہ آنکھیں ترک ہیں چتون سے خونریزی ٹپکتی ہے
چلینگی برچھیاں ایما ہے یہ تحریکِ مژگاں کا

مثلِ خزاں بہار کا نقشہ نظر میں ہے
لالے کی طرح داغ ہمارے جگر میں ہے

لیکر جواب خط ابھی قاصد پھرا نہیں
اے چشم تر نہ روک کہ مسافر سفر میں ہے

اللہ رے اسیری بلبل کا اہتمام
صیاد بات کونسی اس مشتِ پر میں ہے

عاشق کی جان زار بھی قاصد کے ساتھ ہے
دل ہے کہ خطِ شوق کفِ نامہ بر میں ہے

زکی زکی۔ افسر اقلیم نازکخیالی سر دفتر فصحائے زمان حافظ سید محمد زکریا خاں صاحب زکی دہلوی سابق ڈپٹی انسپکٹر مدارس ممالک مغربی و شمالی۔ دہلی کے ایک موقر خاندان سادات کے رکن تھے اور شاعری اِنکی میراث آبائی تھی۔ اِنکے بزرگ نواب مختار الملک مجدالدولہ عبدالاحد خان وزیر شاہ عالم ثانی کے قریبی رشتہ دار تھے، اِنکے والد سید محمود خان مرحوم صاحب دیوان اور اُنکے نانا جو دادا کے بھائی بھی تھے، نواب اعظم الدولہ میر محمد خان صاحب سرور صاحب دیوان و مصنف تذکرہ شعرائے اُردو تھے۔ اِنکی پیدایش ۱۸۳۹ء میں شاہجہاں آباد میں ہوئی "زینت باڑی" میں اُنکے بزرگوں کے مکان تھے، یہ خود نواب اسد اللہ خان بہادر غالب مغفور کے شاگرد رشید بڑے نازکخیال اور ذکی الطبع شاعر تھے علم عروض و قوافی پر عبور کامل اور فن سخن میں ملکہ راسخہ حاصل تھا، حق یہ ہے کہ میرزا غالب کے شاگردوں میں حضرت زکی سے زیادہ کسی نے انکار رنگ نہیں برتا اور ان سے زیادہ کوئی اُنکے رنگ کی تقلید میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ میرزائے مرحوم بھی اِن سے بہت خوش تھے۔ چنانچہ چند سطور بطور سندِ شاعری انہیں لکھکر عنایت کی تھیں جسکی نقل دیوان زکی کے دیباچہ میں بھی درج ہے۔ آپ اِس سارٹیفکیٹ کو نہایت فخر کے ساتھ اپنے احباب کو دکھایا کرتے تھے میں نے بھی یہ سارٹیفکیٹ اُنکے پاس دیکھا تھا۔ راقم تذکرہ کی بھی کئی بار آپ سے دہلی میں

ملاقات ہوئی تھی، آپ وجیہ، مہذب، ذی لیاقت، متین، اور بڑے جہاندیدہ بُردبار آدمی تھے۔ غدر سے پیشتر ہی پنڈت رام کشن بسمل، میرزا غالب و شیخ امام بخش صہبائی کے فیضِ تعلیم سے فارسی، عربی، منطق و ریاضی میں بہرہ ور ہو چکے تھے، فنِ طب میں بھی دخل تھا اور ماسوا اُردو شاعری کے فارسی نظم و نثر میں بھی قدرت رکھتے تھے، ہنگامۂ غدر کی اشراف گردی کے زمانے میں دلی سے قدم باہر نکالا، اُس وقت اُنیس بیس برس کی عمر تھی اور بسبیل روزگار میرٹھ، گورکھپور، بریلی، الہ آباد اور بدایوں میں مقیم رہے۔ آپکی عمر کا آخری حصہ بدایوں میں بسر ہوا جہاں آپ عہدۂ ڈپٹی انسپکٹری مدارس سے پنشن لیکر جارہے تھے، وہیں ۱۹۰۳ء میں تخمیناً ساٹھ سال کی عمر پاکر اس جہانِ فانی کو خیرباد کہکر راہی ملکِ بقا ہوئے حصولِ پنشن کے بعد وہاں سب جسٹرار بھی ہوگئے تھے، آپ فنِ شاعری کے اصول و نکات سے ماہر اور جملہ اصنافِ سخن پر قادر تھے، آپکے کلام بلاغت نظام میں خیالات کی تازگی۔ مضمون آفرینی، نازکخیالی، اور طرزِ ادا کی لطافت، خاص طور پر قابل داد ہیں، فارسی ترکیب بھی موقعہ بموقعہ بکمال صفائی نظم کی ہیں، کوئی شعر معنی خیز لطافت سے خالی نہیں، دشوار پسندی کے باوصف آپکا کلام بلحاظِ فصاحتِ زبان نہایت مستند ہے، دیوان میں ایسی غزلیات کم ہیں جن میں ایک یا دو شعر کم از کم مرزا غالب کی یاد دلانے والے نہ ہوں۔ آپکے دورانِ حیات ہی میں ایک دیوان غزلیات موسومہ دیوان زکی شائع ہوکر مقبول عام ہو چکا تھا۔ اسکے علاوہ غیر مطبوعہ کلام جس میں غزلیات، قصائد، رباعیات وغیرہ شامل ہیں آپکے عزیزوں کے پاس موجود ہے، کلام غیر مطبوعہ ہمیں انکے حقیقی برادرزادے سید محمود حسین صاحب ثاقب وکیل کوٹہ کی مہربانی سے دستیاب ہوا جس کا شکریہ ادا کرنا ہمارا فرض ہے۔ سید زکی مرحوم کثیر العیال شخص تھے، جائداد آبائی باقی نہ رہی تھی اس لئے فکرِ معیشت سے کبھی فارغ البال نہ ہوسکے اُنکے انتقال کے بعد ایک صاحبزادے کی شادی نواب نور الحسن خاں رئیس بھوپال کی دختر سے ہوئی اور اب وہ لکھنؤ میں قیام پذیر ہیں بقیہ بھائی سب دہلی میں رہتے ہیں نواب زکی قدیم تہذیب کے ایک دلپسند نمونہ تھے، پابندی وضع، انکسار، خلق، کم سخنی سے

متصف ہونے کے علاوہ نکتہ سنج اور زود فہم بھی تھے آپ کو نئے مضامین پیدا کرنیکا خیال ہر وقت رہتا تھا اور اس میں کچھ کلام نہیں کہ اپنے زمانے کے مسلم الثبوت اساتذہ میں آپکا شمار تھا، فقیروں سے بہت عقیدت تھی۔ شعر و سخن سے طبیعت کو اسقدر لگاؤ تھا کہ جہاں جاتے تھے وہاں انکے دم سے شعر و سخن کا چرچا ضرور ہو جاتا تھا اور مشاعرے بھی ہوتے رہتے تھے مولوی حشمت اللہ حشمت ایم، اے کلکٹر صوبجات متحدہ۔ پنڈت جواہر ناتھ کول ساقی دہلوی اختر صدیقی، اسیر بدایونی۔ انکے نامور شاگرد ہیں، انکے کلام میں ایک خاص بات یہ ہے کہ جن مضامین سے طبیعت کو لگاؤ نہ تھا اُنکو خواہ مخواہ اپنے اشعار میں داخل نہ کرتے تھے۔ چنانچہ رندانہ بولی ٹھٹولی، زہد کی مذمت، شراب کی تعریف، درد و سوز کے مضامین کم ہیں الغرض آپکی وفات سے دُنیائے شاعری کا ایک زبردست رکن جاتا رہا۔ شائقین کی دلچسپی کے لیئے آپکے کلام مطبوعہ وغیر مطبوعہ کا انتخاب درج کیا جاتا ہے

ساتھ ساتھ اہل تماشا کا وہ ششدر جانا
لیکے دل پوچھتے ہیں تو نے ہمیں کیا سمجھا
شرم پر اُسکی مٹا ہوں کہ نظر کو جھکی
کھل گیا عاشق دیوانہ کا دانا ہونا
ٹوٹ کر جس سے صدا نکلے وہ کیا نازک ہے
غیر کے حق میں کہو دل ناداں کوئی حرف
خاموش ہوں میں دیکھکے اندازِ خامشی
سوز نجسو الم ہیں یہاں ہر نفس کے ساتھ
ہم ہیں ادا میں ہیتے ہیں محو لقائے دوست
رو رو کے میں نے اپنا بیاباں بنا لیا
حسرت یہی رہی کہ حسینوں کو دیکھئے

اللہ اللہ ترا جانب محشر جانا
ابھی آفت ہوا گر کہیئے کہ دلبر جانا
ننگ ہے پردہ مژگاں سے بھی باہر جانا
خاک اُڑانے کو ترے کوچہ میں اکثر جانا
شیشہ جانا جو مرے دلکو تو پتھر جانا
وہی بہتر ہے جسے یار نے بہتر جانا
جو بات لاجواب ہو اُسکا جواب کیا
دم کا نہیں شمار تو غم کا حساب کیا
انداز مہر کیا ہے نگاہ عتاب کیا
زنداں ہوا خراب تو آباد گھر ہوا
میں خاک بھی ہوا تو غبار نظر ہوا

کیا برباد سعیٔ ناخدا کو میری قسمت نے
کہاں جا کر ڈبویا جب کنارے پر سفینہ تھا

ہر ایک کام ہو مشکل تو کیا کرے انسان
مجھے تو جاں لگا دینا بھی وصلِ یار ہوا

عجب کیا ہے وہاں رحمت سے ہو زاہد کی آمرزش
عذاب اُس پر یہاں کچھ کم نہ تھا زہدِ ریائی کا

خرسند تیرے جلوہ سے ہے جانِ ناتوان
تجھ سے ہی رابطہ ہے دلِ بیقرار کا

او چشمِ بے نیاز ذرا دیکھ تو سہی
کیا حال ہو گیا ترے اُمیدوار کا

دماغِ بے کسی اللہ اکبر کیسا عالی ہے
کہ مل کر خاک و خوں میں قصد ہے امانِ قاتل کا

شبِ غم مرنے ہی آخر ہوئی یعنی برابر ہے
نکلنا جان کا، آسان ہونا ایک مشکل کا

پیکانِ پُر آب کس کا رہا سینہ میں صد شکر
یہ قطرہ ہے باعث مرے تسکینِ جگر کا

لبوں سے جان ہی نکلے تو حرفِ مدعا نکلے
کلیم آسان نہیں اہلِ وفا کا ہمزباں ہونا

سکونِ دل سرورِ چشم رنگا رنگ حاصل ہے
ترا دیدار ہے نظارۂ باغِ جناں ہونا

مٹا کر ہائے غمخواروں نے تزئینِ وفا کھوئی
خراشِ تیرِ جاناں خاتمِ دل کا نگینہ تھا

غضب ہے اب تغافل مجھ سے میں وہ ہوں کہ میرا دل
فریبِ مہر دیکر آپ کی آنکھوں نے چھینا تھا

وہ دیکھتے ہیں بزم میں یہ دیکھنا ہے کیوں
بارے ہوا ہے مجھے بھی سزاوار دیکھنا

لگا دل میں وقتِ جگر ہو گیا
ترا تیر تیری نظر ہو گیا

تری راہ کسنے بتائی نہ پوچھ
دلِ مضطرب راہبر ہو گیا

ہمنے بھی اُنکی نیم نگہ کا دیا جواب
کی تھی اُنھوں نے نیم نگہ نیمجاں ہوا

غیر مطبوعہ

وہ گرمِ خواب ہو گئے اس آہ و بکا میں کیا
دردِ شکستِ دل نہیں میری صدا میں کیا

گل کی طرح ہے جیب تا دل ہزار چاک
پنہاں رہیگا داغِ تمنا قبا میں کیا

ایسا ہوں محوِ آرزوئے انتقام میں
دشمن سے پوچھتا ہوں کہ مانگوں دعا میں کیا

ہم جان و دل تو نذرِ غمِ عشق کر چکے
حیراں ہیں اب لٹائیے راہِ وفا میں کیا

کیوں گل فشانیاں ہیں میانِ زمین و چرخ
خونِ جگر نہیں تو ہے اور سما میں کیا

اُڑتے جاتے ہیں مگر شوق میں اربابِ جفا ٭ راہ میں ورنہ کہیں نقشِ کفِ پا ہونا ٭
تری وضعِ تغافل میں ہلاکِ بیکساں مخفی ٭ تری طرزِ تبسم سے عیاں آرامِ جاں ہونا ٭

اندازِ شوخ اسکے ہیں سرمایۂ فریب
دلکش ادائیں کیا نگۂ جانفزا ہیں کیا

ذرّے ہیں بے قرار تو اختر ہیں حیرتی
جلوے ترے سمائے ہوئے ارض و سما میں کیا

غم ہے تو کیوں نکل نہیں چکتا سرشک میں
یارب بھرا ہے اِس دلِ درد آشنا میں کیا

آلودۂ کدورتِ باطن ہے ہر نفس
منہ لے کے زکی دکھاؤ گے بزمِ صفا میں کیا

دیوانگی سے چھوٹ کے اسیرِ بلا ہوا
دل آشنا ہوا بھی تو غم آشنا ہوا

جب دل ہی محوِ لذتِ دردِ وفا ہوا
کیا کیجئے ستم کی شکایت سوا ہوا

گویا بہار رفتہ چمن میں پھر آگئی
اچھا ہوا کہ زخمِ جگر پھر ہرا ہوا

محرومِ سازگاری طالع ازل سے ہوں
ہونا جو کچھ نہ تھا وہ مرا مدعا ہوا

نیرنگ کائنات میں بازیٔ دلفریب
کرتا ہے کوئی شوخ تماشا چھپا ہوا

جب درمیاں حجابِ تعین نہیں رہا
ذرہ سے تا بمہر خدا ہی خدا ہوا

تو وہ کہ تیری خاکِ قدم سرمۂ نظر
میں وہ کہ میرا سجدہ نثارِ نقشِ پا ہوا

دل فرطِ غم سے خستہ ہے ذوقِ فغاں کہاں
سچ ہے جو شیشہ ٹوٹ گیا بے صدا ہوا

اسکے سوا کہ شاہد و مشہود ایک تھا
میں کیا کہوں کہ عالمِ حیرت میں کیا ہوا

قیامت میں کیوں اسنے ملنا نہ ہوگا
کہ اُس دن تو کچھ عذرِ فردا نہ ہوگا

مقرر ہے اثبات نفی مکرر
کہو وصل ہرگز نہ ہوگا نہ ہوگا

مریضِ وفا کا مداوا ہے مرنا
یہ اچھا بھی ہوگا تو اچھا نہ ہوگا

کہتے تھے اور دی لگی اسکو جان حیف
کرتا ہے آدمی کو زکی شرمسار جھوٹ

دنیا میں جب خدا ہی بتوں کو بنا چکا
کرتا ہے اور فکرِ ستم آسمان عبث

ٹھکراتے ہیں وہ مار کے خنجر بُری طرح
جاتی ہے جانِ عاشقِ مضطر بُری طرح

وفا پرست ہوں اہلِ وفا بنائیں گے
تبرکاً مرے خاکِ مزار کی تسبیح

تمھاری آرزوئے وصل شغلِ جانِ حزیں
تمھارا ذکر دلِ بیقرار کی تسبیح

عشق کا وہم ہے زمانے پر
کیا بگڑتے ہیں وہ فسانے پر

میری قسمت میں تھا کہ تک پہنچوں
مُہر ہوتی ہے دانے دانے پر

حدِ شوق سے پہنچا ہوں
تیر سے پہلے ہیں نشانے پر

وہ دل خستہ ہوں دُکھ جاتا ہے دل اندوہِ دشمن پر
رولایا بیکسی نے طالعِ ناکام رہزن پر

نصیبوں سے مرے ہوتا ہے سب پہلے ہی خاکستر
پشیماں برق ہو جاتی ہے جب گرتی ہے خرمن پر

کتنے رہرو مٹے کہ راہ میں ہے　کارواں کارواں غبار ہنوز
بارہا مر کے ہم جیے شبِ ہجر　ہو گیا عمر کا حساب غلط

بھرنے میں زخم کے وہ گل افشانیاں کہاں
جی میں ہے دلکو چھیڑ دیں پھر نیشتر سے ہم

ہے شبِ غم کسقدر ذوقِ تماشائے بلا
بند ہونا دیدۂ بیدار کا اچھا نہیں

ہمکو ستمگر کہیں اور برا کیا کریں
اسکے سوا کیا کہیں اسکے سوا کیا کریں

حقِ محبت عزیز اور ادا کیا کریں
آپ ہیں بیمارِ غم میری دوا کیا کریں

اُنکو مذاقِ ستم عذرِ جفا کیا کریں
خو ہمیں تسلیم کی اس کا گلہ کیا کریں

بزم کو بیخود کیا جلوے نے اب دیکھئے
چشم و نگہ کیا کریں ناز و ادا کیا کریں

یہ شرمگیں نگہ یہ تبسم نقاب میں
کیا بے حجابیاں ہیں تمھارے حجاب میں

لیلیٰ اسکے نام میں بھی تھی مقصود ایک شان
ذوقِ خیالِ یار سے ہوں محوِ خواب میں

کیوں آؤں ہوش میں کہ ہو پھر حسرتِ فراق
ذوقِ خیالِ یار سے ہوں محوِ خواب میں

آوارگی تھی فطرتِ آدم کہ خلد سے
آباد ہونے آئے جہانِ خراب میں

محروم انبساط ہوں رنجور بے کسی
پیتا ہوں خونِ دل قدحِ مشکبو کہاں

اُس موہنی یگانہ کو دل میں کرو تلاش
پھرتے ہو جستجو میں ذکی کو بکو کہاں

ہو گئے جذبِ محبت سے یہ دونوں کیا ایک
کیوں دلِ تنگ میں یا رب خلشِ تیر نہیں

یہ مٹ نجائے کہیں نقشِ آب کی مانند
کہ تابِ موجِ نفس جسمِ ناتواں میں نہیں

دہن سے اسکے کھلا مجکو رازِ بیم و امید
وہ بات کرتے ہیں ایسی کہ نکلے ہاں میں نہیں

ناصح قمارِ عشق کو چھوڑینگے آپ ہم
باقی ہے ایک جان ذرا اسکو ہار لیں

کہاں ہے حسرتِ ذوقِ طپیدن
دلِ بسمل وہ خنجر آزما ہیں

بڑھا ذوقِ اسیری جب انھوں نے
کہا کہدو کہ اب سے یہ رہا ہیں

جمع ہو نہ ہم تپش سے خاطرِ قاتل کہیں
ہو چکے ٹھنڈا نگاہِ ناز کا بسمل کہیں

کہہ نہ بیٹھیں عاشقانِ مضطرب غافل کہیں
یوں نہ کھینچے قابلِ تسکیں نیا پا دل کہیں

ہر بات میں حوالہ ہے ہر بحث میں سند
ناصح کو مانتے ہیں ہم اہلِ کتاب ہیں

وہی سبزہ، وہی وحشت، وہی ویرانی ہے
اور کیا دشت میں ہوگا جو مرے گھر میں نہیں

پاسباں غیر وہ مغرور، رسائی معلوم
بیکسی عرضِ وفا کی کوئی تدبیر نہیں

کہتے ہیں سرزنشِ غیر سے مرتے کیوں ہو
بیوفا لفظ ہے، خنجر نہیں، تلوار نہیں

فروغِ شعلۂ داغِ جگر سے محوِ حیرت ہوں
فروزاں ہو گئی گویا کہ شمعِ طور سینے میں

ہمنے کاٹی ہر شبِ غم نالہ و فریاد میں
وائے گر ہوں یہ نفس بھی زیست کی تعداد میں

کیوں نگاہِ قہر کرتے ہو دلِ رنجور پر
بیکسوں پر کھینچنا تلوار کا اچھا نہیں

وہ لے لیں دل تو چھوٹ جاؤں میں غم سے
کمال مصلحت ہے اِس زباں میں

جان و دل سازگار ہیں دونوں
یعنی تم پر نثار ہیں دونوں

آفریں تم کو۔ ایک ناوک میں
جگر و دل فگار ہیں دونوں

غیر مطبوعہ

میسر جو نہو صہبا پئیں گے خونِ دل اپنا
یہ ہمنے ناک رکھی ہے مئے انگور پینے میں

یار سے غیر فنا وصلِ حقیقی ہے محال
بیخودی خواب بھی خواب کی تعبیر کہاں

سینہ میدانِ قیامت نہیں دم صور نہیں
حسرتِ مردہ عجب کیا ہے جو محشور نہیں

روبرو جلوہ فزا ہے چمنستانِ شہود
نگہِ شوق کبھی دید میں معذور نہیں

مئے پندار سے کیوں پُر ہو مرا جامِ سفال
جامِ جمشید نہیں یہ سرِ فغفور نہیں

کردیا غنچۂ خموشی کو وفا میں داخل
بیقراری میں بھی فریاد کا مقدور نہیں

ہوگیا پردہ برانداز انا الحق کہنا
بزمِ توحید میں گنجایشِ منصور نہیں

غیر مطبوعہ

اشکِ خوں کی یہ تراوش ہے تو کیونکر مانوں
جگر و دل میں جراحت نہیں ناسور نہیں

نہ محرم تماشا ہیں نہ ہم نظارہ کرتے ہیں
پڑے ہیں بزم میں بیخود نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

ہوائے دولتِ فانی میں غافل کیا ابھرتے ہیں
حبابِ بحر ہیں گویا کہ ہستی سے گذرتے ہیں

تری آنکھوں کے آگے فق ہو رنگت سبزۂ نرگس کی
یہی سفاک آہو سبزۂ فردوس چرتے ہیں

ترے گیسو بھی نیرنگِ جہانِ بے بقا نکلے
سنورتے ہیں بگڑتے ہیں بگڑتے ہیں سنورتے ہیں

ترے طرزِ تغافل سے میں کیوں طرزِ وفا چھوڑوں
بہت عاشق ہوا ہوں میں بہت معشوق بنتے ہیں

تماشا ہے امید و بیم کا یہ گو مگو ان کی
نہ ہے اقرارِ وصل ان کو نہ وہ انکار کرتے ہیں

ازل میں جو کہا اس پر رہیں گے تا ابد قائم
ترے عاشق کہیں عہدِ وفا کے مکرتے ہیں

مایوس ہوں اثر سے تو فریاد کیا کروں
شیریں کا رنج ماتمِ فرہاد کیا کروں

غم کا یہ ہے ہجوم کہ ہے تلخ زندگی
وہ سنتے ہی نہیں دلِ ناشاد کیا کروں

حیرت سے شش جہت نگراں ہوں خموش ہوں
ہر دم جو سامنے ہو اسے یاد کیا کروں

نہ پہنچے کیوں ترے قدموں سے تا سرِ امن
مرا غبار مری آہِ نارسا تو نہیں

نگاہِ بیخودیِ شوق بھی تماشا ہے
حجابِ چشم و دل اندازِ ماسوا تو نہیں

عبث ہے دست درازی کفن سے دستِ جنوں
لباسِ مردہ ہے یہ زندگی کی قبا تو نہیں

نمودِ عشق ہے بیگانگی کے پردے میں
وہ مجھ سے اور میں اس شوخ سے جدا تو نہیں

ہو گیا غرق مرے گریہ سے تن پانی میں
تیرتے پھرتے ہیں مچھلی سے ہرن پانی میں

شدتِ گریہ میں وہ کیا مری فریاد سنیں
قابلِ فہم نہیں صوت و سخن پانی میں

خستہ ہے کشمکشِ دہر سے ہر ایک وجود
موج کے نام سے پڑتے ہیں شکن پانی میں

ہو گیا خاک مگر جوشِ صفائے دل سے
صورتِ آئینہ ہوں میں ہمہ تن پانی میں

عرقِ شرم سے تر ہیں گلِ عارض ان کے
جلوہ گر آب چمن میں ہے چمن پانی میں

نہیں گلشن نہ سہی زخمِ جگر دیکھتے ہیں
ہم خزاں میں بھی بہارِ گلِ تر دیکھتے ہیں

غیر مطبوعہ

پردۂ غنچہ میں ہوں یا وہ نقابِ گل میں — آنکھ ہر رنگ میں اربابِ نظر دیکھتے ہیں
امتحاں بزم میں ٹھیرا ہے جگرداری کا — دلِ بیتاب سنبھل جا وہ اِدھر دیکھتے ہیں
لاش پر میری وہ حسرت سے ہیں بشکلِ تصویر — بولتے کچھ نہیں حیرت سے مگر دیکھتے ہیں

[illegible]

بس اسی پر تھا مدارِ انجمن — شمعِ کشتہ یادگارِ انجمن
شکلِ گل آنکھوں نے پائی تازگی — تیرا جلوہ ہے بہارِ انجمن
یار مہماں شوق وارماں میزبان — اور دل ہے پردہ دارِ انجمن
وائے حسرت دل میں نقشہ رہ گیا — مٹ گئے نقش و نگارِ انجمن
بزم سے جانا ہے شکلِ برہمی — اُسکا آنا ہے قرارِ انجمن

[illegible]

تم مضطرب ایسے ہوئے جاتے ہو کہوں کیا — آئی ہے عدو کی خبر ایسی کہ نہ پوچھو
میں دمِ نزع بھی نظارے سے محروم رہوں — اسقدر رنجِ دئی شوق نہ کر تم مجکو
جوشِ وحشت سے رہا ہوش تمھارے دم میں — کیا گلہ تمسے اگر بھول گئے تم مجکو
کھینچو نہ مرے سینے سے یوں تیر کو دیکھو — بیدل نہ کرو بسملِ دلگیر کو دیکھو!
ہاں ذبح کرو شوق سے گھبراؤ نہ اتنا — زانو پہ نہ رکھو سرِ نخچیر کو دیکھو!

بدگمانی یار کے حق میں دلِ مہجور حیف — وہ خدانا کردہ کیوں اغیار کی محفل میں ہو
کیا اِس سے فزوں خوبیٔ جنت کا گماں ہو — یا باغ ہو، یا میکدہ یا کوئے بتاں ہو
یہیں ملجاؤنگا میں خاک میں نقشِ قدم ہوکر — نچھوڑا ہے نچھوڑونگا تمہارے آستانے کو
یہ اربابِ طلب کیا بیخبر ہیں ذوقِ وحدت سے — معاذاللہ بیگانہ سمجھتے ہیں یگانے کو
ادائے شوخ جب دِل چھین کر آزردہ کرتی ہے — نگاہِ صلح جو اُٹھتی ہے عاشق کے منانے کو

ڈوبتا ہے سفینۂ امید — ناخدا کون ہے خدا سے کہو
آرزو ہے کہ اپنا کہہ لیجے — گو کسی لفظ نا روا سے کہو

تم سے کیا خوش ہو کوئی عرضِ تمنا کر کے — حسرتیں خاک میں ملجاتی ہیں اِک نکار کے ساتھ

اُٹھا جو تیری بزم سے سوئے عدم گیا
مطلع
عاشق کو دیکھ اور چراغِ سحر کو دیکھ

کیوں شوق ہے بوالہوس یہ نگاہیں ہیں متصل
ہوتا ہوں میں نثار ذرا تو ادھر کو دیکھ

اسیری میں تباہی رونقِ کاشانہ ہو جائے
قفس ہی نالوں سے بناکر چراغِ خانہ ہو جائے

تغافل ساز نگارِ دردِ اہلِ شوق کیا ہوگا
ادا سے وہ فریب ایسا کہ دل دیوانہ ہو جائے

فغاں کرتے ہوئے جا پہنچو اُسکی بزمِ عشرت میں
کبھی تو اے زکی یہ شوخیِ رندانہ ہو جائے

کہو وہاں سے کوئی کیا مرا یہ دل پا سکے
جہاں زباں نہ ہلے عرضِ مدعا کے لیے

چلے ہیں عرضِ وفا کو ہم اور نشتہ ہیں
گرہ میں ایک دل اس کاکلِ دوتا کے لیے

زکی ہم اپنے دل و دیں کسی کو کیوں دیتے
بتوں نے حسن کے جلوے دکھا دکھا کے لیے

رہائی ہیں مجھے بیجا نہیں حسرت اسیری کی
سمجھ لیتے اگر اپنا تو وہ آزاد کیوں کرتے

شہادت و فتح پر اہلِ وفا بھی مرتے ہیں
نیازِ عشق پہ تن جاں کا زیاں ہو جائے

نہ پوچھو مجھ سے اعدا میں کون ہے جانباز
کہیں نہ کھینچ لو خنجر کہ امتحاں ہو جائے

تمہارا ذکر نہ ہو ورد تو یادِ شوق نہ ہو
تو یہی کیوں نہ کہو کوئی بے زباں ہو جائے

جنونِ عشق بھی ہے علم حکمت ورنہ کیا معنی
جو دیوانہ ترا ہو جائے وہ فرزانہ ہو جائے

قفس نفس ہے نسیمِ وفا محرکِ شوق
یہ وہ مزا ہے جسے ذوقِ جاوداں کہیے

چاک داماں کیجیے ٹکڑے گریباں کیجیے
کچھ تو آخر چارۂ طبعِ پریشاں چاہیے

مہ لقا ہر شیوہ میں ہوش ربا ہوتا ہے
ناز بیجا بھی حسینوں کا بجا ہوتا ہے

چشمِ ظاہر میں تو دل آبلہ سا ہوتا ہے
جزو و کل رازِ جہاں اس میں چھپا ہوتا ہے

قتل ہو کر بھی تو رہتے ہیں پریشاں عشاق
سر جدا، ہاتھ جدا، پاؤں جدا ہوتا ہے

دم گھٹا جاتا ہے کب تک سہے کوئی یہ عذاب
جل بھی چک لے دلِ پرسوز دھواں ہوتا ہے

کیا غضب ہے اس بخت کو کیا کہتے ہیں یارب
نالہ بھی ہے لب پر تو ہے محروم اثر سے

تیرِ نگہ یار کی اللہ رے شوخی
بیٹھا ہی تھا دل میں کہ ہوا پار جگر سے

قربانِ شہ حسن کی ہے داغِ جگر مہر
جاگیر محبت بھی عطائے سندی ہے

وسواکو تیرے فائدہ کیا ضبطِ آہ سے
غم کی طرح برستی ہے حسرت نگاہ سے

ڈالا جو دل میں تھا وہی منصور نے کہا
گویا یہ بازگشت صدا کی ہے چاہ سے

دل لگ گیا جو خاک میں افسوس کیا کریں
ہم اور ڈھونڈ لینگے تری جلوہ گاہ سے

محشر میں جاؤں کیا کہ بتایا نہ جائیگا
قاتل کا نام پوچھتے ہیں داد خواہ سے

از روئے فطرت ایک ہیں انسان و درد و غم
دل داغ سے الگ نہ جدا ہم ہے آہ سے

دی تھی حیرت تو ہمیں آئینہ پیدا کرتے
کہ انہیں دیکھتے ہم وہ ہمیں دیکھا کرتے

یہ کہنا ننگ ہے اپنا کہ مرتے ہیں محبت میں
وہ اظہار وفا کیا جس میں شکوہ یار کا نکلے

دل ہے نا چیز انہیں توڑ کے کیا یاد رہے
یہ تو شیشہ بھی نہیں ہے کہ صدا یاد رہے

باغ میں بلبل نے پھر تنکے لیے
خانماں برباد کے دن کے لیے

یار سے ہوتا ہے دوری میں بھی وصل
قرب ہے یہ اہلِ باطن کے لیے

بُت وہ کافر ہیں کہ انکا جلوہ ہے
نورِ ایماں قلبِ مومن کے لیے

کہا ہے سچ سرِ مغرور پائمال
تمہاری زلف قدموں پر پڑی ہے

وہ کیونکہ آرام سے رہیگا جنا نہیں کہا خاک جی لگیگا
نظر میں جسکی سمائی ہوگی بہارِ نقش و نگارِ علی

آہ کی دل کھولکر کس دل گرفتہ نے کہ وہ
نیند لیوں کھوئے ہوئے پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے

راضی رہے جورِ دوست پر بھی
عاشق نہ تھے ہم گویا ولی تھے

وصفِ دہن و کمر نہ پوچھو
صانع کے یہ نکتہ خفی تھے

صد شکر قتیل دوستی تھے
ورنہ ہم ننگِ زندگی تھے

حاصلِ عمر وہ دم ہے جس میں
دیکھ لیں صورتِ زیبا کوئی

اللہ رے نازِ حسن تری خود ستائیاں
جاں اور نذرِ تبسم مگر نہ لی

کاہشِ انتظار میں جینا !
ایک وعدے نے جانفزائی کی

تماشا عام ہوگا اور کیفِ بیخودی ارزاں
عجب کیا ہے قیامت صحبتِ رندانہ ہو جائے

غیر مطبوعہ

ہم ملکے کسی اور سے دل شاد کرینگے
جو کچھ نہ کیا تھا ستم ایجاد کرینگے

ہیں دل میں نہیں ہوں تو بھلاتے ہیں وہ کسکو
ہے چاہ مری جب نہ مجھے یاد کرینگے

کر دیکھیں گے نالہ بھی وہ آئیں کہ نہ آئیں
تیرا بھی کہا اے دلِ ناشاد کرینگے

جلنے کو شمعِ غیر کی محفل میں آگئی
اے خانماں خراب یہ کیا دل میں آگئی

شوخی کی خو جو قاتلِ سفاک تجھ میں تھی
بنکر وہی تپش وہی تیرے بسمل میں آگئی

راہِ وفا کے کرب کو کیا جانے کوہکن
اسکو تو موت پہلی ہی منزل میں آگئی

محرومیوں نے ذوقِ تمنا مٹا دیا
جو آرزو تھی حسرتِ حاصل میں آگئی

خانہ خراب عشق کا اللہ رے جذبِ شوق
لیلیٰ بھی سیرِ دشت کو محمل میں آگئی

جاتے ہو خوار ہونیکو پھر اسکے کوچے میں
بیٹھے بٹھائے کیا یہ زکی دل میں آگئی

مرا نام و نشاں قائم ترے نام و نشاں تک ہے
وہ عمرِ جاوداں ہے تو یہ عمرِ جاوداں تک ہے

ہمیشہ سے نظر افروز عرش و لامکاں تک ہے
خدا جانے کہ اسکا جلوہ کب سے ہے کہاں تک ہے

بہارِ باغِ ہستی وقفہ ہے رنگِ تغیر کا
شبِ آرایشِ بزمِ چمن صبحِ خزاں تک ہے

ٹھہرنا کیسا محمل کا؟ کہاں دیدارِ لیلیٰ کا
یہ سب سودائے مجنوں التفاتِ ساربان تک ہے

پہنچنے کے نہیں آثار گم ہے جادۂ منزل
اسیرِ دامِ حیرانی غبارِ کارواں تک ہے

خموشی میری ہمدم ہے کہا کسنے سنا کس نے
ترا رازِ محبت بدگماں میری زباں تک ہے

ہماری آرزوؤں کا زکی جب کچھ نہیں پایاں
تو کیا پوچھیں کہ حد اسکے تغافل کی کہاں تک ہے

دلکش اندازِ خموشی اور ادا تقریر کی
واہ کیا بات آپکی اور آپ کی تصویر کی

ذوقِ قاتل سے بڑھا شوقِ شہیدانِ وفا
مرحبا میں گم ہوئی یارب صدا تکبیر کی

آفرینش اسکی دمسازِ شکستِ رنگ تھی
بنتے بنتے اڑ گئی رنگت مری تصویر کی

وصل دشمن کیوں نہ ہو ہو کر رہے گا جو کہا
اسکی ضد تحریر ہے گویا مری تقدیر کی

وصل کیسا آخر اسکا پھل ہوا قطع حیات
آرزوئے دل میں پرسش تھی تری شمشیر کی

بار کر اے صدر حبا رے شیوۂ حسن سلوک
انکو آمرزش کی عادت ہمکو تقصیر کی

حسن یوسف کو کیا شوق زلیخا نے عزیز
خواب سے وقعت زیادہ ہوگئی تعبیر کی

جسکو دیکھا بندۂ طرز تغافل کرلیا
بے نیازی سے اُسے حاجت نہیں تسخیر کی

زکی

زکی۔مولوی سیّد زکی حسین صاحب ملازم محکمۂ کلکٹری ضلع رائے بریلی۔ صاف شستہ عاشقانہ شعر کہتے ہیں، بندش اور نشست الفاظ بھی درست ہے اِس فن سے خاصہ لگاؤ معلوم ہوتا ہے حالات باوجود تجسّس دستیاب نہو سکے۔ چند غزلوں کا انتخاب درج کیا جاتا ہے۔

شکوہ کریں ہم کسکا کہ خود انس ہمارا
صیّاد کے پنجے سے نکلنے نہیں دیتا

صیّاد ذکر باغ نہ آئے زبان پر
بن جائیگی قفس میں اسیروں کی جان پر

رخصت ہوئی بہار کے ہمراہ دختِ رز
خاک اڑ رہی ہے پیرِ مغان کی دکان پر

جھانک کر دیکھ تو مجنوں نہ کہیں ہو لیلی
دوڑتا آتا ہے کوئی پسِ محمل خاموش

شوق سے کیجئے باتیں میں اٹھا جاتا ہوں
کیوں رہے میرے سبب آپکی محفل خاموش

مدتِ قید نہ کم ہوگی تمہارے غل سے
بس خدا کے لیئے اے طوق و سلاسل خاموش

جشن کر لو منعمو دنیا میں چاہو جسقدر
قبر میں پھر یہ سرود عیش کی محفل کہاں

شب فرقت میں بھلا نیند کا آنا کیسا؟
موت ہی بن کے اب آئیگی اگر آئی بھی

صحبتیں جن سے تھیں دن رات کی یکجائی بھی
اب وہ کرتے نہیں اقرارِ شناسائی بھی

زاہد بھی مرے ساتھ ہوا حشر میں رسوا
وہ آگ لگائی مرے دامن کی تری نے

گلشن میں بہار آئی ہو پرواہ ہے قسمت
رکھا ہی قفس میں ہمیں بے بال و پری نے

بیوجہ نہیں گل ہیں عنادل سے مکدر
کچھ کان میں پھونکا ہی نسیمِ سحری نے

بجھوادی سرِ قبر مری آکے کسی نے
گر شمع جلائی بھی ترس کھا کے کسی نے

جانیکو گئے سیکڑوں ہی قافلہ لیکن
دی ملکِ عدم کی نہ خبر آکے کسی نے

منظور جو اس پردے میں تھا میرا جلانا	بھجوایا ہے خط غیر سے لکھوا کے کسی نے
اتنا جو سنا بوسۂ لب اسکی ہے قیمت	دل پھینکدیا ہاتھ سے جھنجھلا کے کسی نے
کیا حال ہے جیتے ہو کہ مرتے ہو زکی تم	اتنا بھی تو پوچھا نہ کبھی آ کے کسی نے

زکی

زکی ۔ جناب میرن صاحب زکی، میرزا سلیمان قدر مرحوم کے مشاعرہ ۱۳۱۴ھ کی ایک غزل کا انتخاب درج ذیل ہے ۔

کبھی ہوگی کسیکی آرزو یے دل کہیں نکلی	نہ اپنی ایک بھی حسرت تہ چرخ بریں نکلی
نہ مُردے کو بھی تیرے دور میں دو گز زمیں نکلی	ابھی حسرت تری اے چرخ نکلی یا نہیں نکلی
وہ آئے دیکھنے کو جبکہ اپنا دم نکلتا تھا	ہماری حسرت دیدار وقت واپسیں نکلی

زکی

زکی منشی عبدالغفور خان متوطن گیا مئی ملازم لشکر نہایت معمولی شاعر ہیں مگر دیوان شائع کردیا ہے

خلق میں ایک ہوا ایک سے بڑھ کر پیدا	نہوا پر مرے محبوب کا ہمسر پیدا
عشاق سینکڑوں ہیں جہاں میں مگر زکی	عاشق مزاج ہنسا کہاں دوسرا ہوا
بوسے کے بدلے ہمنے بہت کھائیں گالیاں	ادنیٰ سی بات پر ہوئی تکرار بے سبب
اِک نگاہِ کرم ادھر بھی کیجے	ہیں ہو دم بھر کا میہماں افسوس

زندہ

زندہ منشی محمد یحییٰ ساکن گلاؤٹھی ضلع بلند شہر۔ تلمذ کا حال معلوم نہ ہوا یہ چند شعر انکے ہیں

ظلم حد ظلم سے بھی بڑھ گیا	اب تو ہم انکو رحم کھانا چاہیئے
فصل گل ہے اور گھٹا چھائی ہوئی	آجکل پینا پلانا چاہیئے
یوں کیا زندہ کو زندہ دیکھکر	خاک میں انکو ملانا چاہیئے

زندہ

زندہ منشی زین الدین اورنگ آبادی تلمیذ حضرت ثاقب بدایونی چند شعر حاضر ہیں

کہاں میں اور کہاں ہنگامۂ روز جزا لیکن	محبت ان بتوں کی کھینچ کر پیش خدا لائی
رہیگا ایک بھی تختہ نہ ثابت اپنے مدفن کا	ہماری بیقراری رنگ گر بعد فنا لائی
اٹھا خنجر لگا اک ہاتھ کر دے فیصلہ قاتل	کہ ہے مر مر کے مقتل میں مجھے میری قضا لائی

زوّار

زوّار - جناب سیّد زوار حسین صاحب الہ آبادی تلمیذ جناب ظہیر دہلوی - پندرہ بیس برس سے شعر کہتے ہیں شاید حیدرآباد دکن میں بھی رہے ہیں - کلام کا نمونہ درج ذیل ہے -

ہماری آنکھوں میں رہکر ہمیں سے پردہ ہے
رقیب سامنے آگئے تو کچھ حجاب نہیں

سوالِ بوسہ لب پر وہ نہ سکے کہتے ہیں
یہ وہ سوال ہے جسکا کوئی جواب نہیں

گرے جو طور پہ موسیٰ تو طور خاک ہوا
سنبھال برقِ تجلی کہ مجھ میں تاب نہیں

انہیں سے لونگا فصاحت کی داد اے زوار
جو کہہ رہے ہیں کہ میری زبان ہے اردو

کل تو یہ مشہور تھا مہندی لگی ہے پاؤں میں
آج سنتا ہوں انہیں میرا لہو درکار ہے

زور

زور - منشی میر تراب علی زور صیغہ دار دفتر خزانہ حیدرآباد - حضرت جلال لکھنوی سے تلمذ تھا۔ زبان فصیح اور طرز بیان شگفتہ ہے - غزلیات بہم رسیدہ کا انتخاب درج ذیل ہے

زلفوں کے اُلجھنے سے پریشان بہت ہیں
آئینہ جو چوری گیا حیران بہت ہیں

گردن سے ٹلا بوجھ سبکدوش ہوا ہیں
جانباز کے سر پر ترے احسان بہت ہیں

نہیں تھے رات اپنے گھر میں تم نظریں چراتے ہو
ہمارے چور اندر دیدۂ روشن کے بیٹھے ہیں

حیا و شرم کا پردہ اُٹھا کر دیکھ تو ظالم
وہ باندھے ٹکٹکی کشتے تری چتون کے بیٹھے ہیں

شب وصال نے آنکھوں میں کھینچ لی تصویر
کسی کے ناز سے دامن اُٹھا کے آنے کی

گئی نہ یادِ شہیدانِ ناز کی دل سے
وہ قتل کو ترے دامن اُٹھا کے آنے کی

لگی ہیں خاک نشینوں کی آنکھیں سوئے فلک
خبر ہے بام پہ اُس مہ لقا کے آنے کی

ملازمانِ جنابِ جلال تک اسے زور
کمال دل میں تمنا ہے جا کے آنے کی

ہے تجھکو شب و روز عبث یاد کسیکی
پرواہ بھی ہے اُسکو دلِ ناشاد کسیکی

وہ بام پہ فرماتے ہیں نالہ میرا سنکر
لو عرش پہ آنے لگی فریاد کسیکی

زہیر

زہیر - مولوی آغا حسین صاحب کڑہ مانکپوری شاگرد مشتاق لکھنوی علمی استعداد خاصی ہے اور مشق بھی بُری نہیں - یہ چند شعر انکے نتائج افکار سے درج کیے جاتے ہیں -

عاشقوں میں اسکو ایجاں ہو گئی شاہی نصیب
جسکو دم بھر مل گیا سایہ تری دیوار کا

فصل وہ برسات کی وہ بادہ نوشی کی بہار
گھر کے وہ آنا چمن پر ابرِ دریا بار کا

ہے سراسیمہ تلاشِ یوسفِ گم گشتہ میں
لو زلیخا کو نیا سودا ہوا بازار کا

کیا تھا پرزے پرزے اسنے جو دامن گریباں کا
پڑا لپکا اسی سے ہاتھ کو چاک گریباں کا

جنوں کے جوش میں میں نے نظر کی جب سوئے گردوں
تو مجکو کہکشاں پر شک ہوا چاکِ گریباں کا

آجکل مہماں مرا وہ حور وش جانانہ ہے
غیرتِ فردوس رونق میں مرا کاشانہ ہے

اس طرح آیا ہے زاہد محفلِ رنداں میں آج
شیشۂ مے ہے بغل میں ہاتھ میں پیمانہ ہے

بلبلیں عاشق ہیں اس گل پر تو گلچیں ہے نثار
غیر اس گلزار میں اک سبزۂ بیگانہ ہے

خوانِ بخشش پر ترے موعود ہیں جن و بشر
یہاں سبھی مہمان ہیں اک تو ہی صاحبخانہ ہے

زہیر زہیر ۔ قاضی عبدالحئی صاحب بریلی کے اک خوش فکر سخن گو ہیں حالات کے لئے بار بار لکھا مگر دستیاب نہو سکے کچھ کلام ملا اس کا انتخاب درج کیا جاتا ہے ۔

آپ بن ٹھن کے جو پھر گھر سے چلے ہیں باہر
آج کیا حشر بپا کرنے کی پھر ٹھانی ہے

آپنے دوست جو دشمن کو سمجھ رکھا ہے
مہرباں یہ بھی تو اک آپ کی نادانی ہے

میں کسی اور سے اور آپ کا شکوہ کرتا
بندہ پرور یہ فقط غیر کی لسّانی ہے

کھائے جا رنج زہیر اور پئے جا آنسو
تیری قسمت کا یہی دانہ یہی پانی ہے

عنایت تو ہمیشہ ہی زیادہ اسپہ ہوتی تھی
جفا بھی آج اسنے میرے اوپر غیر سے کم کی

ہماری آنکھ سے باندھا تو ہی بیرا برنے لیکن
دھوئیں اڑ جائینگے جسوقت بجلی آہ کی چمکی

ہماری یاد بھی اے ہمنشیں انکو دلا دینا
اگر مہلت ملی غیروں کی باتوں سے کوئی دم کی

زہیر زہیر ۔ سید قلندر پیران مدرس مدرسۂ چنیاپٹن علاقہ ریاست میسور ۔ میسور جیسے دور افتادہ مقام پر کسی کا اردو شعر گوئی کیطرف ملتفت ہونا ہی بڑی بات ہے ۔ چند غزلیں نظر سے گزریں جو کثرت سے زبان کی غلطیوں سے مملو تھیں صرف یہ چند شعر قابل درج سمجھے گئے

شعلے بھڑک رہے ہیں مرے جسم زار میں
آتش لگی ہوئی ہے دلِ بیقرار میں

چہرہ نظر جو آیا کبھی زلفِ یار میں
بجلی تڑپ کے رہ گئی ابرِ بہار میں

اب مرغِ دل کو سیرِ چمن کی ہوس نہیں
وہ پھول ہیں کھلے جگرِ داغدار میں

وہ شمع رو جو قبر پہ آنسو بہا گیا
لاکھوں چراغ ہو گئے روشن مزار میں

زیب

زیب ۔ مرزا جمال الدین عرف میرزا کلن زیب، اولاد امجاد عالمگیر ثانی ۔ شاگرد ذوق مرحوم ۔ دار فانی سے رحلت کئے عرصہ ہوا ۔ چند شعر یادگار ہیں ۔

لہو میں بھر کے جو دامن کو اپنے یار آیا
یقین ہے آج کسی بیگنہ کو مار آیا

بعد اک عمر لگی آنکھ ذرا سونے دے
نکر اے شورِ قیامت ابھی بیدار مجھے

زندگی دیکھئے ہو ہاتھ سے دل کے کیونکر
اسکے آتے ہیں نظر اور ہی اطوار مجھے

زیب

زیب ۔ عالیجناب راجہ چھنولال بہادر زیب مرحوم حیدرآباد کے نامی امیر راجہ راجان راجہ شیوراج بہادر کے اعزائے قریبہ میں سے تھے اور خود بھی عرصے تک دفتر بخشی گری دکن میں سررشتہ دار رہے کچھ دنوں نواب اقتدار جنگ بہادر اور نواب نصرت جنگ بہادر کی سرکار میں مختار بھی رہے تھے، فن سخن کے دلدادہ اور سخنوروں کے بڑے قدردان تھے۔ آپکا دیوان رائے سوامی پرشاد نے چھپوا دیا ہے اس کا انتخاب حیطۂ تحریر میں آیا۔ کوئی خاص بات قابلِ ذکر انکے کلام میں نہیں ۔

کیا حلاوت تم اٹھائی شیریں نے
عشق میں کوہکن نے کیا دیکھا

رہا زیب تا صبح اختر شمار
سرِ شام ٹھیرا تھا آنا ترا

خستہ و آشفتہ و آوارہ و رسوا کیا
حضرتِ عشق آپنے جو کچھ کیا اچھا کیا

گھر کیا کرتے تھے ہر اک دلمیں تصویر بتاں
آئینہ نے اب تمھارے دلمیں گھر پیدا کیا

تیغ کے ہیں جگر پہ وار بہت
تیر دل کے ہوئے ہیں پار بہت

دیدہ و دل کی آبیاری سے
نخل غم اب کے لایا بار بہت

کم ملے گا مگر کوئی مجھ سا
حسن پر اپنے خود ہوئے مفتوں
کیا کروں تدبیر اب لے ہمنشیں
بندۂ بُت بنا دیا ہمکو
تیرے دامن سے آلگا ہے غریب
نوکِ مژگاں پہ تُل رہے ہیں اشک
اپنے بختِ زبوں کو کیا کیجے
زلفِ پرخم پہ دل و جاں سے فدا ہوتا ہوں

گرچہ تم کو ملیں گے یار بہت
آئینہ سے ہو تم دو چار بہت
یار روٹھا ہے مناؤں کس طرح
ہے نرالی تری خدائی عشق
زیب کی کر نہ جگ ہنسائی عشق
اب ہے انکا سنبھالنا مشکل
شک نہیں اُنکی مہربانی ہیں
جانکر آپ گرفتار بلا ہوتا ہوں

زیبا

زیبا۔ مرزا بندہ علیخاں زیبا لکھنوی۔ نواب شرف الدولہ شریف الملک نواب رضان علیخاں کے پوتے اور نواب ذازش علیخاں کے بیٹے تھے خان علامہ نواب تفضل حسین خان اجداد مادری میں تھے ۱۸۴۱ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور صغر سنی میں ہی کربلا و نجف کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ ابھی تحصیل علمی کی تکمیل نہوئی تھی کہ انقلاب سلطنت اودھ ہو گیا۔ اور دجمعی اطمینان کا سلسلہ منقطع۔ پھر بھی اپنے دلی شوق سے عربی۔ فارسی اور رمل وغیرہ میں خاصی استعداد فراہم کرلی اور خواجہ آتش کے شاگرد نواب محمد حسن خان شید اسے فن سخن میں بہرہ ور ہوئے نہایت شریف اور خلیق صاف دل پاک طینت انسان تھے کبر و غرور نام کو نتھا مشاعروں میں اکثر ہم طرح غزلیں پڑھا کرتے تھے عیوب شاعری سے انکا کلام پاک ہے۔ فکر معاش سے بدرجۂ اوسط فارغ البال تھے پچاس برس سے کچھ زیادہ عمر پاکر ۱۸۹۲ء میں انتقال کیا حضرت جلال نے تاریخ وفات کہی ؎ زیبا شد زیب بہشت برین۔ زبان صاف شستہ، بندش الفاظ وطرز بیان دلکش و پسندیدہ، اپنے ہمعصر شعرا میں وقعت و اعزاز کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ سید عاشق حسین عاشق اُنکے شاگرد نے دیوان موسوم بہ "مرقع زیبا" مرتب کرکے چھپوا دیا ہے

جب تک اُسنے زلف میں شانہ کیا
آئینہ حیرت سے مُنہ دیکھا کیا

مر گئے ہم عشق کا آزار اچھا ہو گیا
لیجئے آج آپ کا بیمار اچھا ہو گیا

تازیانے بیکسوں کی آہ کے اتنے پڑے
جسم نیلا ہو گیا سب آسمانِ پیر کا

نزاکت نے اک بحرِ خوبی کے مارا
کفن چاہیئے مجکو آبِ رواں کا

جب اُسنے کہتا ہوں اچھا کیا تباہ مجھے
تو ہنس کے کہتے ہیں جو کچھ کیا خدا نے کیا

رہا یہ حالِ ہیجانِ شوقِ دید و بوسۂ لب میں
کبھی آنکھوں میں دم آیا کبھی مُنہ کو جگر آیا

تُو نے کہیں دیکھا تو نہیں اے نگہ ناز
مدت سے ہمارا دلِ مضطر نہیں ملتا

جسکو نیاز تم سے ہوا بے نیاز تھا
جسنے جھکایا پاؤں پہ سر سرفراز تھا

انداز یہ نہ آتے جو آتا نہ دل مرا
کسدن ادا یہ آپ میں تھی کب یہ ناز تھا

آپ کا بیمارِ الفت ہو گیا وقفِ قضا
اے مسیحا بس یہی اپنی ادا پر ناز تھا

تسکین کیسی اور وہ بے تاب کر گئے
مجھ کو دلاسے دیکے نجانے تو خوب تھا

آج اُسے پھر مرا دھیان او دلِ ناشاد آیا
لے مبارک ہو کوئی اور ستم یاد آیا

طفل کو ہے یہی ہنگامِ ولادت رونا
ہائے ہیں کیوں طرفِ عالمِ ایجاد آیا

بیمارِ محبت کو سنبھلتے نہیں دیکھا
بے جان لیئے موت کو ٹلتے نہیں دیکھا

فقرے ہیں ترے بس میں مرے فرق ہے اتنا
چلبجاتا ہے وہ اور اسے چلتے نہیں دیکھا

کس ناز سے چلتے ہو لبھاتے ہوئے دلکو
اِس طرح تو جادو کو بھی چلتے نہیں دیکھا

کہے دیتی ہے چال اٹکھیلیوں کی
لیئے جاتا ہے دِل وہ دلبر کسی کا

ہوئے ہونگے برہم ضرور آئینہ سے
نہ توڑا مگر دل سمجھکر کسی کا

وہ دن لائے خالق میں اسد کے قربان
مرا حلق ہو اور خنجر کسی کا

اُمیدِ وصل پر اُنکے ستم کیا کیا اُٹھائے ہیں
مقدر آزمائی ہے محبت آزمائی ہیں

بہت ملئے نہ ان ترچھی نظر والوں سے اے زیبا
کہیں یہ راست بازی ہی نجائے کج ادائی ہیں

ہجر میں لا کے خیالِ رخِ جاناں دل میں
شامِ غم کو شبِ وصلت کی سحر کرتے ہیں

اپنی خاموشی نے کھلوائیں زبانیں خلق کی — میرے چپ رہنے کے چرچے جابجا ہونے لگے

آپ سے دل پھیر لینگے ہم سمجھیئے تو ذرا — دل لگی میں آپ تو صاحب خفا ہونے لگے

یہ بھی غیرت تمھیں آتی نہیں ای رشکِ مسیح — جاں بلب عاشقِ صادق ہو تمھارے ہوتے

ہوں وہ بے جرم اگر قتل کروگے مجکو — تیغ بھی دیکھ کے رہجائیگی صورت میری

دمِ وصلِ صنم فرطِ خوشی سے دم نکلتا ہے — زمانے میں کسیکا یوں بھی ارماں کم نکلتا ہے

مسرت سے کبھی ہوتا ہے تو بھی آپ سے باہر — کبھی تیرا بھی ارمان ای دلِ پرغم نکلتا ہے

کوئے جاناں سے کیا جب قصد جانیکے لیئے — ہوک اک اٹھی کلیجے میں بٹھانے کے لیئے

منکرِ رحمت سزاوارِ سقر ہے زاہد ! — ہم نجائیں گے تو ہے باغِ جناں کس کے لیئے

ہم تو لے سفاک کشتہ ابرو و مژگاں کے ہیں — تیغ کسکے واسطے ہے اور سناں کس کے لیئے

جو تیرِ ناز کسی کا کبھی ادہر کو چلے
یہ آرزو ہے کہ لیتا ہوا جگر کو چلے

تھا کوئی نہ پسِ دفن فاتحہ پڑھ کے
اکیلا چھوڑ کے سب اپنے اپنے گھر کو چلے

کسی کے دل میں نہ پائی جگہ جو نالوں نے
تو آسماں کیطرف ڈھونڈنے اثر کو چلے

کہیئے انصاف سے مرجانے کی جا ہے کہ نہیں — قتل کا حکم ہوا اوروں کو ہمارے آگے

عشقِ جاناں سے ہی قدر آپکی ای حضرتِ دل — جان سے بڑھ کے کبھی آپ نہ پیارے ہوتے

چشمِ مخمور کسیکی مجھے یاد آتی ہے — خود بخود آنکھ مری بند ہوئی جاتی ہے

شبِ وعدہ یہ رہا کرتی ہیں باتیں دل سے — دیکھیں یار آتا ہے پہلے کہ قضا آتی ہے

غیر کے ہاتھ نہ بھیجیں طلبِ دل کا پیام — مجھ سے خود کہتے ہوئے کیا انھیں شرم آتی ہے

کششِ مرگ کی اچھی یہ زبردستی ہے — کوئے قاتل ہی میں مجھے کھینچے لیئے جاتی ہے

کیا جو عہدِ وفا اُن سے زندگی بھر کا — تو ہنسکے بولے اگر زندگی وفا نکرے

وہ مجھ کو دیکھکے ترچھی نگہ سے کہتے ہیں — یہ تیر وہ ہے نشانہ پہ جو خطا نکرے

دل سے اس نرگسِ فتاں کے اشارے ہیں یہی — جو ہماری طرف آئے وہ سمجھ کر آئے

بے وصل کے بوسے کا تقاضا نہیں کرتے	ہم بات کوئی آپ سے بیجا نہیں کرتے

زیبا

زیبا منشی محمد قاسم زیبا دہلوی دبستان گو خلف میر کاظم علی دبستان گو تلمیذ راسخ دہلوی ۲۸-۲۹ برس کی عمر اور حیدرآباد میں سکونت پذیر ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

پاؤں پر بیرحم کے بسمل نے جب سر رکھ دیا	بلبے قسمت ہاتھ سے قاتل نے خنجر رکھ دیا
ڈھنگ سیکھا برق نے آہ دلِ ناشاد کا	رنگ اُڑایا شورِ محشر نے مری فریاد کا
اشک گو لختِ جگر نورِ بصر ہیں لیکن	بُری اولاد کو نظروں سے گرا دیتے ہیں
ہے نمکپاش مرے زخموں پہ اور کہتا ہے	آج اُلفت کا مزا تجکو چکھا دیتے ہیں
کریں ہم اس خلش کا درد کا کس سے گلہ یارب	کہ اپنا دل ہی جب پہلو میں کانٹا سا کھٹکتا ہو
یہ بت بیباک ہیں سفاک ہیں انکو نہ پروا ہو	کسی کی جان جائے یا کسی کا دم نکلتا ہو
اللہ رے پردہ کہ مری نعش پہ بے سے	رونے کو بھی وہ آئے تو مُنہ ڈھانپ کر آئے

زیبا

زیبا منشی عبدالمجید خان زیبا انکے والد سوہاوی ضلع بندیل کھنڈ میں وکیل تھے وہیں نومبر ۱۸۸۱ء میں یہ پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۰ء میں علیگڈھ کالج سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ کوٹ فتح پور ہسوہ کے رہنے والے ہیں غضب کے ذہین ہیں آجکل سشن جج رلئے بریلی کی عدالت میں سررشتہ دار ہیں۔ احسن مارہروی کی صلاح سے چند غزلیں مضطر خیرآبادی کو دکھائیں پھر حضرت شوق لکھنوی اور آخر میں حضرت شہید مچھلی شہری سے تلمذ اختیار کیا بڑے پُرگو اور موزوں طبع ہیں عرصہ ہوا کچھ کلام بھیجا تھا اُس کا انتخاب درج ذیل ہے۔

خریدار اسکے ہو گئے تیرے عاشق بیچکر دل کو	گراں ہرگز تری اُلفت کا سودا ہو نہیں سکتا
ابھی دیکھو ابھی دیکھا کہاں ہے	نتیجہ دشمنوں کی دوستی کا
خیالِ یار پر سو بار صدقے	کہ یہ ساتھی ہے میری بیکسی کا
سب کچھ ملا جو بوسۂ رخسار ملگیا	دنیا ملی جو وصل کا اقرار ہوگیا
وہ بوسہ مانگنے پہ مجھے دیتے ہیں سزا	فرماتے ہیں کہ جرم کا اقرار ہوگیا

گھٹ گئی ہے اسقدر تاب و توانِ اہلِ درد
ساتھ ہی اُف کے نکل جاتی ہے جانِ اہلِ درد

لب جاں بخش سے کیوں کوسنے ہو
جئیں مر مر کے ہم آخر کہاں تک

نہ کچھ مسیح سے مطلب نہ کچھ طبیب سے کام
مرض مٹیں کو مٹیں کو دوا سمجھتے ہیں

جاؤں گلی سے اُٹھکے تمھاری میں کس لیئے
جنت میں کیا دھرا ہے وہاں جب تمہیں نہیں

شکوۂ ظلم نہیں جور کہ بیداد کریں
اپنے بھولے کو کسی طرح تو وہ یاد کریں

عشق میں دل گیا، ایمان گیا، جان گئی
کسے روئیں کسے پیٹیں کسے ہم یاد کریں

ایفاء وعدہ تم نہ کرو اس کا غم نہیں
جھوٹی قسم ہی میری تسلی کو کم نہیں

اسلئے کوئے یار ہر ایک کو کہاں نصیب
زاہدا یہ عیش و راحتِ باغِ ارم نہیں

مجھ سے پردہ ہے تو کیوں چھپتے ہو نظروں میں مری
مجھ سے نفرت ہے تو کیوں گھر ہے تمہارا دلمیں

نہوا پر نہوا وصل کسی بُت کا نصیب
ہائے افسوس رہی دل کی تمنا دل میں

اسقدر پاس تھا اُس پردہ نشین کا دل میں
اپنی آنکھوں سے بھی پنہاں اُسے رکھا دلمیں

بیخود ایسا بھی نہوگا کوئی جیسا میں ہوں
آجتک مجکو نہ معلوم ہوا کیا میں ہوں

چھیڑ دیکھو کہ مری نعش پہ آئے تو کہا
بیمروت کہو اب کون ہے تم یا میں ہوں

ہائے بیمارِ محبت سے یہ کہنا اُن کا
تجکو کیا خوفِ اجل تیرا مسیحا میں ہوں

دل سے میرے ہے لڑی اُنکی نگاہ
دیکھیے دل کریں یا ہم کیا کریں

عشق کا امتحان لیتے ہیں
اِس بہانے سے جان لیتے ہیں

رہرو تم سیر دیکھے جاؤ کچھ پوچھو نہ حال
کیوں گرے قدموں پہ ہم وہ سر کو ٹھکراتے ہیں کیوں

جراحت ہائے پنہاں کی سُنے تب داستاں کوئی
دہانِ زخم میں جب تیغ کی رکھدے زباں کوئی

حرم میں دیر میں مسجد میں دلمیں چشمِ عاشق میں
کہاں رہتے ہو بتلاؤ تمھیں ڈھونڈے کہاں کوئی

سند تو عشق کی ہم جان دیکے پا چکے زیبا
اُسے بھی پاس کرلیں اور اگر ہو امتحاں کوئی

زیبا۔ مولوی عبدالمغنی ساکن بدایوں۔ صاف صاف عاشقانہ شعر خاصہ کہہ لیتے ہیں۔

سنہ ۱۹۰۵ء میں اپنے استاد حضرت مضطر خیر آبادی کے پاس لشکر گوالیار میں مقیم تھے۔

تم اگر روز تصور میں نہ آیا کرتے
جینا پھر طالبِ دیدار کا مشکل ہوتا

دل جان بوجھ کر نہیں دینے سے فائدہ
دانستہ کوئی جان سے بیزار ہو تو کیوں

لاکھ الفت جتائیں ہم ان سے
وہ کہاں اعتبار کرتے ہیں

کوئی وعدہ وفا نہیں ہوتا
آپ وعدے ہزار کرتے ہیں

تمھیں کہو کہ گذر نامہ بر کا کیونکر ہو
تمھارے کوچے سے بچکر حیا نکلتی ہے

جلوہ ترا اے پردہ نشیں تو ہی بتا دے
آنکھوں میں نہیں ہے کہ مرے دل میں نہیں ہے

جز حسرتِ دیدار نہیں آنکھ میں کچھ بھی
جز خواہشِ وصل اور ہوس دل میں نہیں ہے

آیئے بے پردہ اسکی لاش پر
منہ چھپانا کیا شہیدِ ناز سے

ظلم اپنے طالبِ دیدار پر!
شرم اپنے عاشقِ جانباز سے؟

دل کو میں لوں تو جگر کی لے خبر
کہتی ہے شوخی نگاہِ ناز سے

دل لیا زیبا کا تم نے جس طرح
جان بھی لیلو اسی انداز سے

بڑھے میکشی کیوں نہ برسات میں
گنا ہوں کا پردہ گھٹا ہو گئی

یہ کہکر منایا انھیں وصل میں
چلو ہو گئی۔ جو خطا ہو گئی

یہ نشانی ہے ترے تیرِ نظر کی ظالم
اس لیئے درد کو سینے سے لگا رکھا ہے

زیبا

زیبا۔ رائے اجودھیا پرشاد زیبا رئیس شاہجہانپور شاگرد جناب احسان مرحوم پرانے مشاق ہیں عمر پچاس پچپن کے قریب ہے، یہ چند شعر انکے ہیں۔

ترچھی نظریں بھی حسینوں کی غضب ہیں زیبا
چوٹ کھا کر کبھی دل کو نہ سنبھلتے دیکھا

زیبا نگہ چشم حقیقت سے جو دیکھا
بتخانوں میں قدرت کے تماشے نظر آئے

ہجر میں یوں ہو قصہ خوانی غم
جسکو وہ بت تو کیا زمانہ سنے

شکر ہے آج آبلے دل کے
روئے تلوار سے گلے ملکے

زیبا

زیبا۔ مرزا عبدالرحمن بیگ تلمیذ حضرت فصیح الملک داغ دہلوی دکن کے باشندے ہیں یہ کلام کا نمونہ ہے

کیا کروں شکوہ بیوفائی کا	دوست وہ بت ہے اک خدائی کا
ہاتھ اوچھا لگا یا کیوں قاتل	وقت اب بھی تھا صفائی کا
خود تو ملتے نہیں یہ پھر کیسا	مجھ پہ الزام بیوفائی کا

زید

زید۔ سید احمد زید بلگرامی خلف سید محمد حافظ مولد و منشا بلگرام اودھ آپکے دو دیوان غیر مطبوعہ ہیں اور فی الحال ریاست نظام میں کسی ضلع کے ناظم ہیں انکی بدو شعور کی چند غزلیات کا انتخاب درج تذکرہ کیا جاتا ہے جس سے موجودہ مشق سخن کا اندازہ ہوسکتا ہے ؂

جو کاکل و روئے یار دیکھا تو سنبل و لالہ زار دیکھا	عجیب لیل و نہار دیکھے قرین حلب کے تتار دیکھا
پھرے بہت دیر میں حرم میں چمن چمن کو ہزار دیکھا	مگر جہاں میں ترا مقابل نہ ہمنے پروردگار دیکھا
خزاں جو آئی تو باغباں نے چمن میں پھر کر ہزار دیکھا	نہ تخم دیکھے نہ پھول دیکھا نہ برگ دیکھا نہ بار دیکھا
مثال طفلی چلی جوانی وہ آئی پیری ہوئے وہ فانی	یہ عمر کی ہے سبک روانی نہ ایسا یک مٹ سوار دیکھا
شباب پیری میں یاد آیا تو دل لگے کیا کیا مزے اٹھائے	خدا کی قدرت سے زید ہمنے خزاں میں لطف بہار دیکھا
مجھ سے فرماتے ہیں کیا عشق کے بیمار ہیں آپ	کسقدر زار ہیں کیا جان سے بیزار ہیں آپ
جان لب کر کے ہمیں جانے پہ تیار ہیں آپ	حال دل سنتے نہیں کتنے دل آزار ہیں آپ
کیا خطا، کون سبب، جرم ہے کیا، کون قصور	کس لیئے ہمسے بتا دیجئے بیزار ہیں آپ
چشم مخمور کے بوسوں پہ مراہیں تو کہا	کیا تنگ ظرف ہیں دو جام میں سرشار ہیں آپ
اٹھا ہے شور جو سینے سے میرے ماتم کا	یقیں ہے حضرت دل انتقال کرتے ہیں
چمن میں چلکے دکھا دیجئے قد موزوں	کہ یاد باغ میں سب نونہال کرتے ہیں
نگاہ ناز سے خود ہو چکا ہے زید شہید	اب آپ غصہ سے کیوں چہرہ لال کرتے ہیں
سر چڑھا کر انھیں خود دار کیا خود تو نے	بل کی لینے لگے تجھسے بھی ستمگر گیسو
رخ ترا سورۂ والشمس ہے از سرتا پا	ہوگئے سورۂ واللیل سراسر گیسو
کفر و اسلام میں کچھ فرق نہیں رہنا ہے	جب قریں ہوتے ہیں رخسار کے آ کر گیسو

زیدی

زیدی۔ منشی سید نور الدین صاحب ساکن ظفر آباد نواح جون پور۔ عدالت میں پیشکار اور حضرت جلال کے باعقیدت تلامذہ میں ہیں۔ دس بارہ برس سے فکر سخن کرتے ہیں۔

خدا کو منہ بھی دکھانا ہے ایک دن زیدی
دنیا کی نعمتوں سے کبھی دل بھرا نہیں
مدت ہوئی کہ آنکھیں ترستی ہیں دید کو
ہنستی صورت پہ نجا دل کے لگانیوالے
تنکے چنواتی ہے انساں سے ہوس دنیا کی

تم آخرت کے لئے کچھ تو کام کر لیتے
اللہ ری ہوس تری کچھ انتہا نہیں
اسپر وہ کہہ رہے ہیں کہ ہیں بیوفا نہیں
یہ گل اندام ہیں ہنس ہنس کے جلانیوالے
چھانتے خاک ہیں اکسیر بنانیوالے

زیرک

زیرک۔ حافظ مولوی قلندر بخش صاحب باشندہ پانی پت شاگرد منشی کرامت علی مرحوم شہیدی تحصیل علمی دھلی و لکھنؤ میں کی۔ اپنی علمیت پر بڑا ناز تھا۔ شعر و غزل بھی کہتے تھے۔ یہ ان کے کلام کا نمونہ ہے۔

زیرک کل ایک طرف کو میں شکل خستہ دل
فی الفور دیکھتے ہی یہ اوسکو میں عرض کی
سنتے ہی در جواب یہ بولا وہ تند خو
لیکن یہ ڈر ہے اپنی محبت کے واسطے
زیرک شباب ہی میں ہے کچھ لطف زندگی

جاتا تھا ناگہاں وہ پری رو ملا مجھے
کب تک رکھے گا رنج میں تو مبتلا مجھے؟
صحبت سے تری رنج نہیں ہو ذرا مجھے
ایسا نہ ہو سکھائے تو مہر و وفا مجھے
یہ عیش پھر کہاں جو جوانی گذر گئی

مفصلۂ ذیل کلام ترتیب حصۂ سوم کے بعد موصول ہوا لہذا آخر میں درج کیا گیا۔

خاطر

خاطر۔ منشی ظفر حسن مندرجہ صفحہ ۳۰۴ حصۂ سوم

چٹکیاں اور بھی لیں دلمیں جھکی جب وہ نگہ
یاد گلشن میں بڑھی اور اسیروں کی تڑپ
دیکھکر پھیری ہیں ہم چشموں نے نظریں کیا کیا

اپنی شوخی سے نہ باز آئی جو شرمائی بھی
نکہت گل جو صبا تا بہ قفس لائی بھی
بار خاطر تھی مصیبت میں شناسائی بھی

امید اس کے وصل کی جب جینے جی نہ ہو
مرنے کی اپنے کس لئے ہمکو خوشی نہ ہو

ہے موت ہجر عاشق و معشوق بعد وصل
ملکر بہم جدا نہ ہوں یا وصل ہی نہ ہو

تم چھوڑ دو جو دیکھنا چشم عتاب سے
اتنا بھی اپنا پوچھنے والا کوئی نہ ہو

شوخی کسیکی دیکھ کے ہوتا ہے شک کلیم
جو طور پر گری تھی وہ بجلی یہی نہ ہو

خرد

خرد ۔ بقیہ کلام حکیم انور آغا صاحب تحر ولکھنوی مندرجہ صفحہ ۴ - ۱۳

پامال ہم کئے ہوئے اس جان جاں کے ہیں
انداز جسکی چال ہیں عمر رواں کے ہیں

کچھ یار کا قصور نہ اغیار کی خطا
سارے فساد میرے دل بدگماں کے ہیں

رخسار یار دیکھ کے کہتی ہیں بلبلیں
گل کس چمن کے پھول یہ کس بوستاں کے ہیں

زاہد ہی ایک راندہ درگاہ ہو تو ہو
لاکھوں مرید حضرت پیر مغاں کے ہیں

شاہد ہے ضبط معنی یہ سوز نہاں کے ہیں
مہر سکوت لب مجھے چھالے زباں کے ہیں

بربادی چمن کی لکھی ہیں حکایتیں
برگ خزاں رسیدہ ورق بوستاں کے ہیں

خلش

خلش ۔ خواجہ کرامت علی اجمیری مرحوم مندرجہ صفحہ ۹ - ۲۸

رموز عاشق و معشوق کو اغیار کیا سمجھیں
بھلا دشمن بتا تو وے کہ وہ مجھ پر خفا کیوں ہے

تمھیں چاہا کئے دشمن کو اسنے کب تمھیں چاہا
تمھیں ہو مبتلا اسپر وہ تمپر مبتلا کیوں ہے

وہ کہتے ہیں یہی دو چار باتیں تجھکو آتی ہیں
کرم کیوں تھا ستم کیوں ہے وفا کیوں تھی جفا کیوں ہے

وہ بگڑے ہیں تو بگڑیں حال میرا کیوں بگڑتا ہے
وہ اٹھتے ہیں تو اٹھیں خیر میرا دم خفا کیوں ہے

حیا کا یہ تقاضا ہی ہی ہیں ہوں انکی آنکھوں ہیں
ادھر شوخی یہ کہتی ہی جہاں ہیں ہوں حیا کیوں ہے

خلش کے نام پر مرتی ہو کیوں باتیں بتاتی ہو
ہمیں الفت نہیں اس سے تو ہر دم تذکرہ کیوں ہے

خلیل

خلیل ۔ نواب صاحب ٹونک مندرجہ صفحہ ۲ - ۵۱

دل ناداں محبت میں پشیمانی سے کیا حاصل
جو ہونی تھی ہوئی اب سوچتا اچھا برا کیوں ہی

بتاؤ تو کھنچے کیوں ہو بتاؤ تو خفا کیوں ہو
یہ کھنچنا بے سبب کیسا یہ غصہ بے خطا کیوں ہی

جو کہتا ہوں جفا کا تمکو ارماں اسقدر کیوں ہے	تو کہتے ہیں تمھیں چاہت کا ایسا حوصلہ کیوں ہے
وہ کہتے ہیں کہ کہتے کیوں نہیں جو تمکو شکوہ ہے	کہونگا تو کہیں گے کیوں جی یہ میرا گلہ کیوں ہے

خورشید

خورشید - منشی خوشرفت علیخاں خلف داؤد خاں مندرجہ صفحہ ۱۷

بہت پھرا نہ بتوں نے سنی میری فریاد	خدا کے ہاتھ ہے خورشید فیصلہ دل کا
وہ صبح وصل کس کس نازسے ہمکو جگاتے ہیں	سدھاری رات اٹھو صبح محشر سر پہ آئی ہے

خیال

خیال - مولانا فیض الحسن صاحب خیال - سہارنپور کے باشندے - بڑے جید اوستاد اور فاضل دھر مانے جاتے تھے اور نیٹیل کالج لاہور میں پندرہ بیس برس تک علوم مشرقی کے پروفیسر رہے اور صدہا شاگردوں نے آپ سے فیض پایا۔ پروفیسر آزاد کے ہمعصر تھے سُنا ہے کہ خود مولانا مرحوم حضرت صہبائی کے نامور تلامذہ تھے چند شعر بڑی کوشش سے ہاتھ آئے بطور یادگار درج تذکرہ کئے گئے - مولانا شبلی کو بھی مرحوم سے تلمذ تھا۔

اِس جفا پر بھی کی وفا ہم نے	کیا کیا تم نے کیا کیا ہم نے
کرتے ہیں زہر سے علاجِ فراق	خوب سوچی ہے یہ دوا ہم نے
چھیڑ کر اُن کو بزم دشمن میں	جو نہ سننا تھا وہ سُنا ہم نے
کہتے ہیں جور بھی غنیمت ہے	جب کیا شکوۂ جفا ہم نے
ملا جو خاک میں کوئی تو قبر یہ بولی	کہ اتنے روز رہے آپ ایجناب کہاں

رونے میں نتھا جو تری آنکھوں کا تصور	آئے گُلِ نرگس مرے دامن میں کہاں سے
کسنے لیا اس چاند سے رخسار کا بوسہ	یہ داغ لگا یارُخِ روشن میں کہاں سے
اُڑتی تھی ابھی خاک گلستاں میں خدا یا	اکبار یہ پھول آ گئے گلشن میں کہاں سے

باب چہارم - ثنیں

تقاریظ و قطعات تاریخ خمخانۂ جاوید جلد سوم

تقریظ بجید کلک جواہر سلک فضیلت مآب کمالات انتساب جامع صفات صوری و معنوی فخر الاطبائے ہندوستان حاذق زمان شفیقی حکیم غلام کبریا خان صاحب دہلوی

خمخانۂ جاوید کو میں نے جستہ جستہ پڑھا، زمانہ حال کے شعرا کا اتنا مبسوط تذکرہ لکھنا درحقیقت میرے دوست لالہ سری رام صاحب جیسے باہمت، اور سخن شناس ہی کا کام تھا، جو انھوں نے نہایت جانکاہی، اور عرقریزی کے ساتھ پورا کیا، میرے خیال میں دنیائے اردو کی یہ بڑی مہم تھی جو اردو کے "اِس بہادر سپاہی" کے ہاتھوں سر ہوئی اردو میں بہت کم پڑھنے کے لائق کتابیں چھپی ہیں، خیرہ نداقی کا یہ عالم ہے، کہ محض سطحی نداق کی چیزیں ڈھونڈی جاتی ہیں، ادنی درجے کے ناول بار بار چھپتے ہیں، اور ایسی کتابیں جن سے پڑھنے والوں کے علم، قابلیت، میں کوئی مفید اضافہ نہیں ہوتا، مقبول بازار ہیں، عوام کے اِس نداق نے لکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے اور بہت کم اردو میں ایسی کتابیں چھپتی ہیں، جو لٹریچر کی کسی واقعی ضرورت کو پورا کرتی ہوں، اور اگر کوئی ایسی کتاب شائع بھی ہوتی ہے، تو قبولِ عام سے دور رہتی ہے

اِس جنس کی بدمذاقی نے اُردو ادب کے سرمایہ کو محدود کر دیا ہے، نہ اوریجنل کتابیں اس تعداد میں پیدا ہوتی ہیں، جو اُردو کی وسعت، اور وقعت، کے مناسب ہو، نہ غیر زبانوں کی اچھی اور سودمند، کتابیں ترجمہ ہوتی ہیں، اگر ترجمے بھی ہوتے ہیں تو محض معمولی ناولوں کے، جن کو پڑھکر نہ دل، نہ دماغ، میں روشنی پیدا ہوتی ہے، نہ اخلاق پر کوئی اچھا اثر پڑتا ہے، نہ تشنہ کام ذوقِ علمی سیراب ہوتا ہے ۔

جس زمانہ میں عام طور پر لکھنے والوں کی ہمت کا یہ حال ہو، اور جس زمانے میں تصنیف و تالیف کا معیار بلندی کی طرف اتنا کم اُبھرتا ہو، اُس زمانے میں یہ حیرت انگیز مثال ہے، کہ لالہ سری رام صاحب نے ایسی کتاب لکھی، اور اس کتاب کے لکھنے میں سالہا سال تک اتنی بڑی محنت و کاہش گوارا کی !!!

سچے جذبۂ علم دوستی کے بغیر چند گھنٹے بھی کوئی شخص اتنی محنت نہیں کر سکتا، جتنی محنت کہ انھوں نے مسلسل کئی برس تک کی ہے، انھوں نے ہزاروں اشعار کو پڑھ اور سمجھ کر، اور نقد، و تنقیح کے سانچے میں ڈھال کر، "خمخانۂ جاوید کی شکل میں پیش کیا ہے، اور " دورِ جدید" کے صدہا شعرا کے حالاتِ زندگی بہم پہنچانے میں جسقدر محنت، اور کوفت اُٹھانے کی ضرورت تھی اُسے اِس لئے گوارا کی ہے، کہ اُردو شاعری کی تاریخ " آبحیات "کے بعد ختم نہو جائے، اِنکے اس عزم راسخ کی بدولت یہ صدہا تذکرے اور ہزاروں اشعار، آج اس خوبصورت کتاب کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں، جس کا نام خمخانۂ جاوید ہے ÷

میں اپنے دوست کو جو اس بڑی علمی مہم کے فاتح ہیں، اِس مہتم بالشان فتح پر مبارکباد دیتا ہوں جو انھوں نے اُردو شاعری کے ' دورِ جدید' کو زندگی، اور موت، کی کشمکش سے بچانے، اور ' دورِ جدید' کے لیئے ' حیاتِ جاوید' بہم پہنچانے کی صورت میں حاصل کرلی ہے، اُردو شاعری، کے اِس دور کی یہ حیاتِ جاوید ہے، جو لالہ سری رام صاحب

کے عقدِ ہمت نے حاصل کرلی ہے، جس کی ٹھیک ٹھیک، قدر، و قیمت، اِس زمانے میں کیا ہو سکتی ہے؟ آیندہ زمانے میں ہوگی، جبکہ لوگ اُردو شاعری کے اِس پچاس سال کا تذکرہ ڈھونڈیں گے، اور اس دَور کی خصوصیات کو سمجھنے کے لیئے خمخانہ جاوید مشعلِ راہ ہوکر اُنکے سامنے آئیگی ؞

غلام کبریا خان - ۲۴-۲-۱۵ء

قطعہ تاریخ از فکرِ ارجمند و سادہ نشین ریاست نونہال گلشن امارت منشی سید التفات رسول صاحب ہاشمی تعلقہ دار سندیلہ نبیرہ و جانشین حضرت واسطی مرحوم

سخن شناس سرِ ایام صاحبِ ہمت
اداشناس کی ہوتی ہے قدر دلبر کو
لکھا وہ تذکرہ شاعرانِ ماضی و حال
جو کوئی دن کو کہے رات اور راتکو دن
نظر میں کیوں نہ ہو خمخانۂ سخن کا وقار
یہ ہاشمی نے لکھا سالِ طبعِ ثانی کا

جہاں کو جنکی بہار ریاض ہے مرغوب
حبیب بن کے ہوئے وہ ہر ایک کو محبوب
کہ جسکے شوق میں طالب بنا ہے ہر مطلوب
تو اِس سے بڑھکے نہیں کوئی بات بھی معیوب
ہے اہلِ دل کے لیئے باعثِ سرورِ قلوب
سخنوروں کی ہوئی یادگار بھی کیا خوب

۱۹۱۵ء

تقریظ از نتائج افکار گہر بار فخر شعرای زمان ناثر رنگین بیان سخن طراز جادو نگار مشاق طرز قدیم و نوی صاحب تصنیف کثیر منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی لکھنوی از ارشد تلامذہ منشی تدبیر الدولہ اسیر لکھنوی

خمخانہ جاوید کی دو جلدیں میں نے دیکھیں، اب تیسری کا انتظار ہے، یہ کیا چیز ہے؟ اِس سوال کا جواب اِس سبب سے مشکل ہے کہ قلم و دل نہیں بن سکتا –

اِس تذکرے نے اِدھر تو ہمیشہ کے لیئے مُردوں کو زندہ کیا، اور اُدھر ہمیشہ کے لیئے زندوں کو زندگی دی پچھلے شعرا جو گمنامی کے گورستان میں پڑے ہوئے تھے، وہ زندہ ہو گئے اور حال کے شعرا جن کو گمنامی ڈھونڈ رہی تھی وہ اُس سے بچ کے ناموری کی بلندی پر پہنچ گئے، لوگ کہتے ہیں کہ اُردو اور اُسکی شاعری زوال کیجانب جا رہی ہے، اور میں کہتا ہوں کہ وہ ترقی کے زینے پر چڑھ رہی ہے۔ ایک خمخانہ جاوید، میرے دعوے کی ایسی دلیل ہے کہ جو رد نہیں ہو سکتی ✤

اُردو کی خدمت کا دعویٰ جتنا آسان اُتنا ہی اُس کا پورا کر دکھانا مشکل ہے، اِس مشکل کو خدا جانے کتنی مشکلوں کے ساتھ دیوان سری رام صاحب ایم۔ اے۔ نے آسان کیا قابلیت، ہمت، دولت، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُردو کی محبت میں اُنھوں نے اپنی صحت تک صرف کر دی ✤

اِس تذکرے میں صرف اِتنا ہی نہیں ہے کہ شعرا کے نام جمع کر دیئے گئے ہوں، بلکہ مناسب حد تک، یا یوں کہو کہ جسقدر مِل سکی اُسقدر ہر شاعر کی لائف بھی موجود ہے، یہ ایک ایسی بات ہے جسکی قدر شاعری کی حیثیت سے نہیں بلکہ تاریخی حیثیت سے بھی کیجائے گی اولاد سے تو وہی تین پشتوں تک نام چلتا ہے، اور یہ تذکرہ اُس وقت تک ناموں کو روشن رکھے گا، جبتک علم کی ٹکسال میں حرفوں کے سکّے چلتے رہیں گے، اِس صورت میں یہ کہنا صحیح ہے کہ جس کا نام "خمخانہ جاوید" میں داخل ہوا، اُسکے خاندان پر حضرت مؤلف کا احسان رہا، جب چاہو اپنے باپ دادا کو اُسکے صفحوں پر دیکھ لو ✤

یہ آواز بھی ملک میں گونج رہی ہے کہ اُردو شاعری کا رنگ بدل گیا، اسکو میں تسلیم کرتا ہوں

(۱) زمانے کی رفتار نے بہت سے دماغوں کو فطری مذاق کا رستہ بتا دیا۔

(۲) تغزّل کا رنگ بدل گیا۔

پہلی بات سے میں بحث نکروں گا، اِس لیئے کہ وہ ایسی خوبی ہے جو اُردو کی شاعری

ہیں نہیں تھی اور اب آگئی ٭

دوسری بات کو میں بحث کے قابل پاتا ہوں، لیکن یہ وسیع بحث کا محل نہیں ہے مجھے اس موقع پر صرف اتنا ہی کہنا کافی ہے، کہ خمخانہ جاوید میں جذبات انسانی کے نقشے بھی موجود ہیں اور ادّعائی شاعری کے بھی، فہم سلیم دونوں کا موازنہ خود کر سکتا ہے۔ اور اگر میرا فیصلہ کوئی چاہے تو میں یہ کہوں گا کہ جذبات پر دل سے آہ نکلتی ہے، اور ادّعا پر صرف ہونٹوں سے واہ، دل اور ہونٹوں میں جو فرق ہے اس سے دونوں شاعریوں کا فرق سمجھ لیا جائے، اگر سخن سنج میں فہم سلیم کا مادہ موجود ہے تو وہ اس تذکرے کے ورقوں سے ایسا سبق لے سکتا ہے جو اسے صرف نام کا شاعر نہیں بلکہ کام کا شاعر بنا دے۔

انتخاب پر قلم کا اٹھانا کچھ مناسب نہیں ہے "خمخانہ جاوید" کا پھیلاؤ اتنا ہے کہ میں اسکو انتخاب کے دامن میں نہیں سمیٹ سکتا، صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اس میں ہر مذاق کے اشعار موجود ہیں، اور اس سے میں یہ عمدہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ حضرت مؤلف نے ہمہ گیر مذاق سے کام لیا ہے، میں اسکی مثال ایک ایسے آراستہ باغ سے دونگا جس میں مختلف رنگوں کے بیشمار پھول کھلے ہوں ۔ اگر ایک ہی رنگ ہوتا تو ایک ہی مذاق والے کی دلچسپی ہوتی اور اب ہر مذاق والا اپنی پسند کے پھول چن سکتا ہے ٭

لوگ سخن فہمی کو سخن وری سے زیادہ مشکل کہتے ہیں۔ یہ ہے بھی صحیح سخن ور اپنے مذاق کے موافق کہہ لیتا ہے، مگر سخن فہم کو ہر مذاق کی خوبیاں اور باریکیاں فہم رسا کی انگلیوں سے ٹٹولنا پڑتی ہیں، حاصل یہ کہ سخنوری کے لئے ایک ہی مذاق کی ضرورت ہے، اور سخن فہمی کے لیئے ہزار مذاقوں کی، میں دیکھتا ہوں کہ حضرت مؤلف نے قلمرو سخن فہمی پر اپنا ایسا سکہ بٹھا دیا ہے کہ اس کا انکار علم ادب کی عدالت میں ایک جرم قرار پا سکتا ہے، لوگ تو ایک ہی غزل کے انتخاب میں چکرا جاتے ہیں، اور انھوں نے ہزارہا انباروں کو چھان ڈالا، گویا عالم اردو کے سمندروں کو پھیر پھیر کر موتی نکالے ہیں ٭

ایک بڑا لطف یہ بھی ہے کہ عبارت سلیس، فصیح، متین اور سنجیدہ تحریر فرمائی جس نے مذاقِ نظم کے ساتھ مذاقِ نثر کو بڑھا کے حُسنِ سخن کو دوبالا کر دیا، اور پھر کتاب کو چھپوایا بھی ایسے عمدہ کاغذ پر اسقدر خوشخط کہ آنکھوں میں کھُبی جاتی ہے، گویا خمخانہ جاوید ایک ایسے معشوق کا نام ہے جو حسین بھی ہے اور نیز تکلفِ لباس اور جواہر کے زیوروں سے آراستہ بھی، میں حضرت مؤلف کو جتنی داد کا مستحق سمجھتا ہوں اُتنی داد کے لیئے مجھے الفاظ نہیں ملتے، آخر میں یہ دعا مانگتا ہوں کہ خدا لالہ سریرام صاحب ایم۔ اے کی عمر میں برکت دے اور آنکو ایسا تندرست رکھے کہ "خمخانہ کی ابتدا اپنی انتہا کو پہنچے، اور اسکے بعد پھر وہ اُردو کے خزانے کو اور جواہر سے بھرتے رہیں ٭ احمد علی شوق، قدوائی۔ اپریل ۱۹۱۵ء

اقتباس از نامہ عنبریں شمامہ چکیدہ خامہ جواہر سلک فخر شعراء دورِ جدید افتخار عرفی و طالب پیرو مرزا غالب مولانا میرزا رضا علی صاحب وحشت رئیس کلکتہ

مخدومی و محترمی۔ تسلیم و نیاز، گرامی نامہ شرفِ صدور لایا، اس ذرہ نوازی کے لیئے ہمہ تن زبان شکر گذار ہوں، اگرچہ جناب کی زیارت ابتک میسر نہیں آئی ہے لیکن آپکے غائبانہ مداحوں میں ہوں، اُردو لٹریچر کی جو خدمت جناب نے تذکرہ خمخانہ جاوید لکھکر فرمائی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے، زمانہ جانتا ہے اور مانتا ہے، میں اپنے دیوان کا ایک نسخہ خدمتِ عالی میں روانہ کرتا ہوں اُمید ہے کہ آپ اسکو قبول فرمائیں گے، خمخانہ کی تیسری جلد کے لیئے قطعہ تاریخ انشاء اللہ بہت جلد لکھ کر بھیجوں گا۔

آپنے جو الفاظ اس حقیر کی شاعری کے متعلق تحریر فرمائے ہیں اگرچہ میں اپنے کو ان کا مستحق نہیں سمجھتا پھر بھی شکریہ ادا کیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اس خبر کو دریافت کر کے کہ جناب علیل ہیں بہت افسوس ہوا، دعا کرتا ہوں کہ خدا

آپکو جلد صحتِ کامل عطا کرے کیونکہ آپکی ذات بابرکات سے بہی خواہانِ زبانِ اُردو کی اُمیدیں وابستہ ہیں ۔

نیاز مند رضا علی وحشت، ۲۲ ستمبر ۱۹۱۴ء

اقتباس از تحریر منشی سید محمد نوح صاحب نوح ناروی شاگرد رشید حضرت فصیح الملک مرزا داغ مغفور

خمخانہ جاوید کی تیسری جلد کا حال معلوم کر کے نہایت خوشی ہوئی، آپ باوجودیکہ اسقدر عدیم الفرصت ہیں لیکن پھر بھی جس مستعدی سے اُردو زبان کی خدمت کئے جاتے ہیں وہ ہر طرح قابلِ قدر ہے لوگوں کے کہنے سننے پر نہ جایئے، اپنا کام کیئے جایئے

محمد نوح، ۹ جولائی ۱۹۱۳ء

اقتباس از تحریر منشی علی محمد خان صاحب برق شاہجہانپوری

شہرہ سنا ہے جس سے ترا شوقِ دید ہے	پوری یہ آرزو ہو مری کیا بعید ہے

آپنے شعرائے ماضی وحال پر وہ احسان کیا ہے کہ زندہ تو زبانِ حال سے شکر گزار ہیں اور گذرے ہوؤں کا دوسرے لوگ تذکرہ پڑھکر شکر گزار ہیں، محمد حسن ۱۶ نومبر

اقتباس از عنایت نامہ مسٹر محمد حیات خان ڈپٹی پولیٹکل سکرٹری ہز ہائنس مہاراجہ صاحب سیندھیہ گوالیار

آپکی مرتبہ کتاب موسوم بہ "خمخانۂ جاوید" کی پہلی، دوسری جلد نظر سے گذری، واقعی آپنے بیحد کاوش سے اِس تذکرہ میں حالات شعرائے ماضی وحال اور اُنکے کلام کے نمونے جمع کیئے ہیں۔ آپ کی اِس بیش بہا خدمت کا جب تک کہ اُردو ادب زندہ ہے زمانہ مرہون منت رہیگا۔

محمد حیات خان دہلوی - ۱۵ فروری ۱۹۱۵ء

اقتباس از تحریر مولوی محمد یونس خان صاحب بی اے زمیندار آرہ

جناب من تسلیم عرض ہے، اتفاق زمانہ دیکھئے کہ جلد اول خمخانہ جاوید ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا ابھی تک اِس سے فیضیاب نہو سکا تھا، اب مجھے اس سے فیض حاصل کرنیکا موقع

ملا ہے، واقعی حضرت مؤلف نے سرشارانِ بادۂ سخن کو باخود ہا انٹرڈیوس کرانے اور اُنکے اشعار کے انتخاب اور اُنکی نسبت رائے قائم کرنے میں جو داد انصاف دی ہے اُسکی شکر گزاری سے سبکدوش ہونا کوئی آسان بات نہیں ہے وہ جہان ہے جسکے صلے میں حضرات شعرا کی جماعت کو زندگی بھر جناب مؤلف کیلئے دربار خداوندی میں دست بدعا رہنا چاہیئے

قطعۂ تاریخ از نتائج افکار گہربار محقق کامل فن مشاق قدیم سخنور ماہر منشی رام پرشاد صاحب طاہر دہلوی وکیل گوالیار شاگرد رشید مرزا صابر گورگانی مرحوم

چھپا خمخانۂ جاوید جس دم
ندا دی غیب دان نے لکھدے طاہر
لکھی تاریخ دیگر فکر کر کے
بصد آب و تاب و بکوشش تمام

دیگر

لکھی ہیں نے تاریخ فی الفور طاہر
چھپا جب تذکرہ خمخانۂ جاوید
سنِ عیسیٰ ہیں طاہر نے یہ لکھا

دیگر

پئے تاریخ پھر تو ہیں نے سوچا
چہ زیبا ہے بہارستان شعرا
نسیم گلشن اشعار عقلا ۱۳۳۳
یہ خمخانہ جاوید جس دم چھپا
گلِ تازہ اشعار فرحت فزا ۱۹۱۵ء
بصد آب و بصد تاب مستجل
گلستان مسرت خیز با دل ۱۹۱۵

دلا این گلشن شعار نادر (سنہ ۱۳۳۳ف)	با غنچۂ اشعار مصفا اعلیٰ (سنہ ۱۹۱۵ء)	مکمل مصفا باغ شعرا (سنہ ۱۹۱۵ء)
مخزن اشعار بین (سنہ ۱۳۳۳ھ)	خوشا این باغ (سمت ۱۹۷۱)	چہا این نادرہ باغ (سنہ ۱۳۳۳ھ)
گلستان شعرائے فایق "	مو بمو باغ سخن سنجان "	غنچۂ نادر زیبا (سنہ ۱۳۳۳ھ)

کسی خانہ کو مبدء قائم کر کے اُس کے اعداد لیجیے اور ایک خانہ چھوڑ کر دوسرے کے اعداد لیئے جاویں اِس طرح ایک ایک خانہ چھوڑ کر سات خانہ کے اعداد جمع کیئے جائیں سنہ ۱۹۱۵ء برآمد ہونگے۔
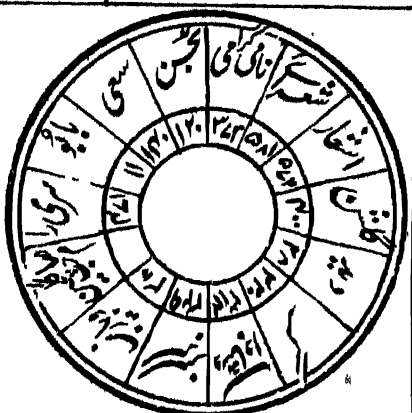
از نتیجہ فکر پر بہار پنڈت کامتا پرشاد صاحب مسرور ڈپٹی کلکٹر بجنور

مجموعہ کیا لالہ سری رام نے تالیف
ہر مطلع پُر نور ہے عبرت دہ خورشید

مسرور نے تاریخ دعائی یہ رقم کی
آباد و ہمیشہ رہے خمخانہ جاوید
۱۹۱۴ع

از نتائج افکار گہر بار منشی کنور بہادر فصیح لکھنوی تلمیذ منشی فدا احمد صاحب انش لکھنوی

حبذا خمخانہ جاوید را ترتیب داد
بر حقِ تالیف میگویم مؤلف را سلام

نامِ آں عالی خیال و پاک طینت برزبان
آید از ترتیب لفظی از سری و زلفظ رام

ساکن دہلی کہ شہرے است رشکِ باغِ خلد
پُر بہار و دلکش و دلچسپ مرغوبِ انام

جلدِ ثالث ہم بحمد اللہ در پایاں رسید
بہرِ اثباتِ تواریخش چنیں شد انتظام

در حروفِ معجمہ گفتہ بزبر و بینات
شد عجب این یادگارِ شاعرانِ خوش کلام
۱۹۷۱ ب

بود سالِ بکرمی آن عیسوی سال ست ویں
واقفاتِ شاعراں بہر وقوفِ خاص و عام
۱۹۱۴ع

سالِ ہجری ہاتفِ غیب از فصیح لکھنوی
گفت دراں نامہ حالات ہنرمنداں تمام
۱۳۳۲ھ

تصریحات حروف معجمہ بزبر و بینات

شد عجب این یادگار شاعران خوش کلام — بکرمی

نام حروف	تعداد حروف	اعدادی حرف	جملہ اعداد
شین	۳	۳۶۰	۱۰۸۰
جیم	۱	۵۳	۵۳
یا	۱	۳	۳
یا	۲	۱۱	۲۲
نون	۲	۱۰۶	۲۱۲
خا	۱	۶۰۱	۶۰۱
			۱۹۷۱

واقفاتِ شاعراں بہر وقوفِ خاص و عام — عیسوی

نام حروف	تعداد حروف	اعدادی حرف	جملہ اعداد
قاف	۲	۱۸۱	۳۶۲
تا	۱	۴۰۱	۴۰۱
شین	۱	۳۶۰	۳۶۰
نون	۱	۱۰۶	۱۰۶
یا	۱	۳	۳
حا	۱	۸۱	۸۱
خا	۱	۶۰۱	۶۰۱
			۱۹۱۴

گفت دراں نامہ حالات ہنرمنداں تمام — ہجری

نام حروف	تعداد حروف	اعدادی حرف	جملہ اعداد
نون	۵	۱۰۶	۵۳۰
تا	۲	۴۰۱	۸۰۲
			۱۳۳۲

قطعہ تاریخ از نتائج افکار شاعر فصیح حکیم محمد اسمٰعیل خان صاحب ذبیح دہلوی

ہاں ذبیح مضطرب بنشین خموش و زود خیز
در سیحی دوریابی کیف این آتشہ

شد الیقین تذکرہ را گو بگیر و زر بریز
طبع شد جلد سوم خمخانۂ جاوید بنہ

۱۹۱۵ء

قطعہ تاریخ از نتیجہ فکر گرامی واقف رموز شیریں بیانی سخنور یکتا صاحب طبع سلیم منشی سید صمیم علی شاہ صاحب صمیم بلند شہری

کیا ساغر جم ذوقِ حیاتِ ابدی ہے
ولدادہ ذکرِ شعرا یوسفِ جاں ہے
کسریٰ کا کہاں طاق کہاں قصرِ فریدوں
آنکھوں سے چھپا طور کے جلوہ کا ثبات آپ
کیونکر ہو زوال ابرئے سلکِ سخن کو
ہے وحشتِ دیوان سخن سر میں ازل سے
ایمان ہے اپنا تو یہی مصرعہ تاریخ

پیمانِ سخن ہے یہی پیمانہ جاوید
بازار میں ہے نظم کے بیعانۂ جاوید
یہ دائرۂ علم ہے کاشانۂ جاوید
ہے صبحِ معانی ہیں جلوخانۂ جاوید
نقطہ ہے ہر اک گوہر یکدانۂ جاوید
ایسا نہ صمیم اور ہے دیوانۂ جاوید
واللہ کہ بے مثل ہے خمخانہ جاوید

۱۳۳۲ھ

نثر و قطعہ تاریخ چکیدہ خامہ عنبریں شمامہ شاعر خوش بیان سخنور یکتہ دان منشی مظفر حسین مظفر سلیمانی شاہ آبادی مؤلف حیات مسیح و دیگر تصانیف کثیرہ

چونکہ جناب نے احسان کرکے دوسروں کے نام زندہ کرنیکا بیڑا اٹھایا ہے اس لئے اور دل سے آپکی زندگی و صحت کے لیے بارگاہ احدیت میں دست بدعا ہیں اور یقین خاطر کمترین ہے کہ یہ دعا درجہ اجابت کو پہنچیگی مظفر حسین ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۴ء
(اقتباس از نامہ مرقومہ ۲۲ ستمبر ۱۹۱۴ء) جناب کی علالتِ مزاجی کا حال معلوم ہو کر دل کو سخت افسوس ہوا اور تردد ہوا شافی مطلق جلد جناب کو صحت و شفائے کلی عطا فرمائے اور راقم کمال محبت سے بطور تبارک یاد یہ غسل صحت کا قطعہ لکھے، فی زمانہ آپکا دم غنیمت ہے آپنے وہ کام کیا جس سے علمی بنیاد زندہ ہو رہی ہے خداوند کریم آپکو زندہ رکھے اور آپکے ذریعہ اہلِ کمال کا نام روشن کرائے مظفر حسین سلیمانی، ۲۲ ستمبر ۱۹۱۴ء

برآمد چوں پری جلدِ سوم از بزم خمخانہ ۔۔۔ برائے دہر از تصنیف دلکش زیب غازہ شد
مظفر جُست چوں تاریخ بہرِ سالِ تالیفش ۔۔۔ ندا آمد بہار بوستانِ عشق تازہ شد

بہرام صاحب کی تالیف سے ۔۔۔ ہوئی ختم پہلے ہی جلد دوم
الیضاً
مظفر اس حصہ کی تاریخ لکھ ۔۔۔ خداوند نعمت ہے جلد سوم

الیضاً

ایسے ساقی کو خداوند سلامت رکھے ۔۔۔ ذات سے جسکی کھلا باب ہے خمخانہ کا
تذکرہ ایسا خوش اسلوب مرصع لکھا ۔۔۔ رنگ پھیکا کیا جسنے ہر اک افسانہ کا
تیسری جلد ہوئی مثل پری کے تیار ۔۔۔ دور چلنے لگا اب تیسرے پیمانہ کا
جسکو دیکھو وہ ہے سرمست کہیں بھی کیوں ہیں ۔۔۔ ایک عالم کو ہوا شوق ہے یارانہ کا
بادہ نوشانِ سخن ہیں یہ دعائیں دیتے ۔۔۔ بانی زندہ رہے یارب عرب خمخانہ کا
غسلِ صحت ہو مؤلف کو الٰہی حاصل ۔۔۔ لُطف قائم رہے اِس فن اُنسے کاشانہ کا
فکرِ تاریخ مظفر ہے اگر یہ لکھدے ۔۔۔ تیسرا دور ہوا عطر ہے میخانہ کا

اقتباس از عنایت نامہ و قطعہ تاریخ نتیجہ طبع وقاد ناثر باکمال ناظم شیریں مقال طوطی شکرستانِ فن ڈراما نویسی منشی ونایک پرشاد صاحب طالب بنارسی تحرید جناب داغ و حضرت راسخ

آپکے تذکرہ کی پہلی جلد میرے پاس ہے اسکو باربار پڑھا کرتا ہوں، آپنے کچھ ایسی مٹھاس اسکی تحریر میں ڈالدی ہے کہ سو دفعہ پڑھکر بھی نیت نہیں بھرتی، سچ تو یہ ہے کہ یہ تذکرہ لکھکر آپنے وہ کار نمایاں کیا ہے جسپر ہم ہندو جسقدر فخر کریں بجا ہے خدا ایسے فخر ملک و قوم کو سلامت باکرامت رکھے، براہ خداوندی مطلع فرمائیں کہ حرف ط کی نوبت کب آئیگی، ابتو بقیہ جلدیں بھی نکل جائیں تو بہتر ہے کہ ہم لوگ اپنی زندگی ہیں درشن کرلیں۔ طالب بنارسی ۲۶ مئی ۱۹۱۳ء از بمبئی

عالیجاہا تذکرہ جلد دوم شرف صدور لایا، ممتاز فرمایا، سبحان اللہ کیا خوب لکھا ہے اور کمال کیا ہے، آپنے بیشک خونِ جگر کھایا ہے، آنکھوں کے تیل سے یہ غیرتِ طور چراغ جلایا ہے ہماری ہندو قوم کے تاجِ افتخار میں ایک نیا اور قابلِ اعزاز طرہ لگایا ہے خدا آپکو سلامت باکرامت رکھے اور تمام و کمال تذکرہ شائع کرا دے، آپکی علالت سے دلکو سخت رنج ہے کیونکہ آپ مالی اور جسمانی

تکلیف اٹھاکر ایک بڑا مفید کام کر رہے ہیں جس پر آپ نے اپنی ذاتی منفعت قربان کردی، شافیٔ حقیقی آپ کو صحتِ تامہ عطا کرے۔ طالب بناری ۲۰ اکتوبر ۱۹۱۴ء

جب ہوا سلطانِ شرق اسپِ فلک پر سوار — آکے نقیبِ سحر ہوگیا خدمت گذار
مخزنِ گل شاخسار مستِ ترنم ہزار — لائی صبا رو بکار، آئی چمن میں بہار
لال مَی لالہ رنگ سُرخ رُخِ مَی گسار — موج میں دستاں سرا لہر میں ہر آبشار
شعبدہ گر چرخ نے پھونک کے سحر سحر — کردیا سادہ سفید سقفِ جواہر نگار
آنکھ کھلی میری جب دیکھا تماشا عجب — طرفہ دو رنگی تمام دہر میں ہے آشکار
کوئی ہے آشفتہ حال کوئی پریشان خیال — کوئی شکارِ غمِ عسار، کوئی ہے دولت مدار
عالمِ ناسوت یہ عالمِ مبہوت ہے — آدمی کیواسطے آفتوں کا ہے حصار
دام میں ہے ایک کے طائرِ عیش و نشاط — ایک جفادیدہ ہے شیرِ الم کا شکار
کوئی غمِ ہجر میں جان سے مایوس ہے — کوئی ہے دلدار کے وصل کا امیدوار
ایک جو سر دار ہے۔ ایک سرِ دار ہے — ایک کو تحقیر ہے ایک کو ہے افتخار
اشرفِ مخلوق ہے آدمی اس دہر میں — لیکن اسے بھی نہیں دارِ فنا میں قرار
روز ملالِ حیات۔ روز خیالِ ممات — زیست ہے مثلِ حباب، جان مثالِ شرار
ایک نفس کے لیے آفتیں ہیں لاکھ لاکھ — ایک بشر کے لیے عارضے ہیں اک ہزار
سبزۂ خطِ یار سے، زینتِ لب یار سے — سبزۂ بیگانہ سے، آج چمن میں بہار
اسکی شہادت کو صاف باغِ جہاں ہے عیان — ہمسرِ انگشت ہے سرو لبِ جوئبار
شاہدِ معنی ہے آج جلوہ نما یا کہ ہے — ناقۂ انشا پہ لیلیٔ محمل سوار
نقدِ گلِ نظم سے، گلشنِ ایجاد میں — دامنِ دولت سے ہے آج دامنِ ہر گلعذار
ساقیٔ گلفام نے دی مَے لالہ رنگ — کیفِ دلاویز سے مست ہوئے بادہ خوار
پاکے الم سے فراغ۔ ہوگیا دل باغ باغ — روضۂ امکان میں ہے آج، آئی نرالی بہار

چھاپ کے اک تذکرہ لالہ سری رام نے
نسخۂ اعجاز کا، چھاپ دیا اشتہار

آدھوئی آب بن گئی مثل گلاب
سینچ کے فرحت کا باغ اسکو کیا آبدار

ایک نئے چاند کا بن گیا عالم چکور
ایک گل سرخ کے بن گئے بلبل ہزار

بن گئے موتی وہ آج اسکے سر شاخ گل
قطرۂ شبنم سے چرخ گرچہ ہوا اشکبار

لالہ سری رام کے اس گل شاداب پر
رشک سے گلزار میں لالہ بھی ہے داغدار

کون سری رام ہے؟ وہ منصف والا حشم
کون سری رام وہ صاحب عالی وقار

منصف علم و کمال، منصف شعر و کلام
آپکے اجلاس کے فہم و ذکا پیشکار

کرم بیاں مدح میں جسکے امیر و غریب
رطب لسان صف بہ صف جسکے صغار و کبار

نقد دل و درد مند نذر کو لائیں یہاں
بیٹھے ہیں انشا و میر لوگ جو کھائے ادھار

اسکے طلبگار ہیں عالم و اطراف میں
مفلس و محتاج سے تا بہ سلیمان وقار

دولت و دینار سے محسن بسیار سے
ڈالی مؤلف نے طرح تذکرۂ خوشگوار

جلد بھی کچھ کم نہیں جلد گل اندام سے
نقطۂ حرف کلام اختر جلوہ شعار

شاعروں کے ہیں کلام حسن معجز نظام
باغ شگفتہ ہے ایک روح فزا پر بہار

خط کی کتابت تمام مثل خط حور وش
کاغذ شفاف و صاف چہرۂ سیمیں عذار

حسن میں ہے انتخاب صف میں ہے لاجواب
ہے یہ دل آرا کتاب ایسی جو ہو زرنگار

کھائیں مٹھائی تو ہے درد مفاصل کا ڈر
کھائیں کھٹائی تو ہو ضعف سے حالت نزار

ایک سے صفرا کا ڈر، ایک سے سودا کا خوف
ایک سے خوں کو ضرر، ایک سے بلغم کو عار

چین کسی طرح سے، دہر میں دل کو نہیں
کونسی امید پہ جان کو آئے قرار

زال ہے دنیائے دوں حسن ہے اسکا فسون
کون ہوا سپر نثار کون کرے اسکو پیار

قسمت انسان نہیں جیب گل باغ نشاط
بلبل دل کے لئے دام ہے ہر مرغزار

بار سے پھولوں کے ہیں زیب چمن جو نہال
پڑتے ہیں گلچیں کے ہاتھ ان پہ یہاں بار بار

تارِ گُل ہے اگر تارِ رگِ عندلیب
حوضِ چمن ہے اگر ہے یہ چشمِ پُرآب
دارِ فنا ہے سرا، آج رہا کل گیا
آئی صدا ناگہاں، طالبِ سینہ فگار
خانۂ قدرت میں دیکھ آئینہ روزگار
برگِ درختانِ سبز، در نظرِ ہوشیار
کوئی دم اندھیر ہے کوئی گھڑی روشنی
حیرتوں سے انتساب ہر کا ہی انقلاب
مرد بہادر سگر، مرتے ہیں ایک ہی دفعہ
آپ سے آتا ہے کون آپ سے جاتا ہے کون
لائی ہے سب کو حیات، آئی ہے سب کو اجل
ہے وہ بشرِ نیک مرد، ہے وہ شرافت میں فرد
دیکھ نئے آب کے ایک گلوں کا چمن
نظم کی پیچیدہ زلف دیکھ سے جسے دیکھ کر
آیا ہے وہ شوخ چشم گلشنِ عالم میں آج
طالبِ دل خستہ کی ہے یہ دعائے ولی

دامنِ گُل ہے اگر آفتوں سے تار تار
قامتِ شمشاد ہے واسطے قمری کے خار
طالبِ دنیا نہ ہو کوئی یہاں زینہار
(۲) کعبہ نہ عبث جان زار ہو نہ عبث سوگوار
سعدی کی گفتار کو یاد رکھے غمگسار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار"
مظہرِ اسرار ہیں روز کے لیل و نہار
ہوش ہوا ہے یہاں صبر و خرد ہیں فرار
بزدلوں کو موت ہے آئے دن اور بار بار
ہے اجل و زیست پر کسکو یہاں اختیار
ہے کبھی آغوشِ یار، ہے کبھی کنجِ مزار
جورِ تسلیم میں جا کے رہے بُردبار
دیکھ نئے رنگ کے لائے وگل کی بہار
سنبل و ریحاں کی زلف کو بھی ہوا انتشار
دیدۂ نرگس کو بھی جس کا رہا انتظار
دہر میں یہ تذکرہ ہو سندِ روزگار

تاریخ

جب چھپی جلدِ سوم "خمخانۂ جاوید" کی
غیب سے پیدا ہوئی ناگاہ ہاتف کی ندا
ہے یہ "ہزار داستان" کیا ہی عجیب تذکرہ
طبع رواں مری ہوئی، طالبِ سالِ طبع جب

ہمنے کی تاریخ کی تفتیش رشن کر حالِ طبع
تذکرۂ تقسیم سے نکلے گا طالبِ سالِ طبع
۱۹۱۳ء
مونس ہر فریق ہے غم زدوں کا رفیق ہے
آئی ندائے ہاتفی، تذکرہ عتیق ہے

تقریظ و تاریخ ریختۂ کلکِ جواہر سلک شاعرِ یکتا ناثرِ بے ہمتا محقق والا نظر سخن گستر

معدن صدق و صفا منبع فہم و ذکا تصنیفی منشی ترائن پرشاد صاحب مہر شاگرد رشید نواب فصیح الملک مرزا داغ منصرم محکمۂ تعلیمات ریاست گوالیار

ہر بات جہاں میں شعرا کی ہے نرالی
ہو واقعہ کوئی کہ ہو مضمون خیالی

جادو کا اثر رکھتی ہے تقریر دل آویز
انکا کوئی مضموں نہیں تاثیر سے خالی

ٹکسال ہے یا انکی طبیعت ہے الٰہی
سانچے میں ڈھلی نکلی ہے جو منہ سے نکالی

وہ مال ہے انکے سخن نغز کی پونجی
جس کا بجز انکے کوئی وارث ہے نہ والی

آزردہ کسی حال میں انکو نہیں دیکھا
سر پر جو پڑی انکے وہ خوش ہو کے اٹھا لی

ہر وقت رہا کرتے ہیں خوش فکر سخن میں
جاتی نہیں انکے کبھی چہرہ کی بحالی

چپ بیٹھے تو لب پر ہوئی قربان خموشی
کی بات تو ہر بات میں اک بات نکالی

اس طرح چہکتے ہیں یہ گلزار سخن میں
گویا روش بلبل خوش لہجہ اڑا لی

سیکھے کوئی ان لوگوں سے انداز تکلم
رندوں سے اگر بات کی تو شیخ پہ ڈالی

جو بات یہ کہہ دینگے پھر اس سے نہ ہٹینگے
ہٹ جائیں اگر قطب جنوبی و شمالی

ہر پھول سے یہ گوندھتے ہیں ہار سخن کے
ہے انکی طبیعت چمن نظم کی مالی

تشبیہ اگر ڈھونڈتے ہیں سرخی لب کی
گلشن سے یہ پھولوں کی اڑا لاتے ہیں لالی

ہر چشم گہربار کے اشکوں سے بنا کر
موتی کی پہنا دیتے ہیں یہ کان میں بالی

مر جاتے ہیں یہ دیکھ کے انداز خموشی
جی جاتے ہیں سنکر لب جاں بخش سے گالی

اللہ رے نزاکت نہ دہن ہے نہ کمر ہے
دنیا سے الگ انکا ہے معشوق خیالی

دیکھو تو انھیں پیار کی باتوں میں انھوں نے
کس پیار سے اردو کی زباں تھی کبھی پالی

جس طرح سے چاہیں یہ کریں صرف در نظم
قدرت نے انھیں سونپی ہے اس گنج کی تالی

جی چاہا تو جاگی ہوئی قسمت کو سلایا
بن آئی تو بگڑی ہوئی تقدیر بنا لی

دل میں جو سمایا کوئی انداز جنوں کا
مجنوں کی طرح سر پہ ہیں خاک کی ڈالی

صحرا میں لگی پیاس تو شکوے سے بجھا لی
جنگل میں لگی بھوک تو ٹھوکر کوئی کھا لی

زاہد کی مذمت سے کیا ہے کبھی جی خوش
میخانے کی تعریف سے رندوں کی دعا لی

یا ہجر کی شب بند کیے دل میں سب ارمان
یا وصل کی شب حسرت دل خوب نکالی

یا دل ہی میں اک شوخ کو مہمان بلا کر
آئی ہوئی سر پہ سے گھڑی ہجر کی ٹالی

جنت میں بھی دنیا کے حسیں یاد رہے ہیں
اللہ رے ان لوگوں کی آشفتہ خیالی

عشق انکا مگر پاک ہے عاشق ہیں یہ اس پر
ہے دلکے مرقع میں جو تصویر خیالی

لاتے نہیں چھپ چھپ کے یہ میخانے سے بوتل
واعظ کی پڑی آنکھ تو دامن میں چھپا لی

یہ رند سیہ مست ہیں صہبائے سخن کے
انکے لیے آتی ہے گھٹا جھوم کے کالی

پیتے ہیں یہ ہر وقت مئے ناب سخن کی
خالی کبھی رہتی ہی نہیں انکی پیالی

خمخانۂ جاوید سے مے ان کو پلا کر
ساقیٔ ازل نے کیے خم سیکڑوں خالی

دنیا میں بھی انکے لیے اک بحر کرم نے
خمخانۂ جاوید کی بنیاد ہے ڈالی

اب اس میں یہ سب زندۂ جاوید رہینگے
صورت یہ نئی انکی بقا کی ہے نکالی

خمخانۂ جاوید ہے یا بزم سخن ہے
ہیں اس میں ہزاروں شعرائے ماضی و حالی

یہ تذکرہ وہ تذکرہ ہے جسکے سخنور
رکھتے ہیں یہ رتبہ جو ہے اعلیٰ سے بھی عالی

اس تذکرہ میں اب وہ نظر آتے ہیں ہمکو
جن لوگوں کی صورت نہ کبھی دیکھی نہ بھالی

انکے لیے دیکھے ہیں کئی ہند کے قصبے
انکے لیے چھانے ہیں بہت شہر و حوالی

اس کام میں دولت بھی مصیبت بھی اٹھائی
جب جاکے ملے یہ در مضمون خیالی

مشہور سخنگویوں کے لکھے ہیں فسانے
گمناموں کی گمنامی پہ اک روشنی ڈالی

شاعر جو گرے جاتے تھے پھر انکو ابھارا
بیقدری نے جو بات بگاڑی تھی بنائی

ہر ایک کے اس طرح کیے منتخب اشعار
جس طرح پرکھتا ہے کوئی لعل و لآلی

کلیاں چنیں ہر طرز کی ہر باغ سخن سے
ہر رنگ کے پھولوں سے بنائی ہے یہ ڈالی

حالات دل آویز ہیں اشعار ہیں دلکش
دیکھے انھیں اب آنکھ جو ہو دیکھنے والی

اُٹھے گی کسی کے نہ اُٹھائے سے جہاں میں
یہ پوٹ جو احسان کی ہے باندھ کے ڈالی

مٹنے سے بچایا ہے فنِ شعر و سخن کو
یہ لالہ سری رام کی ہے ہمتِ عالی

ہیں نیک دل و نیک منش نیک طبیعت
دل انکا ہے بغض و حسد و رشک سے خالی

ہیں صاحبِ جود و کرم و دولت و ثروت
اللہ نے بخشا ہے انھیں رتبۂ عالی

فاضل نہیں، ہیں ورثۂ افضال کے وارث
عالم نہیں، ہیں مملکتِ علم کے والی

ہے شوق لڑکپن سے انھیں شعر و سخن کا
اِس کام کی بنیاد اسی شوق نے ڈالی

اِس کام کا کیا کہنا یہ وہ کام ہے جس سے
مُردوں کو کیا زندہ تو زندوں سے دُعا لی

دیدیے رُوپے سینکڑوں دیواں لیے ہیں
ایسوں سے جنھوں نے یہ گراں جنس چھپا لی

اُن لوگوں کے دیوان بھی چھپوائے انھوں نے
شہرت کو سمجھتے تھے جو اک خام خیالی

بالیں پہ گئے اُنکی جو دم توڑ رہے تھے
دب جاتی جو ساتھ اُنکے وہ دولت بھی نکالی

تلچھٹ سے کیا صاف ہر اک جامِ سخن کو
ہر اک کی پیالی یوں نہیں آنکھوں سے کھنگالی

ہر طرح سے چمکایا غرض اہلِ سخن کو
حالت شعرا کی بخدا خوب سنبھالی

ہندو کی، مسلمان کی تفریق نہیں کچھ
ہے قابلِ تعریف یہ آزاد خیالی

یہ تذکرہ مجموعہ ہے اشعار کا نادر
تاریخِ سخن ہے یہ زمانے سے نرالی

دو جلدیں اِسی تذکرہ کی پہلے چھپی ہیں
اب تیسری جلد اسکی یہ چھپوا کے نکالی

اِس جلد میں جتنے شعرا جلوہ نما ہیں
ہے مرتبہ اُنکا مری تعریف سے عالی

یوں اسکی چمکتی ہے سفیدی و سیاہی
جس طرح کوئی رات ہو اُجلی کوئی کالی

ہے خوب لکھائی تو چھپائی بھی ہے مرغوب
ہر طرح سے یہ نُور کے سانچے میں ہے ڈھالی

کیا آپ سے کیا بات ہے اِس جلد کی واللہ
حُسّاد نے بھی دیکھ کے جاں اپنی جلا لی

ہے دیکھ کے اسکو یہ دُعا مہر کے لب پر
اللہ کرے اور بڑھے ہمتِ عالی۔

قطعۂ تاریخ از رشحات قلم جادو رقم شاعر نکتہ پرور سخن گستر منشی کاظم حسین صاحب محشرؔ لکھنوی

یہ شاعروں کا تذکرہ یا جام ہے جمشید کا — جی چاہے جس سے ملنے کو مل لو کہیں جو دب
جانکاہیوں پر آفریں، واہ اے مصنف واہ وا — تحریر میں حالات کے کیا کیا اٹھائے ہیں تعب
زندہ ہیں جس سے زندہ دل مردوں پہ احسان سطور — تاریخ اہل فن لکھی محنت اٹھائی روز و شب
دفتر یہ نظم و نثر کا لکھا گیا ہے بے نظیر — جسکے تمام اوراق ہیں سو سو ترقی کے سبب
محشرؔ نے سال طبع کو یوں خامہ پر لکھ دیا — خمخانۂ جاوید میں ہے نسخۂ حسن ادب
۱۹۱۵ء

قطعۂ تاریخ تراوش خامۂ جادو نگار مجموعۂ فصاحت و بلاغت گلدستۂ ذہانت و ذکاوت شاہد باز رعنائی خیال شاعر باکمال جناب پروفیسر مولنا حامد حسین صاحب قادری ساکن بچھرایوں پروفیسر بڑودہ کالج

تذکرہ مطبوع شد "خمخانہ جاوید" نام — ہست این کان سخن جان سخن شان سخن
حامدؔ اگر فکر داری سال ترتیبش بگو — میکدہ گویا کشادہ بہر مستان سخن
۱۹۱۴ء

ایضاً

ڈھنگ ہیں سارے حسینان جہاں — تذکرہ میں ہے وہ شان دلبری
چھپ کے جب نکلا تو دل نے یہ کہا — آج نکلا تذکرہ بنکر پری
۱۹۱۴ء

ایضاً

کیفیتیں درج تذکرہ ہیں — سب فن سخن کے ماہروں کی
حامدؔ لکھو سال جلد ثالث — تاریخ ہے یہ بھی شاعروں کی

ایضاً

گل اشعار سخن سنجاں سے — ہوا آراستہ کاشانۂ نظم
کہدو تاریخ اشاعت حامدؔ — یہ بھی اچھا ہے پریخانہ نظم
۱۹۱۵

ایضاً

اسی تذکرہ سے ہے رونق سخن کی — کیا اس نے احسان سب شاعروں پر
کہی اسکی تاریخ حامدؔ نے فوراً — یہی بادۂ شاعری کا ہے ساغر
۱۹۱۵

ایضاً

حوریں ہیں جس میں نثر کی جنت یہی ہے وہ — پریاں ہیں جس میں نظم کی وہ قاف ہے یہی
تاریخ ایک مصرعۂ روشن سے ہے عیاں — آئینۂ عروس سخن صاف ہے یہی
۱۳۳۳ھ

ایضاً

شایقِ فنِ سخن کے واسطے　　کچھ عجب دلچسپ مجموعہ ہے یہ
کہدو حامد تذکرہ کا سالِ طبع　　ظاہر و باطن ہیں دونوں زیب دہ

ایضاً

یہ تذکرہ ہزار دستان　　شائع ہوا با ہزار تزئین
جلوہ گستر ہیں تذکرہ میں　　اہلِ سخن پسین و پیشیں
ہیں صاحبِ تذکرہ سپہر مرام　　بیشک ہیں وہ مستحقِ تحسین
وہ رشکِ مصورانِ چیں ہیں　　یہ رشکِ نگار خانۂ چیں
دو سال ہیں ایک مصرعے میں　　(باغِ نیرنگ) و (باغِ رنگیں)

صاحبِ تذکرہ ہیں خود ساقیِ بادۂ سخن　　ساقیِ بادۂ عنب آپ سا ذی کرم نہیں
ساغرِ بادہ ہیں وہ سب شعر جو تذکرہ میں ہیں　　جن کے مقابلے میں کچھ قیمتِ جامِ جم نہیں
سال کی فکر تھی مجھے ہاتفِ غیب بول اُٹھا　　میکشِ شاعری کو بھی میکدہ ہے یہ کم نہیں

ایضاً

واہ کیا باغِ سخن آج نظر آیا ہے　　شاد ہر شاعرِ اردو کا دلِ غمگیں ہے
شعرا اسکے ہیں مالک تو مولف اسکا　　باغباں اسکا ہے اور لائقِ صد تحسیں ہے
جو غزل اسمیں ہے گلبن ہے تہ شان میں کم　　تذکرہ کا جو خریدار ہے وہ گلچیں ہے
بوئے گل سے ہیں سوا روح فزا معنیٔ شعر　　شاخِ گل شعر ہے ہر لفظِ گلِ رنگیں ہے
دیکھی یہ شان تو حامد نے یہ تاریخ کہی　　واہ یہ تذکرہ اک گلشنِ نو آئیں ہے

قطعات تاریخ تراوشِ خامۂ جادو طراز شاعرِ بے نظیر سخنورِ پُر تاثیر منشی گوری شنکر صاحب قیصر اسپکٹر چونگی شاگرد حضرت ظہیر مغفور و برادر سخنور باکمال منشی بہاری لال مشتاق

جلوہ گر یہ کونسا حجلت وہ ہتا ہے　　آج ہے اللہ کیسا نور افشاں آسماں
کہہ رہا ہے آج کچھ عقدِ ثریا کا نکھار　　کر رہے ہیں کہکشاں سے کچھ ستارے شوخیاں
دل میں اُتری ہے کھبی جاتی ہے آنکھوں میں بہار　　رنگِ عارض کیا حسینوں کا شفق میں ہے عیاں
چاندنی چٹکی ہوئی پھیلی ہوئی ہے بوئے گل　　باغِ عالم بن گیا ہے رشکِ گلزارِ جناں

کو نشا ہے شاہدِ رنگیں ادا جلوہ نما
چھوٹتی مہتاب کے رخ پر بھی ہیں مہتابیاں

فرطِ عشرت ہر طرف وہ نور برسانے لگا
کر دیا ہے چار جانب ایک نورانی سماں

یک بیک مغرب کی جانب سے اٹھی کالی گھٹا
بجلیاں ہیں جسکی رگ رگ میں نظر آتیں طپاں

دور سے پانی کی لہریں صاف آتی ہیں نظر
اسقدر لبریز ہے ابرِ سیہ دامن فشاں

آ رہی ہیں کیا ہوائیں عطر افشاں سرد سرد
ہو گیا جس سے مشامِ جاں بھی رشکِ بوستاں

عطر افشاں ہے صبا تو ابر گوہر ریز ہے
پڑ رہی ہیں آسماں سے ننھی ننھی بوندیاں

ہو گیا ہے صاف اب گردِ کدورت سے چمن
بن گیا صحنِ گلستاں مثلِ قلبِ صوفیاں

کھل رہے ہیں پھول ہر سو بوئے خوش سے ہر طرف
ہو گئی ہے کیا دو چنداں زیبِ گلزارِ جہاں

شاخِ گل مستی سے آتی ہے نظر ساغر بدست
مست ہو کر اس طرح کچھ جھومتی ہیں ڈالیاں

اک فقط گل ہی نظر آتا نہیں رنگیں قبا
باندھ لیں کلیوں نے بھی سر پر گلابی پگڑیاں

پھر رہی ہیں آج اترائی ہوئی کیا بلبلیں
نغمہ سنجی میں ہے جنکی اک مسرت کا نشاں

سبزۂ بیگانہ بھی اب تو یگانہ بن گیا
سبزہ رنگوں کی طرح ہے سبز سارا گلستاں

دل میں کہتا تھا یہ میں اللہ ہے کیسی خوشی
کیوں مسرت ریز ہر سو ہو گیا سارا جہاں

اب نہیں عشاق کے لب پر کہیں آہ و بکا
بیوفائی چھوڑ بیٹھے ہیں حسینانِ زماں

ابروؤں کے بانکپن میں اب نہیں اندازِ ظلم
اب نہیں ہے تیغ جوہر دار وہ موئے میاں

مطلعِ مہر و وفا کا صاف ہے آنکھوں میں رنگ
مصرعۂ برجستہ گویا بن گیا قدِ بتاں

اب نہیں ترچھی نظر میں تیر کے انداز وہ
اب نہیں لیتی ہے بل کی کاکلِ عنبر فشاں

اٹھ گیا جور و ستم کا اب زمانے سے رواج
بن گئے ہیں اب جہاں میں عیب سارے خوبیاں

شاہدِ رنگیں ادا نے سحر کچھ ایسا کیا
سبکو یکساں کر دیا ہے اے **قصیر** نکتہ داں

کچھ خبر بھی ہے تجھے غفلت تری یہ تا کجا
ہو گیا عالم میں اک ناز آفریں جلوہ کناں

چھپ گئی جلد سوم **خمخانۂ جاوید** کی
جس میں لکھا ہے کلامِ نغز گویانِ جہاں

واہ اے لالہ سری رام اے سخن پیرائے دہر
کر دیا مخمور اک عالم کو وہ ساغر دیئے
ہے یہ مے اک آتشہ، دو آتشہ، سہ آتشہ
چھانٹ کر شائع کیا ہے وہ کلام دلپسند
ہے سکندر کا یہ آئینہ کہ جام جم کہوں
چھپ چکا جب تذکرہ لالہ سری رام آپکا
اسکے چھپ جانیکا سمت تو یہ لکھدے اے قصیر

واہ اے خمخانۂ جاوید کے پیر مغاں
ہو گئے پُر کیف اس مے کے جو ہیں لذت چشاں
حال و ماضی کی ہے اس مینا میں رنگت بیگماں
جسپہ شیدا ہو گئے ہیں کل حسینانِ جہاں
لکھ نہیں سکتا جو لکھے کوئی اسکی خوبیاں
دی ندا یہ ہاتف غیبی نے مجکو ناگہاں
ہو گیا خمخانۂ جاوید مشہور جہاں

لوگ قربان ہو کے کہتے ہیں
آنکھیں دنیا کی ہو گئیں روشن
شعلۂ خوشاعروں کا لکھا ہے حال
سالِ تاریخ ہے قصیر یہی

غیرت حور تذکرہ یہ ہے
واہ کیا نور تذکرہ یہ ہے
روکش طور تذکرہ یہ ہے
چشم بد دور تذکرہ یہ ہے
۱۹۱۴ء

دیگر

سری رام صد آفریں آپ کو
زبانوں پہ دنیا کی ہے اس کا نام
مجھے اسکی تاریخ کی فکر تھی
ندا غیب سے آئی لکھدے قصیر

بہ محنت سے لکھا ہے کیا تذکرہ
اسی کا ہے اب جا بجا تذکرہ
یہی دوستوں میں ہوا تذکرہ
عجب شان کا جاں فزا تذکرہ
کھلا آج جوہر سری رام کا
کہ نامی ہے دفتر سری رام کا
۱۳۳۲ھ

دیگر

عیاں تذکرہ کی ہوئیں خوبیاں
قصیر اسکی تاریخ ترتیب لکھ
لکھا کیا تذکرہ لالہ سری رام
قصیر اس کا لکھو تم سالِ ہجری

کھلا ہے دہر میں گویا چمن یہ
چھپا ہے اک گلستانِ سخن یہ
۱۳۳۲ھ

دیگر

نہ کیوں فیضیاب اس سے ہو اک جہاں
کہی اسکی تاریخ میں نے قصیر

چھپا تذکرہ یہ بڑے کام کا
عجب ارمغاں ہے سری رام کا
۱۹۱۴ء

لکھا ہے جامع یہ تذکرہ کیا سخنوروں کا ہے حال سارا
جہاں میں ثانی نہیں ہے جس کا دکھائے اس کا جواب کوئی
کوئی جو خوش ہے تو کوئی غمگیں جہاں میں لاکھوں ہیں دوست دشمن
ہوا ہے مسرور کوئی اس سے بنا ہے جلکر کباب کوئی
کلام سارے سخنوروں کا لکھا ہے کُل حال شاعروں کا
سُنی نہ دیکھی کبھی کسی نے جہاں میں ایسی کتاب کوئی
چمک یہ کس کی ہے نور کس کا زمانہ جس سے ہے جگمگایا
اُتر کر آیا ہے آسماں سے زمیں پہ کیا آفتاب کوئی
یہ اس کا ہر شعر کہہ رہا ہے کہ منتخب ہوں زمانے بھر کا
ورق ہے یا عارضِ حسیں ہے دکھائے ایسا شباب کوئی
مہک ہے اسکی وہ روح پرور مشامِ جاں جس سے ہو معطر
کھلا دیا اک چمن سراسر کرے گا کیا انتخاب کوئی
چمک گئے گوہر مضامیں، ہیں شعر سب پنجۂ نگاریں
کہ ماند ہوں جس سے ماہ و پرویں دکھائے کیا آب و تاب کوئی
کہیں فروزاں دماغ رنگیں، کہیں نمایاں ریاضِ گلچیں
پیا ہے خونِ جگر کسی نے ہوا کہیں فیض یاب کوئی
دماغ کے ساتھ صرفِ زر ہے یہ سب ہے سر یرام ہی کا حصّہ
کبھی جہاں میں کہیں ہوا ہے **قصیر** یوں کامیاب کوئی
یہ کسکی ہمت تھی اس طرح سے کہ تذکرہ شاعروں کا لکھے
پلائے آبِ حیات سب کو جہاں میں لے یوں ثواب کوئی
خیالِ عالی کو ہے یہ شایاں کہ ناز و تمکیں رہے نمایاں

جواب بنجائے آسماں کا جو سر اُٹھائے حباب کوئی
ضرور سمجھیں گے نکتہ پرور کہ پھول انکے ہیں منتخب تر
نہ ایسی رنگت نہ ایسی خوشبو ہزار دیکھے گلاب کوئی
کہا ہے اے دل بحال کیسا کہ عطر کا عطر کھینچ لائے
دُرِ سخن منتخب کیا ہے گہر فشاں ہے سحاب کوئی
جہاں میں اہلِ کرم بہت ہیں مگر یہ ہمت کہاں کسی میں
کھپائے یُوں جان زار کوئی لُٹائے زر بےحساب کوئی
کہاں ہیں اب ایسے قدر افزا ہر اک ہے نام آوری کا جویا
کسی کو عہدے کی ہے تمنا تو مانگتا ہے خطاب کوئی
بنایا خمخانہ نگاریں سبیل اس میں ہے رشکِ کوثر
سرور ہے جس کا روح پرور نہ ایسی دیکھی شراب کوئی
بھرا ہے رنگیں وہ اس میں بادہ سہ آتشہ سے بھی ہو زیادہ
دکھائے ایسی کتاب کوئی پلائے ایسی شراب کوئی
ہے رشک صد غنچہ مصرعہ مصرعہ بیان رنگین ہیں سراپا
چمن ہیں یا شعر ہیں یہ رنگیں کھلا گلستاں کا باب کوئی
کہا یہ ہاتف نے عیسوی ہو قیصر تاریخ طبع اسکی
چھپا ہے کیا تذکرہ یہ نادر نہیں ہے جس کا جواب کوئی
۱۹ع　۱۴

قطعہ تاریخ از تصنیف منیف منشی بنائک پرشاد صاحب شریف ساکن نواح بنارس

بہر تاریخ غنچۂ جاوید　　فکر تھی کوئی مختصر کہیے
آئی اتنے میں اک شریف ندا　　اسکو منظوم نامور کہیے ۱۳۳۳ھ

دیگر

تاریخ ہزار داستاں شد　　از غیب ہمیں شریف مسموع
گر فیض مکرمی سر انجام　　کتب نایاب گشت مطبوع ۱۳۳۳ھ

پئے تاریخ غنچۂ جاوید	چشمِ ہاتف کا یوں اشارا ہے	دیگر	کہ لکھو ہی شرف سال اس کا	تذکرۂ نظمِ عالم آرا ہے ۱۳۳۳

قطعات تاریخ از نتائج فکر نخلبند گلزار معانی طوطی شکرستان خوش بیانی، سخنور نازک خیال منشی پیارے لال رونق دہلوی تلمیذ رشید حضرت راسخ دہلوی صاحبِ دیوان رونق سخن

پھر بنا ابر سایۂ رحمت　　پھر ہے ہر سمت بارشِ عشرت
پھر بہارِ نشاط آئی ہے　　پھر کھلے باغ میں گلِ راحت
پھر بچھا فرش سبز مخمل کا　　بدلی صحنِ چمن کی پھر رنگت
پتّہ پتّہ زمرّدیں ہے آج　　ہے عیاں حُسن جوہرِ قدرت
نخلِ اُمّید پھر پھلا پھولا　　پھر نظر آئی عیش کی صورت
شاخ ہر گل پہ ہے بہار نئی　　ہر شجر کو ملا نیا خلعت
برگ و بار چمن نمونۂ حق　　رنگِ ہر گل ہے جلوۂ صنعت
لوٹ ہے دل بہارِ تازہ پر　　فرح بخش و دماغ کیفیت
نغمۂ طوطیانِ گلشنِ ہند　　غلغلہ سازِ خوبیٔ فطرت
ہر سخن وقفِ زمزمہ سنجی　　بانگ بانگِ ترانۂ عشرت
کوئی پڑھتا ہے کلمۂ یاہو　　ہے کسی لب پہ نعرۂ وحدت

شورِ بلبل برنگِ سازِ آہنگ　　نالۂ دل ہے نغمۂ راحت
اب کہاں الغیاث و وا فریاد　　کر سکے شور کسکی ہے طاقت
دیکھنے کو نظر ہیں کلفتِ دل　　صاف روشن ہے آئینہ صورت
مستِ صہبائے نظمِ عیش جہاں　　لب پہ ہے ذکر ساغرِ راحت
پھر جما آج رنگِ خمخانہ　　رنگ پھر لائی مستیٔ عشرت
پھر ہے شورِ نشاط رندوں میں　　جشنِ شادی کی پھر بجی نوبت

رنگِ دورِ سرورِ بادہ سے
وجد میں جھومتے ہیں مستی سے
غش ہیں حسنِ مئے سخن پر آج
دیکھتے ہی اُدھر سرور آیا
کر رہے ہیں طوافِ چشمِ بتاں
چھلکے پھر ساغرِ گُلِ مضموں
رنگ لائے نہ کیوں سرورِ نشاط
جسکی مشتاق دید تھیں نظریں
رُونمائی ہے ایسے شاہد کی
یعنی وہ تذکرہ ہوا شائع
ہر ورق رشکِ روئے محبوباں
سطریں ہیں کاکلِ مسلسلِ یار
بانکپن کی ادا ہے لفظوں میں
دلفریبِ زمانہ ہیں اشعار
حسنِ معشوق کی ہے اِک تصویر
اِسکی اک شان میں ہیں حسن ہزار
دائروں پر ہے ماہِ نو قرباں
مطلع مطلع ہے، مطلعِ انوار
جدولیں رشکِ کہکشانِ فلک
لوح لوحِ جبینِ حورِ بہشت
دیکھکر رنگِ حسن کی شوخی

صوفیوں کی بدل گئی نیت
ہے نگاہوں میں حسنِ کیفیت
زاہدوں کی بھی یہ کہاں قسمت
ہو گئے مست بادۂ الفت
کیفِ مستی سے ہے عجب حالت
مئے معنی کی پھر کھلی رنگت
دے نہ دورِ خمار جب فرصت
جلوہ گر وہ ہوا بصد زینت
جانِ عشاق جسکی ہے قیمت
جسکی دنیا میں ہو گئی شہرت
چشمِ بینا کو جس سے ہو حیرت
مصرع مصرع ہے غیرتِ قامت
نقطہ نقطہ ہے خال کی صورت
شوخیِ نظم سے عیاں جدّت
نقشِ آئینہ نقشۂ حیرت
رنگِ وحدت میں جلوہ گر کثرت
حسنِ تحریر پر فدا شوکت
جسپہ صدقے ہے مہر کی طلعت
گوشہ گوشہ ہے آفتاب صفت
چرخ پر جس سے ماہ کو خجلت
تڑپے خورشید برق کی صورت

رنگ ہیں اس میں وہ عجیب و غریب
بن گیا ہے کرشمۂ حیرت

شانِ مضمونِ نو میں شانِ جمال
حسنِ معنی میں جلوۂ صنعت

دلفریبی و دلبری اسکی
رکھتی ہے ایک رنگِ محویت

لفظ لفظ اس کا سحر سازِ جہاں
فقرہ فقرہ نمونۂ صنعت

رنگِ صوری پہ معنوی کو فروغ
حسنِ صورت سے ہے فزوں سیرت

ہے یہ ایک جلوۂ ہلالِ عید
انگلیاں اٹھتی ہیں دمِ رویت

طالبانِ جمال کو اپنے
بخش دیتا ہے حسن کی دولت

دل میں بنکر سرور رہتا ہے
خالِ مردم میں نور کی صورت

عطر بیزِ جہاں گلِ مضموں
اسکی ہے ہر دماغ میں نکہت

اس میں ہے ذکرِ شاعرانِ ہند
جن پہ نازاں ہے نازشِ شہرت

ہر سخن ان پہ فخر کرتا ہے
ان سے ہے ہر کلام کی زینت

عہد کے اپنے عرفی و سعدی
دل میں شوخی ہے طبع میں جدت

انکی ہے ہر دلیل میں منطق
ہر سخن میں ہے اک نئی حجت

دخل حسنِ کلام میں کسکو
ہو کوئی حرف گیر کیا طاقت

کر دکھاتے ہیں کاہ کو یہ کوہ
اللہ اللہ خیال کی رفعت

علمِ ہیئت میں، علمِ ہندسہ میں
اک کرامت ہے طرفہ ماہیت

ہوا شارے میں طے رہِ مشکل
اک قدم ہے منازلِ وقت

دفترِ نظم دفترِ میزان
ہندسہ ہندسہ ہوا ہیئت

فلسفہ پر اگر اٹھائیں قلم
صفحہ صفحہ ہو دفترِ حکمت

ہاتھ علمِ رمل پہ گر ڈالیں
کھول دیں اک جہاں کی ماہیت

سیرِ سیارگاں سے آئینہ
ہے بنجومِ فلک کی سب حالت

نقشہ نقشہ جدا ہے شکل جدا　　خانہ خانہ کی اک نئی صورت
حسن معنی کی کھینچی تصویر　　انکا ہے ایک رنگ علمیت
گل کھلاتی ہے شوخی مضمون　　ہے فضا اسکی غیرت جنت
بند کرتے ہیں کوزہ میں دریا　　حسن قلت میں جوہر کثرت
توڑ لاتے ہیں عرش سے تارے　　لکھتے ہیں خال یار کی جو صفت
وہ خیال بلند ہے ان کا　　پست ہے جس سے چرخ کی رفعت
دم اوصاف ابروئے پُر خم　　خامہ بن جاتا ہے ہلال صفت
ہے علوم و فنون پر قادر　　ہر ہنر میں جہاں پہ فوقیت
ان کا نیرنگ طبع ایک طلسم　　انقلاب زمانہ ہے حالت
دل الگ سب سے ہے دماغ الگ　　انکی خصلت ہے اک جدا خصلت
رندی و پارسائی ہے شیوہ　　ہوشیاری و بےخودی عادت
محفل عام انکا رنگ خیال　　خلوت خاص گوشۂ عزلت
انکو یکساں کنشت و کعبہ و دیر　　دلنشیں ہے خیال کی صورت
ہے کبھی باغ و راغ میں مسکن　　گھر کبھی ان کا وادئ وحشت
ہیں کبھی محو یاد روئے بتاں　　ہے کبھی ذکر یار سے نفرت
ہے کبھی معرفت پہ چشم ادب　　ہے بتوں سے کبھی انھیں رغبت
رازداں ہیں کبھی حقیقت کے　　ہیں کبھی محو حسن کیفیت
ہیں کبھی فرط شوق میں مضطر　　کبھی صبر و سکوں سے ہی خلوت
ناتوان و نحیف و زار کبھی　　کبھی حاصل جہاں کی قوت
کبھی آہوں کی سرد بازاری　　ہے کبھی تیز آتش الفت
مائل سیر آسماں ہیں کبھی　　کبھی فرش زمیں ہیں خاک صفت

گلۂ جورِ آسماں ہے کبھی | کبھی حق سے شکایتِ قسمت

کبھی بیماریٔ فراق ہیں | شربتِ وصل سے کبھی صحبت

دل کبھی یاس و غم کا کاشانہ | آرزوؤں کا گھر کبھی راحت

دلِ پراگندۂ سخن ہے کبھی | چمنِ نظم سے کبھی فرحت

جلوۂ حسن ہے نظر میں کبھی | کبھی بے نور دیدۂ حسرت

ہیں کبھی نازکیٔ گل پہ فدا | ہے کبھی بوئے باغ سے نفرت

کبھی ماتم کدہ نظر میں جہاں | خانۂ عیش ہے کبھی تربت

کبھی ولدادۂ حسیناں ہیں | ہے کبھی حورِ خلد کی چاہت

ہے شریعت میں دخلِ شرک کبھی | ہے کبھی ان کو محبتِ بدعت

ننگِ و نام و نمود ہیں یہ کبھی | کبھی خواہانِ خلعتِ عزت

کبھی خودکاریوں پہ نازاں ہیں | کبھی فعلِ عبث پہ ہے لعنت

ہے کبھی خوئے انتہائے نیاز | کبھی علم و عمل پہ ہے نخوت

سخنِ تلخ اور لبِ شیریں | زہر میں ہے حلاوتِ شربت

انکی فکرِ رسا مطیعِ شوق | ان سے کب ہے خیال کو فرصت

نقشِ دل حسنِ نقشِ بوقلموں | ہے نظر میں جہاں کی کیفیت

ہے خودی انکی بیخودی کی مثال | ہوشیاری میں ہے نہاں غفلت

ان سے ہے بزمِ صوفیاں آباد | گرم ہے حال و قال کی صحبت

کبھی مجذوب ہیں، کبھی سالک | متغیر ہے ہر گھڑی حالت

رنگ ڈھنگ انکے سب نرالے ہیں | انکی دنیا سے ہے نئی خلقت

لئے غم دزد نے غمِ کالا | ایک ہے انکو عشرت و عسرت

ہوں بیاں وصف کیا مؤلف کے | ہے یہ سب آنکے فیض کی برکت

وہ سری رام منبعِ خوبی — مخزنِ جود صاحبِ ہمت
ذی ہمم، ذی شعور، ذی رتبہ — ذی کرم، ذی تبار، ذی حشمت
نیک دل۔ نیک ذات، نیک نہاد — نیک خو، پاک باز، خوش طینت
خوبیِ وضع، اک غلامِ خاص — خادمِ بابِ عام ہے شوکت
لاکھ جوہر ہیں انکی اک خوبی — لاکھ اوصاف انکی ایک صفت
غیر ممکن جو پاس آئے غرور — خُلق سے اُنکے دُور ہے نخوت
ہمہ دانِ جہاں مشیر و انیس — ماہرانِ فنون سے صحبت
انکا اقلیمِ نظم میں سکہ — ہر دیارِ سخن میں ہے شہرت
جانچ لینا سخن کو نظروں میں — ہے کرشمہ کلام کی صحبت
لکھا یا تذکرہ وہ لاثانی — ہر صفت اُسکی اک نئی ہے صفت
بن گیا کان جوہر و زر کی — اسپہ قربان کی ہے وہ دولت
ہر سخن کو طفیل سے اِسکے — مل گیا آج تمغۂ عزت
انتخابِ کلامِ نادر سے — شاعروں کی ہوئی فزوں عظمت
نغز گویانِ ہند کو بخشا — شرفِ خدمتِ درِ دولت
حُسنِ ظن ہے کلام سے ظاہر — طبعِ روشن کی آئینہ جودت
دولتِ علم پا گیا گویا — مل گئی جسکو آج یہ نعمت
جو نہ پایا تھا نام وہ پایا — جو نہ ہوئی تھی وہ ہوئی شہرت
ہیں یہ پیرِ مغانِ "خمخانہ" — بھر دی ہر دل میں مستیِ عشرت
وہ لنڈھائے ہیں ساغرِ مضمون — پائی رندی نے زہد پر سبقت
اِس میں لطفِ مئے سہ آتشہ ہے — نشہ ہے اِسکا باعثِ فرحت
واعظ و شیخ و صوفی و زاہد — کی ہے اِن سب نے آپ سے بیعت

ہے یہ بنیادِ میکدہ ان سے | دم قدم سے انھیں کے ہے زینت
خوبیٔ دَورِ دوم و اوّل | کر گئی سب کو محوِ صد حیرت
صنعتِ حق ہے رنگِ دورِ سوم | جلوہ اس کا ہے جلوۂ قدرت
نقشِ آئینہ جہاں ہے یہ | جامِ جم کی ہے اس میں خاصیت
ہے یہ پیوستہ سرور و نشاط | اس سے وابستہ ہے مے فرحت
کوششیں انکی لائقِ تحسیں | قابلِ داد و آفریں محنت
تاقیامت جہاں میں شاد رہیں | سر پہ ہر دم ہو سایۂ رحمت
خیر خواہوں کو انکے عیش مدام | دشمنوں کو نصیب ہو زحمت
حسنِ خمخانہ، اور یہ تقریظ | ذرّہ کو آفتاب سے نسبت؟
تھا جو رونق کو پاسِ خاطرِ دوست | آسپہ فرمائشوں کی تھی کثرت
لکھدیا پہلے یہ سنِ ہجری | یعنی عکسِ کرشمۂ حیرت ۱۳۳۳
پھر یہ نکلا قلم سے برجستہ | کہ، ہے خمخانۂ مے راحت ۱۹۱۷ ب
پھر کہا اور مصرعۂ رنگیں | ہے عجب دَورِ ساغرِ بہجت ۱۹۱۷
پھر یہ تاریخ عیسوی لکھدی | ہے یہ اک حسنِ غنچۂ فرحت ۱۹۱۵ء

قطعۂ دیگر

ہر بیت اسکی سلکِ دُرِ آبدار ہے | کس آب تاب کا ہے یہ واللہ تذکرہ
ہے اسکی شانِ حسن پہ چشمِ جہاں فدا | آئینہ سامنے ہے کبھی۔ گاہ تذکرہ
جلوہ ہے اس کا جلوۂ رنگِ بہارِ باغ | ہے دلکشا و دلکش و دلخواہ تذکرہ
تاریخِ طبع اسکی ہے سمت میں آشکار | رونق کہو۔ یہ خوب چھپا واہ تذکرہ ۱۹۱۷ ب

دیگر

یہ ہے تذکرہ یا بہارِ بہشت | گلِ نظم کا پُر فضا باغ ہے
شنو اسکی تاریخ رونق سے تم | سرِ ایام کیا دلکشا باغ ہے ۱۹۱۵ء

دیگر

لکھا ہے خوب لالہ سری رام تذکرہ | گلہائے شعرِ تر کا کھلایا چمن عجب

اِس باغ پُر بہار کا برجستہ سالِ طبع	رونق سے سُنئے، لُطفِ ریاضِ سخن عجب ۱۹۱۵
جب مرتب ہو چکا مرغوب دلہا تذکرہ	دیکھکر حسنِ کلامِ نغز گویانِ جہاں
بُوئے گلہائے سخن بھی تازگی بخشِ دماغ	دل ہُوا نظّارۂ ہر شعرِ تر سے شادماں
غیب سے آیا بجا ایک مژدۂ فرحت فزا	لکھدے تاریخ اسکی رونق ارمغانِ شاعراں ۱۹۱۴

چون سرِ انجام تذکرہ بنوشت	گشتہ بندیدہ محو از حیرت
جلد سوم با حسن و خوبی	کرد تیار صاحبِ ہمّت
مست و سرشار شد بیک ساغر	جرعہ نوشئے زبادۂ وحدت
عاشقاں را پیام وصلت داد	یافت ہر دل بشارتِ عشرت
وجد در بزمِ صوفیان آمد	دیدہ باید ز حُسنِ کیفیت
لُطفِ صہبائے عیش یافتہ ام	در کلامے کہ داشت نوعیت
فکرِ تاریخ چوں شد ای رونق	داد ہاتف ندا پے سمّت
از سرِ ہوش ہست مصرعِ سال	واہ خمخانۂ مے راحت ۱۹ ب

نثر و قطعہ تاریخ از شاعر نازک خیال ناظمِ شیریں مقال منشی عبدالخالق خلیق دہلوی تلمیذ منشی چندر بھان کیفی و حضرت سائل دہلوی

یہ دعا ہے خلیق کی حق سے	تذکرہ ہو یہ زندۂ جاوید

حق تو یہ ہے کہ دوسرا ایسا تذکرہ نہیں لکھ سکتا، کُل اہلِ دہلی کو آپ پر فخر کرنا چاہیئے شعرا کے آپ مسیحا ہیں، مردوں کو زندہ کردیا، اتنا روپیہ خرچ کرنا اور اتنی عرق ریزی کرنی بڑی مشکل ہے، بلکہ غیر ممکن ہے، یہ آپ کو ہی خدا نے غیور دل عطا فرمایا ہے آپکا احسان نہ ماننے کو نسا نادان ہے قطعات تاریخ ارسال کرتا ہوں، اگر قبول اُفتد زہے عز و شرف ؛

بارک اللہ کیا زمانہ ہے!	رات ہے شب برات دن ہے عید

جام ملتے ہیں ہر گھڑی ہر دم
بادہ خواروں کو ہے یہ سالِ سعید

پھر چھلکتے ہیں شیشۂ عشرت
پھر لبالب ہے ساغرِ امید

پارسائی کی روح کھنچتی ہے
بادۂ ناب ہو رہی ہے کشید

میکدے پر ہے بھیڑ جوش میں ہیں
توڑ ڈالیں گے رند سدِّ سدید

بادۂ ناب کی سبیل لگے
مے گساروں کی ہے یہی تاکید

ساقیٔ مست سے ملا ہے دل
ہاتھ آئی ہے میکدے کی کلید

ہے خدائی کا نور آنکھوں میں
بن گئے جام ساغرِ جمشید

نوٹ پر نوٹ دے رہے ہیں آج
پیگ پر پیگ کر رہے ہیں خرید

دھول دھپے کی شیخ سے ٹھہرے
ایسے گستاخ ہیں مغاں کے مُرید

دخترِ رز ہے بغل میں رندوں کی
محتسب کو نہ مل سکے گی رسید

آج مے نوش شادماں کیوں ہیں
میکدہ کیا کھلا ہے کوئی جدید

عشرت افزا ہے قلقلِ مینا
بادہ خواروں میں ہو رہی ہے عید

اور جاری ہوا ہے خمخانہ
مے کشی کے لیئے ہوئی تاکید

شیشے شعر و سخن کے ڈھلتے ہیں
علم کی ہوتی ہے شراب کشید

روح پرور کہیں شرابِ کہن
عشرت افزا کہیں ہے دورِ جدید

جسکے ہر رنگ میں نرالا رنگ
جس کی تجدید میں نئی تجدید

صفحہ صفحہ ہے روکشِ جاناں
مصرعہ مصرعہ ہے ابرؤں کی کشید

نقطہ نقطہ ہے خالِ محبوباں
مطلع مطلع ہے مطلعِ خورشید

عقدِ پرویں ہے ہر سطر اسکی
دائروں میں ہے صورتِ ناہید

تیوری میں پڑے ہوں بل جیسے
اسکے ہر حرف پر ہے یوں تشدید

شاعروں کا ہے حالِ تاریخی
یہ مبارک ہے ارمغانِ جدید

ہے سرِ رام کا یہ خمخانہ ۔۔۔ ذات جنکی ہے غیرتِ جمشید
علم کی جاں ہیں آپ ہیں ایم۔اے ۔۔۔ حُسن ظاہر ہیں جلوۂ خورشید
ایک ہیں اپنے وقت کے نقّاد ۔۔۔ لوگ کرتے ہیں آپ کی تائید
تذکرہ باغِ جاں فشانی ہے ۔۔۔ کہہ رہی ہے زباں سے تمہید
خوب اشعار انتخاب کیئے ۔۔۔ کر دیا ختم حُسن قطع و بُرید
صدقے سحبان ہے فصاحت پر ۔۔۔ آپکے ہاتھ چومتا ہے لبید
یُوں تو سب شعر چھانٹ لیتے ہیں ۔۔۔ لطف جب ہے کہیں نہو تنقید
اب اگر لکھتے گلشنِ بیخارؔ ۔۔۔ کرتے بے شبہہ آپ کی تقلید
عاشقوں کا کہیں فسانہ ہے ۔۔۔ محفلِ یار کی کہیں ہے دید
جوش پر پھر بہار آئی ہے ۔۔۔ پھر ہرے ہو رہے ہیں زخم شدید
بزمِ عرفاں کے سین کھینچے ہیں ۔۔۔ نور افگن ہے جلوۂ توحید
کیوں نہو آپ خاندانی ہیں ۔۔۔ والدِ ماجد آپکے تھے وحید
نام مشہور تھا **مدن گوپال** ۔۔۔ شان رائے بہادری کی پدید
اونریبل کی عزت افزائی ۔۔۔ کیا بیاں ہو زباں سے وصفِ حمید
آپ اُنکی ہیں آنکھ کے تارے ۔۔۔ جلوہ آرا ہیں صورتِ خورشید
دولت و جاہ کی ترقی ہے ۔۔۔ مرتبے پر نثار بختِ سعید
شوق ہے تذکرہ نویسی کا ۔۔۔ نام روشن کرے گا کارِ مفید
تذکرہ یہ **خلیق** ایسا ہے ۔۔۔ سب کریں اسکو جان و دل سے خرید
بہرِ تاریخ صاف مصرع ہے ۔۔۔ سبے خزاں گلشنِ بہارِ امید
۱۳۴۳

تذکرہ لالہ سرِ رام نے لکھا ایسا ۔۔۔ کہنا زیبا ہے زمانے میں جسے جانِ سخن
باغِ مضموں میں چھائی ہیں بہاریں کیا کیا ۔۔۔ سب شگفتہ ہیں گل و لالہ و ریحانِ سخن

مصرع مصرع پہ فدا اُردو زباں کے شاعر — نکتہ نکتہ پہ ہیں قربان ہمہ دانِ سخن
لہریں لیتا ہے سمندر کی طرح حسنِ کلام — معدنِ گوہرِ مضموں ہے یا کانِ سخن
آپ کس فکر میں بیٹھے ہیں خلیق شاداں — اسکی تاریخ ہے۔ زیبِ چمنستانِ سخن

کیا پریزاد سے ہے یہ خمخانہ
فکرِ تاریخ سے ہے خلیق اگر
واقعی اے خلیق خمخانہ
ایک مصرع میں دو ہیں تاریخیں

دیگر

جلوۂ حسن پر ہیں سب شیدا
لکھ چمن ہے نظیر نا پیدا
بے خزاں گلشنِ مضامیں ہے
باغ بیرنگ، باغ رنگیں ہے

سر براہم ہیں خانداں کے چراغ — عجب نام روشن کیا باپ کا
لکھو بہرِ تاریخ سمت خلیق — رہے تا ابد تذکرہ آپ کا

یہ تیسری جلد چھپ گئی ہے
مداح ہیں سب ترے سربراہم
گاتے ہیں تری ثنا کے سب گیت
اِس نسخہ سے تو ہے زندہ جاوید
مصرع ہے کہ سلکِ دُرِ شہوار
افسوس بھی ہیں اسمیں شاعروں کے
آخر میں ہے اسکے عیسوی سن
لکھا ہے خلیق نے یہ سائل[1]

دیگر

اُس تذکرہ کی جو ہے یگانہ
کرتا ہے صفت تری زمانہ
لب پر ہے جہاں کی یہ ترانہ
خم خانہ کا ہے یہ شادیانہ
صفحہ ہے کہ گوہریں خزانہ
نیز اہلِ سخن کا ہے فسانہ
بہتر نہیں طولِ شاعرانہ
"ارژنگِ سخن نگار خانہ"

قطعۂ تاریخ شاعر خوش بیان منشی سیّد محمد قاسم صاحب حزیں سونی پتی

بل بے بادِ بہار کی رفتار — ہر گلی کوچہ بن گیا گلزار
عطر بیزِ نسیمِ صبح سے — دشت بر زن دکانچۂ عطار

[1] یہ مادۂ تاریخ جناب خلیق کا ہی اور مصرعے مکرمی مرزا سراج الدین احمد خان سائل نے لگائے ہیں۔

قوتِ نامیہ بڑھی ایسی — گل سے پہلے نمو ہیں اثمار
تازگی سے یہ انقلاب ہوا — خار نرمی سے ہیں گلوں کے ہار
ابرِ نیساں ہے ابرِ جود و سخا — آبِ گوہر سے ہے قلزم زخار
فلسِ ماہی کی طرح سے افلاس — پہنے پھرتا ہے جامۂ دینار
پارۂ کاسۂ گدائی ہیں — سپرِ گل جامِ جم کی ہے اظہار
دیکھو آئینۂ سکندر کو — کیا حیراں ہے پشت بر دیوار
کیوں ہے پھر یہ تماشۂ حیرت — کیا کسی نوعیت کا ہے اظہار
ہاں کسی مست ارغوانی نے — میکشوں کے لیئے کیا تیار
ایک ایسا عجیب خمخانہ — نام سے جسکے ہو ہر اک ہشیار
اے سریرام واہ کیا کہنا — ایسی جلبچھٹ کا اور ایسا نکھار
اسکو لکھوں نگار خانۂ چیں — یا کہوں اسکو غیرت گلزار
از سرِ جوش لکھ خزیں تاریخ — ہے یہ بے مثل مخزن الاشعار
لکھ سنِ ہجری بٹے سرِ بد ہیں — ہے عجائب خزینۂ اشعار

خلاصۂ تحریر قطعہ تاریخ از نتائج افکار گہربار ناظم خوش خیال سخنور عدیم المثال منشی حب لال صاحب رعد وکیل و آنریری مجسٹریٹ بھنڈ ضلع گوالیار

خمخانۂ جاوید کی پہلی جلد میرے پاس پہنچی، اُسکی ترتیب، لکھائی، چھپائی، اور عمدگی کاغذ کو دیکھکر طبیعت بہت خوش ہوئی، اور عبارت پڑھکر اور بھی حظِ روحی حاصل ہوا۔ آپ کی جانفشانی اور تلاش تہ دل سے قابلِ داد ہے، واقعی آپنے یہ بہت بڑا کار نمایاں کیا ہے جو تا حشر یادگار رہے گا، اور پڑھنے والے تا ابد جناب کی جانفشانی اور قابلیت کی داد دیتے رہیں گے۔

خوب شعراء کا تذکرہ لکھا	خوب کی جان توڑ کر محنت
باعث افتخار آپ کی ذات	قابل داد آپ کی محنت
اک زمانہ ہے آپ کا مداح	ہر نظر میں ہے آپ کی عظمت
زندہ جاوید شاعروں کو کیا	کر کے اُنکے کلام کی شہرت
سچ تو یہ ہے کہ رعد شعراء کو	ملا اچھا ذریعۂ شہرت
دیکھتے ہی پھڑک اُٹھے شعرا	ایضاً تذکرہ کیا ہی لاجواب رہا
سالِ تاریخ کی جو فکر ہے رعد	لکھو یہ انتخاب خوب رہا
	۱۹۱۴ء

تقریظ از نتائج افکار ناثر باکمال ناظم شیریں مقال منشی چندولال صاحب شفق خلف الرشید منشی بہاری لال مشتاق مرحوم تلمیذ حضرت غالب مغفور

میں نے "خمخانۂ جاوید" کی دو جلدوں کو طبیعت کے ذوق اور دل کے شوق سے پڑھا اور تیسری جلد کو بھی جستہ جستہ دیکھا، شعرائے ماضی و حال کے جامع حالات اور اُنکے کلام کا انتخاب بلا لحاظ مذہب و ملت کے جو کچھ لالہ سری رام صاحب نے کیا ہے صرف اپنی اعلیٰ سخن فہمی کا ثبوت ہی نہیں دیا ہے بلکہ پبلک کو دکھلا دیا ہے کہ سچائی کے ساتھ کس طرح شعروں کا انتخاب کیا کرتے ہیں "خمخانۂ جاوید سے پہلے اور بھی کئی تذکرے اِس قسم کے میں نے پڑھے ہیں۔ اور میرے خیال میں مولانا آزاد کی کتاب "آبحیات" نے سب پر پانی پھیر دیا تھا۔ مگر اُس کتاب میں بیچارے ہندو شاعروں کو کہیں کہیں فٹ نوٹوں یا حواشی پر جگہ دی گئی ہے اور لالہ سری رام صاحب کے تذکروں میں یہ کمی بھی پوری کی گئی ہے۔ لالہ سری رام صاحب نے پہلے ہر شاعر کا بسیط حال لکھا ہے۔ پھر اُسکے کلام کا ایسا انتخاب کیا ہے کہ اِس سے بہتر شاید ہی کوئی کرتا۔ آپکی دلی خواہش یہ رہی ہے کہ اُنکی کتاب میں کمال ہنر دکھلایا جاوے اور ہر شاعر مناصب

مناسب ہر جگہ پاوے اور پبلک سے انٹروڈیوس ہو، ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند ٭
مجھے مؤلفِ تذکرہ سے بچپن سے نیاز حاصل ہے، وہ لگاتار پچیس سال سے ہندوستان کے
شعرائے کلام کے انتخاب میں مصروف ہیں اور نہایت مستقل مزاجی اور محنت سے زرِ کثیر صرف کر کے اِس
کام کو خیر و خوبی کیساتھ انجام دے رہے ہیں، حق تو یہ ہے کہ شعرائے اُردو اور اُردو زبان پر جو احسان
آپ نے کیا ہے اور کر رہے ہیں یہ صرف آپ ہی کا کام ہے اور پہلے تذکرہ نویسوں کا نام ہی نام ہے۔
میری ایشور پر آتما کی جناب میں پرارتھنا ہے کہ وہ مؤلف صاحب کو عمرِ طبعی عطا فرماوے
اور خمخانہ جاوید کی ساری جلدوں کو اُنکے ہاتھ سے ختم کرائے۔

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش ست	تو بدیں آرزو مرا برسان

قطعہ تاریخ از نتیجہ طبع وفاد لالہ گوپال سہائے صاحب صفا ساکن گوالیار

سخن سنجو! ابھی دیکھا ہی کیا ہے	چھپیں گے دو جمالِ دورِ ثالث
کیئے گر نوش اب تک وہی ساغر	تو اب رکھنا خیالِ دورِ ثالث
حیاتِ جاوداں پائینگے شعرا	یہ ہی ہوگا مآلِ دورِ ثالث
ذرا سنبھلے ہوئے تاریخ سن لو	یہ دیکھو ہے، کمالِ دورِ ثالث

۱۳۳۲ھ

		[illegible]		
از سرِ دوستی و روئے یقین	غایتِ خبط و ہم زِ پا سراغ		بر سرِ راہ سالِ عیسائی	خامہ برکرد نیک مہ چراغ
الحمد ذکر سبد ہائے گل نو	خامہ گلچیں بنا کے لایا		گلچیں کی نظر تھی طرزِ نو پر	دلکو تازہ شگوفہ بھایا
سالِ ہجری سنِ مسیحی	سمت کا پتا بھی سہیں آیا		ہے صنعت معنوی توالی	رہتا نہیں اک عدد تھا باقی
	تاریخ لکھی قلم بھی رکھدی		طبعِ نازک نے چین پایا	

الحمد	حساب ازروئے جمل	بروئے توالی	سبد ہائے	ازروئے جمل	بروئے توالی	گل نو	ازروئے جمل	بروئے توالی
ا		۱	س	۶۰	۳۱۴	گ	۲۰	۲۱۰
ل	۳۰	۴۶۵	ب	۲	۳	ل	۳	۴۶۵
ح	۸	۳۶	د	۴	۱۰	ن	۵۰	۲۷۵
م	۴۰	۸۲۰	ہ	۵	۱۵	و	۶	۲۱
د	۴	۱۰	ا	۱	۱			
			ی	۱۰	۵۵			
		۱۳۳۳ھ			۱۹۱۴			۱۹۷۱

تقریظ طبع زاد بلبل چمنستان خوش بیانی سخنور با مذاق منشی چندر بھان کیفی دہلوی نواسہ پروفیسر رام چندر صاحب مغفور

آفریں نیک نفس لالہ سری رام ایم اے
تم جیو لاکھ برس لالہ سری رام ایم اے

جی اٹھے اہلِ سخن سب نے شفا پائی ہے
آپ کے ہاتھ میں اعجازِ مسیحائی ہے

دب رہا تھا جو معانی کا خزینہ اب تک
یاد اشعار تھے جو سینہ بسینہ اب تک

زیبِ اوراق کیا زندۂ جاوید ہوئے
ذرۂ خاک تھے جو مطلعِ خورشید ہوئے

دھوم آفاق میں خمخانۂ جاوید کی ہے
جلد ہر طاق میں خمخانۂ جاوید کی ہے

تذکرہ کھیل نہیں تھا کوئی بچہ کھیلے
عمر بھر آپ نے اسکے لیے "پاپڑ بیلے"

خاک پنجاب کی چھانی کبھی بنگال گئے
باکمالوں کی ملاقات کو بھوپال گئے

میرزا داغ سے ملنے کو دکن میں پہنچے
میر محبوب علیخاں کے چمن میں پہنچے

دلّی والوں میں رہے لکھنو والوں میں رہے
لطف صحبت کے عجب پاک خیالوں میں رہے

چن لیا پھول وہ جس پھول میں خوشبو دیکھی
لکھ لیا شعر وہ جس شعر میں اردو دیکھی

چارپائی نہ ملی فرشِ زمیں پر بیٹھے
جس جگہ مل گئے ہمرنگ وہیں پر بیٹھے

آپ کی ہمتِ مردانہ کا خمخانہ ہے
میکشوں کے لئے ہر رنگ کا پیمانہ ہے

بادۂ شعر و سخن پیتے ہیں پینے والے
معرفت سیکھتے ہیں مکّے مدینے والے

مصرع مصرع میں موحد کو ہیں وحدت کے مزے
عاشقِ زار کو ملتے ہیں محبت کے مزے

جامِ جمشید کی ہے جلوہ نمائی اس میں
میکشوں کو نظر آتی ہے خدائی اس میں

دَورِ افلاک کے نیرنگ دکھائے ہیں کہیں
رنگ اڑتے ہوئے ہر رنگ دکھائے ہیں کہیں

کھینچ لی روحِ سخن رہ گئے دیوان خالی
کر دیئے ہیں مرے گلچیں نے گلستاں خالی

کیا طلسمات ہے سب رنگ سخن ہیں اس میں
ایک گلشن ہے مگر لاکھ چمن ہیں اس میں

دلپسند آپ کے گلزار کی گلچینی ہے
سادگی ہے تو کسی شعر میں رنگینی ہے

شہرتِ عام کا دربار بنایا تم نے
بلبلوں کے لئے گلزار بنایا تم نے

مُجرا کرنے کے لئے شاعرِ رنگیں آئے
نذر کو گوہرِ خوش آب مضامیں لائے

دیکھنا دیکھنا وہ حُسن کے مارے تو نہیں
عشق میں ہمدم و ہمرازِ ہمارے تو نہیں

اِنکے دیوان میں اسرار نظر آتا ہے
ہر ورق مصر کا بازار نظر آتا ہے

چوٹ کرتے ہیں کبھی درد کے مضموں دلمیں
ہجر کی رات دمِ سرد کے مضموں دلمیں

پڑ گئے سوزِ تپِ غم سے کسی کے چھالے
تیر بن بن کے اُترتے ہیں جگر میں نالے

موسمِ گل میں ہرے زخمِ کہن ہوتے ہیں
ہائے مُرجھائے ہوئے پھُول چمن ہوتے ہیں

جبہہ فرسا ہے کوئی سنگِ درِ جاناں پر
کوچۂ یار کو دیتا ہے شرف رضواں پر

روئے روشن کا تصور ہے کسی کے دلمیں
شکل لیلیٰ کی جھلکتی ہے کسی محمل میں

زلفِ پیچاں کے خیالوں میں کسیکو اُلجھن
گیسوئے یار کے کالوں میں کسی کو اُلجھن

لوٹتا ہے کوئی انداز سے بسمل ہوکر
چشمِ پُرفن نگہِ ناز سے بسمل ہوکر

ناتوانی سے کوئی ہو گیا ایسا لاغر
کہ اجل کو بھی دکھائی نہ دیا بستر پر

آتشِ رشک سے جل جل کے کوئی مرتا ہے
کوئی بدبخت رقیبوں کے گلے کرتا ہے

بعض نیچر کے مرقعوں کے تماشائی ہیں
بزمِ قدرت کے ہر اک سین کے شیدائی ہیں

دن نکلتا ہے تو سورج پہ فدا ہوتے ہیں
رات کو چاند کی سج دھج پہ فدا ہوتے ہیں

توڑ کر عرش سے مضمون کے تارے لائے
چاندنی رات کے نظموں میں نظارے لائے

ہو گئے مست جو گھنگھور گھٹائیں دیکھیں
پردۂ ابر میں بجلی کی ادائیں دیکھیں

مینہ کی بوندوں کو سمجھتے ہیں کہ موتی برسے
باغ کی سیر کو جاتے ہیں نکلکر گھر سے

موجۂ بادِ بہاری کے مزے لیتے ہیں
شعر میں نظم نگاری کے مزے لیتے ہیں

دیکھتے ہیں کبھی اندازِ صبا کا نقشہ
کھینچتے ہیں کبھی پھُولوں کی قبا کا نقشہ

لوٹ جاتے ہیں کبھی تختِ چمن کے اُوپر
رشک کھاتے ہیں کبھی تختۂ چمن کے اُوپر

برف کے سین پہاڑوں میں دکھاتے ہیں کہیں
آبِ مضمون کی گنگا میں نہاتے ہیں کہیں

آفریں آفریں اللہ رے قدرت کی بہار
نیچرل شعر ہوئے صنعتِ صانع کے نثار

نشۂ علم کے سرمست بہکتے آئے
بلبلِ باغ کی مانند چہکتے آئے

ٹکڑے ٹکڑے ہوئی توبہ یہ مصیبت آئی
وہ برستی ہوئی اللہ کی رحمت آئی

شور رندوں میں مچا دور چلے دور چلے
ساقیا! ہاتھ ملا اَور چلے اور چلے

بادۂ ہوش رُبا تیر سی دل میں اُترے
اسقدر تیز ہو شمشیر سی دل میں اُترے

چُور ہو جائیں مگر جائیں نہ میخانے سے
عہد شیشے سے تو پیمان ہے پیمانے سے

بزمِ تہذیب جسے وسکی برانڈی دیدے
کوری کوری مٹی گلرنگ کی ہانڈی دیدے

زاہد و شیخ کو منہ جھوٹ پلا دے ساقی
پاکبازوں کی انھیں جھوٹ پلا دے ساقی

میگساروں کو کوئی روک نہیں سکتا ہے
جسقدر چاہیں پئیں ٹوک نہیں سکتا ہے

شرح بوتل میں مئے ناب بھری رہتی ہے
کیا طلسمات ہے شیشے میں پری رہتی ہے

ہر غزل شیشۂ مینائی ہے میخواروں کی
پوچھ جنت میں بھی ہے ایسے گنہگاروں کی

حال میں اپنے گرفتار ہیں قومی شاعر
قوم کے رنج سے بیزار ہیں قومی شاعر

ما خدا سوچ میں ہیں کسکے سہارے لائیں
کس طرح قوم کی کشتی کو کنارے لائیں

روز طیار ہیں بگڑی کو بنانے کے لئے
اپنی آواز اُٹھاتے ہیں جگانے کے لیے

جاں نثارانِ وطن قوم کے ہمدرد بنو
رانا پرتاب کی مانند جواںمرد بنو

خدمتِ قوم سے بہتر نہیں خدمت کوئی
ایسی عزت کے برابر نہیں عزت کوئی

قوم میں ایک ہو آپس میں رہو مِل جُل کے
ایک کی ایک سُنو بات کرو کُھل کُھل کے

دیو بانی ہیں سُناتے ہیں پدر کی بیتی
اپنی بیتی کبھی کہتے ہیں کبھی جگ بیتی

بھر دیا جوش مشاہیر کے افسانوں سے
کہدی گذری ہوئی تاریخ مسلمانوں سے

کون بانی تھا ہر اک علم کے بانی تم تھے
گر تمدن تھا گھڑی اسکی کمانی تم تھے

الغرض انکا فسانہ ہے کہ یہ تھا وہ تھا
نظم میں گذرا زمانہ ہے کہ یہ تھا وہ تھا

اور کچھ لوگ چلے آتے ہیں دیوانے سے
کام بستی سے کچھ انکو ہے نہ ویرانے سے

ہیچ ہے عالم امکان نظر میں ان کی
خاک ہیں عیش کے سامان نظر میں انکی

نقش بر آب سمجھتے ہیں پرستانوں کو
منظر خواب بتاتے ہیں شبستانوں کو

نفس سرکش کے لیئے آگ ہے دلمیں روشن
خواہشیں پھونکدیں ہیں آگ ہے دلمیں روشن

بے ثباتی کے زباں پر ہیں برابر اشعار
دل پہ برچھی کیطرح لگتے ہیں اکثر اشعار

کہہ رہی ہیں کہ جوانی نہ رہی ہے نہ رہے
بہتے دریا میں روانی نہ رہی ہے نہ رہے

بلبل و لالہ و گلزار کوئی دن کے ہیں
ناز و انداز و طرحدار کوئی دن کے ہیں

واقعی مرگ تر شنہ[1] ہے سراب ہستی
بلبلے بن کے بگڑتے ہیں حباب ہستی

عمر ہے حضرت انساں کی تماشے کیطرح
سیر دنیا ہے فسونگر کے تماشے کیطرح

پیکر حسن جہاں نقش ہے پرچھائیں کا
کون رہتا ہے سدا نام رہے سائیں کا

خود فراموش تصوف کے قلندر آئے
ایسے دربار میں بھی گدڑی پہن کر آئے

جلوۂ حسن ازل کعبۂ دل کے اندر
ہے ہمہ اوست ہمہ اوست کا نعرہ لب پر

ایسے مجذوب کہیں ہیں تو کہیں کی باتیں
عرش کی کہتی ہیں پوچھو جو زمیں کی باتیں

انکے اشعار ہیں توحید کی یکتائی ہیں
آپ ہی آپ نظر آتے ہیں تنہائی میں

رام تیرتھ کی طرح کہتے ہیں آزاد ہیں ہم
ست چدانند ہیں آنند ہیں دلشاد ہیں ہم

ماسوا ذات حقیقی ہے کوئی اور نہیں
وہم کا سانپ بھی رسی ہے کوئی اور نہیں

کثرت ذات نہیں ایک ہے نور عرفاں
آپ ہی ذات احد آپ ہی ذات انساں

آپ ہی عبد ہوئے آپ ہی معبود ہوئے
آپ ہی سجدہ کیا آپ ہی مسجود ہوئے

آپ ہی پھول بنے آپ ہی گلزار بنے
آپ ہی گل کے لیئے بلبل بیمار بنے

آپ ہی آپ ہیں ہم غیر کا کچھ کام نہیں
ذات مطلق میں کہیں شکل نہیں نام نہیں

[1] سراب

"در حقیقت دگرے نسبت جدائیم ہمہ — لیک از گردش یک نقطہ جدائیم ہمہ"

الغرض رند ہیں ہر رنگ کے خمخانہ میں — دور ہیں مے کے کبھی بنگ کے میخانہ میں
خوب سرچشمۂ اعجازِ بیانی کھولا — خوب گنجینۂ اسرارِ معانی کھولا
قدر ہے حسنِ مضامیں کے خریداروں میں — بھاؤ یوسف کا گرا مصر کے بازاروں میں
ایک سے ایک ہی خمخانہ کا دفتر بھاری — علم و تہذیب کے ہیں چار سمندر جاری
جلوۂ بزم جہاں ست کہ خمخانہ تو — آفریں باد بریں ہمتِ مردانہ تو
تذکرہ نورِ نظر جان کے پالا گھر میں — چونکہ کبھی جوت کا رہتا ہی اجالا گھر میں
آپکا نام سری رام کریگا روشن — جو خدا چاہے مرادوں سے بھریگا دامن
مدرسے والے سجائینگے کتب خانوں میں — مشرقی لائبریری میں کلب خانوں میں
نازبردار بنائینگے پریزاد اسے — اپنی رکھیں گے بغل میں ستم ایجاد اسے
آپ جب گلشنِ امید کا پھل پائیں گے — مطرب بزم یہ کیفی کی غزل گائیں گے

تا ابد آپ کا خمخانۂ جاوید رہے — رات دن لالہ سری رام کے گھر عید رہے
دولت و جاہ کے دروازے پہ ہاتھی جھومیں — چومتی نقشِ قدم شوکتِ جمشید رہے
تازگی بخش ہے دہلی کی نسیمِ عشرت — باغ عالم میں شگفتہ گلِ امید رہے
حسنِ اخلاق سے روشن ہو زمانہ سارا — جلوہ آرا ے جہاں جس طرح خورشید رہے
تذکرہ آپنے بے لاگ لکھا ہے ایسا — جس میں تردید نہ تائید نہ تقلید رہے
ایسے خیالات کہاں گلشنِ پنجاب میں تھے — لطف لکھنے کا اسی میں ہے کہ تجدید رہے
کون ایسا ہے سخن فہم جہاں میں نقاد — جسکی تحریر میں ہر شعر کی تنقید رہے
ہر کہ و مہ کے لئے برتی ہی یکساں نظری — آپکے علم میں حل عقدۂ توحید رہے
آرزو ہے کہ ملے قندِ مکرر کا مزا — کہدو کاتب سے کہ ہر شعر پہ تشدید رہے
جگمگیا رنگ تو کیفی نے نکالی تاریخ — دور ہو ہند میں خمخانۂ جاوید رہے

۱۹۱۵ء

تقریظ و تاریخ ریختۂ کلک عجائب سلک شاعر یکتا ناثر بے ہمتا محقق والا نظر سخن گستر معدن صدق و صفا منبع فہم و ذکا شفیقی منشی نرائن پرشاد صاحب مہذب تخلص جیاؔ ولد منصرم محکمۂ تعلیمات گوالیار

سودا سلف کی خرید و فروخت کے لیے شاہجہانی لشکر کے مختلف زبان کے لوگوں نے آپس میں بات چیت کر کے اُردو کا ایک ان گھڑ ڈول ڈال دیا تھا جس صورت میں تم اسے آج دیکھ رہے ہو یہ شعرا کی بدولت نصیب ہوئی ہے، جن لوگوں نے اِس زبان میں سخنگوئی اختیار کی اُنھوں نے ثقیل و کریہہ الفاظ کی کاٹ چھانٹ، نادر تراکیب اور سریع الفہم محاورات کی بھرت سے اسکو ایسا مانجھا صاف کیا کہ اس سے بیگموں کے محلوں کی زینت، شاہی درباروں کی رونق ہوئی۔ ملک کی ساری زبانوں سے زیادہ فصیح، زیادہ مہذب بنکر یہ شرفا کی زبان کہلائی، دلّی میں اِسکی ٹکسال قائم ہوئی اور اُردوئے معلّی اس کا نام رکھا گیا، مگر آہ زمانے کی نیرنگیاں کسی چیز کو ایک حالت پر نہیں رہنے دیتیں، عروج و زوال ہر شے کے لیئے لازمی ہے۔

دیکھو ایک وہ وقت تھا جبکہ وؔلی گجراتی نے پہلا شعر کہکر ہندوستان میں اُردو شاعری کی داغ بیل ڈالی، شاہ حاتم، فغان، خان آرزو نے اسے بڑے نازوں سے پالا مظہر جانجاناں، میر سوز، میر تقی، میرزا سودا، میر درد نے اسے پروان چڑھایا۔ مصحفی، انشا، جراءت نے اِسکے آتش رخسار سے آنکھیں سینکیں، شاہ نصیر، مؤمن، ذوق، غالب، معروف، عارف، نیّر رخشان نے اسکے شباب کی بہاریں لوٹیں اور تمام ہندوستان میں اپنی استادی کا ڈنکا بجایا، ایام غدر کی ہلچل اور مغلیہ سلطنت کے انتزاع نے اسکے چہرے پر کچھ جھائیاں سی ڈالدی تھیں کہ آزردہ، شیفتہ، مینر، سالک، کوکب، عزیز، انور، ارشد، بشیر، صابر، رشک، شاکر، قلق، ثاقب، مبین، طالب، زکی، رشید، مجروح کی رسا فکر، مشکور سعی کے ہاتھوں نے اُبٹنا ملکر پھر وہی جوانی کی چمک پیدا کردی، اور

آخر میں تو جہاں اُستاد فصیح الملک حضرت داغ دہلوی نے اپنی درد انگیز شاعری، سادگی زبان، صفائی بیان، معاملہ بندی، اور فصاحت کلامی سے اِس حُسن کے پُتلے کو چار چاند لگا دیئے، یہ تو اِس کا عروج تھا۔ مگر ابتدا ہی سے اِس گھٹنوں چلتے ہوئے بچے کی باتیں کچھ ایسی پیاری اور محبت کی پوٹ تھیں کہ بہت جلد یہ امرا اور رؤسا کا کھلونا بن گیا، شعرا کی وہ پوچھ گچھ ہوئی کہ سب انہیں آنکھوں پر جگہ دیتے اور جی کھول کر انکی قدر کرتے تھے، امرا کی انجمنوں کی گرمی تھی تو انکے دم سے، سلطانی بارگاہوں کی رونق تھی تو انکے قدم سے۔

یا ایک یہ زمانہ ہے کہ جن شاعروں نے اردو کو خدا داد پر اتار کر سڈول کیا اور سقم و اغلاط سے پاک کر کے سانچے میں ڈھالا جنکی کوششوں سے اسے معراج ترقی میسر ہوئی جنکے احسانوں سے اس کا حرف حرف نقطہ نقطہ گرانبار رہے انھیں آج کوئی نہیں پوچھتا انکی اب کوئی آؤ بھگت نہیں کرتا، دلی کی ٹکسال ٹوٹ گئی، نئے سکے ڈھلنے بند ہو گئے، پرانے سکوں پر بٹا لگنے لگا، ایک طرف سے سارا کارخانہ ہی درہم برہم ہو گیا، پھر بھی لے دیکے چند دوکانیں بچ رہی تھیں جن پر یہ سکے چلتے تھے مگر ان میں بھی بہت سی بند ہوگئیں، چند باقی ہیں۔ ابتو جناب حالی، حضرت ظہیر، جناب اشک، حضرت نوح ناروی، جناب بیخود دہلوی، نواب سراج الدین احمد خان سائل دہلوی، جناب وجاہت، خان بہادر اکبر حسین اکبر۔ اسنر الشعرا آغا شاعر۔ اور انکے جیسے چند اور نفوس رہ گئے ہیں جنکی شیوا بیانیاں لئے گرما رہی ہیں ورنہ بزم سخن تو کب کی تہ و بالا ہو چکی ہے۔

یا اللہ یہ کیسی ہوا چلی ہے کہ تقریر اور تحریر دونوں میں خود رنگی اور خود آہنگی پیدا ہو گئی ہے، نہ زبان سے واسطہ نہ روزمرہ سے غرض، نہ بندش کی پروا نہ محاورے سے مطلب، جو جسکے منہ میں آتا ہے کہہ ڈالتا ہے، جو جسکی قلم سے نکلتا ہے لکھ مارتا ہے اور تو اور صرف نحو کی پابندی بھی ضروری نہیں رہی۔ اِس وقت ادبی دنیا میں ایک

شور انگیز آپا دھاپی پڑی ہے، قیامت کی ہماہمی ٹھنی ہے، غیر زبانوں کے درشت اور غیر مربوط الفاظ کی جا بیجا ٹھوس ٹھاس، غلط سلط محاورات کی بھرمار، اُلٹے پلٹے فقروں کی گھڑت غیر مانوس ترکیبوں کی کھپت سے ایک عجیب ستو کھچڑی زبان بن رہی ہے جسکے کھرے کھوٹے کی کسوٹی بھی نہیں، اور پھر لطف یہ کہ ہر نا آشنائے زبان زباندانی کا دم مارتا ہے ہر ناواقف علم لسان استادی کا دعویٰ کرتا ہے، ہاں اس سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کہ علوم و فنون کی کتابوں کے ترجموں سے علمی اور فنی اصطلاحات کا ذخیرہ بڑھتا جاتا ہے مگر ساتھ ہی ان میں کتنی ہی کتابیں ایسی ہیں جنکی زبان ٹکسالی اُردو نہیں ہے۔ کیا ایک فصیح زبان کی ہڈیاں پسلیاں توڑ مروڑ کر اُس میں چند نئے الفاظ اور اصطلاحوں کا اضافہ کردینا ہی زبان کی ترقی ہے؟ ناواقفوں سے بحث نہیں، اہلِ زبان اور زبان دان اس بات کو ضرور محسوس کر رہے ہیں کہ اب اُردو زبان اپنی اصلیت اور فصاحت سے روز بروز گرتی جاتی ہے۔

اس پر آشوب زمانے میں جب آپس کے جھگڑوں مذہبی تعصبوں سے زبان کا اچھی طرح ستیاناس ہو رہا ہے اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ اُردوئے معلیٰ کے ٹکسال چڑھے سکے اور وہ بیش بہا جواہر جو سالہائے مدید کی بے تکان محنتوں سے ہمارے شعرائے نامدار نے بہم پہنچائے ہیں نہایت احتیاط اور دوربینی کے ساتھ محفوظ کئے جائیں تاکہ آنے والی نسلیں اُن سے فائدہ اُٹھائیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس ضرورت کی اہمیت کو خدا کے دو بندوں نے عین وقت پر محسوس کیا ہے، مولانا سید احمد دہلوی نے فرہنگ آصفیہ اُردو زبان کی مبسوط لغت لکھکر اس زبان کے تتر بتر خزف پاروں کو ایک جگہ جمع کردیا ہے، اور ہمارے معزز دوست لالہ سری رام صاحب ایم۔ اے مصنف دہلوی نے شبانہ روز محنت شاقہ اُٹھاکر "ہزار داستان" کے نام سے اُردو شاعروں کا یہ ایسا بڑا تذکرہ لکھدیا ہے جس میں ولی سے لیکر آج تک کے نو مشق شاعر تک موجود ہیں۔ پھر یہ

بھی اک حسنِ اتفاق ہے کہ اِن دونوں گرانمایہ تالیفوں کو اعلیٰ حضرت قدر قدرت نظام الدولہ نظام الملک آصف جاہ قدر دان سخن میر محبوب علیخان بہادر شاہِ دکن کا عہد معدلت مہد ملا اور آصفی قدر دانیوں کا سہرا اِنکے سر بندھا۔

لالہ سری رام صاحب دہلی کے ایک صاحب اقتدار رئیس، آنریبل رائے بہادر لالہ مدن گوپال صاحب مرحوم ایم۔ اے بیرسٹرایٹ لا کے خلف الصدق اور رائے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب ٹمنڈن کے لائق بھتیجے ہیں، سری رام صاحب کے نام نامی سے کون واقف نہیں، مگر ہمکو یہاں یہ ظاہر کرنا ہے کہ آپ یونیورسٹی کے کوئی معمولی ڈگری یافتہ یا نئے پٹیو نجیا امیر نہیں ہیں بلکہ ایک قدیمی علم دوست خاندان کے رکن اور پونڈوں کے رئیس ہیں۔ آپکے مورث اعلیٰ دربار اکبری کے رکن رکین مومن الدولہ عمدۃ الملک راجہ ٹوڈرمل بہادر تھے جس طرح اِس بے آئین ملک کی ارضی پیمایش کر کے مالی آئین باندھا تھا۔ آپ نے بھی اُسی طرح ملکِ سخن کی برسوں کی جانچ پڑتال کے بعد یہ تذکرہ بنام تاریخی "خمخانۂ جاوید" لکھکر مردہ شاعروں کو زندگی جاوید اور زندہ سخنوروں کو بقائے دوام کا پٹا لکھ دیا ہے۔

اِس سے پہلے ملک کے بعض شعرا اور سربرآوردہ اہلِ قلم نے اُردو شاعروں کے اور بھی چند تذکرے لکھے ہیں مگر جس تحقیق انیق اور کوشش بلیغ سے "خمخانۂ جاوید" کے مؤلف نے تذکرہ نویسی کا حق ادا کیا ہے اُس پر نظر کر کے ہم اس تذکرہ کو اُردو شعرا کے مجمع کا اوّلیں نقش کہیں تو بیجا نہ ہوگا، موازنہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُن تذکروں کے مؤلفوں نے صرف مشہور شعرا کے حالات اور کلام کے نمونے لکھے ہیں اور ہزاروں شعرا کو جو زمانے کی سرد مہریوں کے ہاتھوں کنج گمنامی میں پڑے تھے ہمسے روشناس نہیں کرایا برخلاف اُنکے اس تذکرے میں جواہر سخن کے مالدار جوہریوں کے سجے سجائے صندوقوں اور کم مایہ خوردہ فروشوں کی تھیلیوں پوٹلیوں کی جانچ ایک ہی جوہر شناس نظر سے کی

گئی ہے، اس لیئے اُردو میں فصاحت، بلاغت، تحقیق، تدقیق، تلاش، جستجو، انتخاب و تنقید کے لحاظ سے "خمخانۂ جاوید" انشاپردازی اور فنِ تذکرہ نویسی کا بہت مکمل بہت اچھا نمونہ ہے

اِس تذکرے کی ترتیب کے لیئے ہمارے عالیقدر مؤلف نے بدوِ شعور سے ہی سیکڑوں اساتذہ ماضی وحال کی تصنیفوں کو انگریزی تعلیم کے پہلو بہ پہلو اپنے درس میں پیشِ نظر رکھا۔ ہندوستان کے اکثر مشہور مقامات کا دورہ کیا۔ تقریبًا تین ہزار پرانے اور نئے شعراء کا کلام فراہم کیا، شہرت کو خیالِ باطل سمجھنے والے دبے چھپے شاعروں کو ڈھونڈ نکالا۔ کہنہ مشقوں کو جو مشقِ سخن چھوڑ چھاڑ کر اور ہی طرف ڈھل گئے تھے اُبھارا، نو مشقوں کا دل بڑھایا، اور زرِ خطیر صرف کر کے قلمی اور مطبوعہ کلیات، دیوان، کچکول بیاض، رسالے، گلدستے خرید کر کے اسقدر اکٹھا کیئے کہ آج آپکے ہاں اُردو کلام کا ایک اچھا خاصہ کتبخانہ جمع ہوگیا ہے۔

پھر جس تذکرے کی ترتیب میں سترہ اور اشاعت میں بحساب اوسط بارہ سال صرف ہوں جسکی پانچ جلدوں میں سے پہلی تین ہی جلدیں اب تک نکلی ہوں جسکی اوسط ضخامت تین ہزار صفحوں سے اُوپر ہو جسکی سوانح نگاری اور اشعار کی چھانٹ چھنٹ میں دس ہزار آٹھ سو پچاسی راتیں سفید اور دن کالے ہوں، جسکی تدوین و اشاعت میں مؤلف کے ہزاروں پر پانی پھرے جسکی بزمِ سخن میں تُک بند اور دو مصرعی شاعروں کا گذر نہ ہو جسکی انجمن سچے اور اعلیٰ پایہ کے شعراء سے سجے جسکی کلامی تنقید میں دھڑے بندی اور جانب داری سے کام نہ لیا گیا ہو اُس تذکرے کی جامعیت اور عمدگی کا مرتبہ اور تذکروں کے مقابلے میں کیونکر بلند نہ ہوگا، ہماری رائے میں یہ تذکرہ ایک نہایت ہی اعلیٰ درجے کا تذکرہ ہے، اور اسکے مؤلف کی محنت جانفشانی، بلند خیالی، بالغ نظری، ایثار نفسی، دریا دلی صرف تحسین و آفرین اور قدردانی ہی کے لائق نہیں بلکہ اُردو ادب کی تصنیف و تالیف کی تاریخ کے صفحوں پر آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

یا ایں ہمہ اس ضخیم الحجم تذکرے کی دوسری جلد کے چھپتے وقت بعض حسّاد نافہم نے چند اخباروں میں مضامین لکھ کر بہت کچھ زہر اُگلا ہے، اور دلی بغض کے جلے پھپھولے پھوڑے ہیں، انکی تحریروں کا جواب بہتاب پیرایہ میں منشی چیتاری پرشاد شیدا دہلوی اپنی تقریظ مطبوعہ جلد دوم میں خوب مُنہ توڑ کے دیچکے ہیں۔ انکے لیئے یہاں ہم صرف یہی شعر پڑھکر چپ ہو جائینگے۔

	عیب نماید ہنرش در نظر		چشم بد اندیش کہ برکندہ باد

ہاں اس تقریظ کے لکھنے کے لیئے لالہ صاحب موصوف نے جو خط ہمارے پاس بھیجا ہے اس کا یہ فقرہ باوجود اسقدر دماغ سوزی اور صرف کے ملک نے اس تذکرہ کی کچھ قدر نہ کی،، ہمارے جسم میں ایک نہایت درد انگیز سنسنی پیدا کر رہا ہے، انگلستان جیسے علم ادب کے قدردان ملک میں جہاں آجکے دن ہزاروں معمولی درجے کے حکایت نگار اُجلی گذران زندگی بسر کرتے ہیں اگر اتنی بڑی نادر الوجود کتاب لکھی جاتی تو غالباً مؤلف کو اتنا صرف کرکے اسے کوڑیوں کے مول دیدا لینے کی ضرورت نہوتی۔ ایک ادبی دارالاشاعت اسکی ترتیب و اشاعت کا بار اپنے سر لے لیتا اور کتاب کے طبع ہوتے ہی اسکی تمام جلدیں ہاتھوں ہاتھ بک جاتیں، شاید دس پانچ اشاعتوں کی نوبت آجاتی اور پھر بھی تشنہ لبانِ سخن کی ان اوسوں پیاس نہ بجھتی۔ اسوقت جب یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارے ملک میں ادبی تعلیم روزافزوں ترقی کر رہی ہے ملکی علم ادب کی ایسی بیقدری نہایت افسوسناک ہے۔

بدقسمتی سے آجکل کے تعلیم یافتہ اصحاب اور اُردو ادب کے جُہلا کو ناواقفیت فن کے باعث اُردو شاعری کی طرف سے ایک طرح کی بے اعتنائی ہی نہیں بلکہ چونک پیدا ہو گئی ہے، انکا خیال ہے کہ اول تو شاعری ہی فی نفسہ کوئی ضروری چیز نہیں۔ دنیا سے سارے شاعر ناپید ہو جائیں تو بھی دنیاوی کاروبار اور انسانی طرز معاشرت میں کوئی کمی

باہرج نہیں ہوسکتا، اور اردو شاعری تو محض حسن وعشق کی داستان ہونے کے باعث مخرب اخلاق ہی ہے۔

ان دنوں مادی ترقی ہی انسانی ترقی کی معراج سمجھی جاتی ہے، سائنس مادیات کی ترقی پر بحث کرتا ہے، غالباً یہ خیال سائنس کے اصول پر مبنی ہے، جنھیں روحانیات سے کوئی واسطہ ہی نہیں، ورنہ حقیقت میں تو مادی اور روحانی دونوں طرح کی ترقی کے بغیر انسانی ترقی کی تکمیل ہو نہیں سکتی، کیونکہ انسان میں روح اور مادہ دونوں چیزیں موجود ہیں جس طرح مادی اشیا کی ترقی سائنس کے اصول کی واقفیت پر موقوف ہے، اسی طرح روحانی ترقی استغراق، تخیل، مناظر قدرت کے مشاہدے، اور فنون نفیسہ کی قدردانی پر منحصر ہے، موسیقی اور مصوری کی طرح شاعری بھی ایک نفیس فن ہے بلکہ اس کا مرتبہ ان دونوں سے برتر ہے، شاعر کی طبیعت قدرتی مناظر کے جذبات وخیالات کا خزانہ ہوتی ہے، وہ انکی تصویریں اپنے جادو کار قلم سے کھینچتا ہے جن کو دیکھکر دوسروں کے دلی جذبات جوش میں آتے ہیں، اور دلی جذبات کے جوش سے روح کو ترقی ہوتی ہے پس انسانی ترقی کے لیئے شاعری بھی ایک ضروری چیز ہے، عالم موجودات کی ہر شے میں حسن قدرت جلوہ گر ہے، انسانی حسن بھی قدرتی حسن ہے، حسن قدرت کے مشاہدہ سے دلی جذبات جوش میں آتے ہیں، انسان مخلوق اشرف ہے، اسکے حسن وعشق کے جذبات بھی برتر ہیں، برتر جذبات کے برانگیختہ ہونے سے روح کا اوجاج منصور ہے، اس لیئے عاشقانہ شاعری انسانی ترقی کے لیئے ضروری ہے۔ مخرب اخلاق نہیں اب رہا یہ امر کہ انسانی حسن وعشق سے سفلی جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں۔ یا علوی۔ یہ زیادہ تر سامع کی دلی تربیت اور حالت پر منحصر ہے، اسکے خیالات ادنی ہونگے تو ادنی جذبات جوش میں آئیں گے اور اعلی ہونگے تو اعلی جذبات برانگیختہ ہونگے، اس لیئے عاشقانہ شاعری ہر انسان کے دل پر یکساں اثر کرے مگر کسی حسن وعشق کے شاعر کا

مفہوم انسانی فطرت کا حیوانی حصہ نہیں ہو سکتا۔
بات یہ ہے کہ اس مادی ترقی کے زمانے میں لوگوں کا روحانی مذاق گرا ہوا ہے اور حسن پرستی جو فلسفہ حسن کے مطابق مہذب سوسائٹی کا اعلیٰ عنصر ہے مخرب اخلاق سمجھی جاتی ہے، اس وقت ملک اس تالیف کی قدر کرے یا نہ کرے مگر وہ وقت بھی ضرور آئیگا جب ان تمام شعراء کے دل سے نکلی ہوئی دعائیں جنکو اس خمخانہ جاوید کی شراب ناب کے نشے نے ہمیشہ کے لیے سرخوش و تر دماغ کر دیا ہے مستجاب ہونگی، اور طالبان ادب اس ادبی تالیف کی قدر کر کے مؤلف کو دعائے خیر سے یاد کرینگے۔

طرب و عیش کا آنکھوں میں سمایا تھا سماں — کبھی جاتی تھی نظر میں گل و ریحاں کی بہار
تھا غضب جلوۂ نیرنگیٔ خوبانِ چمن — تھی ستم شیوۂ بدمستیٔ مستاں کی بہار
موسم گل کی ہوا سے وہ ہوا باندھی تھی — کہ ہر اک برگِ خزاں تھا چمنستاں کی بہار
شاملِ فصلِ بہاری جو ہوئی تھی برسات — تھی عجب رُوح فزا ابر بہاراں کی بہار
کثرتِ عیش سے بدلی تھی یہ غم کی صورت — وصل کی شب سے سوا تھی شبِ ہجراں کی بہار
دشت پُرخار میں بھی دیکھ کے سبزے کی نمود — یاد آتی تھی بہت کوچۂ جاناں کی بہار
پھول بن بن کے نکلتے تھے شرارے دل سے — پھلجھڑی تھی کہ تھی آہِ شرر افشاں کی بہار
دیکھکر اسکو کلی دل کی نہ کھلتی کیونکر — اک نئے ڈھنگ کی تھی اک نئے عنواں کی بہار
شاد و بشاش تھا جی خوش تھی طبیعت میری — میرے چہرہ پہ کھلی تھی دلِ شاداں کی بہار
پھول جھڑتے تھے دہن سے مرے ہنگامِ کلام — قابلِ دید تھی میرے لبِ خنداں کی بہار
مجکو حیرت تھی یہ کیا بات ہے یا ربِ خدا — نظر آئی ہے جو یوں عیشِ فراواں کی بہار
غیب سے آئی وہیں کان میں میرے آواز — دلکش اس وجہ سے ہے ایسے زمستاں کی بہار
تذکرہ رائے سر رام نے جو لکھا ہے — جسپہ سو جان سے قربان ہے گلستاں کی بہار
جس کا "خمخانۂ جاوید" ہے تاریخی نام — جس کا ہر جام ہے میخانۂ مستاں کی بہار

جس کا ہر حرف ہے معنی و بیاں کا زیور
جس کا ہر لفظ ہے اردو کے دبستاں کی بہار

جس کا ہر غنچہ ہے گلزارِ سخن کی رونق
جس کا ہر پھول ہے گلزارِ حسیناں کی بہار

جسکے عنواں پہ ہے مرحمتِ آصف مرقوم
جسپہ ہے خاتمِ محبوب علی خاں کی بہار

تیسری جلد اُسی کی یہ چھپی اب کے برس
دیکھئے اِس میں نئی طبع غزلخواں کی بہار

انتخابِ سخن اِس طرح کیا ہے جس سے
نظر آتی ہے ہر اک شعر میں دیواں کی بہار

پوچھنا نظم کا کیا نثر بھی وہ لکھی ہے
جس کا ہر فقرہ ہے نظمِ دُرِ غلطاں کی بہار

کاغذ اچھا ہے چھپائی بھی بہت اچھّی ہے
لوحِ رنگیں بھی ہے رنگِ رُخِ خوباں کی بہار

طبعِ رنگیں کا جو لکھنا تھا مجھے رنگین سال
دیکھکر چہرے سے میرے دلِ جویاں کی بہار

مجھسے ہاتف نے کہا کس لیے خاموش ہو مہرؔ
"یہ بنی جلد سوم گلشنِ رضواں کی بہار"

دیگر

کیا سر رام دہلوی نے یہ
تذکرہ لاجواب لکھا ہے

شاعروں کے کلام کا اس میں
انتخاب انتخاب لکھا ہے

ہیں سوانح بھی زندگی کے درج
عمر کا بھی حساب لکھا ہے

جلدِ ثالث یہ اُس کتاب کی ہے
جسکو با آب و تاب لکھا ہے

اِس میں ہیں جلوہ گر فصیح الملک
کیا فصاحت کا باب لکھا ہے

کیا ہو اُنکے کلام کی تعریف
جو لکھا لاجواب لکھا ہے

اور بھی شاعروں کے شعروں کا
بے مثال انتخاب لکھا ہے

ہو نہ کیوں اس کا یہ شبابِ حُسن
اِس میں حسن شباب لکھا ہے

سب نے جب اِس کتاب کو پڑھکر
منتخب لاجواب لکھا ہے

مہرؔ نے اِس کا زبر و بیّن ہیں
سال بھی "انتخاب" لکھا ہے

سر رام کا وصف کیا کیا کروں مَیں
وہ عالم، وہ فاضل، وہ قابل، وہ لائق

سخنور نہیں تو سخن فہم ہیں وہ
سخن سے ہیں یوں بھی تو اُنکے علائق

لکھا تذکرہ وہ اُنھوں نے کہ جس کا
ہے یہ تیسری جلد اُس تذکرے کی
اسے دیکھ کر میں دعا دے رہا ہوں
نہ سوچو نہ سمجھو، نہ پوچھو، نہ ڈھونڈو
کہو مہر انکار کا سر اُڑا کر

بڑی مدتوں سے زمانہ تھا شائق
لکھائی چھپائی ہے سب اسکی فائق
کہ ہو یہ الٰہی پسندِ خلائق
اگر مصرعۂ سال کے تم ہو شائق
"سری رام صاحب کی تالیف فائق"
۱۳۴۳ھ

(نوٹ) اِس مادۂ تاریخ میں "ر" "کو دو ی" مان کر حسب قاعدہ مروجہ دس عدد دیئے ہیں

ہیں سری رام ایک دہلی کے رئیس
تذکرہ لکھا اُنھوں نے اک ضخیم
کی ہے محنت سالہا سال اسقدر
ہمنوا جب جانیں کوئی اس طرح کی
ہے جو یہ مہر انتخابِ منتخب

عِلم و بذل و خلق میں ہیں لاجواب
ہے وہ اُردو نظم کا نادر نصاب
کر دیا برباد ایامِ شباب
لکھ تو دے اتنی بڑی ایسی کتاب
اِسکی ہے تاریخ عطرِ انتخاب
۱۳۴۳ھ

بتائید یزدان و فضلِ اِلٰہ
رقم کرد خمخانۂ شاعران
بنا در جمل سال خمخانہ مہر

چو لالہ سری رام رنگیں رقم
کہ از نشۂ بادہ اش سرخوشم
بدیہہ نوشتم سرورِ دلم
۱۹۱۵ع

قطعۂ تاریخ از نتائج افکار گرامی بزم آرائے گلشنِ سخندانی واقفِ رموزِ نکتہ دانی
شفیقی و مکرمی کنور بدری کرشن صاحب فروغ وکیل دہلی و رئیس سکندر آباد

فروغ آج کیوں ہے تو آشفتہ حال
نسیمِ سحر نے یہ مژدہ دیا
ہوا نکہتِ گل سے پھر آشکار
ترے سامنے اک شگفتہ ہے باغ

ہوا کیا ترا کس طرف ہے خیال
کہ دامانِ صحرا گلستاں بنا
کہ اب آ گیا موسمِ نوبہار
پراگندہ پھر کیوں ہے تیرا دماغ

پھر اس باغ کی سیر بھی ہے ضرور — طبیعت کو دے اپنی شور و سرور
ہے سبزہ سے سرسبز صحنِ چمن — گلوں سے ہر اک شاخ ہے گلبدن
ہوا آج رونق فزا سبزہ زار — کھلے پھول آئی ہے تازہ بہار
گلستاں میں ہر شاخ نوخاستہ — ہے پھولوں کے زیور سے آراستہ
ہے شمشاد و قمری کا باہم وصال — غزلخواں ہے طوطیِ شیریں مقال
ترنم سرا سوسنِ دہ زباں — تحیر فزا نرگسِ بوستاں
ہیں گلہائے رنگیں کہیں خندہ زن — کہیں نغمہ خواں بلبلانِ چمن
درختانِ سرسبز و خوش الحاں پرند — چمن کی بڑھاتے ہیں رونق دوچند
زمیں پر جھکی ہے ہر اک شاخِ گل — نہ ہو مجھکو کیوں خواہشِ جامِ مُل
مٹا اب جہاں سے نشانِ خزاں — مگر ہے یہی باغ، باغِ جناں
تمامی شہنشاہِ ملکِ سخن — ہوئے آج رونق فزائے چمن
ہر اک کا نیا طرزِ تحریر ہے — ہر اک ماہرِ علم تسخیر ہے
ہر اک اپنی تحریر سے سحر ساز — ہر اک محو حیرت بسوز و گداز
ہر اک کا جُدا رنگ آیا نظر — ہر اک نے دکھایا ہے اپنا ہنر
غرض ہے یہاں جمع سب کا کلام — اسی تذکرہ کا ہے خمخانہ نام
سری رام ایم اے کی تالیف ہے — کہ جسکی زمانے میں توصیف ہے
خرد ور، خردمند، عالی خیال — سخندان، سخن سنج، صاحبکمال
لیاقت شرافت ہے اُسکی عیاں — ثنا گو ہیں سب اُسکے اہلِ جہاں
مؤلف کی تالیف کو دیکھ کر — ہوا دل میں میرے سرور اسقدر
کہ میں بھی اُسی کا ہوا مدح خواں — مگر میرے خامہ کو طاقت کہاں
کہ اُسکی صفت میں کرے کچھ رقم — یہاں پر شکستہ ہے میرا قلم

یہ ہے اُسکی سب کوشش و جستجو ۔ کہ حاصل ہوئے گوہر آرزو
زمانے میں ہر ایک نے یہ کہا ۔ سُرور یرام صد مرحبا مرحبا
کیا جمع یہ دفترِ شاعراں ۔ مضامین پنہاں ہوئے سب عیاں
یہ اوصاف ظاہر ہیں اُسکے صریح ۔ کہ تحقیقِ حالات سب ہے صحیح
وہ رنگیں عبارت وہ شُستہ کلام ۔ وہ ترکیبِ مضموں و ترتیب نام
ہر اک کے مضامین کا ہے انتخاب ۔ غرض انتخاب اُس کا ہے لاجواب
وہ تحریر خوشخط وہ کاغذ نفیس ۔ عیاں جس سے ہے صنعتِ خوشنویس
ہیں جتنے سخن سنج شیریں مقال ۔ مفصّل لکھا اس میں سب کا حال
مٹا دہر سے جن کا نام و نشاں ۔ مکرّر ہوئے زندہ سب بے گماں
جو موجود ہیں اُن کو آبِ بقا ۔ اسی جامِ خمخانہ سے مل گیا
یہ تحریر کارِ مسیحائی ہے ۔ کہ اِس سے صدا قم باذنی آئی ہے
اسی سے ہوئی خضر کی ہمسری ۔ ہوئی آبِ حیواں کی ہمسو نگری
زمانہ میں اسکی یہ شہرت ہے عام ۔ کیا اسنے خضر و مسیحا کا کام
نتیجہ یہ اُسکی طبیعت کا ہے ۔ یہ دفتر اُسی کی لیاقت کا ہے
جب اِس تذکرہ کا ہوا اختتام ۔ ہوا طبع کا اُس کے پھر انتظام
ہوئیں طبع دو جلد با آب و تاب ۔ کہ ہیں خوبی و وصف میں لاجواب
چھپی آج یہ تیسری جلد بھی ۔ کہ جس کی اشاعت کی اُمید تھی
ہُوا مجھکو بھی فکرِ تحریرِ سال ۔ کہا دل نے کیوں ہے یہ وہم و خیال
سنِ عیسوی کے ہوں حاصل نکات ۔ جو دیکھے حسابِ زبر بیّنات
تو تاریخ گوئی میں فرزانہ ہے ۔ یہ لکھدے، سوم جلد خمخانہ ہے
اگر سالِ ہجری کا ہے خواستگار ۔ تو ہر حرفِ منقوطہ کو کر شمار

فروغ اس کا ہے سال ہجری یہی	کہ ہے سویں جلد خمخانہ کی

تقریظ تراویدۂ خامۂ جادو طراز سحر پرداز فاضل یگانہ دہر ناثر عدیم المثال ناظم نظامی خیال پروفیسر خواجہ عبد المجید بی اے رئیس دہلی خلف الرشید خواجہ عبد الرحیم خان بیدل مرحوم

مرضِ عصبیت عام است و چارہ ناپیدا، ہر کس بخیالِ خویش دعویِ انصاف و لاف عدل میزند ہمہ سودائے خام، عدل معدوم و انصاف نایاب، اگر پاسداری نیشن (یعنی ملت) عصبیت نیست پس چیست، انسان انسان است چہ سفید و چہ سیاہ، چہ از روپ چہ از حبشہ، سیاہی در چشم سفیدان خارست، و سفیدی در دیدۂ سیاہاں ناخنہ وار، تعصب مبنی بر اختلاف اقالیم نیست، بلکہ ہر ملک و حصص ملک خلاف دارند، در ہند ایں قضیۂ نامبارک بیشتر از پیشتر اشاعت یافتہ، از ابتدائے آفرینش اختلاف مذہب مورثِ فتنہ و فساد بود، مگر دریں زمانِ نامسعود اختلاف زبان ہم در فتنہ خیزی کم مرتبہ نیست، و ایں فساد و عناد بیشتر از ہم زبانی می خیزد و کمتر از تباین السنہ، یکے گوید کہ زبانِ دہلی درست ست و زبان لکھنو نادرست، آں ثقیل است و ایں لطیف، ندانیم در زبان چہ ثقیل و چہ لطیف، ہر چہ لطف دارد لطیف ہست، و ایں بحث بے لطفی افزاید۔ پس بدتر از ثقالت باشد، موازنہ دبیر و انیس را دیدیم و بر طبع و نقادِ شبلی آفریں گفتیم۔ لیکن ایں بحث انیسیاں دبیر را خوش نمی آید۔ و باعثِ رنجش خاطر شود، ایں مسئلہ ذوق شاعرانہ است و کسے بر خاطر دیگرے جبر نتواں کرد، اگر کسے دبیر را دوست دارد دیا چرا او را دوست نداریم اگر چہ شیفتۂ انیس باشیم، ہمچنیں اگر شما دلدادہ محاورہ لکھنو ہستید چشم ما روشن دلِ ما شاد، ما زبانِ دہلی را پسند می کنیم بر باہم بحث وارد نیست ✤

ہر کہ خدمت میکند مخدوم باشد و سزاوارِ تحسیں، و خوبتریں نعمتے کہ انسان از خدائے بزرگ یافتہ کلام است، و کلام الٰہی بر آں گواہ، پس بہترین خدمت خدمتِ کلام باشد و ہر کہ دریں کارِ زیبا مشغول ست مرغوب ست و ستایش را سزاوار، آں مرد کیست

کہ اکنوں از وم و قدم دریں کار سعی بلیغ می نماید، و در صحت و رنجوری این مشغلہ را از دست ندہد، ہر چہ میگویم نفس لامر ست نہ ژاژ خائی و بیہودہ سرائی، مخدوم من ہمچنین ست، اگر خلاف می گویم تجسس را راہ ست و دروغ گو را سزا، و جلد سوم خمخانۂ جاوید بر دعوی من گواہ، لالہ سری رام صاحب ایم اے۔ دریں باب وکیل من ست و ہم ممدوح من، اگر کسے دریں زمان مثل او باشد بنماید، و مرا اشرمسار سازید، او تہمت والا برایں کار گماشتہ و خود را مثال ساختہ و وا می نماید کہ ہر کہ تعصب ندارد چنیں باشد و پیش روی کار از ذات او وابستگی دارد، کلامے کسی را زندہ داشتن مانند آن ست کہ او را زندہ می داریم، پس ایں مرد یک تنہ ہزاراں مردگاں را حیات جاوید بخشیدہ و ہم خود را زندہ جاوید کردہ، ہرگز آں کس نمیرد کہ نام نیکوئے او در جہاں جاری باشد و ذکر جمیل او در روزگار ساری، این بندہ حقیر کہ سطورے چند بر آں کتاب نایاب می نویسد مثل خاک راہ است کہ بہ دامن بزرگاں می آویزد و از دستیاری دامن از پستی بہ بلندی گراید، حاشا کہ تمنائے بلندی در سر دارم چرا کہ ایں وقار من نا سزا را سزاوار نیست۔ اگر کسی گوید پس ایں خامہ فرسائی چیست در جواب میگویم تعمیل ارشاد مخدوم ست و چوں امر شد مجبور شدم و امید کہ معاف دارند ختم کلام بر دعا می نمایم، مخدوم را ثنا ہائے بلند و دعا ہائے ارجمند می خوانم، فقط

رقم زدہ ۱۴ فروری ۱۹۱۵ء۔ احقر اللہ عبد المجید

تقریظ از نتائج افکار دُربار کانِ فصاحت جانِ بلاغت استاد الوقت یادگار اساتذہ سرگروہ اربابِ صدق و صفا عالیجناب بجالات انتساب مخدومی و مکرمی نواب سعید الدین احمد خاں طالب جاگیردار لوہارو رئیس دہلی یادگار نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیر رخشاں مرحوم

اللہ جلشانہ کی نعمتیں لاتعد و لاتحصیٰ ہیں، منجملہ نعمائے الٰہی کے ایک نعمت علم بھی ہے، جو اس نعمت کا شائق ہو، جسکو یہ نعمت حاصل ہو واقعی وہ خوش نصیب ہے اور جو اس نعمت کے ساتھ صاحب تالیف و تصنیف بھی ہو اُسکو بہا خوش نصیب سمجھنا چاہیئے، چنانچہ مؤخر الذکر وصف کا موصوف اور مصداق اس مقال کا حال فرخ فال

ستودہ صفت ہر نیکو منظر لالہ سری رام صاحب ایم اے سلمہ اللہ تعالیٰ، میرے دیرینہ دوست
آنریبل رائے بہادر لالہ مدن گوپال صاحب بیکنٹھ باسی کے فرزند ارجمند کا ہے
شائق علم اور حصولِ علم کے لحاظ سے تو وہ ایم - اے ہیں جو آجکل کی طرزِ تعلیم کی معراجِ
کمال ہے، یہی تالیف و تصنیف سو یہ تذکرۂ خمخانۂ جاوید کی تالیف نے اِنکو اتنا بڑا خوش نصیب
ثابت کیا ہے کہ اگر وہ اول درجے کے دولتمند اور صاحبِ ثروت ہوتے، اور اس
دولت لازوال سے محروم ہوتے، تو اہلِ علم و فن کی نگاہ میں کبھی انکی اتنی وقعت نہ
ہوتی جواب ہے۔ ؎

قاروں ہلاک شد کہ چہل خانہ گنج داشت	نوشیرواں نمرد کہ نام نکو گذاشت

مجھ سے مؤلفِ مذکور متقاضی ہیں کہ تیسری جلد کے لیئے کوئی تقریظ لکھوں، امتثالِ
امر ضرور ہے، تقریظ تو کیا خاک لکھونگا - یہ تو جن کا منہ ہے انہی سے ہوگا، مگر ہاں چند
سطریں یوں ہی برائے نام لکھدونگا، لیکن جو کچھ معرضِ تحریر میں آئیگا، پیرانہ سالی،
مختلف عوارض کا ہجوم، بے مشقی، سب سے بڑھکر بے دماغی کی وجہ سے کنایۃً یہ شعر حضرت
لسان الغیب اسد اللہ خان غالب رحمۃ اللہ علیہ کا لکھا آئیگا۔ ؎

مجھ سے غالب یہ علائی[1] نے غزل لکھوائی	ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی

خمخانۂ جاوید کی پہلی اور دوسری دونوں جلدیں میں نے فرداً فرداً بالاستیعاب نہیں، بلکہ
جستہ جستہ دیکھی ہیں، اللہ رے مؤلف کی محنت شاقہ اور واہ رے اسکی سلاست زبان کے
خلوصِ دل سے حفظ مراتب کا خیال، انتخاب اشعار میں سلیقہ شعاری، تذکرہ کے طبع کرانے میں
اسکے کاغذ، لکھائی، چھپائی، اور ترتیب کا حسن انتظام، یہ سب باتیں مؤلف کی دماغ سوزی جانکاہی
کے علاوہ اسکی طبیعی تہذیب اور شائستگی کی بھی خبر دیتی ہیں، سخنورانِ امصار و دیار، اور
دانشمندانِ روزگار اسکے ابتدائی تذکرہ ہزار داستان کے محاسن نظم و نثر میں تحریر فرماچکے

[1] علائی تخلص، اخی بزرگوار فخر الدولہ نواب علاء الدین احمد خاں بہادر مرحوم رئیس لوہارو۔

ہیں مشکل نہیں بلکہ سخت دشوار ہے، کہ ان پر کچھ اضافہ کیا جائے، اور اگر پہلو بچا کر کچھ لکھا بھی جائے
اور از ہزار یکے، واز بسیار اندکے، پر قناعت بھی کیجائے تاہم انہی مضامین کی کاسہ لیسی
ہوگی جو نسبتاً تحریر میں آچکے ہیں، اور تحصیل حاصل کسطرح بیوقعت و بیکار، مگر ہاں ایک امر واقعی کا
اظہار ضرور ہے، جو کچھ میں عرض کرتا ہوں، یہ سوء ادبی پر محمول نہ ہو، بلکہ یہ اصول پیش نظر رہے
کہ ہر متنفس اظہار رائے میں آزاد ہے، حضرت استادی مطاعی و مولائی جناب حالی رحمۃ اللہ
علیہ نے جو اس تذکرہ کی دوسری جلد پر تقریظ تحریر فرمائی ہے، اور اس میں ترقیم فرمایا ہے، کہ
وہ مسلمانوں پر سخت الزام لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے باوجود ایک ہزار سال کے ہندوستان
میں آباد ہونے کے سنسکرت اور برج بھاشا کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا، یہ الزام یا اعتراض
تو بجا ہے، مگر قدر سے قلیل اس میں خامی بھی ہے، وہ یہ کہ اس الزام میں ہندو صاحبان تصنیف
و تالیف کو بھی شریک کرنا چاہیئے، صیغہ تصنیف و تالیف نظم و نثر اردو میں مسلمانوں سے ہندو
بہت کا حصہ متناسبہ ضرور رکھتے ہیں، مگر یہی کمی یا لغزش انکی تالیف و تصنیف میں بھی پائی جاتی
ہے تاہم مسلمانوں کی جانب سے ہم کچھ پیش کر سکتے ہیں جو مسلمانوں نے سنسکرت یا بھاشا کی
خدمت یا قدر و منزلت کی ہے، اکبر بادشاہ مرحوم کے زمانہ میں مہابھارت کا ترجمہ فیضی نے
کیا جسکو سنسکرت کا شاہنامہ کہنا بیجا نہ ہوگا، فرملی ارمنی نے جوگ بسشت کا ترجمہ کیا۔ جو ہنود
دھرم کی خاص مواعظ حسنہ کی کتاب ہے، دارا شکوہ کی سرّ اعظم یہ بھی سنسکرت کا ترجمہ
ہے اور اس میں از سرتاپا سنسکرت کے الفاظ بھرے پڑے ہیں ملک محمد جائسی کی پدماوت
خاص بھاشا میں ہے، حضرت[۱] قبلہ ام مرحوم نے حسب التماس خواجہ امان صاحب مرحوم مترجم
بوستان خیال[۲] ریاض الابصار کا دیباچہ اردو میں خواجہ صاحب موصوف کی طرف سے لکھا، چونکہ
یہ دیباچہ راؤ راجہ شیودان سنگھ سکینٹھ باشی والی ریاست الور کی ستایش میں لکھا گیا تھا حضرت

---

[۱] نواب ضیاء الدین احمد خان صاحب نیر رخشاں مرحوم رئیس لوہارو ۔

[۲] بوستان خیال کی تیسری چوتھی جلدوں کا ترجمہ ہے، یہ ترجمہ کی دوسری جلد ہے ۔

مرحوم کی جدت پسند طبیعت نے اس قدر خاص سنسکرت کے الفاظ اس میں داخل کئے ہیں کہ خیال
وید ہے، اور تاریخی لحاظ سے تو دریا نہیں، بلکہ سمندر کوزہ میں بھرا ہے، ہاں اہل نظر نے اپنی
اپنی طبیعتوں کے موافق ضرور حظ اٹھایا، مگر عوام و خواص ہندو و مسلمانوں میں تو کیا کسی پنڈت
صاحب نے بھی اس کا تتبع نہیں کیا، پنڈت رتن ناتھ صاحب سرشار نے فسانہ آزاد، اور
سیر کوہسار دو ضخیم کتابیں لکھیں، مگر وہی مروجہ سلیس اردو میں، رہی وہ فصیح و بلیغ اردو جو آجکل
ہمارے آریہ صاحبان اپنے جلسوں اور لکچروں میں برتتے ہیں، اسکی نسبت نہایت ادب سے
عرض کرونگا کہ اس فصاحت و بلاغت سے ہماری روزمرہ کی زبان اگر محروم ہی رہے تو بہت اچھا
ہے، صغر سنی کے زمانہ میں ہمنے سُنا تھا کہ شاہجہاں کے قلعہ کی زبان اردوئے معلّی کہلاتی ہے
مگر جب حضرت لسان الغیب نواب اسد اللہ خان غالب مرحوم کے خطوط چھپے، اور اُن کی
نثریں، اور شاگردوں کی صلاحیں طبع ہوئیں، جن کا نام اردوئے معلّی، اور عود ہندی رکھا گیا۔
اُس وقت ہر کہ ومہ کی آنکھیں کھلیں اور زمانے نے تسلیم کیا کہ اردوئے معلّی یہ ہے، چنانچہ
یادگار غالب میں حضرت حالی مرحوم استادان وقت سے جہاں تقابلہ حضرت لسان الغیب کا
فرماتے ہیں، وہاں اردو کی نثر کی بابت لکھتے ہیں کہ یہاں غالب مرحوم کے آگے میر، سودا،
ناسخ، آتش، انیس، دبیر، ذوق، مومن، سب کو صفر ہے، اس اردوئے معلّی کا تتبع
یگانہ و بیگانہ اکثر نے کیا، مگر چھ آدمی مشہور و مقبول ہوئے، سر سید احمد خان، مولوی ڈپٹی نذیر احمد
منشی ذکاء اللہ، مولانا حالی، علامہ شبلی، مولوی محمد حسین آزاد، رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین
اور یہ ایک عجیب حسن اتفاق ہے کہ مؤخر الذکر پانچوں حضرات شمس العلماء کے خطاب سے منجانب
برٹش گورنمنٹ مشرف و منور ہیں، ہر چند کہ ان حضرات میں ہر ایک نے اپنے مزاج کے موافق
روش جداگانہ اختیار کی، مگر اصولاً یہ اسی اصل کی فروع ہیں، میرے نزدیک زبانِ حال میں چاہے
جس زبان کے الفاظ کی آمیزش کیجائے، غالب مرحوم کی اردو پر فروغ پانا، ناممکن نہیں تو
محال ضرور ہے، چونکہ یہ تذکرہ نہایت خلوص اور دلسوزی سے لکھا گیا ہے اور بکار آمد ہونے

میں تو اسکے شک و شبہ کی گنجایش ہی نہیں، جن حضرات کو زبان کا اور شعر و سخن کا مذاقِ سلیم ہے وہ ضرور اسکو زیرِ مطالعہ رکھیں گے، اور لطف اٹھائیں گے، اِنکے تفننِ طبع کے لیئے ہم ایک چھوٹا سا سوال اور اُس کا مختصر سا جواب لکھتے ہیں، اور ان اہلِ الاتنبا حضرات سے جن کو اپنی زبان کی ترقی اور توسیع کا شوق ہے عرض کرتے ہیں اور اُمید رکھتے ہیں کہ اس سوال و جواب پر غور فرما کر طبع آزمائی فرمائیں گے اور جو کچھ ہماری غلطی ہو اُسکی اصلاح۔ **سوال** بوجہ کثرت حروف ہجا، نیز مختلف المخارج وصوت حروف سے کونسی زبان کو وسعت اور فضیلت ہے۔

جواب۔ اِس مسئلہ میں علم اللسان کا یہ اصولی فتویٰ ہے کہ بسبب کثرت و مختلف المخارج وصوت حروف ہجا ایک زبان کو دوسری زبان پر حقیقتاً فضیلت نہیں ہوسکتی، کیونکہ ہر ایک زبان میں وہ مختلف المخارج وصوت حروف داخل کیئے گئے ہیں جو لفظ کے بار کو اٹھا سکے، مثلاً عربی میں یہ حروف داخل نہیں ہیں، پ، چ، ژ، گ، اور فارسی میں ث، ح، ذ، ص، ض، ط، ظ، ع، ق، انگریزی میں ت، ش، چ، وغیرہ نہیں ہیں، یہ بحث اگر مفصل دیکھنی ہو تو کتاب لغت انجمن آرائے ناصری یا فرہنگ ناصری کا دیباچہ قابلِ ملاحظہ ہے"۔ رہی وسعت زبان اسکے لیئے دنیا کی تمام زبانوں کے حروفِ ہجا کا مجموعہ زیرِ نظر ہو تو اُس وقت حکم لگایا جاسکتا ہے، اِس سوال و جواب کو پیشِ نظر رکھکر یہ ملحوظ خاطر ہونا چاہیئے کہ جب صرف ایک حرف کا بار جو ایک زبان سے مخصوص ہے دوسری زبان نہیں اُٹھا سکتی تو لفظ کا بار جو دو یا چند حروف کا مجموعہ ہوتا ہے کیونکر اُٹھایا جاسکتا ہے اور اسکی بدیہی دلیل یا تمثیل معرّب، مفرّس مہنّد، الفاظ کا وجود موجود ہے، حضرت اُستادی حالی مرحوم کے اتباع میں اتنا اور عرض کرونگا کہ لالہ سری رام صاحب کو صحتِ واقعات میں جہانتک ممکن ہو سعی بلیغ کرنی چاہیئے۔

۱ غیر زبان کے لفظ کو کسی حرف کی تبدیلی سے عربی بنا لیا گیا ہو۔

۲ کسی اجنبی زبان کے لفظ کو کسی حرف کی تبدیلی سے فارسی بنا لیا گیا ہو۔

۳ کسی غیر زبان کا لفظ کسی قدر تبدیلی کے ساتھ یعنی حرف کی تبدیلی سے ہندی بنا لیا گیا ہو۔

جلد اوّل میں زیر احسن تخلص لکھا ہے حکیم محمد احسن[۵۱] خان خلف حکیم محمد حسن خان، حالانکہ احسن خان اور محسن خان دونوں حقیقی بھائی تھے اور انکے والد کا نام حکیم محمد حسن خان تھا، صد حیف کہ یہ دونوں جوان چل بسے، زیر تخلص احسان لکھا ہے کہ حافظ نواب عبد الرحمن خان احسان کی حویلی بازار لال[۵۲] کنوئیں میں ہے، مگر نہیں یہ حویلی بازار سرکی والان میں ہے،

انجام فرخ فرجام کے لیئے اختتام کلام دعا پر ہونا مستحسن ہے، اللہ تعالیٰ شانہ میرے مخلص دوست لالہ سیری رام کو عمر طبیعی صد وسی سال مرحمت فرمائے، اور انکی صحت ثروت اور ہمت میں روز بروز ترقی عطا کرے تاکہ اس تذکرہ کی تکمیل کے بعد ایک دوسرا تذکرہ اردو شاعروں کا بھی مرتب فرما کر شائع کریں، اور جو اہل زبان ہونے کے مدعی ہیں انکے جوہر کھلیں اور ایسے تذکرہ کا شیوع بالکل ایک نئی بات ہوگی + س

سنم انچہ کردم ز ہرزہ کلام	تو دانی دگر بعدہٗ والسلام	

احقر العباد میرزا سعید الدین احمد آف لوہارو عرف احمد سعید طالب دہلوی

۳۰ اپریل ۱۹۱۵ء روز آدینہ مبارک

نثر و قطعہ تاریخ از تصنیف لطیف شاعر بدیع نگار خوش گفتار منشی بسنت لال صاحب عنبر وکیل گورکھپور

آپنے اپنی صحت کا حال کچھ نہیں لکھا، میں ہمیشہ جناب باری سے آپکی صحت مزاج کے لیئے دعا کرتا رہتا ہوں کہ یہ بڑا کام ترتیب خمخانۂ جاوید کا جو آپنے اپنے ہاتھ میں لیا ہے انجام ہو جائے تقریظ بھیجتا ہوں درج فرما دیجیئے + بسنت لال عنبر وکیل گورکھپور - ۷ مارچ ۱۹۱۵ء

آغاز حسیں کا خوب ہو انجام کیوں نہ ہو	انجام نیک اگر ہو تو پھر نام کیوں نہ ہو

۵۱ کاتب کی غلطی سے بجائے محمد حسن خاں کے محمد محسن خان جلد اول میں چھپ گیا مسودہ میں درست نام موجود تھا -

۵۲ لال چاہ سے جو سید ہا بازار ٹیڑیو کے کٹرہ تک جاتا ہے اسکے ایک حصہ کا نام "سرکی والاں" ہے +

یوں تذکرے تو ہیں شعراء کے بہت بہت
وہ "خمخانہ" لکھنا اور ہی تھا کام کیوں نہ ہو

لبِّ لباب سے لیے سب کے کلام کے
بیشک وہ آتشنہ سے گلفام کیوں نہ ہو

یہ آپ ہی کا کام تھا احسنت و مرحبا
کیا تذکرہ لکھا ہے سربرام کیوں نہ ہو

صحت خراب اور مشاغل ہیں انہماک
با ایں ہمہ یہ خوبیٔ اتمام کیوں نہ ہو

تھے محو و سہو دہر ہیں اہلِ سخن پڑے
روشن کئے جناب نے سب نام کیوں نہ ہو

فیضِ عمیم آپ کا کرتا ہے نامور
اُردو کا گرچہ شاعرِ گمنام کیوں نہ ہو

وہ نامرادِ ٹوٹی تھی جنکی کہ جا کمند
دو چار ہاتھ قربِ لبِ بام کیوں نہ ہو

اِس تذکرہ سے اُنکو حیاتِ ابد ملی
مشہوران کا تذکرہ ما دام کیوں نہ ہو

اُردو کے شاعروں کی یہ انسائیکلوپیڈیا
اُردو ادب میں قابلِ اکرام کیوں نہ ہو

ہیں قدر کی نگاہ سے سب اسکو دیکھتے
یہ منعمِ حقیقی کا انعام کیوں نہ ہو

ہے اپنے آپ فرد یہ مبسوط تذکرہ
مرغوبِ خاص و منتخبِ عام کیوں نہ ہو

"خمخانہ" ہی کے سیر سے معدوم ہوتا ہے
جانسوز کیسا ہی غمِ ایام کیوں نہ ہو

"خمخانہ" کے اثر سے ہے زاہد بھی میگسار
مستِ الست رندِ مے آشام کیوں نہ ہو

ہند و مؤلف آپ سا قادر کلام پائے
محظوظ پھر تو طبقۂ اسلام کیوں نہ ہو

خالق نے دی ازل سے لیاقت یہ آپ کو
تقسیم خوب خالقِ قسام کیوں نہ ہو

دلکش ہے انتخاب تو پاکیزہ روئداد
پھر سیر اسکی دافعِ آلام کیوں نہ ہو

پر حیف ہے کہ ساقیٔ خمخانۂ سخن
حصہ کا میرے خم میں ترے جام کیوں نہ ہو

تاریخ اسکی لکھتا ہوں میں تذکرہ ابد ۱۳۳۲ھ
کیا مادہ ہوا ہے یہ الہام کیوں نہ ہو

عنبر کی نظم ہدیہ ہے احباب کے لیئے
طرزِ بیاں یہ جملۂ تمام کیوں نہ ہو

اقتباس از تحریر لالہ پربھودیال سٹیشن ماسٹر لائٹ ریلوے ریاست گوالیار

میں نے آپکا "خمخانہ جاوید" ایامِ رخصت میں منشی حب لال صاحب رعد وکیل کے پاس

دیکھا، اسکے دلچسپ ہونیکی نسبت اگر میں کچھ عرض کروں تو میرے قابو سے باہر ہے مگر مختصر عرض کرتا ہوں کہ مجھے اپنے رخصت کے ایام تک کی خبر نہ رہی کہ وہ کب ختم ہوئے اور اسقدر شوق نے طول دیا کہ رات دن سوائے اِس مشغلہ کے کسی دوسرے کام کی فکر تک پیدا نہ ہوئی،

آپنے جو کام کیا ہے وہ ایسا مبارک و شائستہ ہے کہ جس کا ہر اہلِ سخن کو ہزار زبان سے شکریہ ادا کرنا چاہیئے، خصوص ہندو بھائیوں کو جو ابھی تک گوشۂ گمنامی میں پڑے تھے، ٹیک چند بہار، چندربھان برہمن، اور راجہ پیارے لال آشفتہ مستند فارسی کے شاعر ہوتے ہوئے جب ایک خفیف بہانہ سے آزادانہ صفِ شعرا میں بیٹھنے سے محروم رہے تو آپنے انکے اردو کلام کو ڈھونڈ نکالا اور اُن پر نہایت درجہ کا احسان کیا۔

یہ تو سچ ہے کہ آپکی محنت اور عرقریزی کا اندازہ ہم لوگ نہیں کر سکتے مگر اس کہنے سے بھی باز نہیں رہ سکتے کہ آپنے اپنی محنت سے کہیں زیادہ احسان جماعتِ شعرا پر کیا ہے کہ جسکے بارسے وہ ہزار آزادانہ روش پر بھی سبکدوش نہیں ہو سکتے، اور صرف یہی کیوں آپنے انکو زندۂ جاوید کر نیکے ساتھ ساتھ اپنی محبت عظمت اور کریم النفسی کا نشان روزگار کے دل پر ڈالدیا جو قیامت تک محو یا حک نہیں ہو سکتا ہے ؎

چو خواہی کہ نامت بود در جہان	مکن نام نیکِ بزرگاں نہاں

بندہ پربھو دیال اسٹیشن ماسٹر لائٹ ریلوے گوالیار ۲۰ ستمبر ۱۹۱۷ء

تقریظ از نتائج افکار گوہر نثار مہر اوج نکتہ دانی ماہ منیر بزم سخندانی مکرمی سید وحید الدین احمد بیخود دہلوی یادگار حضرت فصیح الملک مرزا داغ مغفور

ادائے شکر ہے لازم تجھے زبانِ سخن	کہاں جہاں میں پیدا یہ قدر دانِ سخن

دُھن سکے پکے اور بات کے دھنی ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے ہمارے دیرینہ عنایت فرما عالیجناب رسائے سریرام صاحب ایم۔ اے۔ مؤلف تذکرہ خمخانۂ جاوید ہیں، خوشی ہو، غم ہو، سفر ہو حضر ہو، مرض ہو، صحت ہو، کسی وقت، کسی حال میں تذکرہ کے اضمام تذکرہ کے تک ودو

سے خالی نہیں، برسبیل تذکرہ ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے، کوئی چار ماہ کا عرصہ ہوا ایک دن اتفاقیہ میں آپکی کوٹھی پر جا نکلا وہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ رائے صاحب علیل ہیں، دیکھا تو اسبے دور صاحب فراش پایا، حال پوچھا تو کہا میں عرصہ سے علیل ہوں اور بخار کہنہ ہوگیا ہے، کچھ اوراق ہاتھ میں دیکھ کر میں نے دریافت کیا کہ یہ کاغذ کیسے ہیں جو نصیب دشمنان ایسی سخت علالت کی حالت میں بھی دیکھے جا رہے ہیں، ارشاد ہوا کہ وہی تذکرہ کے متعلق ہیں، انکو ترتیب دیرہا ہوں، یہ سنکر مجکو حیرت ہوگئی، اور میں سمجھا کہ جس طرح عاشقان الٰہی فنا فی اللہ، اور عاشقان نبی فنا فی الرسول، اور عشق مجازی کے مبتلا فنا فی المعشوق ہوجاتے ہیں، یہ ہمارے مکرم فنا فی التذکرہ کا درجہ حاصل کرچکے ہیں، اللہ غنی اس سرگرمی کا کیا ٹھکانا ہے، مگر یہ اسی سرگرمی کا نتیجہ ہے کہ اتنے بڑے تذکرہ کی یہ تیسری جلد اب ناظرین ملاحظہ کر رہے ہیں، ایسا تذکرہ لکھنا اسی عالی دماغ مؤلف کا کام تھا جسنے اردو زبان کی بنیاد کو بے انتہا مضبوط کردیا، افسوس ہے اگر ہمارے اہل ملک ایسے سچے شیفتہ علم ادب کی قدر نکریں، مؤلف کا احسان صرف اردو زبان ہی پر نہیں ہے بلکہ ان دس کروڑ اشخاص پر بھی ہے جو اردو بولتے ہیں یہ ہماری رائے میں مؤلف کی دماغ سوزی اور جگر کاوی کی داد جیسی ملنی چاہئے تھی ابھی تک نہیں ملی، خدا نے چاہا تو اب کوئی دن جاتا ہے کہ جس طرح شمع پر پروانے گرتے ہیں اس تذکرہ کے طالب بھی اسی طرح اس پر گرینگے۔

یہ وہ ہے جنس گرانبار خریداروں میں	جسکا ثانی نہیں ملتا کہیں بازاروں میں

منصف نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ ہمارے مکرم ہر دلعزیز مؤلف نے اپنی قابل قدر جوانی اس معشوق دل نشیں کے آراستہ کرنے میں گنوادی ہے اور اپنی اور اپنے والد بزرگوار کی اندوختہ دولت کا ایک بڑا حصہ اسکی تلاش و جستجو میں صرف کردیا ہے جب کہیں جاکر یہ صورت زیبا مشتاقان حسن معانی کے دیکھنے میں آئی ہے۔

یہ ہیچمدان ذرہ بیمقدار ہیچو دزار کمال احسانمندی کے ساتھ جناب مؤلف کی محنت کی

دینے کے بعد اس دعا پر ان سطروں کو تمام کرتا ہے۔

تم سلامت رہو ہزاروں سال	تم سے ملتی ہے داد اہل کمال

تقریظ و تاریخ طبع از فکر رنگین خوش گوئے دکنی شیخ محمد عثمان صاحب شاد سابق اڈیٹر رسالۂ آفتاب سخن پونہ معتقد حضرت ظہیر دہلوی

تقریظ کے لکھنے میں جو سرگرم رقم تھا	سجدے میں ہر چند سر تسلیم قلم تھا

سبحان اللہ کیا قابل تحسین یہ ریاض پر فضا ہے۔ اس چمن کی تازگی تازگی کو بلبل سے پوچھا چاہئے اور اس رنگین منظر کو چشم اہل بصیرت سے دیکھا چاہیئے۔ مہر منیر اسکے آبگینوں کا ظہور ہے۔ ہر الماری اسکی تجلی سے نور علیٰ نور ہے۔ ہر کلیجہ شہید تسلیم و رضا ہے۔ ہر دل پر حسرت و تمنا سائل حمد و ثنا ہے۔ جل جلالہ عم نوالہ و عظم شانہ و اعظم ذکرہ ؎

للہ الحمد کہ جس چیز کی خواہش تھی کمال	پردۂ غیب سے ظاہر ہوا اب اس کا جمال

یہ مجھے آج پہلا اتفاق ہے کہ خمخانہ جاوید کی دوسری جلد دیکھنے کے بعد میرے دل میں تیسری جلد کی تقریظ نگاری کا خیال پیدا ہوا ہے۔ میں اسکی تقریظ بھی نہیں لکھ سکتا۔ اور لکھوں تو کیا لکھوں بقول شخصے کہ سورج کو چراغ تلے دکھانا۔ یہ تالیف جو اس وقت میرے سامنے ہے اور جس پر میں کچھ رائے ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک ایسے مؤلف کے دلی جذبات کا فوٹو ہے جو خاص دہلی کا رہنے والا اور اردو زبان کا محقق منصف مزاج جس کے سر پر اقلیم سخن کا تاج۔ لائق۔ فائق۔ عاقل فاضل۔ شاعر نکتہ شناس۔ سخنور روشن قیاس۔ ہم آغوش عروس کمال۔ ناظم نظامی مثال جان بلاغت۔ کان فصاحت۔ سخن گستر سراپا ہو مرآتش زبان فصیح اللسان۔ شاعر خوش بیان شیریں بیان۔ اہل زبان۔ بلاغت عنوان۔ حاتم ہمت۔ فلاطون حکمت۔ والا جناب۔ معلی القاب عالی مقام۔ زیبا خیال۔ رنگین کلام جناب لالہ سری رام صاحب ایم۔ اے ہے یہ نام سنہری حرفوں سے لکھنے کے قابل ہے۔ میں مؤلف کو زیادہ داد کے قابل سمجھتا ہوں اس لیے

اِس لیئے کہ اسنے زبان اُردو پر بہت بڑا احسان کیا اور ہمکو فرض ہوگیا کہ مؤلف کا شکریہ ادا
کریں مگر میں حیرت میں ہوں کہ ایسے الفاظ کہاں سے لاؤں جس سے مؤلف کا شکر ادا کروں
اور احسان سے سبکدوش ہو جاؤں۔ شعرائے ماضی وحال پر احسان کرتے ہوئے ایک
یادگار قائم کردی ہے جو ہماری آیندہ نسلوں کی نظر سے گذریگی۔ ہائے مؤلف نے اپنا
کیسا عزیز وقت ضائع کیا۔ کتنی محنت ومشقت سے کلام۔ حالات شعرا کے جمع کیئے چوبیں
گھڑی قلم دوات کاغذ سے کام تھا۔ اور اپنا عزیز وقت ہماری یاد میں گذارا۔ ہر شاعر کے
کلام پر ایسی رائے ظاہر کی کہ کسی شاعر کو چون وچرا کرنے کا موقعہ نہ ملا۔ شعرائے جہان کے
سر پر وہ احسان کا پہاڑ رکھدیا ہے جس کا حشر تک بوجھ اُترنا محال ہے۔ ہم اور شعرائے
مرحوم کی روحیں مؤلف کی محنت کی داد دیتے ہیں اور صدق دل سے دعا دیتے ہیں۔ یا اللہ
جبتک فلک پر شمس و قمر قائم ہیں اس مؤلف کی عمر دراز کر اور خوش وخورم رہے۔ آمین ثم آمین

اِس کام کو اگر میں انجام دیتا تو مکرم جناب لالہ سری رام صاحب سے داد طلب ہوتا جن
شعرائے مرحوم کا ذکر پہلی دوسری جلد میں ہوگیا ہے اُنکی ارواح مؤلف کو دعائے خیر سے
یاد کرتی ہونگی۔ خمخانہ جاوید کی پہلی دوسری جلد باغ پُر بہار ہے جسکی ثنا کے لیئے ایک عمر دراز درکار
ہے۔ زبان کی کیا تعریف ہو اور طبیعت کی کیا توصیف ہو۔ انتخاب لاجواب۔ تقریر جوہر شمشیر۔
زباندانی۔ جادو بیانی۔ شاعر کے کلام پر ریمارک۔ اس پر دلچسپ تحریر۔ کسی چلبلے معشوق کی تصویر
بندش میں سلاست۔ مضمون میں متانت۔ کہیں درد۔ کہیں ذکر آہِ سرد۔ کوئی تصویر نوجوانی۔
کوئی طاؤس کا شانی۔ کوئی یوسف کی نشانی۔ کوئی نقش نگار مانی۔ جلوۂ قدرتِ باری۔
کرم ابر بہاری۔ کہیں توصیفِ کاکل۔ کہیں ذکر گیسوئے سنبل۔ کہیں بھولی بھالی صورت کہیں
تصویر کیجالت۔ کہیں دلکی بُری گت۔ کاغذ اعلیٰ درجے کا۔ چھپائی عمدہ۔ لکھائی نفیس۔ خمخانہ
جاوید کا حرف حرف ستاروں کو جگمگا رہا ہے۔ نقطہ نقطہ روپوں کی طرح چمکتا ہے۔ کاغذ کی
چکنائی کسی معشوق کم سن کے رخسار۔ زبانی تعریف بے سُود ہے۔ دیکھئے تیسری جلد موجود ہے

آخری التجا - ہم اخیر میں جناب لالہ سری رام صاحب سے التجا کرتے ہیں کہ تیسری جلد میں اگر خ سے ی تک فیصلہ ہو تو بہتر ہے - اب ہماری آنکھیں جناب لالہ سری رام کی طرف لگی ہوئی ہیں کہ کب تیسرا ایڈیشن چھپکر ہمارے ہاتھ آتا ہے - چار دن کی زندگی کا کیا بھروسہ ہے ؎

سہارا کیا لڑکپن کا بھروسا زندگانی کا ۔ چھلک جانے کو ہے بھر کر پیالہ زندگانی کا

جب کبھی میں رات کیوقت انسان کی بے ثباتی پر غور کرتا ہوں تو گھنٹوں اس دھن میں خاموش رہتا ہوں - معمارِ قدرت انسانی عمارت کو کتنے دنوں میں تیار کرتا ہے - اور جب وہ بلندی پر آجاتی ہے تو موت کا سیلاب اُسکو نیست و نابود کر دیتا ہے -

اِس غرض سے میں جناب لالہ سری رام صاحب سے بار بار التجا کرتا ہوں کہ اِس سال میں اگر تیسری جلد چھپ کر نکل جائے تو بہتر ہے تاکہ مَیں اُسے دیکھکر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرلوں اور مؤلف کو دعائے خیر سے یاد کروں اور ڈبل شکریہ ادا کرنے کا مستحق بن جاؤں -

تاریخ

مؤلف نے ایسا کیا انتخاب ۔ نہیں منہ کسی کا کرے جو شکایت
نرالی ہے بندش نرالا ہے مضمون ۔ ہر اک رنگ میں ہے نرالی یہ رنگت
ہر اک سطر رنگت میں ہے رشکِ سنبل ۔ ہر اک صفحہ ہے رشکِ گلزارِ جنت
مقابل ہیں حرفوں کے آگر کے چمکے ۔ قمر میں یہ طلعت نہ سورج میں طاقت
شگفتہ ہر اک شعر ہے صورتِ گل ۔ فدا جسپہ سو جان سے مرغانِ جنت
مقابل میں نقطوں کے دیکھو تو صاحب ۔ خجل ہوگئی ہے ستاروں کی طلعت
لکھائی چھپائی مضامین عمدہ ۔ ہر اک صفحہ میں ہے نرالی یہ رنگت
کیا کام ایسا سری رام نے یہ ۔ کہ چاروں طرف ہوگئی خوب شہرت
مطابع سے چوبیس گھنٹے تھا جھگڑا ۔ نہیں کھانے پینے کی تھی اُنکو فرصت
مؤلف کو اشعار ہیں یاد لاکھوں ۔ نہیں دیکھی ایسی کسیکی طبیعت
مؤلف مصنف ہیں جتنے جہان میں ۔ سری رام ایم - اے سے لی اُنپہ سبقت

کرے لاکھ کوشش کوئی کچھ نہ ہوگا
سری رام کا ہے وہ رنگِ طبیعت

مؤلف سے دہلی میں ملنا ہوا تھا
یہ میری تھی واللہ خوبی قسمت

نہ بھولونگا ہرگز۔ نہ بھولونگا ہرگز
مجھے یاد ہے آپ کی وہ عنایت

ہزاروں میں لاکھوں میں میں یہ کہونگا
ہے ان میں تو چاہت محبت، مروت

ملاقات کرتے ہیں ہر ایک سے آپ
وہ ملتے ہیں ہر ایک سے با محبت

ہیں لالہ سری رام ایم اے مؤلف
نہیں جن کا ثانی زمانے میں حضرت

کروں کیا سراپا کی تعریف اُنکے
حسینوں میں ہیں وہ حسیں با نزاکت

گدا در پہ آتے ہیں ان کے ہمیشہ
کہ وا رات دن ہے وہ بابِ سخاوت

سخاوت میں بیشک وہ ابن سخی ہیں
شجاعت میں رستم سے بڑھکر ہے طاقت

یہ اِک بات ہے قابلِ داد اُن میں
کسی سے نہیں ہے بُرائی عداوت

لکھو **شاد** یوں مصرعِ سالِ طبع
ٹھکانے لگی نامی محسن کی محنت

۱۳ ۳۳

قطعۂ تاریخ از تراوش قلم جادو رقم شفیقی و کرم گستری نواب مرزا کاظم علیخان صاحب بیرسٹر ایٹ لا متخلص بہ فہیم رئیس شیش محل لکھنؤ

ساقیا! لا شراب انگوری
دھوم رندوں میں ہے بہار آئی

گھر کے گھنگھور ابر آیا ہے
کوئی دم میں برستے ہیں موتی

کس غضب کا ہے سبزہ پر جوبن
اب اگر ہے کمی تو بس مے کی

تاک میں دختِ رز کی بیٹھا ہوں
اُس پہ پیرو کی شاق ہے دُوری

عشق میں بس اُسی کے ہوں مبہوت
دِل میں ہے درد لب پہ جُھر لگی

خفقاں کچھ ہوا ہے کچھ سودا
مجھپہ سحر اُس کا چل گیا ساقی

چہرہ پہ زردی آج چھائی ہے
نشہ کی ہو گئی ہرن سُرخی

ضبط کرنے کا اب نہیں یارا
کیا کہوں ایسی ہی ہے مجبوری

تشنگی سے مرا جگر ہے کباب | آتش تر کا جام دے جلدی
نظر لطف گر تری ہو جائے | مئے گلگوں کے چشمے ہوں جاری
بارش مے وہ ہو کہ چھک جاؤں | فیض سے تیرے کشتِ دل ہو ہری
دم ترا پھر بہت غنیمت ہے | بس تجھی تک ہو لطفِ میخواری
رہے آباد تیرا میخانہ | روز ہی ہو ترقیٔ روزی
جام پر جام بھر کے مجھ کو پلا | حشر کا ڈر نہ فکر جنت کی
لابرانڈی، کلیبرٹ، ایل مزیل | وسکی، جن پورٹ شیمپین شیری
اب تو عادت مری خراب ہوئی | طاعتِ حق مجھے نہیں بھاتی
مے پرستی ہے اب تو دین اپنا | اور مذہب سے مجکو کیا ساقی
حق پرستی کے نور کے بدلے | چہرہ پہ ہو شراب کی سرخی
آتش تر ہے گو حرام ضرور | قطعہ | اُسکے پینے سے ہونگا میں ناری
حشر میں مجھ پہ جو قیامت ہو | دے بھی دے آج بادۂ باقی
میں نے اسلام کو سلام کیا | دُختِ رز کا بنا ہوں شیدائی
حشر ہوگا بُرا مگر تقدیر؟ | ق | پیش آئے گی جو ہے پیش آنی
پر یہاں اس چھُوٹنا ہے محال | خوب جی بھر کے کر لوں بادہ کشی
تجھ سے تقریر کیا کروں واعظ | ق | مجھکو لازم ہے یاں پہ خاموشی
تُو نے پی ہوتی گر کبھی بھی مے | پُوچھتا تب یہ چیز ہے کیسی؟
اِس میں لذت ہے کیا بتا واعظا | کیوں تو کرتا ہے شغل مینوشی
مگر افسوس تو نے پی ہی نہیں | ورنہ یہ وعظ پھر کہاں ہوتی
خواب میں بھی نہ جسنے دیکھی ہو | اُس کو کیا قدر مے کشی ہوگی
ساقیا تو مجھے شراب پلا! | جان واعظ کو بک رہا ہے سڑی

دے بیر، ہاک ٹام رم اسٹوٹ
پھروں اٹھکھیلیاں کروں مے کی
تن بدن کا نہ ہوش ہو مطلق
جس سے پردے نظر کے سب اٹھ جائیں
ساغرِ مے کو جامِ جم جو کہا
کوئی ایسا سماں نظر آئے
جس طرف دیکھ لوں اٹھا کے نگاہ
کچھ تعجب کچھ اشتیاق کے ساتھ
آج کیوں مجھ کو سرفراز کیا
تجھسا بے رحم اور یہ الطاف
آج تک تیری دید کو ترسا
مسکرا کے جواب دے مجھکو
میرا معشوق تھا تو یا پلٹا ئے
نہ مجھی کو فقط محبت ہے
تو نے دیرانتی جو لگائی سُن
تھا میں اسکے لئے یہاں بیتاب
لا سکی اپنی گو زباں پہ نہ کچھ
بن پڑی جب اسے نہ کچھ تدبیر
مجھکو لکھنا ہے قطعہ گرما گرم
مست ہو کے دو آتشہ مے سے
جس میں ہجری ہو اور الٰہی سال

اکشا تمبروں اور برکت ٹری
لوگ دیکھیں تو سمجھیں سودائی
سرسوں پھولی ہے نظر میں مری
ہو وہ جامِ جہاں نما ساقی
آسماں کو زمیں سے نسبت دی
جس سے کھلجائے میرے دل کی کلی
سامنے آکھڑی ہو میرے پری
اُس سے پوچھوں کہ اے گلِ خوبی
حال پر میرے کیا عنایت تھی
تجھسا بیدرد اور یہ ہمدردی
میری صورت سے تجھکو نفرت تھی
وُہ ہمارا تھا نازِ معشوقی
بس اسی کی ہے اب تو بیتابی
اُلفت اُسکو بھی مجھسے ہے ایسی
تھی پہاڑ اس پہ ایک ایک گھڑی
شاق اُسے واں مری جدائی تھی
دل ہی دل میں وہ پیچ کھایا کی
خون شیشے میں ہوگئی وہ پری
نشۂ مے کی چاہیئے گرمی
کہدوں اک ایسا قطعہ تاریخی
بکرمی اور عیسوی، فصلی

شور چاروں طرف اسی کا ہے
کیا سری رام کی کروں تعریف
شاعرِ بے نظیر خوش تقریر
با مروّت خلیق و نیک وسیر
اُن کا لاہور میں بھی شہرہ ہے
درحقیقت کیا اُنھوں نے کمال
جو جو اس میں اُٹھائی ہو تکلیف
کوئی کہدے کہ ایسا گلدستہ
شاہدِ طبع سے مخاطب ہو
لاسری رام کی کتاب ای شوخ
سنہ ۱۹۱۲ء
مظہرِ اہلِ علم ۔ اخترِ حسن
سنہ ۱۳۲۱ الہی سنہ ۱۳۱۹ فصلی

لالہ صاحب نے کتاب لکھی
گر بہت بھی لکھوں نہ ہو کافی
صاحبِ علم اور فہیم و ذکی
کیوں نہ نازاں ہو آپ پر دہلی
چشمۂ فیض واں بھی ہے جاری
خوب گوندھی ہے موتیوں کی لڑی
یہ وہی جانے جسپہ ہو گذری
ایسا خمخانہ بھی چھپا ہے کبھی
کہہ اٹھائیں یہ قطعۂ تاریخی
نشئت پُرنور جامِ جمشیدی
سمبت ۱۹۶۹ بکرمی
پارۂ دل ذہین بیاگرفی
سنہ ۱۳۳۰ھ